تالیف

فضیلۃ الشیخ ابو محمد حافظ عبدالستار الحماد

مکتبہ اسلامیہ

جلد دوم

فتاوی اصحاب الحدیث

فضیلۃ الشیخ
ابو محمد حافظ عبد الستار الحماد

مکتبہ اسلامیہ

فہرست

توحید و عقیدہ

رسالت و ولایت

مساجد واوقاف

طہارت و وضو

اذان و نماز

جمعہ و عیدین

وتر و تہجد

اذکار و دعوات

جنائز و زیارت قبور

زکوٰۃ وصدقات

حج و عمرہ

روزہ و اعتکاف

خرید و فروخت

وَصِیَّت و وَرَاثَت

نکاح وطلاق

عقیقہ و قربانی

زینت ولباس

آداب و اخلاق

زہد و رقاق

واجبات وحقوق

متفرقات

پیش لفظ

الحمد للہ رب العالمین والصلوة والسلام علی سید المرسلین محمدٍ وآله و أصحابه و أتباعه أجمعین.

انسان کو شریعت کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے بقدر ضرورت دین کا فہم حاصل کرنا ضروری ہے رسول اللہ ﷺ نے دینی فہم و بصیرت کو خیر و بھلائی کی علامت قرار دیا ہے، آپ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ جس شخص کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کا فہم عطا کر دیتا ہے۔'' (صحیح بخاری، العلم:۷۱)

دین میں فہم و بصیرت کا دوسرا نام علم نافع ہے، اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب حضرت محمد ﷺ کو حکم دیا ہے۔

''اے نبی دعا کیجئے کہ میرے پروردگار! مجھے مزید علم عطا فرما۔'' (۲۰/ طٰہٰ:۱۱۴)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ مذکورہ آیت کریمہ فضیلت علم پر وضاحت کے ساتھ دلالت کرتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو علم کے علاوہ کوئی اور چیز زیادہ سے زیادہ مانگنے کا حکم نہیں دیا اور اس سے مراد شریعت کا علم ہے۔
(فتح الباری، ص:۱۸۷، ج۱)

ہر انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ کوئی بھی عمل کرنے سے پہلے اس کے متعلق فہم و بصیرت حاصل کرے تاکہ اس کا عمل بار آور اور نتیجہ خیز ثابت ہو، اس کے ثمر آور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جنت میں داخلے اور جہنم سے نجات کا ذریعہ ہو، علم و عمل کے اعتبار سے لوگوں کی تین اقسام ہیں:

1. وہ لوگ جو علم نافع اور عمل صالح سے سرفراز ہوئے، ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے انعام یافتہ قرار دیا ہے۔
2. وہ لوگ جنہوں نے علم سیکھا، لیکن اس کے مطابق عمل نہ کیا، یہ لوگ یہود تھے جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا۔
3. وہ لوگ جو علم کے بغیر عمل کرتے تھے، یہ لوگ نصاریٰ تھے جو راہ راست سے بھٹک کر گمراہ ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ میں ان تینوں قسم کے لوگوں کا بایں الفاظ ذکر فرمایا:

''ہمیں سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا جن پر تیرا غضب نہیں ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔''
(۱/ فاتحہ:۶، ۷)

اگر انسان کو کسی چیز کا علم نہ ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اہل علم سے اس کے متعلق سوال کرے تاکہ اس کا عمل علیٰ وجہ البصیرت ہو ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اگر تمہیں کسی بات کا علم نہ ہو تو اہل ذکر سے دریافت کر لیا کرو۔'' (۱۶/ النحل:۴۳)

اس قرآنی ہدایت کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اگر دینی مسئلہ میں کوئی مشکل پیش آتی تو سرخیل اہل ذکر جناب رسول

اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرتے چنانچہ حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ نے ابواہاب بن عزیز کی بیٹی سے نکاح کرلیا، بعد میں کسی سیاہ فام عورت نے وضاحت کی کہ میں نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے، اس لیے تمہارا نکاح درست نہیں ہے، حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ نے اس مشکل کو حل کرنے کے لیے کسی مناسب وقت کا انتظار نہیں کیا بلکہ اسی وقت سواری لی اور مکہ سے مدینہ کا سفر کر کے رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا، رسول اللہ ﷺ کی وضاحت کے بعد انہوں نے اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کرلی۔

(صحیح بخاری، العلم: ۸۸)

چونکہ فتویٰ حصول علم کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس لیے ہم اس کی تعریف اور اہمیت وافادیت پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں لغوی طور پر فتویٰ اور فتیا، افتا سے ماخوذ ہے، جس کا معنی اظہار و بیان اور رائے دینے کے ہیں مصدری معنی رائے دینے کے علاوہ خود رائے پر بھی فتویٰ اور فتیا کا اطلاق ہوتا ہے، قرآن مجید میں گیارہ مقامات پر اس کے مشتقات استعمال ہوئے ہیں، ان میں اکثر استفتا سوال پوچھنے اور افتا جواب کی وضاحت کرنے کے معنی میں مستعمل ہیں، اسی بنیاد پر سوال کرنے والے کو مستفتی اور جواب دینے والے کو مفتی کہا جاتا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''لوگ آپ سے فتویٰ طلب کرتے ہیں، فرما دیجئے اللہ تمہیں کلالہ کے متعلق فتویٰ دیتا ہے۔'' (۴/النساء:۱۷۶)

اصطلاحی طور پر فتویٰ سے مراد پیش آمدہ مسائل کے متعلق شریعت کا وہ حکم ہے جو کسی سائل کے جواب میں کوئی عالم دین اور حکام شریعت سے واقف شخص دلیل سے بیان کرے، فتویٰ دینے کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کی ہے چنانچہ قرآن مجید میں دو مقامات پر یعنی سورۃ النساء آیت نمبر ۱۲۷ اور آیت نمبر ۱۷۶ میں اللہ تعالیٰ کے فتویٰ دینے کا ذکر آیا ہے۔ فتویٰ پوچھنے اور فتویٰ دینے کا سلسلہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک سے شروع ہوتا ہے، عہد رسالت میں فتاویٰ کا سلسلہ اکثر و بیشتر زبانی طور پر ہی چلتا تھا، جب کبھی دینی معاملہ میں مشکل مسئلہ پیش آتا تو لوگ رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرتے اس کا جواب کبھی تو قرآنی آیات کی صورت میں ملتا اور کبھی وحی الٰہی کی بنیاد پر اپنے اجتہاد سے فتویٰ دیتے تھے، قرآن مجید میں جن فتاویٰ کا ذکر آیا ہے، ان کے سوالات کبھی یسألونك کے صیغے سے شروع ہوتے ہیں اور کبھی یستفتونك کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ نازل فرمایا وہ رسول اللہ ﷺ نے نہایت امانت داری کے ساتھ لوگوں تک پہنچا دیا، قرآنی فتاویٰ کے علاوہ بھی رسول اللہ ﷺ نے مختلف اوقات میں صحابہ کرام کے سوالات کا حل پیش فرمایا، یہ فتاویٰ حدیث کی مختلف کتابوں میں موجود ہیں، علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تالیف اعلام الموقعین میں ان فتاویٰ کو ایک جگہ جمع کرنے کی بہترین کوشش فرمائی ہے، نواب صدیق حسن خان نے غالباً اسی پر اعتماد کر کے فارسی زبان میں ''فتاویٰ امام المتقین'' نامی ایک کتاب لکھی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد صحابہ کرام نے منصب افتا سنبھالا، سب سے زیادہ فتاویٰ حسب ذیل صحابہ کرام سے مروی ہیں۔

حضرت عائشہ، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابن عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم، کتب حدیث میں ان حضرات کے فتاویٰ بکثرت ملتے ہیں۔

دور حاضر میں حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے فتاویٰ کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

عہد صحابہ میں مدینہ، مکہ، کوفہ، بصرہ، شام اور مصر الغرض ہر جگہ کے باشندے مشکل مسائل میں جلیل القدر صحابہ کی طرف رجوع کر کے اپنی علمی تشنگی دور کرتے تھے، پھر تابعین اور تبع تابعین کے دور میں یہ منصب کبار علما کے سپرد رہا، ان حضرات میں حضرت سعید بن مسیّب اور حضرت سعید بن جبیر تو صحابہ کرام کی موجودگی میں فتویٰ دیتے تھے چنانچہ مدینہ طیبہ میں صحابہ کرام کے تربیت یافتہ سات فقہا یہ ہیں۔

(۱) سعید بن مسیّب (۲) عروہ بن زبیر (۳) قاسم بن محمد (۴) عبیداللہ بن عبداللہ

(۵) خارجہ بن زید (۶) ابوبکر بن عبدالرحمٰن (۷) سلیمان بن یسار رحمۃ اللہ علیہم

پھر ان کا سلسلہ امام زہری اور امام ربیعہ سے گزرتا ہوا امام مالک اور ان کے تلامذہ تک پہنچتا ہے۔ مکہ مکرمہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے تلامذہ تھے، ان میں زیادہ مشہور حضرت عطاء، حضرت طاؤس، حضرت مجاہد اور حضرت عکرمہ ہیں، ان کے بعد یہ سلسلہ سفیان بن عیینہ سے ہوتا ہوا امام شافعی اور ان کے شاگردوں تک منتہی ہوتا ہے۔

کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے تربیت پانے والے بزرگ حضرات منصب افتا پر فائز تھے، ان میں حضرت علقمہ اور قاضی شریح نے شہرتِ دوام حاصل کی، ان کے بعد یہ سلسلہ ابراہیم نخعی پھر حماد کے ذریعے حضرت امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ نے جاری رکھا۔

بصرہ میں حسن بصری، ابن سیرین، قتادہ اور معمر بن راشد نے یہ فریضہ سرانجام دیا، شام میں ابوادریس خولانی پھر امام مکحول، ان کے بعد امام اوزاعی اور ان کے تلامذہ نے یہ منصب سنبھالا، مصر میں یزید بن ابی حبیب اور ان کے بعد امام لیث بن سعد نے لوگوں کو فیض یاب کیا، ان کے علاوہ بغداد اور دیگر شہروں میں بہت سے علما لوگوں کو فتویٰ دیتے رہے، ان میں امام عبداللہ بن مبارک، امام احمد، امام اسحاق بن راہویہ، امام ابوثور اور امام ابن جریر طبری جیسے اساطین علم زیادہ مشہور ہوئے ان تمام حضرات نے یہ منہج اختیار کیا کہ کتاب وسنت کے مطابق فتویٰ دیتے تھے پھر کتاب وسنت کو سمجھنے کے لیے صحابہ کرام کے فہم کا اعتبار کرتے تھے کیونکہ صحابہ کرام ہی علوم نبوت کے حقیقی وارث تھے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ حضرت جابر بن زید سے کہا: ”تم فقہائے بصرہ میں سے ہو اس لیے قرآن ناطق اور سنت ثابتہ کے بغیر فتویٰ نہ دیا کرو، اگر تم نے اس کی خلاف ورزی کی تو خود بھی ہلاک ہو جاؤ گے اور دوسروں کو بھی تباہ کرو گے۔ (سنن دارمی حدیث نمبر ۱۶۶)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے درج ذیل واقعہ سے بھی اس منہج پر خوب روشنی پڑتی ہے جو فتویٰ دینے کے متعلق سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس چند لوگ آئے انہوں نے سوال کیا کہ ہمارے خاندان کے ایک شخص نے کسی خاتون سے نکاح کیا ہے، ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ وہ شخص فوت ہو گیا، عورت کا حق مہر بھی مقرر نہیں کیا گیا تھا، ایسے حالات میں کیا عورت

حق مہر کی حقدار ہے؟ کیا خاوند کے ترکہ سے اس کو حصہ ملے گا؟ کیا اس کے ذمے عدت وفات گزارنا ضروری ہے؟ ان سوالات کا جواب دینے میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ گریز کر رہے ہیں اور خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں، لوگ ایک ماہ تک ان کے پاس آتے رہے اور اصرار کے ساتھ ان سوالات کا جواب پوچھتے رہے آخر کار انہوں نے بایں الفاظ جواب دیا:

''اس استفسار کے متعلق میرا جواب یہ ہے کہ اس عورت کو خاندان کی باقی عورتوں کی طرح حق مہر ملے گا، اس سے کم ہو نہ زیادہ اس کے لیے خاوند کے ترکہ سے میراث بھی ہے اور اسے عدت وفات بھی گزارنا ہو گی اگر یہ فتویٰ درست ہے تو اس کی توفیق اللہ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو میری طرف سے اور شیطان کی اکساہٹ کا نتیجہ ہے اللہ اور اس کا رسول ﷺ اس سے بری ہیں۔''

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ سن کر حضرت جراح، ابو سنان اشجعی رضی اللہ عنہما اور ان کے خاندان کے کچھ دوسرے افراد نے گواہی دی کہ عہد نبوی میں حضرت بروع بنت واشق رضی اللہ عنہا اور ان کے خاوند حضرت ہلال بن مرہ اشجعی رضی اللہ عنہ کے ساتھ یہی صورت حال پیش آئی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے وہی فیصلہ دیا تھا جو آپ نے کیا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنا فیصلہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ کے موافق پا کر انتہائی خوشی کا اظہار کیا۔ (ابوداود، النکاح: ۲۱۱۶)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فتویٰ دینے میں قطعاً جلدی سے کام نہ لیا جائے بلکہ طویل بحث و تمحیص، غور و خوض، تلاش و جستجو اور عمیق فکر و نظر کے بعد فتویٰ دیا جائے، تمام صحابہ کرام اور تابعین عظام کا یہی طرز عمل تھا کہ پوری دل جمعی کے ساتھ کتاب و سنت میں مسئلہ تلاش کرتے، خلفائے راشدین کے اقوال کا پتہ چلانے میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرتے مکمل جدوجہد اور اجتہاد کے بعد جب اطمینان ہو جاتا تو فتویٰ دیتے تھے ہمارے اسلاف کا فتویٰ دینے کے متعلق یہی منہج تھا لیکن دوسری صدی میں بعض اصول و قواعد میں اختلاف کی وجہ سے فقہا دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے، ایک اہل حدیث کا گروہ تھا جو احادیث نبویہ اور اقوال صحابہ کی بنیاد پر فتویٰ دیتا تھا اور جب تک کسی واقعہ کا ظہور نہ ہو جاتا اس وقت تک اس کے متعلق شرعی حکم بیان کرنے سے گریز کرتا تھا، اس گروہ میں علمائے حجاز کی غالب اکثریت شامل تھی، اس گروہ کے مقابلہ میں دوسرا گروہ اہل الرائے کا تھا، جس میں فقہائے عراق کی غالب اکثریت تھی، ان کے پاس صحیح احادیث کم تھیں، اس لیے انہوں نے فتویٰ دیتے وقت عام طور پر رائے اور قیاس کا کثرت سے استعمال کیا، انہوں نے بعض ایسے قواعد وضع کیے جن کی روشنی میں پیش آمدہ اور آیندہ پیش آنے والے بلکہ محال اور غیر ممکن الوقوع ہزاروں مسائل سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا، ان میں کچھ مسائل بہت ہی مضحکہ خیز ہیں جن سے اسلام اور اہل اسلام کی خواہ مخواہ اغیار کے سامنے بدنامی ہوئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سلسلہ میں بہت دور اندیش تھے انہوں نے واضح طور پر فرمایا:

''اصحاب رائے سے اجتناب کرو، کیونکہ یہ حضرات سنتوں کے دشمن ہیں احادیث کو یاد کرنے سے یہ لوگ پست ہمت ثابت ہوئے، اس بنا پر اپنی رائے اور قیاس پر فتویٰ دینے کی روش اختیار کی، سو خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔'' (فتح الباری، ص: ۲۸۹، ج ۱۳)

اسی طرح حضرت ابوسلمہ نے امام حسن بصری سے کہا تھا:

''تم اپنی رائے سے فتویٰ نہ دیا کرو فتویٰ کے لیے صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کا سہارا لیا کرو۔'' (سنن دارمی حدیث نمبر ۶۵)

سوال کرنے والے حضرات کو کس قسم کے آداب کا خیال رکھنا چاہیے، ان کی تفصیل ہم پہلی جلد کے مقدمہ میں بیان کر آئے ہیں، اس سلسلہ میں چند ایک ممنوعہ صورتیں حسب ذیل ہیں:

① ایسے سوالات جن میں کوئی دینی یا دنیوی فائدہ نہ ہو۔

② دینی ضرورت کے پورا ہونے کے بعد بلا وجہ مزید سوالات کا سلسلہ جاری رکھنا۔

③ ایسے معاملات کے متعلق سوالات کرنے جن کے متعلق شریعت نے سکوت اختیار کیا ہے۔

④ مشکل ترین اور حساس معاملات کے متعلق سوالات کرنا تا کہ جواب دینے والا الجھن کا شکار ہو جائے۔

⑤ تعبدی احکام کی غرض و غایت اور ان کی علت کے متعلق سوالات کرنا۔

⑥ تکلف کرتے ہوئے کسی چیز کی گہرائی اور اس کی حقیقت کے متعلق پوچھنا۔

⑦ ایسے سوالات کرنا جن میں عقل و قیاس کے ذریعے کتاب و سنت کی صریح نصوص کا رد مقصود ہو۔

⑧ متشابہات کے سوالات اسلاف کے باہمی مشاجرات کو زیر بحث لانا بھی اسی قبیل سے ہے۔

⑨ کج بحثی، کٹ حجتی اور دوسرے فریق کو لاجواب کرنے کے لیے سوالات کرنا کوئی مستحسن اقدام نہیں ہے۔

⑩ بلاضرورت سوالات گھڑ گھڑ کر ان کی تحقیقات میں دماغ سوزی کرنا نیز فرضی مسائل کھڑے کر کے ان کے متعلق غور و خوض کرنا بھی ممنوع ہے۔

واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو یہ اہم ذمہ داری سونپی ہے کہ آپ دینی مسائل میں لوگوں کی راہنمائی کریں، آپ نے اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے لوگوں کے ساتھ نرمی اور آسانی کے اصول کو پیش نظر رکھا ہم نے بھی شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنے فتاویٰ میں سائلین کے لیے آسانی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ بے جا سختی اور حرفیت پسندی سے اجتناب کیا ہے اور جواب دیتے وقت اس پہلو کو اختیار کیا ہے جس کا نفس انسانی متحمل ہو البتہ تھوڑی مشقت تو ہر کام میں اٹھانا ہی پڑتی ہے نیز کسی چیز کو حلال اور حرام قرار دینے کے متعلق ہم نے جلد بازی سے احتراز کیا ہے، ہاں کسی چیز کی حلت و حرمت اگر کتاب و سنت کی صریح نصوص سے ثابت ہو تو اس سلسلہ میں ہم نے کسی قسم کی مداہنت سے کام نہیں لیا، کیونکہ اگر ایسے معاملات میں واضح حکم نہ لگایا جائے تو لوگ سستی کرتے ہوئے اس کے اسیر ہو جاتے ہیں۔

قارئین کرام! فتاویٰ اصحاب الحدیث کی دوسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے جو ۲۰۰۵ء تا ۲۰۰۷ء تین سال سے ہفت روزہ اہل حدیث میں شائع ہونے والے فتاویٰ جات پر مشتمل ہے اور انہیں نئی فقہی ترتیب کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس میں درج ذیل خصوصیات ہیں:

☆ فتویٰ لکھنے کے بعد ہم اللہ اور اس کے رسول کی نیابت میں رہتے ہوئے دستخط کرتے ہیں، اس احساس ذمہ داری کے پیش نظر ہم نے قرآن وسنت کو ایک ہی درجہ میں رکھا ہے، اخذ مسائل میں ہم انہیں اکٹھا دیکھنے اور ان میں تفریق نہ کرنے کے قائل ہیں، اس بنا پر یہ مجموعہ اقوال رجال اور قیل وقال سے پاک اور دلیل کے اعتبار سے قرآن وحدیث پر مشتمل ہے۔

☆ کتاب وسنت سے دلیل لینے کے ساتھ ہم نے اس بات کا بھی التزام کیا ہے کہ استنباط مسائل میں ''سبیل المؤمنین'' سے خروج نہ کیا جائے، ہم نے قرآن وسنت کو سمجھنے کے لیے صحابہ کرام کے فہم کا اعتبار کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنی اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے ساتھ ''سبیل المؤمنین'' کا بطور خاص ذکر فرمایا ہے۔ (۴/النساء:۱۱۵) اس بنا پر ہم نے انفرادی اور شاذ آرا سے دانستہ پہلوتہی کی ہے۔

☆ مداہنت یا بے جا سختی کی بجائے ہم نے نرمی اور آسانی کے اصول کو پیش نظر رکھا ہے کیونکہ اس ضابطہ کو اللہ تعالیٰ نے خود پسند فرمایا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ نرمی کا برتاؤ چاہتا ہے وہ اس سلسلہ میں سختی نہیں چاہتا۔'' (۲/البقرہ:۱۸۵)

دوسرے مقام پر فرمایا:

''اس نے دین کے معاملات میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔'' (۲۲/الحج:۷۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی اصول کو اپنایا اور اپنے صحابہ کرام کو اس کی تلقین فرمائی۔ (صحیح بخاری، الادب:۶۱۱۶، ۶۱۲۷)

☆ ہم نے اس مجموعہ میں یہ بات بطور خاص ملحوظ رکھی ہے کہ اگر کوئی عمل کسی صحابی سے ثابت ہے، اس پر بدعت کا ٹھپہ نہ لگایا جائے خواہ آسمان نبوت کے روشن ستاروں کی اکثریت اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ کسی صحابی کے متعلق یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ دیدہ دانستہ کسی بدعت کا مرتکب ہوا ہوگا، جبکہ ان حضرات کو دین میں نئی باتوں سے انتہائی نفرت تھی، بہر حال صحابی کے کسی عمل کو بدعت کہنا بہت بڑی جسارت ہے جس سے اجتناب کیا گیا ہے۔

☆ کتاب وسنت کی روشنی میں دورِ حاضر کے جدید مسائل کا اطمینان بخش حل پیش کیا گیا ہے، ایسے مسائل کی تمام جزئیات پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے نصوص کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اس سلسلہ میں زمینی حقائق کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے تاکہ مطالعہ کرتے ہوئے قاری کو اطمینان قلب اور شرح صدر حاصل ہو۔

☆ جن مسائل میں کتاب وسنت سے نصوص نہیں مل سکیں وہاں ہم نے اسلاف کے اقوال کا حوالہ دیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ فقہ کے ان اصولوں کو استعمال کیا ہے جو محدثین کرام کے ہاں رائج ہیں، ایسے اصول اس مجموعہ میں نظر نہیں آئیں گے جو بعض فقہا نے صحیح احادیث کو رد کرنے کے لیے بنائے ہیں، اس اعتبار سے اس مجموعہ کو فقہ الحدیث کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

☆ اس مجموعہ میں صرف ان سوالات کا جواب دیا گیا ہے جن کا تعلق انسان کی عملی زندگی سے ہے، شریعت نے بے مقصد اور لایعنی سوالات اور اس کے جوابات کو مستحسن قرار نہیں دیا ہے مثلاً زلیخا کی شادی حضرت یوسف علیہ السلام سے ہوئی تھی یا نہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا نام کیا تھا، حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کا طول وعرض کتنا تھا اور اصحاب کہف کے کتے کا رنگ کیسا تھا وغیرہ۔

☆ پیش آمدہ مسائل کا جواب دیتے وقت ہم نے اس امر کا خاص خیال رکھا ہے کہ شرعی دلائل کا باہمی ٹکراؤ نہ ہو، اگر کوئی حدیث بظاہر معارض ہے تو جمع و تطبیق کی پوری کوشش کی گئی ہے، یہ التزام اس لیے کیا گیا ہے کہ خواہشات نفس کے پیروکار اور منکرین سنت کو اس بظاہر تضاد سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملے۔

مذکورہ خصوصیات اور ان کے علاوہ دیگر امتیازات بھی دوران مطالعہ نظر آئیں گے، بہرحال یہ ایک انسانی کاوش ہے اگر اس میں کوئی کام کی چیز نظر آئے تو وہ محض اللہ کے فضل کا نتیجہ ہے اور اگر کوئی کوتاہی یا کمی دیکھنے کو ملے تو اسے ہماری کم ہمتی اور کوتاہ نظری خیال کیا جائے، ہم اپنے قارئین سے امید رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں ہماری کوتاہیوں سے ضرور مطلع کریں گے۔

آخر میں برادر مکرم پروفیسر عبید الرحمٰن محسن مدیر الجامعہ الکمالیہ راجووال کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود باریک بینی اور دقت نظری سے اس مجموعہ کی فہرست تیار کی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَهُ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَهُ

(آمین یا رب العالمین)

طالب الدعوات

ابو محمد عبدالستار الحماد بن مہتاب الدین

۲۰ جولائی ۲۰۰۸ء بروز اتوار

توحید و عقیدہ

توحید وعقیدہ

سوال غیر اللہ کے لیے سجدہ بالاتفاق حرام ہے، جبکہ بعض حضرات سجدۂ تعظیمی اور سجدۂ عبادت میں فرق کرتے ہیں۔ پہلے کو حرام اور دوسرے کو شرک قرار دیتے ہیں، کیا یہ تفریق صحیح ہے، نیز اس میں فاعل کی نیت اور عقیدے کا کوئی دخل ہے یا نہیں، اگر شرک ہے تو کس درجے کا؟ کیا تعظیمی سجدے کی طرح تعظیمی رکوع، تعظیمی قیام اور تعظیمی طواف بھی شرک ہے؟ کیا یہ مظاہرِ عبودیت زندہ اور مردہ کے لیے یکساں حکم رکھتے ہیں یا ان میں کوئی فرق ہے؟ تکفیر وخارجیت کے فتنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جواب دیں۔

جواب اللہ تعالیٰ نے جن وانس کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ [۵۱/الذاریات:۵٦]

اللہ تعالیٰ کی عبادت سے مراد یہ ہے کہ اس کے حضور انتہائی عاجزی، لاچاری، بے بسی اور انکساری کا اظہار کیا جائے۔ عبادت کے اظہار کے لیے قیام، رکوع اور سجدے کو بطور ذریعہ استعمال کیا جاتا ہے، جبکہ شرک اور عبادت دونوں متضاد چیزیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں شرک کو ناقابل معافی جرم قرار دیا ہے، اسی طرح اس کی طرف کھلنے والے تمام دروازوں کو بھی بند کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعظیم کے طور پر غیر اللہ کے لیے قیام، رکوع اور سجدہ بھی حرام ہے، جیسا کہ درج ذیل احادیث سے معلوم ہوتا ہے: ''جو شخص پسند کرتا ہے کہ لوگ اس کے لیے دست بستہ کھڑے ہوں، وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔'' [ابوداود، الادب:۵۲۲۹]

رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ بیماری کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھائی جبکہ لوگ آپ کے پیچھے کھڑے تھے تو آپ نے فرمایا: ''ایسا مت کیا کرو، جیسا کہ اہل فارس اپنے ''بڑوں'' کے ساتھ کرتے ہیں۔'' [ابوداود، الصلوٰۃ:٦۰۲]

رسول اللہ ﷺ بیماری کی وجہ سے سہارا لے کر تشریف لائے تو لوگ آپ کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو گئے آپ نے فرمایا: ''تم عجمیوں کی طرح مت کھڑے ہوا کرو وہ اس انداز سے ایک دوسرے کی تعظیم کرتے ہیں۔''

[مسند امام احمد،ص:۲۵۳ج:۵]

مذکورہ احادیث میں قیام کی ممانعت بیان ہوئی ہے۔ اسی طرح ایک آدمی نے آپ سے دریافت کیا کہ کیا ملاقات کے وقت مہمان کے سامنے جھکنا چاہیے؟ آپ نے سختی کے ساتھ اس سے منع فرمایا اور صرف مصافحہ کرنے کی اجازت دی۔

[مسند امام احمد،ص:۱۹۸ج:۳]

اس حدیث سے پتا چلتا ہے کہ کسی دوسرے کے سامنے معمولی سا جھکنا بھی شریعت کو ناگوار ہے، چہ جائیکہ اس کے سامنے رکوع کیا جائے، غیر اللہ کے لیے سجدہ کرنا بھی سخت منع ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ اونٹ نے آپ کو سجدہ کیا تو مہاجرین وانصار کہنے لگے کہ آپ کو حیوانات اور حجر وشجر سجدہ کرتے ہیں، اس بنا پر ہمارا زیادہ حق ہے کہ ہم آپ کو سجدہ کریں، آپ نے فرمایا: ''ایسا کرنا جائز نہیں ہے، تم اپنے رب کی عبادت کرو اور اپنے بھائی کا اکرام کرو۔'' [مسند امام احمد،ص:٧٦ج٦]

حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں حیرہ شہر گیا تو دیکھا کہ لوگ اپنے رہنماؤں کو سجدہ کرتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ زیادہ حق رکھتے ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا جائے، آپ نے فرمایا ''اگر تو میری قبر کے پاس سے

گزرے تو کیا اسے سجدہ کرے گا؟" عرض کیا، نہیں، اس پر آپ نے فرمایا: "پھر مجھے سجدہ کرنا بھی جائز نہیں ہے۔"
[ابوداود، النکاح:۲۱۴۰]

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے عملاً آپ کو سجدہ کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: "اے معاذ! یہ کیا ہے؟" حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں ملک شام گیا تھا، وہاں میں نے دیکھا کہ وہ اپنے مذہبی رہنماؤں کو سجدہ کرتے ہیں، اس بنا پر میرے دل نے چاہا کہ آپ کو سجدہ کروں، آپ نے فرمایا: "ایسا مت کرو اور اگر غیر اللہ کے لیے سجدہ روا ہوتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ خاوند کی حق ادائیگی کے لیے اسے سجدہ کرے۔" [ابن ماجہ، النکاح:۱۸۵۳]

قیام، رکوع اور سجدہ اگرچہ عبادت نہیں بلکہ مظاہر عبادت ہیں، تاہم ہماری شریعت میں غیر اللہ کے لیے انہیں ادا کرنا سخت منع کیا گیا ہے، جیسا کہ سابقہ روایات سے معلوم ہوتا ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پہلی امتوں کے لیے تعظیمی سجدہ جائز تھا، جیسا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے سجدہ کیا تھا قرآن پاک میں اس کی صراحت موجود ہے۔ [۱۲/یوسف:۱۰۰]

لیکن ہمیں جو دین عطا ہوا ہے وہ ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے مکمل صورت میں ملا ہے۔ اس میں عبادت اور مظاہر عبادت سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "قیام، قعود، رکوع اور سجدہ صرف اللہ وحدہ لاشریک کا حق ہے جس نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا ہے اور جو خالص اللہ تعالیٰ کا حق ہو، اس میں کسی غیر کا حق نہیں ہونا چاہیے۔ جیسا کہ غیر اللہ کی قسم اٹھانے کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ "جس نے اللہ کے علاوہ کسی مخلوق کی قسم اٹھائی اس نے شرک کیا۔" [فتاویٰ ابن تیمیہ، ص:۹۳ ج:۲۷]

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ مزید لکھتے ہیں کہ "خشوع وخضوع اور عاجزی وانکساری اللہ تعالیٰ کے لیے ہے کیونکہ یہ عبادت ہے جو کسی وقت بھی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے جائز نہیں ہوئی، البتہ سجدہ کرنا اللہ تعالیٰ کے احکام میں سے ایک حکم ہے جس کی بجا آوری ہم پر فرض ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ تعظیم کے طور پر کسی دوسرے کو سجدہ کرنے کا ہمیں حکم دیتے تو ہم پر اس حکم کی پیروی کرنا ضروری تھا، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری عبادت اور مسجود کی تعظیم تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سجدہ کی دو اقسام ہیں:

ایک سجدہ عبادت: جو کسی وقت بھی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے جائز نہیں ہوا۔

دوسرا سجدۂ تعظیم: اس میں مسجود کی تعظیم ہوتی ہے۔ ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے تعظیم کا یہ انداز اختیار کریں، البتہ ہم سے پہلے لوگوں کے لیے ایسا کرنا جائز تھا۔" [فتاویٰ ابن تیمیہ، ص:۳۶۰ ج:۴]

تفصیل کے لیے فتاویٰ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے درج ذیل مقامات کا مطالعہ مفید رہے گا۔

(ص:۳۷۲ ج:۱، ص:۵۰۱، ۵۵۱، ۵۵۳ ج:۱۱، ص:۸۱، ۹۲ ج:۲۷) واضح رہے کہ اس قسم کی فکری اور نظریاتی مباحث کے لیے بہت تفصیل درکار ہوتی ہے جو فتویٰ میں نہیں آسکتی، لہٰذا جو کچھ تحریر کیا گیا ہے اس میں سائل اپنے سوالات کے جواب تلاش کر سکتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال اللہ اکبر ہے، صدیق بھی اکبر ہے، اللہ اعظم ہے، فاروق بھی اعظم ہے، اللہ غنی ہے، عثمان بھی غنی ہے، اللہ مشکل کشا ہے، علی مشکل کشا کیوں نہیں؟ گو خالق اپنی شان کے مطابق ہے اور مخلوق اپنی شان کے مطابق، اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں بادشاہ

کو رب کہتا ہے اگر بادشاہ رب ہے تو علی ہجویری اور جیلانی رحمۃ اللہ علیہما داتا اور غوث کیوں نہیں؟ قرآن پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے فضل سے تمہیں غنی کردے گا، یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے رسول بھی فضل فرماتے ہیں تو کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ یا رسول اللہ! فضل کریں؟

جواب اللہ تعالیٰ نے اس عالمِ رنگ و بو میں اپنی توحید قائم کرنے کے لیے متعدد کتابیں نازل فرمائیں اور بے شمار رسولوں کو مبعوث کیا، توحید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی صفات، نیز اس کے حقوق و اختیارات اور احکام میں کسی مخلوق کو شریک نہ کیا جائے، اگر کسی نے اللہ کے اسماء، اس کی صفات، اس کے حقوق و اختیارات اور احکام میں کسی مخلوق کو شریک ٹھہرایا تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مشرک ہے اگر توبہ کے بغیر اس جہاں سے رخصت ہوا تو ہمیشہ کے لیے اس پر جنت حرام اور جہنم واجب ہوگئی۔ داتا، غوث اعظم، مشکل کشا اور غریب نواز یہ سب اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ بعض لوگ ان صفات کو مخلوق میں تلاش کرتے ہیں، جیسا کہ سائل کے سوال سے واضح ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''کون ہے جو بے قرار کی پکار سنتا ہے جبکہ وہ اسے پکارتا ہے اور کون اس کی تکلیف کو رفع کرتا ہے اور کون ہے جو تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور کوئی اللہ بھی ہے۔'' [۲۷/النمل:۶۲]

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا سب سے بڑا فریاد سننے والا، یعنی غوث اعظم صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے، عبدالقادر جیلانی نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''یقیناً تو ہی بہت بڑی عطا دینے والا ہے۔'' [۳/آل عمران:۸]

اس آیتِ کریمہ سے پتا چلتا ہے کہ اللہ ہی سب سے بڑھ کر دینے والا یعنی داتا ہے علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ داتا نہیں ہیں۔ انہوں نے تو خود اپنی کتاب ''کشف المحجوب'' میں اپنے متعلق داتا ہونے کی پرزور الفاظ میں تردید کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اے لوگو! تم سب اللہ تعالیٰ کے در کے فقیر ہو وہ اللہ تو غنی و حمید ہے۔'' [۳۵/فاطر:۱۵]

اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہی غریبوں کو نوازنے والا ہے اس کے علاوہ اور کوئی غریب نواز نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اگر اللہ تعالیٰ تمہیں کسی مشکل میں ڈال دے تو اس کے علاوہ اسے کوئی دور کرنے والا نہیں ہے اور اگر وہ تمہیں کوئی خیر پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کو کوئی ہٹانے والا نہیں۔'' [۱۰/یونس:۱۰۷]

اس آیت سے پتا چلتا ہے کہ تمام مشکلات حل کرنے والا، یعنی مشکل کشا صرف اللہ تعالیٰ ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ نہیں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے بعد ایک دعا پڑھا کرتے تھے جس میں یہی مضمون بیان ہوا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے: ''اے اللہ! جسے تو دے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جس سے تو روک لے اسے کوئی دینے والا نہیں اور کسی صاحب حیثیت کو اس کی حیثیت تیرے مقابلے میں نفع نہیں پہنچا سکتی۔'' [صحیح بخاری، کتاب الدعوات: ۶۳۳۰]

سوال میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اکبر، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اعظم اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کو غنی کہا گیا ہے۔ ان حضرات کے لیے اس قسم کے القاب ہم نے خود تجویز کیے ہیں، کتاب وسنت میں ان کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ

کی بعض صفات ایسی ہیں کہ قرآن پاک میں ان کا اطلاق بندوں پر بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً: اللہ تعالیٰ سمیع اور بصیر ہے تو انسان کے لیے بھی سمیع اور بصیر کا اطلاق ہوا ہے۔ [۷۶/الدھر:۲]

لیکن اللہ تعالیٰ کا سمیع وبصیر ہونا اس کی شان کے مطابق ہے اور بندے کا سمیع وبصیر ہونا اس کی شان کے لائق ہے۔ یعنی بندے کی سماعت وبصارت انتہائی محدود ہے۔ کیونکہ بندہ پس پردہ نہ کوئی چیز دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی سن سکتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ ایسے عیوب ونقائص سے پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی صراحت فرمائی ہے کہ ''اس کی ذات وصفات میں کوئی دوسرا اس جیسا نہیں ہے۔'' [۴۲/الشوریٰ:۱۱]

سوال میں خود ہی ان نفوسِ قدسیہ کی طرف ایسی صفات کا انتساب کیا گیا ہے جس کا ثبوت قرآن پاک وحدیث میں نہیں ہے۔ پھر خود ہی صغریٰ کبریٰ ملا کر اس سے غلط مقصد کشید کرلیا گیا کہ اللہ تعالیٰ مشکل کشا ہے تو علی رضی اللہ عنہ مشکل کشا کیوں نہیں؟ مشکل کشا تو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اسے مخلوق میں کس بنیاد پر تسلیم کیا جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو خود مشکلات میں پھنسے رہے وہ اپنے لیے مشکل کشائی نہ کرسکے تو دوسروں کے لیے کیونکر مشکل کشا ہوسکتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اچھا یہ تو بتاؤ کہ جنہیں تم اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہو اگر اللہ تعالیٰ مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو کیا یہ اس کے نقصان کو ہٹا سکتے ہیں؟ یا اللہ تعالیٰ مجھ پر مہربانی کا ارادہ کرے تو کیا یہ اس کی مہربانی کو روک سکتے ہیں۔'' [۳۹/الزمر:۳۸]

اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوزیشن کو واضح فرمایا ہے سیدنا علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتے ہیں کہ وہ مشکل کشا بن جائیں۔ کتاب وسنت میں اس کے لیے کوئی سند نہیں ہے۔ یہی سب خود ساختہ اور ایجاد بندہ ہیں۔ بلاشبہ سورۂ یوسف میں متعدد مرتبہ بادشاہ کے لیے ربّ کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن وہ علی الاطلاق نہیں اور اضافت کے ساتھ دونوں طرح مستعمل ہے، پھر جب بندے کے لیے اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے تو اس کی تانیث بھی کلام عرب میں مستعمل ہے، مثلاً: گھر کی مالکہ کو عربی میں ''ربّة البیــــت'' کہتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کے لیے اس کی تانیث کا استعمال شرک اکبر ہے۔ سوال میں یہ استدلال بھی عجیب ہے کہ اگر بادشاہ رب ہے تو علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ داتا اور شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ غوث اعظم کیوں نہیں؟ یہ تو ایسا ہی استدلال ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے شخص کے باپ کا ہم نام ہو تو پہلا شخص دعویٰ کردے کہ میرا باپ آپ کے باپ کی جائیداد میں برابر کا شریک ہے۔ کسی کے ہم نام ہونے کا یہ معنی نہیں ہے کہ کوئی دوسرا ان کی جائیداد میں حصہ دار ہے۔ سوال میں قرآن پاک کے حوالے سے ایک اور مغالطہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مجرمانہ کوشش کے مترادف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اپنے فضل سے تمہیں غنی کردے گا۔ قرآنِ پاک میں اس قسم کے الفاظ قطعاً نہیں ہیں اگر ایسا سہوًا نہیں ہوا تو یہ ایک ایسی تحریف ہے جس کا ارتکاب یہودی کیا کرتے تھے۔ قرآنِ پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''منافقین صرف اس بات کا انتقام لے رہے ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اور اس کے رسول نے دولت مند کردیا ہے۔'' [۹/توبہ:۷۴]

اس آیت کریمہ سے یہ مفروضہ کشید کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے رسول بھی فضل فرماتے ہیں تو ''یارسول اللہ! فضل کریں'' کہنا بھی صحیح ہے العیاذ باللہ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے رسول کا ذکر اس لیے ہے کہ اس غنا اور تونگری کا ظاہری سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہی بنی تھی، ورنہ حقیقت میں غنی بنانے والا اللہ تعالیٰ ہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ میں

جب فضل کا ذکر ہوا ہے تو اس کے ساتھ واحد کی ضمیر استعمال ہوئی ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے انہیں غنی کردیا۔دوسرے الفاظ میں فضل وکرم کرنا صرف اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے،اس میں اس کے رسول کا ذرّہ برابر بھی حصہ نہیں ہے۔اگر ایسا ہوتا تو اس کے ساتھ تثنیہ کی ضمیر استعمال کی جاتی بلکہ خود رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے فضل کے محتاج ہیں،جیسا کہ حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''قیامت کے دن تم میں سے کسی کو اس کا عمل نجات نہیں دے گا۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا:یارسول اللہ!آپ کو بھی نہیں؟آپ نے فرمایا کہ ''مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلائے گا،ہاں اگر اللہ تعالیٰ کا فضل میرے شامل حال ہوجائے تو الگ بات ہے۔'' [صحیح بخاری،الرقاق:۶۴۶۳]

نیز حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی وفات کے موقع پر جب ان کے متعلق حسن ظن کا اظہار کیا گیا تو آپ نے فرمایا:''اللہ کی قسم!مجھے اللہ تعالیٰ کا رسول ہونے کے باوجود علم نہیں کہ قیامت کے دن میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔'' [صحیح بخاری،المناقب:۳۹۲۹]

آخر میں ہم اپنے معزز قارئین اور سائلین سے یہی گزارش کریں گے کہ اسباب کے بغیر داتا،غوث اعظم،مشکل کشا اور غریب نواز صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے،لہٰذا جب بھی دعا مانگو یا مدد کے لیے پکارو تو صرف اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال ایک عالم دین نے رسول اللہ ﷺ کو مختار کل ثابت کرنے کے لیے ایک حدیث پیش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے صرف دو نمازیں پڑھنے کے متعلق کہا،تو آپ نے اسے اجازت دے دی۔جب آپ کو نمازوں میں کمی کرنے کا اختیار ہے تو دیگر کاموں کے متعلق بھی کلی اختیار رکھتے ہیں۔یہ حدیث مسند احمد کے حوالہ سے پیش کی ہے وضاحت فرمائیں؟

جواب مذکورہ حدیث بایں الفاظ مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اور وہ اس شرط پر مسلمان ہوا کہ وہ صرف دو نمازیں پڑھے گا تو آپ نے اس کی شرط کو قبول کرلیا۔ [مسند امام احمد،ص ۳۶۳ ج ۵]

ہمیں بریلوی علما سے یہ شکوہ ہے کہ وہ ذخیرۂ احادیث میں سے صرف اپنے مطلب کی احادیث چن لیتے ہیں اور باقی ''کیا تمام کتاب کے بعض احکام کو مانتے ہو اور بعض کا انکار کردیتے ہو۔'' [۲/البقرۃ:۸۵]

رسول اللہ ﷺ کا دوسروں کے لیے مختار کل ہونا بہت دور کی بات ہے،آپ اپنے متعلق بھی کسی قسم کا اختیار نہیں رکھتے تھے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:''آپ کہہ دیجئے!مجھے خود اپنے نفع ونقصان کا اختیار نہیں،مگر اللہ تعالیٰ ہی جو چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بہت سی بھلائیاں حاصل کرلیتا اور مجھے کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔'' [۷/الاعراف:۱۸۸]

نمازوں کے متعلق کمی وبیشی کا اختیار بھی آپ کے پاس بالکل نہیں تھا۔اگر ایسا ہوتا تو جب نمازیں فرض ہوئی تھیں تو بار بار اللہ کے حضور تخفیف کی درخواست نہ کرتے۔چنانچہ حدیث میں ہے کہ معراج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کو پچاس نمازوں کا تحفہ ملا۔جناب موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر نو (۹) مرتبہ اللہ تعالیٰ کے حضور تخفیف کی درخواست کی ہر مرتبہ پانچ نمازیں معاف ہوئیں اس طرح

جب پانچ باقی رہ گئیں تو فرمایا: ''اب مجھے اللہ تعالیٰ کے حضور مزید تخفیف کی درخواست دینے سے حیا آتی ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا: میرے اس فیصلے میں مزید تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے۔'' [صحیح بخاری، الصلوٰۃ:۳۴۹]

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں وفد ثقیف حاضر ہوا اور انہوں نے نماز سے رخصت طلب کی تو آپ نے فرمایا: ''جس دین میں رکوع وسجود نہیں، اس میں کوئی برکت نہیں ہے۔'' [مسند امام احمد، ص:۲۱۸، ج۴]

حدیث کے متعلق علامہ احمد شاکر لکھتے ہیں۔ بادیٔ النظر ذہن اس حدیث کو قبول نہیں کرتا لیکن دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اعرابی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کرنے لگا کہ مجھ پر احکام شریعت کی بھرمار ہے تو رسول اللہ ﷺ نے اسے پابندیٔ نماز کی وصیت فرمائی، وہ کہنے لگا میں اس کی طاقت نہیں رکھتا تو آپ نے فرمایا: ''عصر اور فجر کی نماز کو کسی حالت میں ترک نہیں کرنا۔'' یہ الفاظ بھی آپ نے تالیفِ قلبی کے لیے ارشاد فرمائے۔ایک حدیث کے مطابق آپ نے فرمایا: ''جب یہ دین میں داخل ہوگا تو پوری نمازیں پڑھے گا۔'' [حاشیہ احمد شاکر،ص:۱۶۸، ج۱۵]

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو بذریعہ وحی اطلاع دے دی گئی تھی کہ یہ رخصت ہنگامی بنیادوں پر ہے، بالآخر اسلام قبول کرنے کے بعد یہ اعرابی تمام نمازوں کی پابندی کرے گا۔اس کی وضاحت ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے حضرت فضالہ لیثی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر اسلام قبول کیا، آپ نے مجھے دین اسلام کی تعلیمات سے آگاہ فرمایا۔ پھر نماز اور اوقات نماز کی تعلیم دی کہ ان نمازوں کو بروقت ادا کرنا ہے۔ میں نے عرض کیا: ان اوقات میں بہت مصروف ہوتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: ''اگر تجھے واقعی مصروفیت ہے تو کم ازکم دو نمازیں فجر اور عصر تو بروقت ادا کر وان کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرنا۔'' [مسند امام احمد، ص:۳۴۴، ج۴]

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے نماز سے معافی طلب نہیں کی تھی بلکہ انہیں اپنی کثرتِ مصروفیت کی وجہ سے بروقت ادا نہ کرنے سے معذرت کی تھی۔ چنانچہ آپ نے وقتی طور پر اسے قبول کرلیا۔محدثین نے اس سے ایک اصول اخذ کیا ہے کہ صحیح شرائط میں ایک غلط شرط کو وقتی طور پر قبول کیا جاسکتا ہے، پھر شرط کے ایفا کے موقع پر اس کی وضاحت کردی جائے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ ''بریرہ کو آزاد کرنے کے سلسلہ میں اس کے مالک کی ولا کے متعلق شرط کو قبول کرلو اور اسے خرید کر آزاد کردو، پھر آپ نے اپنے خطبہ میں اس کی وضاحت کردی تھی۔'' امام احمد رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ حدیث کی بنا پر فرماتے ہیں کہ شرطِ فاسد کی بنا پر اسلام لانا صحیح ہے لیکن جب وہ دائرہ اسلام میں آجائے تو اسے تمام شریعت اسلام پر عمل کرنا ضروری ہوگا۔ چنانچہ حافظ ابن رجب حنبلی نے اس موضوع پر بہترین بحث کی ہے۔ [جامع العلوم والحکم،ص ۷۳، حدیث نمبر۲]

اس حدیث سے رسول اللہ ﷺ کے متعلق مختار کل ہونے کا مسئلہ کشید کرنا ایجاد بندہ ہے، جس پر کتاب وسنت سے کوئی دلیل نہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت بایں الفاظ بیان ہوئی کہ ''وہ ہی پیٹ کی چیزوں کو جانتا ہے۔'' [۳۱/لقمان:۳۴] یعنی ماں کے پیٹ میں نر یا مادہ ہے اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے جبکہ آج جدید سائنس کے ذریعے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ

ماں کے پیٹ میں بچہ ہے یا بچی۔اس کے متعلق ذہنی الجھن کا شکار ہوں براہِ کرم قرآن پاک اور حدیث کی روشنی میں جواب دے کر مجھے مطمئن کریں؟

جواب قرآن پاک کی کوئی صراحت امر واقع سے متعارض نہیں ہے، اگر کوئی بظاہر قرآن پاک کے خلاف ہوتو امر واقع محض دعویٰ ہوگا، جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں یا پھر قرآن پاک کا امر واقع سے تعارض صریح نہیں ہوگا کیونکہ قرآن پاک کی صراحت اور واقع کی حقیقت دو قطعی امر ہیں اور دو قطعی چیزوں میں کبھی تعارض نہیں ہوتا۔اس تمہید کے بعد ہماری گزارش ہے کہ آج جدید سائنس، مثلاً: الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے اطباء حضرات کا دعویٰ ہے کہ وہ ماں کے پیٹ میں نر یا مادہ ہونے کے متعلق معلومات فراہم کر سکتے ہیں، اگر یہ محض دعویٰ ہے تو اس کے متعلق گفتگو کی ضرورت نہیں ہے، یہ بات ہمارے مشاہدہ میں ہے کہ بیوی خاوند نے اپنا شوق فضول پورا کرنے کے لیے کسی ڈاکٹر کی خدمات حاصل کیں، اس نے جدید آلات کے ذریعے زوجین کو تسلی دی کہ آپ کے ہاں پھول جیسا بچہ پیدا ہوگا لیکن ولادت اس کے برعکس ہوئی، یعنی بچی پیدا ہوئی ،بیسیوں واقعات شہادت کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔اگر یہ جدید ''تحقیق'' نشانے پر بیٹھ جائے اور ڈاکٹر کی پیشین گوئی کے مطابق بچہ ہی پیدا ہو تو بھی آیت قرآن پاک کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ آیت ایک غیبی امر پر دلالت کرتی ہے۔اور جنین کے متعلق غیبی امر صرف یہ نہیں کہ وہ نر ہے یا مادہ، بلکہ حدیث کے مطابق شکم مادر کے اندر جب استقرار حمل ہوتا ہے تو پہلے نطفہ ہوتا ہے، پھر منجمد خون، اس کے بعد گوشت کا لوتھڑا، پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے، ان مراحل میں جدید آلات سے معلوم نہیں کیا جا سکتا ہے کہ شکم مادر میں نر ہے یا مادہ، اس کے بعد شکل و صورت بنتی ہے۔قرآن پاک کی تصریح کے مطابق یہ سب کچھ تاریکیوں کے اندر ہی ہوتا رہتا ہے، حتی کہ وہ جنین مقررہ وقت کے بعد انسان کی شکل و صورت لے کر ماں کے پیٹ سے باہر آ جاتا ہے۔ان تین پردوں میں پہلا پردہ ماں کا پیٹ، دوسرا ماں کے اندر رحم اور تیسرا رحم کے اندر جھلی جس میں وہ بچہ ملفوف اور محفوظ ہوتا ہے۔واضح رہے کہ چار ماہ کے بعد جب جنین میں روح ڈالی جاتی ہے تو اس کی عمر، اس کی روزی، خوشحال ہو گا یا تنگ دست، نیز یہ نیک بخت ہوگا یا بد بخت، یہ تمام باتیں لکھ دی جاتی ہیں اور یہ رحم کے مراحل میں شامل ہیں۔آیت کریمہ میں اس کے نر یا مادہ ہونے کو امور غیبی میں شمار ہی نہیں کیا گیا۔اسی طرح سنت میں بھی اس کی صراحت نہیں ہے کہ ''مافی الارحام'' سے مراد اس کا نر یا مادہ ہونا ہے۔البتہ یہ ضرور ہے کہ شکم مادر کے اندر جب بچہ تین اندھیروں میں پرورش پاتا ہے تو جدید آلات سے ان اندھیروں کو زائل کیا جا سکتا ہے اور اس کی تصویر بھی لی جا سکتی ہے اور یہ کوئی بعید بات نہیں ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایسی قوی شعائیں پیدا کر رکھی ہیں جو ان اندھیروں کو پھاڑ دیتی ہیں اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جنین نر ہے یا مادہ ،جسم کے اندر ٹوٹے ہوئے اعضاء کو ایکسرے کے ذریعے معلوم کیا جا سکتا ہے تو جدید الٹرا ساؤنڈ سے اندھیرے میں تصویر بھی لی جا سکتی ہے اور ایسا کرنا قرآن پاک کے خلاف نہیں ہے، اس کے باوجود ہم کہتے ہیں کہ ان اطباء کا علم محض ظن و تخمین پر مبنی ہے کوئی یقینی بات نہیں ہے۔جبکہ قرآن پاک کا دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے۔واضح رہے کہ عربی قواعد کے اعتبار سے ''مَافِی الْأَرْحَامِ'' روح پڑنے سے پہلے تک ہے جب اس میں روح پڑ جائے تو ''ما'' کی حدود سے نکل جاتا ہے، واضح رہے کہ ہمارے نزدیک قبل از وقت جنین کے متعلق معلومات حاصل کرنا کہ نر ہے یا مادہ محل نظر ہے۔کیونکہ یہ ایک فضول شوق جو بلا ضرورت ہے، اسلام ایسے فضول کاموں کی اجازت نہیں دیتا۔ [واللہ اعلم]

سوال پاکپتن میں بابا فرید کی قبر پر ایک بہشتی دروازہ ہے، جسے ایک سال کے بعد کھولا جاتا ہے اور اس سے گزرنے والے عقیدہ رکھتے ہیں کہ انہوں نے جنت کے دروازے کو پار کرلیا ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ......

① اس دروازہ کی قفل کشائی ایک مجاور کرتا ہے جبکہ جنت کا دروازہ تو رسول اللہ ﷺ کھولیں گے، کیا یہ توہین رسالت نہیں ہے۔

② جو لوگ اس دروازے سے گزرتے ہیں، ان کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب استفتاح میں جو صورتحال بیان کی گئی ہے اس میں صرف توہین رسالت ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی توہین کا بھی نمایاں پہلو پایا جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ پورے عالم اسلام سے استہزاء ومذاق کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاں آسمانوں پر جنت کو پیدا کیا ہے اور اس میں اہل ایمان کے لیے بے شمار ایسی نعمتیں پیدا کی ہیں جو آج ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں ہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ اپنے ماننے والوں کو نہایت اعزاز واحترام سے داخل فرمائیں گے اور خود رسول اللہ ﷺ اس جنت کا افتتاح فرمائیں گے۔ اس کے برعکس بابا فرید کی قبر پر جنت کے بغیر صرف ایک دروازہ نصب ہے جسے بہشتی دروازہ کہا جاتا ہے، اس پر عربی عبارت بھی غلط تحریر ہے عبارت اس طرح ہے۔

"مَنْ دَخَلَ هَذِهِ الْبَابَ دَخَلَ الْجَنَّةَ" یعنی "هذا" کے بجائے "هٰذِهِ" لکھا ہے۔

اس میں داخل ہونے والوں کی خوب مرمت کی جاتی ہے، انہیں وہاں تعینات افراد زدوکوب کر کے گناہوں سے پاک کرتے ہیں۔ پولیس کی لاٹھیاں کھانے کے بعد "بابا فرید" "بابا فرید" کہتے ہوئے وہاں سے بھاگتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی جنت میں ایسا سلوک نہیں ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر اس پر ڈٹ گئے، ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں نہ خوف کرو اور نہ غم کھاؤ اور اس جنت کی خوشی مناؤ، جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے دوست تھے اور آخرت میں بھی تمہارے دوست ہیں۔ اس آخرت میں تمہارا جو جی چاہے گا تمہیں ملے گا اور جو کچھ مانگو گے پورا ہوگا یہ بخشنے والے مہربان کی طرف سے مہمانی ہوگی۔" [۴۱/حٰم السجدہ:۳۲]

اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ حکمت عملی کے ساتھ ان لوگوں کو راہ راست پر لایا جائے، یہ دراصل جہالت کے کرشمے ہیں، یہ لوگ حقیقی جنت سے ناآشنا ہیں، انہیں اس حقیقی جنت سے آشنا کرنے کے لیے محنت کی ضرورت ہے جسے ہم ادا نہیں کر رہے ہیں۔ واللہ المستعان

سوال کیا انسان کو نظر لگ جاتی ہے، اگر ایسا ہے تو اس کے لیے کیا علاج ہے، اس کے متعلق تفصیل سے ہمیں آگاہ کریں؟

جواب نظر بد برحق ہے اور اس سے کسی کو نقصان پہنچنا ممکن ہے، شرعی اور حسی طور پر یہ ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "نظر لگنا برحق ہے اگر کوئی چیز تقدیر سے سبقت کرنے والی ہوتی تو اس سے نظر بد ضرور سبقت کرتی اور جب تم سے دھونے کا مطالبہ کیا جائے تو اس مطالبے کو پورا کرتے ہوئے غسل کر دیا کرو۔" [صحیح مسلم، الطب:۲۱۸۸]

اس سے معلوم ہوا کہ نظر بد کا لگ جانا ایک حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں، حدیث میں ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام

رسول اللہ ﷺ کو دم کرتے ہوئے درج ذیل کلمات پڑھا کرتے تھے "بِاسْمِ اللّٰهِ أَرْقِيكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُؤْذِيكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ أَوْعَيْنِ حَاسِدٍ، اَللّٰهُ يَشْفِيكَ بِاسْمِ اللّٰهِ أَرْقِيكَ " [صحیح مسلم، الطب:۲۱۸۶]

"اللہ کے نام کے ساتھ آپ کو دم کرتا ہوں ہر اس چیز سے جو آپ کو تکلیف دے اور ہر انسان کی شرارت اور حسد کرنے والی آنکھ سے، اللہ آپ کو شفا دے، میں اللہ کے نام سے آپ کو دم کرتا ہوں۔"

نظر بد کا دو طرح سے علاج ہوتا ہے (۱) جسے نظر بد لگی ہے اسے دم کیا جائے (۲) نظر لگانے والے کو چاہیے کہ خود کو دھوئے، پھر اس پانی کو مریض پر ڈال دیا جائے ،نظر بد سے بچنے کے لیے پیشگی احتیاطی تدابیر بھی کی جا سکتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو مندرجہ ذیل کلمات کے ساتھ دم کیا کرتے تھے۔أُعِيذُ كُمَا بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّآمَّةِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَّهَآمَّةٍ وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَّآمَّةٍ "میں تمہیں اللہ کے کلمات تامہ کی پناہ میں دیتا ہوں، ہر شیطان اور زہریلی بلا کے ڈر سے اور ہر لگنے والی نظر بد سے" [ابن ماجہ، الطب:۳۵۲۵]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام کو اسی طرح دم کیا کرتے تھے۔" [صحیح بخاری، احادیث الانبیاء:۳۳۷۱]

الغرض نظر بد برحق ہے اور اس کا علاج ممکن ہے اور اس سے بچنے کے لیے قبل از وقت احتیاطی تدابیر بھی کی جا سکتی ہیں۔

سوال عذاب قبر کے متعلق وضاحت کریں کہ وہ دنیا والی قبر میں ہوتا ہے، اگر اسی قبر میں ہوتا ہے تو جن لوگوں کو خونخوار درندے کھا جاتے ہیں یا جو ڈوب کر یا جل کر مر جاتے ہیں، انہیں کہاں عذاب ہوگا، اس کا جواب تفصیل سے دیں؟

جواب اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے اعتبار سے چار عالم بنائے ہیں۔ پہلا عالم یہ ہے جہاں ان کی ارواح کو پیدا کر کے وہاں رکھا گیا، جسے "عالم ارواح" کہتے ہیں۔ اس عالم میں ارواح کا ذاتی جسم تو ہے لیکن ان کے قرار و سکون کے لیے کوئی وجود نہیں۔ دوسرا عالم جب انہیں عارضی طور پر قرار و سکون کے لیے ایک وجود دیا گیا، اسے "عالم دنیا" کہا جاتا ہے، پھر ایک مقررہ مدت کے بعد انہیں جسم سے الگ کر دیا جائے گا، اسے "عالم برزخ یا عالم قبر" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آخر میں ایک ایسا وقت آئے گا کہ انسانی ارواح کو ان کے اجسام سے ہمیشہ کے لیے پیوست کر دیا جائے گا، اسے "عالم آخرت" کہتے ہیں۔ جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے لیے عارضی طور پر جزا و سزا کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اگر بدکردار ہے تو سزا کا حق دار ہے، بنیادی طور پر سزا روح کو دی جاتی ہے کیونکہ جسم اس روح کا آلہ کار تھا، اس لیے جسم کو بھی اس سزا کا پورا پورا احساس ہوگا۔ مرنے کے بعد جہاں انسان کا جسم پڑا ہے۔ وہی اس کی قبر ہے خواہ اسے کسی گڑھے (قبر) میں دفن کر دیا جائے، یا درندوں کے پیٹ میں ہو یا کسی سمندر کی تہہ میں ہو، قرآن کریم نے بیان کیا ہے کہ مرنے کے بعد انسان کو قبر ملتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اللہ نے انسان کو پیدا کیا، پھر اس کی تقدیر مقرر کی، پھر اس کے لیے راستہ آسان کیا، پھر اسے موت دی اور قبر میں رکھا، پھر جب چاہے گا دوبارہ اٹھا لے گا۔" [۸۰/عبس:۱۹تا۲۲]

چونکہ اکثر انسانوں کو قبر ملتی ہے، اس لیے اکثر احکام اسی قبر سے متعلق ہیں، ہمارے نزدیک جن لوگوں کو یہ قبر ملتی ہے انہیں اسی دنیاوی قبر میں جزا و سزا کا احساس ہوگا، کوئی برزخی قبر اس کے علاوہ نہیں ہے۔ یہ ڈاکٹر مسعود الدین کراچی والے کی دریافت ہے جسے

اَب یقین ہو چکا ہوگا کہ اسی دنیاوی قبر میں جزا وسزا ملتی ہے۔ ہمارے اس دعویٰ (دنیاوی قبر میں سزا و جزا ہوتی ہے) کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ قبرستان کے پاس سے گزرے تو فرمایا کہ ''یہ دونئی قبریں کن کی ہیں؟ انہیں سزا دی جارہی ہے، ان میں ایک چغلیاں کرتا تھا اور دوسرا اپنے پیشاب سے پرہیز نہیں کرتا تھا، انہیں ان جرائم کی پاداش میں عذاب دیا جارہا ہے۔''

[صحیح بخاری، الجنائز، ۱۳۷۸]

یہ حدیث صریح ہے کہ دنیاوی قبر میں ہی جزا وسزا کا سلسلہ جاری ہوتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے کھجور کی ٹہنی کے ٹکڑے انہی دنیاوی قبروں پر گاڑ کر فرمایا تھا: ''امید ہے کہ ان کے خشک ہونے تک اللہ تعالیٰ ان کے عذاب میں تخفیف کریں گے۔'' جن لوگوں کو یہ قبر نہیں ملتی ہے ان کے لیے وہی مقام قبر ہے جہاں ان کے جسم کے ٹکڑے یا ریزے پڑے ہیں۔ اس طرح عقل و نقل میں تطبیق ہو جاتی ہے اور ان میں کوئی الجھن باقی نہیں رہتی۔

سوال بعض دفعہ ایک شیطانی سوال ذہن میں آ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کو پیدا کیا ہے تو آخر اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اس قسم کے خیالات کو کیونکر دور کیا جا سکتا ہے؟

جواب اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک شیطانی سوال اور گمراہ کن وسوسہ ہے۔ حدیث میں اس کی صراحت ہے جب شیطان اس قسم کے سوالات ذہن میں لائے تو انسان کو فوراً اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آ جانا چاہیے۔ یعنی ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ۔'' پڑھنا چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور اگر تمہیں شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پیدا ہو تو فوراً اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ لیا کرو، وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔'' [۴۱/حم السجدہ: ۳۶]

شیطان کے اس مکر و فریب کو دور کرنے کے لیے ہمیں درج ذیل دعا پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے:

''آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ اَللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا اَحَدٌ۔''

''میں اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا، اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، اس نے کسی کو نہیں جنا اور نہ وہ کسی سے جنا گیا اور اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔''

واضح رہے کہ ہماری پیش کردہ گزارشات، مسلم، الایمان: ۳۴۳؛ ابوداود، السنۃ: ۴۷۲۲؛ مسند امام احمد، ص ۳۳۱ ج: ۲ میں آنے والی احادیث کا خلاصہ ہیں۔

سوال قرآنی و غیر قرآنی تعویذ کے متعلق قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب شریعت اسلامیہ نے روحانی اور جسمانی مصائب و آلام سے شفایابی کے لیے دم کرنے اور دم کرانے کو جائز قرار دیا ہے اور اس کی ترغیب دی ہے۔ اس کے متعلق بہت واضح اور صحیح احادیث منقول ہیں کہ رسول اللہ ﷺ خود بھی دم کرتے تھے اور اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے، تعویذات لکھ کر لٹکانے یا اسے دھو کر پینے کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے کوئی اجازت قولی یا عملی منقول نہیں ہے، شرکیہ الفاظ یا مجہول المعنی کو بطور تعویذ استعمال کرنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے، البتہ قرآنی

آیات لکھ کر استعمال کرنے کے متعلق ہمارے اسلاف میں اختلاف رہا ہے۔لیکن ہمارے اس پرفتن دور میں تو اس کے متعلق بہت افراط وتفریط سے کام لیا جاتا ہے،بعض قائلین اور فاعلین تو اسے کاروبار کے طور پر اپنائے ہوئے ہیں اور اس کاروبار کو جائز قرار دینے کے لیے قرآن وحدیث سے دلائل بھی کشید کرتے ہیں،جبکہ اس کے مانعین ومتشددین قرآنی تعویذات کو بھی شرکیہ قرار دے کر انتہا پسندی کا ثبوت دیتے ہیں۔ہمارے نزدیک ایسے حالات میں دم سے بڑھ کر اور کوئی نسخۂ کیمیا نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ خود ایسا کرتے تھے اگر کوئی خود دم نہ کر سکتا ہو تو کسی سے دم کرایا جا سکتا ہے۔اگر دم کرانے کے بھی مواقع میسر نہ ہوں تو قرآنی تعویذات کو عمل میں لایا جا سکتا ہے بشرطیکہ اسے کاروبار یا معمول نہ بنایا جائے،چونکہ ضرورت مند مجبور ہوتا ہے اگر ایسے حالات میں اس کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے تو اندیشہ ہے کہ وہ دین ودنیا لوٹنے والوں کے ہتھے چڑھ جائے گا۔اس قسم کی شدید مجبوری کے پیش نظر اگر تعویذ دینے والا الشفا منجانب اللہ کا عقیدہ رکھتے ہوئے اور حاجت مند کو اللہ تعالیٰ پر اعتماد ویقین کی تلقین کرتے ہوئے قرآنی تعویذ دیتا ہے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں باز پرس نہیں ہوگی اگرچہ بہتر یہی ہے کہ وہ خود دم کرے یا کسی سے دم کرانے کو ہی کافی سمجھے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ایک نمازی آدمی ثواب کی نیت سے لوگوں کی چوری شدہ چیزوں کی نشاندہی کرتا ہے،وہ اس طرح کہ کسی بچے کے ناخن پر سیاہی لگا دیتا ہے،پھر عملیات کے ذریعہ اس سے سوالات کرتا ہے،اس کے متعلق ہماری راہنمائی کریں؟

جواب شرعاً ایسا کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ غیب کی خبریں دینا شیطانی عملیات سے ہوتا ہے،حدیث میں ہے کہ ''جو شخص کسی نجومی یا عرّاف کے پاس گیا اور اس کے قول کی تصدیق کی تو اس نے ان تعلیمات کا انکار کر دیا جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی ہیں۔''

[مسند امام احمد،ص:۴۲۹ج۲]

''عرّاف'' وہ شخص ہے جو خفیہ باتوں کا سراغ لگائے اور قرائن وشواہد سے ان کے معلوم کرنے کا دعویٰ کرے۔چوری اور گمشدہ چیز کی نشاندہی کرنا اسی قسم سے ہے ان حضرات کی اکثر باتیں جھوٹ پر مبنی ہوتی ہیں۔ظن وتخمین سے اپنا دعویٰ مضبوط کرتے ہیں۔ان کا طریقۂ واردات بہت عجیب ہوتا ہے کبھی دھاگہ یا کپڑا پیائش کرتے ہیں،کبھی لوٹا وغیرہ گھماتے ہیں،بعض اوقات پیالے میں پانی بھر کر دیکھتے ہیں،ناخن پر سیاہی لگا کر چوری تلاش کرنے کا بھی دعویٰ کرتے ہیں،ایسا کرنے والا،خواہ کتنا ہی پرہیز گار کیوں نہ ہو اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال کیا ہمیں اپنے گناہوں کی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے وقت رسول اللہ ﷺ کا واسطہ دینا چاہیے؟

جواب وسیلہ اس سبب کو کہتے ہیں جو مطلوب تک پہنچائے،وسیلہ کی دو اقسام ہیں:

(الف) وسیلہ تکوینی: اس سے مراد وہ طبعی سبب ہے جو اپنی فطرت کے اعتبار سے مقصود تک پہنچائے،مثلاً: پانی انسان کو سیراب کرنے کا وسیلہ ہے،اسی طرح سواری ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا وسیلہ ہے۔یہ قسم مؤمن اور مشرک کے مابین مشترک ہے۔

(ب) وسیلہ شرعی: اس سے مراد وہ شرعی سبب ہے جو اس طریقہ کے مطابق منزل مقصود تک پہنچائے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یا اپنے رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے ذریعے سے مقرر فرمایا ہو۔یہ وسیلہ صرف اہل ایمان کے ساتھ خاص ہے جیسا کہ صلہ رحمی،

درازی عمر اور وسعت رزق کا وسیلہ ہے، وغیرہ۔

قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شرعی وسیلہ کی صرف تین صورتیں ایسی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے جائز قرار دیا ہے، ان صورتوں میں اپنے گناہوں کی اللہ سے معافی مانگتے وقت رسول اللہ ﷺ کا واسطہ دینا مشروع نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ ہم براہِ راست اللہ تعالیٰ سے دعا کریں اور طلب حاجات کریں۔ وسیلہ کی جائز اقسام حسب ذیل ہیں:

☆ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ یا صفات کا وسیلہ دے کر دعا کرنا، مثلاً: یوں کہا جائے کہ اے اللہ! تو رحمٰن و رحیم ہے مجھ پر رحم فرما اور مجھے عافیت دے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ کے سب نام اچھے ہیں تو اس کے ناموں سے پکارو۔'' [۷/الاعراف:۱۸۰]

☆ کسی نیک عمل کا وسیلہ دینا، مثلاً: اس طرح کہا جائے: اے اللہ! میں تجھ پر ایمان رکھتا ہوں، تیرے رسول ﷺ کی پیروی کرتا ہوں، ان نیک اعمال کے وسیلے سے میرے گناہ معاف فرما دے۔

اصحابِ غار کا قصہ بھی اسی قبیل سے ہے جنہوں نے اپنے اعمال کا واسطہ دے کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو وہ غار سے بحفاظت نکل گئے تھے۔ (متفق علیہ)

☆ نیک آدمی کی دعا کا وسیلہ: شریعت میں اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ کوئی مسلمان شدید تکلیف کے وقت کسی نیک آدمی سے دعا کا مطالبہ کرے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ سے سخت قحط کے وقت ایک اعرابی نے بارش کے لیے دعا کی اپیل کی تھی۔ [صحیح بخاری]

ان تین وسائل کے علاوہ جتنے وسیلے ہیں وہ ناجائز ہیں، ان کا کتاب وسنت میں کوئی ثبوت نہیں ہے، اس لیے اللہ سے دعا کرتے وقت رسول اللہ ﷺ کا واسطہ نہیں دینا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال حدیث میں ہے کہ اگر میرا بندہ میری طرف ایک قدم آتا ہے تو میں دو قدم اس کی طرف آتا ہوں، اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ صفات باری تعالیٰ کا حقیقی معنی مراد لینا ہی سلف صالحین کا عقیدہ اور طرز عمل ہے۔ اس عقیدہ کی روشنی میں حدیث مذکورہ کا حقیقی معنی کس تناظر میں لیا جائے گا؟

جواب اس حدیث کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بایں الفاظ بیان کیا ہے۔ حدیث میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''میں اپنے بندے سے اس کے گمان کے مطابق برتاؤ کرتا ہوں، جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں، اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں اور جب وہ مجھے کسی مجلس میں یاد کرتا ہے تو میں اس سے بہتر مجلس میں یاد کرتا ہوں، اگر وہ مجھ سے ایک بالشت قریب ہوتا ہے تو میں اس سے ایک ہاتھ قریب ہو جاتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے ایک ہاتھ قریب آتا ہے تو میں اس سے دو ہاتھ قریب ہو جاتا ہوں، اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آجاتا ہوں۔'' [صحیح بخاری، التوحید: ۷۴۰۵]

یہ حدیث اللہ تعالیٰ کی کئی ایک صفات پر مشتمل ہے اور اللہ کی صفات دو طرح کی ہیں۔ ثبوتیہ اور سلبیہ

صفات ثبوتیہ: سے مراد وہ صفات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کے ذریعے اپنے لیے ثابت کی ہیں، جیسے علم اور قدرت وغیرہ۔

صفات سلبیہ: سے مراد وہ صفات ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے خود رسول ﷺ کے ذریعے ان کی نفی کی ہے، جیسے نیند اور تھکاوٹ وغیرہ،

پھر صفات ثبوتیہ کی دو اقسام ہیں:

① ذاتیہ: ذاتیہ سے مراد وہ صفات ہیں جن سے اللہ تعالیٰ ہمیشہ متصف رہتا ہے، جیسے صفتِ علو اور صفتِ عظمت وغیرہ۔

② فعلیہ: فعلیہ سے مراد وہ صفات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مشیّت سے وابستہ ہیں، اگر چاہے تو انہیں کرے اور اگر نہ چاہے تو نہ کرے، جیسا کہ اِسْتِوَاءٌ عَلَی الْعَرْشِ اور نُزُوْلٌ اِلٰی سَمَاءِ الدُّنْیَا۔

آخری قسم کی صفات کو اللہ تعالیٰ کے لیے اس کے شایانِ شان ثابت کیا جائے، اس میں تمثیل یا تکییف کا شائبہ نہیں ہونا چاہیے۔ حدیث مذکورہ میں جو صفات ہیں وہ ثبوتیہ فعلیہ ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی مشیت سے متعلق ہیں۔ شیخ صالح عثیمین رحمہ اللہ اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں کہ اہل سنت والجماعت اور سلف صالحین اس قسم کی نصوص کو ان کے حقیقی اور ظاہری معنی پر ہی محمول کرتے ہیں۔ اور ان صفات کو اللہ رب العزت کے شایانِ شان ثابت کرتے ہیں ان کے لیے کوئی تمثیل یا کیفیت کو متعین نہیں کرتے۔ اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کے قریب ہونے کو بیان کیا گیا ہے وہ اپنے بندے کے جب چاہے جس طرح چاہے قریب ہو سکتا ہے، باوجود اس کے وہ بلند و بالا بھی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا آسمان دنیا کی طرف نزول اور اپنے عرش پر مستوی ہونا ثابت ہے۔

[القواعد المثلی، ص:۷۰]

شیخ عبداللہ غنیمان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے پر جود و کرم بطور تمثیل بیان کیا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر بہت جلد متوجہ ہوتا ہے اور اس پر اپنا فضل و کرم کرنے میں جلدی کرتا ہے باوجود یکہ اس کی عبادت اس کرم و فضل کے مقابلہ میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی، وہ اپنے علاوہ ہر چیز سے بے پروا ہے اور اس کے علاوہ ہر چیز اس کی محتاج ہے۔

[شرح کتاب التوحید، صحیح بخاری، ص:۱۷۱ ج۱]

یہ دونوں بزرگ سرزمین عرب کے نامور علما سے ہیں اور ان کی تمام زندگی درس و تدریس میں گزری ہے، مؤخر الذکر تو سعودی عرب میں ہمارے دوران تعلیم مضمون توحید کے استاد تھے۔ اللہ تعالیٰ ان پر کروٹ کروٹ اپنی رحمت فرمائے، اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے میں نے اس حدیث کی وضاحت میں ان کی تشریحات کو ذکر کر دیا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہم لوگ عام طور پر اسباب اختیار کرنے کو توکل کے منافی خیال کرتے ہیں، کیا ایسا ذہن رکھنا صحیح ہے، اسباب اختیار کرنے کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب مصائب و آلام کے وقت ایک مؤمن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دل کو صرف اللہ کے ساتھ وابستہ رکھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''تمام امور اسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں، لہٰذا تم اس کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ رکھو۔'' [۱۱/ہود:۱۲۳]

''اور اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ نے تلقین کی ہے کہ وہ اپنے ربّ پر بھروسہ رکھیں۔'' [۳/آل عمران:۱۶۰]

جو انسان مشکلات کے وقت اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے کافی ہوگا ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھے گا تو وہ اسے کافی ہوگا یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے کام کو پورا کرنے والا ہے، اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا ایک انداز مقرر فرمایا ہے۔'' [۶۵/الطلاق:۳]

اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور حسن ظن رکھتے ہوئے ایسے اسباب کو اختیار کیا جائے جنہیں اختیار کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

جیسا کہ جب مشرکین نے اہل مدینہ پر چڑھائی کی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ اور اہل مدینہ کی حفاظت کے لیے شہر کے اردگرد خندق کھودی تھی لیکن اسباب اختیار کرنے کی چند ایک اقسام ہیں:

☆ ایسے اسباب اختیار کرنا جو بنیادی طور پر عقیدۂ توحید کے منافی ہیں، مثلاً: ہم دیکھتے ہیں کہ قبروں کے پجاری مصیبت کے وقت اہل قبور سے مدد مانگتے ہیں، ایسا کرنا شرک اکبر ہے، اور ایسے اسباب اختیار کرنے پر اللہ تعالیٰ نے سخت ناراضی کا اظہار کیا ہے اور اسے جہنم کی وعید سنائی ہے۔

☆ سبب پر صرف اتنا ہی اعتماد کیا جائے کہ وہ صرف ایک سبب ہے، ایسے اسباب اختیار کرتے وقت بھی یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ یہ سبب بھی اللہ کی طرف سے ہے۔ وہ چاہے تو اسے باقی رکھے اگر چاہے تو اس کی تاثیر ختم کر دے، ایسے اسباب اختیار کرنا عقیدۂ توحید یا توکل کے خلاف نہیں ہیں۔

بہر حال بیماری اور مصیبت کے وقت شرعی اسباب اختیار کرنے کے باوجود انسان کو چاہیے کہ وہ مکمل طور پر ان اسباب پر انحصار نہ کرے بلکہ انحصار صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو کیونکہ اسباب و ذرائع کا اختیار کرنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، جبکہ آپ کا حقیقی انحصار صرف اللہ پر ہوتا تھا، ہمیں بھی آپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آپ کے اسوۂ مبارکہ کو عمل میں لانا چاہیے، اسباب سے قطع نظر کر کے ہاتھ پاؤں باندھ کر بیٹھ جانا شریعت کے منافی ہے اور اسباب پر کلی انحصار بھی دینِ اسلام کے خلاف ہے۔ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اسباب اور ذرائع اختیار کیے جائیں لیکن آخری بھروسہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات پر ہونا چاہیے کہ وہی اسباب میں تاثیر پیدا کرنے پر قادر ہے اگر چاہے تو ان اسباب سے تاثیر سلب کر دے۔ [واللہ اعلم]

سوال میرے دل میں اللہ تعالیٰ، اس کے رسول (ﷺ) اور اس کی کتاب کے متعلق بہت بُرے بُرے خیالات آتے ہیں، نماز وروزہ میں پابندی سے کرتی ہوں لیکن یہ بُرے خیالات میرا پیچھا نہیں چھوڑتے، اس سلسلے میں بہت پریشان ہوں، ان سے نجات کے لیے کوئی نسخہ تحریر کریں؟

جواب شیطان کا یہ ایک حربہ ہے کہ وہ بُرے خیالات کے ذریعے اہل ایمان پر حملہ کرتا ہے، قرآن پاک نے اس کے طریقۂ واردات سے ہمیں بایں الفاظ آگاہ کیا ہے:

''وہ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا رہتا ہے۔'' [۱۱۴/الناس:۵]

ان وساوس سے شیطان کا مقصد یہ ہے کہ وہ اہل ایمان کے عقیدے کو خراب کر دے اور انہیں نفسیاتی اور فکری اضطراب میں مبتلا کر دے، یہ سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی اس طرح کی باتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، لیکن وہ ایسے خیالات کے مقابلہ میں استقامت اور عمل کے پہاڑ ثابت ہوئے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ! ہم اپنے دلوں میں کچھ ایسی باتیں پاتے ہیں کہ انہیں زبان پر لانا بھی ہمارے لیے بہت گراں ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا: ''کیا تم اس چیز کو پاتے ہو؟'' انہوں نے جواب دیا: ہاں، آپ نے فرمایا: ''یہی تو خالص اور صحیح ایمان ہے۔'' [صحیح مسلم، الایمان:۱۳۲]

اس کا مطلب یہ ہے کہ چور اور ڈاکو اس گھر میں حملہ آور ہوتے ہے جہاں خزانہ ہوتا ہے، اسی طرح شیطان بھی ڈاکہ زنی کے لیے ایسے دلوں کا انتخاب کرتا ہے جہاں دولت ایمان ہوتی ہے، اس لیے وسوسوں سے ڈرنے والا انسان بہت ہی نصیب والا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا علاج بھی تجویز کیا ہے، جیسا کہ درج ذیل حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں کسی کے پاس شیطان آ کر کہتا ہے کہ مخلوق کو اس انداز سے کس نے پیدا کیا حتی کہ وہ وسوسہ اندازی کرتا ہے کہ تیرے رب کو کس نے پیدا کیا؟ جب معاملہ یہاں تک پہنچ جائے تو اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگے اور آگے بڑھنے سے رک جائے۔'' [صحیح بخاری، بدء الخلق: ۳۲۷۶]

اس کے علاج کے لیے حسب ذیل چیزوں کو عمل میں لایا جائے۔

''اعوذ باللہ'' پڑھ کر ان خیالات کو جھٹک دیا جائے اور ضبط سے کام لیا جائے۔

☆ ایسے حالات میں اپنے آپ کو اللہ کی عبادت اور اس کے ذکر اور فکر آخرت میں مصروف کر لیا جائے۔

☆ اللہ تعالیٰ سے دلجمعی کے ساتھ دعا کی جائے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے ہمیں اپنی پناہ میں رکھے۔ بہر حال ایسے خیالات کا آنا خالص ایمان کی علامت ہے اور اس کا علاج یہ ہے کہ ایسے خیالات کو ترک کر کے اللہ کی پناہ میں آ جائے اور خود کو اللہ کی عبادت میں مصروف کر دے۔ [واللہ اعلم]

سوال دجال کی کیا حقیقت ہے؟ کیا اس کا حقیقت سے کوئی تعلق ہے یا محض وہم اور خیال ہے، ہم نے سنا ہے کہ اس دجال سے ہر نبی نے خبردار کیا ہے، اس کے متعلق وضاحت کریں؟

جواب دجال ''دجل'' سے ماخوذ ہے، اس کا معنی حقائق کا چھپانا اور دھوکہ دینا ہے اور دجال، مبالغے کا صیغہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی دھوکہ باز نہیں ہے، یہ لوگوں کو سب سے زیادہ فریب دینے والا ہے، دجال کا فتنہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر قیامت تک برپا ہونے والے فتنوں میں سب سے بڑا فتنہ دجال کا ہوگا، رسول اللہ ﷺ ہر نماز میں اس سے پناہ مانگتے تھے آپ اس طرح دعا کرتے:

''اے اللہ! میں تیری پناہ لیتا ہوں جہنم کے عذاب سے اور تیری پناہ لیتا ہوں قبر کے عذاب سے اور تیری پناہ لیتا ہوں کانے دجال کے فتنے سے اور تیری پناہ لیتا ہوں زندگی اور موت کے فتنے سے۔'' [سنن ابن ماجہ، الدعاء: ۳۸۴۰]

اس فتنے کا اندازہ اس امر سے لگایا جاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک آنے والے ہر نبی نے اپنی قوم کو اس دجال سے خبردار کیا ہے۔ کیونکہ یہ بہت ہولناک فتنہ ہے، اس دجال اکبر سے پہلے چھوٹے چھوٹے دجال پیدا ہوں گے جو اس دجال اکبر کے لیے زمین ہموار کریں گے اور فضا کو سازگار کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر دجال اکبر میری موجودگی میں برآمد ہوا تو تمہارے بجائے میں خود اس سے نمٹ لوں گا اور اگر میری عدم موجودگی میں آیا تو پھر ہر آدمی اپنی طرف سے خود اس کا مقابلہ کرے گا اور ہر مسلمان پر میری طرف سے اللہ نگہبان ہے۔'' [صحیح مسلم، الفتن: ۲۹۳۷]

دجال اکبر کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام قتل کریں گے اور وہ خود عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر اس طرح پگھل جائے گا جس طرح نمک پانی میں حل ہو جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مہدی کا وقت ایک ہے۔ دجال اکبر بھی دونوں حضرات کی موجودگی میں برآمد ہوگا،

دجال چالیس دن اس زمین میں اپنی فتنہ انگیزی کرے گا، روئے زمین کا ان چالیس دنوں میں چکر لگائے گا، اس کے ہاتھوں متعدد خرق عادت چیزوں کا ظہور ہوگا۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی خصوصیت ہے کہ وہ ان مقامات میں نہیں جا سکے گا۔ مدینہ کے باہر ڈیرہ لگائے گا، پھر اہل مدینہ میں سے بے شمار منافقین اس کے ساتھ شامل ہو جائیں گے، ایران کے شہر اصفہان کے ستر ہزار یہودی بھی اس کے ساتھ شامل ہوں گے۔ بہرحال بڑی تیزی کے ساتھ دجال اکبر کے برآمد ہونے کے لیے زمین ہموار ہو رہی ہے، بس ہمیں اپنے اللہ کی پناہ میں رہنا چاہیے اور اس کا ظہور ایک حقیقت ہے، اسے وہم یا خیال سمجھ کر نظر انداز کرنا عقل مندی نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]
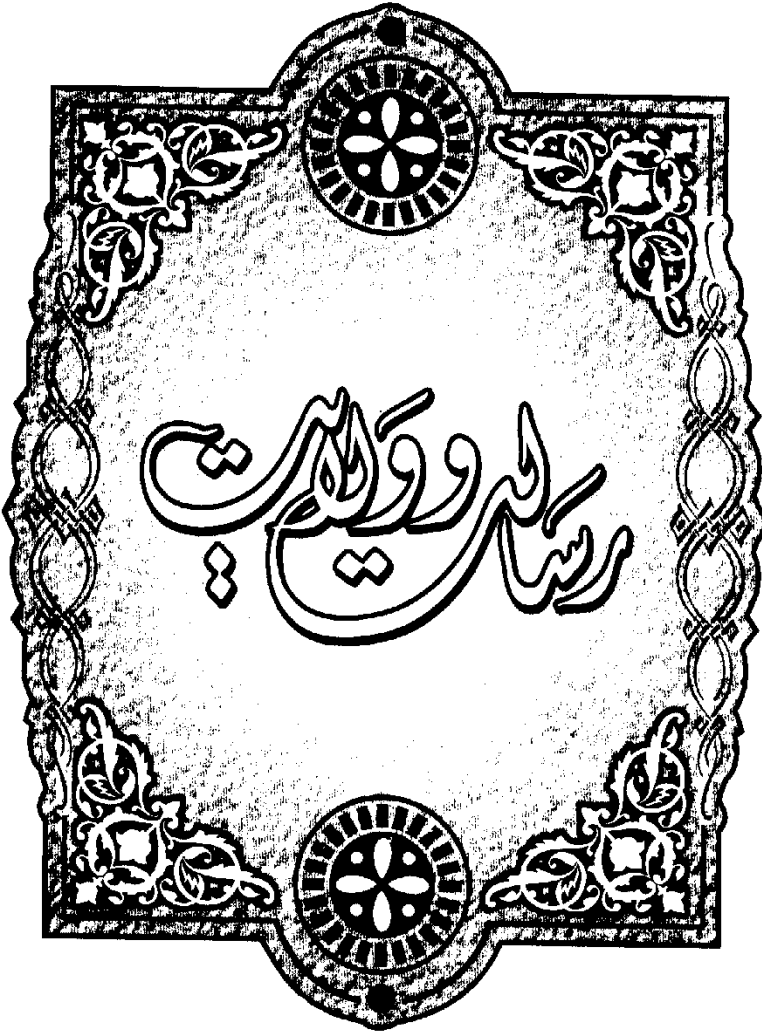
رسالت وولایت

رسالت وولایت

سوال ''نماز نبوی صحیح احادیث کی روشنی میں'' نامی کتاب کے ص:۱۲۷ میں لکھا ہے کہ آپ بلحاظ خلقت ''نور من نور اللہ'' تھے، اس کی وضاحت کریں؟

جواب اس کتاب کے حاشیہ میں معجزہ یا کرامت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے نقل کیا ہے کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ اپنے بستر سے اٹھ کر باہر چلے گئے، امی عائشہ رضی اللہ عنہا بھی ان کے پیچھے باہر نکل گئیں، آپ نے بقیع الغرقد پہنچ کر دعائے مغفرت کی اور واپس آ گئے، امی عائشہ رضی اللہ عنہا آپ سے پہلے بستر پر پہنچ گئیں لیکن سانس پھولی ہوئی تھی، رسول اللہ ﷺ نے وجہ دریافت کی تو آپ نے ٹالنا چاہا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عائشہ! بتا دو وگرنہ میرا اللہ مجھے بتا دے گا۔'' اس پر عائشہ رضی اللہ عنہا نے ساری بات بتا دی۔ [صحیح مسلم، الجنائز:۹۷۴]

اس سے معلوم ہوا کہ گھر سے نکلتے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو معلوم نہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کدھر اور کیوں جا رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو بھی معلوم نہ ہوا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا بھی میرے پیچھے گئی تھیں؟ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد حاشیہ میں لکھا ہے: ''اس واقعہ سے یہ غلط فہمی بھی دور ہو جانی چاہیے کہ آپ چونکہ بلحاظ خلقت نور من نور اللہ تھے، لہٰذا رات کو آپ کی موجودگی میں گمشدہ سوئی بھی نظر آ جاتی تھی، چراغ جلانے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔'' (نماز نبوی، ص:۱۲۷) اس عبارت میں کوئی الجھن نہیں ہے صرف اسے سیاق و سباق کو ساتھ ملا کر پڑھنے کی ضرورت ہے۔

سوال ڈنمارک وغیرہ میں رسول اللہ ﷺ کے گستاخانہ خاکے شائع ہوئے ہیں، ردعمل کے طور پر پوری امت مسلمہ میں اضطراب پایا جاتا ہے، کتاب و سنت کی روشنی میں ہمارے لئے کیا ہدایات ہیں؟

جواب ہمارے نزدیک رسول اللہ ﷺ سے محبت کرنا جزو ایمان ہے۔ جس شخص کو رسول اللہ ﷺ سے پیار اور تعلق خاطر نہیں وہ سرے سے مؤمن ہی نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''تم میں سے کوئی اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اس کے والدین اور اولاد حتی کہ تمام لوگوں سے محبوب نہ ہو جاؤں۔'' [صحیح بخاری، الایمان:۱۵]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے ''رسول اللہ ﷺ سے محبت ایمان کا حصہ ہے۔'' اس کے برعکس ہر وہ قول و عمل اور عقیدہ نواقضِ ایمان سے ہے جو رسالت اور صاحب رسالت سے بغض اور ان کے متعلق طعن و تشنیع پر مشتمل ہو۔ کیونکہ اس سے کلمۂ شہادت کے دوسرے جزو کا انکار لازم آتا ہے اور ایسا کرنے سے وہ گواہی کالعدم ہو جاتی ہے جس کے ذریعے انسان اسلام میں داخل ہوا تھا۔ ہمارے نزدیک اس انکار و تنقیص کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

☆ رسول اللہ ﷺ کی ذات ستودہ صفات کو ہدف تنقید بنانا۔

☆ آپ کی لائی ہوئی شریعت کے کسی حصہ کا انکار یا اس پر طعن کرنا۔

رسول اللہ ﷺ کی ذات کو ہدف تنقید بنانے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے صدق و امانت اور عفت و عصمت کے متعلق حرف

گیری کرنا یا آپ کی ذات عالی صفات کے ساتھ کسی بھی پہلو سے استہزاء وتمسخر کرنا یا آپ کو گالی دینا اور آپ کو برا بھلا کہنا الغرض آپ کی شخصیت پر کسی بھی پہلو سے اعتراض کرنا اس میں شامل ہے۔ لیکن اہل مغرب نے یہودی لابی اور امریکی استعمار کے اشارے پر اسلام اور اہل اسلام کے خلاف مذموم تہذیبی جنگ شروع کر رکھی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے تہذیب وشائستگی کی تمام حدود کو پامال کر دیا ہے۔ پہلے قرآن کریم کی بے حرمتی کر کے پوری امت مسلمہ کے جذبات کو مجروح کیا اور اب رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے مذموم خاکے اور کارٹون شائع کر کے شرمناک حرکت کر ڈالی ہے۔ اس سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات کو مجروح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آپ کا کارٹون بنا کر آپ کی پگڑی یا ٹوپی میں بم نصب کر کے دنیا کو یہ باور کرایا جائے کہ نعوذ باللہ مسلمانوں کے اولین رہنما دہشت گردی اور تخریب کاری کے علمبردار ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ جرم معافی کے قابل نہیں کہ معذرت کرنے سے اس کی تلافی ہو جائے بلکہ ایسے لوگ قابل گردن زدنی ہیں۔ مسجد حرام کے امام وخطیب فضیلۃ الشیخ عبدالرحمٰن السدیس حفظہ اللہ نے اپنے ۱۰ فروری کے خطبہ میں بجا فرمایا ہے کہ توہین رسالت کے مجرمین کو قرار واقعی سزا دی جائے، کیا آزادی اظہار کا مطلب یہ ہے کہ اسلام اور اہل اسلام کی توہین وتضحیک کی جائے، انہوں نے مطالبہ کیا کہ عالمی سطح پر ایسے قوانین بنائے جائیں کہ رسول اللہ ﷺ اور دیگر مقدسات اسلام کی توہین کو جرم قرار دیا جائے اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں توہین رسالت کا جرم معمولی نہیں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''بلاشبہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں، ان پر دنیا وآخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت اور قیامت کے دن ان کے لئے رسوا کن عذاب مہیا کیا جائے گا۔'' [۳۳/الاحزاب:۵۹]

غزوۂ تبوک کے سفر میں منافقین نے آپس میں اسلام اور اہل اسلام کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا، کبھی رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرتے، رسول اللہ ﷺ کو بذریعہ وحی اس کی اطلاع مل جاتی، جب آپ ان سے طلبی فرماتے تو کہتے کہ ہم تو صرف سفر کی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دل بہلانے کے لئے صرف ایسی باتیں ہی رہ گئی ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کی ذات ستودہ صفات کو ملوث کیا جائے، کسی اور چیز سے تمہاری دل لگی نہیں ہوتی، قرآنی آیات ملاحظہ کریں: ''اور اگر آپ ان سے دریافت کریں (کہ کیا تم ایسی باتیں کرتے ہو) تو کہیں گے ہم تو صرف مذاق اور دل لگی کر رہے تھے۔ کہہ دیجئے: کیا تمہاری ہنسی اور دل لگی اللہ، اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ ہی ہوتی ہے؟ بہانے نہ بناؤ تم واقعی ایمان لانے کے بعد کافر ہو چکے ہو۔'' [۹/التوبہ:۶۵۔۶۶]

اس نص صریح سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات اور شعائر اسلام کو اپنے مذاق کا موضوع بنانا بہت خطرناک عمل ہے۔ اس راستہ پر چل کر انسان براہ راست کفر تک پہنچ سکتا ہے۔ کتب حدیث میں متعدد ایسے واقعات مروی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق گستاخی کے مرتکب کو فوراً جہنم واصل کر دیا گیا اور اسے کیفر کردار تک پہنچانے والے سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کی گئی، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی توہین کیا کرتی تھی، اسے ایک شخص نے قتل کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے خون کا بدلہ، قصاص یا دیت کسی بھی صورت میں نہیں دلوایا۔ [ابوداود، الحدود:۴۳۶۲]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس واقعہ کی تفصیل بایں الفاظ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک نابینا شخص تھا، اس کی لونڈی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتی اور آپ کی ذات کے متعلق حرف گیری کرتی تھی۔ اس کا مالک نابینا شخص اسے منع کرتا اور سختی سے روکتا تھا لیکن وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر قائم رہتی۔ ایک رات ایسا ہوا کہ وہ حسب عادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دینے لگی اور آپ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا تو اس غیرت مند نابینے شخص نے گھر میں پڑی ہوئی کدال اٹھائی اور اسے اس لونڈی کے پیٹ پر رکھ کر اوپر سے دبا ڈالا، جس سے اس کا پیٹ پھٹ گیا اور وہ مرگئی۔ صبح کے وقت جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا: ''میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ رات جو واقعہ ہوا ہے اس کا مرتکب سامنے آ جائے۔'' وہ نابینا شخص کھڑا ہوا اور ہانپتا کانپتا گرتا پڑتا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا: یارسول اللہ! میں نے اسے قتل کیا ہے، اس قتل کی وجہ یہ تھی کہ لونڈی آپ کو گالیاں دیتی تھی اور آپ کو برا بھلا کہتی تھی، میرے بار بار کہنے اور سمجھانے پر باز نہیں آتی تھی، اس کے بطن سے میرے موتیوں جیسے دو خوبصورت بیٹے بھی پیدا ہوئے ہیں، آج رات اس نے پھر وہی نازیبا حرکت کر ڈالی، مجھے غیرت آئی اور میں نے اسے قتل کر دیا۔ واقعہ سننے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم سب گواہ رہو! اس کا قتل ضائع اور خون رائیگاں ہے، اس کا کوئی بدلہ نہیں دیا جائے گا۔'' [ابوداؤد، الحدود: ۴۳۶۱]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ موقف تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی کرنے والے کی سزا قتل ہے اور اس کا خون ضائع ہے، چنانچہ حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم ایک دفعہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مجلس میں تھے کسی بات پر آپ کو ایک شخص کے متعلق غصہ آیا، پھر آپ کا غصہ زیادہ ہونے لگا۔ میں نے عرض کیا: اگر آپ مجھے اجازت دیں تو اسے قتل کر دوں؟ جب میں نے اسے قتل کرنے کا عندیہ دیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجلس کو برخواست کر دیا، جب لوگ منتشر ہو گئے تو آپ نے مجھے بلایا اور فرمایا کہ اس وقت تو نے کیا کہا تھا، میرے ذہن سے یہ واقعہ محو ہو چکا تھا، ان کے یاد دلانے پر مجھے یاد آیا، آپ نے فرمایا کہ واقعی تو نے اسے قتل کر دینا تھا، میں نے عرض کیا کہ اگر آپ مجھے اجازت دیتے تو میں نے ضرور اسے قتل کر دینا تھا آپ اگر اب بھی مجھے حکم دیں تو اسے کیفر کردار تک پہنچا سکتا ہوں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ منصب صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ آپ کے حق میں گستاخی کرنے والے کو قتل کر دیا جائے آپ کے بعد کسی اور کے لئے نہیں ہے۔ [نسائی، المحاربہ: ۴۰۸۲]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاں یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی کرنا ایک جرم ہے کہ اس کے مرتکب کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ اسے فوراً کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ کعب بن اشرف یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف توہین آمیز اشعار کہتا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اس کعب کو کون قتل کرے گا؟'' حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس کام کو میں خود سرانجام دوں گا، چنانچہ اسے قتل کر دیا گیا جس کی تفصیل بخاری شریف میں ہے۔ [صحیح بخاری، المغازی: ۴۰۳۷]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق بھی روایات میں ہے کہ انہوں نے بھی اپنے غلام کو قتل کرا دیا تھا کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف گستاخی کا ارتکاب کرتا تھا۔ [مصنف عبدالرزاق، ص: ۳۰۷، ج ۵]

لیکن ہمارے ہاں جو احتجاج کی صورت ہے کہ نجی اور سرکاری املاک کو نقصان پہنچایا جائے، اسے کسی طور پر بھی مستحسن قرار نہیں

دیا جاسکتا، البتہ جن ممالک میں رسول اللہ ﷺ کی توہین پر مشتمل خاکے شائع ہوئے ہیں ان کی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا جائے اور حکومت پاکستان کو چاہیے کہ ان ممالک سے اپنے سفارتی تعلقات ختم کرے اور اپنے ملک سے ان کے نمائندوں اور سفیروں کو واپس بھیج دیا جائے، عوام الناس کو بھی چاہیے کہ اپنے غم وغصہ کا اظہار ضرور کریں لیکن توڑ پھوڑ اور نعرے بازی کی سیاست محض دکھلاوے کی چیزیں ہیں ان سے قطعی طور پر اجتناب کیا جائے، ایسے کام کرنے سے یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ اہل اسلام واقعی متشدّد اور تخریب کار ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تشدد پر مبنی اس قسم کے واقعات ایجنسیوں کے ذریعے سرانجام پاتے ہیں اور انہیں مسلمانوں کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ بہرحال رسول اللہ ﷺ کی گستاخی ایک ناقابل معافی جرم ہے اور اس کے متعلق جس قدر بھی غم وغصہ کا اظہار کیا جائے وہ ہمارے ایمان کا تقاضا ہے لیکن توڑ پھوڑ سے اجتناب کرنا چاہیے۔

سوال رسول اللہ ﷺ پر درود وسلام بھیجنے کا کیا طریقہ ہے اور اس کے کیا الفاظ ہیں، کیا رسول اللہ ﷺ ہمارے درود وسلام کو سنتے اور اس کا جواب بھی دیتے ہیں وضاحت فرمائیں؟

جواب ہر مؤمن کو رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے ایمان کی دولت نصیب ہوئی اور ایمان اتنی بڑی نعمت ہے کہ دین ودنیا کی کوئی نعمت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی اور نہ ہی کوئی مؤمن اس نعمت کا احسان اتار سکتا ہے، تاہم اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے یہ ضرور مطالبہ کیا ہے کہ وہ اپنے محسن اعظم کی محبت سے سرشار ہوکر اس کے حق میں دعائے رحمت وبرکت ضرور کیا کریں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے رسول اللہ ﷺ پر درود وسلام بھیجتے ہیں اے ایمان والو! تم بھی اس پر درود وسلام بھیجا کرو۔'' [۳۳/ الاحزاب:۵۶]

رسول اللہ ﷺ پر سلام بھیجنے کی بایں الفاظ تعلیم دی گئی:

''اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ'' ''یعنی نبی کریم ﷺ! آپ پر اللہ تعالیٰ کی سلامتی اور رحمت و برکت ہو۔''

چنانچہ حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: یارسول اللہ! آپ پر سلام بھیجنا تو ہم کو معلوم ہوگیا آپ پر درود کیسے بھیجیں؟ آپ نے فرمایا یوں کہو ''اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰی اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَجِيْدٌ ۝ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰی اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَجِيْدٌ۔'' [صحیح بخاری، الانبیاء: ۳۳۷۰]

اس لئے مسنون سلام وہی ہے جو ہم تشہد میں پڑھتے ہیں اگر کوئی زیادہ حساس طبیعت کا حامل ہے تو وہ ''اَلسَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ'' کہہ لیا کرے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب تک بقید حیات تھے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خطاب کے صیغہ سے سلام کہتے تھے آپ کے انتقال کے بعد ''اَلسَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ'' کہنے لگے۔

[صحیح بخاری، الاستیذان: ۶۲۶۵]

اور درود بھی مسنون ہی پڑھا جائے جسے درود ابراہیمی کہا جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ ہمارے درود وسلام کو سنتے نہیں ہیں بلکہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرشتے تعینات کر رکھے ہیں جو رسول

اللہ ﷺ کو امت کی طرف سے درود وسلام پہنچاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی طرف سے زمین پر گھومنے پھرنے والے فرشتے تعینات ہیں جو میری امت کا سلام مجھے پہنچاتے ہیں۔'' [مستدرک حاکم، ص:۴۲۱، ج۲]

اس طرح درود بھی فرشتوں کے ذریعے آپ کو پہنچایا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت حسن اور انس رضی اللہ عنہما سے مروی روایات سے معلوم ہوتا ہے، آپ نے فرمایا کہ ''جہاں سے چاہو مجھ پر درود پڑھو وہ مجھے پہنچ جاتا ہے۔'' [مجمع الزوائد]

اس سلسلہ میں جو روایت پیش کی جاتی ہیں کہ ''جو انسان میری قبر کے پاس کھڑا ہو کر مجھ پر درود وسلام پڑھتا ہے اسے میں خود سنتا ہوں اور جو میری قبر سے دور رہ کر درود پڑھتا ہے وہ مجھے پہنچایا جاتا ہے۔'' محدثین کے فیصلہ کے مطابق یہ حدیث خود ساختہ اور موضوع ہے۔ [سلسلہ الاحادیث الموضوعۃ: نمبر۲۰۳]

یہ اس لئے بھی صحیح نہیں ہے کہ دنیا سے رخصت ہونے کے بعد انسان عالم برزخ میں پہنچ جاتا ہے اور برزخی احوال ومعاملات کو دنیاوی معاملات پر قیاس نہیں کرنا چاہیے، بہر حال رسول اللہ ﷺ ہمارے درود وسلام کو براہ راست ہم سے نہیں سنتے ہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے بعد میں آنے والے مسلمانوں کو بھائی کہا ہے اور ان سے ملنے کی خواہش کی ہے، پوری حدیث اور اس کا حوالہ درکار ہے؟

جواب یہ الفاظ ایک طویل حدیث کا حصہ ہیں، رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ قبرستان تشریف لے گئے' وہاں مسنون دعا پڑھی اور فرمایا: ''میں اپنے بھائیوں کو دیکھنا چاہتا ہوں'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''تم میرے صحابہ ہو' ہمارے بھائی وہ ہیں جو ابھی پیدا نہیں ہوئے وہ بعد میں آئیں گے۔'' [صحیح مسلم، الطہارۃ:۳۹]

ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ ''میرے بھائی وہ ہیں جو میرے بعد آئیں گے۔'' [ابن ماجہ، الزھد:۴۳۰۶]

لیکن اس حدیث کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا مرتبہ اور مقام بڑے بھائی جتنا ہے، جیسا کہ اہل بدعت شور وغوغا کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہمیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے، آپ کی ذات کا جو مقام ہے آپ کے فرمودات کا اس سے کم نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''بلاشبہ نبی اہل ایمان کے لئے ان کی اپنی ذات سے بھی مقدم ہے۔''

[۳۳/الاحزاب:۶]

یعنی جس قدر وہ اپنی جان کے لئے خیر خواہ ہو سکتے ہیں رسول اللہ ﷺ اس سے بھی زیادہ ان کے لئے خیر خواہ ہیں، دوسرا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا حق اہل ایمان پر ان کی اپنی جان سے بھی زیادہ ہے۔

سوال میں نے کسی عالم دین سے سنا ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے دو دفعہ اللہ تعالیٰ کا اور زندگی میں متعدد مرتبہ بحالت خواب رسول اللہ ﷺ کا دیدار کیا ہے، کیا یہ ممکن ہے؟

جواب بحالت بیداری اس عالم رنگ وبو میں اللہ تعالیٰ کو کوئی نہیں دیکھ سکتا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک دفعہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''آپ مجھے نہیں دیکھ سکتے، آپ پہاڑ کی طرف دیکھیں اگر وہ اپنی جگہ پر جما رہا تو آپ مجھے دیکھ سکیں گے، جب اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے۔''

[۷/الاعراف:۱۴۳]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جو کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا ہے تو اس نے جھوٹ بولا کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''نظریں اسے نہیں پاسکتیں جبکہ وہ نظروں کو پالیتا ہے۔'' [۶/الانعام:۱۰۳][صحیح بخاری،التوحید:۷۳۸۰]

البتہ قیامت کے دن اہل ایمان رؤیت باری تعالیٰ کا شرف ضرور حاصل کریں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''بہت سے چہرے اس دن پر رونق اور اپنے رب سے محو دیدار ہوں گے۔'' [۷۵/القیامۃ:۲۲۔۲۳]

چونکہ حضرات انبیا علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی معرفت کاملہ حاصل ہوتی ہے، اس بنا پر یہ حضرات اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کو بحالت خواب دیکھ سکتے ہیں، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا ہے کہ ''آپ نے نیند کی حالت میں اپنے رب کو بڑی خوبصورت شکل میں دیکھا۔'' [مسند امام احمد،ص:۳۶۸،ج۱]

اسی طرح کی ایک روایت حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ [جامع ترمذی،تفسیر قرآن:۳۲۳۵]

حضرات انبیا علیہم السلام کے علاوہ دیگر صلحا و اتقیا کو خواب میں رب کائنات کا نظر آنا، اس کے متعلق ہمیں تردد ہے اگرچہ امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ جس نے اپنے رب کو خواب میں دیکھا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ [دارمی،کتاب الرؤیا]

بہرحال اس طرح کی روایات کی آڑ میں اپنی خواہشات کے پجاری لوگوں نے شریعت سے راہِ فرار اختیار کرنے کے لئے ایک چور دروازہ تلاش کیا ہے جسے وہ اپنی اصطلاح میں ''مکاشفات'' کا نام دیتے ہیں، البتہ انبیائے کرام کو روحانی قوت کی بنا پر خواب میں اس بات کا ادراک ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے رب کو ہی دیکھ رہے ہیں جبکہ عام انسان اس اعزاز سے قطعی محروم ہوتے ہیں، لہٰذا اس سلسلہ میں احتیاط کی انتہائی ضرورت ہے۔ البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ اس کے برعکس ہے آپ کی زیارت خواب میں ممکن ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خنداں رخ انور، حسین و جمیل قد و قامت، بے مثال خد و خال، بے نظیر ڈھال اور باوقار پرکشش وجاہت و شخصیت کا جو عکس الفاظ کے پیرایہ میں ہم تک پہنچا ہے، اس سے واقف ہو۔ آپ کے حلیۂ مبارک سے آگاہ ہو، صرف حسنِ عقیدت ہی نہیں بلکہ شرعی تقاضا بھی ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''چونکہ شیطان میری صورت نہیں اختیار کرسکتا، اس لئے جو مجھے خواب میں دیکھتا ہے وہ درحقیقت مجھ ہی کو دیکھتا ہے۔'' [مسند امام احمد،ص:۳۶۱،ج۱]

اس حدیث کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کرنا بہت بڑی سعادت ہے اگر امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جیسے محبّ رسول اور آپ کی اداؤں سے والہانہ عقیدت رکھنے والوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے تو کوئی ناممکن بات نہیں ہے اگرچہ زیارت نبوی کا دعویٰ کرنے والے بعض ایسے لوگ بھی سامنے آتے ہیں جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و صورت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اگر قارئین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیۂ مبارک کی دل آویزی اور حسن و رعنائی کو الفاظ میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں تو شیخ ابراہیم بن عبداللہ الحازمی کی کتاب ''الرسول كأنك تراه'' کا مطالعہ کریں جسے بندہ آثم راقم الحروف نے ''آئینہ جمال نبوت'' کے نام سے اردو میں ڈھالا ہے اور مکتبہ دارالسلام لاہور نے اسے انتہائی خوبصورت انداز میں شائع کیا ہے۔

سوال آج کل ایک ایسے گروہ نے جنم لیا ہے جو اپنے ہاں ایک خود ساختہ خلیفہ سے بیعت کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ آپ

سے استدعا ہے کہ خلیفہ برحق کی علامتیں اور شناخت سے آگاہ فرمائیں، نیز بتائیں کہ اس کا تعین کیونکر ممکن ہوسکتا ہے؟

جواب شرعی خلیفہ کے لئے مندرجہ ذیل علامتوں کا ہونا ضروری ہے:

① وہ قریشی ہو بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ اقامت دین کے لئے سرگرم عمل ہو۔

② جسمانی اور علمی طور پر انتہائی مضبوط ہو۔

③ اللہ تعالیٰ کی حدود کو عملاً نافذ کرنے کی اپنے اندر ہمت رکھتا ہو۔

④ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے میں بااختیار ہو۔

⑤ امت مسلمہ نے اسے اپنے ہاں شرف قبولیت سے نوازا ہو، یعنی وہ خود ساختہ نہ ہو۔

ایسا نہیں کہ کسی غیر ملک میں بیٹھ کر وہ سیاسی پناہ لے لے اور وہاں اپنی خلافت کا دعویٰ کر دے اور اپنے قریشی ہونے کا اعلان کر کے دیگر ممالک میں حصول بیعت کے لئے اپنے نمائندگان مقرر کر دے تاکہ بغاوت کی فضا سازگار کی جائے اور اس کے مقرر کردہ نمایندے شہر اور دیہاتوں میں پھیل جائیں اور خود ساختہ خلیفہ کی بیعت لیتے پھریں۔ ہمارے نزدیک یہ کھلی بغاوت ہے جس کی شریعت ہمیں اجازت نہیں دیتی۔ حکومت وقت کو چاہیے کہ وہ ایسے لوگوں کا سختی سے نوٹس لے، ایسا کرنا رسول اللہ ﷺ کے منہج اور طریقۂ کار کے خلاف ہے۔ پرفتن حالات میں زندگی بسر کرنے کے لئے ہمیں رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے راہنمائی ملتی ہے، چنانچہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''ایسے حالات میں مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام سے چمٹے رہنا چاہیے۔'' حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کی جماعت اور ان کا امام نہ ہو تو کیا کیا جائے؟ آپ نے فرمایا: ''ایسے حالات میں تمام فرقوں سے الگ رہنا، خواہ تمہیں جنگل میں درختوں کی جڑیں چبا کر ہی گزر اوقات کرنا پڑے تا آنکہ تمہیں اسی حالت میں موت آ جائے۔'' [صحیح بخاری، کتاب الفتن، حدیث نمبر:۷۰۸۴]

حدیث میں ہے کہ جب عبداللہ بن زیاد اور مروان بن حکم نے شام میں' حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے مکہ مکرمہ میں اور خوارج نے بصرہ میں اپنی اپنی حکومتوں کا اعلان کیا تو ابو المنہال اپنے باپ کے ہمراہ حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ کے پاس گئے، میرے باپ نے ان سے عرض کیا:

اے ابو برزہ رضی اللہ عنہ! آپ نہیں دیکھتے کہ لوگ کس قسم کے اختلاف میں الجھے ہوئے ہیں، ایسے حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

آپ نے فرمایا: میں قریش کے لوگوں سے ناراض ہوں اور میری ناراضی اللہ کی رضا کے لئے اور مجھے اس ناراضی سے اجر ملنے کی امید ہے۔

عرب کے لوگو! تم جانتے ہو تمہارا پہلے کیا حال تھا، تم سب گمراہی میں گرفتار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دین اسلام اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کے ذریعے اس بری حالت سے نجات دی، پھر تم مقام عزت پر فائز ہو گئے۔ آج تمہیں اس دنیا نے خراب کر دیا ہے یہ سب بزعم خویش خلفائے دنیا کے لئے آپس میں دست وگریبان ہیں اور ایک دوسرے سے قتال کر رہے ہیں۔

[صحیح بخاری، الفتن:۷۱۱۲]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ آج ہمیں کتاب وسنت کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیے۔ جب کبھی حالات سازگار ہو جائیں کہ کتاب وسنت کے علمبردار باہمی اتحاد واتفاق سے کسی بااختیار خلیفہ پر متفق ہو جائیں تو اس کی بیعت کے لئے تحریک چلانا مناسب اور باعث اجر وثواب ہے۔ لیکن کسی خود ساختہ خلیفہ کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں اور نہ ہی کسی نے اسے دیکھا ہے، اس کی خلافت کے لئے بیعت لینا، فضا سازگار کرنا، تحریک چلانا اور حکومتِ وقت کے خلاف ایک کھلی بغاوت ہے جس کی شریعت ہمیں اجازت نہیں دیتی۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال محفل میلاد کی شرعی حیثیت واضح کریں، ہمارے ہاں اسے بڑے اہتمام سے منایا جاتا ہے، اشتہارات میں لکھا ہوتا ہے جشن میلاد مناؤ، گھر گھر سجاؤ، آ گیا ہے ہمارا تمہارا نبی ﷺ؟

جواب بلاشبہ ہمارے ہاں جشن میلاد بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ کھانے پکانے کا خوب اہتمام ہوتا ہے، جگہ جگہ جلوس نکلتے ہیں۔ گلی کوچوں میں چراغاں ہوتا ہے۔ بھنگڑے اور دھمالیں ڈالی جاتی ہیں۔ یقیناً یہ سب کچھ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ والہانہ عقیدت اور انتہائی محبت کے طور پر کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے محبت کرنا ایمانی تقاضا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ہمیں آپ سے کس قسم کی محبت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم سب ان اداؤں کو اپنائیں جو زندگی بھر آپ کا معمول رہیں اور آپ کے لائے ہوئے دین کے مطابق اپنے گردوپیش اور ماحول کو ڈھالیں۔ محبت کا یہ معیار خود ساختہ ہے کہ سال میں صرف ایک دن رسول اللہ ﷺ کی ولادت کا جشن منالیں اور اپنی پوری زندگی آپ کی تعلیمات کے خلاف بسر کریں۔ رسول اللہ ﷺ کے جانثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ نے اس انداز سے جشن میلاد منانے کا اہتمام نہیں کیا، جیسا کہ ہمارے ہاں منایا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جشن میلاد کے سلسلہ میں ہمارے ہاں رائج معیارِ محبت مطلوب ومقصود نہیں ہے، اس سلسلہ میں چند گزارشات پیش خدمت ہیں۔

☆ رسول اللہ ﷺ کی مدنی زندگی میں دس مرتبہ آپ کی ولادت باسعادت کا دن آیا آپ نے اس قدر اہتمام کے ساتھ نہ خود منایا اور نہ ہی اپنے جانثار صحابہ کو منانے کا حکم دیا، بدعت کی تعریف یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں ایک چیز کا سبب موجود تھا لیکن آپ نے اس کا اہتمام نہیں کیا، البتہ بعد میں آنے والے اسے عبادت کے طور پر اہتمام سے سرانجام دیں۔ ایسے کاموں کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''جو شخص ہمارے دین میں کسی نئی چیز کو رواج دیتا ہے جس کا تعلق دین سے نہیں وہ مردود ہے۔'' [صحیح بخاری، الصلح: ۲۶۹۷]

☆ عہد رسالت، عہد صحابہ اور عہد تابعین کے باعثِ خیر وبرکت ہونے کی خود رسول اللہ ﷺ نے شہادت دی ہے آپ نے فرمایا ہے: ''سب سے بہتر میرا عہد مبارک ہے، پھر اس کے بعد یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم کا اور اس کے بعد تابعین عظام رحمہم اللہ کا عہد اس کے بعد جھوٹ اور یاوہ گوئی عام ہو جائے گی۔'' (صحیح بخاری) عید میلاد خیر وبرکت کے زمانہ سے بعد میں ایجاد ہوئی ہے، اس لئے بھی اس کی مشروعیت محل نظر ہے۔

☆ رسول اللہ ﷺ سوموار کا روزہ رکھا کرتے تھے جب آپ سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''میں اس دن پیدا ہوا ہوں اور مجھے

اس دن رسالت سے نوازا گیا ہے۔'' [صحیح مسلم، الصیام: ۲۷۴۷]

اگر یوم ولادت مسلمانوں کے لئے عید کا دن ہوتا تو اس دن روزہ رکھنے کی ممانعت ہوتی۔ کیونکہ عید کے دن روزہ رکھنا شرعاً منع ہے اگر رسول اللہ ﷺ نے اپنا یوم ولادت منایا ہے تو اظہار تشکر کے طور پر اس دن کا روزہ رکھا ہے، اس لئے مسلمانوں کو چاہیے کہ یوم ولادت کے دن عید منانے کے بجائے شکرانے کے طور پر ہر سوموار کا روزہ رکھیں۔

☆ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے متعلق اکثر اہل علم اور اہل تاریخ حضرات کا قول ہے کہ ۱۲ ربیع الاول کو ہوئی، پرانی جنتریوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخ کو بارہ وفات کہا جاتا تھا۔ اگر یہی تاریخ یوم ولادت کی بھی ہو، جیسا کہ باور کرایا جاتا ہے تو سوچنے کا مقام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے دن ''جشن'' منانا صحیح ہے؟ اس کے علاوہ محققین علما نے ۹ ربیع الاول کو رسول اللہ ﷺ کی ولادت کا دن قرار دیا ہے اس پہلو سے بھی جشن میلاد پر غور کیا جاسکتا ہے۔

☆ اسلام نے ہمیں قومی تہوار کے طور پر دو عیدیں منانے کا حکم دیا ہے، ان میں نماز پڑھنے اور تکبیر و تحلیل کہنے کا حکم دیا ہے، شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے خوشی منانے کی اجازت دی ہے، لیکن تیسری عید ''جشن میلاد'' کی پیوندکاری کو کسی صورت میں صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا۔

☆ خوشی یا جشن منانے کا یہ انداز سراسر غیر اسلامی ہے۔ خوشی کے موقع پر جلوس نکالنا، چراغاں کرنا، دھمالیں ڈالنا، باجے بجانا اور گیتوں کے انداز میں نعتیہ کلام پیش کرنا دین اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ اس انداز سے اپنے اکابر کا دن منانا کفار کی نقالی اور یہود و نصاریٰ سے مشابہت ہے اور ہمیں کفار و یہود کی مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ ''جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے وہ انہیں میں سے ہے۔'' [مسند امام احمد، ص: ۹۲ ج ۲]

بہرحال عید میلاد کو جس اعتبار سے بھی دیکھا جائے اس کی شرعی حیثیت محل نظر ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے محبت کے نام پر عقیدت کا ایسا مظاہرہ ہے جس کی تائید قرآن پاک، حدیث اور تعامل امت سے نہیں ہوتی، صحابہ تابعین سے بھی اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ [واللہ اعلم]

سوال میں رسول اللہ ﷺ سے بہت محبت رکھتا ہوں، اس پرفتن دور میں میری ایک ہی خواہش ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کروں، کیا اب ایسا ہوسکتا ہے؟ میرا کافی عرصہ پہلے نماز کے بعد ذکر و اذکار ''لا الـــہ الا اللہ'' تک محدود ہوتا تھا، میں نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، انہوں نے مجھے کہا کہ ہمیں بھی یاد رکھا کرو، یعنی لا الـہ الا اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ بھی پڑھا کرو تاکہ ہم بھی تمہاری مدد کریں، اس کی شرعی حیثیت واضح کریں؟

جواب بیعت ایک ایسا معاہدہ ہے جو ''لا الـہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پڑھنے کے بعد شروع ہوجاتا ہے، اس معاہدے کا اولین تقاضا یہ ہے کہ بندہ اس عالم رنگ و بو میں اللہ تعالیٰ کے احکام و فرامین پر خلوص دل سے عمل پیرا رہے اور رسول اللہ ﷺ کی ہدایات کو دل و جان سے قبول کرے۔ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا یہی مقصد ہے، اس کے لئے ہاتھ پر ہاتھ رکھنا ضروری نہیں ہے اور نہ ہی اب ایسا ممکن ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ اس دنیا سے رخصت ہوچکے ہیں۔ ہمارے ہاں آج کل

جو بیعت رائج ہے اسے بیعتِ تصوف کہا جاتا ہے اس میں بہت اختلاف ہے۔ بعض علما اسے ناجائز کہتے ہیں، جبکہ بعض حضرات اس کے قائل و فاعل ہیں۔ البتہ ہمیں اس کے متعلق شرح صدر نہیں ہے کیونکہ شریعتِ اسلامیہ میں بیعتِ اسلام، بیعتِ جہاد اور بیعتِ احکام کا ثبوت ملتا ہے لیکن بیعت تصوف کا وجود قرون اولیٰ میں نظر نہیں آتا۔ اس لئے انسان کو چاہیے کہ خلوص دل سے کتاب و سنت پر عمل کرنے کا اللہ تعالیٰ سے عہد کرے اور اس کے لئے مخلصانہ کوشش کرے، لاالٰــــه الااللہ کا بھی یہی مطالبہ ہے جسے پورا کرنا ہمارا فرض ہے۔

خواب کے متعلق واضح رہے کہ اسے کسی شرعی حکم کی بنیاد نہیں قرار دیا جاسکتا، صرف حضرات انبیا علیہم السلام کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کے خواب وحی ہوتے ہیں اور شرعی احکام کی بنیاد قرار پاتے ہیں۔ اس وضاحت کے بعد واضح ہو کہ افضل الذکر تو صرف لاالٰه الااللہ ہے۔ محمد رسول اللہ کو مستقل طور پر ذکر کا حصہ بنانا جائز نہیں، البتہ کبھی کبھار اختتامِ ورد کے موقع پر محمد رسول اللہ کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ سوال میں یہ کہنے پر ''ہم تمہاری مدد کریں گے'' کا جو اشارہ ملا ہے یہ ایک ذہنی اختراع ہے جو شریعتِ اسلامیہ کے خلاف باغیانہ اقدام اور کھلا شرک ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

سوال بعض واعظین حضرات عام طور پر رسول اللہ ﷺ کی شان بیان کرتے ہوئے بکثرت یہ بیان کرتے ہیں کہ ''اگر آپ نہ ہوتے تو میں کائنات کو پیدا نہ کرتا'' بعض علما حضرات کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے اس کے متعلق وضاحت درکار ہے؟

جواب رسول اللہ ﷺ کی شان اور مرتبہ کے متعلق قرآن پاک اور حدیث میں اس قدر مستند مواد موجود ہے کہ واعظین کے لئے کافی ہے۔ لیکن یہ حضرات ایسی باتیں بیان کرنے کے عادی ہیں جس میں کوئی انوکھا پن ہو۔ مذکورہ بالا روایت بھی اسی قبیل سے ہے۔ عام طور پر غالی قسم کے واعظین اس قسم کی روایات بیان کرتے ہیں، حالانکہ یہ روایت بناوٹی اور خود ساختہ ہے اس کے متعلق سرخیل احناف ملا علی قاری لکھتے ہیں کہ یہ حدیث موضوع ہے۔ [الاسرار المرفوعه:۲۹۵]

لیکن اس روایت کو موضوع قرار دینے کے باوجود کہتے ہیں کہ اس کا معنی صحیح ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً امام دیلمی نے اپنی تالیف ''مسند الفردوس'' میں اسے بیان کیا ہے۔ [الأسرار المرفوعه]

محدث العصر علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا بہترین جواب دیا ہے، فرماتے ہیں کہ ''محدث دیلمی کی طرف جو بات منسوب کی گئی ہے اس کے ثبوت کے بعد ہی اس کے معنی کو صحیح کہنے کے متعلق جزم کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ میں اس کی سند پر مطلع نہیں ہوا ہوں، تاہم مجھے اس کے ضعیف ہونے میں کوئی تردد نہیں ہے۔'' [الاحادیث الضعیفه، حدیث نمبر:۲۸۲]

مسند دیلمی شائع ہوچکی ہے۔ تلاش بسیار کے باوجود ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی یہ حدیث ہمیں نہیں مل سکی، نیز محدث دیلمی کی بیان کردہ احادیث اکثر ضعیف ہی نہیں بلکہ موضوع ہیں۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک طویل روایت بیان کی ہے۔ جس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں: ''اگر آپ نہ ہوتے تو میں دنیا کو پیدا نہ کرتا'' اسے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ روایت بناوٹی ہے اس کی سند میں ابو السکین، ابراہیم اور یحییٰ بصری جیسے ضعیف راوی ہیں جنہیں محدثین نے چھوڑ دیا تھا۔ امام فلاس کہتے ہیں کہ یحییٰ بصری جھوٹا راوی ہے جو خود ساختہ احادیث بیان کرتا ہے۔

[اللآلی الموضوعۃ:۱/۲۷۲]

امام جوزی رحمۃ اللہ علیہ اس طویل روایت کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس روایت کے خود ساختہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی سند میں ایسے راوی ہیں جن کے متعلق کوئی اتا پتا نہیں ہے اور کچھ ایسے راوی ہیں جو ضعیف ہیں۔ اس کے بعد یحیٰ بصری کے متعلق امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ ہم نے یحیٰ بصری کی بیان کردہ روایات کو جلا دیا تھا۔

[کتاب الموضوعات:۲/۲۸۹]

امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ محدثین کے ہاں متروک ہے۔ مختصر یہ ہے کہ مذکورہ روایت بناوٹی اور خود ساختہ ہے، نیز اس طرح کی روایت حقیقت حال کی وضاحت کے لئے تو بیان کی جا سکتی ہیں لیکن فضائل اور سیرت کے سلسلہ میں ان کا سہارا لینا ناجائز اور حرام ہے۔ ہمارے واعظین حضرات کو اس طرح کی روایات بیان کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

سوال ایک شخص مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی مانتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ اگر اسے یقین ہو جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو موت نہیں آئی اور نہ ہی وہ سرینگر میں مدفون ہیں تو وہ مرزا قادیانی کی نبوت سے تائب ہو جائے گا۔ آپ سے حیات مسیح کے دلائل درکار ہیں، نیز جواب دیتے وقت سورۂ نساء کی آیت نمبر: ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، کو ضرور مدنظر رکھیں؟

جواب حیات مسیح اور نزول مسیح علیہ السلام کا عقیدہ ہمارے ہاں بنیادی عقائد سے ہے جس کی بنیاد قرآنی آیات اور متعدد احادیث ہیں۔ جو معنوی طور پر حدِ تواتر کو پہنچتی ہیں۔ ہمارا کام اس عقیدہ پر دلائل مہیا کرنا ہے انہیں قابل یقین بنا کر کسی کے دل میں اتارنا یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ واضح رہے کہ حیات عیسیٰ اور نزول عیسیٰ علیہ السلام کے عقیدہ پر امت کا اجماع ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر کبھی جمع نہیں کرے گا۔'' [مستدرک:۱/۱۱۶]

اللہ تعالیٰ نے رفع عیسیٰ اور نزول عیسیٰ علیہ السلام کو قرآن پاک میں بایں الفاظ میں بیان کیا ہے: ''اور وہ یہود یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے رسول مسیح عیسیٰ ابن مریم کو قتل کر ڈالا ہے، حالانکہ انہوں نے اسے نہ قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا بلکہ یہ معاملہ ان کے لئے مشتبہ ہو گیا اور یقیناً جن لوگوں نے اس معاملہ میں اختلاف کیا وہ خود بھی شک میں مبتلا ہیں انہیں حقیقت کا کچھ علم نہیں ہے وہ محض ظن کی اتباع کرتے ہیں اور یقیناً وہ انہیں قتل نہیں کر سکے تھے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا تھا اور اللہ زورآور اور حکمت والا ہے اور تمام اہل کتاب ابن مریم کی موت سے پہلے ضرور اس پر ایمان لائیں گے اور قیامت کے دن وہ ابن مریم ان کے خلاف گواہی دیں گے۔'' (۴/النسآء:۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹)

ان آیات میں صراحت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف اٹھا لیا ہے اور قیامت کے نزدیک جب آپ نزول فرمائیں گے تو آپ کی شان وشوکت کو دیکھ کر یہود کو بھی اعتراف کرنا پڑے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام واقعی اللہ کے رسول تھے۔ انہوں نے ولد الحرام ہونے کا جو الزام لگایا تھا وہ غلط تھا، نیز ان کا یہ گمان کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو مار ڈالا ہے غلط ثابت ہو جائے گا۔

حیات عیسیٰ اور نزول عیسیٰ علیہ السلام کا عقیدہ متعدد احادیث سے بھی ثابت ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھوں میں میری جان ہے! عنقریب تم میں ابن مریم عادل حکمران کی حیثیت سے نازل ہوں گے، وہ صلیب

توڑ ڈالیں گے، خنزیر کو ہلاک کردیں گے جزیہ اٹھادیں گے، اس زمانہ میں مال کی اتنی فراوانی ہوگی کہ اسے کوئی قبول نہ کرے گا اور ایک سجدہ ان کے نزدیک دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا اگر چاہو تو قرآن پاک کی آیت پڑھ لو: ''تمام اہل کتاب ابن مریم کی موت سے پہلے ضرور اس پر ایمان لائیں گے۔'' [صحیح بخاری، الانبیاء: ۳۴۴۸]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان احادیث کو بیان کرنے والے تقریباً پندرہ تابعین ہیں، پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت نواس بن سمعان، حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص، حضرت حذیفہ بن اسید، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت مجمع بن حارثہ، حضرت عبداللہ بن مغفل، حضرت واثلہ بن اسقع، حضرت ابو امامہ، حضرت عثمان، حضرت عمرو بن ابی العاص اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہم سے بھی یہ حدیث ''نزول عیسیٰ علیہ السلام'' مروی ہے۔ اختصار کے پیش نظر ان کے حوالہ جات ذکر نہیں کریں گے۔

مساجد و اوقاف

مساجد و اوقاف
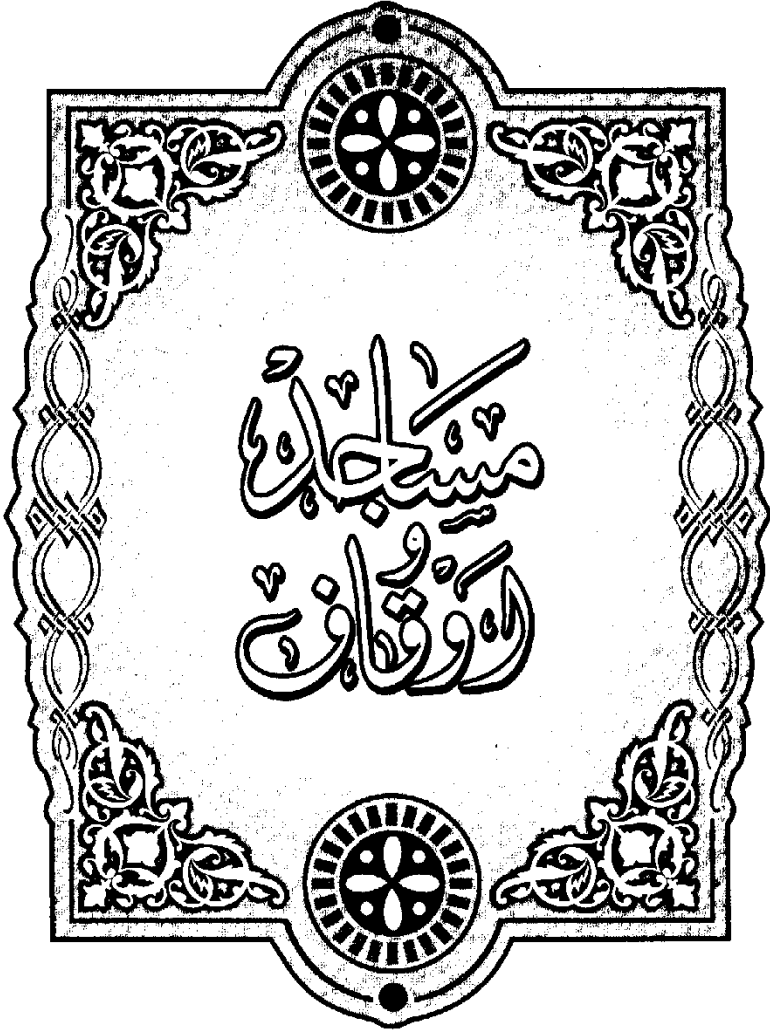
سوال ہمارے ہاں جو قدیم مساجد تعمیر شدہ ہیں، ان کی سمت قبلہ کی تعیین کے متعلق اکابر اہلحدیث نے بڑی محنت اور جانفشانی سے کام لیا تھا جبکہ آج کل ہمارے کچھ نوجوانوں کے ہاتھ بیرون ملک سے درآمد کردہ جائے نماز آئے ہیں جن پر قبلہ نما نصب ہے۔ جدید قبلہ نما کے مطابق پہلے تعیین کردہ سمت قبلہ میں کہیں کم اور کہیں زیادہ فرق ہے، اس وجہ سے جماعتی احباب تذبذب کا شکار ہیں براہِ کرم اس سلسلہ میں کتاب سنت سے ہماری راہنمائی فرمائیں؟

جواب واضح رہے کہ دین اسلام کے تمام احکام کی بنیاد یسر وسہولت اور سادگی و بے تکلفی ہے کیونکہ شریعت کا دائرہ حکومت تمام جہان کے بحر و بر اور شہری و دیہاتی آبادیوں پر حاوی ہے۔ اسلامی فرائض کی ادائیگی جس طرح شہریوں پر عائد ہے اسی طرح دیہاتیوں اور پہاڑوں کے رہنے والے ناخواندہ حضرات پر بھی ہے، اس لئے جو احکام اس حد تک عام ہوں ان کے متعلق رحمت وحکمت کا تقاضا ہے کہ انہیں جدید آلات پر موقوف نہ رکھا جائے تاکہ ہر خاص و عام انہیں بآسانی سرانجام دے سکے۔ اس ضروری تمہید کے بعد نماز پڑھتے وقت قبلہ کے متعلق بھی شریعت نے آسان اور سادہ طریقہ ہی اختیار فرمایا ہے جسے ہر شہری اور دیہاتی بسہولت عمل میں لا سکے، چنانچہ اس کے متعلق ہمارے اسلاف کا طرز عمل حسب ذیل ہے:

☆ سمت قبلہ کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''نماز کے وقت تم اپنے چہروں کو مسجد حرام کی طرف کرو''۔ [۲/البقرہ:۱۴۴]

اس آیت کریمہ میں بیت اللہ کے بجائے مسجد حرام کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا ہے جو کہ بیت اللہ سے زیادہ وسیع ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں استقبال قبلہ کے متعلق شریعت نے تنگی کے بجائے وسعت کو پیش نظر رکھا ہے، چنانچہ اس بات پر اتفاق ہے کہ مسجد حرام کے بعد سب سے پہلی مسجد جو اسلام میں بنائی گئی وہ مسجد قبا ہے۔ اس مسجد کی بنیاد اس وقت رکھی گئی تھی جبکہ مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس تھا، پھر جب تحویل قبلہ کی آیات نازل ہوئیں تو اس کی خبر لے کر مسجد قبا میں ایک صحابی اس وقت پہنچا جب صبح ہو رہی تھی۔ انہوں نے دوران نماز ہی تحویل قبلہ کی خبر دی تو امام اور پوری جماعت بیت اللہ کی جانب پھر گئی۔

[صحیح بخاری، الصلوۃ:۴۰۳]

اس واقعہ کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو ہوئی تو آپ نے ان حضرات کے اس فعل کی تصویب فرمائی اب ظاہر ہے کہ حالت نماز میں اہل قبا نے جو سمت قبلہ اختیار کی اس میں اس قسم کے آلات کا قطعاً کوئی دخل نہ تھا بلکہ انہوں نے اپنے ظن غالب کے مطابق تحری وکوشش کر کے سمت قبلہ کو اختیار کیا۔ نماز کے بعد بھی انہوں نے اس ظن وتخمینہ کے علاوہ کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا۔ پھر سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وقت ہر صوبے میں مساجد تعمیر ہوئیں اور عمال حکومت نے اس سلسلہ میں کسی قسم کے آلات سمت قبلہ کی تعیین کے لئے استعمال نہیں کیے بلکہ اس کی تعیین تحری وتخمینہ سے کی گئی، بلکہ فقہاء ومحدثین کی صراحت کے مطابق اگر کوئی بیت اللہ کے سامنے نماز ادا کرتا ہے تو اس کے لیے عین قبلہ کی طرف منہ کرنا ضروری ہے جبکہ دوسروں کے لئے عین قبلہ کے بجائے جہت قبلہ ضروری ہے اور جہت قبلہ کی تعیین بھی سادہ طریقہ سے کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ سے دوسرے شمالی علاقوں کے لئے ارشاد نبوی

ہے کہ ''مشرق ومغرب کے درمیان قبلہ ہے۔'' [ترمذی، الصلوۃ: ۳۴۲]

اس حدیث سے نقطہ مشرق ومغرب کی درمیانی قوس، یعنی نصف دائرہ کی مقدار کے متعلق جہت قبلہ ہونے کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے لیکن محققین امت نے اس حدیث کو عرف عام پر محمول کر کے مشرق ومغرب سے مشرق ومغرب کی جہت کو مراد لیا ہے۔ فقہاء نے اس کی تفصیل یوں کی ہے کہ اگر نمازی کی پیشانی کے درمیان سے خط مستقیم نکل کر عین کعبہ پر گزرے تو یہ قبلہ مستقیم ہے اگر پیشانی کے درمیان سے نکلنے والا خط عین کعبہ پر نہیں پہنچتا لیکن پیشانی کے دائیں بائیں اطراف سے کوئی خط عین کعبہ پر پہنچے تو اس قدر انحراف قلیل نا قابل التفات ہے اور علمائے ہیئت نے انحراف قلیل کی تعیین اس طرح کی ہے کہ ۴۵ درجہ تک انحراف ہو تو قلیل بصورت دیگر انحراف کثیر ہے جو قابل التفات واعتراض ہے کیونکہ قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کے اعتبار سے لوگوں کی مثال ایسے ہے جیسا کہ مرکز کے گرد دائرہ ہوتا ہے اور کسی بھی دائرہ کا پھیلاؤ اور اتساع اپنے مرکز ۴/ ا دائرہ تک ہو سکتا ہے اس سے زیادہ نہیں ہوتا، اس بنا پر دائرہ کے ربع تک انحراف ہو یعنی کعبہ سے ۴۵ درجہ دائیں جانب اور ۴۵ درجہ بائیں جانب انحراف کا جواز ہے واضح رہے کہ کسی بھی دائرہ کا چوتھائی حصہ نوے درجہ تک ہوتا ہے۔ اسے دائیں بائیں تقسیم کر کے ۴۵، ۴۵ درجہ رکھا گیا ہے۔ تعیین قبلہ کے متعلق ایک سادہ طریقہ یہ ہے جسے ماہرین نے بیان کیا ہے کہ سال میں دو مرتبہ نصف النہار کے وقت سورج عین بیت اللہ کے اوپر ہوتا ہے۔ اور وہ دن ۲۷ مئی اور ۱۶ جولائی ہیں۔ آفتاب کے نصف النہار مکہ پر پہنچنے کا ہمارے ہاں ۲۷ مئی کو ۲ بجکر ۷ امنٹ اور ۱۶ جولائی کو ۲ بجکر ۲۶ منٹ ہے ان اوقات میں عمود کا سایہ قبلہ پر ہوگا، دھوپ میں کسی بھی وزن دار رسی کو ان اوقات میں لٹکا کر سمت قبلہ کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ علامہ مقریزی نے لکھا ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مصر اور دوسرے شہروں میں اس طرح موٹے موٹے آثار ونشانات کے ذریعے تحری کر کے سمت قبلہ کا تعین کیا اور مساجد تعمیر کرائیں اور عام مسلمانوں نے ان کا اتباع کیا۔ البتہ مصر کے فرماں روا احمد بن طولون نے جب مصر میں جامع مسجد کی بنیاد ڈالی تو اس نے مدینہ طیبہ بھیج کر مسجد نبوی کی سمت قبلہ دریافت کرائی اور اس کے مطابق مسجد بنائی جو فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص کی جامع مسجد سے کسی قدر منحرف ہے لیکن علما نے جامع مسجد عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے اتباع کو اولیٰ قرار دیا ہے اور اطراف مصر کی مساجد اسی کے مطابق ہیں، واضح رہے کہ امیر مصر نے جب ماہرین کے ذریعے آلات ریاضیہ سے مسجد نبوی کی سمت قبلہ کو جانچا تو معلوم ہوا کہ آلات کے ذریعے نکالے ہوئے خط سمت قبلہ سے مسجد نبوی کی سمت قبلہ دس درجہ مائل بجنوب ہے، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمت قبلہ کی تعیین بذریعۂ وحی فرمائی تھی، اس لئے مسجد نبوی کی سمت قبلہ کے عین مطابق تھی اور ان ماہرین کا آلات کے ذریعے اندازہ غلط تھا۔ اس لئے ایسے معاملات میں زیادہ باریک بینی سے کام نہ لیا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے بعض اوقات اپنے اسلاف سے بدگمانی پیدا ہوتی ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال اسلام میں متولی مسجد کے عہدے کا کیا مقام ہے، کیا یہ ایک بدعتی کردار ہے یا امام اور خطیب سے اونچا ہے، جب خلفائے راشدین مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خطیب تھے تو متولی مسجد کون ہوتا تھا؟

جواب مسجد سے متعلقہ ضروریات کی فراہمی کا انتظام وانصرام کرنا تولیت کہلاتا ہے۔ قرآن مجید نے مشرکین مکہ کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تولیت مسجد حرام پر تبصرہ کیا ہے کہ انہیں حجاج کرام کو پانی پلانے اور دیگر امور مسجد بجالانے پر بڑا ناز تھا۔ وہ اس بنا پر اہل

ایمان کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔فرمان باری تعالیٰ ہے: ''کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کے آباد کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر قرار دیا ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور آخرت پر یقین رکھے اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرے اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ برابر نہیں ہو سکتے۔'' [۹/التوبہ:۱۹]

اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر ان کا دعویٰ تولیت مسترد کرتے ہوئے فرمایا:

''یہ مشرک مسجد حرام کے متولی نہیں ہیں، اس کے متولی تو وہی ہو سکتے ہیں جو تقویٰ شعار ہیں۔'' [۸/الانفال:۳۴]

ان آیات اور دیگر حقائق کی روشنی میں تولیت کی درج ذیل شرائط ہیں:

☆ تقویٰ شعاری اور پرہیز گاری اس کی بنیادی شرط ہے متولی کو پرہیز گار اور تقویٰ شعار ہونا چاہیے۔

☆ مساجد دینی معاملات کی بجا آوری کے لئے بنائی جاتی ہیں، اس لئے متولی مسجد کا صاحب علم اور معاملہ فہم ہونا ضروری ہے۔

☆ مسجد میں ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، اس لئے متولی کو مستقل مزاج اور بردبار ہونا چاہیے۔

☆ اخراجات کے سلسلہ میں امانت دار ہو اور اپنی جیب سے خرچ کرنے کا عادی ہو۔

☆ ذاتی طور پر اثر ورسوخ والا ہو، تاکہ مسجد کے نظام میں رکاوٹ ڈالنے والوں سے نمٹا جا سکے۔

چونکہ رسول اللہ ﷺ کے عہد نبوت اور خلفائے راشدین کے دور خلافت میں بیت المال کی بنیادیں مضبوط تھیں۔مسجد کا نظام چلانے کے لئے چندہ وغیرہ کی تحریک نہیں چلائی جاتی تھی، اس کے علاوہ سادہ سی مسجد بنا کر رشد وہدایت پھیلانے کا کام شروع کر دیا جاتا تھا، امامت وخطابت کے فرائض خود رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد خلفائے راشدین سرانجام دیتے تھے، اس لئے مسجد کا نظام چلانے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی تھی۔جب سے اہل ثروت حضرات نے مساجد پر خرچ کرنے کو اپنے لئے فخر و مباہات کا ذریعہ بنایا ہے اور اہل علم حضرات نے خطابت وامامت کو ایک پیشے کی صورت قرار دے لیا ہے اس وقت سے مساجد کا داخلی اور خارجی نظام درہم برہم ہو چکا ہے، آج بھی اگر مساجد کا داخلی نظام اہل علم کے پاس ہو اور اخراجات کی ذمہ داری مال دار حضرات قبول کر لیں تو تولیت مساجد کے متعلق وہ سوالات پیدا نہیں ہوں گے جو سائل نے اپنے سوال میں اٹھائے ہیں۔اس وضاحت کے بعد ہم کہتے ہیں کہ تولیت مسجد نہ بدعتی کردار ہے اور نہ خطیب اور امام سے اونچا عہدہ ہے، نیز خلفائے راشدین خود ہی مسجد نبوی کے خطیب اور امام تھے اور اس کی تولیت بھی انہی کے پاس تھی، یہ تولیت دنیاوی طور پر باعث فخر ومباہات نہیں بلکہ یہ حضرات اپنے لئے ذریعہ نجات خیال کرتے ہوئے اسے سرانجام دیتے تھے۔

سوال ایک آدمی نے اپنی زندگی میں تقریباً دو کنال قطعہ اراضی زبانی طور پر مسجد کے لئے وقف کی لیکن قانونی طور پر وقف نامہ لکھنے سے پہلے وہ فوت ہو گیا۔اس کے بیٹے نے وہ موقوفہ زمین کسی دوسرے شخص کو فروخت کر دی، اس کی قیمت وصول کر کے خریدار کے نام رجسٹری کرا دی، اب مسجد کی انتظامیہ اور خریدار کا باہمی تنازعہ پیدا ہوا، مسجد والے کہتے ہیں کہ فروخت کردہ زمین مسجد کے لئے وقف ہے، جبکہ خریدار کا دعویٰ ہے کہ میں نے اسے رقم صرف کر کے خریدا ہے اور میرے نام رجسٹری ہے۔پنچایتی فیصلہ یہ ہوا کہ خریدار، مسجد کو موجودہ زمین سے نو مرلے دے گا اور وضو خانہ، باتھ وغیرہ بھی تعمیر کرا دے گا، فریقین اس پر راضی ہو گئے اور اس پر

عمل درآمد بھی کرادیا گیا، اب مسجد کی انتظامیہ کے بعض افراد پھر مطالبہ کر رہے ہیں کہ مسجد کو دو کنال قطعہ اراضی ملنا چاہیے جبکہ خریدار کہتا ہے کہ یہ سراسر زیادتی اور حق تلفی ہے۔ وضاحت فرمائیں کہ اس تنازعہ میں زیادتی کا مرتکب کون اور حق بجانب کون ہے؟

جواب واضح رہے کہ کسی قیمتی چیز کو اللہ تعالیٰ کی ملک میں مقید کر دینا اور اس کے منافع کو دوسروں پر نیک نیتی کے ساتھ ہمیشہ کے لئے صدقہ کر دینے کا صاف اور صریح اظہار وقف کہلاتا ہے۔ وقف کے لئے شرعی طور پر کسی تحریری دستاویز کی ضرورت نہیں ہے، کسی جائیداد کے بطور وقف استعمال سے بھی اس کا وقف ہونا ثابت کیا جاسکتا ہے، البتہ ازروئے قانون وقف کا تحریری ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے وقف کے جواز کے لئے حسب ذیل شرائط کا ہونا لازمی ہے:

☆ وقف کنندہ عاقل، بالغ اور آزاد ہو۔

☆ وقف کے وقت شئے موقوفہ کا مالک ہو۔

☆ وقف کردہ چیز ہر قسم کے بار کفالت سے مبرّا ہو۔

☆ وقف کردہ چیز کو موقوف علیہ کے حوالے کرنے پر قادر ہو۔

☆ وقف کا اعلان نیک نیتی اور حقیقی ارادے کے ساتھ ہو، اس میں کسی وارث کو نقصان پہنچانا مقصود نہ ہو۔

جب ان شرائط کے مطابق وقف مکمل ہو جائے تو وقف شدہ چیز کو اپنے ذاتی مقاصد کے لئے نہ تو فروخت کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی اور کو ہبہ یا وراثت میں دیا جاسکتا ہے، جیسا کہ حدیث رسول اللہ ﷺ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ [صحیح بخاری: ۲۷۳۷]

اس طرح وقف کے بعد اگر کوئی وارث وقف شدہ چیز کو اپنے ذاتی مقاصد کے لئے فروخت کرتا ہے تو اس فروختگی کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا کیونکہ حدیث کے مطابق ظالمانہ تصرف ہے، جسے شریعت نے غیر معتبر ٹھہرایا ہے۔ [صحیح بخاری، المزارع: ۲۳۳۵]

حدیث میں اس قسم کے تصرف کو عرق ظالم سے تعبیر کیا گیا ہے جس کی وضاحت راوی حدیث حضرت ہشام نے بایں الفاظ کی ہے کہ آدمی کسی دوسرے کی زمین میں ناجائز تصرف کر کے اس کا مالک بن بیٹھے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تفسیر یوں کی کہ حق کے بغیر کسی قسم کا استفادہ کرنا عرق ظالم ہے۔ [ابوداؤد، الامارہ: ۳۰۷۸]

صورت مسئولہ میں ازروئے قانون وقف کی شرائط کا لحاظ نہیں رکھا گیا اور نہ ہی وقف کرتے وقت اپنی اولاد کو اعتماد میں لیا گیا ہے۔ وقف کنندہ کو چاہیے تھا کہ وہ قطعہ اراضی مسجد کی انتظامیہ کے حوالے کر دیتا یا پھر اس کے قانونی تقاضے پورے کر کے مسجد کے نام رجسٹری کرا دیتا۔ کم از کم اپنی اولاد کو اس سے آگاہ کر کے انہیں اعتماد میں لے لیتا، تاہم اس کے بیٹے نے زبانی وقف شدہ قطعہ ارضی دانستہ یا غیر دانستہ طور پر آگے فروخت کر دیا اور اس کی رقم وصول کر کے اس قطعہ اراضی کی خریدار کے نام رجسٹری بھی کرادی ہے۔ اس میں خریدار کا کوئی قصور نہیں ہے لیکن انتظامیہ مسجد کے تنازعہ کے پیش نظر پنچائتی فیصلہ ہوا کہ خریدار اس قطعہ اراضی سے نو مرلے زمین مسجد کو دے گا اور اس پر وضوخانہ اور باتھ وغیرہ تعمیر کرائے گا اور فریقین نے نہ صرف اس فیصلہ کو قبول کیا بلکہ حسب وضاحت بالا اس پر عمل درآمد بھی ہوگیا، اب انتظامیہ کو چاہیے کہ وہ دوبارہ اس تنازعہ کو نہ اٹھائیں، بلکہ اس فیصلہ کو قبول کر کے باہمی اتفاق و یگانگت کی فضا پیدا کریں۔ حدیث میں ہے کہ مسلمانوں کو اپنی طے شدہ شرائط کی پاسداری کرنی چاہیے۔ اس بنا پر اہل مسجد اب مسجد کی آبادی

کے لئے خلوص کے ساتھ کوشش کریں اوراس قسم کے تنازعات سے باہمی نفرت کی فضا پیدا نہ کریں۔ [ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب]

سوال ہم نے اپنی مسجد سے ملحقہ پلاٹ خرید کر اس میں بھرتی ڈلوائی ہے، مقامی بچوں کی تعلیم کے لئے ہم وہاں تعمیر کرنا چاہتے ہیں، کیا عشر وزکوٰۃ کی رقم سے تعمیر کی جاسکتی ہے، جبکہ ہمارے ہاں بیرونی طلبہ نہیں ہیں، نیز بتائیں کہ مسجد پر زکوٰۃ کی رقم کیوں نہیں لگائی جاسکتی؟

جواب ذاتی ضروریات پر زکوٰۃ صرف کرنا درست نہیں ہے۔ زکوٰۃ کے مصارف قرآن کریم میں طے شدہ ہیں، مساجد اور مقامی مدارس کی تعمیر بھی ذاتی ضروریات میں شامل ہے، ان پر عشر یا زکوٰۃ کا پیسہ نہیں خرچ کرنا چاہیے بلکہ ان کی تعمیر اہل محلہ اپنی ذاتی گرہ سے کریں۔ اگر اہل محلہ خود زکوٰۃ یا عشر کے مستحق ہیں اور ان کی گزر اوقات بھی اسی قسم کے فنڈ سے ہوتی ہے تو ایسے حالات میں ان کی مساجد اور مقامی مدارس پر عشر اور زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے۔ عام طور پر مدارس کا رخ غریب اور تنگ دست طلبہ کرتے ہیں، اس لئے مدارس کے لئے زکوٰۃ فنڈ وغیرہ استعمال کرنے کی گنجائش نکالی جاتی ہے، اگر مدارس میں امیر طبقہ سے تعلق رکھنے والے تمام طلبہ ہوں تو ان پر بھی زکوٰۃ کی رقم استعمال نہیں ہوسکتی۔ اگر مقامی حضرات اس قدر متمول ہیں کہ ان کا عشر اور زکوٰۃ وغیرہ جمع ہوتی ہیں تو انہیں چاہیے کہ زکوٰۃ، عشر، صدقۂ فطر اور قربانی کی کھالیں غرباء اور مساکین کو دیں اور مساجد وغیرہ کی تعمیر اپنی گرہ سے کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے کسی وقت بھی مساجد کی تعمیر اور مقامی ضروریات کے لئے زکوٰۃ، عشر، صدقہ فطر یا قربانی کی کھالوں کو استعمال نہیں فرمایا۔ حتی کہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جہاد جیسی اہم ضرورت پر بھی اس قومی فنڈ کو استعمال نہیں فرمایا۔ آپ کے عہد مبارک میں غزوۂ تبوک کے موقع پر متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی گرہ سے جہاد فنڈ کو مضبوط کیا ہے۔ اس سلسلہ میں نصوص کے عمومات سے یہ مسئلہ کشید تو کیا جاسکتا ہے لیکن اسوۂ رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق کوئی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی۔

اس تفصیلی جواب کے بعد اعتراض کنندگان کی حیرانی ختم ہوجانی چاہیے کہ سوال مسجد کی تعمیر پر زکوٰۃ خرچ کرنے کے بارے میں ہے اور جواب جہاد کے بارے میں دیا جارہا ہے، نیز یہ حضرات مطمئن رہیں کہ ہمارا جواب پیش کردہ سوال کے عین مطابق ہے اور ہمیں اپنے موقف پر پوری طرح شرح صدر ہے اور ہمیں یہ موقف اختیار کرنے میں کوئی ناگزیر وجوہات درپیش نہیں ہیں۔ البتہ یہ حضرات متعدد ''ناگزیر وجوہات'' کا شکار ہیں جن کی فہرست بہت طویل ہے۔ مناسب وقت آنے پر ان کی تفصیل ہدیہ قارئین کی جائے گی۔ یہاں ہم ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر صرف ایک مثال بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ہم نے اپنی ایک تالیف ''احکام صیام ومسائل عیدین وآداب قربانی'' میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''قربانی کے احکام ایک نظر میں'' جسے میرے نام کے حوالہ سے مجلّہ الدعوۃ مجریہ اپریل ۱۹۹۹ء میں شائع کیا گیا ہے۔ اس میں لکھا کہ ''قربانی کی کھال یا اس کی قیمت فقراء ومساکین، طالبان دین اور مجاہدین کو دینی چاہیے''۔ میرے الفاظ میں درپیش بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر ''طالبانِ دین اور مجاہدین'' کا اضافہ کرکے ایک مجرمانہ خیانت کا ارتکاب کیا گیا، کیونکہ میں نے اپنی کتاب میں صرف یہ لکھا تھا کہ قربانی کی کھال یا اس کی قیمت فقراء و مساکین کو دینی چاہیے۔ [کتاب مذکور، ص: ۱۱۷]

توجہ دلانے کے باوجود اس کے متعلق کسی قسم کی وضاحت یا معذرت کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ [واللہ اعلم]

سوال کسی پرائیویٹ پارٹی نے کچھ زرعی رقبہ خریدا تاکہ اسے رہائشی پلاٹوں کی صورت میں آگے فروخت کیا جائے، اس میں بچوں کے کھیلنے کے لئے ایک پارک بھی چھوڑا گیا، اب وہاں آبادی ہوچکی ہے۔ اہل محلہ نے مذکورہ پارک کے ایک کونہ میں (جو کہ ایک تکون سی بننے کی وجہ سے پارک کے استعمال میں نہ تھا) ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کی ہے جس کی چار دیواری تقریباً مکمل ہوچکی ہے اور معاملہ چھت تک پہنچ چکا ہے، اب کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ اس جگہ مسجد نہیں بن سکتی، کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟

جواب واضح رہے کہ رائج الوقت قانون کے مطابق یہ ضروری ہے کہ اگر کوئی پارٹی کسی زرعی یا بے آباد زمین کو رہائشی پلاٹوں کی صورت میں فروخت کرنا چاہتی ہے تو سب سے پہلے مجوزہ کالونی کا نقشہ متعلقہ محکمہ کو پیش کردے۔ اس نقشہ میں سڑکوں، سکول، پارک اور مسجد کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ ان تمام چیزوں کا تعلق مشترکہ مفاد عامہ سے ہے۔

صورت مسئولہ میں سڑکوں اور پارک کے لئے تو جگہ چھوڑ دی گئی ہے لیکن مسجد کے لئے جگہ نہ چھوڑ کر مالکان نے مذہب کے ساتھ اپنی ''وابستگی'' کو ظاہر کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لائے تو انہوں نے اپنی رہائش سے پہلے مسجد بنانے کو ترجیح دی تاکہ امت کو یہ سبق دیا جائے کہ رہائشی منصوبے میں مسجد کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ لیکن افسوس کہ ہم نام نہاد مسلمان چند ٹکوں کے لالچ میں اس اہم معاملہ کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ مسجد بھی ایک مشترکہ مفاد ہے کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی، اب چونکہ وہاں اہل محلہ کو خیال آیا ہے کہ یہاں مسجد کا ہونا ضروری ہے تو مجوزہ جگہ پر مسجد تعمیر ہوسکتی ہے کیونکہ وہ جگہ پارک کے استعمال میں نہیں آسکتی، لیکن پیش بندی کے طور پر ایک بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ وہاں مسجد تو ایک ہی تعمیر ہوگی، موجودہ مذہبی تکدر کے پیش نظر اسے اکھاڑا نہ بنایا جائے اور نہ ہی اسے کسی کے لئے ذریعہ معاش بننے دیا جائے بلکہ اہل محلّہ آپس میں مل جل کر مسجد کی آبادی کے لئے کسی ایسے معقول مزاج امام کا انتخاب کریں جو سب کے لئے قابل قبول ہو اور اسے شروع ہی سے مذہبی چھیڑ چھاڑ سے اجتناب کرنے کی تلقین کردی جائے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہم اپنی کالونی میں ۱۵۔۲۰ اہل حدیث ہیں اور ہمارے ہاں کوئی مسجد اہل حدیث نہیں ہے۔ پہلے ہم بریلوی حضرات کی مسجد میں نماز پڑھتے تھے، تین سال قبل انہوں نے ہمیں نماز پڑھنے سے روک دیا، اس کے بعد دیوبند حضرات کی مسجد تعمیر ہوئی تو ہم ان کی مسجد میں نماز ادا کرتے رہے اور دھیمی آواز سے آمین کہتے رہے، اس کے باوجود بھی انہیں تکلیف تھی، ایک دن ہم نے آمین کہی تو امام مسجد نے نماز توڑ کر مقتدیوں کی طرف منہ کرکے کہا ''خنزیرو! تمہیں کیا تکلیف ہے'' اس وقت سے اہل حدیث الگ نماز پڑھتے ہیں، ہمارے ہاں اہل حدیث کا ایک مدرسہ ہے جو زکوۃ وخیرات سے تعمیر کیا گیا ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس مدرسہ میں نماز پڑھ سکتے ہیں اور سپیکر میں اذان دے سکتے ہیں یا مدرسہ کی دوسری منزل پر مسجد تعمیر کرسکتے ہیں؟

جواب دیوبندی حضرات کی طرف سے اہل حدیث حضرات کو کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ بہت متعصب ہیں اور رواداری سے کام نہیں لیتے ہیں۔ ہم نے پورا سوال اس لئے درج کیا ہے تاکہ دیوبندی حضرات کا اہل حدیث لوگوں کے متعلق رویہ سامنے آجائے۔ کیا وزیر آباد کی جماعت مسجد کی تعمیر میں فعال نہیں ہے۔ کیا مسلک کی حمایت میں بے چارے اہل حدیث کا تعاون نہیں کیا جاسکتا، جنہیں ایک سنت پر عمل کرنے کی پاداش میں خنزیر تک کہا جاتا ہے۔ مرکز اہل حدیث کو بھی ایسے لوگوں کے ساتھ دست تعاون

بڑھانا چاہیے۔ ان تمہیدی گزارشات کے بعد سوالات کا جواب حسب ذیل ہے:

جب زکوٰۃ حقدار کو پہنچ جائے تو اس کی زکوٰۃ والی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور جسے زکوٰۃ دی گئی ہے، وہ اسے جہاں چاہے استعمال کر سکتا ہے، چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''جب صدقہ کی حیثیت تبدیل ہو جائے'' اس کے تحت انہوں نے دو احادیث ذکر کی ہیں۔

1 ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ ''کیا تمہارے پاس کوئی چیز ہے؟ عرض کیا کہ حضرت نسیبہ رضی اللہ عنہا نے کچھ بھیجا ہے جو اسے بطور صدقہ دیا گیا تھا، آپ نے فرمایا: ''وہ اپنی جگہ پر پہنچ چکا ہے۔'' [صحیح بخاری، الزکوٰۃ:۱۴۹۴]

مطلب یہ تھا کہ اس گوشت کا استعمال اب ہمارے لئے بھی جائز ہے۔

2 لوگ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو صدقہ کا گوشت دے جاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ گوشت اس کے لئے صدقہ ہے اور ہمارے لئے ہدیہ ہے۔'' [صحیح بخاری، الزکوٰۃ:۱۴۹۵]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان احادیث سے یہ ثابت کیا ہے کہ جب صدقہ کی حیثیت تبدیل ہو جائے تو اس کی ایک ذاتی حیثیت بن جاتی ہے، اسے کسی جگہ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

صورت مسئولہ میں مدرسہ کی جگہ اور تعمیر مال زکوٰۃ سے ہوتی ہے وہاں نماز پڑھنے یا مسجد تعمیر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، احباب جماعت میں سے متمول حضرات کو چاہیے کہ وہاں مسجد تعمیر کریں، جب تک مسجد کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا مدرسہ کی عمارت میں سپیکر نصب کر کے اذان دینا شروع کر دیں اور نماز باجماعت ادا کرنے کا اہتمام کریں۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال مساجد میں نقش و نگار کرنا جائز ہے یا نہیں؟ قرآن و حدیث کے مطابق جواب دیں؟

جواب واضح رہے کہ مساجد میں اس طرح کی مینا کاری اور نقش و نگاری جو نماز پڑھتے وقت نمازی کے لئے خلل اندازی کا باعث ہو، درست نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی زیب و زینت کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا، چنانچہ آپ نے ایک دفعہ منقش چادر میں نماز ادا کی تو بعد میں فرمایا: ''اسے واپس کر دو کیونکہ اس کے نقش و نگار کی وجہ سے میری توجہ ہٹ جانے کا اندیشہ ہے۔'' [صحیح بخاری، الصلوٰۃ:۳۷۴]

اس حدیث کے تحت حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو نمازی کے لئے دوران نماز توجہ ہٹانے کا باعث بنے مکروہ اور ناپسندیدہ ہے، جیسا کہ نقش و نگار وغیرہ۔ [فتح الباری، ص:۴۸۳ ج۱]

مساجد کی زیب و زینت اور نقش و نگاری کی مذمت کے متعلق کئی ایک احادیث میں صراحت کے ساتھ اسے علامات قیامت قرار دیتے ہوئے اس سے آپ نے منع فرمایا ہے، خاص طور پر جب ایسی چیزیں فخر و مباہات کا ذریعہ بن جائیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ''مجھے اس بات کا حکم نہیں دیا گیا کہ مساجد کو چونا گچ کروں یا انہیں نقش و نگار سے آراستہ کروں۔'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ''تم اپنی مساجد کو یہود و نصاریٰ کی طرح خوب مینا کاری سے آراستہ کرو گے۔'' [صحیح ابن حبان:۴/۷۰]

ایک اور حدیث میں ہے کہ لوگوں پر ایسا وقت ضرور آئے گا کہ ''وہ اپنی مساجد کو فخر و مباہات کا ذریعہ بنائیں گے، نماز اور

رشد و ہدایت کے سامان سے اس کی تعمیر نہیں کریں گے۔'' [صحیح بخاری تعلیقاً]

رسول اللہ ﷺ کا یہ بھی فرمان ہے کہ ''جو قوم بد عملی کا شکار ہوتی ہے وہ مساجد کو نقش و نگاری اور بیل بوٹوں سے مزین کرنا شروع کر دیتی ہے۔'' [ابن ماجہ: کتاب المساجد]

یہ روایت اگرچہ سنداً ضعیف ہے، تاہم تائید کے لئے اسے پیش کیا جا سکتا ہے۔ مسجد کو مضبوط اور خوبصورت تو ضرور ہونا چاہیے لیکن نقش و نگار اور مینا کاری سے دور رکھنا چاہیے۔ خاص طور پر محراب والی دیوار پر بیل بوٹے یا شیشہ لگانا جس سے نمازی کی توجہ دوسری طرف لگ جائے سخت معیوب ہے۔

سوال (۱) کیا قرض کی رقم سے مسجد تعمیر کی جا سکتی ہے، نیز کیا زکوٰۃ کی رقم سے مسجد میں چندہ دیا جا سکتا ہے؟ (۲) اگر حکومت وقت غیر شرعی ہو تو کیا زکوٰۃ کی ادائیگی ساقط ہو جاتی ہے یا ہر فرد کو اپنی اپنی زکوٰۃ خود ادا کرنا پڑے گی؟ (۳) کافر اور فاسق کو زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی، نیز طاقتور اور غنی کو بھی زکوٰۃ دینا منع ہے اور جو ۱۲۰ روپیہ یومیہ کماتا ہے کیا اسے بھی زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی؟

جواب ① اگر اہل مسجد اس پوزیشن میں ہیں کہ آیندہ حالات میں چندہ جمع کر کے اپنی گرہ سے قرض اتار سکتے ہیں تو وقتی طور پر قرض لے کر مسجد تعمیر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اگر ان حضرات کی مالی پوزیشن کمزور ہو تو دوسرے مسلمانوں سے تعاون لیا جا سکتا ہے، نیز اگر اہل مسجد خود زکوٰۃ کے حقدار ہیں تو ایسے لوگوں کی مسجد مال زکوٰۃ سے تعمیر کی جا سکتی ہے، بصورت دیگر زکوٰۃ کی رقم مسجد پر لگانے سے پرہیز کرنا چاہیے اسے اہل مسجد کو اپنی گرہ سے تعمیر کرنا چاہیے۔

② حکومت وقت اگر غیر شرعی ہو تو اس سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوتی، جیسا کہ دیگر فرائض کی ادائیگی ضروری ہے، اسی طرح فریضہ زکوٰۃ بھی ادا کرنا ضروری ہے، خواہ وہ انفرادی طور پر ہو۔

③ اگر ۱۲۰ روپیہ یومیہ کمانے سے گھر کا نظام نہیں چلتا کیونکہ افراد خانہ زیادہ ہیں اس یومیہ مزدوری سے اگر کسی کی گھریلو ضروریات پوری نہیں ہوتیں تو ایسے غریب شخص کے ساتھ مال زکوٰۃ سے تعاون کیا جا سکتا ہے۔

سوال ایک آدمی اپنی ذاتی جگہ پر مسجد بناتا ہے لیکن اسے وقف نہیں کرتا، کیا ایسی مسجد میں نماز پڑھنا درست ہے، قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب مسجد کے لوازمات میں سے ہے کہ اس میں نماز باجماعت اور جمعہ وغیرہ کی ادائیگی کا اہتمام ہو۔ بوقت نماز ہر کلمہ گو مسلمان کو اس میں نماز پڑھنے کی آزادی ہو۔ اس قسم کی مسجد کا وقف ہونا ضروری ہے تاکہ کوئی بھی نمازیوں کے لئے مسجد میں نماز کی ادائیگی میں رکاوٹ نہ ڈال سکے۔ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو سب سے پہلے اللہ کا گھر تعمیر کرنے کی طرف توجہ دی۔ اس کے لئے ایک جگہ کا انتخاب کیا گیا اور اس جگہ کے مالکان بنو نجار سے فرمایا کہ ''تم اس جگہ کی قیمت وصول کر کے اسے ہر قسم کے بار ملکیت سے مبرا کرو۔'' انہوں نے بڑی فراخ دلی سے عرض کیا ہم اس کی قیمت اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کی صورت میں وصول کریں گے، اس طرح جب وہ زمین وقف ہو گئی تو پھر آپ نے وہاں مسجد تعمیر فرمائی۔ [صحیح بخاری، الوصایا: ۲۷۷۴]

ویسے غیر وقف شدہ مسجد میں نماز ہو جاتی ہے لیکن شرعی مسجد کے احکام وقف کے بعد لاگو ہوں گے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال جو فنڈ مسجد کی تعمیر وترقی کے لئے جمع کیا جاتا ہے اس سے امام مسجد کی ضروریات کو پورا کرنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے جبکہ امام مسجد خود کفیل نہ ہو، کیا امام مسجد قربانی کی کھالیں وصول کر کے اپنے استعمال میں لاسکتا ہے جبکہ اس کی تنخواہ معقول نہ ہو کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب مسجد کی تعمیر وترقی کے لئے جو فنڈ جمع کیا جاتا ہے اسے مسجد کی ضروریات کے لئے استعمال کرنا جائز ہے اور امام مسجد خود بھی مسجد کی ایک مستقل ضرورت ہے، لہٰذا اس کی تنخواہ اور رہائش کے لئے مکان وغیرہ کی تعمیر، مسجد کے جمع شدہ فنڈ سے ہوسکتی ہے، پھر جبکہ امام خود کفیل بھی نہیں ہے تو اس کی ضروریات کو پورا کرنا اہل مسجد کی ذمہ داری ہے اگر امام مسجد خود کفیل ہے تو اسے چاہیے کہ مسجد کی خدمت فی سبیل اللہ سرانجام دے، اسی طرح کھالیں غرباء، مساکین اور بیواؤں کا حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا کہ قربانی کی کھالوں کو غرباء ومساکین میں تقسیم کردو، اس بنا پر یہ کھالیں نادار اور غرباء ومساکین کا حق ہے، اسے مسجد کی تعمیر وترقی پر خرچ کرنا صحیح نہیں ہے۔ اگر جماعت انتہائی غریب ہے اور مقامی طور پر مستحقین موجود نہیں ہیں تو ایسی صورت میں غریب جماعت پر کھالوں کو استعمال کرنے کی گنجائش نکل سکتی ہے، تاہم بہتر ہے کہ اہل مسجد جیسے اپنی ضروریات کو پورا کرتے ہیں مسجد کی ضروریات کو بھی اپنی ضروریات کی فہرست میں شامل کریں، امام مسجد اگر تنخواہ دار ہے تو اسے قربانی کی کھالیں لینا درست نہیں ہے اگر تنخواہ کم ہے اور اس سے گزارہ نہیں ہوتا تو وہ غرباء ومساکین کی طرح ہے، ایسے حالات میں بقدر حصہ قربانی کی کھالیں لے سکتا ہے، اسی طرح تنخواہ کے عوض امام مسجد کو قربانی کی کھالیں دینا بھی جائز نہیں ہے، جیسا کہ ہمارے ہاں دیہاتیوں میں عام رواج ہے۔ مسجد کا امام مسجد کی ضرورت ہے اور اسے پورا کرنا اہل مسجد کی ذمہ داری ہے قربانی کی کھالیں غرباء ومسکین کا حق ہے اور یہ حق غرباء ومساکین کو ہی ملنا چاہیے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال مسجد کی ضرورت کے لئے جو چندہ وصول کیا جاتا ہے کیا اس رقم سے جلسہ وغیرہ کا خرچہ برداشت کیا جاسکتا ہے (یعنی اس چندے سے اشتہارات علما حضرات کے کھانے ودیگر لوازمات پورے کئے جاسکتے ہیں؟)

جواب مسجد کے لئے جو چندہ جمع کیا جاتا ہے اسے صرف مسجد کی ضروریات اور اس کے دیگر لوازمات وغیرہ پر ہی صرف کیا جاسکتا ہے، مثلاً: بجلی کا بل، صفیں خریدنا، وضو کا اہتمام اور پانی کا انتظام وغیرہ۔ جلسہ وغیرہ کا اہتمام مسجد کی بنیادی ضرورت نہیں ہے کیونکہ مقامی طور پر دعوت وارشاد کا کام خطیب سے پورا ہورہا ہے۔ اگر اہل مسجد جلسہ وغیرہ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو اکیلے جلسہ کے نام پر الگ چندہ جمع کیا جائے، مسجد کا چندہ جو مسجد کے نام سے جمع کیا گیا ہو اسے مسجد کی ضروریات پر ہی صرف کرنا چاہیے اگر مسجد میں مستقل طور پر رشد وہدایت کا بندوبست کردیا جائے تو سب سے بہتر ہے تاکہ مسجد میں آنے والے نمازی اپنی دینی تشنگی دور کرسکیں اور زندگی میں پیش آمدہ مسائل کا حل تلاش کرسکیں۔ [واللہ اعلم]

طہارت و وضو

طہارت و وضو

سوال ہم وضو سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا کرتے تھے، اب پتہ چلا ہے کہ صرف بسم اللہ پڑھنا چاہیے، قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں؟

جواب پچھلے دنوں ہمارے ایک مہربان نے ''جدید محققین کرام کی خدمت میں'' کے عنوان سے ایک معاصر رسالے میں لکھا تھا کہ کھانے اور وضو سے قبل صرف بسم اللہ کہے یا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پوری پڑھے؟ بعض کا فتویٰ بسم اللہ پڑھنے کا ہے، بعض بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں اور اس کو مستحب بتاتے ہیں۔ مذکورہ صورتحال کے پیش نظر تو کھانے اور وضو سے قبل بسم اللہ پڑھنے کو سرے سے ہی چھوڑ دینا زیادہ باعث عافیت معلوم ہوتا ہے (تنظیم اہل حدیث مجریہ ۲۵ مارچ ۲۰۰۴ء)

معزز قارئین! اس سلسلہ میں ہمیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہم اہل حدیث ہیں اور اختلاف کے وقت اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرنے کا عقیدہ رکھتے ہیں، چنانچہ اس کے متعلق حدیث ہے کہ ''اس شخص کا وضو نہیں جو اللہ کا نام ذکر نہیں کرتا۔'' [ابوداود، الطہارۃ:۱۰۱]

یہ حدیث متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے جن کی تعداد نو (۹) تک پہنچتی ہے۔ ہر حدیث کی سند کے متعلق محدثین نے کلام کیا ہے، تاہم ان کے مجموعہ سے قوت پیدا ہو جاتی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی اصل لامحالہ موجود ہے۔ [تلخیص الحبیر ص:۲۵۷، ج۱]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں سب سے زیادہ قوی حدیث وہ ہے، جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے۔ [تمام المنہ ص:۸۹]

اب اس بات کی وضاحت کرنا ہے کہ وضو کرتے وقت جو اللہ کا نام ذکر کرنا اس سے مراد بسم اللہ ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا ہے۔ امام ابن السنی نے اپنی تالیف ''عمل الیوم واللیلۃ'' میں ایک عنوان بایں الفاظ میں قائم کیا ہے کہ وضو کرتے وقت اللہ کا نام کیسے لیا جائے، یعنی تسمیہ سے کیا مراد ہے؟ چنانچہ انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تَوَضَّؤُوْا بِاسْمِ اللّٰہِ'' یعنی بسم اللہ پڑھ کر وضو کرو۔ [عمل الیوم واللیلۃ: حدیث نمبر ۲۷]

اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی عملی طور پر صرف ''بسم اللہ'' کہنا ہی ثابت ہے، جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ پانی کے برتن میں رکھا، پھر فرمایا ''بسم اللہ اچھی طرح وضو کرو۔'' [مسند امام احمد ص۲۹۲، ج۳]

اس سے معلوم ہوا کہ وضو کے شروع میں بسم اللہ کے ساتھ الرحمن الرحیم کے الفاظ ثابت نہیں ہیں، جیسا کہ ذبح کرتے وقت صرف بسم اللہ کہنا مشروع ہے اور ہم اس کے ساتھ الرحمن الرحیم کا اضافہ نہیں کرتے اسی طرح وضو کے شروع میں ان الفاظ کو نہ پڑھنا ہی قرین قیاس ہے۔ چنانچہ ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ تسمیہ سے مراد ''بسم اللہ'' کہنا ہے اس کے علاوہ کوئی

دوسرے الفاظ اس کے قائم مقام نہیں ہوسکتے، جیسا کہ ذبح کرتے، کھانا کھاتے اور پانی پیتے وقت یہی تسمیہ مشروع ہے اور اس کا محل نیت کے بعد وضو کے تمام اعمال سے پہلے ہے۔ [مغنی، ص:۱۴۶، ج۱]

اس کے علاوہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''اے ابو ہریرہ! جب وضو کرو تو پہلے بسم اللہ والحمدللہ پڑھ لیا کرو۔'' [مجمع الزوائد، ص:۲۲۰، ج۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی فرمایا کہ ''جب وضو کرو تو بسم اللہ پڑھو۔'' [المطالب العلیہ، ص:۲۵، ج۱]

لیکن اس آخری حدیث کی سند میں حارث نامی راوی ضعیف ہے، تاہم اسے بطور استدلال نہیں بلکہ تائید کے لئے پیش کیا ہے۔ ان احادیث کے پیش نظر وضو کے شروع میں صرف ''بسم اللہ'' پڑھنا مشروع ہے۔ اختلاف سے دل برداشتہ ہوکر بسم اللہ کو ترک کردینا زیادہ باعث عافیت نہیں ہے، جیسا کہ ہمارے ''مہربان'' نے موقف اختیار کیا ہے۔ ہاں، اگر بھول کی وجہ سے وضو کے آغاز میں ''بسم اللہ'' نہیں پڑھی گئی تو دوران وضو جب بھی یاد آئے تو اسے پڑھا جاسکتا ہے اگر وضو مکمل ہونے کے بعد یاد آئے تو اس کے بغیر بھی صحیح ہے۔ اسے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ امام ابوداؤد نے امام احمد سے دریافت کیا کہ جب کوئی وضو میں بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو کیا حکم ہے آپ نے جواب دیا کہ ''مجھے امید ہے کہ اس پر کچھ نہیں ہے۔'' [مغنی لابن قدامہ، ص:۱۴۶، ج۱]

سوال ابوداؤد میں لکھا ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت مسح علی الجوربین متصل نہیں ہے، اس روایت کے علاوہ کوئی دوسری روایت جس سے جرابوں پر مسح کرنا ثابت ہو تو مطلع کریں؟

جواب ہم نے اہل حدیث مجریہ ۲۹ جون ۲۰۰۱ شمارہ نمبر ۲۴ میں جرابوں پر مسح کے متعلق ایک فتویٰ لکھا تھا اس میں چار احادیث کا حوالہ دیا تھا۔ ہم نے یہ بھی لکھا تھا کہ ان احادیث پر کچھ اعتراضات ہیں۔ ہم ان کی وضاحت اور مفصل جواب کسی اور فرصت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ حسن اتفاق کہ اس سلسلہ میں ہی یہ ایک سوال ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت متصل نہیں ہے پہلے ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ واضح ہو کہ امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں اس روایت کے متعلق مذکورہ الفاظ بیان نہیں کئے ہیں، بلکہ فرمایا ہے کہ عبدالرحمٰن بن مہدی اس حدیث کو بیان نہیں کرتے تھے کیونکہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مشہور حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موزوں پر مسح کیا تھا۔ [ابوداؤد، الطہارۃ:۱۵۹]

جن حضرات نے اس حدیث پر جرح کی ہے ان کی بنیاد حضرت عبدالرحمٰن بن مہدی کا یہی قول ہے، حالانکہ یہ حدیث صحیح ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں، امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے۔ [ترمذی، الطہارۃ:۹۹]

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ متاخرین سے ہیں، انہوں نے اس حدیث کے متعلق متقدمین کے اقوال کا جائزہ لینے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے اس میں شک نہیں ہے کہ مذکورہ حدیث صحیح الاسناد ہے کیونکہ حضرت مغیرہ سے روایت کرنے والے ہذیل بن شرحبیل ثقہ ہیں، نیز ان کی روایت کو شاذ بھی نہیں کہا جاسکتا، جیسا کہ عبدالرحمٰن بن مہدی کے قول سے تاثر ملتا ہے کیونکہ اس کے لئے واقعہ کا ایک ہونا ضروری ہے مگر یہاں موزوں پر مسح والی روایت سفر سے متعلق ہے کیونکہ روایت میں اس کی صراحت ہے اور جرابوں میں مسح کی روایت میں سفر وغیرہ کا ذکر نہیں ہے، لہٰذا یہ دو مستقل حدیثیں ہیں، اس بنا پر مذکورہ اضافے کو شاذ یا منکر نہیں کہا جاسکتا، پھر صحابہ

کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے، چنانچہ امام ابوداؤد لکھتے ہیں کہ حضرت علی بن ابی طالب، ابومسعود، براء بن عازب، انس بن مالک، ابوامامہ، سہل بن سعد، عمرو بن حریث، عمر بن خطاب اور ابن عباس رضی اللہ عنہم نے جرابوں پر مسح کیا، سائل نے جس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ وہ متصل نہیں ہے وہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس کے متعلق امام ابوداؤد لکھتے ہیں کہ وہ روایت متصل نہیں اور نہ ہی قوی ہے، اس روایت کو ابن ماجہ نے بیان کیا ہے۔ [الطہارۃ:۵۶۰]

اس روایت پر دو اعتراض ہیں ایک یہ کہ مذکورہ روایت متصل نہیں کیونکہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والے ضحاک بن عثمان ہیں جسے حضرت موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے سماع حاصل نہیں ہے، حالانکہ یہ دعویٰ انتہائی سطحی ہے کیونکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جو اس فن میں ید طولیٰ رکھتے ہیں فرماتے ہیں کہ اسے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے سماع حاصل ہے۔ [تاریخ کبیر،ص:۳۳۴،ج۲]

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس روایت میں ایک راوی عیسیٰ بن سنان ہے جسے امام احمد وغیرہ نے بھی ضعیف کہا ہے، حالانکہ ابن سنان کے متعلق علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ اس کی احادیث لکھی جاتی ہیں۔ بعض محدثین نے اسے ثقہ قرار دیا ہے اور امام عجلی کہتے ہیں کہ اس سے روایت لینے میں چنداں حرج نہیں ہے۔ [میزان الاعتدال]

اس کے علاوہ دو مزید روایات پیش خدمت ہیں جو جرابوں پر مسح کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں:

① حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مہم کیلئے ایک فوجی دستہ بھیجا جنہیں سردی سے تکلیف ہوئی جب وہ واپس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سخت سردی کی شکایت کی تو آپ نے حکم دیا کہ وہ پگڑی اور جرابوں پر مسح کر لیا کریں۔ [مسند امام احمد،ص۲۷۵،ج۵ محلیٰ ابن حزم،ص:۸۱،ج۲]

② حضرت ازرق بن قیس کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ بے وضو ہوئے تو انہوں نے وضو کے لئے ہاتھ اور منہ کو دھویا، پھر اون کی جرابوں پر مسح کیا، لوگوں نے اعتراض کیا کہ ان پر مسح کرنا جائز ہے؟ اس پر آپ نے فرمایا: کیوں نہیں؟ یہ بھی موزے ہیں لیکن اون کے ہیں۔ [الکنیٰ والاسماء للدولابی،ص:۱۸۱ج۱]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت متعدد طرق سے مروی ہے۔ [محلیٰ ابن حزم،ص:۸۵،ج۲]

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ابومقاتل سمرقندی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ کے پاس اس وقت گئے جب وہ بیمار تھے انہوں نے وضو کے لئے پانی منگوایا اور وضو کیا، آپ نے جرابیں پہن رکھی تھیں۔ انہوں نے ان پر مسح کیا اور فرمایا کہ میں نے آج ایسا کام کیا ہے جو پہلے نہیں کرتا تھا، یعنی میں نے جرابوں پر مسح کیا جن کے نیچے چمڑا نہیں لگا ہوا، یعنی سادہ ہیں۔ [ترمذی،الطہارۃ:۹۹]

سوال وضو کے بعد دو رکعت ادا کرنے کی شرعی حیثیت واضح فرمائیں، بعض لوگ عصر کے بعد بھی وضو کی دو رکعت پڑھتے ہیں، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کے بعد نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے، کتاب و سنت کی روشنی میں اس الجھن کو دور کریں؟

جواب وضو کے بعد دو رکعت پڑھنا احادیث سے ثابت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ مکمل وضو کیا، پھر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا تھا اور آپ نے

فرمایا تھا: ''جس شخص نے میرے اس وضو کی طرح وضو کیا، پھر اس نے دو رکعت ادا کیں کہ پڑھتے وقت دل میں دنیاوی خیالات پیدا نہیں ہونے دیے تو اللہ تعالیٰ اس کے سابقہ تمام گناہ معاف فرما دے گا۔'' [صحیح بخاری:۱۶۴]

اسی طرح حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو مسلمان اچھی طرح وضو کرے، پھر کھڑا ہو کر مکمل توجہ کے ساتھ دو رکعت پڑھے تو اس کے لئے جنت واجب ہو جاتی ہے۔'' [صحیح مسلم:۲۳۴]

صبح کی نماز کے بعد ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اے بلال! تم کس عمل کی وجہ سے جنت میں میرے آگے آگے تھے؟ میں جب بھی جنت میں داخل ہوا تو میں نے اپنے آگے تمہارے چلنے کی آواز ضرور سنی اور آج رات بھی اسی طرح ہوا کہ میں جنت میں داخل ہوا تو اپنے آگے تیرے چلنے کی آواز سنی، انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے جب بھی اذان کہی، اس کے بعد دو رکعت ضرور ادا کیں اور جب بھی میرا وضو ٹوٹا تو میں نے دوبارہ وضو کیا تو دو رکعت ادا کیں، میں نے یہ ذہن بنالیا ہے کہ دو رکعت پڑھنا اللہ تعالیٰ کا مجھ پر حق ہے۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انہی دو رکعت کے پڑھنے کی وجہ سے تم جنت میں میرے آگے آگے تھے۔'' [مسند امام احمد،ص:۳۶۰،ج۵]

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وضو کے بعد دو رکعت ہر وقت ادا کی جاسکتی ہیں، اس میں ممنوع اوقات کی بھی پابندی نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا جب بھی وضو ٹوٹتا تو وہ ہر مرتبہ وضو کرتے اور وضو کے بعد نماز پڑھتے، خواہ کوئی بھی وقت ہوتا۔ [فتح الباری،ص۳۵،ج۳]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی موقف ہے کہ سنت وضو ہر وقت پڑھی جاسکتی ہیں، اگرچہ ممنوع اوقات میں سے کوئی وقت کیوں نہ ہو۔ [الاختیارات،ص:۱۰۱]

واضح رہے کہ مطلق نوافل ممنوعہ اوقات میں ادا کرنا منع ہیں، البتہ جن نوافل کا کوئی سبب ہو جنہیں فقہاء کی اصطلاح میں ''صلوٰۃ سببی'' کہتے ہیں، انہیں ہر وقت ادا کیا جاسکتا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے اس کی تفصیل لکھی ہے۔ [فتح الباری،ص:۳۵،ج۳]

سوال ''لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ'' اس آیت کریمہ کے پیش نظر کیا قرآن پاک کو بلا وضو ہاتھ لگایا جاسکتا ہے یا نہیں کتاب وسنت کے مطابق جواب دیں؟

جواب سوال میں ذکر کردہ آیت کا معنی یہ ہے کہ ''قرآن مجید کو پاک لوگوں کے سوا اور کوئی نہیں چھو سکتا۔'' [۵۶/الواقعۃ:۷۹]

مفسرین نے اس آیت کریمہ کے کئی ایک مطلب بیان فرمائے ہیں۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ پاکیزہ لوگوں سے مراد فرشتے ہیں، یعنی یہ کتاب قرآن مجید لوح محفوظ میں ثبت ہے وہاں سے پاک فرشتے ہی لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے ہیں کسی شیطان کی وہاں تک دسترس نہیں ہوسکتی جو اسے لا کر کسی کاہن کے دل پر نازل کر دے۔

☆ قرآن پاک کے مطالب ومضامین تک رسائی صرف ان لوگوں کی ہوسکتی ہیں جن کے خیالات پاکیزہ ہوں اور کفر وشرک کی آلودگی سے پاک ہوں۔ عقل صحیح اور قلب سلیم رکھتے ہوں۔ جن لوگوں کے خیالات ہی گندے ہوں ان کی رسائی قرآن کریم کے

بلند پایہ مطالب تک نہیں ہوسکتی۔ قرآن پاک کو صرف پاکیزہ لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔ ناپاک اور گندے لوگوں کو چاہیے کہ وہ اسے ہاتھ نہ لگائیں۔ شرعی اصطلاح میں لفظ طاہر یا مطہر چار چیزوں کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے:

① کفار و مشرکین کے مقابلہ میں بندہ مؤمن کو طاہر کہا جاتا ہے، خواہ وہ جنبی ہی کیوں نہ ہو۔

② جنابت آلودہ آدمی کے مقابلہ میں غیر جنبی کو طاہر کہا جاتا ہے، خواہ وہ بے وضو ہو۔

③ بے وضو کے مقابلہ میں باوضو آدمی پاک ہے، خواہ اس کے کپڑوں پر نجاست لگی ہوئی ہو۔

④ نجاست آلود جسم یا نجس کپڑوں والے شخص کے مقابلہ میں وہ شخص طاہر ہے جس کے جسم یا کپڑوں پر نجاست نہ ہو۔ ایسے حالات میں قرآنی آیات کا مفہوم متعین کرنے کے لئے صاحب قرآن کے ارشادات کی طرف رجوع کرنا ہوگا، چنانچہ احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے مراد باوضو انسان ہے، یعنی بے وضو انسان کو چاہیے کہ وہ قرآن پاک کو ہاتھ لگانے سے اجتناب کرے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل یمن کے نام سے ایک ہدایت نامہ میں فرمایا تھا: ''طاہر انسان کے علاوہ اور کوئی قرآن پاک کو ہاتھ نہ لگائے۔'' [دارمی، کتاب الطلاق، ص۱۶۱، ج۲]

یہ حدیث حضرت عمرو بن حزم، حکیم بن حزام، عبداللہ بن عمر اور حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہم سے متعدد کتب حدیث میں مروی ہے۔ اگرچہ تمام مرویات میں کچھ ضعف پایا جاتا ہے، تاہم کثرت طرق کی وجہ سے اس کی تلافی ممکن ہے، جیسا کہ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ [ارواء الغلیل، ص:۱۶۰، ج۱]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت مصعب بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میرے والد گرامی قرآن پاک کی تلاوت کررہے تھے اور میں خود قرآن پاک پکڑے ہوئے تھا، اسی دوران مجھے خارش کی حاجت ہوئی تو والد گرامی نے فرمایا ''شاید تو نے خارش کے دوران اپنی شرمگاہ کو ہاتھ لگایا ہے'' میں نے کہا ہاں، تو فرمانے لگے جاؤ! وضو کرکے آؤ۔ چنانچہ میں وضو کرکے دوبارہ واپس آیا۔ [بیہقی، ص:۸۸، ج۱]

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی قسم کا ایک واقعہ منقول ہے، اسحاق مروزی کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کیا بے وضو آدمی قرآن پاک کو ہاتھ لگا سکتے ہیں فرمایا: ہاں، لیکن قرآن پاک دیکھ کر پڑھنے کی صورت میں اسے باوضو ہونا چاہیے کیونکہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قرآن پاک کو بے وضو آدمی ہاتھ نہ لگائے۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کا یہی معمول تھا۔ [ارواء الغلیل، ص:۱۶۱، ج۱]

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن پاک کو باوضو ہو کر ہاتھ لگانا چاہیے ہاں! حفظ کرنے والے بچوں کو اس کے متعلق رعایت ہے اس کی تفصیل مغنی لابن قدامہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ [ص۲۰۲ ج۱ واللہ اعلم]

سوال مردوں کے لئے سونے کے دانت لگوانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کلی کرتے وقت اسے اتارنا ہوگا یا اتارے بغیر کلی کرنا صحیح ہوگا؟

جواب اگر سونے کا دانت مردوں کی مجبوری اور ضرورت ہو تو مرد حضرات سونے کا دانت لگوا سکتے ہیں۔ بصورت دیگر جائز

نہیں ہے۔ کیونکہ حدیث کے مطابق مردوں کے لئے سونا پہننا اور انہیں بطور زیورات استعمال کرنا حرام ہے۔ عورتیں اگر سونے کا دانت بطور زیب و زینت استعمال کرتی ہوں تو جائز ہے بصورت دیگر اسراف ہے۔ اس کی اجازت نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کی عورتوں کے لئے سونے اور ریشم کو حلال قرار دیا گیا ہے۔'' [ترمذی، اللباس:۱۷۲۰]

اگر کسی نے ضرورت کے پیش نظر سونے کا دانت لگوایا تھا تو فوتگی کے بعد اگر آسانی سے اتارا جاسکے تو اسے اتار لینا چاہیے۔ کیونکہ سونا مال ہے، وفات کے بعد وہ اس کے وارثوں کا ہو چکا ہے، اگر کسی نے مصنوعی دانت لگوائے ہوں تو وضو یا غسل کرتے وقت انہیں اتارنا ضروری نہیں ہے، کیونکہ دانتوں کا اپنی جگہ سے بار بار اتارنا اور انہیں دوبارہ لگانا بہت مشکل کام ہے، اس بنا پر وضو کرتے وقت انہیں اتارنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔

سوال کیا اونٹ کا گوشت کھانے سے وضوٹوٹ جاتا ہے قرآن وحدیث کے مطابق جواب دیں؟

جواب اونٹ کا گوشت کھانے سے وضوٹوٹ جاتا ہے اس کے بعد حقیقی وضو کرنا ہوگا۔ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک آدمی نے سوال کیا: آیا میں اونٹ کے گوشت سے وضو کروں، آپ نے فرمایا: ''ہاں اونٹ کے گوشت سے وضو کرو۔'' [صحیح مسلم، الحیض:۳۶۰]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرنا چاہیے، وہ گوشت جسم کے کسی حصے یا عضو کا ہو ناقض وضو ہے۔ اس کے علاوہ کسی بھی حلال جانور کا گوشت ناقض وضو نہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک عورت کے ذمے غسل جنابت کرنا تھا لیکن اسے حیض آ گیا، اب اس کے لئے کیا حکم ہے؟

جواب اگر کسی مرد یا عورت نے غسل جنابت کرنا ہو تو بلا وجہ تاخیر کرنا مناسب نہیں ہے، اس کی حکمی نجاست کو جس قدر ممکن ہو جلدی دور کر لیا جائے لیکن اگر کسی مجبوری کی وجہ سے کوئی عورت غسل جنابت نہیں کر سکی، اس دوران اسے حیض آ گیا تو اب الگ سے غسل جنابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے اگر وہ نفسیاتی طور پر اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہے تو الگ بات ہے، تاہم پیش آمدہ صورت حال میں اسے غسل جنابت کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی فائدہ ہے جب حیض سے فارغ ہو تو دونوں کے لئے ایک غسل کافی ہوگا، حیض کی کثافت، جنابت سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ جنابت کی حالت میں روزہ رکھنے کی اجازت ہے جبکہ بحالت حیض روزہ رکھنے کی ممانعت ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق اسے الگ سے غسل جنابت کے تکلف کی ضرورت نہیں، بلکہ ایام سے فراغت کے بعد ایک ہی غسل کافی ہوگا۔ [واللہ اعلم]

سوال میری ہمشیرہ کی شادی کو چار سال ہو چکے ہیں اسے بعض اوقات دوران حمل خون جاری ہو جاتا ہے اور حمل بھی برقرار رہتا ہے، ایسے خون کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا اس دوران نماز، روزہ ادا کرنا چاہیے یا نہیں، کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب حیض وحمل کے اعتبار سے عورتوں کو عام طور پر تین اقسام دیکھنے میں آتی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

① اکثر عورتیں ایسی ہیں کہ انہیں استقرار حمل کے بعد حیض آنا بند ہو جاتا ہے، وہ عورتیں صرف حیض کے بند ہونے سے حمل کو پہچانتی

ہیں۔اللہ تعالیٰ کا یہ عجیب نظام ہے کہ جب حمل کی وجہ سے خون حیض بند ہو جاتا ہے تو بچہ کے لئے ماں کے پیٹ میں وہ غذا کے کام آتا ہے جو خون بچے کی غذا سے زائد ہوتا ہے۔وہ رحم میں جمع ہوتا رہتا ہے، ولادت کے وقت وہی جمع شدہ خون نفاس کی صورت میں باہر نکلتا ہے۔

② بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں حمل کے دوران اپنی عادت کے مطابق خون آتا ہے جس طرح حمل سے پہلے ہوتا ہے، اس خون کا حکم حیض کا ہے کیونکہ یہ جاری رہتا ہے اور حمل کی وجہ سے متاثر نہیں ہوتا ہے اور یہ خون ہر اس چیز سے روکتا ہے جس سے حیض روکتا ہے اور ہر اس چیز کو واجب کرتا ہے جسے حیض واجب کرتا ہے دراصل بچے کی غذا سے فالتو خون رحم میں جمع نہیں ہوتا بلکہ وہ رحم کے ذریعے حسب عادت جاری رہتا ہے۔

③ بعض عورتیں ایسی بھی ہیں جنہیں سرے سے حیض آتا ہی نہیں ہے اور انہیں حمل بھی ٹھہرتا ہے وہ اپنے حمل کو اندرونی یا بیرونی علامات سے پہچان لیتی ہیں، اس قسم کی عورتیں بہت کم ہیں لیکن ہوتی ضرور ہیں۔صورت مسئولہ کی نوعیت معلوم کرنے کے لئے دوران حمل آنے والے خون کی دو اقسام ہیں:

(الف) اسے حیض کا خون شمار کیا جائے جو عورت کو اس طرح آ رہا ہے جس طرح حمل سے پہلے تھا۔اس کا معنی یہ ہے کہ عورت اس دوران نماز روزہ ادا نہیں کرے گی اور اس سے فراغت کے بعد غسل کر کے فوت شدہ روزوں کی قضا دینا ہوگی، البتہ اس دوران رہ جانے والی نمازوں کو ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(ب) وہ خون جو عادت سے ہٹ کر حاملہ کو اچانک آتا ہے اور یہ کسی حادثہ یا کسی چیز سے گرنے کے سبب ہوتا ہے، یہ خون حیض کا نہیں بلکہ رگ کا خون ہے اور یہ نماز روزہ سے رکاوٹ نہیں بنتا، پھر اگر حادثہ کی وجہ سے حمل ساقط ہو جائے تو اس کی مزید دو اقسام ہیں:

☆ اگر اس حمل میں انسانی تخلیق ظاہر ہو چکی ہے تو اس کے بعد آنے والا خون نفاس کا ہے اور عورت اس میں نماز روزہ ترک کر دے گی کیونکہ انسانی تخلیق کا ضابطہ یہ ہے کہ چار ماہ بعد جنین میں روح ڈالی جاتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: ''بے شک تم میں سے ہر ایک کا مادہ اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دن جمع کیا جاتا ہے، پھر چالیس دن تک ایک لوتھڑا بنتا ہے، پھر چالیس دن تک گوشت کا ٹکڑا بنتا ہے، پھر فرشتے کے ذریعے اس میں روح پھونک دی جاتی ہے اور اس کا رزق، اجل، عمل اور اچھا یا برا ہونا لکھ دیا جاتا ہے۔''

[صحیح بخاری، التوحید: ۷۴۵۴]

اگر چار ماہ سے قبل، یعنی اس میں روح پڑنے سے پہلے اسقاط ہو جائے اور اس میں انسانی تخلیق نہیں ہوتی تو وہ نفاس کا خون نہیں ہے، بلکہ بیماری کا ہے جو نماز روزہ اور دوسری چیزوں سے رکاوٹ کا باعث نہیں ہے۔سائلہ کو چاہیے کہ وہ تفصیل بالا کے مطابق عمل کرے۔ [واللہ اعلم]

سوال زچگی کے بعد خون بند نہیں ہوتا، دو ماہ سے ایک خاتون کو یہ عارضہ لاحق ہے، اس کے لئے شریعت میں کیا حکم ہے کہ وہ ایسے حالات میں نماز پڑھ سکتی ہے؟ اگر پڑھ سکتی ہے تو وضو وغیرہ کا کیا طریقہ ہوگا؟ تفصیل سے ہمیں آگاہ فرمائیں۔

جواب زچگی کے بعد جو خون آتا ہے، اسے شریعت کی اصطلاح میں نفاس کہا جاتا ہے۔ استقرار حمل کے بعد یہ حیض کا ہی خون ہوتا ہے جو رحم مادر کے اندر جمع ہو کر بچے کی خوراک اور اس کی حفاظت کے کام آتا ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد جمع شدہ خون جب خارج ہوتا ہے تو اس کے ختم ہونے کے لئے کئی دن درکار ہوتے ہیں۔ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ علیہم کے نزدیک ولادت کے خون کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں نفاس والی عورتیں چالیس دن بیٹھا کرتی تھیں۔'' [ابوداؤد، الطہارۃ: ۳۱۲]

اگر چالیس دن کے بعد بھی خون بند نہ ہو بلکہ جاری رہے تو اکثر اہل علم کے نزدیک وہ خون استحاضہ ہے، جس میں عورت نماز کے لئے تازہ وضو کرتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت ابی حبیش کو استحاضہ کا عارضہ تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم ہر نماز کے لئے وضو کر لیا کرو۔'' [صحیح بخاری، الوضو: ۲۲۸]

صورت مسئولہ میں اگر عورت کو چالیس دن کے بعد خون نفاس بند نہیں ہوا تو اسے چاہیے کہ وہ غسل کر کے نماز شروع کر دے، البتہ اسے ہر نماز کے لئے تازہ وضو کرنا ہوگا۔ ایک وضو سے ایک نماز کے فرض اور سنتیں وغیرہ ادا کی جاسکتی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نفاس والی عورت سات دن تک انتظار کرے اگر پاک ہو جائے تو ٹھیک ورنہ چودہ دن انتظار کرے، پھر اکیس دن زیادہ سے زیادہ چالیس دن تک خون بند ہونے کا انتظار کرے اگر پھر بھی بند نہ ہو تو غسل کر کے نماز پڑھنا شروع کر دے۔ [بیہقی ص: ۳۴۱، ج ۱]

حضرت عمر اور انس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ واضح رہے کہ دوران نفاس جو نمازیں فوت ہو جائیں انہیں قضا کے طور پر پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ حضرت ام سلمیٰ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نفاس والی عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چالیس دن نماز نہیں پڑھا کرتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دنوں فوت ہونے والی نمازوں کے متعلق قضا کا حکم نہیں دیا۔

[بیہقی ص: ۳۴۱، ج ۱]

سوال ایک آدمی نے قضائے حاجت کے بعد صرف ڈھیلے استعمال کئے پانی سے استنجا نہیں کیا، اس کے بعد وضو کر کے جماعت کرادی، کیا شرعاً ایسا کرنا درست ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

جواب واضح رہے کہ امامت کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے، امام کو چاہیے کہ وہ اپنے مقتدیوں کے سامنے قطعاً کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے ان کے جذبات میں اشتعال پیدا ہو سکتا ہو، چونکہ امام مقتدیوں کے لئے ایک نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے امام کے لئے بہترین اخلاق اور مثالی کردار کا حامل ہونا ضروری ہے۔ بلاشبہ قضائے حاجت کے بعد صرف ڈھیلے استعمال کرنے سے طہارت مکمل ہو جاتی ہے اگر ایسا کرنے کے بعد باوضو ہو کر نماز پڑھاتا ہے تو اس کی نماز میں کوئی نقص نہیں ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''جب تم میں سے کوئی قضائے حاجت کے لئے جائے تو طہارت کے لئے تین پتھر ساتھ لے جائے، فراغت کے بعد انہیں استعمال کرنا طہارت کے لئے کافی ہے۔'' [ابوداؤد، کتاب الطہارۃ: ۴۰]

تاہم بہتر ہے کہ پانی سے استنجا کیا جائے کیونکہ پانی سے طہارت اور صفائی اچھی طرح ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

فرماتی ہیں: ''عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنے خاوندوں کو پانی سے استنجا کرنے کی تلقین کریں کیونکہ ایسے معاملات میں مجھے گفتگو کرنے سے شرم آتی ہے، رسول اللہ ﷺ ایسا کرتے تھے، یعنی وہ پانی سے استنجا کرتے تھے۔'' [نسائی، کتاب الطہارۃ: ۴۶]

اگر ڈھیلے اور پانی دونوں میسر ہوں اور ڈھیلے استعمال کرنے کے بعد پانی سے استنجا کیا جائے تو بہت بڑی فضیلت ہے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اہل قبا کی طہارت کے متعلق فضیلت بیان فرمائی ہے۔ جب اس کی وجہ دریافت کی گئی تو انہوں نے بتایا کہ ہم ڈھیلے استعمال کرنے کے بعد پانی استعمال کرتے ہیں۔ بہر حال امام کو چاہیے کہ وہ ایسی باتوں کا خیال رکھیں اور مقتدیوں کو بھی چاہیے کہ وہ ایسی باتوں کو فساد و فتنہ کا ذریعہ نہ بنائیں، اگر مسئلہ کا علم نہ ہو تو کسی اہل علم کی طرف رجوع کریں۔ [واللہ اعلم]

سوال مجھے بار بار پیشاب آنا اور ریح خارج ہونے کا مرض لاحق ہے، اس کے علاوہ پیشاب کے بعد قطرے آنے کی بھی شکایت ہے، دوران نماز بھی بعض اوقات یہ عمل جاری رہتا ہے، اس لئے میں شلوار یا چادر کے نیچے جانگیہ پہنتا ہوں، ایسے حالات میں مجھے نماز کے لئے کیا کرنا چاہیے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب جس شخص کو بار بار پیشاب آنے یا ریح خارج ہونے کا مستقل عارضہ لاحق ہو، اس کے متعلق محدثین کا یہ موقف ہے کہ وہ ہر نماز کے لئے تازہ وضو کرے اور اس وضو سے ایک فریضہ، خواہ ادا ہو یا قضا نماز پڑھ سکتا ہے۔ اس نماز کی سنتیں وغیرہ بھی اسی وضو سے ادا کی جا سکتی ہیں۔ اس موقف کی بنیاد حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا کا واقعہ ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے ایک دفعہ شکایت کی مجھے کثرت سے خون آتا ہے اور کسی وقت اس کی بندش نہیں ہوتی ایسے حالات میں کیا مجھے نماز چھوڑ دینے کی اجازت ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ''یہ خون حیض کا نہیں ہے جس کی وجہ سے نماز ترک کر دی جائے بلکہ یہ ایک بیماری کی وجہ سے رگ خون بہہ پڑتی ہے مخصوص ایام میں تو نماز ترک کی جا سکتی ہے۔'' اگر خون بدستور جاری رہے تو غسل کر کے نماز ادا کرنا ہوگی جس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر نماز کے لئے تازہ وضو کرنا ہوگا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ ''پھر تجھے ہر نماز کے لئے وضو کرنا ہوگا۔'' [صحیح بخاری، الوضو: ۲۲۸]

استحاضہ کے خون کا حکم بے وضو ہونے کی طرح ہے کہ مستحاضہ ہر نماز کے لئے وضو کرے گی لیکن وہ اس وضو سے صرف ایک فریضہ ادا کر سکتی ہے۔ [فتح الباری، ص: ۴۰۹ ج ۱]

اس پر قیاس کرتے ہوئے جس مریض کو بار بار پیشاب آنے یا ریح خارج ہونے کی شکایت ہے اسے چاہیے کہ وہ ہر نماز کے لئے تازہ وضو کرے، اگر دوران نماز قطرہ آنے کا اندیشہ ہو تو جانگیہ نہ اتارے۔ اگر نماز میں قطرہ آنے کا خطرہ نہ ہو تو جانگیہ اتار کر نماز ادا کی جائے۔ بہر حال اس کے لئے علاج جاری رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

سوال ہمارے ہاں سر کا مسح کرنے کے بعد الٹے ہاتھوں گردن کا مسح بھی کیا جاتا ہے، اس کی شرعی حیثیت واضح کریں؟

جواب سر کا مسح بایں طور پر کیا جائے کہ دونوں ہاتھ سر کے اگلے سرے سے شروع کر کے گدی تک پیچھے لے جائیں، پھر پیچھے سے آگے تک لے آئیں کہ جہاں سے مسح شروع کیا تھا۔ [صحیح بخاری، الوضو: ۱۸۵]

پھر کانوں کا مسح اس طرح کیا جائے کہ شہادت کی انگلیاں دونوں کانوں کے سوراخوں میں ڈال کر کانوں کی پشت پر انگوٹھوں کے ساتھ مسح کیا جائے۔ [ابن ماجہ، الطہارۃ: ۴۳۹]

گردن کے مسح کرنے کے متعلق جو حدیث پیش کی جاتی ہے وہ محدثین کے معیار صحت پر پوری نہیں اترتی۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

☆ جس نے وضو کیا اور گردن کا مسح کیا، قیامت کے دن لوہے کے طوق سے محفوظ رہے گا۔ [تاریخ اصفہان]

☆ گردن کا مسح کرنا قیامت کے دن طوق سے محفوظ رہنا ہے۔ [مسند الفردوس]

یہ دونوں روایات موضوع اور خود ساختہ ہیں کیونکہ ان میں محمد بن عمرو انصاری ایک راوی، واہی تباہی مچانے والا اور انتہائی ناقابل اعتبار ہے۔ [سلسلہ الاحادیث الضعیفہ ص ۱۶۷، ج ۲ نمبر ۷۴۴]

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گردن کا مسح کرنا ثابت نہیں ہے۔ آپ نے وضو کرنے کا طریقہ امت کو تلقین کیا ہے اس میں گردن کے مسح کا سرے سے وجود نہیں ہے۔ جمہور علما، مثلاً: امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ اس کے قائل نہیں ہیں۔ اس کے متعلق حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی جو روایت پیش کی جاتی ہے وہ صحیح نہیں۔ اس لئے گردن کے مسح کے بغیر وضو کرنا چاہیے۔ [فتاویٰ ابن تیمیہ ص: ۱۲۷، ج ۲۱]

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ دوران وضو گردن کا مسح کرنا احادیث سے ثابت نہیں۔ [زاد المعاد، ص: ۶۸، ج ۱]

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے بدعت قرار دیا ہے جیسا کہ علامہ ترکمانی نے اسے نقل کیا ہے۔ [نیل الاوطار، ص: ۲۰۲، ج ۱]

اس لئے وضو کرتے وقت گردن کے مسح سے اجتناب کرنا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے ہاں عام طور پر وضو کے بعد آسمان کی طرف منہ کر کے اپنی انگشت شہادت اٹھا کر وضو کی دعا پڑھی جاتی ہے ایسا کرنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب وضو کے بعد درج ذیل دعا صحیح سند سے منقول ہے:

"اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ"

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں ہے اور یقیناً حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔''

ایک روایت میں "وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ" کے الفاظ بھی ہیں۔ [صحیح مسلم، الطہارۃ: ۲۳۴]

سنن ترمذی میں ایک دعا بھی منقول ہے "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ" ''اے اللہ! ہمیں توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں سے بنا۔'' [سنن ترمذی، الطہارۃ: ۵۵]

اگرچہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے تاہم دیگر شواہد کی وجہ سے قابل عمل اور صحیح ہے۔

[عمل الیوم واللیلۃ، حدیث نمبر: ۳۰]

مستدرک حاکم میں ایک اور دعا بھی بیان ہوئی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ" ''اے اللہ! تو اپنی تعریف کے ساتھ ہر قسم کے نقائص سے پاک ہے میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے علاوہ کوئی معبود حقیقی نہیں ہے میں تجھ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں اور تیری طرف رجوع کرتا ہوں۔'' [مستدرک، ص: ۵۶۴، ج ۱]

وضو کے بعد مندرجہ بالا دعائیں پڑھنا فضیلت کا باعث ہیں لیکن اس دوران انگشت شہادت اٹھانا کسی معتبر حدیث سے ثابت نہیں ہے، البتہ آسمان کی طرف نظر اٹھانا بعض روایات میں آیا ہے۔ [مسند امام احمد، ص:۱۵۰ج۴]

لیکن اس کی سند صحیح نہیں ہے کیونکہ اس میں ابوعقیل نامی راوی اپنے چچا کے بیٹے سے بیان کرتے ہیں جس کی تعدیل ثابت نہیں ہے اس لئے یہ راوی مجہول ہے۔ اس میں دوسری علت یہ ہے کہ مذکورہ راوی اضافہ کرنے میں منفرد ہے اگر ضعیف یا مجہول راوی ثقہ راویوں کی مخالفت کرے تو اس کی بیان کردہ روایت منکر کہلاتی ہے۔ واضح رہے کہ صحیح مسلم اور سنن نسائی میں یہ روایت اس اضافہ کے بغیر بیان ہوئی ہے اس لئے وضو کے بعد مذکوزہ دعائیں پڑھی جائیں۔ پڑھتے وقت آسمان کی طرف نظر کرنا یا انگشت شہادت کو اٹھانا صحیح نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال کیا ناپاکی کی حالت میں چھوٹی چھوٹی دعائیں چلتے پھرتے پڑھی جاسکتی ہیں، نیز قرآن پاک پڑھ کر مردوں کو بخشنا شرعاً کیسا ہے؟ اس کے علاوہ ذہانت کے لئے کوئی بہترین وظیفہ اور نسخہ تحریر کریں؟

جواب ناپاکی کی حالت میں ہر قسم کے وظائف کئے جاسکتے ہیں، دعا کے طور پر قرآنی آیات بھی پڑھی جاسکتی ہیں۔ ان آیات کو تلاوت اور قراءت کی حیثیت نہ دی جائے کیونکہ اس حالت میں تلاوت قرآن جائز نہیں ہے۔

☆ عبادات کی تین اقسام ہیں:

① مالی: صدقہ وغیرہ میت کی طرف سے دیا جاسکتا ہے۔

② بدنی: نماز وغیرہ میت کی طرف سے ادا نہیں کی جاسکتی ہے۔

③ مرکب: حج وغیرہ بھی میت کی طرف سے ہوسکتا ہے۔ تلاوت قرآن بھی بدنی عبادت ہے اس بنا پر اس میں نیابت درست نہیں ہے۔ متقدمین شافعیہ نے اسے ناجائز ٹھہرایا ہے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے درج ذیل آیت کو دلیل بناتے ہوئے میت کی طرف سے قرآن خوانی کو ناجائز کہا ہے ''اور انسان کے لئے وہی کچھ ہے جس کی اس نے کوشش کی ہو اور اس کی کوشش کو جلد ہی دیکھ لیا جائے گا۔''

[۵۳/النجم:۳۹۔۴۰]

اس کے علاوہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور دور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی یہ کام نہیں ہوا، اس لئے بھی ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی درست نہیں ہے۔

☆ جہاں تک ذہانت کے لئے بہترین وظیفہ یا نسخہ کا تعلق ہے، اس کے لئے کسی بہترین روحانی عامل یا تجربہ کار حکیم سے رابطہ کیا جائے، البتہ علمائے کرام نے اپنے تجربات کے مطابق ''ترک معاصی'' کا نسخہ ذہانت کے لئے تجویز کیا ہے، نیز ان کا کہنا ہے کہ نماز کے بعد سورۂ الم نشرح گیارہ مرتبہ اور اکیس مرتبہ ''رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ تا یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ'' پڑھنا بھی مفید ہے۔ ان سے پہلے اور بعد میں درود ابراہیمی بھی پڑھ لیا جائے، اس کے علاوہ گیارہ بادام شیریں پانی میں بھگو کر صبح نہار منہ چبائے جائیں ان کے ساتھ خمیرہ گاؤزبان عنبری جواہر والا بھی ذہانت کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

سوال کیا عورت جنابت کی حالت میں اپنے بچے کو دودھ پلاسکتی ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت

کریں۔

جواب جنبی عورت کے لئے یہ پابندی ہے کہ نماز کی ادائیگی اس حالت میں نہیں کر سکتی کیونکہ اس قسم کی عبادت کے لئے طہارت شرط ہے، جیسا کہ حیض ونفاس والی عورت کے لئے شرط ہے کہ جب وہ حیض ونفاس سے پاک ہو تو نماز وغیرہ کی ادائیگی کے لئے طہارت واجب ہے لیکن بچے کو دودھ پلانے کے لئے طہارت شرط نہیں ہے، جیسا کہ کھانا پکانے اور گھر کے دوسرے کام کاج کرنے کے لئے طہارت ضروری نہیں۔ اس لئے عورت کا غسل سے قبل دودھ پلانا جائز ہے، خواہ وہ غسل جنابت ہو یا غسل حیض یا غسل نفاس، ان حالات میں بچے کو دودھ پلانے کے لئے طہارت کی شرط لگانا کتاب وسنت سے ثابت نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے ہاں شہر کی اکثر مساجد میں نمازی حضرات صاف ستھرے ماحول میں رہنے کے باوجود جب وضو کے لئے بیٹھتے ہیں تو اعضائے وضو کو مل مل کر کم وبیش پانچ سات مرتبہ دھوتے ہیں۔ پانی کا استعمال غسل کے برابر ہوتا ہے، براہ کرم راہنمائی فرمائیں۔

جواب پانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑی نعمت ہے اسے بلاوجہ ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے اعضائے وضو کو ایک ایک دو دو اور زیادہ سے زیادہ تین تین مرتبہ دھویا ہے جو آدمی تین مرتبہ سے زیادہ مرتبہ دھوتا ہے اس کے متعلق آپ نے فرمایا کہ ''اس نے زیادتی کی اور حد سے تجاوز کیا ہے۔'' بعض روایات میں ہے کہ ''اس نے برا کام کیا ہے۔'' لہٰذا اس سلسلہ میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ [ابن ماجہ، الطہارۃ: ۴۲۲]

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تین مرتبہ سے زیادہ وہی شخص دھوتا ہے جو مجنوں ہوتا ہے۔ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسا کرنا گناہ ہے۔ حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وضو کرتے وقت پانی کا اسراف شیطانی حرکت ہے (مغنی ابن قدامہ، ص: ۱۹۴ ج ۱) لہٰذا سنت کے مطابق اعضائے وضو کو تین سے زیادہ مرتبہ نہیں دھونا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال جنابت کی حالت میں اگر کوئی فوت ہو جائے تو اسے ایک غسل دینا کافی ہے یا دو مرتبہ غسل دینا چاہیے؟

جواب ایسی حالت میں فوت ہونے والے شخص کے لئے ایک ہی غسل کافی ہے اسے دو مرتبہ غسل دینے کی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ دوران نفاس فوت ہونے والی عورت کو ایک ہی غسل کافی ہوتا ہے، عبادات میں اس کی نظیر بایں طور پر ہے اگر کوئی مسجد میں صبح یا ظہر کی سنتیں ادا کرتا ہے تو اس سے تحیۃ المسجد ساقط ہو جاتا ہے اسے الگ الگ سنتیں ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، صورت مسئولہ میں بھی ایک ہی مرتبہ غسل دینا کافی ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال وضو کے بعد پانی کے دو گھونٹ پینا سنت ہے یا نہیں؟

جواب اگر پانی پینے کی ضرورت ہو یا کوئی مسئلہ بتانا مقصود ہو تو وضو سے بچا ہوا پانی پینے میں کوئی حرج نہیں ہے، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے کوفہ میں ایک مرتبہ وضو کیا، پھر کھڑے ہو کر بچا ہوا پانی نوش کیا اور فرمایا کہ ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس طرح کھڑے ہو کر پانی پیتے دیکھا ہے۔'' [صحیح بخاری: ۵۶۱۶]

سوال تیمّم کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے وضاحت کریں؟

جواب رسول اللہ ﷺ نے تیمّم کے لئے دونوں ہاتھ زمین پر مارے، پھر ان میں پھونک لگائی۔ اس کے بعد ان کے ساتھ

اپنے منہ اور دونوں ہاتھوں پر مسح کیا۔ [صحیح بخاری: ۳۳۸]

یعنی الٹے ہاتھ سے سیدھے ہاتھ پر، سیدھے ہاتھ سے الٹے ہاتھ پر مسح کیا، پھر دونوں ہاتھوں سے چہرہ کا مسح کیا۔

سوال دودھ پیتے بچے کا پیشاب پاک ہے کیا بچی کا پیشاب بھی پاک ہے اس کی وضاحت فرمائیں؟

جواب پیشاب پلید ہے، خواہ شیر خوار بچے کا ہو یا بالغ مرد کا، اسی طرح اس کے نجس ہونے میں بچی اور بچے کی تفریق بھی صحیح نہیں ہے، البتہ شریعت نے جس کپڑے کو پیشاب لگ جائے، اس کے پاک کرنے کے متعلق بچے اور بچی کے پیشاب میں فرق ضرور رکھا ہے، چنانچہ بچے کے متعلق حکم ہے کہ اس پر چھینٹے مارے جائیں اسے دھویا نہ جائے اور بچی کے پیشاب کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ اسے دھویا جائے۔ حدیث میں ہے: ''لڑکی کا پیشاب دھویا جاتا ہے اور لڑکے کے پیشاب پر چھینٹے مارے جاتے ہیں۔'' [ابن ماجہ، الطہارۃ: ۵۲۲]

لڑکے اور لڑکی کے پیشاب میں تفریق کے متعلق احادیث خاموش ہیں، البتہ محدثین نے بیان کیا ہے کہ لڑکے کے اٹھانے والے اقارب اور اجانب سب ہوتے ہیں، اس لئے اس کی طہارت میں کچھ تخفیف رکھی گئی ہے جبکہ لڑکی کو اٹھانے والے صرف والدین یا اس کے بہن بھائی ہوتے ہیں، اس لئے طہارت کے متعلق اصل حکم کو باقی رکھا گیا ہے۔

سوال اگر کسی عورت کا تین چار ماہ کا حمل ضائع ہو جائے تو اس کے بہنے والے خون کا کیا حکم ہے، اس کی موجودگی میں نمازیں پڑھی جاسکتی ہیں یا روزہ رکھا جاسکتا ہے یا نہیں؟

جواب اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ ہر ماہ عورت سے بہنے والا خون حیض، جب عورت کو حمل ہو جاتا ہے تو وہی خون جنین کی غذا کا کام دیتا ہے۔ حمل کے بعد خون حیض بند ہونے کی غالباً یہی وجہ ہے۔ اب اگر وقت پورا ہونے سے پہلے پہلے حمل ساقط ہو جاتا ہے تو اس کے بعد بہنے والا خون ''نفاس'' کے حکم میں ہے، جس کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن ہے اگر اس سے پہلے بند ہو جائے تو نہانے کے بعد نماز پڑھنا چاہیے اور روزے بھی رکھنا چاہئیں۔ جب تک یہ خون جاری رہے، نماز اور روزے معاف ہیں۔ روزوں کی بعد میں قضا دینا ہوگی۔ واضح رہے کہ خون بند ہونے کے بعد نماز روزہ کی معافی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے بندش کے فوراً بعد غسل کر کے نماز روزہ کو شروع کر دیا جائے، بلاوجہ غسل میں تاخیر کرنا جیسا کہ عام طور پر خواتین کی عادت ہے شرعی طور پر صحیح نہیں ہے۔

سوال کیا کسی مجبوری کے پیش نظر جنبی کو تیمّم کرنے کی اجازت ہے، ناپاک جسم اور ناپاک کپڑوں کے متعلق ایسے حالات میں کیا حکم ہے کیونکہ تیمّم تو صرف منہ اور ہاتھوں کا ہوتا ہے؟

جواب اگر پانی دستیاب نہ ہو تو ایسی مجبوری کے وقت تیمّم کی اجازت ہے، چنانچہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز سے فراغت کے بعد ایک شخص کو الگ تھلگ بیٹھے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ ''تو نے قوم کے ساتھ نماز نہیں پڑھی'' اس نے عرض کیا: مجھے جنابت کا عارضہ لاحق ہو گیا لیکن غسل کے لئے پانی نہ مل سکا۔ آپ نے فرمایا کہ ''تیرے لئے مٹی کا استعمال یعنی تیمّم کافی تھا تجھے چاہیے تھا کہ تیمّم کر کے نماز پڑھ لیتا۔'' [بخاری، تیمم: ۳۴۸]

اس طرح اگر بیماری یا اور کوئی مجبوری ہو تو تیمّم کیا جاسکتا ہے عبادت کے لئے یہی کافی ہے جب بھی مجبوری ختم ہو جائے

تو غسل کرنا ہو گا یہ اجازت صرف نماز کی ادائیگی کیلئے ہے، اسی طرح نماز کے لئے کپڑوں کا پاک ہونا بھی ضروری ہے اگر پانی میسر نہ ہو تو انہی کپڑوں میں نماز پڑھی جا سکتی ہے بشرطیکہ دوسرے کپڑے نہ مل سکتے ہوں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے وہ سختی کرنا نہیں چاہتا۔'' [۲/البقرہ:۱۸۵]

نیز فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔'' [۲۲/الحج:۷۸]

ان آیات واحادیث کے پیش نظر مجبوری کے وقت انسان ناپاک جسم اور ناپاک کپڑوں میں عبادت کر سکتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال میری عمر تقریباً ۲۶ سال ہے مجھے پیشاب کے بعد قطرے آنے کا مرض لاحق ہے نماز کا باقاعدہ اہتمام کرتا ہوں، مگر ان ناپاک قطروں کی وجہ سے بہت پریشان ہوں قرآن وحدیث کے مطابق مجھے کیا کرنا چاہیے؟

جواب شریعت مطہرہ کی بنیاد آسانی اور رفع حرج پر ہے، اگر کسی کو مسلسل پیشاب کے قطرے آتے ہیں یا اس کی ہوا خارج ہوتی رہتی ہے تو اس کے لئے شرعی حکم یہ ہے کہ وہ ہر نماز کے لئے تازہ وضو کرے اور اس وضو سے موجودہ نماز اور اس کے متعلقات ادا کرے ہر نماز کے لئے تازہ وضو کرنا اس کی طہارت ہے، اس کی نظیر استحاضہ والی عورت ہے جسے مسلسل خون آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی عورت کے متعلق یہ حکم دیا ہے کہ وہ ہر نماز کے لئے تازہ وضو کر کے اسے پڑھ لے۔ چنانچہ حضرت فاطمہ بن ابی حبیش رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ مجھے مسلسل خون آتا ہے اور میں پاک نہیں ہوتی ہوں ایسی حالت میں مجھے نماز ترک کرنے کی اجازت ہے۔ آپ نے فرمایا: ''خون حیض کے وقت نماز چھوڑنے کی اجازت ہے اور اس کی شناخت ہو جاتی ہے جب خون حیض کے علاوہ اور خون ہو تو وضو کر کے نماز ادا کرتی رہو۔'' [ابوداؤد، الطہارۃ:۲۸۶]

ایسے حالات میں نماز پڑھنے کا حکم ہے اگر چہ دوران نماز قطرے آتے رہیں اور ہوا وغیرہ بھی خارج ہوتی رہے۔ نماز چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے، البتہ ہر نماز کے لئے نیا وضو کرنے کا حکم ہے۔ [واللہ اعلم]

اذان ونماز

اذان ونماز

سوال کیا نماز اشراق بدعت ہے۔ ماہنامہ ''طیبات'' میں اس نماز کو بدعت لکھا ہے، بعض حضرات نے اس کے پیش نظر اس نماز کو ترک کر دیا ہے جبکہ ہم نے اپنے علمائے کرام سے اس نماز کے متعلق بہت فضیلت سن رکھی ہے۔ وضاحت فرمائیں؟

جواب ماہنامہ ''طیبات'' میں ایک خاتون ''گل دستہ احادیث سے کچھ پھول چنے میں نے'' کے عنوان سے مستقل لکھتی ہیں، اس میں ایک حدیث بایں الفاظ درج ہے'' مجاہد نے بیان کیا کہ میں اور عروہ بن زبیر مسجد نبوی میں داخل ہوئے وہاں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کچھ لوگ مسجد نبوی میں اشراق کی نماز پڑھ رہے تھے، مجاہد کہتے ہیں کہ ہم نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے لوگوں کی اس نماز کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ بدعت ہے۔''

[بخاری، ماہنامہ ''طیبات'' مجریہ اکتوبر ۲۰۰۳، صفحہ ۸]

کالم نگار کو چاہیے تھا کہ اس حدیث کے متعلق وضاحتی نوٹ لکھتی کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے نماز اشراق کے متعلق بدعت ہونے کا تبصرہ کس پس منظر میں کیا ہے تاکہ لوگ اس کے متعلق الجھن یا ابہام کا شکار نہ ہوتے۔ ممکن ہے کہ ناقصات عقل ودین کے حوالہ سے یہ سہو ہوا ہو، ویسے بھی اس پرفتن دور میں تحقیق کی آڑ میں بدعات کو فروغ دیا جارہا ہے اور مسلمات کا انکار کیا جارہا ہے، اس قسم کی جدید تحقیق سے ہمارے حساس اہل حدیث حضرات میں بہت اضطراب پایا جاتا ہے۔ ارباب حل وعقد کو چاہیے کہ اس فتنہ تحقیق کی روک تھام کے لئے مناسب اقدامات کریں تاکہ عامۃ الناس مسلک اہل حدیث کے متعلق شکوک وشبہات کا شکار نہ ہوں، اس ضروری وضاحت کے بعد اب ہم در پیش مسئلہ کے متعلق اپنی گزارشات پیش کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وعمل سے نماز اشراق کی اہمیت وفضیلت ثابت ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: ''ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے جسم کے ہر جوڑ کے بدلے صدقہ خیرات کرے سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے، الحمدللہ کہنا بھی صدقہ ہے، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنا بھی صدقہ ہے، اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے، نیکی کا حکم دینا بھی صدقہ ہے، برائی سے روکنا بھی صدقہ ہے اور اگر اشراق کی دو رکعت پڑھ لی جائیں تو ان سب کاموں سے کفایت کر جاتی ہیں۔'' [صحیح مسلم:۱۶۷۱]

اس حدیث پر امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''نماز اشراق کے استحباب کا بیان کم از کم دو رکعات اور مکمل آٹھ رکعات ہیں، درمیانہ درجہ چار یا چھ رکعات ادا کرنا ہے اور شوق سے اس نماز کی پابندی کا بیان۔''

حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''اے ابن آدم! تو میرے لئے چار رکعات (اشراق کی) اول دن میں پڑھ میں اس دن کی شام تک تیرے تمام کام سنوار دوں گا۔'' [ابوداؤد، ابواب التطوع:۱۲۸۹]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نماز اشراق کے ادا کرنے کی وصیت بھی فرمائی جس پر عمر بھر کاربند رہے، چنانچہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے پیارے دوست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چیزوں کی وصیت فرمائی، جب تک میں زندہ رہوں گا انہیں نہیں چھوڑوں گا، ہر مہینے کے تین روزے، اشراق کی نماز اور سونے سے پہلے نماز وتر کی ادائیگی۔

[صحیح بخاری، التہجد :۱۱۷۸]

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے حبیب نے تین باتوں کی وصیت فرمائی میں زندگی بھر ان پر عمل پیرا رہوں گا، ہر ماہ کے تین روزے، نماز اشراق اور سونے سے پہلے وتروں کو ادا کرنا۔ [صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین:۱۶۷۵]

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے بھی میرے پیارے حبیب نے تین باتوں کی وصیت فرمائی، اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو میں انہیں کبھی ترک نہیں کروں گا، مجھے نماز اشراق کی وصیت کی، سونے سے پہلے وتر پڑھنے کی تاکید فرمائی اور ہر ماہ تین روزے رکھنے کے متعلق فرمایا۔ [نسائی، الصیام:۲۴۰۶]

اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل مبارک کے متعلق چند احادیث پیش خدمت ہیں:

حضرت عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز اشراق کے متعلق معلومات لینے کے لئے کئی ایک لوگوں سے ملا مجھے حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر دن چڑھنے کے بعد میرے گھر آئے، آپ نے غسل فرمایا اور نماز اشراق کی آٹھ رکعات ادا کیں۔ [صحیح مسلم، حدیث نمبر:۲۶۶۸]

حضرت ابن ابی لیلیٰ نے بھی حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز اشراق کو نقل کیا ہے۔ [ابوداؤد:۱۲۹۱]

بعض روایات میں حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا نے اس نماز اشراق کی تفصیل بھی بیان کی ہے کہ آپ نے آٹھ رکعات اس طرح ادا فرمائیں کہ ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے تھے۔ [ابوداؤد:۱۲۹۰]

حضرت معاذہ عدویہ کہتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز اشراق کے متعلق پوچھا تو آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''ہاں، چار رکعت پڑھتے تھے اور جس قدر اللہ تعالیٰ چاہتا آپ اس سے زیادہ بھی پڑھ لیتے۔''

[صحیح مسلم:۱۶۶۳]

حضرت عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ آیا آپ نماز اشراق پڑھتے تھے آپ نے فرمایا جب سفر سے واپس آتے تو اشراق پڑھ کر گھر آتے تھے۔ [صحیح مسلم:۱۶۶۰]

حضرت ام ذرہ کہتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیکھا کہ آپ نماز اشراق پڑھتی تھیں اور فرمایا کرتی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے اشراق کی چار رکعات پڑھتے دیکھا ہے۔ [مسند امام احمد، ص:۱۰۶، ج۶]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر پابندی کے ساتھ نماز اشراق پڑھتے تا آنکہ ہم کہتے کہ اب آپ اسے ترک نہیں کریں گے اور پھر آپ عرصہ تک اسے ادا نہ کرتے حتیٰ کہ ہم کہتے اب آپ اسے نہیں پڑھیں گے۔

[ترمذی:۴۷۷]

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز اشراق پڑھتے ہوئے دیکھا۔ [مجمع الزوائد:۲/۲۳۷]

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سفر میں نماز اشراق آٹھ رکعات پڑھتے دیکھا، پھر آپ سے نماز کے بعد ایک طویل دعا بھی منقول ہے۔ [مستدرک حاکم:۱/۳۱۴]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے نماز اشراق کے متعلق ایک مفصل جز تصنیف کیا ہے جس میں تقریباً بیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مرویات کو جمع کر کے اس نماز کی مشروعیت کو ثابت کیا ہے۔ [فتح الباری:۳/۷۲]

اس نماز کی فضیلت کے متعلق متعدد روایات ہیں، حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نماز اشراق پڑھنے والے کو عمرہ کرنے والے کے برابر اجر ملتا ہے۔'' [مسند امام احمد:۵/۲۶۸]

اگرچہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز اشراق پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ لیکن ان کے نہ دیکھنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سرے سے اس نماز کا وجود ہی نہیں بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز اشراق پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا مگر میں اسے ادا کرتی ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ آپ کسی عمل کو پسند کرتے تھے مگر اس پر عمل پیرا نہ ہوتے، اس کی وجہ یہ ہوتی کہ آپ کے عمل کو دیکھ کر لوگ بھی اسے اپنائیں گے، پھر ان پر فرض ہو جائے گا اس ڈر سے آپ کو پسندیدہ ہونے کے باوجود آپ اس پر عمل نہ کرتے تھے۔

[صحیح مسلم:۱۶۶۲]

اس حدیث کے پیش نظر ممکن ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز اشراق نہ دیکھی ہو، اگرچہ اس کا ثبوت سابقہ روایات میں موجود ہے، تاہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اسے بڑے اہتمام سے ادا کرتی اور فرمایا کرتی تھیں کہ اگر میرے والدین بھی زندہ ہو کر آ جائیں تب بھی نماز اشراق نہیں چھوڑوں گی۔ [مؤطا امام مالک، باب صلوٰۃ الضحیٰ]

اب ہم حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کا جائزہ لیتے ہیں، جس میں انہوں نے فرمایا کہ نماز اشراق بدعت ہے، چنانچہ وہ روایت ماہنامہ ''طیبات'' کے حوالہ سے بیان ہو چکی ہے اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے [کتاب العمرہ:۱۷۷۵] میں بیان کیا ہے، اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ مورق نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا کہ کیا آپ نماز اشراق پڑھتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: نہیں، میں نے کہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے پڑھا؟ فرمایا نہیں، عرض کیا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے ادا کیا؟ فرمایا نہیں، میں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا پڑھنا ثابت ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میرے خیال میں ان سے پڑھنا بھی ثابت نہیں ہے۔ [صحیح بخاری:۱۱۷۵]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت پر یہ عنوان قائم کیا ہے کہ ''سفر میں نماز اشراق ادا کرنا۔''

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے بعد آپ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کی روایت لاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر ان کے گھر تشریف لائے، غسل فرمایا، پھر آٹھ رکعات ادا کیں، یہ نماز بہت ہلکی تھی، البتہ رکوع اور سجود کو پورا ادا کرتے تھے۔

[صحیح بخاری:۱۱۷۶]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ان روایت کی تشریح کرتے ہوئے ابن المنیر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ دوران سفر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس نماز کا اہتمام نہ کرتے تھے ہاں، اگر دوران سفر، حضر جیسی سہولت میسر ہو تو نماز اشراق کا اہتمام کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر میں سہولیات میسر تھیں تو آپ نے نماز اشراق ادا کی۔ جبکہ ابھی سفر ختم نہیں ہوا تھا۔ [فتح الباری:۳/۶۸]

پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ نماز اشراق کے متعلق اپنے اندر نرم گوشہ رکھتے تھے، جیسا کہ مصنف ابن ابی

شیبہ میں ہے کہ اگرچہ اسے لوگوں نے اپنے طور پر پڑھنا شروع کردیا ہے لیکن مجھے ان کی ادا بہت پسند ہے۔ [فتح الباری: ۶۹/۳]

بہر حال آپ کا انکار اس بنا پر ہے کہ آپ نے رسول اللہ ﷺ کو نماز اشراق پڑھتے نہیں دیکھا، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا نہ دیکھنا اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ سرے سے اس نماز کا وجود ہی نہیں ہے یا اس کا ادا کرنا بدعت ہے۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے لکھا ہے کہ نماز اشراق کی فرض نماز جیسی پابندی کرنا، مسجد میں اس کا ادا کرنا اور باجماعت اہتمام کرنے کے متعلق حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے انکار کیا ہے۔ آپ کے انکار کا یہ معنی نہیں ہے کہ نماز اشراق خلاف سنت ہے جیسا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے متعلق مروی ہے کہ آپ نے چند لوگوں کو اس کا اہتمام کرتے دیکھا تو فرمایا: اگر تم نے اس کا اہتمام کرنا ہے تو اپنے گھروں میں ادا کرو۔ [فتح الباری]

بلکہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح ابن خزیمہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر سے واپس آتے تو نماز اشراق پڑھتے۔ [فتح الباری: ۶۹/۳]

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے نماز اشراق کے متعلق اختلاف بیان کرتے ہوئے مختلف مسالک کی نشاندہی کی ہے۔ جس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

① نماز اشراق مستحب ہے، البتہ اس کی تعداد میں اختلاف ہے۔

② کسی سبب کی وجہ سے اس کا اہتمام کیا جائے، مثلاً: کسی شہر کے فتح ہونے یا کسی مخالف کی موت پر یا کسی کے ہاں زیارت کے لئے جانے پر یا سفر سے واپس آنے پر۔

③ سرے سے مشروع نہیں ہے جیسا کہ حضرت عبدالرحمٰن اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے متعلق مروی ہے کہ یہ حضرات، اسے نہیں پڑھا کرتے تھے۔

④ اس پر مداومت نہ کی جائے بلکہ کبھی پڑھ لی جائے اور کبھی اسے چھوڑ دیا جائے۔

⑤ اس کے پڑھنے کا اہتمام گھروں میں کیا جائے، مساجد وغیرہ میں اس کا اظہار درست نہیں ہے۔

⑥ یہ مستحب نہیں ہے بلکہ بدعت ہے۔ [زاد المعاد: ۳۵۱/۱]

ہمارے نزدیک پہلا موقف صحیح ہے اور اس کی کم از کم دو رکعات اور زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعات ہیں۔

[ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب]

سوال آپ نے اہل حدیث شمارہ نمبر ۲ مجریہ ۱۰ جنوری ۲۰۰۴ء میں نمازی کے سترہ کے متعلق لکھا ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے نمازی کو سترہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے کا حکم دیا اور بغیر سترہ کے نماز پڑھنے سے منع کیا ہے اور آپ کا امر وجوب اور نہی تحریم کے لئے ہے۔ ہاں، اگر کوئی قرینہ ہو تو امر وجوب کے بجائے استحباب کے لئے ہوتا ہے لیکن یہاں کوئی ایسا قرینہ نہیں ہے کہ آپ کے امر کو وجوب کے بجائے استحباب پر محمول کیا جائے، پھر نہی سے مراد بھی نہی تحریم ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے لئے سترہ بنانا واجب ہے اور اس کے بغیر نماز ادا کرنا حرام ہے" (الیٰ آخرہ)

لیکن ہمارے سامنے کچھ ایسی احادیث اور آثار و قرائن ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ امر وجوب کے لئے نہیں بلکہ استحباب

کے لئے ہے، آپ ان کی وضاحت فرمائیں؟

جواب حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے والد حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ہمراہ شہر سے باہر ہماری رہائش گاہ میں تشریف لائے، وہاں صحرا میں آپ نے بایں حالت نماز ادا کی کہ آپ کے آگے سترہ نہیں تھا۔[ابوداود، الصلوۃ:۷۱۸]

وضاحت: ہم نے اپنے موقف کے لئے جو احادیث پیش کی تھیں وہ اپنے مفہوم میں صریح تھیں، اس کے برعکس یہ جو احادیث پیش کی جاتی ہیں وہ صحیح نہیں، اگر صحیح ہیں تو اپنے مفہوم میں صریح نہیں ہیں۔ پیش کردہ حدیث کے متعلق علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کا تبصرہ ہے کہ یہ باطل ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے یہ بیان کی ہے کہ عباس بن عبید اللہ بن عباس ہاشمی جو اپنے چچا حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے چچا کو نہیں پایا، اس انقطاع کی وجہ سے یہ حدیث ضعیف اور نا قابل استدلال ہے۔[محلی ابن حزم:۱۳/۴]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس راوی کو ''مقبول'' لکھا ہے۔ [تہذیب التہذیب:۱۲۳/۵]

مقبول راوی کی روایات اس وقت قبول ہوتی ہیں جب اس کی متابعت ہو، لیکن مذکورہ حدیث کی متابعت کسی صحیح یا حسن حدیث سے نہیں ہوتی، اگر ایک ضعیف حدیث کے مختلف طرق ہوں تو بعض اوقات اسے حسن لغیرہ کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے، لیکن متعدد ضعیف روایات کا اجتماع انفرادی کمزوری کی تلافی نہیں کرسکتا۔ بہرحال یہ روایت نا قابل استدلال ہے، لہٰذا سترہ کا وجوب اپنی جگہ برقرار رہے گا، نیز پیش کردہ حدیث کے آخر میں یہ الفاظ ہیں کہ گدھی اور کتیا آپ کے آگے کھیل رہی تھیں، آپ نے ان کی کوئی پروا نہیں کی۔ حدیث کا یہ مضمون ان صحیح اور صریح احادیث کے خلاف ہے، جن میں صراحت ہے کہ ایک دفعہ آپ نماز پڑھ رہے تھے اور ایک بکری دوڑتی ہوئی آئی، وہ آپ کے آگے سے گزرنا چاہتی تھی۔ آپ نے اپنا بطن مبارک دیوار کے ساتھ لگا دیا حتی کہ اس بکری کو آپ کے پیچھے سے گزرنا پڑا۔ [صحیح ابن خزیمہ:۸۲۷]

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ گدھی اور کتیا آپ کے سامنے گھومتی رہیں اور آپ اس کی پروا نہ کریں، جبکہ آپ ہی نے فرمایا کہ ''کتا، گدھا اور عورت، ان کے نمازی کے آگے سے گزرنے سے نماز کا خشوع متاثر ہوتا ہے۔'' [صحیح مسلم، الصلوۃ:۲۶۶]

محدثین کرام رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل میں تعارض ہو تو قول کو ترجیح دی جاتی ہے اور فعل کو خصوصیت پر محمول کیا جاتا ہے۔ چنانچہ پیش کردہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فعل بیان ہوا ہے، لیکن آپ کے متعدد اقوال اس کے معارض ہیں، لہٰذا ان اقوال کو ترجیح دی جائے گی۔ مختصر یہ ہے کہ مذکورہ حدیث اس قابل ہی نہیں کہ اسے صحیح اور صریح احادیث کے مقابلہ میں پیش کیا جائے، اگر کوئی ان کے معارضہ پر اصرار کرتا ہے تو اس میں آپ کا فعل بیان ہوا ہے، جو آپ کے فرامین کے مقابلہ میں مرجوح ہے۔

☆ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے مسند البزار کے حوالہ سے حدیث نقل کی ہے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کے سامنے کوئی چیز بطور سترہ نہ تھی۔'' [فتح الباری:۲۶۶/۱]

وضاحت: علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کو بایں الفاظ نقل فرمایا ہے کہ آپ کے سامنے کوئی ایسی چیز بطور سترہ نہ تھی جو ہمارے اور آپ کے درمیان حائل ہو۔ [نیل الاوطار:۱۲/۳]

ہمارے نزدیک اس حدیث کی صحت مسلم نہیں ہے کیونکہ اس کی سند میں عبدالکریم بن ابی المخارق راوی ہے جسے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ [تہذیب التھذیب:۶/۳۷۶]

جن حضرات نے اسے صحیح کہا ہے انہوں نے اسے عبدالکریم الجزری خیال کیا ہے علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی صحت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ جواب دیا ہے کہ اس سے مطلق سترے کی نفی نہیں ہوتی۔ بلکہ ایسے سترہ کی نفی کرتی ہے جو لوگوں اور آپ کے درمیان حائل ہو۔ جیسے بلند دیوار وغیرہ، جو دونوں کے درمیان ایک دوسرے کو دیکھنے سے مانع ہو۔ محدث عراقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی مؤقف اختیار کیا ہے۔ [مرعاۃ المفاتیح:۳/۴۹۹]

لہٰذا ایسی محتمل روایت صحیح اور صریح احادیث کے خلاف دلیل نہیں بن سکتی۔ واضح رہے کہ اس حدیث کے بنیادی الفاظ جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں ایک گدھی پر سوار ہو کر آیا اور میں اس وقت قریب البلوغ تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت دیوار کے سوا کسی اور چیز کا سترہ کر کے لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے، صف کے کچھ حصے سے گزر کر میں اپنی سواری سے اترا اور گدھی کو چرنے کے لئے چھوڑ دیا اور خود صف میں شامل ہو کر شریک نماز ہو گیا۔ کسی نے اس وجہ سے مجھ پر اعتراض نہیں کیا۔'' [صحیح بخاری:۴۳۹]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث سے سترہ کو ثابت کیا ہے، جبکہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے سترہ کی نفی کو ثابت کیا ہے اور اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے ''سترہ کے بغیر نماز پڑھنا'' لیکن حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا معاملہ انتہائی تعجب خیز ہے کہ وہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے قائم کردہ عنوانات سے احادیث کی مطابقت اور صحت استدلال کے لئے بڑی کوشش وکاوش کرتے ہیں۔ لیکن اس مقام پر وہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ سے متاثر نظر آتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے سترے کے متعلق امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال محل نظر ہے۔ [فتح الباری:۱/۷۳۹]

اگر حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ دقت نظر سے کام لیتے تو معاملہ اس کے برعکس ہوتا، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر یہ نکتہ تھا کہ حدیث میں ''غیر جدار'' کے الفاظ ہیں اور غیر لفظ ہمیشہ کسی سابق کی صفت ہوا کرتا ہے۔ اس لئے حدیث کا معنی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیوار کے علاوہ کسی دوسری چیز کو سترہ بنا کر نماز پڑھ رہے تھے۔ نفی جدار کا فائدہ بھی اس وقت ہوگا کہ وہاں کسی دوسری چیز کا سترہ ہو بصورت دیگر یہ نفی لغو ہوگی۔ نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ دوران جماعت میرے صف کے کچھ حصے کے آگے سے گزرنے کے باوجود مجھ پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے سترہ موجود تھا وہاں سترہ مقتدی حضرات کے لئے کافی تھا، اس لئے اعتراض کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس حدیث پر ہم نے اپنی زیر ترتیب شرح بخاری میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ قارئین سے استدعا ہے کہ وہ اس کی تکمیل کے لئے دعا کرتے رہیں۔

☆ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلہ میں ایک صحابی کا عمل نقل کرتے ہیں کہ حضرت عروہ بن زبیر رحمۃ اللہ علیہ نے صحرا میں سترہ کے بغیر نماز پڑھی۔ [مؤطا امام مالک، باب سترۃ المصلی فی السفر]

وضاحت: اس حدیث میں صحابی کا نہیں بلکہ ایک تابعی کا عمل پیش کیا گیا ہے کیونکہ حضرت عروہ بن زبیر رحمۃ اللہ علیہ تابعی ہیں۔ صحیح احادیث کے مقابلہ میں ایک تابعی کے عمل کی کوئی حیثیت نہیں ہے، ہاں اس سے پہلے حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا عمل بیان کیا گیا ہے کہ وہ سفر میں بھی سترہ کا اہتمام کرتے تھے۔ [مؤطا امام مالک]

حضرت قرہ بن ایاس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں دوستونوں کے درمیان نماز پڑھ رہا تھا کہ مجھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گدی سے پکڑ کر سترہ کے قریب کر دیا اور فرمایا کہ اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ۔ [صحیح بخاری، تعلیقا مع الفتح: ۱/۵۷۷]

مصنف ابن ابی شیبہ میں اس روایت کو موصولاً بیان کیا گیا ہے۔ [مصنف ابن ابی شیبہ: ۳/۳۷۰]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ تم میں سے جب کوئی نماز پڑھے تو سترے کی طرف رخ کر کے پڑھے اور اس کے قریب کھڑا ہو، تاکہ شیطان اس کے آگے سے نہ گزر سکے۔ [مصنف ابن ابی شیبہ: ۱/۲۷۹]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سترے کا اس قدر اہتمام کرتے کہ اگر مسجد میں کوئی ستون نہ ملتا تو حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ سے کہتے کہ تم اپنی پیٹھ میری طرف کر کے بیٹھ جاؤ تاکہ میں تیری طرف رخ کر کے نماز پڑھوں۔ [مصنف ابن ابی شیبہ: ۱/۲۷۹]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نمازی کی زیادتی اور بے انصافی یہ ہے کہ وہ سترہ کے بغیر نماز پڑھے۔ [بیہقی: ۲/۲۸۵]

حضرت سلمہ بن الاکوع صحرا میں کسی پتھر کو سامنے گاڑ لیتے، پھر اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے۔ [مصنف ابن ابی شیبہ: ۱/۲۷۸]

ان آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو نماز کے لئے سترہ کا ازحد اہتمام کرتے۔

☆ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحرا میں بایں حالت نماز ادا کی کہ آپ کے آگے کوئی چیز نہ تھی۔ [مسند امام احمد: ۱/۲۲۴]

وضاحت: اس روایت کو سید سابق رحمۃ اللہ علیہ نے سترہ کے استحباب کے پیش نظر اپنی کتاب فقہ السنہ میں بیان فرمایا ہے لیکن یہ روایت ناقابل استدلال ہے، کیونکہ اس میں ایک راوی حجاج بن ارطاۃ ہے جسے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ [مجمع الزوائد: ۲/۶۶]

اس کے علاوہ یہ مدلس بھی ہے اور اس کی مذکورہ روایت ''عن'' کے صیغہ سے بیان کی ہے۔ [تمام المنۃ: ۳۰۵]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے (الاحادیث الضعیفہ رقم: ۵۸۰۴) اور علامہ عبیداللہ مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ [مرعاۃ المفاتیح: ۲/۵۰۴]

علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ مذکورہ روایت کی تائید حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے بھی ہوتی ہے لیکن تائید میں پیش کی جانے والی روایت کے متعلق امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ منقطع ہے کیونکہ عباس بن عبیداللہ نے اپنے چچا حضرت فضل بن عباس کو نہیں پایا، اس کے علاوہ ماہر فن ابن قطان فرماتے ہیں کہ عباس بن عبیداللہ مجہول ہے، جس کے حالات کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔ [تمام المنۃ: ۳۰۵]

☆ نماز مغرب سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سنتیں پڑھنے کے لئے ستونوں کی طرف جلدی کرتے، مسجد نبوی میں اس قدر ستون نہ تھے کہ تمام صحابہ کے لئے سترہ کا کام دے سکتے، اس سے معلوم ہوا کہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سترہ کے بغیر نماز پڑھتے تھے۔

وضاحت: جس روایت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اسے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب مؤذن اذان دیتا تو کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کھڑے ہو جاتے اور جلدی جلدی ستونوں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے۔ [صحیح بخاری: ۶۲۵]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سترہ کا اہتمام کرتے تھے۔ کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سترہ کے لئے ستونوں سے کام لیتے، باقی ایک دوسرے کے پیچھے کھڑے ہو جاتے، پھر سامنے والی دیوار کو بھی سترہ بنا لیا جاتا تھا۔

ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ جب ایک چیز صحیح احادیث سے ثابت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل نے اسے مزید تقویت دی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس پر عمل پیرا نظر آتے ہیں تو پھر اس قسم کے موہوم خدشات کے پیش نظر اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ بہر حال اس قسم کے دلائل وجوب سے استحباب کے لئے قرینہ صارفہ نہیں ہو سکتے۔

☆ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت بیان کی ہے کہ آپ نے ان لوگوں پر اعتراض کیا جو کہتے ہیں کہ کتے، گدھے اور عورت کا آگے سے گزرنا قاطع الصلوٰۃ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا شکوہ تب ہی درست ہو سکتا ہے جب نمازی کے سامنے سترہ نہ ہو۔ ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاؤں کو ہاتھ لگاتے تو آپ اپنے پاؤں سکیٹر لیتیں اور جب آپ سجدہ سے فارغ ہو جاتے تو پاؤں پھیلا دیتیں۔ پاؤں کو سکیٹرنا اور پھیلانا مرور ہی تو ہے؟

وضاحت: دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ رات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز تہجد پڑھتے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے سامنے ہوتیں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے سامنے بیٹھنے کو پسند نہ کرتیں، چنانچہ وہ پائینتی کی طرف سے کھسک کر لحاف سے باہر نکل جاتیں، اس طرح آپ کے سامنے سے گزر جاتیں اور آپ کے سامنے کوئی سترہ نہیں ہوتا تھا، لیکن روایات کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دو واقعات ہیں۔

ایک واقعہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چارپائی پر ہوتیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیچے اتر کر چارپائی کو سترہ بنا کر نماز پڑھتے۔ اس صورت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جنازہ کی طرح آپ کے سامنے لیٹی رہتیں، جب آپ کو ضرورت ہوتی تو پائینتی کی طرف کھسک کر باہر نکل جاتیں۔ اس میں آپ کے پاؤں کو ہاتھ لگانے اور انہیں سمیٹنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس صورت پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے ''چارپائی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا'' یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے چارپائی بطور سترہ ہے۔ اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اٹھ کر چلی جاتیں تو چارپائی آپ کے سامنے رہتی اور سترے کا کام دیتی، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو متعدد مقامات پر بیان کیا ہے۔ (۵۰۸، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۴، ۵۱۹)

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی بستر پر نماز پڑھتے جہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا لیٹی ہوتی تھیں۔ اس صورت میں سترہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ذات گرامی ہوتی، چنانچہ سجدہ کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ رضی اللہ عنہا کے پاؤں کو دباتے تو وہ انہیں سمیٹ

لیتیں سجدہ سے فراغت کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا انہیں پھیلا دیتیں۔ اس واقعہ میں لحاف سے نکل کر باہر جانے کی صورت میں ہے۔ اس روایت پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے ''عورت کو سترہ بنا کر نوافل پڑھنا'' اسے بھی متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے۔ (۱۲۰۹،۵۱۹،۵۱۳)

بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ گھر، مسجد، آبادی، صحرا، منیٰ، عرفات، بیت اللہ، الغرض جہاں بھی نماز پڑھتے سترہ کا اہتمام کرتے۔ آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس پر عمل پیرا تھے۔ اس لئے یہ نمازی کی ذمہ داری ہے کہ وہ خود سترہ کا اہتمام کرے، اہل مسجد کی ذمہ داری نہیں کہ وہ متعدد ''سترات'' کا مسجد میں بندوبست کرکے رکھیں۔ اس قسم کی سہولیات فراہم کرنا انتظامیہ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ مؤمن کی شان یہ ہے کہ جب بھی کوئی معاملہ صحیح احادیث سے ثابت ہو جائے اس پر عمل پیرا ہونے کی فکر کرے نہ کہ اسے نظر انداز کرنے کے لئے موہوم خدشات یا پائے چوبین کا سہارا لے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال تشہد میں انگشت شہادت کو حرکت دینا چاہیے یا نہیں؟ اگر دینا چاہیے تو کب اور کیسے ہو؟ اس مسئلہ کے متعلق تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

جواب دوران نماز تشہد کی حالت میں انگشت شہادت کو حرکت دینا نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے بلکہ تمام انبیا علیہم السلام کا طریقہ مبارکہ ہے چنانچہ امام حمیدی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک آدمی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ اس نے شام کے کسی گرجا میں انبیا علیہم السلام کے مجسموں کو دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے اور اپنی انگشت شہادت کو اٹھائے ہوئے تھے۔ [مسند حمیدی، ص: ۱۸۳، حدیث نمبر ۲۴۸]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اس سنت کو زندہ رکھا بلکہ اگر کسی سے اس سلسلہ میں کوتاہی ہو جاتی تو یہ حضرات اس کا مؤاخذہ کرتے۔ [مصنف ابن ابی شیبہ، ص: ۳۶۸، ج ۲]

لیکن افسوس کہ ہمارے ہاں اس سنت کو باہمی اختلاف کی نذر کر دیا گیا۔ اس اختلاف کی بدترین صورت یہ ہے کہ اس سنت کو صحت نماز کے منافی قرار دیا گیا، چنانچہ خلاصہ کیدانی احناف کے ہاں ایک معروف کتاب ہے جس کے متعلق سرورق پر لکھا ہے:

اگر طریق صلوٰۃ کہ دانی اگر نخوانی خلاصہ کیدانی

اگر تو نے خلاصہ کیدانی نہ پڑھا تو نماز کے طریقہ کے متعلق تجھے کچھ پتہ نہیں ہوگا۔ اس کتاب کا پانچواں باب ''محرمات'' کے متعلق ہے۔ اس میں ان چیزوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جن کا ارتکاب دوران نماز حرام اور ناجائز ہے بلکہ ان کے عمل میں لانے سے نماز باطل قرار پاتی ہے۔ ان میں سرفہرست بآواز بلند آمین اور رفع الیدین کو بیان کیا گیا ہے اس کی مزید وضاحت بایں الفاظ کی ہے: ''اَلْاَشَارَۃُ بِالسَّبَّابَۃِ کَأَھْلِ حَدِیْثٍ'' (خلاصہ کیدانی، ص ۱۱) ''بار بار انگلی کے ساتھ اشارہ کرنا جیسا کہ اہل حدیث کرتے ہیں'' یعنی یہ عمل ان کے ہاں نماز کو باطل کر دیتا ہے، ستم بالائے ستم یہ ہے کہ مذکورہ بالا عربی عبارت کا فارسی زبان میں بایں الفاظ ترجمہ کیا ہے ''اشارہ کردن بانگشت شہادت مانند قصہ خواناں'' اس عبارت میں اہل حدیث کا ترجمہ ''قصہ خواناں'' کیا گیا ہے گویا اہل حدیث محض داستان گو اور قصہ خوان ہیں، مصنف خلاصہ کی اس ناروا جسارت کے پیش نظر احناف کے معروف فقیہ اور عالم دین ملا علی قاری نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ لکھتے ہیں کہ مصنف نے بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے، جس کی وجہ قواعد اصول اور مراتب

فروع سے ناواقفیت ہے۔ اگر اس کے متعلق حسن ظن سے کام نہ لیں اور اس کے کلام کی تاویل نہ کریں، تو اس کا کفر واضح اور ارتداد صریح ہے۔ کیا یہ مسلمان کے لئے جائز ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے ایک ثابت شدہ سنت کو حرام کہے اور ایسی چیز سے منع کرے جس پر عامۃ العلما پشت در پشت عمل کرتے چلے آتے ہیں۔ [تزئین العبادۃ بتحسین الاشارۃ،ص:۶۷]

بہرحال دوران تشہد انگشت شہادت کو حرکت دینا، مصنف خلاصہ کیدانی کے نزدیک ''خاکم بدھن'' ایک نازیبا حرکت ہے جس سے نماز باطل ہوتی ہے "نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ هَفَوَاتِ الْفَهْمِ وَالْقَلَمِ" جبکہ تشہد میں انگلی اٹھانا بڑی بابرکت اور عظمت والی سنت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''تشہد میں انگلی اٹھانا شیطان کے لئے دہکتے لوہے سے زیادہ ضرب کاری کا باعث ہے۔''

[مسند امام احمد،ص:۱۱۹،ج۲]

امام حمیدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب نمازی اپنی انگشت شہادت کو حرکت دیتا ہے تو شیطان اس سے دور رہتا ہے اس وجہ سے نمازی کو دوران نماز سہو ونسیان نہیں ہوتا۔ [مسند حمیدی:۱۸۵]

نیز یہ حرکت اور اشارہ نماز میں یکسوئی کا باعث ہے، اس سے خیالات منتشر اور پراگندہ نہیں ہوتے، نمازی، خارجی وساوس اور نماز کے منافی سوچ وبچار سے محفوظ رہتا ہے، کیونکہ انگشت شہادت کا براہ راست دل سے تعلق ہے۔ اس کے حرکت کرنے سے دل بھی رکا رہتا ہے، جیسا کہ حدیث بالا میں اس کا اشارہ موجود ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ دوران نماز شیطان کو اپنے سے دور رکھنے کے لئے انگشت شہادت کی یہ حرکت بہت کارگر ہے۔ [مسند ابی یعلی،ص:۲۷۵،ج۴۷]

ایک روایت میں ہے کہ شیطان اس سے بہت پریشان ہوتا ہے۔ [سنن بیہقی،ص:۱۳۲،ج۲]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اس کی ترغیب بایں الفاظ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز (کے قعدہ) میں بیٹھتے تو دونوں ہاتھ اپنے دونوں گھٹنوں پر رکھتے اور اپنے دائیں کی وہ انگلی اٹھالیتے جو انگوٹھے سے متصل ہے، پھر اس کے ساتھ دعا مانگتے۔

[صحیح مسلم، المساجد:۵۸۰]

جو حضرات اس اشارہ اور حرکت کے قائل ہیں ان میں سے بعض کا مؤقف یہ ہے کہ تشہد میں "أَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کہتے وقت انگشت شہادت اٹھائی جائے اور جب یہ شہادت توحید ختم ہوجائے تو اپنی انگلی کو نیچے کرلیا جائے، ان کی دلیل مندرجہ ذیل حدیث ہے:

حضرت خفاف بن ایماء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب تشہد کے لئے بیٹھتے تو اس سے اشارہ کرتے جس سے آپ کی مراد توحید ہوتی۔ [بیہقی،ص:۱۳۳،ج۲]

علامہ صنعانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ دوران تشہد اشارے کا مقام لا الہ الا اللہ کہتے وقت ہے کیونکہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے رسول اللہ ﷺ کا عمل مبارک نقل فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ اس اشارہ سے مراد توحید واخلاص ہے۔ [سبل السلام،ص:۳۱۹،ج۱]

لیکن اس حدیث میں کسی قسم کی صراحت نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ لا الہ الا اللہ کہنے پر اشارہ کرتے تھے، پھر یہ حدیث معیار محدثین پر پوری بھی نہیں اترتی، اس لئے محل اشارہ کی تعیین کے لئے کوئی صریح اور صحیح حدیث مروی نہیں ہے بلکہ بظاہر حدیث

سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع تشہد سے انگلی اٹھانا چاہیے اور سلام پھیرنے تک اسے حرکت دیتے رہنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل مبارک بایں الفاظ بیان کرتے ہیں ''سب نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انگلی ہلا رہے تھے اور اس کے ساتھ دعا کر رہے تھے۔'' [ابوداؤد، الصلوٰۃ:۷۲۷]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں انگشت شہادت کے متعلق مسنون طریقہ بیان ہوا ہے کہ اس کا اشارہ اور حرکت سلام تک جاری رہے کیونکہ دعا سلام سے متصل ہے۔ [صفۃ الصلوٰۃ:۱۵۸]

برصغیر کے نامور محدثین کا بھی یہی مؤقف ہے کہ انگشت شہادت کی حرکت شروع تشہد سے آخر تشہد تک جاری رہنی چاہیے۔

[عون المعبود،ص:۳۷۴،ج۱،تحفۃ الاحوذی،ص:۲۴۱،ج۱،مرعاۃ المفاتیح،ص:۴۶۸،ج۲]

بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوران تشہد اپنی انگلی کو حرکت نہیں دیتے تھے۔ [ابوداؤد، الصلوٰۃ:۹۸۹]

لیکن عدم حرکت کا یہ اضافہ شاذ ہے کیونکہ مذکورہ روایت محمد بن عجلان کی بیان کردہ ہے جو متکلم فیہ راوی ہے، اس سے بیان کرنے والے خالد الاحمر، عمرو بن دینار، یحییٰ اور زیاد چار راوی ہیں مذکورہ اضافہ بیان کرنے والے صرف زیاد ہیں جو باقی رواۃ کی مخالفت کرتے ہیں اگر ثقہ راوی دوسرے ثقات کی مخالفت کرے تو اس کی بیان کردہ روایت کو شاذ قرار دیا جاتا ہے، علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کی صراحت کی ہے۔ [تمام المنۃ، صفۃ الصلوٰۃ]

محمد بن عجلان کے شیخ حضرت عامر بن عبداللہ سے جب محمد عجلان کے علاوہ دیگر ثقہ راوی بیان کرتے ہیں تو اس اضافہ کو نقل نہیں کرتے، پھر اضافہ کے شاذ اور ناقابل حجت ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عجلان رحمۃ اللہ علیہ سے اس روایت کو مذکورہ حدیث کے بغیر ہی بیان کیا ہے۔ [صحیح مسلم، المساجد:۵۷۹]

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اضافہ والی روایت نافی ہے۔ جن روایات میں اشارہ کا ذکر ہے وہ مثبت ہیں اور محدثین کے بیان کردہ اصول کے مطابق مثبت روایت، نافی پر مقدم ہوتی ہے۔ [زاد المعاد،ص:۲۳۸،ج۱]

مختصر یہ ہے کہ تشہد بیٹھتے ہی انگشت شہادت کو اٹھا کر اسے مسلسل ہلاتے رہنا چاہیے اور اس عمل کے منافی جو روایات ہیں، وہ شاذ، منکر اور ناقابل حجت ہیں، اب ہم تشہد بیٹھتے وقت دائیں ہاتھ اور اس کی انگلیوں کی کیفیت بیان کرتے ہیں۔ محدثین کرام رحمۃ اللہ علیہم نے اسے تین طرح سے بیان کیا ہے جو حسب ذیل ہے:

- دائیں ہاتھ کی تین انگلیوں کو بند کر لیا جائے، پھر انگوٹھے کو انگشت شہادت کی جڑ میں رکھ کر انگشت شہادت سے اشارہ و حرکت کی جائے۔ حدیث میں ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشہد کے لئے بیٹھتے تو اپنا بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر اور دایاں ہاتھ دائیں گھٹنے پر رکھتے اور ترپن (53) کی گرہ لگاتے، پھر انگشت شہادت سے اشارہ کرتے۔'' [صحیح مسلم، المساجد:۵۸۰]

عرب کے ہاں گنتی کا ایک معروف طریقہ ہے کہ ترپن (53) کا عدد بتانے کے لئے پہلی تین انگلیوں کو بند کر کے انگوٹھے کو انگشت شہادت کی جڑ میں رکھ دیتے، حدیث میں ترپن کی گرہ لگانے کا یہی مطلب ہے۔

- تمام انگلیوں کو بند کر کے انگوٹھے کو درمیانی انگلی پر رکھا جائے اور انگشت شہادت سے اشارہ کیا جائے، حدیث میں ہے کہ رسول

اللہ ﷺ دوران تشہد اپنے دائیں ہاتھ کی تمام انگلیاں بند کر لیتے، پھر انگوٹھے کے ساتھ متصل انگلی سے اشارہ کرتے۔

[صحیح مسلم، المساجد: ۵۸۰]

ایک روایت میں مزید وضاحت ہے کہ اپنی انگشت شہادت سے اشارہ کرتے اور انگوٹھے کو درمیانی انگلی پر رکھ لیتے۔

[صحیح مسلم، المساجد: ۵۷۹]

☆ پہلی دو انگلیوں کو بند کر لیا جائے، پھر درمیانی انگلی اور انگوٹھے سے حلقہ بنا کر انگشت شہادت سے اشارہ کیا جائے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے اپنے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کو بند فرمایا، پھر درمیانی انگلی اور انگوٹھے کے ساتھ حلقہ بنایا اور انگشت شہادت سے اشارہ فرمایا۔'' [ابوداؤد، الصلوۃ ۷۲۶]

ان تینوں صورتوں کو گاہے بگاہے استعمال کرتے رہنا چاہیے، اب ہم اس کا فلسفہ بیان کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں مولانا محمد صادق سیالکوٹی مرحوم کے الفاظ مستعار لیتے ہیں، مولانا فرماتے ہیں کہ ''جب انگلی کو کھڑا کیا تو اس نے توحید کی گواہی دی کہ اللہ ایک ہے، پھر جب انگلی کو بار بار ہلانا شروع کیا تو اس نے بار بار ایک، ایک، ایک ہونے کا اعلان کیا، مثلاً: دوران تشہد اگر انگلی کو سات یا آٹھ بار ہلایا تو اتنی ہی مرتبہ انگلی نے توحید کا اعلان کیا گویا انگلی کھڑی ہوئی اور بول بول کر ایک اللہ، ایک اللہ کہتی رہی اور نمازی کے کیف کا یہ عالم ہو کہ نظر انگلی کے رفع اور حرکت پر رکھے، دماغ وحدانیت کو آبشار دل پر گرائے اور قلب عطشاں پر آب حیات پیا جائے۔'' (صلوٰۃ الرسول) حاصل کلام یہ ہے کہ انگشت شہادت کو دوران تشہد حرکت دینا چاہیے اور اشارہ اور حرکت سلام پھیرنے تک برقرار رہے، حرکت نہ دینے کے متعلق جو روایات ہیں شاذ اور نا قابل حجت ہیں، نیز نمازی کی نظر دوران حرکت انگلی اور اس کے اشارہ پر مرکوز رہے اور اس سے تجاوز نہ کرے، اس کا فائدہ یہ ہے کہ نمازی داخلی انتشار اور خارجی خیالات سے محفوظ رہتا ہے۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال جمعہ کی پہلی اذان کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ بعض لوگ اسے سنت کہتے ہیں، کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟

جواب وہ اذان جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے جمعہ کے دن اس وقت ہوتی تھی، جب رسول اللہ ﷺ خطبہ کے لئے منبر پر بیٹھ جاتے تھے، رسول اللہ ﷺ کے بعد حضرت ابو بکر صدیق اور عمر رضی اللہ عنہما کے دور خلافت میں یہی معمول رہا، جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں مدینہ کی آبادی میں اضافہ ہوگیا تو آپ نے لوگوں کی سہولت کے لئے مزید ایک اذان کا اضافہ کر دیا جو بازار میں ''زوراء'' نامی مقام پر دی جاتی تھی۔ جیسا کہ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں جمعہ کے دن پہلی اذان اس وقت ہوتی تھی جب امام منبر پر بیٹھ جاتا تھا لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں جب لوگ زیادہ ہوگئے تو آپ نے مقام زوراء پر تیسری اذان کا اضافہ فرمایا۔ [صحیح بخاری، الجمعہ: ۹۱۲]

شرعی اعتبار سے نماز کے لئے تکبیر کو بھی اذان کہا جاتا ہے، اس لئے عثمانی اذان، اضافہ کے اعتبار سے تیسری اور ترتیب کے لحاظ سے پہلی ہے بعض روایات میں اس عثمانی اذان کو اذان ثانی سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ [صحیح بخاری، ۹۱۵]

حقیقی اذان نبوی کے مقابلہ میں اسے دوسری اذان کہا جاتا ہے اگر چہ ترتیب کے اعتبار سے پہلی اذان کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آبادی میں اضافہ کی وجہ سے بازار میں ایک اونچے مقام پر اذان کہنے کا اہتمام، اس لئے کیا تھا تاکہ لوگوں کو جمعہ کے متعلق بآسانی خبردار کیا جائے۔ اسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت نے اختیار کرلیا، اگر آج بھی ایسے حالات ہوں تو اس عمل کو برقرار رکھا جاسکتا ہے لیکن عصر حاضر میں تقریباً ہر مسجد میں لاؤڈ سپیکر موجود ہے جس کے ذریعے دور دراز علاقوں میں اذان کی آواز پہنچ جاتی ہے اور لوگ جمعہ کے وقت سے باخبر ہو جاتے ہیں اندریں حالات کسی ہنگامی اذان کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ واضح رہے کہ مسجد میں ہی دونوں اذانوں کا اہتمام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا طریقہ نہیں ہے اگر کوئی اس پر عمل کرنا چاہتا ہے تو اسے بازار میں جا کر کسی اونچی جگہ پر کھڑے ہوکر پہلی اذان دینے کا شرف پورا کر لینا چاہیے۔ اپنے مؤقف کی تائید میں یہ کہنا اذان عثمانی خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم میں سے ایک خلیفہ کی سنت ہے جسے مضبوطی سے تھامنے کی تلقین کی گئی ہے۔ یہ اس لئے درست نہیں ہے کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی وہی سنت اختیار کی جاسکتی ہے جو سنت نبوی کے خلاف نہ ہو، لیکن ہم اسے بدعت نہیں کہہ سکتے کیونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ اذان دوسری اذانوں پر قیاس کرتے ہوئے شروع کردی تھی وہ اس طرح کہ کسی بھی نماز کے لئے اذان اس لئے کہی جاتی ہے تاکہ لوگوں کو نماز کے وقت سے خبردار کیا جاسکے چونکہ لوگوں کی کثرت کے باعث جمعہ کے دن ایسا ممکن نہ تھا کہ ایک ہی اذان سے سب کو اطلاع ہو جائے اس لئے انہوں نے یہ اذان شروع کردی۔ یہ دعویٰ کرنا کہ پہلی اذان کے جواز پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع سکوتی ہے، یہ دعویٰ بھی محل نظر ہے کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جمعہ کے دن پہلی اذان کہنا بدعت ہے۔ [مصنف ابن ابی شیبہ،ص:۱۴۰،ج۳]

اس کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی دارالحکومت کوفہ میں اسے ختم کر کے اذان نبوی کو ہی جاری رکھنے کا حکم جاری کیا تھا۔

[تفسیر قرطبی،ص:۱۰۰،ج۱۸]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ نویں صدی ہجری کے نصف تک مغرب کے علاقے میں جمعہ کے لئے صرف ایک اذان دینے کا حکم دیا تھا۔ [فتح الباری،ص:۵۰۷،ج۲]

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جمعہ کی اذان کے متعلق میں عہد رسالت ہی کے طرز عمل کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔

[کتاب الام،ص:۱۹۵،ج۱]

تفصیل بالا کے پیش نظر ہمارے نزدیک سنت نبوی کے مطابق جہاں ایک اذان دینے کا عمل ہے، وہاں اسے برقرار رہنا چاہیے، کسی خاص مکتب فکر کے لوگوں کو خوش کرنے کے لئے اس نبوی طرز عمل کو بدلنا قطعاً مستحسن نہیں ہے، البتہ جہاں دو اذانیں ہوتی ہیں اگر وہاں کسی قسم کے فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو تو وہاں ایک اذان پر اکتفا کرنے کا اہتمام ہونا چاہیے۔ اگر حالات سازگار نہ ہوں تو ان کے سازگار ہونے تک دونوں اذانوں کو برقرار رکھنے کی گنجائش ہے، لیکن سنت نبوی پر عمل کرنے کے لئے ذہن سازی کرتے رہنا چاہیے ایسے حالات کو باہمی اختلاف و جدال کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ [واللہ اعلم]

سوال: خرابی موسم کی وجہ سے نماز مغرب کے فوراً بعد نماز عشاء ادا کرنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے جبکہ عشاء کی نماز کے لئے

اذان وغیرہ نہیں دی گئی تھی اور نہ ہی مغرب کی سنتیں ادا کی گئی ہیں؟ ہم نے اپنے علما سے سنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ دوران سفر نماز مغرب اور نماز عشاء اس طرح اکٹھی پڑھتے کہ نماز مغرب کو لیٹ کر کے نماز عشاء کے ساتھ ملا کر پڑھتے تھے۔ کیا ایسے حالات میں سفر کے علاوہ نماز کو دوسری نماز کے ساتھ اکٹھا پڑھا جا سکتا ہے؟

جواب دین اسلام کی بنیاد تخفیف اور سہولت پر ہے، اس میں بلاوجہ کسی کو مشقت اور تنگی میں نہیں ڈالا گیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''دین کے معاملات میں تم پر کوئی تنگی نہیں۔'' [۲۲/الحج:۷۸]

''اللہ تعالیٰ نے انسانی کمزوری کے پیش نظر تمہارے ساتھ تخفیف کا ارادہ فرمایا۔'' [۴/النسآء:۲۸]

نیز فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تم پر آسانی کرنا چاہتے ہیں اس کا تمہیں مشقت اور تنگی میں ڈالنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' [۲/البقرہ:۱۸۵]

نمازوں کے سلسلہ میں بھی اس سہولت اور آسانی کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ سفر، بیماری، خوف، بارش وغیرہ اور کسی اہم مصروفیت کے پیش نظر دو نمازوں کو اکٹھا کیا جا سکتا ہے، پھر انہیں اکٹھا کر کے ادا کرنے کی دو صورتیں ہیں:

① ایک نماز کو دوسری نماز کے وقت جمع کر کے ادا کرنا اسے جمع حقیقی کہا جاتا ہے اس کی دو اقسام ہیں:

(الف) جمع تقدیم: ایک نماز وقت سے پہلے دوسری کے ساتھ جمع کی جائے، مثلاً: ظہر کے ساتھ عصر اور مغرب کے ساتھ عشاء کی نماز ادا کرنا۔

(ب) جمع تاخیر: ایک نماز وقت کے بعد مؤخر کر کے دوسری نماز کے ساتھ جمع کی جائے، مثلاً: عصر کے ساتھ ظہر اور عشاء کے ساتھ مغرب کی نماز ادا کرنا۔

② جمع صوری: پہلی نماز کو مؤخر کر کے اس کے آخری وقت میں اور دوسری نماز کو مقدم کر کے پہلے وقت میں پڑھ لینا، اس طرح بظاہر دونوں نمازیں جمع ہو جائیں گی لیکن انہیں اپنے اپنے اوقات میں ہی ادا کیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ سے دوران سفر نماز جمع تقدیم اور جمع تاخیر دونوں طرح پڑھنا ثابت ہے، جیسا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر رسول اللہ ﷺ اگر سورج ڈھلنے کے بعد سفر شروع کرتے تو ظہر اور عصر کو اسی وقت پڑھ لیتے اور اگر سورج ڈھلنے سے پہلے سفر شروع کرتے تو ظہر کو مؤخر کر کے عصر کے ساتھ ادا کرتے، اسی طرح اگر سورج غروب ہونے کے بعد سفر شروع کرتے تو مغرب اور عشاء اسی وقت پڑھ لیتے۔ [ابوداود، الصلوٰۃ:۱۲۲۰]

اسی طرح نمازوں کو مذکورہ طریقے کے مطابق ادا کرنے کی ایک روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ، [بیہقی، ص:۱۶۲، ج۳] اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ [مسند امام احمد، ص:۳۶۷، ج۵]

سفر کے علاوہ حضر میں بھی ناگزیر حالات کے پیش نظر دو نمازوں کو جمع کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اسے مستقل عادت نہ بنایا جائے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں ظہر اور عصر کی آٹھ رکعات اور مغرب اور عشاء کی سات رکعات ایک ساتھ پڑھیں۔ [صحیح بخاری، مواقیت:۵۴۳]

ایک روایت میں ہے کہ راوی حدیث نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کیوں کیا؟ تو

آپ نے جواب دیا کہ ایسا امت کی سہولت کے پیش نظر کیا گیا تا کہ یہ امت کسی تنگی اور مشقت میں مبتلا نہ ہو۔

[مسند امام احمد،ص:۲۲۳،ج۵]

تاہم دو نمازوں کو جمع کرنا سخت ضرورت، مثلاً: بارش اور شدید آندھی وغیرہ ہو تو ایسا کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر کاروباری حضرات کا معمول ہے کہ وہ سستی یا کاروباری مصروفیات کی وجہ سے دو نمازیں جمع کر لیتے ہیں یہ صحیح نہیں ہے بلکہ بعض اوقات روایات کے مطابق ایسا کرنا سخت گناہ ہے۔ ناگزیر حالات کے علاوہ ہر نماز کو اس کے وقت پر ہی ادا کرنا ضروری ہے۔ جب سفر کے علاوہ کسی سخت مجبوری کی بنا پر دو نمازوں کو اکٹھا کر کے ادا کیا جائے تو پہلی نماز کی سنتیں وغیرہ ادا نہیں کی جاتیں کیونکہ اس سے جمع کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اس کے علاوہ دوسری جماعت کے لئے صرف اقامت ہی کافی ہے اذان دینے کی ضرورت نہیں۔

[صحیح مسلم، الحج:۱۲۱۸]

واضح رہے کہ اگر بارش کی وجہ سے دو نمازوں کو اکٹھا پڑھا جائے تو مسجد میں دوسری نماز کے لئے اذان دی جائے اگر بارش جاری ہو تو "اَلَا صَلُّوْا فِی الرِّحَالِ" کے الفاظ کہے جائیں اور مسجد میں رہائش رکھنے والے باقاعدہ جماعت کا اہتمام کریں اور اگر بارش رک گئی ہو تو معمول کے مطابق اذان کہی جائے تا کہ جو حضرات بارش کی وجہ سے پہلی نماز میں حاضر نہیں ہو سکے تھے وہ دوسری نماز با جماعت مسجد میں ادا کریں۔ [واللہ اعلم]

سوال رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو نماز پڑھتے دیکھا جس کا کپڑا ٹخنوں سے نیچے تھا تو آپ نے اسے نماز اور وضو دوبارہ کرنے کے متعلق حکم دیا (ابوداؤد) اس حدیث کی صحت کیسی ہے؟

جواب حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو بایں حالت نماز پڑھتے دیکھا کہ اس کی چادر ٹخنوں سے نیچے تھی، آپ نے فرمایا کہ "جا اور وضو کر۔" چنانچہ وہ گیا اور وضو کر کے چلا آیا۔ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ آپ نے اسے وضو کرنے کا حکم کیوں دیا؟ آپ نے فرمایا کہ "وہ اپنی چادر ٹخنوں سے نیچے کر کے نماز پڑھ رہا تھا اور اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی نماز قبول نہیں کرتا ہے جس کا کپڑا ٹخنوں سے نیچے ہو۔" [ابوداؤد، صلوٰۃ، ۶۳۸، اللباس: ۴۰۸۶، مسند امام احمد، ص:۷۹، ج۵]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے۔ [ضعیف ابوداؤد، ص:۵۹، حدیث نمبر:۱۲۴]

اور اس کے ضعف کی وجہ بایں الفاظ بیان کی ہے، کہ اس میں ابوجعفر الانصاری المدنی المؤذن راوی مجہول ہے۔ محدث ابن قطان نے اس کی صراحت کی ہے، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اسے "لین الحدیث" میں لکھا ہے۔ (تقریب) کچھ علما نے وہم کی بنا پر اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ [تعلیق مشکوٰۃ المصابیح:۷۶۱]

امام منذری رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ ترکمانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس راوی کو مجہول قرار دیا ہے۔ [مختصر سنن ابی داؤد، ص:۳۲۴، ج۱]

اگرچہ امام ترمذی نے اس سے مروی ایک حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔ [الدعوات:۳۴۴۸]

لیکن اسے بیان کرنے والا صرف ایک راوی یحییٰ بن ابی کثیر ہے محدثین کے بیان کردہ اصول کے مطابق ایسا راوی مجہول ہوتا ہے جس سے بیان کرنے والا صرف ایک راوی ہو۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی شرط پر اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔

[ریاض الصالحین، حدیث نمبر: ۷۹۷]

لیکن مذکورہ راوی صحیح مسلم کے راویوں میں سے نہیں ہے کہ اس روایت کو مسلم کی شرط پر صحیح قرار دیا جائے، ان شرائط کی بنا پر یہ روایت ہمارے نزدیک ضعیف ہے، اس لئے قابل حجت نہیں ہے، اگرچہ اسبال ازار سخت ممنوع فعل ہے، اس فعل کے ارتکاب پر وہ شخص اخروی سزا کا حق دار ہوگا اگر صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے، تو بھی اسبال ازار کو نواقض وضو میں شمار کرنا محل نظر ہے، کیونکہ کسی محدث نے اس حدیث سے اس قسم کا مسئلہ مستنبط نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ وضو کرنے کے متعلق غالباً اس لئے کہا کہ بلاشبہ وضو کرنے سے گناہ اور اسباب گناہ، مثلاً: غصہ وغیرہ ختم ہوجاتے ہیں لیکن اسبال ازار نے وضو کی اس فضیلت کو غیر مؤثر کردیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اسے دوبارہ وضو کی تلقین کر کے اس کوتاہی کی طرف متوجہ کرنا چاہتے تھے جس نے اسے وضو کی اس فضیلت سے محروم کردیا تھا۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال کیا دوران جماعت نمازیوں کو سلام کہنا ضروری ہے جبکہ ایسا کرنے سے خشوع بھی متاثر ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کچھ ساتھی جب جماعت کھڑی ہوتی ہے تو باآواز بلند سلام کہتے ہیں کچھ نمازی کہتے ہیں کہ جماعت کھڑی ہو تو سلام نہیں کہنا اور نہ ہی اس کا جواب دینا چاہیے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلے کی وضاحت فرمائیں۔

جواب دوران نماز انسان کو ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو نماز کا حصہ نہیں ہے اور نہ ہی باہر سے آنے والے کو کوئی ایسا کام کرنے کی اجازت ہے جس سے نمازی حضرات کا خشوع متاثر ہو، لیکن بعض کام ایسے ہیں جو نماز کا حصہ نہ ہونے کے باوجود بھی دوران نماز کئے جاسکتے ہیں کیونکہ شریعت نے ان کی اجازت دی ہے، اس طرح کچھ کام ایسے ہیں کہ باہر سے آنے والا انہیں سرانجام دے سکتا ہے، اگرچہ اس سے کسی حد تک نمازی کا خشوع متاثر ہوتا ہے۔ ان میں سلام کا کہنا اور اس کا مخصوص انداز سے جواب دینا بھی ہے واضح رہے کہ نماز سے متعلقہ احکام کی تکمیل کئی ایک مراحل میں ہوتی ہے۔ چنانچہ پہلے دوران نماز باہر سے آنے والوں کو سلام کہنے اور نمازیوں کو اس کا جواب دینے کی اجازت تھی، لیکن بعد میں اس اجازت کو ختم کردیا گیا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز پڑھ رہے ہوتے تو ہم آپ کو سلام کہتے اور آپ اس کا دوران نماز جواب بھی دیتے تھے لیکن حبشہ کے فرمانروا حضرت نجاشی کے پاس سے واپس مدینہ آئے تو میں نے رسول اللہ ﷺ کو حسب معمول دوران نماز سلام کہا لیکن آپ نے اس کا جواب نہ دیا میرے دل میں اس سے متعلق طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ جب آپ نے سلام پھیرا تو میں نے اس کے متعلق آپ سے دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا: ''نماز میں مصروفیت ہوتی ہے۔'' [صحیح مسلم، المساجد: ۱۲۰۱]

ایک روایت میں ہے کہ جب میں نے آپ کو سلام کہا تو آپ نے میری طرف اشارہ فرمایا۔ [صحیح مسلم: ۱۲۰۵]

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دوران نماز سلام کہا جاسکتا ہے لیکن ایسا کرنا ضروری نہیں ہے کہ اگر نہ کہا جائے تو کسی فرض کا تارک قرار پائے، اس لئے باہر سے آنے والے کو چاہیے کہ اگر وہ سلام کہنا چاہتا ہے تو باآواز بلند سلام ''پھینکنے'' کی بجائے نہایت شائستگی اور آہستگی سے سلام کہے۔ نماز میں مصروف انسان کے لئے اس کا جواب کہنا دو طرح سے جائز ہے۔

① نماز سے فراغت کے بعد زبان سے اس کا جواب دے دے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں

نے رسول اللہ ﷺ کو دوران نماز سلام کہا تو آپ نے فراغت کے بعد اس کا جواب دیا اور اس کے ساتھ ساتھ وضاحت بھی کر دی۔

[ابوداؤد، الصلوٰۃ:۹۲۴]

② دوران نماز اپنے ہاتھ کے اشارہ سے بھی جواب دیا جا سکتا ہے لیکن زبان سے کچھ نہیں کہنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ مسجد قبا تشریف لے گئے۔ وہاں آپ نے نماز پڑھی تو وہاں مقیم انصاری حضرات دوران نماز آپ کو سلام کرنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ تھے، اس لیے میں نے ان سے دریافت کیا کہ رسول اللہ ﷺ ان کے سلام کا جواب کیسے دیتے تھے انہوں نے کہا آپ اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتے تھے۔

[ابن ماجہ، اقامۃ الصلوٰۃ:۱۰۱۷]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے بھی یہی سوال کیا تھا تو انہوں نے بھی وہی جواب دیا جو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے دیا تھا۔ [جامع ترمذی، الصلوٰۃ:۳۶۸]

جبکہ ابوداؤد میں ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ پھیلا کر وضاحت فرمائی کہ رسول اللہ ﷺ دوران نماز اس طرح جواب دیتے تھے۔ [ابوداؤد، الصلوٰۃ:۹۲۷]

دراصل شریعت بعض اوقات کسی انسان کی حسن نیت کے پیش نظر اس کے کسی عمل کو صرف جواز کی حد تک نہ کہ افضل ہونے کی حیثیت سے گوارا کر لیتی ہے۔ اس لئے ایسے اعمال کو مسنون ہونے کا درجہ نہیں دیا جا سکتا، جیسا کہ ایک آدمی نے دوران جماعت رکوع سے اٹھ کر باآواز بلند ''کلمات تحمید'' ادا کیے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے اخلاص کے پیش نظر اس کی تحسین فرمائی لیکن خود اس پر عمل نہیں کیا اور نہ ہی دوسروں کو یہ عمل بجالانے کی تلقین فرمائی، دوران جماعت سلام کہنا بھی اسی قبیل سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنی زندگی میں کم از کم تین مرتبہ دوران نماز شامل ہوئے ہیں، لیکن آپ کا نمازیوں کو سلام کہنا کسی روایت سے ثابت نہیں ہے، اگر یہ افضل عمل ہوتا تو آپ اسے ضرور بجالاتے، اسی طرح اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے جواز کی حد تک برقرار رکھا ہے۔ پھر آپ کے جواب دینے کی جو صورتیں ہیں ان سے بھی اس کا افضل ہونا ثابت نہیں بلکہ صرف جواز ثابت ہوتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال اذان تہجد کے متعلق وضاحت فرمائیں کہ اس کی کیا حیثیت ہے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ جو اذان دیتے تھے اس پر اعتراض ہے کہ وہ صرف رمضان کے ساتھ خاص ہے کیا اذان تہجد سارا سال بھی دی جا سکتی ہے؟

جواب رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں صرف فجر کی ایک اذان ہوتی تھی، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ رضی اللہ عنہ نے جب اذان کے متعلق خواب میں دیکھا تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو پانچوں وقت اذان دینے کیلئے تعینات فرمایا کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ خوش الحان اور بلند آواز تھے۔ اس وقت فجر کی اذان بھی ایک ہوتی تھی۔ [مسند امام احمد ص:۴۳ ج۴]

حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ صبح کی اذان وقت سے پہلے کہہ دی تھی تو اس کے متعلق باقاعدہ اعلان کیا گیا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو نیند آنے کی وجہ سے بروقت اذان نہیں دی جا سکی۔ [ابوداؤد، الصلوٰۃ:۵۳۲]

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو پابند کیا تھا کہ فجر واضح ہونے سے پہلے صبح کی اذان نہ کہی

جائے۔ [ابوداود، الصلوٰۃ:۵۳۴]

اگر چہ امام ابوداوٗد نے ان روایات کے ضعیف ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے، تاہم یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ صبح کی اذان ایک ہوتی تھی اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کہتے تھے جب حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے اذان کہنے کے متعلق اپنے شوق کا اظہار کیا تو صبح کی دو اذانیں دینے کا اہتمام کر دیا گیا۔ پہلی اذان حضرت بلال رضی اللہ عنہ کہتے جبکہ دوسری اذان حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے ذمے لگادی گئی، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ رات کو اذان دیتے تھے، اس لئے تم سحری کھاؤ اور پیو، تا آنکہ ابن ام مکتوم اذان دے۔ [صحیح بخاری، الاذان:۲۶۳]

ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نابینے تھے وہ اس وقت تک اذان نہیں دیتے تھے تا آنکہ انہیں کہا جاتا کہ صبح ہوگئی اب اذان کہہ دی جائے۔ [صحیح بخاری، الاذان:۶۱۷]

اس میں رمضان یا غیر رمضان کی تخصیص نہیں ہے، لیکن یہ اذان اولیٰ نماز فجر کے وقت کا اعلان اور سامعین کو حضور جماعت کی دعوت دینے کے لئے نہیں ہے اسے تہجد کی اذان کہنے کی بجائے سحری کی اذان کہنا زیادہ مناسب ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اذان کی غرض وغایت خود فرمائی ہے کہ تہجد پڑھنے والا گھر لوٹ آئے اور اپنے گھر سونے والا بیدار ہو جائے۔ [صحیح بخاری، الاذان:۶۲۱]

واضح رہے کہ ہمارے ہاں یہ اذان فجر کی اذان سے کافی وقت پہلے کہہ دی جاتی ہے کیونکہ یہ اذان سحری کھانے اور نماز فجر کی تیاری کے لئے ان دونوں کاموں کے لئے چالیس، پینتالیس منٹ کافی ہیں، اس لئے گھنٹوں پہلے یہ اذان دینا درست نہیں ہے، نیز مذکورہ احادیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ اذان رمضان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے کیونکہ سحری کا تعلق صرف رمضان سے ہی نہیں بلکہ دوسرے مہینوں میں بھی روزے رکھے جاسکتے ہیں۔ تفصیل کے لئے کتاب مرعاۃ المفاتیح (ص:۱۵۵ ج۲) کو دیکھا جاسکتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال غیر اللہ کے لئے سجدہ تو تسبیحات کے بغیر ہی پورا ہو جاتا ہے کیا دوران نماز سجدہ میں اگر تسبیحات نہ کی جائیں تو سجدہ مکمل ہو گا یا نہیں؟ اگر تسبیحات کے بغیر سجدہ نامکمل ہے تو کیا اس رکعت کو دوبارہ پڑھنا ہو گا؟ وضاحت کریں۔

جواب سجدہ کی دو اقسام ہیں ایک سجدہ تعظیمی اور دوسرا سجدہ عبادت۔ سجدہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جو کسی وقت بھی اس کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے جائز نہیں ہوا اور سجدہ تعظیمی غیر اللہ کے لئے پہلے کیا جاتا تھا، جیسا کہ فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے لئے کیا یا برادران یوسف نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کیا۔ اس امت کے لئے سجدہ تعظیمی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ حدیث میں اس کی ممانعت ہے، چنانچہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جب علاقہ شام سے واپس آئے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ تعظیمی کیا آپ نے فرمایا: ''اے معاذ! یہ کیا ہے؟'' انہوں نے کہا کہ علاقہ شام کے لوگ اپنے مذہبی رہنماؤں کے سامنے اس قسم کا سجدہ بجالاتے ہیں، اس لئے میں نے پسند کیا کہ ہم آپ کو سجدہ کریں۔ تو آپ نے فرمایا: ''ایسا مت کرو، اگر اللہ کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔'' [ابن ماجہ، النکاح:۱۸۵۳]

سجدہ تعظیمی زمین پر سر رکھ دینے سے پورا ہو جاتا ہے اس میں تسبیحات کہنے کی ضرورت نہیں ہے جبکہ اللہ کے حضور جسے سجدہ عبادت کیا جاتا ہے اس کے لئے اپنی بے بسی اور اللہ کی کبریائی کا اعتراف کرنا ہوتا ہے، اس لئے اس میں تسبیحات کہی جاتی ہیں

چنانچہ حضرت عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب آیت کریمہ "فسبح اسم ربك العظیم" نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم اسے رکوع میں پڑھا کرو۔" اور جب آیت کریمہ "سبح اسم ربك الاعلی" نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا: "اسے اپنے سجدہ میں پڑھا کرو۔" [ابن ماجہ:۸۸۷]

ان تسبیحات کو کم از کم تین مرتبہ بحالت سجدہ پڑھنا چاہیے، حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحالت سجدہ تین مرتبہ "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى" پڑھتے سنا ہے۔ [ابن ماجہ، اقامۃ الصلوۃ:۸۸۸]

ترمذی کی روایت میں صراحت ہے کہ ان تسبیحات کو کم از کم تین مرتبہ پڑھنے سے سجدہ پورا ہو جاتا ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب تم سے کوئی سجدہ کرے اور دوران سجدہ تین مرتبہ "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى" کہے تو اس کا سجدہ مکمل ہو جاتا ہے یہ تعداد کم از کم ہے۔" [ترمذی، الصلوۃ:۲۶۱]

اس حدیث کا واضح مطلب ہے کہ اگر سجدہ میں کم از کم تین تسبیحات نہ کہی جائیں تو وہ سجدہ مکمل نہیں ہے اور جس رکعت کا سجدہ نامکمل ہو اسے دوبارہ پڑھنا ہو گا اگر دانستہ تسبیحات نہیں پڑھی ہیں تو اس کی سرے سے نماز ہی باطل ہے، اگر غفلت یا بے خیالی میں یہ تسبیحات رہ جائیں تو حدیث کے مطابق یہ سجدہ نامکمل ہے اور اس کی تلافی اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ اس رکعت کو دوبارہ پڑھ لیا جائے۔ شریعت اسلامیہ میں سجدہ صرف اوپر نیچے ہونے کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کی اصل روح یہ ہے کہ اپنی کامل عاجزی اور بے کسی کا اظہار پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور شان رفیع کا اعتراف کیا جائے۔ اس لئے جس سجدہ میں یہ روح کارفرما نہیں ہے اسے لغوی طور پر تو سجدہ کہا جا سکتا ہے لیکن شرعی اعتبار سے اسے سجدہ قرار دینا محل نظر ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال کیا بریلوی اور دیوبندی امام کی اقتدا میں نماز ادا کی جا سکتی ہے؟ جبکہ یہ حضرات تقلید کی بندشوں میں جکڑے ہوئے ہیں اور بریلوی حضرات تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک بھی کرتے ہیں، کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دیں؟

جواب واضح رہے کہ بریلوی اور دیوبندی جیسی نسبتیں دیوبند اور بریلی کے مدارس کی وجہ سے ہیں امامت کا تعلق عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ سے ہے، چونکہ امام کی حیثیت ایک نمایندہ کی ہوتی ہے اس لئے دینی اعتبار سے اسے دوسرے لوگوں سے بہتر ہونا چاہیے اور مستقل امام کی حیثیت سے کسی ایسے شخص کا انتخاب کرنا چاہیے جو اچھے عقائد و نظریات اور بہترین اعمال و کردار کا حامل ہو۔ اس بات کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "امامت کے لئے اپنے سے بہتر انسان کا انتخاب کرو کیونکہ یہ حضرات ہمارے اور اللہ کے درمیان نمائندہ ہوتے ہیں۔" [دارقطنی، ص:۸۸ ج۲]

یہ حدیث سند کے اعتبار سے اگرچہ ضعیف ہے، تاہم استشہاد کے طور پر اس قسم کی احادیث کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک جو انسان تقلید شخصی کو شرعی حکم خیال کرتا ہے اور اپنے امام کی بات کو حرف آخر تسلیم کرتا ہے، اولیائے اللہ کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتا ہے، اہل قبور سے استمداد کا قائل اور فاعل ہے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب اور حاضر و ناظر جانتا ہے، ایسے شخص کو مستقل طور پر اپنا امام نہیں بنانا چاہیے اور نہ ہی ایسے شخص کے پیچھے مستقل طور پر اختیاری حالات میں نماز ادا کرنا چاہیے، البتہ کبھی کبھار کسی مصلحت و ضرورت کے پیش نظر ایسے امام کی اقتدا میں نماز ادا کرنا پڑے تو نماز ادا ہو جائے گی۔ جیسا کہ اہل بدعت کے

متعلق امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ (جب ان سے بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنے کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا) ''اس کی اقتدا میں نماز پڑھ لے اور بدعت کا وبال بدعتی پر ہو گا۔'' [صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب امامة المفتون والمبتدع]

لیکن جس امام میں ایسی فکری اور نظریاتی خرابیاں ہوں جو اسے دین اسلام سے خارج کر دیتی ہوں تو ایسے امام کے پیچھے نماز ادا کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی کہتا ہے کہ کوئی انسان داڑھی اور نماز کے بغیر جنت میں نہیں جا سکتا، کیا داڑھی کے بغیر مسلمان نہیں ہو سکتا اور نماز کے بغیر جنت کا حصول ممکن نہیں ہے؟

جواب جنت کا حصول اللہ کی مرضی پر موقوف ہے وہ چاہے تو ایک بدکار اور زانیہ عورت کو ایک پیاسے کتے کو پانی پلانے پر جنت عطا کر دے اور وہ چاہے تو بلاوجہ بلی کو اپنے گھر قید کرنے کی وجہ سے کسی عورت کو جہنم میں بھیج دے، ہمیں اس امر کا پابند کیا گیا ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے ایمان کے ساتھ اس کے احکام کی پابندی کریں جو اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں داڑھی کے متعلق ہماری گزارشات حسب ذیل ہیں:

① داڑھی رکھنا نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بلکہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام کا طریقہ ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کے جتنے بھی پیرو کار ہیں ان میں سے کوئی بھی داڑھی کے بغیر نہیں۔

② داڑھی رکھنے کو شریعت نے امور فطرت سے قرار دیا ہے جو انسان داڑھی نہیں رکھتا وہ فطرت کی خلاف ورزی کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی خلقت میں بگاڑ کا باعث ہے۔

③ داڑھی رکھنے کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے جو انسان اسے نہیں مانتا وہ گویا سرکاری حکم کو ٹھکراتا ہے۔

④ داڑھی رکھنے کی مخالفت کو یہود ونصاریٰ، کفار ومشرکین اور مجوس کی مشابہت قرار دیا گیا ہے اور یہ بھی ایک ضابطہ ہے جو کسی کی مشابہت اختیار کرتا ہے وہ قیامت کے دن انہی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

⑤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت بااخلاق تھے لیکن داڑھی کا معاملہ اتنی نزاکت کا حامل ہے کہ اس کی مخالفت کرنے پر دو ایرانی نمائندوں کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔

⑥ گناہ کرتے وقت ہر انسان اپنے اندر اس کی ٹیس محسوس کرتا ہے لیکن داڑھی کی مخالفت ایسا جرم ہے کہ اس کے ارتکاب پر انسان خوش ہوتا ہے اور اسے اپنے لئے باعث زینت خیال کرتا ہے۔

مندرجہ بالا امور کے پیش نظر کیا ایک مسلمان کو زیب دیتا ہے کہ وہ داڑھی کے بغیر رہے، نماز کا معاملہ داڑھی سے بھی سنگین ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے ''اس دین میں کوئی خیر وبرکت نہیں جس میں نماز نہیں ہے۔'' بلکہ آپ نے بندے اور کفر کے درمیان نماز کو حد امتیاز قرار دیا ہے۔ [مسلم، الایمان: ۸۲]

نماز کی ادائیگی اسلام کے بنیادی پانچ ارکان سے ہے۔ [صحیح بخاری، الایمان: ۸]

نماز دین کا ستون ہے اور مؤمن کی معراج ہے۔ [مستدرک حاکم، ص: ۶۰۷ ج ۴]

رسول اللہ ﷺ کا ارشادگرامی ہے: ''قیامت کے دن لوگوں کے اعمال میں سے پہلے نماز کا حساب ہوگا۔''

[ابوداؤد، الصلوٰۃ:۸۶۶]

رسول اللہ ﷺ کے جتنے بھی پیروکار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں ان میں سے ایک بھی بے نماز نہیں ہے بلکہ آدمی اورشرک کے درمیان نماز ہی رکاوٹ کا باعث ہے۔ایسے حالات میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک متبع سنت، داڑھی کا احترام کرنے والانمازی انسان ضرور جنت میں داخل ہوگا۔باذن اللہ،اس کے بغیر جنت کاحصول اللہ کی مرضی پرموقوف ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال نماز فجر کے لئے امام تشہد میں بیٹھا ہے۔باہر سے آنے والے نمازی کے لئے کیا حکم ہے وہ تشہد میں بیٹھ جائے یا فجر کی سنت ادا کرے یا سلام پھیرنے کا انتظار کرے تاکہ پہلے سنتیں ادا کر کے فرض نماز پڑھے، نیز مؤذن صبح کی اذان میں "الصلوٰۃ خیر من النوم " کہنا بھول گیا ہے،اب کیا اذان دوبارہ کہنا ہوگی یا یہی کافی ہے؟ بعض لوگوں کا موقف ہے کہ پہلے دی گئی اذان غلط ہے،اس لئے دوبارہ کہی جائے۔

جواب امام اس لئے بنایا جاتا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے،اس لئے بہتر ہے کہ باہر سے آنے والانمازی امام کے ساتھ تشہد میں شامل ہوجائے کیونکہ جوحصہ جماعت کا اسے ملا ہے اس کا ثواب بھی ضرور ملے گا،حدیث میں بھی اس طرح کا اشارہ ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھ رہے تھے کہ آپ نے لوگوں کے دوڑنے کی آواز سنی ، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے اس کے متعلق دریافت فرمایا۔ بتایا گیا کہ نماز میں شمولیت کی جلدی تھی، اس لئے ایسا کیا گیا ہے اس پر آپ نے فرمایا: ''آیندہ ایسامت کرنا،نماز کے لئے سکون اوراطمینان سے آنا چاہیے، جوامام کے ساتھ نماز کا حصہ مل جائے اسے پڑھ لواور جورہ جائے اسے مکمل کرلو۔'' [صحیح بخاری،الاذان:۶۳۵]

اس حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ اگر امام تشہد میں بھی بیٹھا ہے تو بھی باہر سے آنے والانمازی جماعت میں شامل ہوجائے اور یہ کسی صورت جائز نہیں ہے کہ وہ جماعت کے ہوتے ہوئے سنتیں پڑھنا شروع کردے۔کیونکہ اس کی حدیث میں ممانعت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب نماز کھڑی ہوجائے توفرض نماز کے علاوہ دوسری نماز نہیں ہوتی ہے۔'' [مسند امام احمد،ص:۴۵۵ج۲]

ایک روایت میں ہے کہ جس نماز کی اقامت کہی گئی ہے اس کے علاوہ دوسری نماز نہیں ہوتی۔ [مسند احمد،ص:۴۵۲ج۲]

اس لئے دوران جماعت سنت ادا کرنے کی اجازت نہیں ہے،مؤذن اگر صبح کی اذان میں " الصلوٰۃ خیر من النوم " کہنا بھول گیا ہے تو بھول چوک کو اللہ تعالیٰ نے معاف کردیا ہے، اذان مکمل ہے اسے دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اذان کا مطلب لوگوں کو نماز کے وقت کی اطلاع دینا ہے، وہ اس طرح اذان کہنے سے پورا ہوچکا ہے اگرچہ بھول کر "الصلوٰۃ خیر من النوم " نہیں کہا گیا بہرحال اذان صحیح ہے دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ نماز کھڑی ہونے کے بعد آدمی نماز میں شامل ہوتا ہے وہ پہلے ہاتھ اٹھا کر سینہ پر باندھتا ہے پھرامام کے ساتھ رکوع یا سجدہ میں شامل ہوتا ہے کیا ایسا کرنا صحیح ہے؟

جواب امام کے ساتھ شمولیت کے لئے ایسا کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ نماز میں شمولیت کے لئے اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ اٹھانے

ضروری ہیں۔اس کے بعد اگر امام قیام میں ہے تو قیام کی حالت اختیار کرتے ہوئے ہاتھ سینہ پر باندھ لئے جائیں لیکن اگر رکوع یا سجدہ میں ہے تو نماز میں شمولیت کے بعد امام جیسی حالت اختیار کر لینی چاہیے، جب امام بحالت رکوع ہے تو رکوع میں چلا جائے اور اگر امام سجدے میں ہے تو سجدے میں چلا جائے۔اس کے لئے ہاتھ سینے پر باندھنے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ اسے دو مرتبہ اللہ اکبر کہنا پڑے گا، ایک نماز میں داخل ہونے کے لیے تکبیر تحریمہ کہنا اور پھر رکوع یا سجدہ میں جانے کے لئے اللہ اکبر کہنا۔اکثر طور پر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ امام جب رکوع میں ہوتا ہے تو بعد میں آنے والا شخص نماز میں شامل ہو کر جلدی جلدی بحالت قیام سورۂ فاتحہ پڑھنا شروع کر دیتا ہے، پھر رکوع میں جاتا ہے، جبکہ اس دوران امام رکوع سے سر اٹھا لیتا ہے۔دوران نماز امام کی مخالفت کرتے ہوئے جو نماز کا رکن ادا کیا جائے وہ سرے سے ہوتا ہی نہیں ہے، اس بنا پر اس قسم کا لالچ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ بعد میں آنے والے کو چاہیے کہ وہ تکبیر تحریمہ کہہ کر ہاتھ اٹھائے، پھر اللہ اکبر کہتا ہوا امام کے ساتھ رکوع یا سجدہ میں شامل ہو جائے، بحالت رکوع ملنے سے رکعت کو شمار نہ کیا جائے کیونکہ اس سے قیام اور قراءت فاتحہ فوت ہونے سے رکعت نہیں ہوگی، اسے دوبارہ ادا کرنا ہوگا۔ [واللہ اعلم]

سوال دوران سفر جو نماز رہ گئی، گھر آ کر وہ پوری پڑھی جائے یا قصر ادا کی جائے؟

جواب دوران سفر رسول اللہ ﷺ بایں طور پر نمازیں ادا کرتے تھے کہ اگر زوال آفتاب یا غروب آفتاب سے پہلے سفر شروع کرتے تو ظہر کو مؤخر کر کے عصر کے ساتھ اور مغرب کو مؤخر کر کے عشاء کے ساتھ پڑھتے اور اگر سفر کا آغاز زوال آفتاب یا غروب آفتاب کے بعد ہوتا تو عصر کو مقدم کر کے ظہر کے ساتھ اور عشاء کو مقدم کر کے مغرب کے ساتھ ادا کرتے، پھر سفر شروع کرتے، دوران سفر نماز فوت ہونے کا کوئی واقعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔صرف ایک دفعہ نیند کی وجہ سے صبح کی نماز فوت ہوئی تھی جسے رسول اللہ ﷺ نے دن چڑھے باجماعت ادا فرمایا۔جن کوائف کے ساتھ نماز فوت ہوتی تھی انہی کوائف کے ساتھ اسے ادا کیا گیا، اسی طرح حضر میں غزوۂ خندق کے موقع پر کچھ نمازیں فوت ہوئی تھیں تو رسول اللہ ﷺ نے غروب آفتاب کے بعد فوت شدہ نمازوں کو ادا فرمایا اور ادا کرتے وقت ترتیب کو ملحوظ رکھا، ان اشباہ و نظائر کو پیش نظر رکھتے ہوئے صورت مسئولہ کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ نماز جس حالت میں فوت ہوئی، ادا کرتے وقت اسی حالت کو پیش نظر رکھا جائے، مثلاً: ایک نماز سفر کی تیاری کے وقت فوت ہو گئی تو اس وقت چونکہ چار رکعت ادا کرنا تھی، اس لئے دوران سفر اس قسم کی فوت شدہ نماز کو چار رکعت کی شکل میں ہی ادا کیا جائے، اس کے لئے یہ مفروضہ قائم کرنا کہ قصر کی اباحت یا رخصت سفر کی وجہ سے تھی گھر پہنچ کر قصر کا سبب (سفر) ختم ہو چکا ہے، لہٰذا اسے فوت شدہ نماز پوری پڑھنی چاہیے، محض سخن سازی ہے کیونکہ بات تو فوت شدہ نمازوں سے متعلق ہے اسے کس حالت میں ادا کرنا ہے دیگر نمازیں تو اہتمام سے ہی ہوں گی، کیونکہ ان کے لئے قصر کا سبب زائل ہو چکا ہے بہر حال فوت شدہ کو ادا کرتے وقت اس کے فوت ہونے کی حالت کو مدنظر رکھنا ہوگا۔اگر اس پر قصر کرنا ضروری تھا تو قصر پڑھی جائے اور اگر پوری پڑھنا فرض تھی تو ادا کرتے وقت پوری پڑھی جائے۔

سوال میں نے ایک حدیث میں پڑھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ کسی صحابی کی تیمارداری کے لئے اس کے گھر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ وہ تکیے پر سجدہ کر رہے تھے آپ نے تکیہ دور پھینک دیا فرمایا: ''سجدہ زمین پر کرنا چاہیے'' اس حدیث کی روشنی میں

میرا سوال ہے کہ تخت پوش پر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ میں قائم کیا ہے ''چھت، منبر اور لکڑی پر نماز پڑھنے کا بیان'' اس عنوان کے تحت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سے اہم مسائل کی طرف اشارات کئے ہیں، چنانچہ چھت اور منبر کے ذکر سے اونچی جگہ پر نماز پڑھنے اور پڑھانے کا جواز ثابت کیا ہے، یعنی اگر امام یا مقتدی عام لوگوں سے اونچا ہو تو ان کی نماز ہو جائے گی اسی طرح لکڑی پر نماز پڑھنے کی وضاحت سے یہ ثابت کیا ہے کہ جس طرح مٹی پر نماز پڑھی جاتی ہے اور سجدہ کیا جاتا ہے، اسی طرح لکڑی (تخت پوش) وغیرہ پر بھی نماز ہو سکتی ہیں اور ان پر سجدہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق بیان کیا ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ برف پر نماز پڑھی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ ہر اس چیز پر سجدہ کیا جا سکتا ہے جہاں پیشانی اچھی طرح ٹک جائے اور اس کی سختی محسوس ہو کیونکہ سجدہ میں پوری طرح سر کو جائے سجدہ پر ڈال دینا شرط ہے، ہمارے نزدیک فوم کے گدے پر بھی نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ اسی طرح مسجد میں کارپٹ پر نماز پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں ہے، ہاں ایسی جگہ جس پر پیشانی اچھی طرح نہ جم سکے اور اس کی سختی محسوس نہ ہو، اس پر سجدہ کرنا صحیح نہیں ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بستر پر نماز پڑھنے کا عنوان بھی قائم کیا ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت ذکر کی ہے کہ وہ اپنے بچھونے پر نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ سخت گرمی کے دنوں میں اپنے کپڑوں پر سجدہ کرنے کا ذکر بھی احادیث میں ملتا ہے، چنانچہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نماز پڑھتے تھے ہم میں سے کچھ لوگ گرمی کی شدت کی بنا پر سجدہ کی جگہ پر اپنے کپڑے بچھا لیتے تھے۔

[صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۳۸۵]

سوال میں ذکر کردہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بیمار آدمی تکیہ اٹھا کر اپنے سر کے قریب کرتا اور اس پر سر رکھ کر سجدہ کرتا تھا، اس لئے آپ نے اسے منع فرمایا اور زمین پر سجدہ کرنے کی تلقین فرمائی۔ [واللہ اعلم]

سوال اگر دوران نماز تعداد رکعات کے متعلق شک پڑ جائے تو کیا کرنا چاہیے، اس کے متعلق کتاب و سنت کی روشنی میں راہنمائی فرمائیں؟

جواب دوران نماز تعداد رکعات کے متعلق شک پڑنے کی صورت میں کچھ تفصیل ہے۔ اگر نمازی کو اپنی نماز میں شک پڑ جائے تو اپنے ذہن پر زور ڈال کر درستی کی کوشش کرے، اسے شرعی اصطلاح میں تحری کہتے ہیں، پھر اپنی مستحکم رائے پر نماز کی بنیاد رکھتے ہوئے اسے پورا کرے اور سلام پھرنے کے بعد سہو کے دو سجدے کرے جیسا کہ حدیث میں ہے۔ [صحیح بخاری، الصلوٰۃ: ۴۰۱]

اگر کوئی مستحکم رائے نہ قائم کر سکے تو یقین پر بنیاد رکھے جیسا کہ حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو دوران نماز شک پڑ جائے کہ اس نے کتنی رکعات پڑھی ہیں تین یا چار، تو ایسی صورت میں شک کو نظر انداز کر کے جس پر یقین ہو اس پر نماز کی بنیاد رکھے، پھر سلام پھیرنے سے پہلے سہو کے دو سجدے کرے۔ اگر اس نے پانچ رکعت پڑھ لی ہیں تو یہ سجدے اس کی چھٹی رکعت کے قائم مقام ہوں گے اور اگر وہ پہلے ہی نماز پوری پڑھ چکا ہے تو یہ سجدے شیطان کی ذلت اور رسوائی کا باعث ہوں گے۔'' [صحیح مسلم، المساجد: ۵۷۱]

اس کی مزید وضاحت ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو اپنی نماز میں شک پڑ جائے اور اسے پتہ نہ چلے کہ اس نے ایک رکعت پڑھی یا دو تو وہ اپنی نماز کو ایک رکعت ہی قرار دے اور اگر اسے علم نہ ہو کہ اس نے دو رکعت پڑھی ہیں یا تین تو وہ اپنی نماز کو دو رکعت ہی بنا لے اور اگر اسے پتہ نہ چلے کہ اس نے تین پڑھی ہیں یا چار تو وہ تین ہی شمار کرے جب وہ نماز سے فراغت کے قریب ہو تو سلام پھیرنے سے قبل بیٹھے بیٹھے ہی سہو کے دو سجدے کرے۔''

[مسند امام احمد، ص:۱۹۰، ج۱]

دوران نماز شک پڑنے کی صورت میں دیار عرب کے نامور عالم دین شیخ محمد صالح عثیمین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دو معاملات میں تردد کو شک کہتے ہیں۔ تین حالات میں شک کو کوئی حیثیت نہ دی جائے۔

☆ اگر دوران نماز محض وہم پیدا ہو جس کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی جیسا کہ وسوسہ وغیرہ ہوتا ہے۔

☆ جب نمازی کو بکثرت وہم میں پڑ جانے کی بیماری ہو کہ جب بھی نماز کے لئے کھڑا ہو تو وہ وہم کا شکار ہو جائے۔

☆ نماز سے فراغت کے بعد شک پڑ جائے تو اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی جائے۔

ان تین حالات کے علاوہ اگر دوران نماز شک پڑ جائے تو وہ قابل اعتبار ہوگا اور اس کی دو حالتیں ممکن ہیں:

① نمازی کا رجحان ایک طرف ہے، اس صورت میں اپنے رجحان کے مطابق عمل کرتے ہوئے اپنی نماز کو پورا کرے اور سلام پھیر دے، پھر سہو کے دو سجدے کرے اور سلام پھیر دے، مثلاً: ایک نمازی کو نماز ظہر پڑھتے ہوئے شک پڑا کہ اس کی دوسری رکعت ہے یا تیسری، لیکن رجحان تیسری رکعت کی طرف ہے تو اسے تیسری قرار دے کر اپنی نماز پوری کرے، یعنی ایک رکعت مزید پڑھے اور سلام پھیر دے۔ اس کے بعد سہو کے دو سجدے کرے اور سلام پھیر دے، جیسا کہ صحیح بخاری حدیث نمبر ۴۰۱ میں ہے۔

② اگر نمازی کا رجحان کسی جانب نہیں ہے تو وہ شک کو نظر انداز کر کے یقین پر بنیاد رکھے اور یقین سے مراد اس کی کم رکعات ہیں، پھر نماز مکمل کر کے سلام سے قبل سہو کے دو سجدے ادا کرے اور سلام پھیر دے، مثلاً: ایک نمازی کو نماز عصر پڑھتے ہوئے شک گزرا کہ اس کی دوسری رکعت ہے یا تیسری اور اس کا رجحان بھی کسی طرف نہیں ہے تو کم رکعات پر بنیاد رکھے جو یقینی ہیں، یعنی اسے دوسری رکعت قرار دے کر پہلا تشہد پڑھے، اس کے بعد مزید دو رکعت پڑھے، پھر سلام سے قبل سہو کے دو سجدے کرے اور سلام پھیر دے۔ جیسا کہ (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۵۷۱ میں ہے، سجود السہو، ص ۷، ۸) اس بنا پر نماز میں شک پڑنے کی صورت درج بالا تفصیل کے مطابق عمل کیا جائے۔

سوال ہمارے علاقہ (چکوال) میں کوئی اہل حدیث عالم نہیں ہے۔ حنفی علما سے مختلف مسائل کے متعلق گفتگو ہوتی رہتی ہے ہمیں بآواز بلند آمین کہنے کے دلائل درکار ہیں، پھر اس مسئلہ پر چند ایک اعتراضات ہیں ان کا بھی جواب دیں حوالہ جات کی وضاحت ضرور کریں؟

جواب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو جس شخص کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوگی تو اس کے سابقہ تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔'' [صحیح بخاری، الاذان: ۷۸۰]

امام ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''اس سے ثابت ہوا کہ امام اونچی آواز سے آمین کہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقتدی کو امام کی آمین کے ساتھ آمین کہنے کا حکم اسی صورت میں دے سکتے ہیں جب مقتدی کو معلوم ہو کہ امام اونچی آواز سے آمین کہہ رہا ہے۔ کوئی عالم تصور نہیں کر سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقتدی کو امام کی آمین کے ساتھ آمین کہنے کا حکم دیں جبکہ وہ اپنے امام کی آمین کو نہ سن سکے۔'' [صحیح ابن خزیمہ، ص:۲۸۶ ج۱]

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے سنا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''غیر المغضوب علیھم ولا الضالین'' پڑھا تو آپ نے باآواز بلند آمین کہی۔ [ابوداود، الصلوٰۃ:۹۳۲]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جہری نماز میں امام اور مقتدیوں کو آمین باآواز بلند کہنا چاہیے اور جب آہستہ قراءت ہو تو آمین بھی آہستہ کہی جائے جبکہ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آمین کہتے وقت اپنی آواز کو پست رکھا۔ [مسند امام احمد، ص:۳۱۶ ج۴]

واضح رہے کہ آمین کا آغاز پہلے امام کرے گا اس کی آواز سنتے ہی تمام مقتدی باآواز بلند کہیں گے امام سے پہلے یا بعد میں اونچی آمین کہنا درست نہیں ہے لیکن اگر امام باآواز بلند آمین نہ کہے تو مقتدی حضرات کو اونچی آواز سے آمین کہہ دینا چاہیے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت امام کی اقتدا پر مقدم ہے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور ان کے مقتدی اتنی بلند آواز سے آمین کہا کرتے تھے کہ مسجد گونج اٹھتی تھی۔ [صحیح بخاری تعلیقاً]

عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ تابعی کہتے ہیں کہ میں نے دو سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیکھا کہ وہ بیت اللہ میں جب امام ''وَلَا الضَّآلِّیْنَ'' کہتا تو سب بلند آواز سے آمین کہتے تھے۔ [سنن بیہقی، ص:۵۹ ج۲]

اب باآواز بلند آمین کہنے پر سائل نے جو اعتراضات کیے ہیں ان کا مختصر جواب دیا جاتا ہے۔

☆ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے باآواز بلند آمین کہنے کا عنوان قائم کیا ہے لیکن اونچی آمین کہنے کے متعلق کوئی صحیح مرفوع حدیث نہیں پیش کی۔ ہم نے آمین اونچی کہنے کے دلائل میں جو پہلی حدیث پیش کی ہے وہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی پیش کردہ ہے، وہ ملاحظہ کریں اور اس کے متعلق امام ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ کی وضاحت پڑھ لیں۔

☆ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''تم اپنے رب کو عاجزی کرتے ہوئے اور چپکے چپکے پکارو۔'' [۷/الاعراف:۵۵]

اس آیت کے پیش نظر پسندیدہ دعا وہ ہے جس میں عاجزی اور آہستگی ہو۔ آمین بھی ایک دعا ہے، اس لئے اسے آہستہ کہنا چاہیے۔

☆ ہم اہل حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معیار مانتے ہیں جہاں آپ نے آہستہ دعا کی ہے وہاں آہستہ اور جہاں باآواز بلند دعا کی ہے وہاں اونچی آواز سے دعا کرتے ہیں۔ آمین کے متعلق احادیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جانثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم باآواز بلند کہتے تھے، اس لئے آمین کو باآواز بلند کہنا چاہیے۔ یہ حضرات خود بھی آیت کے خود ساختہ مفہوم کے خلاف بلند آواز سے دعائیں کرتے ہیں جہری نمازوں میں سورۂ فاتحہ اونچی آواز سے پڑھتے ہیں جو ایک دعا ہے، پھر نماز کے بعد بھی باآواز بلند دعا کرتے

ہیں۔

☆ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تعلیم دیتے کہ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی کہو اور جب وہ و لا الضالین کہے تو تم آمین کہو اور جب وہ سمع اللہ لمن حمده کہے تو تم ربنالك الحمد کہو۔ [صحیح مسلم، الصلوٰۃ:۹۳۲]

چونکہ "اللّٰھم ربنالك الحمد "آہستہ کہا جاتا ہے۔اس لئے آمین بھی آہستہ کہنی چاہیے کیونکہ دونوں کے لئے ایک جیسے الفاظ ہیں۔

"ربنا لك الحمد "اور آمین کہنے میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے کہ دونوں کا حکم ایک ہو۔آمین کے متعلق صحیح روایات میں ہے کہ اسے باآواز بلند کہنا چاہیے، پھر "ربنا لك الحمد" کے متعلق باآواز بلند کہنا بعض روایات سے ثابت ہے، جیسا کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے "ربنالك الحمد" کہا تو آپ نے فرمایا کہ ''ابھی بولنے والا کون تھا؟''صحابی نے جواب دیا کہ میں نے یہ کلمات کہے تھے آپ نے فرمایا کہ ''میں نے تیس سے زیادہ فرشتوں کو دیکھا کہ وہ ایک دوسرے پر سبقت کر رہے تھے کہ اس عمل کو پہلے کون لکھے۔'' [صحیح بخاری، الاذان:۷۹۹]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ربنالك الحمد باآواز بلند بھی کہا جاسکتا ہے۔

☆ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ امام تین چیزیں آہستہ کہے، تعوذ، تسمیہ اور آمین (محلیٰ ابن حزم) محلیٰ ابن حزم کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ اس روایت میں ابوحمزہ میمون الاعور نامی ضعیف اور متروک ہے، نیز علامہ زیلعی حنفی اس راوی کے متعلق کہتے ہیں: دار قطنی نے اسے ضعیف کہا ہے۔امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ متروک الحدیث ہے امام ابن معین کہتے ہیں کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ثقہ نہیں ہے۔ [نصب الرایہ،ص:۳۷۳ج۲]

☆ ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اونچی آمین کہنا حاضرین کی تعلیم کے لئے ''ایک آدھ دفعہ'' حاضرین کو بتادیا کہ سورۂ فاتحہ کے بعد خاموشی والے لمحات میں یہ کلمہ کہا کرو۔ہم بھی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لئے معلم کی حیثیت رکھتے ہیں آپ نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ خاموشی کے لمحات میں باآواز بلند آمین کہا کرو۔ہم اس پر عمل پیرا ہیں۔لیکن جو لوگ اس طرح کی موشگافیاں پیدا کرتے ہیں کبھی انہیں زندگی میں ایک آدھ مرتبہ اونچی آواز سے آمین کہنے کا موقع ملے گا؟ اللہ تعالیٰ ہمیں سنت پر عمل کرنے کی توفیق دے۔

سوال گرمی کے موسم میں دوران نماز مکمل جسم ڈھانپنا چاہیے یا کندھوں پر رومال وغیرہ ڈال لیا جائے تو اتنا ہی کافی ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب نمازی کے لئے ضروری ہے کہ دوران نماز اپنے ستر کے سمیت دونوں کندھوں کو بھی ڈھانپ کر نماز پڑھے۔ مرد حضرات کا ستر ناف سے گھٹنوں تک ہے جبکہ عورتوں کا سارا جسم ہی ستر ہے مردوں کے لئے ستر کے علاوہ کندھوں کا ڈھانپنا بھی ضروری ہے، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی ایک کپڑے میں اس طرح نماز نہ پڑھے کہ اس کے کندھے پر کچھ نہ ہو۔'' [صحیح بخاری، الصلوٰۃ:۳۵۹]

نیز حضرت عمرو بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مرتبہ صرف ایک کپڑے میں نماز بایں طور پر پڑھتے دیکھا کہ آپ نے اس کے دونوں کناروں کو مخالف سمتوں میں کندھوں پر ڈال رکھا تھا۔ [صحیح بخاری، الصلوٰۃ:۳۵۶]

ان احادیث کے پیش نظر ایک ستر پوش نمازی کے لئے یہ گنجائش ہے کہ وہ صرف رومال وغیرہ کندھوں پر ڈال کر نماز پڑھ لے یا بازو والی بنیان پہن لے، ہاں، اگر رومال وغیرہ کندھوں پر ڈالا ہے تو اس کے دونوں کناروں کو کھلا نہ چھوڑا جائے، بلکہ اس کی گرہ دے لی جائے کیونکہ کپڑے کو کھلا چھوڑ دینا سدل ہے جس کی نماز میں ممانعت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوران نماز منہ ڈھانپنے اور سدل سے منع فرمایا۔ [ابوداؤد، الصلوٰۃ:۶۴۳]

سدل یہ ہے کہ سر یا کندھوں پر اس طرح کپڑا ڈالا جائے کہ وہ دونوں طرف لٹکتا رہے، ہاں اگر سر یا گردن پر کپڑے کو بل دے کر لپیٹ لیا، پھر اس کے دونوں کنارے لٹکیں تو یہ سدل نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ممانعت ہے، البتہ عورت کے لئے ضروری ہے کہ دوران نماز اس کے چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ اس کے جسم کا کوئی حصہ کھلا نہ ہو حتی کہ اس کے قدم بھی ڈھکے ہوئے ہوں، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ عورت اوڑھنی اور ایسے لمبے کرتے میں نماز پڑھے کہ جس میں اس کے قدم بھی چھپ جائیں۔

[سنن بیہقی، ص:۲۳۲ ج۲]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس حدیث کا موقوف ہونا زیادہ صحیح ہے۔ [بلوغ المرام، حدیث نمبر:۲۰۷]

تاہم اس قسم کی موقوف روایت مرفوع کے حکم میں ہے کیونکہ اس میں جو مسئلہ بیان ہوا ہے اس کا تعلق اجتہاد و استنباط سے نہیں ہے۔ صورت مسئولہ میں اگر رومال وغیرہ سے کندھوں کو ڈھانپ لیا جائے تو اس میں نماز ہو جاتی ہے بشرطیکہ قابل ستر حصہ ڈھانپا ہوا ہو۔ [واللہ اعلم]

سوال ٹریننگ کے لئے جانے والوں کو وہاں کم از کم ۲۱ دن قیام کرنا ہوتا ہے لیکن وہاں نماز قصر پڑھائی جاتی ہیں اور جو اساتذہ عرصہ دراز سے وہاں مقیم ہیں وہ بھی نماز قصر ادا کرتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت واضح کریں؟

جواب نماز قصر کے متعلق محدثین کا موقف یہ ہے کہ اگر کسی نے اپنی اقامت گاہ سے نو میل کی مسافت طے کرنا ہو تو اقامت گاہ کی حدود کے بعد نماز قصر پڑھنا ہوگی، اگر آنے اور جانے کا دن نکال کر کسی مقام پر تین دن اور تین رات سے زیادہ پڑاؤ کا پروگرام ہو تو قصر کی بجائے پوری نماز پڑھنا ہوگی۔ لیکن اگر اقامت گاہ کی طرف واپسی کا پروگرام طے شدہ نہ ہو تو، یعنی آج واپس ہونا ہے یا کل، تردد ہو تو جتنی دیر تک تردد ختم نہ ہو نماز قصر پڑھنے کی اجازت ہے۔ جہاد افغانستان کے وقت صورت حال بھی غیر یقینی ہوتی تھی کیونکہ روس کی افواج سے مزاحمت ہر وقت جاری رہتی تھی، کسی جگہ پر قیام مستقل نہیں ہوتا تھا، ہم خود صوبہ جاجی میں اس قسم کی صورت حال سے پورے دو ماہ دوچار رہے تھے، ایسے حالات میں نماز قصر پڑھنے کی اجازت ہے لیکن وطن کے اندر اس طرح کی صورت حال قطعاً نہیں ہے، یہاں کسی دشمن سے مزاحمت کا اندیشہ واضح نہیں ہوتا کہ غیر یقینی صورت حال کے پیش نظر نماز قصر ادا کی جائے، موہوم خطرات تو پاکستان میں ہر جگہ ہو سکتے ہیں، اس لئے ہمارا مؤقف یہ ہے کہ وطن کے اندر ٹریننگ سنٹرز میں ۲۱ دن تک قیام رکھنے والوں کو شرعاً نماز قصر پڑھنے کی اجازت نہیں اور جو اساتذہ کرام تقریباً عرصہ دراز سے وہاں مقیم ہیں وہ بھی شرعی طور پر پوری نماز

ادا کرنے کے پابند ہیں۔

سوال صبح کی نماز کھڑی ہوتی ہے، بعض لوگ جماعت میں شامل ہونے کی بجائے الگ سنتیں شروع کر دیتے ہیں، کسی عالم دین نے صحیح بخاری کے حوالہ سے بتایا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے صبح کی جماعت ہوتے ہوتے سنتیں ادا کی تھیں اس کی وضاحت کریں؟

جواب نماز فجر سے پہلے دو سنتوں کی بہت اہمیت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نوافل میں فجر کی سنتوں کا سب سے زیادہ اہتمام کرتے تھے۔ [صحیح بخاری، التہجد: ۱۱۶۹]

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کبھی ترک نہیں کیا۔ [صحیح بخاری، التہجد: ۱۱۵۹]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی اہمیت کو بایں الفاظ اجاگر کرتے ہیں کہ ''نماز فجر کی دو سنتیں دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں۔'' [صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین: ۷۲۵]

اگر یہ سنتیں فجر سے پہلے نہ پڑھی جاسکیں تو انہیں نماز سے فراغت کے بعد بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت قیس رضی اللہ عنہ کو جماعت کے بعد یہ سنتیں پڑھنے کی اجازت دی تھی۔ [مسند امام احمد: ۵/۴۴۷]

اگر نماز کے بعد بھی نہ پڑھی جائیں تو طلوع آفتاب کے بعد انہیں پڑھا جاسکتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے نماز فجر کی دو سنتیں نہ پڑھیں وہ سورج طلوع ہونے کے بعد پڑھ لے۔'' [جامع ترمذی، الصلوٰۃ: ۴۲۳]

جماعت کے دوران الگ تھلگ دو سنتیں پڑھنا، جیسا کہ صورت مسئولہ میں ذکر کیا گیا ہے یہ درست نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب نماز فجر کے لئے اقامت کہہ دی جائے تو فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز قبول نہیں ہوتی۔'' [صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین: ۷۱۰]

احناف نے یہ گنجائش نکالی ہے کہ اقامت کے بعد نماز فجر کی سنتیں پڑھی جاسکتی ہیں، اگر فجر کی دوسری رکعت فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو تو سنتیں چھوڑ کر جماعت میں شامل ہو جانا چاہیے۔ لیکن ان کا یہ مؤقف کتاب و سنت کے خلاف ہے، سوال میں صحیح بخاری کے حوالہ سے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا عمل بیان کیا گیا ہے وہ صبح کی جماعت کھڑی ہونے کے باوجود صبح کی سنتیں پڑھ لیتے تھے، تلاش بسیار کے باوجود یہ اثر صحیح بخاری میں نہیں مل سکا۔ بہر حال اگر صبح کی سنتیں رہ جائیں تو انہیں جماعت کے بعد فوراً یا طلوع آفتاب کے بعد پڑھا جاسکتا ہے، لیکن دوران جماعت پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال نمازی کے لئے سترہ کی کیا حیثیت ہے، اگر کوئی دانستہ سترہ کے بغیر نماز پڑھتا ہے تو کیا شیطان اس کی نماز کو قطع کر دیتا ہے، نیز سترہ اور نمازی کے درمیان کتنا فاصلہ ہونا چاہیے؟

جواب احادیث کے الفاظ سے نمازی کے لئے سترہ کا اہتمام کرنا ضروری ہے، چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''صرف سترہ کی جانب ہی نماز پڑھو۔'' [صحیح ابن خزیمہ: ۸۰۰]

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو سترے کی طرف

نماز پڑھے اور اس کے قریب ہو کر کھڑا ہو۔'' [مسند امام احمد، ص:۴۰۴، ج۳]

اور سترہ رکھنے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ مبادا شیطان انسان کی نماز کاٹ ڈالے۔ [مستدرک حاکم، ص:۲۵۱، ج۱]

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سترہ کا اہتمام واجب ہے، البتہ جمہور اس کے استحباب کے قائل ہیں۔ پھر سترہ اور نمازی کے درمیان کم از کم تین ہاتھ کا فاصلہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ میں داخل ہو کر نماز پڑھی تو دیوار کعبہ اور آپ کے درمیان تین ہاتھ کا فاصلہ تھا۔ [مسند امام احمد، ص:۱۳، ج۶]

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیوار قبلہ کے درمیان ایک بکری گزرنے کا فاصلہ تھا۔

[صحیح بخاری، الصلوٰۃ:۴۹۶]

دوران جماعت صرف امام کو سترہ کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس کے پیچھے نماز ادا کرنے والوں کو سترہ کا اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں ہے، چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے ''امام کا سترہ ہی مقتدی کا سترہ ہے۔''

مسجد میں اکیلے نماز پڑھنے کی صورت میں نمازی حضرات کا فرض ہے کہ وہ کسی دیوار، ستون یا کسی نمازی کے پیچھے ادا کریں، اس کے لئے چھوٹے چھوٹے سترے بنا کر مسجد میں رکھنے کی ضرورت نہیں، یہ محض تکلف ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال اگر مسافر آدمی کسی مقیم امام کی اقتدا میں نماز ادا کرے اور اتفاق سے آخری دو رکعات میں شامل ہوا ہو تو کیا اسے امام کے ساتھ سلام پھیر دینا چاہیے یا اسے چار رکعات پڑھنا ضروری ہیں؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب مسافر انسان پر دو رکعت ادا کرنا ہی فرض ہے، اس لئے عقل کا تقاضا تو یہی ہے کہ مسافر اگر مقیم کی اقتدا میں تیسری یا چوتھی رکعت میں شامل ہو تو اسے دو رکعت ادا کرنے پر سلام پھیر دینا چاہیے، لیکن شریعت کی بعض نصوص اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار ایسے ملتے ہیں کہ اس معاملہ میں عقل کے فیصلے کے مطابق عمل نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا گیا کہ مسافر جب اکیلا نماز پڑھتا ہے تو دو رکعات ادا کرتا ہے اور جب مقیم کی اقتدا میں پڑھتا ہے تو چار رکعتیں پڑھتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا یہی ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ [مسند امام احمد، ص:۵۰۳، ج۲]

امام ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تالیف میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے جب مسافر مقیم کے ساتھ نماز میں شامل ہو تو کیا کرے؟ اس کے تحت انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے چند ایسے آثار نقل فرمائے ہیں کہ مسافر جب کسی مقیم شخص کی اقتدا میں نماز پڑھے تو اسے مکمل نماز پڑھنا چاہیے، ان آثار کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر مسافر مقیم امام کے ساتھ ایک رکعت میں شامل ہو تو امام کے ساتھ باجماعت نماز ادا کرنے کے بعد جو نماز رہ گئی ہو اسے ادا کرے۔

② حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اگر مسافر مقیم امام کے پیچھے نماز ادا کرے تو اسے پوری نماز پڑھنا چاہیے۔

③ حضرت مکحول رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اگر مسافر کسی مقیم امام کے پیچھے نماز پڑھے اور اسے ایک یا دو رکعت باجماعت مل جائیں تو امام کے ساتھ نماز ادا کر کے اس کے بعد بقیہ نماز پوری کرے۔

④ حضرت جابر بن زید رضی اللہ عنہ سے سفر کی نماز کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اگر تم اکیلے نماز پڑھو تو دو رکعت اور اگر باجماعت ادا کرو تو مقیم امام کی اقتدا کے پیش نظر پوری نماز پڑھو۔ حضرت سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی، قاسم اور عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہم کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ [مصنف ابن ابی شیبہ، ص:۳۸۲، ج۱]

ان آثار کے پیش نظر مسافر کو چاہیے کہ مقیم امام کی اقتدا کرتے ہوئے پوری نماز ادا کرے۔

نوٹ: راقم الحروف کافی عرصہ تک عقل کے تقاضے کے مطابق اگر مقیم امام کے پیچھے اتفاقاً مسافر کو دو یا ایک رکعت مل جانے پر مسافر کے لئے دو رکعت ادا کرنے کا قائل اور فاعل تھا مذکورہ حوالہ جات دستیاب ہونے پر اس موقف سے رجوع کیا، ان آثار کی نشاندہی عزیزم محمد حماد نے کی، جزاہ اللہ خیراً! واضح رہے کہ تحدیث نعمت کے طور پر یہ نوٹ لکھا گیا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے ہاں امام صاحب فرض نماز پڑھانے کے بعد دعا نہیں مانگتے، کہتے ہیں کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں وضاحت فرمائیں۔ نماز پنجگانہ کتنی رکعات ہیں، ہر نماز کی رکعات مفصل تحریر فرمادیں؟

جواب نماز کے بعد اگر کوئی انفرادی طور پر دعا مانگتا ہے تو اس میں کوئی حرج والی بات نہیں ہے۔ البتہ نماز کے بعد اجتماعی دعا کا ثبوت محل نظر ہے، اس سلسلہ میں جتنی بھی روایات پیش کی جاتی ہیں وہ صحیح نہیں ہیں، اگر صحیح ہیں تو مدعا ثابت کرنے لئے صریح نہیں ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں دس سال رہے۔ پانچوں وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نمازیں پڑھائیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کثیر تعداد نے آپ کی اقتدا میں نمازیں ادا کیں۔ مگر ان میں سے کوئی ایک بھی اجتماعی دعا کا ذکر نہیں کرتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے معمول بنالینا سنت کے خلاف ہے اگر کوئی امام صاحب سے استدعا کرے تو اس کی تعمیل میں اجتماعی دعا کی جاسکتی ہے، اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

☆ نماز پنجگانہ کی فرض رکعات حسب ذیل ہیں۔ نماز فجر دو فرض، نماز ظہر چار فرض، نماز عصر چار فرض، نماز مغرب تین فرض، عشاء چار فرض اور نماز جمعہ دو فرض۔

☆ نماز پنجگانہ کی سنت رکعات حسب ذیل ہیں۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص دن اور رات میں (فرض رکعات کے علاوہ) بارہ رکعات پڑھے، اس کے لئے جنت میں ایک محل تیار کیا جاتا ہے۔ چار رکعات ظہر سے پہلے، دو رکعت اس کے بعد، دو رکعت مغرب کے بعد، دو رکعت عشاء کے بعد اور دو رکعت فجر سے پہلے۔'' [ترمذی، الصلوٰۃ:۴۱۵]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ظہر سے پہلے دو رکعات (سنت) پڑھیں۔ [صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین:۷۲۹]

اس حدیث سے معلوم ہوا ہے کہ ظہر سے پہلے چار سنت کے بجائے دو رکعت بھی پڑھی جاسکتی ہیں۔ ان بارہ رکعات کو سنن مؤکدہ کہا جاتا ہے، ان کے علاوہ کچھ سنتیں غیر مؤکدہ بھی ہیں، مثلاً:

☆ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص عصر سے پہلے چار رکعت (سنت) پڑھے، اللہ اس پر رحم کرے۔''

[صحیح مسلم،صلوٰۃ المسافرین:۴۳۰]

☆ رسول اللہ ﷺ نے دومرتبہ فرمایا کہ ''مغرب سے پہلے دورکعات ادا کرو، تیسری بار فرمایا کہ جس کا دل چاہے، یہ اس لئے فرمایا کہ کہیں لوگ اسے سنت مؤکدہ نہ بنالیں۔'' [صحیح بخاری،التہجد:۱۱۸۳]

☆ جمعہ سے پہلے نوافل کی ادائیگی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ ''جو شخص غسل کرکے جمعہ کے لئے آئے اور خطبہ شروع ہونے تک جس قدر ہوسکے نوافل ادا کرتا رہے، پھر خطبہ جمعہ شروع سے آخر تک خاموشی سے سنے تو اس کے گزشتہ جمعہ سے لے کر اس جمعہ تک اور مزید تین (۳) دن کے گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔'' [صحیح مسلم،الجمعہ:۸۵۷]

☆ جمعہ کے بعد چار رکعت سنتیں پڑھنا چاہیے۔جیسا کہ حدیث میں ہے کہ جب تم جمعہ کے بعد نماز پڑھنا چاہو تو چار رکعات ادا کرو۔

[صحیح مسلم،الجمعہ:۸۸۱]

اگر کوئی گھر آکر پڑھنا چاہے تو دورکعات ہی کافی ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ کے بعد کچھ نہیں پڑھا کرتے تھے۔تاآنکہ اپنے گھر آتے اور دورکعات پڑھتے۔ [صحیح بخاری،الجمعہ،۹۳۷]

نماز عشاء کے ساتھ ہم نے وتروں کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ وتر عشاء کی نماز کا حصہ نہیں ہیں بلکہ وتر نماز تہجد کا حصہ ہیں جو تہجد کے ساتھ ملاکر پڑھے جاتے ہیں۔ جو حضرات رات کو اٹھنے کے عادی نہ ہوں شریعت نے انہیں سہولت دی ہے کہ وہ نماز عشاء کے ساتھ انہیں پڑھ لیں۔حدیث میں ہے جسے اندیشہ ہو کہ رات کے آخری حصہ میں نہیں اٹھ سکے گا وہ اول شب ہی وتر پڑھ لے۔

[صحیح مسلم،صلوٰۃ المسافرین:۷۵۵]

ان فرائض وسنن کے علاوہ نوافل کی ادائیگی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔آپ حضرات اپنی خوشی سے جس قدر چاہیں نوافل پڑھ سکتے ہیں لیکن ان نوافل کو فرائض کے ساتھ نتھی نہ کیا جائے۔ واضح رہے کی قیامت کے دن جب نماز کے متعلق باز پرس ہوگی تو فرائض کی کمی کو نوافل وسنن سے پورا کیا جائے گا، اس لئے فرائض کی حفاظت کے لئے سنن اور نوافل بھی ادا کرنے چاہیں۔

سوال نماز تہجد کی گیارہ رکعت کس طرح ادا کی جائیں، نیز اگر کسی وجہ سے نماز تہجد نہ پڑھی جائے تو اسے بطور قضا پڑھا جاسکتا ہے یا نہیں؟

جواب رسول اللہ ﷺ عام طور پر تہجد کی گیارہ رکعات ادا کرتے تھے بعض اوقات تہجد سے پہلے دورکعات بطور تمہید یا افتتاح ادا کرتے جو ہلکی پھلکی ہوتیں، اس طرح تہجد کی رکعات تیرہ ہوجاتیں، رسول اللہ ﷺ نماز تہجد مختلف انداز سے ادا کرتے تھے۔ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ دو دو رکعات ادا کرنے کے بعد سلام پھیر دیا جائے۔آخر میں ایک وتر الگ پڑھ لیا جائے۔عام طور پر رسول اللہ ﷺ نماز تہجد اس طرح ادا کرتے تھے۔ [صحیح مسلم،صلوٰۃ المسافرین:۷۳۶]

☆ پہلے دورکعات الگ پڑھ لی جائیں، پھر نو رکعات اس طرح ادا کی جائیں کہ آٹھویں رکعت میں تشہد پڑھا جائے، پھر کھڑے ہوکر ایک رکعت ادا کی جائے۔ [صحیح مسلم،صلوٰۃ المسافرین:۷۴۶]

☆ پہلے دو دو کر کے چار رکعت ادا کی جائیں، پھر سات رکعات کی نیت کر کے آخری رکعت میں سلام پھیرا جائے۔

[مسند امام احمد، ص:۲۳۹، ج۴]

☆ پہلے دو دو کر کے چھ رکعات ادا کی جائیں، پھر پانچ رکعت اس طرح ادا ہوں کہ آخری رکعت میں تشہد مکمل کر کے سلام پھیر دیا جائے۔ [صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین: ۷۳۷]

☆ پہلے آٹھ رکعات دو دو کر کے ادا کی جائیں، پھر تین وتر حسب ذیل طریقے سے پڑھے جائیں۔

(ا) دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے اور ایک وتر الگ پڑھا جائے اسے فصل کا طریقہ کہا جاتا ہے۔

[صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین: ۷۳۶]

(ب) تین رکعت درمیان میں تشہد بیٹھے بغیر ادا کی جائیں اور آخری رکعت میں تشہد کو مکمل کر کے سلام پھیر دیا جائے۔

[مستدرک حاکم، ص: ۴۴۷، ج۱]

اسے طریقہ وصل کہتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس آخری طریقہ کے مطابق تین وتر ادا کرتے تھے، امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اہل مدینہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طریقہ کے مطابق نماز وتر پڑھتے تھے، اگر رات کو نیند کا غلبہ ہو یا نسیان کی وجہ سے تہجد یا وتر بھول جائیں تو اس کی ادائیگی کے متعلق علمائے کرام میں اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وتر کی ادائیگی ضروری ہے۔ اس لئے ان کے نزدیک ان کی قضا بھی ضروری ہے جبکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا موقف ہے کہ اگر تہجد یا وتر رہ جائیں تو انہیں بطور قضا نہیں پڑھنا چاہیے۔ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ اسے بطور قضا پڑھا جا سکتا ہے اس کے لئے وقت کی کوئی پابندی نہیں ہے جب بھی بیدار ہو یا یاد آئے تو اسے ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس موقف کی بنیاد حدیث نبوی پر ہے۔

[مستدرک حاکم، ص: ۴۴۳ ج۱]

صحیح موقف یہ ہے کہ اگر کسی کا وظیفہ شب رہ جائے تو اس کی قضا ضروری نہیں، اگر پڑھنا چاہیے تو اگلے دن ظہر سے پہلے پہلے اسے ادا کر لے، اس صورت میں اسے رات کے وقت ادائیگی کا ہی ثواب ملے گا۔ [صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین: ۱۴۲]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ مبارک یہ تھا کہ جب نیند یا کوئی تکلیف قیام اللیل میں رکاوٹ بن جاتی تو دن میں بارہ رکعات ادا فرما لیتے تھے۔ [صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین: ۱۳۹]

سوال ''صلوٰۃ الاوابین'' کے متعلق وضاحت فرمائیں کہ اس کا وقت کون سا اور اس کی رکعات کتنی ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کا وقت مغرب اور عشاء کے درمیان ہے جبکہ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ صلوٰۃ اشراق کو ہی صلوٰۃ الاوابین کہا گیا ہے اس کے متعلق تفصیل سے لکھیں؟

جواب بعض روایات میں ہے کہ ''صلوٰۃ الاوابین'' ایک مستقل نفلی نماز ہے جو مغرب کے بعد عشاء سے پہلے پڑھی جاتی ہے اس سلسلہ میں درج ذیل دو روایات پیش کی جاتی ہیں:

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ''صلوٰۃ الاوابین'' جب نمازی اپنی نماز مغرب سے فارغ ہوں تو اس وقت سے لے کر

نمازعشاء سے پہلے تک ادا کی جاتی ہے۔ [مصنف ابن ابی شیبہ،ص:۱۹۷،ج۲]

سند کے اعتبار سے یہ روایت صحیح نہیں ہے کیونکہ اس میں ایک راوی موسیٰ بن عبیدہ ہے۔ جسے امام احمد بن حنبل اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ''منکر الحدیث'' قرار دیا ہے، نیز امام ابن معین، علی بن مدینی، ابوزرعہ اور امام ابوحاتم رحمۃ اللہ علیہم نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔ [تہذیب،ص:۳۱۹،ج۱۰]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا گیا ہے کہ فرشتے ان لوگوں کو گھیر لیتے ہیں جو مغرب اور عشاء کے درمیان نماز پڑھتے ہیں اور یہی صلاۃ الاوابین ہے۔ [شرح السنۃ،ص:۴۷۴،ج۳]

لیکن یہ روایت بھی قابل حجت نہیں ہے کیونکہ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو ''صیغۂ تمریض'' سے بیان کیا ہے جو اس روایت کے ضعیف ہونے کی طرف واضح اشارہ ہے، اس لئے نماز مغرب کے بعد ''صلوٰۃ الاوابین'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے بلکہ احادیث کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ صلوٰۃ الضحیٰ کو ہی ''صلوٰۃ الاوابین'' کہا گیا ہے، جیسا کہ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''صلوٰۃ الاوابین'' اس وقت پڑھی جاتی ہے جب اونٹ کے بچوں کے پاؤں جلنے لگیں۔'' [صحیح مسلم،الصلوٰۃ:۱۴۴]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت اس سلسلہ میں نص صریح کی حیثیت رکھتی ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نماز ضحیٰ کی حفاظت اواب، یعنی اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہی کرسکتا ہے، پھر فرمایا: یہی ''صلوٰۃ الاوابین'' ہے۔''
[مستدرک حاکم،ص:۳۲۲،ج۱]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے خلیل، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تین کاموں کی وصیت فرمائی تھی میں انہیں کسی حالت میں چھوڑنے والا نہیں ہوں، وتر پڑھے بغیر نیند نہ کروں، صلوۃ ضحیٰ کی دو رکعت ترک نہ کروں، کیونکہ یہ صلوٰۃ الاوابین ہے اور ہر ماہ تین روزے رکھوں۔ [مسند امام احمد،ص:۴۱۲ج۳]

صلوٰۃ ضحیٰ کی دو، چار اور آٹھ رکعت ثابت ہیں جس قدر وقت میسر آئے پڑھ لی جائیں۔

واضح رہے کہ صلوٰۃ ضحیٰ کا دوسرا نام صلوٰۃ اشراق ہے۔ وقت کے اعتبار سے اس کے دو الگ الگ نام ہیں، یعنی اگر سورج طلوع ہونے کے کچھ دیر بعد ادا کریں تو صلوٰۃ اشراق اور اگر سورج اچھی طرح بلند ہو جائے اور دھوپ میں اس قدر شدت آجائے کہ پاؤں جلنے لگیں لیکن زوال سے قبل پڑھیں تو اسے صلوٰۃ ضحیٰ کہا جاتا ہے، اسے محدثین نے ''ضحوۃ صغریٰ'' اور ''ضحوۃ کبریٰ'' سے بھی تعبیر کیا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال دوران نماز سترہ کی کیا حیثیت ہے؟ کیا مسجد کے اندر یا اس کے صحن میں بھی اس کا اہتمام کرنا چاہیے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب نماز دین اسلام کا ایک اہم رکن ہے۔ اس کے متعلق کئی ایک ایسے احکام ہیں جن کی پابندی انتہائی ضروری ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے ادا کرتے وقت سترہ کا اہتمام کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بہت تاکید فرمائی ہے، بلکہ عمل کے

لحاظ سے بھی اس پر مداومت فرمائی ہے۔ آپ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو سترہ کی طرف پڑھے، نیز اس سترہ کے نزدیک ہو کر اسے ادا کرے۔'' [ابوداود، الصلوٰۃ: ۶۹۸]

ایک روایت میں قریب ہو کر نماز پڑھنے کی حکمت اس طرح بیان کی گئی ہے کہ مبادا شیطان اس کی نماز کو خراب کر دے۔

[ابوداود، الصلوٰۃ: ۶۹۵]

ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم سترہ کے بغیر نماز نہ پڑھو اور کسی کو اپنے آگے سے گزرنے نہ دو۔ اگر کوئی روکنے کے باوجود بزور گزرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے سختی سے روکا جائے کیونکہ گزرنے والے کے ساتھ شیطان ہے۔'' [صحیح مسلم، الصلوٰۃ: ۱۱۳۰]

ایک روایت میں ہے: ''گزرنے والا خود شیطان ہے۔'' [ابن ماجہ، اقامۃ الصلوٰۃ: ۹۵۴]

اس سترہ کے حجم کے متعلق آپ نے فرمایا کہ ''جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو اپنے آگے ضرور سترہ رکھے، اگرچہ تیر ہی کیوں نہ ہو۔'' [مسند امام احمد: ۱/۱۶۲]

ان احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نمازی کو سترہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے اور بغیر سترہ کے نماز پڑھنے سے منع کیا ہے۔ واضح رہے کہ آپ کا امر وجوب کے لئے اور نہی تحریم کے لئے ہے۔ ہاں، اگر کوئی قرینہ ہو تو وجوب کے بجائے استحباب کے لئے ہوتا ہے لیکن یہاں کوئی ایسا قرینہ نہیں ہے کہ آپ کے امر کو وجوب کے بجائے استحباب پر محمول کیا جائے۔ پھر نہی سے مراد بھی نہی تحریم ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے لئے سترہ بنانا واجب اور اس کے بغیر نماز ادا کرنا حرام ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی عملی زندگی سے بھی اس موقف کی تائید ہوتی ہے کہ آپ نے اس پر مداومت کی ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ آپ جب نماز عید کے لئے باہر نکلتے تو نماز کے لئے چھوٹے نیزے کو اپنے سامنے گاڑھ دینے کا حکم دیتے، پھر آپ اس کی طرف نماز پڑھتے دوسرے لوگ آپ کے پیچھے ہوتے اور دوران سفر بھی آپ ایسا ہی کرتے تھے۔

[صحیح بخاری، الصلوٰۃ: ۴۹۴]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں خود کو دیکھتی کہ چارپائی پر لیٹی ہوتی رسول اللہ ﷺ تشریف لاتے میری چارپائی کو اپنے اور قبلہ کے درمیان کر لیتے، پھر نماز پڑھتے میں اس حالت میں آپ کے سامنے لیٹے رہنے کو ناپسند کرتی تو چارپائی کی پائینتی کی طرف سے کھسک کر لحاف سے نکل جاتی۔ [صحیح بخاری، الصلوٰۃ: ۵۰۸]

اگر رسول اللہ ﷺ مسجد میں ہوتے تو مسجد کے کسی ستون کو آگے کرتے اور نماز پڑھتے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں مصحف کے قریب والے ستون کے پاس نماز پڑھتے اور فرماتے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ وہ اس کے پاس قصداً نماز پڑھتے تھے۔ [صحیح بخاری، الصلوٰۃ: ۵۰۲]

دوران سفر اگر کوئی دیوار ہوتی تو اسے سترہ بنا لیا جاتا، چنانچہ حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے دیوار کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی، آپ نے اسے سترہ بنایا، دوران نماز بکری کا ایک بچہ آیا جو رسول اللہ ﷺ کے آگے سے گزرنے لگا آپ

اسے روکتے رہے، حتی کہ آپ کا بطن مبارک دیوار کے ساتھ لگ گیا اور وہ بچہ آپ کے پیچھے سے گزر گیا۔

[ابوداؤد، الصلوٰۃ:۷۰۸]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار سے بھی سترہ کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسی آدمی کو جو کہ دوستونوں کے درمیان نماز پڑھ رہا تھا، اسے ستون کے قریب کر دیا اور فرمایا کہ اس کی طرف نماز پڑھ۔

[صحیح بخاری، تعلیقاً کتاب الصلوٰۃ، باب الصلوٰۃ الی الاسطوانۃ]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق حدیث ہے کہ وہ پالان کو اپنے اور قبلہ کے درمیان کرتے اور اس کی طرف نماز پڑھتے۔

[مصنف عبدالرزاق، حدیث رقم:۲۳۷۴]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے کہ وہ مسجد حرام میں لاٹھی گاڑھ لیتے اور اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے کہ وہ جمعہ کے دن سترہ بنا کر نماز پڑھ رہے تھے کہ بنوابی معیط کے ایک نوجوان نے ان کے سامنے سے گزرنا چاہا تو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے اسے روکا جب وہ باز نہ آیا تو آپ نے اس کے سینے پر مارا۔[صحیح بخاری، الصلوٰۃ:۵۰۹]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب مؤذن اذان دیتا تو کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کھڑے ہوجاتے اور جلدی جلدی ستونوں کی طرف بڑھتے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے اور وہ، یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس طرح مغرب سے پہلے دو رکعت ادا کرتے۔ [صحیح بخاری، الصلوٰۃ:۶۲۵]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ستونوں کا رخ، اس لئے کرتے تھے تاکہ نماز کے لئے انہیں سترہ بنائیں کیونکہ وہ علیحدہ علیحدہ نماز پڑھتے تھے۔ [فتح الباری:۲/۱۳۷]

ان آثار سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نماز پڑھتے وقت سترے کا بہت اہتمام کرتے تھے۔ مسجد کے اندر بھی سترہ کا اہتمام کرنا چاہیے۔ کیونکہ احادیث کے عموم کا یہی تقاضا ہے، پھر متعدد روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انفرادی نماز میں ستونوں کا رخ کرتے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بذات خود بھی یہی عمل تھا، جیسا کہ صحیح بخاری کے "باب الصلوٰۃ الی الاسطوانۃ" میں ہے پھر اہل علم کا اختلاف ہے کہ مسجد حرام میں سترہ ہونا چاہیے یا نہیں؟ اگر مسجد کے اندر سترہ کا تصور نہ ہوتا تو اس اختلاف کی چنداں ضرورت ہی نہ ہوتی۔

سوال اگر امام سے دوران جماعت کوئی سجدہ رہ جائے اور سلام کے بعد یاد آئے تو اس کی تلافی کیسے ہوسکتی ہے کیا اس کے لئے سجدہ سہو کافی ہوگا یا نہیں؟

جواب دوران نماز اگر کوئی سہو ہو جائے تو اس کی تلافی کے لئے سجدہ سہو کیا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ ہر سہو کے لئے دو سجدے ہیں۔ [ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلوٰۃ:۱۲۱۹]

چونکہ یہ سجدے شیطان کے لئے ذلت اور رسوائی کا باعث ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے۔ [صحیح مسلم:۵۷۱]

اس لئے اگر کوئی مسنون عمل رہ جائے تو اس کی تلافی صرف دو سجدوں سے ہوجائے گی، جیسا کہ پہلا تشہد واجب نہیں

اور رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ درمیانہ تشہد چھوڑ دیا اور تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہوگئے تو آپ نے اس کی تلافی کے لئے آخر میں صرف دو سجدے کر لئے۔ [صحیح بخاری، مسلم، السہو:۱۲۲۴]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو اس بات کے لئے دلیل بنایا ہے کہ پہلا تشہد ضروری نہیں ہے کیونکہ ایک دفعہ رہ جانے کے بعد اس کا اعادہ نہیں کیا بلکہ دو سجدوں کو ہی کافی خیال کیا ہے۔ [صحیح بخاری، الاذان:۸۲۹]

سجدہ نماز کا رکن ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ادائیگی کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے ایمان والو! تم رکوع اور سجدہ کرو۔'' [۲۲/الحج:۷۷]

رسول اللہ ﷺ نے اس آدمی کو سجدہ اچھی طرح کرنے کا حکم دیا تھا جس نے جلدی سے نماز کو ادا کر لیا تھا، اس لئے رکن کے رہ جانے سے پہلے رکن ادا کرنا ہوگا، پھر سجدہ سہو کیے جائیں، جیسا کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز عصر کی ایک رکعت بھول کر چھوڑ دی، پھر وہ رکعت ادا کی اور بعد میں سجدہ ہائے سہو کیے۔'' [صحیح مسلم، المساجد:۵۷۴]

جس رکعت میں سجدہ یا رکوع رہ جائے وہ رکعت شمار نہیں ہوگی، اگر کسی کا سجدہ یا رکوع رہ جائے تو مکمل رکعت ادا کرنا ہوگی، پھر دو سجدے بطور سہو ادا کیے جائیں گے، اگر سلام کے فوراً بعد یاد آئے تو اسی رکعت کا اعادہ کافی ہوگا۔ اگر نماز کے کافی دیر بعد یاد آئے جبکہ امام اور مقتدی مسجد سے چلے گئے یا دنیاوی گفتگو میں مصروف ہوگئے تو مکمل نماز کا اعادہ کرنا ہوگا۔ آخر میں سجدہ سہو دونوں صورتوں میں کرنا ہوں گے۔ صورت مسئولہ میں اگر سلام کے فوراً بعد یاد آجائے تو ایک رکعت پڑھ کر سجدہ ہائے سہو کر لیے جائیں، مقتدی حضرات کو بھی امام کے ساتھ رکعت کا اعادہ کرنا ہوگا۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال اگر قرآن مجید سننا فرض ہے تو امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کیوں پڑھی جاتی ہے، نیز یہ بتائیں کہ اگر صبح کی جماعت کھڑی ہو تو کیا صبح کی سنتیں ایک طرف کھڑے ہو کر پڑھی جا سکتی ہیں جہاں امام کی قراءت نہ سنی جاتی ہو؟

جواب جس ذات اقدس نے قرآن پاک خاموشی سے سننا فرض قرار دیا ہے، اسی ذات باری تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ ﷺ کے ذریعے یہ حکم دیا ہے کہ سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی ہے۔ [صحیح بخاری، الاذان:۷۵۶]

دوران جماعت جب امام بآواز بلند قراءت کر رہا ہو تب بھی یہی حکم ہے، جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب میں اونچی آواز سے قراءت کروں تو (میرے پیچھے) سورۂ فاتحہ کے علاوہ اور کچھ نہ پڑھا کرو۔''

[دار قطنی، ص:۳۱۹، ج۱]

جو حضرات امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے سے منع کرتے ہیں آخر وہ بھی امام کی قراءت کے دوران کچھ پڑھنے کی گنجائش نکال لیتے ہیں جیسا کہ بوقت قراءت جماعت میں شامل ہونے والے کے لئے تکبیر تحریمہ اور دعا استفتاح، یعنی ''سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ'' پڑھنے کا جواز ان کے ہاں بھی مسلّم ہے۔ اس بنا پر امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا اس ''انصاف'' کے خلاف نہیں ہے جس کا اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکم دیا ہے اور نہ ہی حدیث میں اور قرآن پاک میں کوئی تضاد ہے، لہٰذا ہمیں قرآن کا سہارا لے کر رسول اللہ ﷺ سے اختلاف نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ایسا کرنا ایمان کے منافی ہے۔ باقی رہا مسئلہ کہ جب صبح کی نماز کھڑی ہو تو ایک طرف

کھڑے ہو کر صبح کی سنتیں ادا کرنا تو یہ بھی حدیث کے خلاف ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''جب فرض نماز کے لیے اقامت ہو جائے تو اس وقت فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں ہوتی۔'' [صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین: ۱۶۴۴]

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جب فرض نماز کی ادائیگی کے لئے تکبیر کہہ دی جائے تو اس وقت سنت ادا کرنا جائز نہیں ہے، اس حکم میں صبح کی سنتیں بھی شامل ہیں، اس لئے مسجد کے کونے یا ستون کے پیچھے یا مسجد کے باہر دروازے کے پاس کسی جگہ پر انہیں ادا کرنا درست نہیں، بلکہ جماعت میں شامل ہو کر فراغت کے بعد فوت شدہ سنتوں کو ادا کیا جائے اس کا جواز احادیث سے ملتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دوران جماعت سنتیں پڑھنے والوں کو سزا دیا کرتے تھے، جیسا کہ محدثین کرام نے وضاحت کی ہے۔

[معالم السنن، ص: ۷۷ ج ۲] [واللہ اعلم]

سوال ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' کے الفاظ فجر کی پہلی اذان میں کہے جائیں یا دوسری اذان میں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان الفاظ کو پہلی اذان میں کہا جائے وضاحت فرمائیں؟

جواب ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' کے الفاظ فجر کی پہلی اذان میں کہے جائیں جبکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: ''جب تم صبح کی پہلی اذان دو تو اس میں ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' کہو۔'' [مسند احمد، ص: ۴۰۸، ج ۴]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ الفاظ فجر کی پہلی اذان میں کہے جائیں۔ لیکن اس بات کا بھی علم ہونا چاہیے کہ حدیث مذکورہ میں اذان سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد وہ اذان ہے جو نماز فجر کا وقت شروع ہونے کے بعد کہی جاتی ہے اور دوسری اذان سے مراد اقامت ہے اور اقامت کو بھی اذان کہا جاتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے: ''ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے''

[صحیح بخاری، الاذان: ۶۲۷]

اس حدیث میں دو اذانوں سے مراد اذان اور اقامت ہے۔ جو اذان نماز فجر کے وقت سے پہلے ہوتی ہے اسے فجر نہیں کہا جاتا کیونکہ وہ تو فجر سے پہلے ہوتی ہے کیونکہ اس کا مقصد حدیث میں بایں الفاظ میں بیان ہوا ہے ''قیام کرنے والا گھر واپس آ جائے اور سویا ہوا انسان خبردار ہو جائے۔'' [صحیح بخاری، الاذان: ۶۲۱]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسے اذان تہجد کہنا بھی محل نظر ہے بلکہ اذان سحری کہنا چاہیے، بہرحال "الصلوٰۃ خیر من النوم" اس اذان میں ہیں جو نماز فجر کے وقت کے بعد دی جائے۔ [واللہ اعلم]

سوال جب دوران جماعت نماز پہلی صف مکمل ہو چکی ہو تو بعد میں آنے والا کسی دوسرے نمازی کا انتظار کرے یا صف کے پیچھے اکیلا کھڑا ہو جائے یا اگلی صف سے کسی آدمی کو کھینچ کر اپنے ساتھ ملائے اور نماز شروع کر دے؟

جواب دوران جماعت اگر کوئی نمازی آتا ہے تو اس کے لئے جماعت میں شمولیت کی تین صورتیں ممکن ہیں:

(الف) وہ انتظار کرتا رہے تاکہ کوئی دوسرا آدمی آ جائے اور اس کے ساتھ صف بنا کر نماز میں شامل ہو جائے، لیکن ایسا کرنا شرعاً ناجائز ہے، کیونکہ حدیث میں ہے کہ جب تم میں سے کوئی نماز کے لئے آئے تو امام کو جس حالت میں پائے اسی حالت میں امام کے ساتھ شامل ہو جائے۔ [جامع ترمذی، الجمعہ: ۵۹۱]

نیز حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم کسی سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے دوران سفر نماز کا وقت ہوا تو آپ نے لوگوں کو نماز پڑھائی ، جب نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے دیکھا کہ ایک آدمی الگ تھلگ کھڑا ہے جس نے جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھی۔ آپ نے اس سے باز پرس کرتے ہوئے فرمایا: ''تونے ہمارے ساتھ نماز کیوں نہیں ادا کی؟'' اس نے عرض کیا کہ میں جنابت کی حالت میں تھا لیکن غسل کے لیے پانی نہیں مل سکا، اس لیے نماز میں شمولیت نہیں کی، آپ نے فرمایا: ''تجھے تیمم کر کے نماز میں شامل ہو جانا چاہیے تھا۔'' [صحیح بخاری، التیمم:۳۴۴]

اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے لئے آنے والے کی نماز میں شمولیت ضروری ہے، البتہ اگر کوئی شرعی عذر ہو تو الگ بات ہے۔ صورت مسئولہ میں کوئی شرعی عذر ایسا نہیں جس کے پیش نظر اسے کسی دوسرے شخص کا انتظار کرنے کے لیے یونہی مسجد میں ٹہلنے اور پھرنے کی اجازت دی جائے۔

(ب) دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اکیلا کھڑا ہو جائے جیسا کہ آج کل ''جدید تحقیق'' کی آڑ میں اس کی تلقین کی جاتی ہے، اس کے متعلق احادیث میں ممانعت ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ جو صف کے پیچھے اکیلا نماز پڑھ رہا تھا تو آپ نے اسے دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ [ابوداؤد، الصلوٰۃ:۶۸۲]

حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''صف کے پیچھے اکیلے آدمی کی نماز نہیں ہوتی۔''

[ابن ماجہ، اقامۃ الصلوٰۃ:۱۰۰۳]

امیر صنعانی رحمۃ اللہ علیہ حدیث ابی داؤد کے پیش نظر لکھتے ہیں کہ جس نے صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھی اس کی نماز باطل ہے۔

[سبل السلام:۲/۵۹۳]

(ج) تیسری صورت یہ ہے کہ اگلی صف سے کوئی نمازی کھینچ کر اپنے ساتھ ملا لیا جائے، اس طرح صف بندی کر کے نماز میں شامل ہو جائے، ہمارے نزدیک یہ صورت کتاب وسنت کے زیادہ قریب ہے کیونکہ سنت میں اس کی نظیر ملتی ہے وہ یہ ہے کہ جب امام اور ایک مقتدی ایک ساتھ نماز پڑھ رہے ہوں، اسی حالت میں ایک تیسرا آدمی آ جائے تو اس کی شمولیت دو طرح سے ممکن ہے۔

(الف) امام کو آگے کر دیا جائے اور خود مقتدی کے ساتھ صف بندی کر کے نماز شروع کر دے۔

(ب) اگر آگے دیوار ہے تو مقتدی کو پیچھے کھینچ کر اپنے ساتھ ملائے اور نماز ادا کرے۔

اس پر قطع صف کا الزام اس لئے درست نہیں ہے کہ صف بندی کے لئے اس نے ایسا کیا ہے اور اس کے پیچھے آنے سے جو خلا پیدا ہوا ہے اسے دائیں یا بائیں جانب سے پر کر لیا جائے، جیسا کہ دوران نماز اگر کسی کا وضو ٹوٹ جائے تو وہ بھی اس کی زد میں آتا ہے۔

واضح رہے کہ عورت کے اکیلے نماز پڑھنے کو امام کے پیچھے اکیلے کھڑے ہونے کے لئے نظیر نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ عورت کو دوران جماعت اکیلی نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس کے متعلق ایک عنوان بایں الفاظ قائم کرتے ہیں ''عورت کے لئے جائز ہے کہ وہ اکیلے ہی صف بنا لے'' پھر حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کو بطور دلیل پیش کیا ہے وہ

فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے گھر نماز با جماعت کا اہتمام فرمایا میں اور ایک لڑکا آپ کے پیچھے اور حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا اکیلی ہمارے پیچھے کھڑی تھیں، اسی حالت میں رسول اللہ ﷺ نے جماعت کرائی۔

[صحیح بخاری، الاذان:۷۲۷]

اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی ہے جسے امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔ جو ضعیف ہے، اس لیے ہم نے اسے بطور دلیل پیش نہیں کیا، اسے بطور تائید پیش کیا جا سکتا ہے۔ [الاحادیث الضعیفہ:۹۲۲]

چونکہ یہ مسئلہ اجتہادی ہے، اس لئے ہم نے اس صورت کو اختیار کیا ہے جو کتاب وسنت سے زیادہ قریب ہے، دوسری دونوں صورتوں میں شرعی قباحتیں ہیں جن کی تفصیل ہم نے بیان کر دی ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال عورت معقول انتظام اور شرعی پردہ کی صورت میں نماز جنازہ پڑھ سکتی ہے یا نہیں، نیز عورت سپیکر کی آواز پر امام کی اقتدا میں اپنے گھر نماز جمعہ اور دیگر نمازیں با جماعت ادا کر سکتی ہے؟

جواب عورت کا نماز جنازہ میں شرکت کرنا شرعاً جائز ہے، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے مسجد میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ پڑھی تھی۔ [صحیح مسلم، الجنائز:۹۷۳]

لیکن دھوم دھام کے ساتھ خواتین کے لئے بسوں کا اہتمام کرنا تا کہ انہیں نماز جنازہ میں شریک کیا جائے صحیح نہیں ہے اور نہ ہی ان کے لئے جنازہ کے پیچھے چل کر جانا جائز ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ہمیں نماز جنازہ کے ساتھ چلنے سے منع کیا گیا مگر اس سلسلہ میں سختی نہیں کی جاتی تھی۔ [صحیح بخاری:۶۳]

اس لئے خواتین کا نماز جنازہ میں شریک ہونا جائز ہے لیکن ان کی شمولیت کا باقاعدہ اہتمام کرنا یا ان کا خود جنازہ کے پیچھے چلنا یا تدفین کے موقع پر وہاں حاضر ہونا صحیح نہیں ہے۔ جس قدر احادیث میں اجازت ہو اس سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے، نیز عورتوں کا اپنے گھر میں سپیکر کی آواز پر نماز با جماعت ادا کرنا محل نظر ہے، اگر انہیں با جماعت نماز ادا کرنے کا شوق ہے تو معقول انتظام کے ساتھ مسجد میں حاضر ہوں اور وہاں جماعت میں شمولیت کر سکتی ہیں، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی بندیوں کو مساجد سے مت روکو۔'' [ابوداود، الصلوۃ:۵۶۵]

لیکن ان کا گھر میں نماز ادا کرنا بہتر ہے، جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اپنی عورتوں کو مسجدوں سے مت روکو لیکن ان کے گھر ہی ان کے لئے بہتر ہیں۔'' [مسند امام احمد، ص:۷۶، ج۲]

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خواتین کے لئے بہترین مساجد ان کے گھروں کی چار دیواری ہے۔'' [مستدرک حاکم، ص:۲۰۹، ج۱]

لیکن یاد رہے! عورتوں کا خوشبو لگا کر اور زیب وزینت کے ساتھ مسجد میں جانا صحیح نہیں ہے، سادگی کے ساتھ اگر مسجد میں نماز با جماعت ادا کرے تو جائز ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال جب جماعت ہو رہی ہو یا کوئی شخص اکیلا نماز ادا کر رہا ہو تو کیا اسے سلام کہنا جائز ہے اگر سلام کہا جا سکتا ہے، تو نماز ادا

کرنے والا اس کا جواب کیسے دے؟

جواب دوران جماعت یا اکیلے نماز پڑھنے والے کو سلام کہا جا سکتا ہے لیکن نمازی کو چاہیے کہ وہ زبان سے اس کا جواب دینے کی بجائے دائیں ہاتھ سے اشارہ کر دے، جیسا کہ مندرجہ ذیل احادیث سے ثابت ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ میں نے ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کو دوران نماز سلام کہا تو آپ نے جواب نہ دیا (حالانکہ جواب دیا کرتے تھے) سلام کے بعد آپ نے فرمایا: ''بلاشبہ نماز میں مشغولیت ہوتی ہے۔'' (جو سلام کا جواب دینے کے منافی ہے) [صحیح بخاری، العمل فی الصلوٰۃ:۱۱۹۹]

بخاری کی ایک روایت ہے کہ جب ابراہیم نخعی سے دریافت کیا گیا کہ ایسے حالات میں نمازی کیا کرے تو آپ نے فرمایا کہ میں دل میں اس کا جواب دیتا ہوں۔ [صحیح بخاری، مناقب الانصار:۳۸۷۵]

ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم نماز میں ہوتے ہو تو فرمانبردار رہو اور کلام نہ کرو۔'' [مسند ابی یعلی ص:۳۸۴، ج۸]

ابوداؤد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے نیا حکم یہ دیا ہے کہ دوران نماز کلام نہ کرو۔'' [سنن ابی داؤد، الصلوٰۃ:۹۲۳]

سلام کا جواب ہاتھ کے اشارہ سے دیا جائے، جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ دوران نماز جب لوگ رسول اللہ ﷺ کو سلام کرتے تو آپ انہیں کیسے جواب دیتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ اس طرح کرتے اور اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ [ابوداؤد، الصلوٰۃ:۹۲۷]

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سلام کہا جبکہ آپ نماز پڑھ رہے تھے تو آپ نے اشارہ سے اس کا جواب دیا۔ [ابوداؤد، الصلوٰۃ:۹۲۵]

ان روایات سے مندرجہ ذیل امور ثابت ہوتے ہیں:

☆ ابتدائی زمانہ میں دوران نماز سلام و کلام وغیرہ جائز تھا، پھر منسوخ کر دیا گیا۔

☆ اب سلام کا جواب دل میں یا ہاتھ کے اشارہ سے دیا جا سکتا ہے۔

☆ دوران نماز، نمازی کو سلام کہا جا سکتا ہے، اس میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے ہاں جمعرات کے دن نماز مغرب میں سورۂ کٰفرون اور سورۂ اخلاص بڑے اہتمام سے پڑھی جاتی ہیں۔ اس کے متعلق وضاحت کریں کہ ایسا کرنا کتاب و سنت سے ثابت ہے؟

جواب چند سال قبل خود ہمارا معمول بھی یہی تھا کہ اہتمام کے ساتھ جمعرات کے دن [قل یاایھا الکافرون اور قل ھو اللہ احد] پڑھتے تھے، لیکن جب تحقیق کی گئی تو پتہ چلا کہ قرآنی سورتوں کے اعتبار سے تو انہیں نماز مغرب کی پہلی اور دوسری رکعت میں پڑھا جا سکتا ہے لیکن انہیں مسنون قرار دینا محل نظر آتا ہے۔ دراصل ہمارے پیش نظر مشکوٰۃ میں بیان کردہ ایک روایت تھی جس کے

الفاظ یہ ہیں: حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی رات نماز مغرب میں [قل یا ایھا الکافرون اور قل ھو اللہ احد] پڑھتے تھے، اس روایت کے متعلق صاحب مشکوۃ نے شرح السنۃ کا حوالہ دیا ہے کہ اسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ [مشکوۃ، حدیث نمبر: ۸۵۴]

شارح مشکوۃ مولانا عبید اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ نے مرعاۃ المفاتیح میں لکھ دیا کہ امام بغوی نے شرح السنۃ میں اپنی سند کے ساتھ اس روایت کو بیان کیا ہے۔ [مرعاۃ المفاتیح ص: ۳۹۸، ج ۲]

لیکن جب شرح السنۃ کو دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ اس میں دور، دور تک اس روایت کی سند کے متعلق کوئی سراغ نہیں ملتا بلکہ انہوں نے وضاحت سے لکھا ہے کہ یہ روایت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کی گئی ہے، یعنی انہوں نے صیغۂ تمریض "رُوِیَ" کے الفاظ سے اس روایت کو بیان کیا ہے۔ [شرح السنۃ ص: ۸، ج ۳]

البتہ اس روایت کو امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے متصل سند سے نقل کیا ہے۔ [صحیح ابن حبان، حدیث نمبر ۵۵۲ ص: ۱۵۹ ج ۴]

اسی طرح امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ [بیہقی ص: ۳۹۱، ج ۲]

لیکن امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے جب اپنی کتاب "الثقات" میں سعید بن سماک کے ترجمہ میں نقل کیا تو اسے ارسال کے ساتھ بیان کیا اور وضاحت کی کہ یہ حدیث مرسل ہی محفوظ ہے۔ [کتاب الثقات، ص: ۱۰۴، ج ۲]

واضح رہے کہ یہ روایت انتہائی کمزور ہے کیونکہ اس میں سعید بن سماک راوی متروک ہے، جیسا کہ علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے لکھا ہے۔ [میزان الاعتدال ص: ۱۴۳، ج ۲]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے لیکن اس میں "لیلة الجمعة" کے الفاظ نہیں ہیں۔ [ابن ماجہ: ۸۳۳]

اس روایت کے متعلق حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ بظاہر یہ سند صحیح ہے لیکن محدثین نے اسے معلول قرار دیا ہے، جیسا کہ امام دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس روایت کو بعض راویوں نے غلط بیان کیا ہے، البتہ محفوظ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سورتوں کو مغرب کی سنتوں میں پڑھتے تھے۔ [فتح الباری، ص: ۱۴۸، ج ۲]

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ مغرب کی سنتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان سورتوں کا پڑھنا ثابت ہے لیکن نماز مغرب میں ان سورتوں کا پڑھنا مسنون نہیں، اس لئے اس کا التزام صحیح نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال نماز کے ممنوعہ اوقات، یعنی طلوع وغروب آفتاب کے وقت فرض، سنت، نفل یا کوئی سببی نماز جائز ہے یا نہیں؟ کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب آفتاب کا کنارہ طلوع ہونے لگے تو نماز موقوف کر دو تا کہ سورج بلند ہو جائے اور جب سورج کا کنارہ ڈوبنے لگے تو بھی نماز موقوف کر دو تا کہ آفتاب پوری طرح چھپ جائے۔" [صحیح بخاری: ۵۸۳]

اس کی وجہ حدیث میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اس وقت سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے۔ [صحیح بخاری: ۳۲۷۴]

نیز اس وقت کفار سورج کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ [صحیح مسلم:۸۳۲]

اس طرح عین دو پہر کے وقت بھی نماز پڑھنا منع ہے کیونکہ اس وقت جہنم جوش میں ہوتی ہے جو غضب الٰہی کا مظہر ہے۔ اس کے علاوہ نماز فجر کے بعد طلوع آفتاب تک اور نماز عصر کے بعد غروب آفتاب تک رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھنے سے منع کیا ہے گویا اوقات ممنوعہ پانچ ہیں۔

① عین طلوع آفتاب ② عین غروب آفتاب

③ عین دو پہر کا وقت ④ نماز فجر کے بعد طلوع آفتاب تک

⑤ نماز عصر کے بعد غروب آفتاب تک

ان اوقات میں ایسے نوافل پڑھنے کی اجازت نہیں ہے جو کسی سبب سے وابستہ نہیں ہیں اور نہ ہی شریعت نے ان کے متعلق کوئی ترغیب دی ہے، البتہ ان اوقات میں فوت شدہ نمازیں، نماز جنازہ اور ایسے نوافل پڑھے جا سکتے ہیں جو کسی سبب سے وابستہ ہیں اور شریعت نے انہیں کرنے کی ترغیب دی ہے جیسا کہ ''تحیۃ المسجد'' وغیرہ، چونکہ نماز فجر کا وقت طلوع آفتاب تک اور عصر کا وقت غروب آفتاب تک ہے، اس لئے اگر کوئی شخص طلوع آفتاب سے پہلے فجر کی ایک رکعت اسی طرح غروب آفتاب سے پہلے عصر کی ایک رکعت پالیتا ہے تو اس کی بقیہ نماز وقت ادا میں ہی شمار ہوگی۔ اگرچہ اس نے عین طلوع اور عین غروب کے وقت انہیں پڑھا ہے، اس کی حدیث میں صراحت ہے۔ [صحیح بخاری:۵۷۹]

ان اوقات میں عام نوافل پڑھنے سے اجتناب کیا جائے، البتہ سببی نماز ادا کرنے کی گنجائش ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال اگر امام درمیانہ تشہد پڑھے بغیر بھول کر کھڑا ہو جائے تو کیا مقتدیوں کو بھی کھڑا ہونا چاہیے یا وہ اپنا تشہد پورا کریں اور اگر امام کھڑا ہو کر، پھر بیٹھ جائے تو اس صورت میں سجدہ سہو کرنا پڑے گا یا نہیں، نیز اگر امام آخری تشہد میں جلدی سلام پھیر دے تو کیا مقتدی بھی اس کے ساتھ سلام پھیریں یا وہ اپنا تشہد پورا کر کے سلام پھیریں؟ کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دے کر شکریہ کا موقع دیں۔

جواب صورت مسئولہ میں واضح ہو کہ اگر امام دو رکعت پڑھنے کے بعد تشہد پڑھے بغیر کھڑا ہو جاتا ہے تو سیدھا کھڑا ہونے سے پہلے یاد آنے یا مقتدی حضرات کے یاد دلانے پر اسے بیٹھ جانا چاہیے۔ لیکن اگر سیدھا ہو گیا ہے تو اس صورت میں اسے بیٹھنا نہیں چاہیے۔ بلکہ اس حالت میں اپنی نماز مکمل کر کے سجدہ سہو کر لے اور سلام پھیر لے۔ اس صورت میں مقتدی حضرات بھی اس کے ساتھ کھڑے ہوں گے انہیں بیٹھ کر اپنا تشہد مکمل کرنے کی اجازت نہیں ہے حدیث میں ہے ''جب امام دو رکعت پڑھنے کے بعد کھڑا ہو جائے اگر اسے سیدھا کھڑا ہونے سے پہلے یاد آ جائے تو بیٹھ جائے اگر سیدھا کھڑا ہو گیا ہے تو اسے بیٹھنا نہیں چاہیے، بلکہ اسے نماز مکمل کر کے سہو کے سجدے کرنا چاہییں۔'' [ابوداود، کتاب الصلوٰۃ:۱۰۳۶]

اگر امام سیدھا کھڑا ہونے کے بعد بیٹھ گیا ہے، اس صورت میں بھی اسے سجدہ سہو کرنا ہوگا اور مقتدی حضرات بھی اس میں شریک ہوں گے۔

اگر امام نے اس قدر جلدی کی ہے کہ مقتدی حضرات اس کے سلام پھیرنے تک تشہد اور درود نہیں پڑھ سکے ہیں تو انہیں تشہد اور درود پڑھ کر سلام پھیرنا چاہیے اور اگر مقتدی حضرات نے امام کے سلام پھیرنے تک تشہد اور درود پڑھ لیا ہے لیکن اس کے بعد دعا وغیرہ نہیں پڑھ سکے تو اس صورت میں مقتدی حضرات کو امام کے ساتھ سلام پھیر دینا چاہیے کیونکہ حدیث میں ہے:

''امام اس لئے بنایا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتدا کی جائے۔'' [صحیح بخاری، الاذان: ۶۸۸]

پہلی صورت میں چونکہ مقتدی حضرات کا تشہد اور درود مکمل نہیں ہوا تھا اور ان کا مکمل کرنا نماز کے لئے ضروری تھا، اس لئے انہیں تشہد اور درود پڑھ کر سلام پھیرنا ہوگا۔ جبکہ دوسری صورت میں وہ تشہد اور درود پڑھ چکے ہیں، لہٰذا انہیں امام کے ساتھ ہی سلام پھیر دینا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال اگر نماز کی چار رکعت پڑھنا ہوں تو کیا پہلے تشہد میں درود شریف پڑھنا ضروری ہے؟

جواب اس سلسلہ میں ہمارے ہاں افراط وتفریط اور انتہا پسندی ہے، کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ پہلے تشہد میں اگر درود پڑھ لیا جائے تو اس سے نماز میں نقص آ جاتا ہے اور اس کی تلافی سجدہ سہو سے ہو سکے گی جبکہ دوسری طرف کچھ اہل علم کا اصرار ہے کہ تشہد اول میں بھی دوسرے تشہد کی طرح درود پڑھنا ضروری ہے، اعتدال یہ ہے کہ پہلے تشہد میں درود پڑھا جا سکتا ہے، جیسا کہ صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کے وقت نماز کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں: ''پھر آپ نو رکعت ادا کرتے اور آٹھویں رکعت کے علاوہ کسی رکعت میں نہیں بیٹھتے تھے، آٹھویں رکعت میں بیٹھ کر اللہ کی تعریف کرتے اور اس کے نبی پر درود بھیجتے، دعا کرتے، پھر سلام کے بغیر کھڑے ہو جاتے اس کے بعد نویں رکعت ادا کر کے بیٹھتے، اللہ کی حمد کرتے، اس کے نبی پر درود بھیجتے اور دعا کر کے سلام پھیر دیتے'' [سنن نسائی، قیام اللیل: ۱۷۲۱]

اس حدیث میں واضح ثبوت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تشہد میں بھی اپنی ذات پر اسی طرح درود پڑھا۔ جس طرح دوسرے تشہد میں پڑھا تھا لیکن یہ درود پہلے تشہد میں ضروری نہیں ہے بلکہ صرف تشہد پر اکتفا بھی کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درمیانی تشہد میں تشہد سے فارغ ہو کر کھڑے ہو جاتے تھے۔

[مسند امام احمد، ص: ۴۵۹ ج ۱]

اس روایت پر محدث ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''پہلے تشہد میں دعا وغیرہ ترک کر کے صرف التحیات پڑھنے پر اکتفا کرنا۔'' [صحیح ابن خزیمہ، ص: ۳۵۰ ج ۲]

اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت رفاع بن رافع رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا کہ ''جب تم نماز کے درمیان میں (تشہد) بیٹھو تو اطمینان وسکون سے اپنا بایاں پاؤں بچھا دو، پھر تشہد پڑھو۔'' [ابوداود، الصلوٰۃ: ۸۶۰]

واضح رہے کہ یہاں وسط الصلوٰۃ سے مراد درمیانی تشہد ہے کیونکہ یہ آخر الصلوٰۃ کے مقابلہ میں ہے۔ ان تمام روایات کا حاصل یہ ہے کہ درمیانی تشہد میں درود پڑھا جا سکتا ہے لیکن ضروری نہیں ہے۔ البتہ آخری تشہد میں اس کا پڑھنا ضروری ہے، اب مذکورہ روایات سے واضح اور صریح حکم کے باوجود بعض اہل علم کی طرف سے اس تاویل کی کیا گنجائش ہے کہ ''جن روایات میں تشہد اول کا بغیر

درود کے ذکر ہے، انہیں سورۂ احزاب کی آیت: "صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا" کے نزول سے پہلے پر محمول کیا جائے گا۔" [واللہ اعلم]

سوال دوران جماعت مقتدی کو رکوع سے اٹھنے کے بعد "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" پڑھنا چاہیے یا صرف "رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ" ہی کہہ دینا کافی ہے؟

جواب امام، مقتدی اور منفرد سب رکوع سے اٹھتے وقت: "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کہیں اور سیدھے کھڑے ہونے کے بعد انہیں "رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ" کہنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو تکبیر تحریمہ کہتے، پھر رکوع کرتے تو اللہ اکبر کہتے رکوع سے اٹھتے وقت: "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کہتے، پھر جب سیدھے کھڑے ہوتے تو: "رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ" کہتے۔ [صحیح بخاری، الاذان: ۷۸۹]

اور ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ نماز اس طرح ادا کرنی چاہیے، جس طرح آپ سے ثابت ہے۔
[صحیح بخاری، الاذان: ۶۳۱]

البتہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب امام: "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کہے تو تم "رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ" کہو۔" [صحیح بخاری، الاذان: ۷۳۲]

اس حدیث سے بعض حضرات نے استنباط کیا ہے کہ مقتدی کو "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" نہیں کہنا چاہیے۔ لیکن یہ استنباط اس لئے درست نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دوران نماز دونوں کلمات کا کہنا ثابت ہے اور ہمیں اس طرح نماز پڑھنے کا حکم ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے، نیز اس استنباط کا مطلب یہ ہے کہ امام کو: "رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ" نہیں کہنا چاہیے، حالانکہ ایسا کرنا صحیح احادیث کے خلاف ہے۔

واضح رہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ مقصد نہیں کہ اس موقع پر امام اور مقتدی کو کیا کہنا چاہیے بلکہ صرف بتانا مقصود ہے کہ مقتدی کا: "رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ" امام کے: "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کہنے کے بعد ہونا چاہیے۔ اس کی مزید وضاحت علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف "صفۃ الصلوٰۃ" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال فوت شدہ نمازوں کی قضا کس وقت اور کس طرح دینا چاہیے۔ تفصیل سے جواب دیں اور دلیل سے مزین کریں؟

جواب فوت شدہ نمازوں کی قضا کے متعلق ہمارے ہاں مشہور ہے کہ دوسرے دن انہیں فرض نمازوں کے ساتھ پڑھا جائے، مثلاً: اگر کسی وجہ سے نماز فجر رہ گئی ہو تو اسے اگلے دن نماز فجر کے ساتھ پڑھا جائے، یہ بات سرے سے بے بنیاد اور غلط ہے بلکہ فوت شدہ نماز اسی وقت پڑھی جائے جب یاد آئے اور آئندہ دن تک مؤخر نہ کیا جائے حدیث میں ہے کہ "جو شخص کسی نماز کو بھول جائے یا سویا رہے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے اسی وقت پڑھ لے جب اسے یاد آئے۔" [صحیح مسلم، المساجد: ۶۸۴]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلے میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے "جو شخص نماز بھول جائے وہ اسی وقت پڑھے جب اسے یاد آئے۔" (صحیح بخاری، مواقیت الصلوٰۃ، باب نمبر ۳۷) اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ "فوت شدہ نمازوں کو دوسرے دن اس وقت پڑھے جب اس کا وقت آئے" بلکہ فرمایا کہ اسی وقت پڑھ لے جب اسے یاد آئے، ان کے پڑھنے کا طریقہ

یہ ہے کہ پہلے فوت شدہ نمازوں کو پڑھا جائے اس کے بعد موجودہ نمازیں ادا کی جائیں۔ رسول اللہ ﷺ سے غزوۂ خندق کے موقع پر نماز عصر فوت ہوگئی تو آپ نے غروب آفتاب کے بعد پہلے عصر پڑھی اس کے بعد نماز مغرب ادا کی۔ [صحیح بخاری، مواقیت الصلوٰۃ: ۵۹۸]

اس حدیث پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح عنوان قائم کیا ہے: ''فوت شدہ نمازوں کو پڑھتے وقت ترتیب کا خیال رکھا جائے۔'' یہ عنوان اور پیش کردہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ انسان پہلے فوت شدہ نماز کو پڑھے، پھر موجودہ نماز کو ادا کرے، لیکن اگر کسی نے بھول کر یا لاعلمی میں موجودہ نماز کو فوت شدہ سے پہلے پڑھ لیا تو اس کی نماز نسیان یا لاعلمی کے عذر کی وجہ سے صحیح ہوگی ۔مسئلہ کی مناسبت سے یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ قضا نمازوں کی دو اقسام ہیں:

① آدمی فوت شدہ نماز کی اس وقت قضا دے جب عذر ختم ہو جائے۔ اس میں نماز پنجگانہ آتی ہیں کہ تاخیر کا عذر ختم ہوتے ہی انہیں پڑھ لیا جائے انہیں مزید مؤخر نہ کیا جائے۔

② جب نماز فوت ہو جائے تو اسے قضا پڑھنے کے بجائے اس کے بدل کی قضا دی جائے، اس قسم کے تحت جمعہ کی نماز آتی ہے جب انسان کا جمعہ فوت ہو جائے یا امام کے ساتھ دوسری رکعت کے سجدہ میں شامل ہوا ہو تو اس صورت میں اسے ظہر بطور قضا پڑھنا ہوگی جمعہ کی نماز کے لئے کم از کم رکعت پانا ضروری ہے کیونکہ حدیث میں ہے جس نے نماز کی ایک رکعت پالی اس نے نماز کو پالیا۔ [صحیح بخاری، المواقیت: ۵۸۰]

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے نماز جمعہ ایک رکعت سے کم پائی تو اس نے جمعہ نہیں پایا، لہٰذا جمعہ کے بجائے اسے اب ظہر کی قضا دینا ضروری ہوگا۔ [واللہ اعلم]

سوال اگر صبح کی جماعت کھڑی ہے تو کیا صبح کی سنتیں ایک طرف ہو کر پڑھی جا سکتی ہیں؟

جواب حدیث میں ہے ''اِذَا اُقِیْمَتِ الصَّلٰوۃُ فَلَا صَلٰوۃَ اِلَّا الْمَکْتُوْبَۃَ '' [صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین: ۱۶۴۴]

یعنی ''جب فرضوں کی اقامت ہو جائے اس وقت سوائے فرض نماز کے اور کوئی نماز نہیں ہوتی۔'' اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جب فرضوں کی تکبیر ہو جائے تو اس وقت سنت پڑھنا جائز نہیں ہے اس میں صبح کی سنتیں بھی شامل ہیں، اس لیے مسجد کے کسی کونے یا ستون کے سامنے یا صف کے پیچھے یا مسجد کے باہر دروازے کے قریب کسی جگہ پر انہیں ادا کرنا درست نہیں ہے بلکہ جماعت میں شامل ہو کر فرض نماز ادا کریں اور اس سے فراغت کے بعد سنتیں ادا کرنی چاہییں، اس کا جواز احادیث میں ملتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ دوران نماز سنتیں پڑھنے والے کو سزا دیا کرتے تھے۔ [معالم السنن، ص: ۷۷ ج ۸]

سوال اگر امام جہری نمازوں میں کسی بڑی سورت سے چند آیات کی قراءت کرتا ہے تو کیا اسے مضمون اور ترجمہ کا خیال رکھنا چاہیے یا نہیں، بعض اوقات امام کسی آیت پر قراءت ختم کر دیتا ہے، حالانکہ اس آیت کا تعلق آئندہ آیات سے بھی ہوتا ہے؟

جواب نماز میں قراءت کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا عام معمول یہی تھا، کہ آپ ہر رکعت میں مکمل سورت تلاوت کرتے تھے، تاہم سورت کا کچھ حصہ یا بعض آیات کی تلاوت بھی کتب حدیث میں مروی ہے، چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ''دو سورتیں ایک رکعت میں پڑھنا سورتوں کی آخری آیات یا ابتدائی آیت یا سورتوں کو تقدیم

وتاخیر سے پڑھنے کا بیان۔'' [کتاب الاذان:۱۰۶]

پھر آپ نے اس عنوان کو ثابت کرنے کے لیے کچھ آثار وروایات پیش کی ہیں جو اس مسئلہ کے اثبات کے لئے کافی ہیں، اس لئے نماز میں جہاں سے چاہیں قرآن پڑھ سکتے ہیں۔ اس کے متعلق کوئی پابندی نہیں ہے، تاہم بہتر ہے کہ اختتام کے وقت مضمون کا خیال رکھا جائے۔ قرائے کرام اور اہل علم حضرات کے نزدیک قراءت کا مسنون اور پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ ہر آیت کے اختتام پر وقف کیا جائے اور اسے الگ الگ پڑھا جائے۔ فصل ووصل کی اصطلاحات خیر القرون کے بعد کی پیداوار ہیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب قراءت کرتے تو ہر آیت کو علیحدہ علیحدہ پڑھتے۔ [مسند امام احمد، ص:۳۰۲، ج۶]

بلکہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کے وقت تمام حروف وکلمات واضح اور علیحدہ علیحدہ ہوتے تھے۔'' [ترمذی، فضائل القرآن:۲۹۲۳]

ایک روایت میں اس کی مزید وضاحت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ''الحمدلله رب العالمین'' پڑھتے تو ٹھہرتے، پھر ''الرحمن الرحیم'' پڑھتے تو پھر ٹھہرتے۔ [ترمذی، القراءۃ:۲۹۲۷]

ان احادیث کے پیش نظر ہم کہتے ہیں کہ مساجد کے قرائے کرام کو کم از کم ترجمہ قرآن ضرور پڑھے ہونا چاہیے تاکہ آیات کے اختتام کے وقت انہیں پتہ ہو کہ ان کا مابعد آیات سے تعلق ہے یا نہیں۔ تاہم اگر کوئی اس بات کا خیال نہیں رکھتا تو اس سے نماز کی ادائیگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی سفر پر ہے اور وہ سفر میں نماز جمعہ باجماعت ادا کرتا ہے، کیا اسے نماز جمعہ کے ساتھ عصر کی نماز پڑھنے کی اجازت ہے، یعنی جمعہ کے ساتھ عصر جمع ہو سکتی ہے اس طرح بارش یا کسی شرعی عذر کی وجہ سے نماز جمعہ کے ساتھ نماز عصر کو جمع کیا جا سکتا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب واضح ہو کہ نمازوں کو جمع کرنے کی دو صورتیں ہیں:

(الف) ایک نماز کو دوسری نماز کے وقت بھی اس طرح ادا کرنا کہ پہلی نماز کا وقت گزر چکا ہو یا دوسری نماز کا ابھی وقت نہ ہوا ہو اسے حقیقی جمع کہا جاتا ہے اس کی پھر دو صورتیں ممکن ہیں:

① جمع تقدیم، یعنی ظہر کے ساتھ عصر اور مغرب کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھنا۔

② جمع تاخیر، یعنی عصر کے ساتھ ظہر اور عشاء کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھنا۔

(ب) پہلی نماز کو مؤخر کر کے آخری وقت اور دوسری کو جلدی کر کے پہلے وقت میں پڑھ لینا، اس طرح بظاہر دونوں نمازیں جمع ہو جائیں گی لیکن درحقیقت اپنے اپنے اوقات میں ادا ہوں گی اس قسم کو جمع صوری کہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جمع تقدیم اور جمع تاخیر دونوں طرح پڑھنا ثابت ہے، جیسا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر سورج ڈھلنے کے بعد سفر شروع کرتے تو ظہر اور عصر کو اس وقت جمع فرما لیتے اور اگر سورج ڈھلنے سے پہلے سفر کرتے تو ظہر کو مؤخر کر کے عصر کے ساتھ ادا فرماتے اس طرح اگر سورج غروب ہونے کے بعد سفر شروع

کرتے تو مغرب اور عشاء اس وقت پڑھ لیتے اور اگر سورج غروب ہونے سے پہلے سفر شروع کرتے تو مغرب کو مؤخر کر کے عشاء کے ساتھ پڑھ لیتے۔ [ابوداؤد، الصلوٰۃ:۱۲۲۰]

سفر کے علاوہ شدید بارش، سخت آندھی، انتہائی سردی یا ژالہ باری کے وقت بھی نمازوں کو جمع کیا جا سکتا ہے۔ جنگی حالات اور ہنگامی اوقات میں جمع کرنے کا جواز ہے چونکہ جمعہ، نماز ظہر کا قائم مقام ہے، اس لئے بوقت ضرورت جمعہ کے ساتھ نماز عصر ادا کی جا سکتی ہیں لیکن نماز جمعہ کو مؤخر کر کے عصر کے وقت ادا کرنا صحیح نہیں ہے۔

نوٹ: ناگزیر حالات کے پیش نظر حالت اقامت میں بھی دو نمازوں کو جمع کیا جا سکتا ہے، تاہم شدید ضرورت کے بغیر ایسا کرنا ناجائز ہے، جیسا کہ ہمارے ہاں کاروباری حضرات کا معمول ہے کہ وہ سستی یا کاروباری مصروفیت کی وجہ سے دو نمازیں جمع کرنے کا معمول بنا لیتے ہیں، ایسا کرنا جائز نہیں ہے بلکہ سخت گناہ ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال جو آدمی امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز نہیں ہوتی، اسے قرآن وحدیث سے ثابت کریں، نیز نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کی کیا دلیل ہے؟

جواب نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ حدیث میں ہے کہ ''جس شخص نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں۔'' [صحیح بخاری، الاذان:۷۵۶]

اس حدیث پر امام بخاری رحمہ اللہ علیہ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''تمام نمازوں میں امام اور مقتدی کے لئے سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے۔'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص نے نماز پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی وہ نماز ناقص ہے، ناقص ہے، ناقص ہے، پوری نہیں۔'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ ہم امام کے پیچھے ہوتے ہیں؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اس وقت جی میں پڑھ لیا کرو۔ [مسلم، الصلوٰۃ:۳۹۵]

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم نماز فجر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے تھے آپ نے قرآن پڑھا۔ آپ پر قراءت بھاری ہوگئی جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: ''شاید تم اپنے امام کے پیچھے پڑھا کرتے ہو؟'' ہم نے کہا: ہاں، اے اللہ کے رسول! آپ نے فرمایا: ''سوائے سورۂ فاتحہ کے اور کچھ نہ پڑھا کرو کیونکہ اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتا۔'' [ابوداؤد، الصلوٰۃ:۸۳۲]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ مقتدیوں کو امام کے پیچھے، خواہ وہ بلند آواز سے قراءت کرے یا آہستہ سورۂ فاتحہ ضرور پڑھنی چاہیے۔ اسی طرح نماز جنازہ میں بھی سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہیے۔ کیونکہ طلحہ بن عبداللہ بن عوف کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی تو آپ نے سورۂ فاتحہ پڑھی اور فرمایا: ''میں نے یہ اس لئے کیا کہ تم جان لو یہ سنت ہے۔'' [بخاری:۱۳۳۵]

اس سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہیے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال کیا گھر میں میاں بیوی دونوں فرض نماز کی جماعت کرا سکتے ہیں اگر کرا سکتے ہیں، تو اس کی صورت کیا ہوگی؟

جواب مرد حضرات کے لئے مسجد میں نماز باجماعت ادا کرنا ضروری ہے، بلاوجہ ان کا گھر میں نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے، اگر کسی

معقول عذر کی وجہ سے گھر میں نماز ادا کرنا ضروری ہو تو بیوی خاوند دونوں جماعت کرا سکتے ہیں، اس کی صورت یہ ہوگی کہ خاوند جماعت کرائے اور بیوی اس کے برابر کھڑے ہونے کے بجائے پیچھے کھڑی ہوگی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمارے گھر ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت کرائی تو میں اور ایک بچہ آپ کے پیچھے اور ہماری والدہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا اکیلی ہمارے پیچھے کھڑی ہوئیں۔ [صحیح بخاری، الاذان: ۷۲۷]

عورت کسی صورت میں مرد کی جماعت نہیں کرائے گی، خواہ وہ عالمہ فاضلہ ہی کیوں نہ ہو۔

سوال ہمارے ہاں ایک دن امام صاحب کو دوران جماعت شدید درد ہوا اور وہ بیٹھ گئے اور اسی حالت میں جماعت مکمل کی، سلام کے بعد نمازی حضرات میں اختلاف ہوا کچھ کہنے لگے کہ ہمیں بھی بیٹھ کر نماز ادا کرنا تھی جبکہ دوسرے حضرات کہنے لگے کہ ہمیں بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس سلسلہ میں وضاحت فرمائیں۔

جواب جب امام کسی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھے تو مقتدی کو بیٹھ کر نماز پڑھنا چاہیے یا انہیں کھڑا رہنا چاہیے، اس کے متعلق دونوں روایات ہیں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پانچ ہجری میں گھوڑے سے گر کر زخمی ہوئے تو آپ نے اپنے گھر میں نماز پڑھائی اور فرمایا: ''جب امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر نماز ادا کرو۔'' [صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۶۸۸]

لیکن دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرض وفات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر نماز پڑھائی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھائی اور لوگ بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔ [صحیح بخاری، الاذان: ۶۸۳]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں حضرت حمیدی کے حوالہ سے بایں الفاظ فیصلہ کیا ہے: ''جب امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی اس کے پیچھے نماز بیٹھ کر ادا کرو، یہ واقعہ مرض قدیم میں پیش آیا تھا۔'' اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض وفات میں بیٹھ کر نماز ادا کی جبکہ لوگ آپ کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے، آپ نے انہیں بیٹھنے کا حکم نہیں دیا، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری فعل کو عمل میں لانا چاہیے۔ [صحیح بخاری: ۶۸۹]

اس لئے صورت مسئولہ میں اگر امام دوران نماز کسی وجہ سے بیٹھ گیا تو مقتدی حضرات کو بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ کھڑے ہو کر ہی نماز ادا کریں۔ اگرچہ قیس بن فہد انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عہد رسالت میں ان کا امام بیمار ہو گیا تو وہ بیٹھ کر ساری امامت کراتا تھا، ہم بھی بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے۔ [مصنف عبدالرزاق، ص: ۴۶۲ ج ۲]

تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہمارے لئے نمونہ ہے اور اسی کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال موسم کی خرابی کی وجہ سے اگر مغرب کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھ لی جائے تو نماز عشاء کے لئے اذان کہنا ضروری ہے؟

جواب سفر و حضر میں اگر کسی معقول عذر کی وجہ سے دو نمازوں کو جمع کیا جائے تو اذان ایک کہی جائے گی، البتہ اقامت ہر نماز کے لئے الگ الگ کہنا ہوگی، جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوران حج میدان عرفات میں وقوف فرمایا اس اثنا میں مؤذن نے اذان دی، پھر اقامت کہی تو آپ نے نماز ظہر ادا کی، پھر اقامت کہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز

عصر ادا کی۔ [صحیح مسلم، الحج:۱۲۱۸]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جمع کرتے وقت دوسری نماز کے لئے اذان کی ضرورت نہیں اس کے لئے صرف اقامت ہی کافی ہے، البتہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوران سفر اگر دو نمازوں کو جمع کرنے کی ضرورت پڑے تو ہر نماز کے لئے صرف اقامت پر بھی اکتفا کیا جاسکتا ہے۔ اس مسئلہ کے لئے انہوں نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بھی قائم کیا ہے:

''جب مغرب اور عشاء کو جمع کیا جائے تو کیا اذان دی جائے یا صرف اقامت پر اکتفا کیا جائے''۔ پھر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا عمل پیش کیا ہے کہ اگر انہیں سفر میں جلدی ہوتی تو اقامت کہہ کر نماز مغرب کی تین رکعت ادا کرتے، پھر تھوڑی دیر بعد اقامت کہی گئی تو آپ نے عشاء کی دو رکعت ادا کیں۔ [صحیح بخاری، تقصیر الصلوٰۃ:۱۱۰۹]

دار قطنی کی روایت میں مزید وضاحت ہے کہ دوران سفر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کسی نماز کے لئے اذان نہیں کہتے تھے۔ [فتح الباری، ص:۲۵۰ ج۲]

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ دوران سفر اگر جمع کرنا ہو تو ایک اذان کہی جائے، پھر ہر نماز کے لئے اقامت الگ الگ ہو۔ [واللہ اعلم]

سوال نماز میں قراءت کرتے وقت قرآنی سورتوں کی ترتیب کا خیال رکھنا ضروری ہے یا اسے بلاترتیب بھی پڑھا جاسکتا ہے، نیز عصر یا ظہر کی آخری دو رکعت میں فاتحہ کے علاوہ قراءت کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب نماز میں قراءت کرتے وقت قرآنی سورتوں کی ترتیب کا خیال رکھنا ضروری نہیں ہے، تاہم بہتر ہے اس کا خیال رکھا جائے۔ کیونکہ عام طور پر جن سورتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں پڑھا ہے ان میں ترتیب کا خیال رکھا ہے، البتہ بعض اوقات بلاترتیب پڑھنا بھی منقول ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نماز میں پہلے سورۂ بقرہ، پھر سورۂ نساء اور پھر آل عمران پڑھی۔ [مسند امام احمد، ص:۳۸۲، ج۵]

حالانکہ سورۂ نساء، سورۂ آل عمران کے بعد ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق اپنی صحیح میں مستقل عنوان قائم کیا ہے کہ دوران نماز قراءت کرتے وقت تقدیم وتاخیر میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ظہر اور عصر کی آخری دو رکعات میں بھی فاتحہ کے علاوہ قراءت کی جاسکتی ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی آخری دو رکعات میں پندرہ آیات کے برابر قراءت کرتے تھے۔ [ابوداؤد، الصلوٰۃ:۸۰۵]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آخری دو رکعات میں سورۂ فاتحہ کے بعد قرأت کرنا مسنون عمل ہے۔ اگر کوئی آخری دو رکعات میں صرف فاتحہ پڑھتا ہے تو بھی جائز ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات آخری دو رکعت میں صرف سورۂ فاتحہ کی قرأت کرتے تھے۔ [صحیح بخاری، صفۃ الصلوٰۃ:۷۷۶]

لہٰذا اس میں وسعت ہے۔ دونوں طرح عمل کیا جاسکتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال بندہ قدرے معذور ہے زمین پر بیٹھنے سے سخت تکلیف ہوتی ہے، کھانا وغیرہ چارپائی یا کرسی پر بیٹھ کر کھاتا ہوں اور نماز

بھی اسی حالت میں ادا کرتا ہوں، بعض اوقات برتن سامنے ہوتے ہیں، میں نے سنا ہے کہ کھانے کے برتن اگر سامنے ہوں تو نماز نہیں ہوتی، وضاحت فرمائیں؟

جواب دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و عافیت عطا فرمائے۔ حدیث میں ہے کہ جب کھانا سامنے آجائے اور دوسری طرف نماز کی اقامت ہو چکی ہو تو پہلے کھانے سے فارغ ہو جانا چاہیے، پھر نماز پڑھی جائے۔ [صحیح بخاری، الاذان: ٦٧٣]

اس حدیث سے کسی نے یہ مسئلہ کشید کیا ہوگا کہ جب کھانے کے برتن سامنے ہوں تو نماز نہیں ہوتی، حالانکہ حدیث میں اس طرح کا کوئی مسئلہ نہیں۔ خواتین اس طرح کے مسئلے گھڑ کر رواج دے دیتی ہیں۔ ایسے مسائل کا تعلق ''دین خواتین'' سے تو ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آمدہ دین متین میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ فراغت کے بعد اگر برتن سامنے پڑے ہوں تو اس سے نماز متاثر نہیں ہوتی۔ البتہ اتنا اہتمام ضرور ہونا چاہیے کہ اگر برتنوں میں کھانا بچا ہوا ہے تو اسے ڈھانپ دیا جائے، پھر نماز پڑھی جائے تاکہ کھلے کھانے سے نماز کا خشوع متاثر نہ ہو۔ [واللہ اعلم]

سوال مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے اگر نماز ظہر زوال آفتاب سے پہلے پڑھ لی جائے تو اس کا شرعی حکم کیا ہے کیا اسے دوبارہ پڑھنا ہوگا یا وہی نماز کافی ہو جائے گی؟

جواب قبل از وقت نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے۔ ایسا کرنے سے فرضیت ادا نہیں ہوگی، بلکہ وقت کے بعد دوبارہ پڑھنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''بے شک نماز اہل ایمان پر وقت مقرر پر ادا کرنا ضروری ہے۔'' [النساء: ١٠٣]

رسول اللہ ﷺ نے وقت ظہر کو بایں الفاظ میں بیان کیا ہے ''ظہر کا وقت جب سورج ڈھل جائے'' [صحیح مسلم، المساجد: ٦١٢]

قرآنی آیت اور ارشاد نبوی کے پیش نظر اگر کسی نے مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے نماز ظہر کو زوال آفتاب سے پہلے پڑھ لیا تو اسے دوبارہ پڑھنا ہوگا، قبل از وقت پڑھی ہوئی نماز نفل ہو جائے گی، یعنی اسے نفل نماز کا ثواب مل جائے گا، لیکن موجودہ دور کی ایجادات نے ہمیں سورج کے طلوع و غروب اور زوال سے آزاد کر دیا ہے، آج ہر انسان کے پاس گھڑی ہے اگر مطلع ابر آلود ہو تو اس سے سورج کی روشنی تو متاثر ہو سکتی ہے لیکن گھڑیاں متاثر نہیں ہوتی ہیں جو ہمیں اوقات نماز سے مسلسل آگاہ کرتی رہتی ہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال ہماری مسجد کے امام عرصہ دراز سے امامت کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں، اب وہ معذور ہو چکے ہیں اور کرسی پر بیٹھ کر جماعت کراتے ہیں منصب کو کسی صورت میں چھوڑنے پر تیار نہیں ہیں ہم نے ان کی جگہ پر ایک اور امام کا بندوبست بھی کیا ہے لیکن پھر بھی مصلیٰ چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہیں کچھ جماعتی احباب بھی اس قسم کی صورت حال سے اتفاق کرتے ہوئے اس ''معذور'' امام کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اس سلسلہ میں کیا کرنا چاہیے؟

جواب بیٹھ کر نماز پڑھنے والے معذور امام کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھائی اور آپ کے پیچھے باقی حضرات کھڑے ہو کر نماز ادا کر رہے تھے۔

[صحیح بخاری، الاذان: ٦٨٣]

لیکن اس صورت حال پر استمرار اور دوام اچھا نہیں ہے، بہتر ہے کہ اہل جماعت اس معذور امام کا وظیفہ الگ سے مقرر کر دیں

جوان کی سابقہ حق الخدمت کے طور پر جاری رہے اور امامت کے لئے کسی اور صحت مند امام کا بندوبست کریں۔ اس امام کو بھی چاہیے کہ وہ اس قدر طمع اور لالچ نہ کرے بلکہ از خود اس منصب سے دستبردار ہو جائے، اہل جماعت اتفاق کرکے اس امام کی منت سماجت کریں تاکہ وہ برضا و رغبت اس مصلے کو چھوڑ دے۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ جب جماعت نے ان کی جگہ پر ایک امام مقرر کر دیا تو پھر وہ زبردستی کیونکر مصلے پر آ جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ سماجی طور پر اثر و رسوخ والا ہے یا اس کی پشت پر کچھ اثر و رسوخ رکھنے والے ہیں یا دیہاتی ماحول کی وجہ سے کوئی مجبوری حائل ہے۔ بہرحال ہمارے نزدیک ایسے حالات میں نماز ہو جاتی ہے لیکن اس پر دوام اور استمرار صحیح نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال اس دور میں ہمارے پاس کپڑوں کی کمی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود بعض حضرات آدھے بازو والی شرٹ پہن کر نماز پڑتے ہیں کیا اس سے نماز میں تو کوئی فرق نہیں آتا؟

جواب ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''اے اولادِ آدم! تم ہر مسجد میں حاضری کے وقت اپنی زینت یعنی لباس پہن لیا کرو۔'' (۷/الاعراف:۳۱)

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ یہاں زینت سے مراد ایسا لباس ہے جو انسان کی شرم گاہ کو چھپا لے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں ستر پوشی فرض ہے اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی، نمازی مرد پر ستر ڈھانپنے کے علاوہ کندھے پر کوئی کپڑا رکھنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر نماز پڑھنے کی ممانعت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے ہرگز کوئی ایسے کپڑے میں نماز نہ پڑھے کہ جس کا کوئی حصہ اس کے کندھے پر نہ ہو۔'' [صحیح بخاری:۳۵۹]

ایک دوسری روایت میں ہے کہ جو شخص ایک کپڑے میں نماز پڑھے اسے کپڑے کے دونوں کناروں کو اس کے مخالف سمت کے کندھے پر ڈال لینا چاہیے۔ [صحیح بخاری:۳۶۰]

اگر کپڑا تنگ ہو تو صرف ازار کے طور پر محض اپنا ستر ہی ڈھانپ لینا ضروری ہے، جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر کپڑا تنگ ہو تو اس کا تہبند باندھ لو۔'' [صحیح بخاری:۳۶۱]

صورت مسئولہ میں نصف بازو والی بنیان یا قمیص پہن کر نماز ہو جاتی ہے، اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے اور نہ ہی ایسا کرنے سے ثواب میں کمی ہوتی ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال کیا فرض نماز پڑھنے کے بعد سنت یا نفل پڑھنے کے لئے جگہ تبدیل کرنا چاہیے یا اسی جگہ ہی انہیں ادا کیا جا سکتا ہے؟

جواب فرض نماز ادا کرنے کے بعد سنت یا نفل پڑھنے کے لئے جگہ تبدیل کر لی جائے یا گفتگو کے ذریعے ان کے درمیان فاصلہ کر لیا جائے، کیونکہ حدیث میں ہے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے: ''ہم ایک نماز کے ساتھ دوسری نماز نہ ملائیں تا آنکہ گفتگو کر لیں یا مسجد سے نکل جائیں۔'' [صحیح مسلم:۸۸۳]

ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عصر ادا فرمائی، پھر ایک آدمی کھڑا ہو کر نماز پڑھنے لگا، اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو کہا بیٹھ جاؤ! کیونکہ اہل کتاب کو اس بات نے ہلاک کیا تھا کہ ان کی نمازوں میں فاصلہ نہیں ہوتا تھا۔ تب رسول

اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ابن خطاب! نے بہت اچھی بات کہی ہے۔'' [مسند امام احمد ص:۳۶۸، ج۵]

نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''کیا تم میں سے کوئی عاجز ہے کہ وہ آگے بڑھے یا پیچھے ہٹے یا بائیں دائیں ہو کر نماز پڑھ لے یعنی نفل نماز۔'' [ابوداؤد:۱۰۰۶]

یہ امر مستحب ہے تاکہ سجدہ کرنے کی جگہیں زیادہ ہوں۔ [واللہ اعلم]

سوال ہم نے سنا ہے کہ مکہ مکرمہ میں چار مصلے ہیں اور وہ بھی مقلدین کے لئے مخصوص ہیں، اس کے متعلق حقیقت حال سے آگاہ فرمائیں؟

جواب توحید کی نشر و اشاعت میں مصروف حکومت سعودیہ کے عہد مبارک سے بیت اللہ میں ایک ہی مصلیٰ ہے۔ وہ بھی اللہ کے حکم کی تعمیل کے پیش نظر ہے کہ ''تم مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بناؤ۔'' [۲/البقرہ:۱۲۵]

وہاں آج کل ایک ہی مصلیٰ ہے۔ چار نہیں ہیں تقلید جامد کی نحوست سے کسی وقت وہاں چار مصلے تھے۔ اس وقت جب حنفی مصلیٰ پر نماز ہوتی تو شافعی اپنے مصلیٰ پر نماز پڑھتے تھے، یعنی بیت اللہ جو وحدت ملت کی علامت تھا اسے چار حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا، اللہ تعالیٰ حکومت سعودیہ کو جزائے خیر دے کہ اس نے چار مصلوں کو ختم کر کے صرف ایک مصلیٰ پر لوگوں کو جمع کر دیا۔

سوال کیا اہل تشیع حضرات کی اذان کا جواب دینا چاہیے یا نہیں؟

جواب ہمارے ہاں بدقسمتی سے بیک وقت کئی اذانیں شروع ہو جاتی ہیں، اس لئے اس اذان کا جواب دیا جائے، جس پر لبیک کہتے ہوئے مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے آنا ہے۔ شیعہ حضرات کی اذان کا شریعت کے خلاف ہونے کی وجہ سے جواب نہیں دینا چاہیے کیونکہ اس میں انہوں نے اضافہ کیا ہے جو خلفائے ثلاثہ، حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم سے بغض وعداوت پر مبنی ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ہم نے سنا ہے کہ فرض نماز میں سورۂ حجرات سے سورۂ ناس تک حسب ضرورت تلاوت کی جا سکتی ہیں لیکن سورۂ حجرات سے پہلے کسی سورت کو نماز میں پڑھنا صحیح نہیں ہے، وضاحت فرمائیں؟

جواب قرآن کریم میں ہے کہ جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکو پڑھ لیا کرو۔ [۷۳/المزمل:۲۰]

اس حکم کا تقاضا ہے کہ نماز میں قراءت کے متعلق کوئی پابندی نہیں ہے رسول اللہ ﷺ سے جمعۃ المبارک کے دن نماز فجر میں ''تنزیل السجدہ'' پڑھنا ثابت ہے۔ [صحیح بخاری:۸۹۱]

فتح مکہ کے دن نماز فجر میں ''سورۂ مؤمنون'' شروع کرنے کا ذکر بھی احادیث میں ہے۔ [صحیح مسلم:۴۵۵]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ سورۂ اعراف کو نماز مغرب میں پڑھا۔ [نسائی:۹۹۰]

نیز آپ نے نماز مغرب میں سورۂ دخان بھی ایک مرتبہ پڑھی تھی۔ [نسائی:۹۸۹]

نماز فجر میں سورۂ روم پڑھنے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ [نسائی:۹۴۸]

ان روایات کا تقاضا ہے کہ نماز میں قراءت کے متعلق کوئی پابندی نہیں ہے۔ اگرچہ حجرات کے بعد سورتوں کو پڑھنا بہتر ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال (الف) بعض اوقات دوران نماز آدمی قمیص کے بازو یا اپنی شلوار اوپر نیچے کرتا ہے یا گرمی کی وجہ سے قمیص کے بازو اوپر کر لئے جاتے ہیں کیا ایسا کرنے سے نماز میں کوئی نقص آتا ہے یا نہیں؟

(ب) بعض لوگ گرمیوں میں نماز کے وقت میلی سی بنیان یا گندا سا کپڑا جسم پر لپیٹ لیتے ہیں، حالانکہ گھر میں کپڑے موجود ہیں، کیا ایسا کرنے سے نماز ہو جاتی ہے؟

جواب جب آدمی نماز پڑھتا ہے تو اپنے رب سے مناجات کرتا ہے۔ نمازی کو چاہیے کہ وہ ہر اس ظاہری شکل وصورت یا باطنی کیفیت وہیئت سے اجتناب کرے جو اس کی مناجات پر اثر انداز ہوں یا دوران نماز اس کے خشوع وخضوع میں کمی کا باعث ہوں۔ کپڑوں کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''اے بنی آدم! تم ہر نماز کے وقت اپنی زینت کو اپناؤ۔'' [۷/الاعراف:۳۱]

اپنی نماز کے وقت کپڑے میلے کچیلے اور گندے نہ ہوں۔ اچھے صاف ستھرے اور پاکیزہ لباس میں نماز ادا کی جائے، گرمی کی وجہ سے یہ کوئی معقول عذر نہیں ہے کہ گندی سی بنیان یا میلے کچیلے کپڑے کو جسم پر لپیٹ کر نماز ادا کر لی جائے، اس طرح کی شکل وصورت میں ہم کسی کے ہاں بطور مہمان یا بازار جانا پسند نہیں کرتے، لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ سوال میں بیان کردہ تمام صورتوں سے نماز کے ثواب میں ضرور کمی آ جاتی ہیں، لہٰذا ان صورتوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال قرآن کریم میں مختلف مقامات پر سجدہ تلاوت کرنے کا حکم دیا گیا ہے آیت سجدہ میں کوئی مخصوص لفظ ہوتا ہے جس کی وجہ سے سجدہ کرنے کا حکم ہے یا اور کوئی وجہ ہوتی ہے؟

جواب قرآن کریم میں جن آیات کی تلاوت پر سجدہ کرنے کا حکم ہے وہاں کوئی ایسا مفہوم ضرور ہے جسے سجدہ سے مناسبت ہوتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جہاں بھی سجدہ وغیرہ کا ذکر ہو وہاں سجدہ تلاوت کرنا ضروری ہو، جیسا کہ سورۂ یوسف میں گیارہ ستاروں اور شمس وقمر کے سجدہ کرنے کا ذکر ہے لیکن وہاں سجدہ تلاوت کا حکم نہیں ہے۔ بہرحال جن مقامات پر سجدہ کرنے کا حکم ہے وہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت شدہ ہیں ہمیں وہاں سجدہ تلاوت کرنا چاہیے۔ اس سجدہ کی مناسبت ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اس کے متعلق ہمیں دماغ سوزی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک حدیث میں ہے کہ جس نے سورج نکلنے سے پہلے ایک رکعت پا لی اس نے نماز فجر کو پا لیا جبکہ ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے طلوع آفتاب کے وقت نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ وضاحت فرمائیں؟

جواب مکمل حدیث اس طرح ہے کہ ''جس نے طلوع آفتاب سے پہلے نماز فجر کی ایک رکعت کو پا لیا اس نے گویا نماز فجر کو پا لیا اور جس نے غروب آفتاب سے پہلے عصر کی ایک رکعت پا لی وہ نماز عصر پانے میں کامیاب ہو گیا۔'' [صحیح بخاری، مواقیت:۵۷۹]

اس حدیث کا قطعاً یہ مقصد نہیں ہے کہ طلوع آفتاب یا غروب آفتاب سے پہلے ایک رکعت پڑھ لینے سے ہی پوری نماز ادا ہو جائے گی اور اسے بقیہ نماز ادا کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص طلوع آفتاب یا غروب آفتاب سے پہلے

ایک رکعت پڑھ لے تو اس نے نماز کے وقت ادا کو پالیا۔اب باقی ماندہ نماز طلوع آفتاب یا غروب آفتاب کے بعد پڑھے گا تو بھی اسے وقت ادا میں پڑھنے کا ثواب ملے گا۔نماز کا جو حصہ وقت نکلنے کے بعد پڑھا گیا ہے اسے بھی ادا ہی شمار کیا جائے گا وہ قضا میں شامل نہیں ہوگا۔جمہور محدثین کے ہاں حدیث کا یہی مفہوم ہے، چنانچہ مندرجہ ذیل حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جس شخص نے طلوع آفتاب سے پہلے ایک رکعت پالی اور باقی ایک رکعت طلوع آفتاب کے بعد پڑھی تو اس نے پوری نماز کو پالیا اور جس نے غروب آفتاب سے پہلے عصر کی ایک رکعت پڑھی اور باقی تین رکعات آفتاب کے بعد پڑھیں تو اس نے عصر کی نماز کو پالیا۔ [بیہقی ،ص:۳۷۹،ج۱]

اس روایت پر امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے۔

اس بات کی دلیل کہ اس طرح طلوع آفتاب سے اس کی نماز باطل نہیں ہوگی۔عرب کے نامور عالم دین شیخ محمد صالح عثیمین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو نماز کا وقت ختم ہونے سے پہلے پہلے ایک رکعت پڑھنے کا وقت مل جاتا ہے تو وہ گویا پوری نماز وقت ادا ہی میں پڑھتا ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ جس نے نماز کی ایک رکعت پالی اس نے پوری نماز کو پالیا۔اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ اگر کسی کو وقت ختم ہونے سے پہلے پہلے ایک رکعت سے کم حصہ ادا کرنے کا موقع ملتا ہے تو وہ وقت ادا کو پانے والا نہیں ہوگا، نیز اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ انسان دانستہ طور پر نماز کو مؤخر کرے، نمازی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی نماز وقت ادا میں ہی مکمل کرے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''منافق کی نماز یہ ہے کہ وہ بیٹھا سورج کا انتظار کرتا رہتا ہے جب وہ شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان چلا جاتا ہے تو کھڑا ہو کر کوے کی طرح ٹھونگے مار کر اسے جلدی جلدی مکمل کر لیتا ہے وہ اس میں برائے نام ہی اللہ کا ذکر کرتا ہے۔'' [رسالہ مواقیت الصلوۃ ،ص:۱۶]

اور جس حدیث میں طلوع آفتاب کے وقت نماز پڑھنے سے ممانعت کا ذکر ہے اس سے مراد اوقات مکروہ کا بیان ہے کہ انسان مقصد اور ارادہ سے طلوع یا غروب آفتاب کے وقت نماز پڑھے، ایسے اوقات میں نماز پڑھنا اس لئے منع ہے کہ ان اوقات میں کفار عبادت کرتے ہیں اور طلوع وغروب آفتاب کے وقت شیطان کی عبادت کی جاتی ہے اور جو انسان طلوع وغروب آفتاب سے پہلے نماز شروع کر لیتا ہے وہ اس حکم امتناعی میں شامل نہیں ہوگا۔ [واللہ اعلم]

سوال جس نے رکوع پالیا تحقیق اس نے رکعت پالی، اس حدیث کا حوالہ درکار ہے، نیز ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جس نے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہیں ہوتی، ان دونوں احادیث میں بظاہر تعارض ہے، اس کی وضاحت کریں؟

جواب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مذکورہ حدیث درج ذیل کتب میں ہے۔

[صحیح ابن خزیمہ:۱۶۲۲، ابوداؤد:۸۹۳، دار قطنی ،ص:۳۴۷،ج۱، مستدرک حاکم ،ص:۲۱۶،ج۱]

ہمارے نزدیک امام کے ساتھ بحالت رکوع ملنے سے رکعت نہیں ہوتی، البتہ اس سے رکعت کا ثواب مل جاتا ہے کیونکہ رکعت کے لئے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے، ایک قیام دوسرے قراءت فاتحہ، امام کیساتھ رکوع میں شامل ہونے سے یہ دونوں چیزیں رہ جاتی ہیں اگرچہ جمہور کا یہ موقف ہے کہ ایسی حالت میں رکعت ہو جاتی ہے لیکن راجح بات یہ ہے کہ جس رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ شمار نہیں ہوگی۔امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''جزء القراءۃ'' میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے ''اگر تم

جماعت کو بحالت رکوع پاؤ تو اسے رکعت شمار نہ کرو۔'' امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے فریقین کے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے جمہور کے موقف کو کمزور قرار دیا ہے۔ [نیل الاوطار: ص:۴۱، ج۴]

سوال میں پیش کردہ احادیث میں کوئی تعارض نہیں ہے، بلکہ دونوں احادیث اپنے اپنے مقام پر صحیح ہیں۔

سوال دوسری رکعت کے لئے ہاتھوں کے سہارے اٹھنا چاہیے یا مٹھی بند کر کے۔ کتاب وسنت کے حوالے سے اٹھنے کی کیفیت کو وضاحت سے بیان کریں؟

جواب دوسری رکعت کے لئے اٹھتے وقت کچھ لوگ اپنے دونوں ہاتھوں پر ٹیک لگا کر اٹھنے کے بجائے سیدھے تیر کی طرح اٹھتے ہیں اور بطور استدلال یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دونوں ہاتھوں پر ٹیک لگائے بغیر تیر کی مانند اٹھتے تھے لیکن یہ حدیث من گھڑت اور موضوع ہے کیونکہ اس کی سند میں خصیب بن جحدر نامی ایک راوی کذاب ہے۔

[مجمع الزوائد:۲/۱۳۵]

نیز یہ روایت صحیح بخاری کی اس حدیث کے بھی خلاف ہے، جس میں صراحت کیساتھ یہ بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دوسرے سجدے سے اپنا سر مبارک اٹھاتے تو بیٹھتے، زمین پر ٹیک لگاتے، پھر دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہوتے، اب سوال یہ ہے کہ زمین پر ٹیک لگا کر اٹھتے وقت ہاتھوں کی کیفیت کیا ہوگی، کیا کھلے ہاتھوں اٹھنا چاہیے یا مٹھی بند کر کے کھڑے ہونا چاہیے، اس کے متعلق ازرق بن قیس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ وہ نماز میں جب (دوسری رکعت کے لئے) کھڑے ہوتے تو آٹا گوندھنے والے کی طرح مٹھی بند کر کے زمین پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے، میں نے ان سے اس کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔ [غریب الحدیث لابی اسحاق الحربی:۲/۵۲۵]

اگرچہ اس روایت پر ہیثم بن عمران کی وجہ سے اعتراض کیا گیا ہے لیکن امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اسے کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے۔ (۷/۵۷۷) محدث العصر علامہ البانی مرحوم نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ [سلسلہ الاحادیث الضعیفہ:۲/۳۹۲]

بعض اہل علم نے اس کی یہ توجیہ بھی کی ہے کہ آٹا گوندھتے وقت کبھی کھلے ہاتھ استعمال ہوتے ہیں، لہٰذا کھلے ہاتھوں سے ٹیک لگا کر اٹھنے کی گنجائش ہے لیکن یہ توجیہ امر واقعہ کے خلاف ہے کیونکہ کھلے ہاتھوں سے آٹا نہیں گوندھا جاتا ہے بلکہ مٹھی بند کر کے اسے گوندھا جاتا ہے۔ لہٰذا ہماری تحقیق یہی ہے، کہ دوسری رکعت سے کھڑے ہوتے وقت مٹھی بند کر کے زمین پر ٹیک لگا کھڑے ہونا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہم نماز کی ابتدا میں دعائے استفتاح کے طور پر ''سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ ......الخ'' پڑھتے چلے آرہے ہیں مگر آج کل کسی عالم نے بتایا کہ یہ دعا صحیح نہیں ہے بلکہ ''اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ خَطَايَايَ..........الخ'' پڑھنی چاہیے۔ اس کے متعلق راہنمائی فرمائیں کہ ہم کونسی دعا پڑھیں؟

جواب مذکورہ دعائے استفتاح متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مرفوعاً وموقوفاً مروی ہے کہ محدثین کرام نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کا آغاز کرتے تو مذکورہ دعا پڑھتے۔

[ابوداؤد، الصلوٰۃ ۷۷۶، ترمذی، الصلوٰۃ:۲۴۳، ابن ماجہ، اقامۃ الصلوٰات:۸۰۶]

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے روایت کیا ہے اور علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ [مستدرک:۱/۲۳۵]

لیکن اس کی سند میں ایک راوی حارثہ ہے جس کے متعلق علمائے جرح وتعدیل نے کلام کیا ہے مگر اس حدیث کی ایک دوسری سند سے اسے تقویت پہنچتی ہے۔ [دارقطنی، حدیث نمبر:۱۱۲۸]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ یہ سند منقطع ہونے کے باوجود پہلی حدیث کے لئے بہترین مؤید ہے۔اس بنا پر یہ روایت درجہ حسن تک پہنچ جاتی ہے۔ اگر اس کے ساتھ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث کو ملا دیا جائے تو درجہ صحت تک پہنچ جاتی ہے۔

[ارواء الغلیل:۲/۵۰۲]

☆ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کے وقت نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہہ کر مذکورہ دعا پڑھتے تھے۔ [نسائی:۲/۱۳۲، دارمی:۱/۲۸۲، مسند امام احمد:۳/۵۰]

شیخ احمد شاکر رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے [تحقیق ترمذی، ص:۱۱، ج۲]

البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے۔ [ارواء الغلیل، ص:۵۳، ج۲]

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے تو اللہ اکبر کہتے، پھر اپنے ہاتھوں کو کانوں تک اٹھاتے اس کے بعد مذکورہ دعا پڑھتے۔ [دارقطنی، حدیث نمبر:۱۱۳۵]

اس حدیثِ انس رضی اللہ عنہ کو امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بیان کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔

☆ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً یہ دعا مروی ہے لیکن اس کے بعد "وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ" کا بھی ذکر ہے۔ [بیہقی:۱/۳۵]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے موقوفاً یہ دعا پڑھنا منقول ہے۔ [صحیح مسلم، الصلوٰۃ:۸۹۲]

لیکن مسلم کی روایت میں انقطاع ہے، کیونکہ اس میں ایک راوی عبدہ ہے جس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نہیں سنا ہے لیکن امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ موقوف روایت متعدد اسانید سے موصولاً بیان کی ہے۔ [دارقطنی:۱۱۲۳تا۱۱۳۰]

دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس روایت کو مرفوعاً بھی بیان کیا ہے، تاہم وضاحت کردی ہے کہ اس کا موقوف ہونا صحیح ہے۔ [دارقطنی ۱۱۲۹]

اس روایت کے پیش نظر بہتر ہے کہ صحیحین کی روایت کے مطابق نماز کے آغاز میں "اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِيْ" پڑھی جائے لیکن اگر کوئی سہولت کے پیش نظر "سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ" پڑھتا ہے تو یہ بھی صحیح ہے۔متعدد محدثین کرام نے مجموعی طور پر مذکورہ بالا روایت کو صحیح اور قابل حجت قرار دیا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال دوران نماز بعض لوگ سورۂ فاتحہ یا کوئی سورت شروع کرتے وقت بسم اللہ باآواز بلند نہیں پڑھتے، اس کے متعلق قرآن وحدیث سے راہنمائی فرمائیں؟

جواب سورۂ فاتحہ یا کسی اور سورت سے پہلے بسم اللہ پڑھنا مشروع ہے کیونکہ یہ ہر سورت کی آیت ہے، البتہ اس میں اختلاف

ہے کہ اسے جہری نمازوں میں بآواز بلند پڑھا جائے یا اسے آہستہ پڑھا جائے۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بآواز بلند پڑھنے کو مسنون قرار دیتے ہیں جبکہ جمہور اہل علم کے نزدیک بسم اللہ کو اونچی آواز سے پڑھنا مسنون نہیں ہے۔فریقین کے پاس دلائل ہیں۔چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ،حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ،حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے ہمراہ نمازیں پڑھی ہیں، میں نے ان سے کسی کو اونچی آواز سے بسم اللہ پڑھتے ہوئے نہیں سنا ہے۔ [مسلم،الصلوٰۃ:۶۰۵]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اونچی آواز سے بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے۔ [مسند امام احمد،ص:۱۷۰،ج۳]

امام ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ وہ لوگ آہستہ بسم اللہ پڑھتے تھے۔ [صحیح ابن خزیمہ،ص:۲۵۰،ج۱]

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دوران نماز بسم اللہ کو آہستہ پڑھا جائے جبکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے ایک روایت ہے کہ انہوں نے نماز پڑھی اور بسم اللہ بآواز بلند پڑھی اور فرمایا کہ میں نماز کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کر رہا ہوں۔

[دار قطنی،ص:۳۰۸،ج۱]

ان روایات کے پیش نظر ہمارا موقف ہے کہ دوران نماز بسم اللہ کو پڑھنا دونوں طرح جائز ہے،البتہ آہستہ پڑھنے کے متعلق احادیث زیادہ صحیح اور واضح ہیں،امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگرد رشید امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اسی موقف کو اختیار کیا ہے۔

[زاد المعاد،ص:۱۹۹،ج۱]

بعض احادیث میں بسم اللہ پڑھنے کا ذکر نہیں ہے،انہیں راوی کے عدم علم یا قراءت کے آہستہ پر محمول کیا جائے۔

سوال کیا نماز کی ہر رکعت میں قراءت سے پہلے "اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم" پڑھنا ضروری ہے،اگر ضروری ہے تو قرآن وحدیث سے اس کی کوئی دلیل ضرور تحریر کریں؟

جواب حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو دعائے استفتاح پڑھنے کے بعد تعوذ پڑھتے۔ [ابوداؤد،الصلوٰۃ:۷۷۵]

تعوذ کے لئے کئی ایک الفاظ ہیں جن میں دو زیادہ مشہور ہیں:

① "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ" [مسند امام احمد،ص:۵۰ج۳]

② "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ"

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قرآنی آیت سے استدلال کرتے ہوئے اس تعوذ کو ہر رکعت میں مشروع قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے راجح قرار دیا ہے۔ [تمام المنہ،ص:۱۷۶]

لیکن ہمارے نزدیک اسے پہلی رکعت میں قراءت سے پہلے پڑھنا چاہیے،جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دوسری رکعت سے اٹھتے تو "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ" سے قراءت شروع فرماتے۔ [صحیح مسلم،المساجد:۹۴۱]

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی رکعت کے لئے اٹھتے تو قراءت شروع فرما دیتے اور خاموش نہ رہتے۔جیسا کہ ابتدا نماز میں خاموش رہتے تھے۔ [زاد المعاد،ص:۲۳۴،ج۱]

رسول اللہ ﷺ کے اس عمل کے پیش نظر قرآنی آیت سے استدلال صحیح نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال نماز کے اوقات اوران کی ادائیگی کا طریق کار سکھانے کے لئے حضرت جبرائیل علیہ السلام دو دن مسلسل آتے رہے کیا مکی دور کے طریق کار اور رسول اللہ ﷺ کے آخری ایام میں نماز کی ادائیگی کے متعلق کوئی فرق تھا تو اسے واضح کیا جائے، جیسا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ نماز میں رفع الیدین پہلے تھا بعد میں اسے منسوخ کر دیا گیا قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں؟

جواب مکہ مکرمہ بیت اللہ کے پاس رسول اللہ ﷺ کو اوقات وطریقہ نماز بتانے کے لئے حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے، رسول اللہ ﷺ جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو نماز کے متعلق کچھ نئے احکام نازل ہوئے اور کچھ احکام ایسے بھی تھے جن کی مدت ختم ہونے پر انہیں ختم کر دیا گیا، مثلاً: دوران نماز پہلے کسی ضرورت کے پیش نظر گفتگو کرنے کی اجازت تھی، جسے منسوخ کر دیا گیا۔ چنانچہ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں پہلے دوران نماز گفتگو کرنے کی اجازت تھی، پھر جب یہ آیت نازل ہوئی کہ ''اللہ کے حضور ادب سے کھڑے ہوا کرو۔'' [۲/البقرہ:۲۳۸]

پھر ہمیں نماز میں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا۔ [صحیح بخاری، الصلوٰۃ:۱۲۰۰]

اسی طرح سلام پھیرتے وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے ہاتھوں کو اٹھاتے تھے، جیسا کہ گھوڑا اپنی دم کو ہلاتا ہے ہمیں بعد میں اس سے منع کر دیا گیا۔ [صحیح مسلم، الصلوٰۃ:۹۷۰]

نماز کی رکعات پہلے دو، دو تھیں بعد میں ظہر، عصر اور عشاء کی نماز جب حضر میں پڑھی جائے تو اس میں مزید دو، دو رکعات کا اضافہ کر دیا گیا، البتہ سفر کی نماز کو اپنی حالت پر برقرار رکھا گیا۔ [بخاری:۱۰۹۰]

لیکن رفع الیدین ایک ایسی سنت ثابتہ ہے جس میں کسی وقت کسی صورت میں نسخ کی کوئی حدیث نہیں ہے۔ رفع الیدین کے چار مواقع ہیں، تکبیر تحریمہ کے وقت، رکوع جاتے وقت، رکوع سے سر اٹھاتے وقت اور تیسری رکعت کے لئے اٹھتے وقت۔ تکبیر تحریمہ کے وقت رفع الیدین پر تمام امت کا اجماع ہے اور باقی تین مقامات میں رفع الیدین کرنے پر بھی اہل کوفہ کے علاوہ تمام علمائے امت کا اتفاق ہے، بقول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اظہار اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کی اتباع ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عمر بھر اس سنت پر عمل کیا۔ اس سنت متواترہ کو عشرہ مبشرہ کے علاوہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی بیان کرتے اور اس پر عمل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس بنا پر رسول اللہ ﷺ اور سبیل المؤمنین کی اتباع کے پیش نظر تمام مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ رکوع جاتے، اس سے سر اٹھاتے وقت اللہ کی عظمت کا اظہار کرتے ہوئے رفع الیدین کریں۔ اس کے علاوہ دعویٰ نسخ کا یا منافی سکون کا شوشہ، عدم دوام کا شاخسانہ، سنت غیر مؤکدہ کی تحقیق، غیر فقیہ راویوں کا غیر روایتی نکتہ یہ سب بے بنیاد باتیں ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس سنت کو ثابت کرنے کے لئے ایک مستقل رسالہ ''جزء رفع الیدین'' لکھا ہے جو استاذی المکرّم حضرت شاہ بدیع الدین راشدی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق سے مطبوع ومتداول ہے۔

سوال اگر امام رکوع جاتے وقت یا سجدے سے اٹھتے وقت اللہ اکبر کہنا بھول جائے یا آہستہ آواز سے پڑھے کہ نمازی نہ سن سکیں تو اس پر سجدہ سہو کرنا ہے یا نہیں، نیز اگر کوئی شخص دوسری یا تیسری رکعت میں امام کے ساتھ شامل ہو تو اسے فوت شدہ رکعات ادا

کرتے وقت دعا استفتاح پڑھنا چاہیے یا نہیں؟

جواب نماز میں داخل ہونے کے لئے تکبیر تحریمہ کہنا فرض ہے، حدیث میں ہے کہ نماز کی تحریم ''اللہ اکبر'' سے، اس کی تحلیل ''السلام علیکم'' ہے۔ [ابوداؤد، الصلوۃ: ٦١٨]

رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو نماز میں داخل ہونے کے لئے تکبیر تحریمہ کا حکم بھی دیا تھا۔ [صحیح بخاری، الاستیذان: ٦٢٥١]

اس کے علاوہ ہر مرتبہ اٹھتے اور جھکتے وقت ''اللہ اکبر'' کہا جائے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ہر مرتبہ اٹھتے وقت، جھکتے وقت، کھڑے ہوتے وقت اور بیٹھتے وقت ''اللہ اکبر'' کہتے ہوئے دیکھا ہے۔

[مسند امام احمد، ص: ٣١٨ ج ١]

صورت مسئلہ میں آہستہ ''اللہ اکبر'' کہنے پر کسی قسم کا سجدہ سہو نہیں ہے، اگرچہ امام کو چاہیے کہ وہ بآواز بلند اللہ اکبر کہے تا کہ مقتدی حضرات سن لیں اور ان کی نماز میں کوئی خلل واقع نہ ہو اور اگر بھول کر اللہ اکبر نہیں کہا جا سکا تو سجدہ سہو کرنا ہوگا، جیسا کہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر سہو کے لئے دو سجدے ہیں۔'' [مسند امام احمد، ص: ٢٨٠ ج ٥]

جب کوئی شخص امام کے ساتھ دوسری یا تیسری رکعت میں شامل ہوتا ہے تو شامل ہونے والے کی پہلی رکعت شمار ہوگی اور دعائے استفتاح پڑھنا پہلی رکعت میں مشروع ہے اگر کسی وجہ سے نہیں پڑھ سکا تو اسے فوت شدہ رکعات پڑھتے وقت اس دعا کو پڑھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ رکعات دعائے استفتاح کا محل نہیں۔

سوال نماز وتر کے بعد رسول اللہ ﷺ نے دو نفل پڑھنے کا حکم دیا ہے، جبکہ ایک حدیث میں ہے کہ رات کے وقت تمہاری آخری نماز وتر ہونی چاہیے اگر کوئی وتروں کے بعد نفل نہ پڑھے تو اس کے متعلق کیا وعید ہے؟

جواب حدیث کی رو سے وتر کو رات کی آخری نماز قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وتر کو اپنی رات کی آخری نماز بناؤ۔'' [صحیح بخاری، الوتر: ٩٩٨]

لیکن احادیث سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے۔ آپ نماز وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھتے اور جب رکوع کرنا ہوتا تو کھڑے ہو جاتے تھے۔

[صحیح مسلم، حدیث نمبر: ٧٣٨]

اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے بھی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز وتر کے بعد بیٹھ کر دو ہلکی پھلکی رکعات پڑھتے تھے۔

[مسند امام احمد، ص: ٢٩٨ ج ٦]

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز وتر کے بعد دو رکعت پڑھتے تھے اور ان میں سورۃ الزلزال اور سورۃ الکافرون پڑھتے تھے۔ [طحاوی، ص: ٢٠٢، ج ١]

وتر کے بعد دو رکعت پڑھنے کے متعلق آپ کا عمل ہی نہیں بلکہ احادیث میں ارشاد بھی منقول ہے، جیسا کہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ کسی سفر میں تھے آپ نے فرمایا: ''یہ سفر بہت مشقت طلب اور بھاری ہوتا

ہے، جب تم میں سے کوئی وتر پڑھے تو اسے چاہیے کہ دو رکعت بھی ان کے بعد پڑھ لے اگر تہجد کے لئے بیدار ہوا تو زہے قسمت! اگر نہ اٹھ سکا تو یہ دو رکعت اس کے لئے کافی ہوں گی۔'' [دار قطنی، الوتر:۱۶۲۵]

اگر چہ مذکورہ بالا حدیث کہ تم نماز وتر کو رات کی آخری نماز بناؤ اور رسول اللہ ﷺ کے وتر کے بعد دو رکعت پڑھنے کے متعلق عمل اور ارشاد میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے لیکن ائمہ حدیث نے ان کے درمیان تطبیق کی متعدد صورتیں بیان کی ہیں، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ نماز وتر کو رات کی آخری نماز قرار دینا اس صورت میں ہے کہ جب وتر رات کے آخری حصے میں پڑھے جائیں۔ [فتح الباری،ص:۲۹۹، ج۲]

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے وتر کے بعد دو رکعت پڑھنے کو جواز پر محمول کیا ہے اور نماز وتر کو رات کی آخری نماز بنانا استحباب پر مبنی قرار دیا ہے۔ [شرح صحیح مسلم]

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ وتر مستقل ایک عبادت ہے، اس لئے ان کے بعد دو رکعت ان کی تکمیل کے لئے بطور سنت ادا کی جاتی ہیں، جیسا کہ مغرب کی نماز کے بعد دو رکعت پڑھی جاتی ہیں۔ [زاد المعاد،ص:۳۲۳، ج۱]

ہمارے نزدیک نماز وتر کے بعد دو رکعت پڑھنا مستحب ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا عمل اور قول یہی ہے لیکن انہیں بیٹھ کر پڑھنے کی بجائے کھڑے ہو کر ادا کرنا چاہیے کیونکہ بیٹھ کر ادا کرنا رسول اللہ ﷺ کا خاصہ ہے، جیسا کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ [صحیح مسلم، صلوۃ المسافرین:۱۷۱۵]

ان رکعات کا ادا کرنا فضیلت کا باعث ہے اگر کوئی انہیں ادا نہیں کرتا تو اس کے متعلق کوئی وعید نہیں، بہتر ہے نماز وتر کے بعد دو رکعت کھڑے ہو کر ادا کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ [واللہ اعلم]

سوال مندرجہ ذیل سوالات کا کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں:

☆ اذان اور اقامت کے درمیان دو نوافل صرف مغرب سے پہلے ہیں یا ہر نماز سے پہلے۔

☆ اگر کوئی فجر کی سنتیں گھر میں پڑھ لے تو جماعت کے لئے مسجد میں آنے کے بعد کیا اسے تحیۃ المسجد ادا کرنا چاہیے۔

☆ حضرت بلال رضی اللہ عنہ تحیۃ الوضو پڑھتے تھے یا تحیۃ المسجد جن پر آپ کو جنت کی بشارت ملی تھی اگر تحیۃ الوضو ہے تو کیا ہر وضو کے بعد یہ نفل پڑھے جا سکتے ہیں؟

جواب اذان اور اقامت کے درمیان نفل پڑھنا مستحب ہیں، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر دو اذانوں (اذان اور اقامت) کے درمیان نماز ہے ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے۔'' پھر آپ نے تیسری مرتبہ یہ الفاظ کہنے کے بعد فرمایا: ''یہ نوافل اس انسان کے لئے ہیں جو پڑھنا چاہے۔'' [صحیح بخاری، الاذان:۶۲۴]

البتہ مغرب کے پہلے دو نوافل ادا کرنے کا بطور خاص ذکر ہے، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ''جب مغرب کی اذان ہو جاتی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ستونوں کے پیچھے کھڑے ہو کر دو نفل ادا کرتے۔'' [صحیح بخاری، الاذان:۶۲۵]

☆ تحیۃ المسجد کے متعلق احادیث میں بہت تاکید آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی جب بھی مسجد میں داخل

ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت ادا کرے۔'' [صحیح بخاری، الصلوۃ: ۴۴۴]

حتی کہ اگر کوئی آدمی جمعہ کے دن دوران خطبہ آئے تو اسے بھی تحیۃ المسجد ادا کرنے کا حکم ہے۔ [صحیح مسلم، الصلوۃ: ۸۷۵]

اگر کوئی گھر میں فجر کی سنت پڑھنے کے بعد مسجد میں آتا ہے تو اسے بھی تحیۃ المسجد ادا کرنا چاہیے، کیونکہ ان کے ادا کرنے کا ایک سبب ہے جب بھی وہ سبب آموجود ہوگا، نماز ادا کی جاسکتی ہے۔ سببی نوافل کے علاوہ دیگر نفل اوقات ممنوعہ میں ادا نہیں کرنا چاہییں۔

☆ ہر وضو کے بعد بھی کچھ نفل پڑھنے چاہییں، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز فجر کے وقت حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اے بلال! مجھے آپ اپنے اسلام لانے کے بعد کوئی سب سے زیادہ پر امید عمل بتاؤ کیونکہ معراج کے وقت میں نے جنت میں اپنے سامنے تمہارے جوتوں کی چاپ سنی ہے۔'' حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں نے رات اور دن کے اوقات میں جب بھی وضو کیا تو لازماً اس قدر نماز پڑھی جتنی میرے لئے پہلے سے لکھ دی گئی تھی۔

[صحیح بخاری، التہجد: ۱۱۴۹]

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو یہ اعزاز تحیۃ الوضو کی بدولت ملا تھا۔ [واللہ اعلم]

جمعہ و عیدین

جمعہ وعیدین

سوال اکثر خطبا اور واعظین حضرات اپنے خطبات وتقاریر کے آغاز میں عربی خطبہ پڑھنے کے بعد عام طور پر درود پڑھنے کا اہتمام کرتے ہیں، بعض حضرات تو عوام کو بھی تلقین کرتے ہیں کہ درود شریف پڑھ لیں اس کی شرعی حیثیت واضح کریں؟

جواب رسول اللہ ﷺ محسن انسانیت ہیں۔ آپ کے احسانات کے پیش نظر اہل ایمان کو ہر وقت، ہر جگہ آپ پر درود بھیجنے کا حکم ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم جہاں کہیں بھی ہو مجھ پر درود بھیجتے رہو، تمہارا درود مجھے پہنچایا جاتا ہے۔'' [مسند احمد]

بلکہ جس مجلس میں اللہ کا ذکر نہ کیا جائے اور رسول اللہ ﷺ پر درود نہ پڑھا جائے وہ قیامت کے دن ایسے نقصان کا باعث ہوگی جس کی تلافی نہیں ہوسکے گی بلکہ حسرت وارمان کے علاوہ وہاں کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ جو مجلس اللہ کے ذکر اور رسول اللہ ﷺ پر دورد پڑھے بغیر برخاست ہوجائے وہ قیامت کے دن نقصان کا باعث ہوگی۔ [بیہقی، ص:۲۱۰، ج۳]

ایک روایت میں ہے کہ ایسے لوگ جنت میں داخل ہونے کے باوجود ایسے افسوس سے دوچار ہوں گے کہ اسے فراموش نہیں کرسکیں گے۔ [مسند احمد، ص:۴۶۳، ج۲]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے ان احادیث کی ثقاہت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مجلس میں اللہ کا ذکر اور رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھنا ضروری ہے۔ [الاحادیث الصحیحہ، ص:۱۶۲، ج۱]

جمعہ کے دن بالخصوص حکم ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر بکثرت درود بھیجنا چاہیے، چنانچہ حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جمعہ کے دن مجھ پر بکثرت درود پڑھا کرو کیونکہ جو آدمی جمعہ کے دن مجھ پر درود بھیجتا ہے اس کا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔'' [مستدرک حاکم، ص:۴۲۱، ج۲]

اس قسم کی ایک روایت حضرت اوس بن اوس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ [سنن ابی داود، الجمعۃ: ۱۰۴۷]

جمعۃ المبارک اور عیدین کے خطبات میں درود پڑھنے کے متعلق بعض اسلاف کا عمل ملتا ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم مقام خیف میں حضرت عبداللہ بن ابی عتبہ کے ہمراہ تھے، اس نے خطبہ میں اللہ کی حمد وثنا کی رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھا اور دعائیں مانگیں، پھر ہمیں نماز پڑھائی۔ [فضل الصلوٰۃ علی النبی ﷺ: ۷۸ تحقیق البانی]

حضرت ابواسحاق عمرو بن عبداللہ السبیعی رحمۃ اللہ علیہ تابعی کہتے ہیں کہ میں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیکھا کہ وہ خطبہ کے وقت امام کی طرف منہ کرکے توجہ سے بیٹھتے، کیونکہ خطبہ میں وعظ ونصیحت اور رسول اللہ ﷺ پر درود وسلام ہوتا تھا۔

[فضل الصلوٰۃ علی النبی ﷺ: ۸۷ تحقیق البانی]

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تالیف ''جلاء الافہام'' میں متعدد مقامات کی نشاندہی کی ہے جہاں رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھنا چاہیے، ان میں سے خطبات جمعہ وعیدین بھی ہیں۔ انہوں نے متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل بیان کیا ہے کہ وہ خطبات میں درود

پڑھا کرتے تھے، چنانچہ عون بن ابی جحیفہ کہتے ہیں کہ میرے والد ابو جحیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خدام میں سے تھے اور منبر کے نیچے بیٹھتے تھے، انہوں نے مجھے بتایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ منبر پر چڑھے، اللہ کی حمد وثنا کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھا پھر فرمایا کہ اس امت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بہتر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ اس طرح حضرت عمرو بن عاص اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کے متعلق بھی بیان کیا ہے کہ وہ اپنے خطبات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے کا اہتمام کرتے تھے۔

[جلاء الافہام مترجم، ص:۲۶۹]

ان شواہد کی بنا پر خطبات جمعہ وعیدین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے میں چنداں حرج نہیں بلکہ ایسا کرنا خیر وبرکت کا باعث ہے۔ اس مقام پر یہ وضاحت کرنا بھی ضروری ہے کہ اذان سے قبل فرض نماز کے بعد یا نماز جمعہ کے بعد کھڑے ہو کر باآواز بلند اجتماعی درود پڑھنا سنت سے ثابت نہیں ہے اور نہ ہی قرون اولیٰ میں اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال کیا خطیب دوران خطبہ یا اختتام خطبہ کے وقت کسی جلسہ یا درس قرآن کا اعلان کرسکتا ہے ہمارے ہاں بعض حضرات کا کہنا ہے کہ خطیب وعظ ونصیحت کے علاوہ کسی دوسرے اعلان وغیرہ کا مجاز نہیں ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب خطبہ جمعہ کا مقصد حاضرین کو وعظ ونصیحت کرنا ہے یہی وجہ ہے، کہ دوران خطبہ سامعین کو ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھنا ضروری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اگر کوئی دوران خطبہ باتیں کرنے والوں کو خاموشی کی تلقین کرتا ہے تو اس کی اس تلقین کو بے ہودہ ولغو قرار دیا گیا ہے۔ [صحیح بخاری، الجمعہ:۹۳۴]

ایک حدیث کے مطابق دوران خطبہ باتوں میں مصروف لوگوں کو بھی بے ہودگی اور لغویات کے مرتکب کہا گیا ہے۔

[ابن ماجہ، الصلوۃ:۱۱۱]

تاہم خطیب کو بعض ناگزیر حالات کی بنا پر اپنے خطبہ سے ہٹ کر سامعین کو کچھ کہنے یا کسی خلاف شریعت کام پر متنبہ کرنے کی اجازت ہے، اسی طرح سامعین کو بھی اجازت ہے کہ وہ اپنی کسی ناگہانی ضرورت کا ذکر دوران خطبہ خطیب سے کریں، جیسا کہ درج ذیل احادیث سے معلوم ہوتا ہے:

☆ سلیک غطفانی جب مسجد میں آئے تو دو رکعت پڑھنے کے بغیر بیٹھ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوران خطبہ ہلکی پھلکی دو رکعت پڑھنے کی تلقین فرمائی۔ [صحیح مسلم، الجمعہ:۲۰۲۳]

☆ حضرت ابو رفاعہ رضی اللہ عنہ دوران خطبہ آئے اور آپ سے التجا کی کہ ایک غریب الدیار دین کے متعلق آپ سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے، چنانچہ آپ نے خطبہ چھوڑ کر اسے دین کی باتیں سکھائیں، پھر خطبہ مکمل فرمایا۔ [صحیح مسلم، الجمعہ:۲۰۲۵]

☆ دوران خطبہ سامعین میں سے کسی نے قحط سالی کا آپ سے ذکر کیا۔ [صحیح بخاری، الجمعہ:۹۳۲]

دوران خطبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھا کر بارش کی دعا فرمائی اگلے جمعہ آپ نے بارش رکنے کی اللہ تعالیٰ سے التجا کی۔

[صحیح بخاری، الجمعہ:۹۳۴]

☆ ایک آدمی دوران خطبہ لوگوں کی گردنوں کو پھلانگتا ہوا آیا تو خطبہ دیتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ "بیٹھ جا! تو نے تکلیف دہ معاملہ کا ارتکاب کیا ہے۔" [ابوداؤد، الجمعۃ:۱۱۱۸]

☆ خطیب دوران خطبہ کسی پراگندہ حال انسان کے لئے سامعین سے تعاون کی اپیل بھی کرسکتا ہے۔ [نسائی، الجمعۃ:۱۴۰۹]

☆ امام ابوداؤد نے ایک عنوان بایں الفاظ میں قائم کیا ہے کہ "کسی ناگہانی حادثہ کی وجہ سے خطبہ منقطع کرسکتا ہے۔" اس عنوان کے تحت ایک واقعہ پیش کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے تھے کہ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما گرتے پڑتے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے، ان کی یہ حالت دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے خطبہ منقطع کردیا اور انہیں پکڑ کر اپنے پاس منبر پر بٹھایا، پھر خطبہ کی تکمیل کی۔ [ابوداؤد، الجمعۃ:۱۱۰۹]

ان احادیث کے پیش نظر خطیب حالات وظروف کو مدنظر رکھتے ہوئے، خطبہ جمعہ کے اختتام پر جلسہ یا درس قرآن وغیرہ کا اعلان کرسکتا ہے، شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہماری مسجد میں عرصہ دراز سے سوا ایک بجے نماز جمعہ ادا کی جاتی تھی مقامی ایک خطیب کے کہنے کے مطابق اس کا وقت ایک بجے کردیا گیا۔ اس طرح مسجد میں اختلاف کا آغاز ہوا جو ختم ہوتا نظر نہیں آتا، براہِ کرم نماز جمعہ کے افضل وقت کی نشاندہی کردیں، شاید اس طرح موجودہ جماعتی اختلاف ختم ہوجائے؟ قرآن وحدیث کے مطابق جواب دیں۔

جواب تمام نمازوں کو ان کے اوقات پر ادا کرنا نہایت ضروری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "نماز پابندی وقت کے ساتھ اہل ایمان پر فرض کی گئی ہے۔" [۴/النساء:۱۰۳]

یہ بات بھی مبنی برحقیقت ہے کہ نماز جمعہ کو نماز ظہر کی جگہ پر ادا کیا جائے، یعنی نماز جمعہ کی ادائیگی کا وہی وقت ہے جو نماز ظہر کو ادا کرنے کا وقت ہے، اب سوال یہ ہے کہ حدیث کے مطابق نماز ظہر کا وقت کون سا ہے۔ اس سلسلہ میں صحیح ترین روایت حسب ذیل ہے: حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہا: "اٹھیے اور نماز ادا کیجئے" چنانچہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ظہر کی نماز اس وقت پڑھائی جب سورج ڈھلنے لگا، پھر اگلے دن ظہر کے لئے آئے اور نماز ظہر اس وقت پڑھائی جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہوچکا تھا۔ آخر میں حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا ان دونوں اوقات کے درمیان نمازوں کا وقت ہے۔ [مسند امام احمد، ص:۳۳۰، ج۳]

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث اوقات نماز کے متعلق صحیح ترین حدیث ہے۔ [ترمذی، المواقیت:۱۴۹]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز ظہر کا وقت زوال آفتاب سے لے کر کسی چیز کا سایہ اس کے برابر ہونے تک ہے۔ آج کل گھڑیوں کا دور ہے، اس لئے نماز ظہر زوال آفتاب سے تقریباً بیس منٹ بعد ادا کرنا افضل ہے لیکن سخت گرمی میں ایک گھنٹہ سے ڈیڑھ گھنٹہ تک تاخیر کی جاسکتی ہے۔ نماز جمعہ کے متعلق حدیث میں ہے کہ اس کا وقت بھی زوال آفتاب سے شروع ہوجاتا ہے۔ [صحیح بخاری، الجمعۃ:۹۰۴]

نیز رسول اللہ ﷺ جمعہ کی نماز سردیوں میں جلد پڑھتے اور سخت گرمی میں دیر سے ادا کرتے۔ [صحیح بخاری، الجمعہ:۹۰۶]

نماز جمعہ اور خطبہ جمعہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا عمل یہ ہے کہ آپ نماز کو لمبا اور خطبہ کو مختصر کرتے تھے، خطبہ میں اللہ کا ذکر ہوتا۔ [نسائی، الجمعہ:۱۴۱۵]

راوی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز جمعہ اور خطبہ جمعہ کے متعلق اعتدال اور میانہ روی اختیار کرتے۔ [ترمذی، الجمعہ:۵۰۷]

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں جمعہ کے دن مختصر خطبہ دینے کا حکم دیتے تھے۔

[ابوداود، الجمعہ:۱۱۰۶]

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا خطبہ کام کی چند باتوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ [ابوداود، الجمعہ:۱۱۰۷]

یہ روایات پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جمعہ کے دن خطبہ کو طویل کر کے افضل وقت سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ جبکہ ایک روایت ہے کہ جمعہ کے دن نماز کو طویل اور خطبہ کو مختصر کرنا خطیب کی عقلمندی اور سمجھداری کی علامت ہے۔ [صحیح بخاری، الجمعہ:۸۶۹]

اس کا یہی مطلب ہے کہ جمعہ کی نماز عام نمازوں سے لمبی اور خطبہ عام خطبوں سے مختصر ہونا چاہیے، ان روایات کی روشنی میں اگر خطبہ ساڑھے بارہ بجے شروع کیا جائے تو ایک بجے یا سوا ایک بجے نماز کو کھڑا کر دیا جائے۔ یہ افضل وقت ہے اس سے تجاوز کسی صورت میں نہیں ہونا چاہیے، بہرحال خطبہ میں بے جا طوالت جو نماز میں تاخیر کا باعث ہو کسی صورت میں مستحسن نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہم اپنی بعض مجبوریوں کی وجہ سے مسجد میں عیدین کی نماز ادا کرتے ہیں بعض حضرات اعتراض کرتے ہیں کہ ایسا کرنا خلاف سنت ہے، کیا کسی مجبوری کے پیش نظر مسجد میں نماز عید نہیں پڑھی جا سکتی؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں ہماری راہنمائی فرمائیں۔

جواب بلاشبہ رسول اللہ ﷺ زندگی بھر عیدین کی نماز کھلے میدان میں ادا کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ اس کے لئے مسجد نبوی کی دائیں جانب ''بقیع'' کا انتخاب کرتے، وہاں بے شمار خودرو درخت تھے ان کے درمیان عیدین کی نماز ادا کرنے کے لئے آپ نے ایک جگہ مخصوص کی تھی، یہ بقول حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ مسجد نبوی سے ایک ہزار فٹ دور تھی۔ [فتح الباری، ص:۵۷۹، ج۲]

نماز استسقاء پڑھنے کے لئے بھی اسی جگہ کا انتخاب کرتے تھے۔ حضرت نجاشی کی غائبانہ نماز جنازہ بھی اس مقام پر ادا کی گئی، آج کل وہاں مسجد غمامہ تعمیر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں نماز استسقاء کے دوران ایک بادل نے رسول اللہ ﷺ پر سایہ کئے رکھا تھا، لہٰذا آج کل مسجد غمامہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق یہ جگہ مسجد نبوی کے باب السلام سے تقریباً 1500 فٹ کے فاصلے پر ہے۔ نویں صدی ہجری تک اسی مسجد میں عیدین کی نماز ادا کی جاتی رہی، پھر مسجد نبوی کے کشادہ ہونے کے باعث اسی مسجد میں نماز عیدین کا اہتمام کیا جانے لگا۔ الغرض رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں مدینہ منورہ کی آبادی انتہائی محدود تھی مسجد نبوی کے دائیں بائیں گھنے جنگلات تھے بائیں جانب بقیع الغرقد، یعنی جنت البقیع تھا اب وہاں جنگلات کا نام و نشان تک نہیں ہے مسجد نبوی بہت کشادہ ہو چکی ہے صرف ایک اور مرحلہ توسیع سے شاید رسول اللہ ﷺ کی عیدگاہ مسجد نبوی کا حصہ بن جائے، بہرحال نماز عید کھلے میدان میں ادا کرنے کا مقصد شوکت اسلام کا اظہار تھا جو آج کل ناپید ہے، کیونکہ ہمارے ہاں محلے کی مسجد کی انتظامیہ خود اپنی عید کا اہتمام

کرتی ہے اس سلسلہ میں وہ خود کفیل بھی ہے ہمارے اہل حدیث حضرات کا بھی یہی حال ہے وہ بھی ایک جگہ نماز عید ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں جس مسجد میں جمعہ ہوتا ہے وہاں عید پڑھنے کا اہتمام کیا جاتا ہے، پھر شہری آبادی میں کھلے میدان ناپید ہیں زیادہ سے زیادہ سکولوں، کالجوں میں کھیلنے کے لئے گراؤنڈ یا پبلک پارک یا ہسپتال وغیرہ میں کھلی جگہ میسر آ سکتی ہے۔ وہ بھی موجودہ انتظامیہ کی مرہون منت ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق بہتر اور افضل ہے کہ نماز عیدین ادا کرنے کے لئے کسی کھلی جگہ کا انتخاب کیا جائے تا کہ ظاہری طور پر ہمارا عمل اسوۂ نبوی کے مطابق برقرار رہے، اگر کسی وجہ سے ایسا کرنا ممکن نہیں تو نماز عیدین مسجد میں ادا کی جا سکتی ہیں۔ لیکن مجبور خواتین کے لئے الگ اہتمام کرنا ہوگا کیونکہ اپنی مجبوری کی وجہ سے وہ مسجد میں نہیں آ سکتیں، رسول اللہ ﷺ نے انہیں مسلمانوں کی دعاؤں میں شمولیت اختیار کرنے کی بہت تاکید کی ہے۔ اصول فقہ کا قانون ہے کہ مجبوری کے پیش نظر ممنوع اشیاء بھی جائز ہو جاتی ہیں۔ جب کہ نماز عید کا مسجد میں ادا کرنا ممنوع نہیں بلکہ افضل اور غیر افضل کا فرق ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال بیشتر احباب عیدین کی نماز کے متعلق پوچھتے ہیں کہ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کا وقت کیا ہے؟

جواب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں نماز عیدین کے متعلق ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے ''عید کے لئے صبح سویرے جانا۔'' پھر انہوں نے ایک معلق روایت کا حوالہ دیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''ہم نماز عید سے اس وقت فارغ ہو جاتے تھے جب وقت تسبیح، یعنی نفل پڑھنا جائز ہو جاتا ہے۔'' [صحیح بخاری، کتاب العیدین: ۱۰]

اس معلق روایت کو امام ابوداود نے اپنی مکمل سند کے ساتھ ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ جب لوگوں کے ہمراہ نماز عید پڑھنے گئے تو امام نے عید پڑھانے میں دیر کر دی، آپ نے اس تاخیر کا شدت سے انکار کرتے ہوئے فرمایا: ''ہم تو (عہد نبوی) میں اس وقت نماز عید سے فارغ ہو جاتے تھے۔'' اس وقت چاشت کا وقت تھا۔ [ابوداود، الصلوٰۃ: ۱۱۳۵]

طبرانی میں ہے یہ اشراق کا وقت تھا۔ [عمدۃ القاری، ص: ۱۸۱، ج ۵]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں دوسری حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس دن ہمارا پہلا کام نماز پڑھنا، پھر قربانی کرنا ہے، جس نے ایسا کیا اس نے ہماری سنت کو پا لیا۔'' [صحیح بخاری، العیدین: ۹۶۸]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ اس دن کے آغاز میں نماز عید کی تیاری کے لئے اور کسی چیز میں مصروف نہیں ہونا چاہیے، تیاری کے بعد جلدی روانہ ہونا چاہیے، یہ اس بات کا متقاضی ہے کہ نماز عید کے لئے جلدی کرنا چاہیے۔ [فتح الباری، ص: ۵۸۹، ج ۲]

ان احادیث کا تقاضا ہے کہ نماز عید طلوع آفتاب سے پہلے نہیں پڑھی جا سکتی ہے اور نہ ہی عین طلوع کے وقت پڑھنا چاہیے کیونکہ یہ کراہت کے اوقات ہیں۔ طلوع آفتاب کے بعد جب نوافل پڑھنے کا وقت ہوتا ہے تو نماز عید کے وقت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ شارح بخاری ابن بطال نے اس پر فقہا کا اجماع نقل کیا ہے۔ [شرح بخاری ابن بطال، ص: ۵۶۰، ج ۲]

نماز عید کا آخری وقت زوال آفتاب ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ایک مرتبہ زوال آفتاب کے بعد چاند نظر آنے کی اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا: ''تمام لوگ کل صبح نماز عید کے لئے عید گاہ پہنچیں۔'' [ابوداود، الصلوٰۃ: ۱۱۵۷]

اگر اس وقت نماز عید پڑھنے کی گنجائش ہوتی تو آپ اسے کل آئندہ تک مؤخر نہ کرتے، اس کا واضح نتیجہ یہ ہے کہ نماز عید کا

آخری وقت زوال آفتاب تک ہے۔ نماز عید کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وتابعین رحمۃ اللہ علیہم کا طرز عمل حسب ذیل ہے:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نماز فجر پڑھتے، پھر اس حالت میں عید گاہ چلے جاتے، حضرت سعید بن مسیب بھی ایسا کرتے تھے۔ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ اپنے بیٹوں سمیت کپڑے وغیرہ پہن کر تیاری کر کے مسجد کی طرف جاتے نماز فجر پڑھ کر وہیں بیٹھے رہتے، جب طلوع آفتاب ہوجاتا تو چاشت کے دو نفل پڑھ کر عید پڑھنے کے لئے عید گاہ چلے جاتے۔ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما دن چڑھے عید گاہ جاتے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بھی عید پڑھنے کے لئے اپنے گھر سے دن چڑھے روانہ ہوتے تھے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب سورج خوب روشن ہوجائے تو عید گاہ جانا چاہیے، البتہ عید الفطر اس سے کچھ وقت پہلے پڑھ لی جائے، یہ تمام آثار [عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری، ص:۱۸۲، ج۵] سے نقل کے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر اس وقت پڑھتے تھے جب سورج دو نیزے کے برابر ہوجاتا، اور نماز عید الاضحیٰ اس وقت پڑھتے جب سورج ایک نیزے کے برابر ہوجاتا۔ [تلخیص، ص:۱۲۷، ج۲]

لیکن اس کی سند میں معلیٰ بن ہلال نامی راوی کذاب ہے، اس لئے یہ حدیث ضعیف ہے۔ [تمام المنۃ، ص:۳۴۷]

ان روایات وآثار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عید پڑھنے کا وقت طلوع آفتاب کے بعد ہے اور چاشت کا وقت سورج کے ایک نیزے بلند ہونے پر ہوجاتا ہے، بلاوجہ اس میں تاخیر کرنا درست نہیں ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس تاخیر پر انکار کرتے تھے عید الاضحیٰ کے دن قربانی کرنی ہوتی ہے، اس لئے اسے عید الفطر سے پہلے پڑھنے میں چنداں حرج نہیں ہے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرسل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران میں تعینات حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو خط لکھا تھا کہ عید الاضحیٰ جلدی پڑھا کرو اور عید الفطر کچھ تاخیر سے ادا کرو۔ [بدائع المنن، ص:۲۷۲، ج۲]

لیکن اس کی سند بھی ضعیف ہے۔ [الروضۃ الندیہ، ص:۳۶۵، ج۱]

آج کل گھڑیوں کا دور ہے، اس لئے ہمیں دور حاضر کے مطابق گھڑیوں کا حساب لگانا ہوگا۔ محکمۂ موسمیات کی تصریحات کے مطابق طلوع فجر سے لے کر طلوع آفتاب تک تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کا وقفہ ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر صبح کی اذان پانچ بجے ہو تو تقریباً ساڑھے چھ بجے سورج طلوع ہوگا، چاشت کا وقت طلوع آفتاب کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد شروع ہوجاتا ہے، ضرورت کے پیش نظر اس میں مزید کچھ تاخیر کی جاسکتی ہے، اس لئے حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ کی تصریح کے مطابق نماز عید کا وقت نماز چاشت کے وقت ہوتا ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک لاہور کے اوقات کے مطابق نماز عید کا وقت سات، ساڑھے سات بجے شروع ہوجاتا ہے، ہمیں چاہیے کہ اس کی تیاری پہلے سے کر رکھیں، اگر طلوع آفتاب کے بعد اس کی تیاری کا آغاز کیا تو نماز عید کا وقت فضیلت نہیں مل سکے گا، البتہ جواز کا وقت زوال آفتاب تک ممتد ہے، اب یہ ہماری ہمت ہے کہ ہم نے عید کے لئے وقت فضیلت کا انتخاب کرنا ہے یا وقت جواز کا سہارا لینا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال کیا امام کو عیدین کے موقع پر جمعہ کی طرح دو خطبے دینا چاہییں یا ایک ہی خطبہ کافی ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب واضح رہے کہ شرعی احکام کے ثبوت کے لئے دلائل درکار ہوتے ہیں جو بالکل صحیح اور اپنا مدعا بیان کرنے میں صریح ہوں، صورت مسئولہ میں ہمارے ہاں معمول یہی ہے کہ عیدین کے موقع پر دو خطبے دیئے جاتے ہیں اور اس پر عاملین حضرات اپنے پاس دلائل بھی رکھتے ہیں، یہ دلائل دو طرح کے ہیں:

① استنادی طور پر بالکل صحیح ہیں لیکن اپنے مدعا پر دلالت کرنے کے لئے صریح نہیں ہیں۔

② اپنے مفہوم میں بالکل صریح ہیں لیکن ان کی اسنادی حیثیت انتہائی مخدوش ہے، فیصلے سے پہلے دلائل مع حیثیت پیش خدمت ہیں، تا کہ نتیجہ اخذ کرنے میں آسانی رہے۔

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر دو خطبے ارشاد فرماتے تھے اور درمیان میں بیٹھ کر ان میں فصل فرماتے۔ [صحیح ابن خزیمہ، ص: ۳۴۹، ج ۲]

اس حدیث پر محدث ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے بایں الفاظ میں عنوان قائم کیا ہے کہ ''یہ باب عیدین میں خطبوں کی تعداد اور ان کے درمیان بیٹھ کر فصل کرنے کے بیان میں ہے۔'' (حوالہ مذکورہ)

اس حدیث سے امام ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے ثابت کیا ہے کہ عیدین کے دو خطبے ہیں اور ان کے درمیان بیٹھ کر فصل کرنا چاہیے، لیکن اس کے متعلق ہماری گزارشات حسب ذیل ہیں:

بلاشبہ یہ حدیث صحیح ہے لیکن مذکورہ مؤقف کے ثبوت کے لئے واضح اور صریح نہیں ہے، چنانچہ محدث العصر علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ حدیث جمعہ کے دونوں خطبوں سے متعلق ہے۔ [تعلیق صحیح ابن خزیمہ، ص: ۳۴۹، ج ۲]

اس موقف کی دلیل یہ ہے کہ اس روایت کے ایک راوی عبید اللہ ہیں جن سے بشر بن فضل مطلق طور پر بیان کرتے ہیں، یعنی اس میں عیدین یا جمعہ کا ذکر نہیں ہے جبکہ ایک دوسرے طریق میں عبید اللہ راوی سے خالد بن حارث بیان کرتے ہیں تو وہ اس میں یوم جمعہ کا ذکر کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ روایت جمعہ کے خطبوں سے متعلق ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن خطبہ ارشاد فرماتے تو درمیان میں بیٹھ کر پھر کھڑے ہوتے۔'' [صحیح مسلم، الجمعہ: ۸۶۱]

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ مذکورہ روایت کا عیدین کے خطبوں سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ واضح طور پر یہ روایت جمعہ کے خطبہ سے متعلق ہے، اس کی تائید حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ وہ جمعہ کے دن کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرماتے، بعد ازاں بیٹھ جاتے اور گفتگو نہ فرماتے، پھر کھڑے ہو کر دوسرا خطبہ ارشاد فرماتے۔ [صحیح مسلم، الجمعہ: ۸۶۲]

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کو مطلقاً بھی بیان کیا ہے اور اس سے انہوں نے جمعۃ المبارک کے دو خطبوں کے متعلق دلیل لی ہے اور اس پر خطبات جمعہ کا ہی عنوان قائم کیا ہے۔

☆ اس سلسلہ میں دلیل کے طور پر دوسری روایت حسب ذیل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن باہر تشریف لے گئے، آپ نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا، پھر درمیان میں بیٹھ کر دوبارہ کھڑے ہوئے۔ [ابن ماجہ، اقامۃ الصلوٰۃ: ۱۲۸۹]

یہ روایت عیدین کے دو خطبوں کے لئے اگرچہ صریح اور واضح ہے لیکن صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ محدث العصر علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ یہ روایت سند اور متن کے اعتبار سے ''منکر'' ہے اور محفوظ یہ ہے کہ اس کا تعلق جمعہ کے خطبہ سے ہے۔ [ضعیف ابن ماجہ، ص:۹۴]

اس روایت کے ناقابل حجت ہونے پر درج ذیل وجوہات ہیں:

☆ اس روایت میں ایک راوی اسماعیل بن مسلم ہے جس کے متعلق محدثین کا فیصلہ ہے کہ وہ ضعیف ہے، چنانچہ علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس روایت میں اسماعیل بن مسلم راوی ہیں جس کے ضعف پر تمام محدثین کا اتفاق ہے۔ [زوائد ابن ماجہ، ص:۴۰۹، ج۱]

علامہ ساعاتی نے بھی اس ''اتفاق محدثین'' کو نقل کیا ہے۔ [فتح الربانی، ص:۱۵۵، ج۶]

☆ علامہ بوصیری نے اس روایت کے ایک دوسرے راوی ابوالحبر کے متعلق بھی لکھا ہے کہ وہ ضعیف ہے۔ (ابن ماجہ حوالہ مذکورہ)

☆ اس روایت میں ابوالزبیر راوی مدلس ہے، جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ اس میں تصریح سماع نہیں، اس بنا پر بھی روایت کا ضعف برقرار ہے۔

☆ امام نسائی نے اس روایت کو نقل کیا ہے لیکن اس میں ''یوم الفطر اور یوم الاضحیٰ'' کے الفاظ بیان نہیں ہوئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روایت کے مذکورہ صریح الفاظ محفوظ نہیں بلکہ کسی راوی کے وہم کا نتیجہ ہیں۔ [نسائی، العیدین:۱۴۵۷]

☆ اس مؤقف کے متعلق تیسری روایت جو بطور دلیل پیش کی جاتی ہے حضرت سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عیدین اذان اور اقامت کے بغیر ادا کی اور آپ کھڑے ہو کر دو خطبے دیتے اور دونوں کے درمیان بیٹھ کر فصل فرماتے۔

[کشف الاستار عن زوائد البزار ا/:۶۵۷]

یہ روایت بھی قابل حجت نہیں ہے کیونکہ علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بزار رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو ''وجادہ'' کے طور پر بیان کیا اور اس کی سند میں ایک ایسا راوی بھی ہے جسے میں نہیں پہچانتا ہوں۔ [مجمع الزوائد، ص:۲۰۳، ج۲]

''وجادہ'' محدثین کی اصطلاح ہے، جس کا یہ مطلب ہے کہ محدث کسی حدیث کو ایک کتاب میں نقل شدہ پاتا ہے اور اس کتاب کے حوالہ ہی سے بیان کر دیتا ہے، چنانچہ اس روایت میں ایک راوی احمد بن محمد بن عبدالعزیز ہے جو اس حدیث کے متعلق بیان کرتا ہے کہ میں نے اس روایت کو اپنے باپ کی کتاب میں پایا، یعنی باپ نے براہِ راست اپنے بیٹے کو حدیث بیان نہیں کی بلکہ بیٹے نے اپنے باپ کی کتاب میں لکھی ہوئی دیکھی اور اسے آگے بیان کرنا شروع کر دیا، مزید برآں محمد بن عبدالعزیز جس کی کتاب سے اس حدیث کو دریافت کیا گیا ہے، اس کے متعلق امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ منکر احادیث بیان کرنے والا ہے۔ [لسان المیزان، ص:۲۶۰، ج۵]

واضح رہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جس راوی کے متعلق یہ لفظ استعمال کریں اس سے روایت لینا ہی جائز نہیں۔ چنانچہ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں کہ جس راوی کے متعلق آپ یہ الفاظ ذکر کریں اس سے روایت لینا صحیح نہیں ہے۔

[میزان الاعتدال، ص:۶، ج۱]

امام ابوحاتم الرازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ تینوں بھائی، یعنی محمد بن عبدالعزیز، عبداللہ بن عبدالعزیز اور عمران بن عبدالعزیز حدیث کے معاملہ میں کمزور ہیں اور ان کی بیان کردہ احادیث صحیح نہیں ہیں۔ [الکامل لابن عدی، ص:۲۲۴۳، ج۶]

نیز اس حدیث کا پہلا راوی جو امام بزار رحمۃ اللہ علیہ کا استاد ہے جس کا نام عبداللہ بن شبیب ہے، اس کے متعلق محدثین کی رائے ہے کہ تاریخی معلومات تو بہت رکھتا ہے لیکن حدیث کے معاملہ میں واہی تباہی مچانے والا ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ حدیث کے معاملہ میں یہ گیا گزرا انسان ہے۔ [لسان المیزان،ص:۳۹۹،ج۳]

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ یہ قابل گردن زدنی راوی ہے۔ [تاریخ بغداد،ص:۴۷۵،ج۹]

ایسے حالات میں اس روایت کی کیا حیثیت رہ جاتی ہیں، چنانچہ مصنف البزار اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے یہ روایت صرف اسی سند سے مروی ہے۔ [مسند البزار،ص:۲۲۱،ج۳]

جب اس روایت کی کوئی دوسری سند ہی نہیں تو اسے ناقابل حجت ہی قرار دیا جائے گا، محدث العصر علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ [تمام المنۃ،ص:۳۴۷]

☆ اس سلسلہ میں آخری اور چوتھی روایت مندرجہ ذیل پیش کی جاتی ہے، عبیداللہ تابعی کہتے ہیں کہ امام کے لئے سنت یہ ہے کہ وہ عیدین میں دو خطبے دے اور درمیان میں بیٹھ کر فصل کرے۔ [بیہقی،ص:۲۹۹،ج۳]

اس روایت کے متعلق ہماری مندرجہ ذیل گزارشات ہیں:

☆ اس میں ایک راوی ابراہیم بن محمد ابی یحییٰ ہے جسے محدثین نے متروک اور کذاب قرار دیا ہے اس کے متعلق امام یحییٰ بن معین لکھتے ہیں کہ یہ کذاب، تقدیر کا منکر اور رافضی تھا۔ [تہذیب،ص:۱۵۸،ج۱]

☆ اگر صحابی "من السنۃ" جیسے الفاظ استعمال کرے تو یقیناً ایسی روایت حکماً مرفوع ہوتی ہے لیکن اگر یہ انداز کسی تابعی کا ہو تو اس میں محدثین کا اختلاف ہے راجح یہ ہے کہ ایسی روایت کو موقوف شمار کیا جائے مذکورہ روایت بھی اسی قبیل سے ہے، چنانچہ علامہ ساعاتی فرماتے ہیں کہ کسی تابعی کا "من السنۃ" کے الفاظ استعمال کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے متعلق ظاہر نہیں اور نہ ہی یہ انداز قابل حجت ہے۔ [فتح الربانی،ص:۱۵۵ج۶]

سید سابق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ تمام احادیث جن میں عیدین کے متعلق دو خطبوں کا ذکر ہے، وہ ضعیف ہیں۔ [فقہ السنۃ،ص:۳۰ ج۱]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی سید سابق رحمۃ اللہ علیہ کے اس فیصلے کو برقرار رکھا ہے۔ [تمام المنۃ،ص:۳۴۷]

اس سلسلہ میں عام طور پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خطبہ جمعہ پر قیاس کرکے عیدین کے بھی دو خطبے ہونے چاہییں، اب ہم اس قیاس کا بھی جائزہ لیتے ہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ قیاس کرتے وقت مقیس اور مقیس علیہ میں وجہ اشتراک ضرور ہونی چاہیے جسے علت کہا جاتا ہے۔ اگر وجہ اشتراک یہ ہے کہ جمعہ کی طرح عیدین کی بھی نماز ہوتی ہے، لہٰذا اس کے بھی جمعہ کی طرح دو خطبے ہونے چاہییں تو اس لحاظ سے تو نماز استسقاء اور نماز خسوف کے بھی دو خطبے ہونے چاہییں، حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل یا فاعل نہیں ہے، پھر خطبہ عیدین اور خطبہ جمعہ میں وجہ افتراق مندرجہ ذیل اشیاء ہیں:

☆ جمعہ کا خطبہ نماز سے پہلے عیدین کا خطبہ نماز کے بعد ہوتا ہے۔

☆ جمعہ کا خطبہ بالعموم منبر پر ہوتا ہے، جبکہ عیدین کے لئے منبر کا ثبوت محل نظر ہے بلکہ عیدین کا خطبہ حسب ضرورت سواری پر بھی

جائز ہے ایسی صورت میں دونوں خطبوں کے درمیان فصل کی کیا شکل ہوگی؟

☆ خطبہ جمعہ کا سماع ضروری ہے جبکہ عیدین کا خطبہ سننا ضروری نہیں بلکہ مستحب ہے۔

آخری گزارش: عیدین کے دونوں خطبوں کے متعلق جو نقلی اور عقلی دلائل کتب حدیث سے دستیاب ہوئے ہیں ہم نے دیانت داری کے ساتھ انہیں پیش کر دیا ہے اور ان پر انتہائی احتیاط کے ساتھ اپنی گزارشات بھی رقم کی ہیں مذکورہ دلائل اور گزارشات کے پیش نظر ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عیدین کے لئے دو خطبے دینا ایک شرعی حکم ہے جس کے ثبوت کے لئے صاف واضح اور صحیح دلائل کی ضرورت ہے جو ہمیں نہیں مل سکے۔ اس کے متعلق صرف لفظ "خطب" استعمال ہوا ہے جو فرد مطلق پر دلالت کرتا ہے اور اس سے مراد صرف ایک خطبہ ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ عام طور پر وعظ و ارشاد فرماتے ہوئے دیا کرتے تھے، دو خطبے صراحت کے ساتھ صرف جمعہ کے لئے ہیں اس کے علاوہ کسی دوسرے مقام پر دو خطبے دینا ہمارے نزدیک پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتے، اس لئے ہمارا موقف یہی ہے کہ عیدین کے لئے صرف ایک ہی خطبہ پر اکتفا کیا جائے۔ چنانچہ برصغیر کے عظیم محدث علامہ عبید اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں لفظ "خطب" میں اس بات کی دلیل ہے کہ عیدین کے لئے صرف ایک ہی خطبہ مشروع ہے اور جمعہ کی طرح اس کے دو خطبے نہیں ہیں نہ ہی ان کے درمیان بیٹھنے کا ثبوت ملتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے عیدین کے دو خطبے دینا قابل اعتبار سند سے ثابت نہیں لوگوں نے جمعہ پر قیاس کرتے ہوئے اسے رواج دے دیا ہے۔ [مرعاۃ المفاتیح، ص: ۳۰۰، ج ۲]

البتہ جو حضرات ضعیف احادیث کے متعلق کچھ نرم گوشہ رکھتے ہیں ان کے نزدیک عیدین کے دو خطبے دینے میں کوئی حرج نہیں ہے اگرچہ ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے، البتہ ہم یہ بات کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ ایسے مسائل کو محل نزاع بنا کر قوت ذہانت کو غلط مقاصد کے لئے استعمال نہ کیا جائے اور اختلاف و انتشار سے اجتناب کرتے ہوئے اپنے اندر برداشت کا مادہ پیدا کیا جائے۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال نماز عید کے بعد مصافحہ، معانقہ کرنے یا نہ کرنے کے متعلق صحیح مؤقف کی وضاحت کریں؟

جواب ہم نے اہل حدیث مجریہ ۲۰ دسمبر ۲۰۰۲ء میں اس مسئلہ کے متعلق تفصیلی فتویٰ لکھا تھا کہ نماز عید کے بعد مصافحہ کرنے یا گلے ملنے کا ثبوت کتاب و سنت سے نہیں ملتا، یہ ایک رسم و رواج ہے جس سے گریز کرنا چاہیے۔ البتہ عید کے بعد ایک دوسرے کو بایں الفاظ مبارک باد دی جا سکتی ہے "تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَمِنكُمْ" یعنی "اللہ تعالیٰ ہم سے اور آپ سے (یہ عبادت) قبول فرمائے۔" اگرچہ اس کے متعلق بھی کوئی مرفوع روایت صحیح سند سے ثابت نہیں ہے، تاہم بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ان الفاظ کے ساتھ عید کے موقع پر مبارک باد دینا صحیح سند سے مروی ہے۔ اب ہم اس کے متعلق مزید گزارشات پیش کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں عید کے بعد جس دھوم دھام سے مصافحہ اور معانقہ کیا جاتا ہے، یہ عمل رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بالکل ثابت نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "جس عمل پر ہماری طرف سے کوئی امر نہ ہو وہ رد کر دینے کے قابل ہے۔" [صحیح مسلم، الاقضیہ: ۴۴۹۳]

پھر مصافحہ اور معانقہ ملاقات اور رخصت ہوتے وقت مشروع ہے لیکن عید کے موقع پر اکٹھے روانگی، پھر واپسی ہوتی ہے اس موقع پر مصافحہ اور معانقہ کا کوئی سبب اور وجہ معلوم نہیں ہوتی مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے اس کے متعلق سوال کیا تو آپ

نے بڑے جامع الفاظ میں جواب دیا فرماتے ہیں: ''مصافحہ بعد سلام آیا ہے، عید کے روز بھی بنیت تکمیل سلام مصافحہ تو جائز ہے، بنیت خصوص عید، بدعت ہے کیونکہ زمانہ رسالت وخلافت میں مروج نہ تھا۔'' [فتاویٰ ثنائیہ، ص:۴۵۰، ج۱]

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے سوال ہوا کہ لوگ عیدین کے موقع پر ''تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَمِنْكُمْ '' سے ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہیں اس کی کیا حیثیت ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''ایسا کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اہل شام حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے اسے بیان کرتے ہیں اس کی سند جید ہے۔'' امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی روایت ہے کہ میں ابتدا میں کسی کو ان الفاظ سے مبارک باد نہیں دیتا، البتہ اگر مجھے کوئی کہتا ہے تو اس کا جواب دے دیتا ہوں علی بن ثابت کہتے ہیں کہ میں نے آج سے پینتیس سال قبل اس مبارک باد کے متعلق سوال کیا تھا تو آپ نے فرمایا کہ ہمارے ہاں مدینہ میں عرصہ دراز سے یہ بات معروف ہے۔ [مغنی ابن قدامہ، ص:۲۹۵، ج۳]

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے سوال ہوا کہ لوگ عید کے موقع پر ایک دوسرے کو ''عید مبارک'' کہتے ہیں کیا شرعی طور پر اس کی کوئی بنیاد ہے اگر ہے تو اس کی وضاحت فرمائیں۔ امام صاحب نے بایں الفاظ جواب دیا: ''عید کے دن نماز کے بعد ''تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَمِنْكُمْ'' سے ایک دوسرے کو مبارک باد دی جا سکتی ہے کیونکہ چند ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ عمل مروی ہے اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جیسے ائمہ کرام نے بھی اس کی رخصت دی ہے اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حکم یا نہی مروی نہیں ہے، اس لئے اس کے کرنے یا نہ کرنے میں چنداں مضائقہ نہیں ہے۔ [فتاویٰ ابن تیمیہ، ص:۲۵۳، ج۲۴]

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی تفصیل ہم پہلے فتویٰ میں بیان کر آئے ہیں، اسے دوبارہ ذکر کیا جاتا ہے:

☆ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب عید کے دن ملتے تو مذکورہ الفاظ سے ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے تھے۔ [فتح الباری، ص:۴۴۶، ج۳]

☆ محمد بن زیاد کہتے ہیں کہ میں حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ تھا جب وہ عید پڑھ کر واپس ہوئے تو انہوں نے انہی الفاظ کے ساتھ ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔ [الجوہر النقی، ص:۳۲۰، ج۳]

کتب حدیث میں بعض ایسی روایات بھی ملتی ہیں جن سے اس کی کراہت معلوم ہوتی ہے اور اسے اہل کتاب کا طریقہ بتایا گیا ہے لیکن وہ روایات محدثین کے قائم کردہ معیار صحت پر پورا نہیں اترتیں۔ [بیہقی، ص:۳۲۰، ج۳]

ان حقائق کے پیش نظر ''تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَمِنْكُمْ'' کے الفاظ سے عید کے موقع پر مبارک باد تو دی جا سکتی ہے لیکن مصافحہ کرنا اور گلے ملنا ایک رواج ہے جس کا ثبوت محل نظر ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے ہاں عام طور پر آج مساجد میں ہی عید پڑھنے کا رواج چل نکلا ہے، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ کھلے میدان میں عید پڑھاتے تھے کیا مسجد میں عید پڑھنے کی گنجائش ہے؟

جواب اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی معمول یہی تھا کہ آپ عیدین کی نماز عیدگاہ میں پڑھاتے تھے جو مسجد نبوی سے ہزار فٹ دور کھلے میدان میں واقع تھی۔ [فتح الباری، ص:۵۷۹ ج۲]

اور وہ بقیع کے پاس تھی۔ [صحیح بخاری، العیدین: ۹۷۶]

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن عید گاہ کی طرف باہر نکلتے تھے۔ [صحیح بخاری، الجمعہ: ۹۵۶]

لیکن اگر کوئی عذر ہو تو باہر کھلے میدان کے بجائے مسجد میں نماز عید ادا کی جا سکتی ہے۔ اصول فقہ کا ایک قاعدہ ہے کہ ضروریات، ممنوع کاموں کو مباح بنا دیتی ہیں، اس لئے کسی معقول عذر کی بنا پر مسجد میں نماز عید ادا کی جا سکتی ہیں، اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی بیان کی جاتی ہے کہ ایک دفعہ عید کے موقع پر لوگوں کو بارش نے آلیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نماز عید مسجد میں پڑھادی۔ [ابوداؤد، الصلوۃ: ۱۱۶۰]

یہ روایت ضعیف ہے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے موقوفاً ایک روایت ہے کہ بارش ہو جائے تو مسجد میں نماز عید پڑھی جا سکتی ہے۔ [بیہقی، ص: ۳۱۰، ج ۳]

دیہاتوں میں تو ایسا ممکن ہے کہ باہر کھلے میدان میں نماز عید پڑھ لی جائے لیکن شہری آبادی میں پارک وغیرہ اتنی تعداد میں دستیاب نہیں ہو سکتے کہ نماز عید وہاں ادا کی جا سکے، اس لئے عدم دستیابی کی صورت میں مسجد میں نماز پڑھ لینے کا جواز ہے، اگرچہ افضل یہ ہے کسی گراؤنڈ یا پارک میں نماز عید گاہ کا اہتمام کیا جائے، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر کھلے میدان میں پڑھنے کا عمل سنت نہ ہوتا تو میں مسجد میں نماز عید پڑھ لیتا۔'' [مصنف ابن ابی شیبہ، ص: ۱۸۵، ج ۲]

اس کے متعلق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ اگر علاقہ کی مسجد ہی وسیع اور کشادہ ہو تو مسجد میں پڑھنا افضل ہے کیونکہ اصل مقصود خواتین و حضرات کا اجتماع ہے اگر وہ مسجد میں ہو سکتا ہے تو باہر نکلنے کی ضرورت نہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل پر مداومت فرمائی ہے، اس لئے باہر کھلے میدان میں نکلنا ہی افضل ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال نماز عید کے لئے جاتے اور واپس آتے وقت راستہ بدلنا چاہیے، نیز اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یہی ہے کہ جب عید کا دن ہوتا تو عید گاہ جانے اور واپس آنے کے لئے راستہ تبدیل کر لیتے تھے۔ [صحیح بخاری، العیدین: ۹۸۶]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب عید کے لئے کسی راستہ سے نکلتے تو واپسی پر کسی دوسرے راستہ سے لوٹتے تھے۔ [مسند امام احمد، ص: ۳۳۸ ج ۲]

اس لئے راستہ تبدیل کرنا مسنون عمل ہے۔ راستہ تبدیل کرنے کی حکمت کے متعلق علما نے لکھا ہے تاکہ قیامت کے دن زیادہ چیزیں اس کار خیر کے لئے گواہی دیں، نیز فقرا و مساکین کی خبر گیری کرنے کے لئے ایسا عمل کیا جاتا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی احوال پرسی ہو سکے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے۔ [مغنی ابن قدامہ، ص: ۲۸۳، ج ۳]

بہر حال اس عمل کو سنت سمجھ کر بجا لانا چاہیے اگرچہ اس کی حکمت کے متعلق ہم کچھ بھی نہ جان سکیں، اس سنت پر عمل کرنے سے ہمیں اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر و ثواب ضرور ملے گا۔ [واللہ اعلم]

سوال ہماری مسجد سے بارہ ایکڑ دور بچیوں کا مدرسہ ہے وہاں سپیکر کی آواز پر بچیاں جمعہ ادا کرتی ہیں، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے جبکہ مسجد اور مدرسہ کے درمیان اتنا فاصلہ ہونے کے ساتھ ساتھ دو مین سڑکیں بھی گزرتی ہیں؟

جواب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''عورتوں کا آدمیوں کے پیچھے نماز پڑھنا'' پھر ایک حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز سے فارغ ہوتے تو (اپنے صحابہ سمیت) کچھ وقت سیدھے منہ بیٹھے رہتے تا کہ خواتین اٹھ کر گھروں کو چلی جائیں۔ [صحیح بخاری، الاذان: ۸۷۰]

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ خواتین مسجد نبوی میں ہی فرض نماز با جماعت ادا کرتی تھیں، اگر ایسا ممکن نہ ہو تو مسجد سے ملحقہ کوئی کمرہ تعمیر کر کے اسے ''مصلی النساء'' قرار دیا جا سکتا ہے مسجد کی چھت پر بھی یہ اہتمام کیا جا سکتا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مسجد کی چھت پر نماز با جماعت ادا کی تھی جبکہ امام نیچے تھا، اسی طرح اگر امام اور لوگوں کے درمیان کوئی دیوار، راستہ وغیرہ بھی حائل ہو تو نماز با جماعت ادا کی جا سکتی ہے لیکن اتصال ضروری ہے کہ مسجد کا ہال اور صحن نمازیوں سے بھر چکا ہے تو مسجد کی چھت یا ملحقہ جگہ کو نماز کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے، لیکن صورت مسئولہ میں جو کیفیت بیان کی گئی ہے کہ مسجد اور مدرسہ کے درمیان تقریباً بارہ ایکڑ کا فاصلہ ہے، پھر درمیان سے دو مین سڑکیں بھی گزرتی ہیں ایسے حالات میں صرف سپیکر کی آواز پر جماعت کو جائز نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس طرح تو ہر گھر والے اپنے گھر میں اپنی خواتین اور بچوں کو اکٹھا کر کے امام کے ساتھ نماز با جماعت کا اہتمام کر سکیں گے، ہمارے رجحان کے مطابق اہل مسجد کو چاہیے کہ وہ خواتین کے لئے نماز جمعہ کا اگر اہتمام کرنا چاہتے ہیں تو مسجد یا اس کے ملحقہ کمرہ میں بندوبست کریں، اس طرح گنجائش تلاش کرنا درست نہیں ہے زیادہ سے زیادہ اتنے فاصلہ کی گنجائش ہو سکتی ہے جہاں امام کی طبعی آواز پہنچ سکے، کیونکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابو مجلز رحمۃ اللہ علیہ سے ایک اثر نقل کیا ہے کہ امام کے ساتھ راستہ یا دیوار حائل ہونے کے باوجود نماز ادا کی جا سکتی ہے بشرطیکہ امام کی تکبیر سنی جا سکتی ہو، پھر آپ نے اس حدیث کا حوالہ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت اپنے حجرہ میں نماز پڑھ رہے تھے تو لوگوں نے حجرہ کی دیوار حائل ہونے کے باوجود آپ کی اقتدا میں نماز با جماعت ادا کی۔ [صحیح بخاری، الاذان: ۷۲۹]

بہر حال صورت مسئولہ میں بارہ ایکڑ کے فاصلے پر خواتین کی جماعت درست نہیں ہے، اس کے لئے مسجد یا اس کے ملحقہ مکان یا کمرہ میں اہتمام کرنا ہو گا۔ [واللہ اعلم]

سوال نماز عید کے لئے دو خطبے ضروری ہیں یا ایک خطبہ سے بھی کام چل سکتا ہے؟

جواب صورت مسئولہ کے متعلق ہمارے ہاں عام معمول یہ ہے کہ عیدین کے لئے دو خطبے دیے جاتے ہیں اور اس کے ثبوت کے لئے عاملین حضرات جو دلائل رکھتے ہیں ان کی دو اقسام ہیں:

① استنادی طور پر وہ صحیح احادیث پر مبنی ہیں لیکن وہ حدیث اپنے مدعا پر دلالت کے لئے صریح نہیں ہے، ان میں عیدین یا جمعہ کا ذکر نہیں بلکہ وہ مطلق ہیں۔

② دلائل کے طور پر جو احادیث پیش کی جاتی ہیں، وہ اپنے مفہوم میں واضح اور صریح ہیں لیکن ان کی اسنادی حیثیت انتہائی مخدوش

ہے، مختصر طور پر دونوں قسم کے دلائل اپنی حیثیت سمیت حسب ذیل ہیں:

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر دو خطبے دیتے تھے اور درمیان میں فصل کرتے تھے۔
[صحیح ابن خزیمہ، ص: ۳۴۹، ج ۲]

بلاشبہ یہ حدیث صحیح ہے لیکن مذکورہ موقف کے ثبوت کے لئے واضح اور صریح نہیں ہے بلکہ محدث العصر علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ حدیث جمعۃ المبارک کے دو خطبوں سے متعلق ہے۔ [حاشیہ صحیح ابن خزیمہ، ص: ۳۴۹، ج ۲]

انہوں نے اس حدیث کے ایک طریق کی نشاندہی کی ہے جس میں جمعہ کے دن کی صراحت ہے۔ [صحیح مسلم، کتاب الجمعہ: ۱۹۹۴]

☆ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذان اور اقامت کے بغیر نماز عید پڑھاتے اور کھڑے ہو کر دو خطبے دیتے، پھر ان دونوں کے درمیان فصل فرماتے تھے۔ [کشف الأستار للبزار، ص: ۳۱۵، ج ۱]

یہ روایت اپنے موقف کی وضاحت میں صریح ہے لیکن اس کی استنادی حیثیت قابل اعتماد نہیں کیونکہ اس کے متعلق علامہ ہیثمی فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں ایک ایسا راوی ہے، جسے میں نہیں پہچانتا۔ [مجمع الزوائد، ص: ۲۰۳، ج ۲]

محدث العصر علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ حدیث نہ تو صحیح ہے نہ حسن کا درجہ رکھتی ہے۔ [تمام المنہ، ص: ۳۴۸]

خطبہ عید کو جمعہ کے خطبوں پر قیاس کرنا بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ عبادات میں قیاس کو کوئی دخل نہیں ہوتا، عیدین کے خطبہ کے متعلق صرف لفظ "خَطَبَ" استعمال ہوا ہے جو فرد مطلق پر دلالت کرتا ہے اور اس سے مراد صرف ایک خطبہ ہے، چنانچہ برصغیر کے عظیم محدث عبید اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ لفظ "خَطَبَ" میں اس بات کی دلیل ہے کہ عیدین کے لئے خطبہ مشروع ہے اور جمعہ کی طرح اس کے دو خطبے نہیں ہیں اور نہ ہی ان کے درمیان فصل کرنے کا کوئی ثبوت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قابل اعتبار سند کے ساتھ دو خطبے دینا ثابت نہیں ہیں۔ لوگوں نے جمعہ پر قیاس کرتے ہوئے اسے رواج دے لیا ہے۔ [مرعاۃ المفاتیح، ص: ۳۰۰ ج ۲]

البتہ جو حضرات ضعیف حدیث کے متعلق اپنے اندر نرم گوشہ رکھتے ہیں ان کے نزدیک عیدین کے دن دو خطبے دینے میں کوئی حرج نہیں ہے جس سے ہمیں اتفاق نہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے اکثر خطبا نماز جمعہ میں سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ الغاشیہ پوری نہیں پڑھتے، بعض حضرات ان سورتوں کے علاوہ اور سورتیں پڑھتے ہیں ان کا استدلال ارشاد باری تعالیٰ کا عموم ہے کہ قرآن سے جو آسان ہو پڑھ لو کیا ان کا یہ عمل مطابق سنت ہے یا مخالفت سنت؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز جمعہ کی رکعات میں سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ الغاشیہ پڑھتے تھے، چنانچہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں عیدوں اور جمعہ کی نماز میں "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلٰى اور هَلْ اَتَاكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ" پڑھتے تھے۔ اگر عید اور جمعہ ایک دن میں جمع ہوتے تو پھر بھی آپ دونوں سورتیں عیدین اور جمعہ کی نمازوں میں پڑھتے۔ [صحیح مسلم، الجمعہ: ۸۷۸]

جمعہ کی نماز میں سورۂ جمعہ اور سورۂ منافقون پڑھنا بھی صحیح روایت سے ثابت ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ

جمعہ کی نماز پڑھائی تو اس میں سورۂ جمعہ اور سورۂ منافقون کو تلاوت کیا اور فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو جمعہ کی نماز میں ان سورتوں کو پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ [صحیح مسلم، الجمعہ:۸۷۷]

ان احادیث کے پیش نظر ہمارے خطبا حضرات کو چاہیے کہ وہ نماز جمعہ میں ان سورتوں کو مکمل پڑھنے کا التزام کریں، سوال میں ذکر کردہ جس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے اس کے عموم کو رسول اللہ ﷺ کے معمولات کے تناظر میں دیکھنا چاہیے، البتہ اگر کوئی ان سورتوں کو نامکمل پڑھتا ہے یا ان کے علاوہ دوسری سورتوں کو نماز میں پڑھتا ہے تو اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں، اگرچہ سنت پر عمل کرنے کے لئے ثواب سے محرومی ہوگی، تاہم ایسا کرنے کا جواز ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک باب بایں الفاظ میں قائم کیا ہے:

''دو سورتوں کو ایک رکعت میں جمع کرنا یا کسی سورت کی ابتدائی یا آخری آیات پڑھنا یا موجودہ ترتیب کے خلاف پڑھنا یہ جائز ہے۔''

پھر آپ نے اس کے جواز کے لئے چند ایک روایات اور آثار بھی پیش کیے ہیں۔ [صحیح بخاری، الاذان:۱۰۶]

البتہ سنت کے احیا کا تقاضا ہے کہ خطبا حضرات عیدین اور جمعہ کی نماز میں وہی سورتیں پڑھنے کی پابندی کریں جو رسول اللہ ﷺ پڑھتے تھے تاکہ اہل حدیث کی علامت اور امتیازی حیثیت برقرار رہے۔ [واللہ اعلم]

سوال بعض اہل حدیث مصنفین حضرات نے درج ذیل احادیث کو اپنی تالیفات میں ذکر کیا ہے ان کی اسنادی حیثیت کے متعلق وضاحت کریں۔

① جس نے عیدین کی دونوں راتوں میں اخلاص اور حصول ثواب کی نیت سے قیام کیا تو اس کا دل، اس دن زندہ رہے گا جس دن دل مردہ ہوجائیں گے۔

② جو پانچ راتوں میں عبادت کرے گا اس کے لئے جنت واجب ہوجائے گی۔ ذوالحجہ کی آٹھویں، نویں اور دسویں رات، عید الفطر کی رات اور شعبان کی پندرھویں رات۔

جواب پہلی روایت موضوع ہے کیونکہ اس میں ایک راوی عمر بن ہارون البلخی ہے۔ جس کے متعلق علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''ابن معین نے اسے کذاب کہا ہے اور محدثین کی ایک جماعت نے اسے متروک قرار دیا ہے۔'' [تلخیص المستدرک، ص:۸۷، ج۴]

میزان الاعتدال میں اس کے متعلق ''کذاب خبیث'' کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ [میزان الاعتدال، ص:۲۲۸، ج۳]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے خودساختہ اور بناوٹی بتایا ہے۔ [سلسلہ الاحادیث الضعیفہ، ص۱۱، ج۲]

مذکورہ الفاظ سنن ابن ماجہ کے ہیں اس میں بقیع بن ولید نامی ایک راوی سخت مدلس ہے۔ محدثین کرام نے اس کی تدلیس سے اجتناب کرنے کی تلقین کی ہے۔ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: عید کی رات رسول اللہ ﷺ صبح تک سوئے رہے اور آپ نے شب بیداری نہیں فرمائی، عیدین کی رات عبادت کرنے کے متعلق کوئی صحیح روایت مروی نہیں ہے۔ [زاد المعاد، ص:۲۱۲، ج۱]

دوسری روایت کو علامہ منذری رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔ [الترغیب والترہیب:۱۵۲/۲]

علامہ منذری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے موضوع یا ضعیف کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کیونکہ انہوں نے بصیغہ تمریض بیان کیا ہے۔

بعض روایات میں پانچ راتوں کے بجائے چار راتوں کے الفاظ ہیں، اس روایت میں عبدالرحیم بن زید العمی راوی کذاب ہے اور اس سے بیان کرنے والا سوید بن سعید بھی سخت ضعیف ہے۔ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت پر موضوع ہونے کا حکم لگایا ہے۔

[سلسلہ الاحادیث الضعیفہ، ص:۱۲، ج۱]

بعض روایات میں عیدالفطر کی رات کو ''لیلۃ الجائزہ'' کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ اسے ابن حبان نے اپنی تالیف کتاب الثواب میں نقل کیا ہے حافظ منذری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے یہ ایک طویل حدیث ہے جس کے الفاظ ہی اس کے موضوع ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ حافظ منذری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔ [الترغیب، ص:۱۰۰، ج۱]

بہر حال ہمارے ہاں بعض بزرگ ان راتوں میں عبادت کا خاص اہتمام کرتے ہیں جبکہ اس سلسلہ میں مروی احادیث قابل اعتماد نہیں ہیں، جیسا کہ گزشتہ سطور میں وضاحت کی گئی ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال جمعہ کے دن دو اذانیں کیوں دی جاتی ہیں کیا ایسا کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے؟

جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک اور حضرت ابو بکر صدیق، اور حضرت عمر فاروق، اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے ابتدائی دور خلافت میں جمعہ کے دن ایک ہی اذان ہوتی تھی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور حکومت میں جب مدینہ کی آبادی میں اضافہ ہوا تو آپ نے لوگوں کی سہولت کے پیش نظر ''زوراء'' نامی پہاڑی پر پہلی اذان دینے کا اہتمام کر دیا، اس پر بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اعتراض بھی کیا تھا، تاہم یہ سلسلہ جاری رہا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں صرف ایک اذان کو ہی برقرار رکھا، اس پہلی اذان کی آج کوئی ضرورت نہیں ہے، تاہم جہاں فتنہ فساد کا اندیشہ ہو وہاں عثمانی اذان کو برقرار رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال جمعہ کے دن دوران خطبہ جھولی اٹھا کر مسجد کی ضروریات کے لئے چندہ جمع کرنا شرعاً کیسا ہے؟

جواب خطبہ جمعہ بھی نماز کی طرح ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''دوران خطبہ اگر کسی نے شور کرنیوالے کو خاموش رہنے کا کہا تو خاموشی کی تلقین کرنے والے نے خود ایک لغو اور بے ہودہ فعل کا ارتکاب کیا ہے۔'' اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب خاموش کروانے والے کے متعلق اس قدر شدید وعید ہے، تو مصروف گفتگو رہنے والا کس قدر سنگین جرم کا مرتکب ہو رہا ہے، اس بنا پر دوران خطبہ سامعین اور حاضرین کو صرف خطبہ کی طرف توجہ رکھنا چاہیے۔ چندہ وغیرہ اکٹھا کرنا سامعین کی توجہ کو منتشر کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس لئے یہ حرکت بھی دوران خطبہ نہیں کرنی چاہیے، البتہ اگر کوئی ہنگامی ضرورت آ پڑی ہے تو امام کو چاہیے کہ وہ خود اس کا اعلان کرے اور حاضرین کو ترغیب دے، لیکن اس کے لئے بھی حاضرین کو نام بنام آواز دینے، پھر سامعین کی گردنیں پھلانگ کر فوراً چندہ دینے کی ضرورت نہیں بلکہ نماز سے فراغت کے بعد اطمینان اور سکون سے حسب استطاعت اس کار خیر میں حصہ ڈالا جا سکتا ہے۔ صورت مسئولہ میں جس طرح سوال اٹھایا گیا ہے اگر واقعی چندہ جمع کرنے کی یہی صورت ہے تو ایسا کرنا مسجد کے تقدس اور احترام و وقار کے بہت منافی ہے کہ انسان جھولی پھیلا کر لوگوں کے سامنے آئے اور مسجد کے لئے چندہ جمع کرے، اہل مسجد کو چاہیے کہ مسجد کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کوئی اور باعزت طریقہ اپنائیں یاد رہے کہ امام کے منبر پر کھڑا ہونے سے لے کر نماز کے لئے کھڑا ہونے تک سب خطبہ ہی شمار ہوتا ہے یہ وضاحت، اس لئے ضروری ہے کہ بعض مقامات پر دونوں خطبوں کے درمیان وقفہ لمبا کر کے یہ ''فریضہ'' سرانجام دیا جاتا ہے، لہٰذا اس سے بھی اجتناب کرنا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

وتر و تہجد

وتر و تہجد

سوال ایک آدمی نے نماز عشاء کے بعد وتر ادا نہیں کیے، اس لئے کہ وہ نیند سے بیدار ہو کر پڑھنا چاہتا تھا۔ جب پچھلی رات بیدار ہوا تو فجر کی اذان ہو چکی تھی یا جب نفل پڑھنا شروع کیے تو فجر کی اذان ہونے لگی، اب کیا نفل پڑھ کر وتر پڑھنے چاہییں یا صرف نفل پڑھنے پر اکتفا کیا جائے، نیز وتروں میں اگر دعا نہ پڑھی جائے تو کیا وتر ہو جائیں گے۔ ہمارے ہاں وتر پڑھنے کے بعد بیٹھ کر دو نفل پڑھے جاتے ہیں ان کی شرعی حیثیت کیا ہے، جبکہ وتر رات کی آخری نماز ہے؟

جواب اس ایک سوال میں کئی سوالات ہیں، ان کے جوابات سے پہلے اس بات کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔ کہ نماز وتر تہجد کا حصہ ہے نماز عشاء کا جز نہیں کہ اس کے ساتھ ہی پڑھنا ضروری ہو، نماز وتر کا وقت نماز عشاء کے بعد سے طلوع فجر تک ہے، جیسا کہ حدیث میں اس کے وقت کی تعیین کی گئی ہے۔ [ابوداؤد، الصلوٰۃ:۱۴۱۸]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ''نماز وتر صبح سے پہلے پڑھو'' [صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین:۷۵۴]

جس انسان کو یہ اندیشہ ہو کہ وہ رات کے آخری اوقات میں بیدار نہیں ہو سکے گا، اسے چاہیے کہ وہ وتر پڑھ کر سوئے، اگر یہ اندیشہ نہ ہو تو رات کے آخری حصہ میں وتر پڑھنا افضل ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''تم میں سے جسے یہ خدشہ ہو کہ وہ رات کے آخری حصہ میں نہیں اٹھ سکے گا تو وہ وتر پڑھ لے، پھر سو جائے۔'' [مسند امام احمد، ص:۳۱۵، ج۲]

حضرت ابو ہریرہ، حضرت سلمان اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہم کو آپ نے وصیت کی تھی کہ عشاء کے بعد سونے سے پہلے وتر پڑھ لیا کریں، اب ترتیب وار جوابات ملاحظہ فرمائیں۔

☆ جو شخص نمازِ فجر سے اٹھا اور اس نے نفل شروع کر دیے اور اس دوران اذان ہو گئی تو ان نوافل کو وتر بنا لے اور انہیں مکمل کر لے اور اگر صبح کی اذان کے بعد بیدار ہو تو وتر ادا کرنے کی دو صورتیں ہیں:

① وہ جب بھی بیدار ہو، اسی وقت وتر ادا کرے، خواہ وہ اذان کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص وتر کے وقت سویا رہے یا اسے وتر پڑھنا بھول جائیں تو جب اسے یاد آئے یا جب وہ بیدار ہو تو اسی وقت پڑھ لے۔''

[جامع ترمذی، الصلوٰۃ:۴۶۵]

ترمذی کی ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ ''جب کوئی نماز وتر سے سو رہے۔ جب صبح کرے تو پڑھ لے۔'' [حدیث نمبر۴۶۹]

② فوت شدہ وتروں کو ادا کرنے کی دوسری صورت یہ ہے کہ وہ دن چڑھے بارہ رکعت پڑھ لے، اس سے وتروں کی تلافی ہو جائے گی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جب نیند یا کوئی تکلیف قیام اللیل سے رکاوٹ بن جاتی تو آپ دن میں بارہ رکعت ادا فرما لیتے۔ [سنن دارمی، الصلوٰۃ:۱۴۳۹]

☆ وتر میں دعائے قنوت کے محل کے تعین میں اختلاف ہے احناف رکوع سے پہلے دعا کرنے کے قائل ہیں، جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے رکوع کے بعد دعا کرنے کا موقف اختیار کیا ہے۔ ہمارا رجحان یہ ہے کہ اگر قنوت وتر کو قنوت نازلہ کی شکل نہیں دی گئی، یعنی اس میں دیگر ہنگامی ادعیہ شامل نہیں کی گئی ہیں۔ تو قنوت رکوع سے پہلے کرنا چاہیے، جیسا کہ حضرت ابی بن

کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین وتر پڑھتے اور دعائے قنوت رکوع سے پہلے پڑھتے تھے۔'' [سنن النسائی، قیام اللیل:۱۷۰۰]

اس روایت کے دو مزید طریق ہیں ان میں بھی رکوع سے پہلے قنوت کرنے کی صراحت ہے۔

① طریق فطر بن خلیفہ۔ [دارقطنی، ص:۳۱، ج۲]

② طریق مسعر بن کدام۔ [بیہقی، ص:۴۱، ج۳]

نیز حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعائے قنوت سکھائی کہ میں وتر ادا کرتے وقت جب قراءت سے فارغ ہو جاؤں تو اسے پڑھوں۔ [کتاب التوحید لابن مندہ، ص:۹۱، ج۲]

اس کے علاوہ حضرت ابن عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت انس رضی اللہ عنہم کا معمول کتب حدیث میں یہی منقول ہے کہ وہ رکوع سے پہلے قنوت کیا کرتے تھے۔ ہاں، اگر وتروں کی دعا کو ہنگامی حالات کے پیش نظر قنوت نازلہ کی شکل دے دی جائے تو رکوع کے بعد دعا کی جائے، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو نماز تراویح باجماعت پڑھانے کے لئے مقرر کیا تو وہ ہنگامی حالت کے پیش نظر مخالفین اسلام کے خلاف بددعا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے دعا کرنے کے بعد ''اللہ اکبر'' کہتے اور سجدہ میں چلے جاتے۔ [صحیح ابن خزیمہ، ص:۱۵۶، ج۲]

☆ وتروں میں دعائے قنوت پڑھنا مسنون ہے اگر رہ جائے تو وتر ہو جاتے ہیں انہیں دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں، جیسا کہ حضرت ابن عمر، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہم، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ایسی روایات ملتی ہیں، کہ وہ وتروں میں دعائے قنوت نہیں کرتے تھے۔ [مختصر قیام اللیل، ص:۲۲۷]

حضرت امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قنوت چھوڑ دینا ایک سنت کا ترک ہے، جس پر سجدہ سہو ضروری نہیں ہے، البتہ حضرت حسن بصری، ابن ابی لیلیٰ، حماد اور سفیان رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ اگر وتروں میں دعائے قنوت رہ جائے تو سجدہ سہو سے تلافی ہو سکے گی۔ [مختصر قیام اللیل، ص:۲۴۲]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تعامل کے پیش نظر ہمارا یہ رجحان ہے کہ وتروں میں قنوت کرنا مستحب اور بہتر ہے اگر رہ جائے تو وتر ہو جائیں گے سجدہ سہو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

☆ وتروں کے بعد دو رکعت پڑھنا مسنون ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مبارک ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کے بعد دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ [مسند امام احمد، ص:۹۸، ج۶]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایات میں صراحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر ادا کرتے اور جب رکوع کرنا ہوتا تو کھڑے ہو جاتے۔ [ابن ماجہ، الصلوٰۃ:۱۱۹۶]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ان کے ادا کرنے کا حکم بھی دیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ''یہ سفر گرانی اور مشقت کا باعث ہے، اس لئے وتر کے بعد دو رکعت پڑھ لی جائیں، اگر صبح کی نماز تہجد کے لئے بیدار ہو جائے تو بہتر بصورت دیگر اس کے لئے یہی دو رکعات کافی ہیں۔'' [صحیح ابن خزیمہ، ص:۱۵۹، ج۲]

اگر چہ بعض روایات میں وتر کو رات کی آخری نماز قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وتر کو تم اپنی رات کی آخری نماز بناؤ۔'' [صحیح بخاری، الوتر: ۹۹۸]

لیکن مندرجہ بالا آپ کا عمل مبارک اور حکم اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ حکم محض استحباب کے لئے ہے وجوب کے لیے نہیں۔ اس بات کی وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ وتر کے بعد دو رکعت پڑھنا امت کے لئے استحباب کے درجہ میں ہے، البتہ انہیں بیٹھ کر ادا کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ ہے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا علم ہوا کہ بیٹھ کر نماز پڑھنا کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی نسبت نصف ثواب ملتا ہے، چنانچہ وہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ بیٹھ کر نماز پڑھ رہے تھے، اس پر انہوں نے تعجب کیا ہے اور عرض کیا کہ مجھے تو آپ کی فلاں بات پہنچی ہے اس پر آپ نے فرمایا: ''میں آپ کی طرح نہیں ہوں۔'' [صحیح مسلم، المسافرین: ۷۳۵]

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کو بیٹھ کر نماز پڑھنے سے بھی پورا ثواب ملتا ہے، اس کے باوجود آپ صرف قراءت بیٹھ کر کرتے تھے رکوع کرنے سے پہلے کھڑے ہو جاتے تھے جو حضرات وتروں کے بعد مکمل دو رکعت بیٹھ کر ادا کرتے ہیں ان کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔

سوال کتاب و سنت کے حوالے سے مندرجہ ذیل سوالات کے جواب درکار ہیں:

☆ نماز تسبیح با جماعت ادا کرنی چاہیے یا انفرادی طور پر وضاحت کریں۔

☆ وتروں میں دعائے قنوت ہاتھ اٹھا کر مانگیں یا ہاتھ باندھ کر یا چھوڑ کر تفصیل سے لکھیں؟

جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو نماز تسبیح پڑھنے کی ترغیب دلائی کہ اسے آپ روزانہ ادا کریں یا ہفتہ میں ایک مرتبہ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو مہینہ میں ایک مرتبہ یا سال میں ایک بار، اگر ایسا نہ کر سکتے ہوں تو کم از کم زندگی میں ایک مرتبہ ضرور پڑھیں۔ [ابوداود، التطوع: ۱۲۹۷]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث کثرت طرق کی بنا پر حسن درجہ کی ہے لیکن اس نماز کو با جماعت ادا کرنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے، اس لئے نماز تسبیح پڑھنے والے کو چاہیے کہ پہلے اس کا طریقہ سیکھے، پھر تنہائی میں اسے اکیلا پڑھے۔ ہمارے ہاں یہ رویہ انتہائی افسوس ناک ہے کہ فرض نمازوں پر توجہ نہیں دی جاتی ہے، البتہ نماز تسبیح ادا کرنے کے لئے بے قراری اور بے تابی کی کیفیت رہتی ہے۔ فرض نمازوں کی پابندی کرنے والوں کے لئے نماز تسبیح بہت فائدہ مند ہے۔

☆ قنوت وتر میں ہاتھ اٹھانے کے متعلق کوئی مرفوع روایت کتب حدیث میں مروی نہیں ہے، البتہ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے نماز وتر میں قنوت کے وقت ہاتھ اٹھانا ثابت ہے، جیسا کہ امام مروزی رحمۃ اللہ علیہ نے قیام اللیل میں ذکر کیا ہے۔ [مختصر قیام اللیل، ص: ۲۳۰]

اسی طرح مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی بعض آثار ملتے ہیں۔ اس سلسلہ میں دو جلیل القدر ائمہ حدیث کا مناظرہ بھی قابل ملاحظہ ہے۔ امام ابو حاتم رازی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ مجھے ایک مرتبہ امام ابو زرعہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آپ قنوت وتر میں ہاتھ اٹھاتے

ہیں؟ میں نے کہا:نہیں، پھر میں نے سوال کیا کہ آپ اٹھاتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ ہاں، میں تو اٹھاتا ہوں۔امام ابوحاتم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی دلیل پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث جس میں ہے کہ وہ یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قنوت وتر میں ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ اس پر امام ابوحاتم نے کہا اس روایت کو نقل کرنے والے لیث بن ابی سلیم ہیں۔ (جو محدثین کے ہاں ثقہ نہیں ہیں) امام ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ کہنے لگے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا عمل بھی قنوت وتر میں ہاتھ اٹھانے کا ہے امام ابوحاتم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب دیا کہ اس میں ایک راوی ابن لہیعہ ہے جو قابل اعتبار نہیں۔امام ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ کہنے لگے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا عمل ہمارے لئے حجت ہے امام ابوحاتم رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے: اسے تو عوف بن ابی جمیلہ نے بیان کیا ہے۔ جو محدثین کے ہاں ناقابل اعتبار ہے امام ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: تمہارے پاس ہاتھ نہ اٹھانے کی کیا دلیل ہے۔امام ابوحاتم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعائے استسقاء کے علاوہ دیگر کسی مقام پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ یہ جواب سن کر امام ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ خاموش ہو گئے۔ [تاریخ بغداد،ص:۷۶،ج۲]

ہمارے نزدیک اس مسئلہ میں توسیع ہے ہاتھ اٹھا کر یا ہاتھ اٹھائے بغیر دونوں طرح سے دعا مانگی جاسکتی ہے، البتہ تکبیر تحریمہ کی طرح ہاتھ اٹھانا، پھر باندھ لینا محل نظر ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال قنوت کے متعلق وضاحت کریں کہ رکوع سے پہلے ہے یا بعد میں، نیز اس میں ہاتھ اٹھائے جائیں یا اٹھائے بغیر بھی قنوت پڑھی جاسکتی ہے جبکہ بخاری شریف میں ہے کہ قنوت رکوع سے پہلے بھی ہے اور بعد میں بھی کی جاسکتی ہے؟

جواب عبادات میں قنوت کی دو اقسام ہیں:

① قنوت نازلہ۔ ② قنوت وتر۔ان دونوں کے لوازمات اور خصوصیات کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

❶ قنوت نازلہ سے مراد جو جنگ، مصیبت، وبائی امراض اور غلبہ دشمن کے وقت دوران نماز پڑھی جاتی ہے، ان ہنگامی حالات کے پیش نظر قنوت نازلہ کے مندرجہ ذیل لوازمات ہیں:

☆ اسے رکوع کے بعد پڑھا جاتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز فجر میں رکوع کے بعد کفار پر لعنت کرتے تھے یہ سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا۔ [صحیح بخاری،التفسیر:۴۵۵۹]

☆ دوران جماعت امام اسے باآواز بلند پڑھتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق احادیث میں آیا ہے کہ آپ قنوت نازلہ باآواز بلند پڑھا کرتے تھے۔ [صحیح بخاری،التفسیر:۴۵۶۰]

☆ قنوت نازلہ ہاتھ اٹھا کر پڑھی جاتی ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ اٹھا کر قنوت نازلہ کیا کرتے تھے۔[مسند امام احمد،ص:۱۳۷،ج۳]

☆ مقتدی حضرات قنوت نازلہ کے لئے آمین کہیں۔ [ابوداود،الوتر:۱۴۴۳]

☆ قنوت نازلہ تمام نمازوں میں کی جاسکتی ہے۔ [مسند امام احمد،ص:۳۰۱ج۱]

☆ ہنگامی حالات ختم ہونے پر موقوف کر دیا جائے۔ [صحیح مسلم،المساجد:۱۵۴۲]

❷ قنوت وتر سے مراد وہ دعا ہے جو وتروں کی آخری رکعت میں پڑھی جاتی ہے، اس کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

☆ یہ دعا صرف وتروں میں پڑھی جاتی ہے اگر صرف وتروں سے متعلقہ دعا پڑھنا ہو تو اسے رکوع سے پہلے پڑھا جائے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ تین وتر ادا کرتے اور دعائے قنوت رکوع سے پہلے پڑھتے تھے۔

[نسائی، قیام اللیل: ۱۷۰۰]

☆ اگر وتر کی دعا کو ہنگامی حالات کے پیش نظر قنوت نازلہ کی شکل دے دی جائے تو اسے رکوع کے بعد پڑھنا چاہیے، جیسا کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما وتروں میں مخالفین اسلام کے خلاف بددعا رکوع کے بعد کرتے تھے۔ [صحیح ابن خزیمہ، ص: ۱۵۶، ج ۲]

☆ رسول اللہ ﷺ سے صراحت کے ساتھ قنوت وتر میں ہاتھ اٹھانا ثابت نہیں، البتہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار ملتے ہیں کہ وہ وتروں میں دعا کرتے وقت ہاتھ اٹھایا کرتے تھے۔ [مختصر قیام اللیل، ص ۲۳۰ طبع ہند]

☆ امام کا باآواز بلند قنوت وتر پڑھنا اور مقتدی حضرات کا آمین کہنا بھی کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے، البتہ قنوت نازلہ پر قیاس کیا جائے تو گنجائش نکل سکتی ہے، ہمارے نزدیک اس مسئلہ میں توسیع ہے۔ قنوت وتر ہاتھ اٹھا کر یا ہاتھ اٹھائے بغیر دونوں طرح کی جا سکتی ہے، کسی ایک طریقے پر تشدد اور دوام درست نہیں ہے، البتہ وتروں میں تکبیر تحریمہ کی طرح ہاتھ اٹھانا، پھر انہیں باندھ لینا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال کے آخر میں صحیح بخاری کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے کہ قنوت رکوع سے پہلے بھی ہے اور رکوع کے بعد بھی کی جا سکتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے عنوانات انتہائی خاموش اور بہت ٹھوس ہوا کرتے ہیں۔

چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابواب وتر میں ایک عنوان بایں الفاظ بیان کیا ہے ''رکوع سے پہلے اور اس سے بعد قنوت کرنا۔'' پھر محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سوال ہوا کہ آیا رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز میں قنوت کی تھی؟ فرمایا: ہاں! پھر سوال ہوا کہ قنوت رکوع سے پہلے تھی، جواب دیا رکوع کے بعد تھوڑا عرصہ کی تھی۔ [صحیح بخاری، الوتر: ۱۰۰۱]

پھر اس کی مزید وضاحت کے لئے عاصم الاحول کی روایت پیش فرمائی، وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نماز میں قنوت کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ رکوع سے پہلے ہے، پھر میں نے عرض کیا کہ فلاں شخص آپ سے بیان کرتا ہے کہ قنوت رکوع کے بعد ہے آپ نے جواب کے طور پر فرمایا غلط کہتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے رکوع کے بعد صرف ایک ماہ قنوت فرمائی۔ یہ اس وقت ہوا جب مشرکین نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے ستر قراء کو شہید کر دیا تو آپ نے رکوع کے بعد صرف ایک ماہ ان پر بددعا فرمائی۔ [صحیح بخاری، الوتر: ۱۰۰۲]

اس روایت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہنگامی حالات کے پیش نظر جو دعا کی جائے وہ رکوع کے بعد ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے جس قنوت کو رکوع سے پہلے بیان کیا ہے وہ ہنگامی حالات کے پیش نظر نہیں بلکہ وہ قنوت وتر ہے کیونکہ جو قنوت ہنگامی حالات کے پیش نظر نہیں بلکہ عام حالات میں کی جاتی ہے وہ صرف قنوت وتر ہے، تفصیلی روایت سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے موقف کی وضاحت ہوتی ہے کہ وہ قنوت وتر رکوع سے پہلے کرنے کے قائل ہیں۔ [واللہ اعلم]
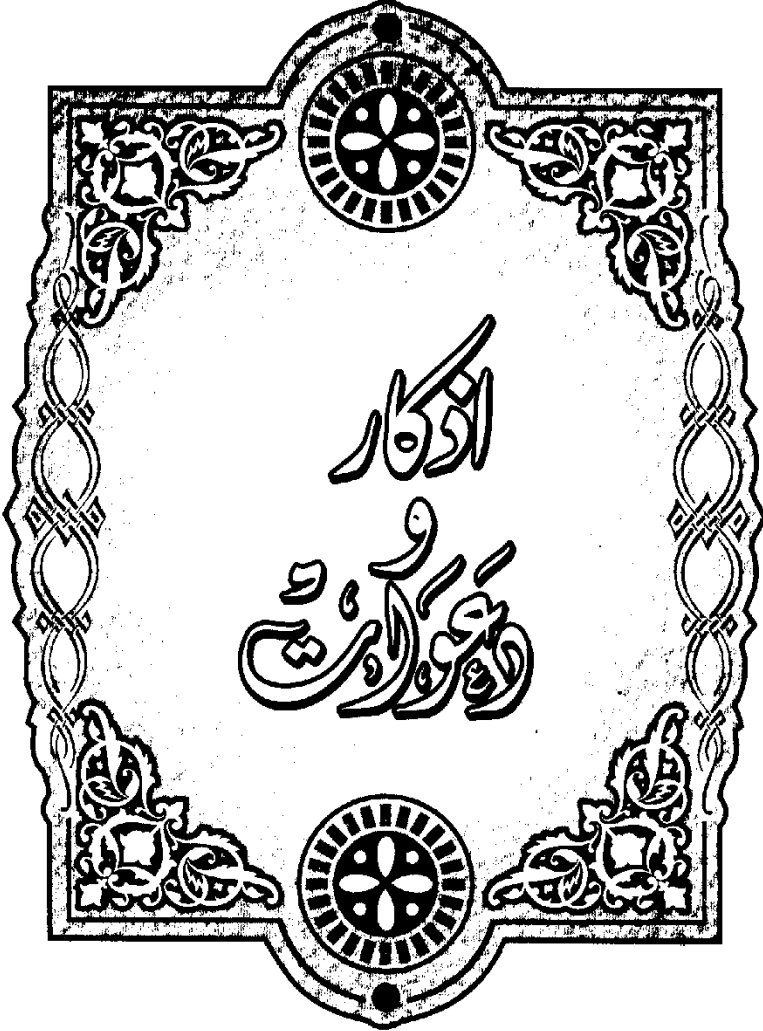
اذکار و دعوات

اذکار و دعوات

سوال قرآن پاک کی تلاوت باعث اجر وثواب ہے۔ رمضان المبارک میں اس کی تلاوت کا ثواب کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ایک کتابچہ اس حوالہ سے تقسیم کیا جاتا ہے جس کا عنوان ہے ''صرف 9 منٹ میں 9 قرآن پاک اور ایک ہزار آیات پڑھنے کا ثواب مل سکتا ہے'' اس میں احادیث کے حوالہ جات بھی موجود ہیں حقیقت حال سے آگاہ فرمائیں؟

جواب احادیث میں بعض سورتوں اور آیات کی فضیلت کے پیش نظر سوال میں مذکورہ اعداد وشمار کو کافی خیال کرلیا گیا ہے، مثلاً:

سورۂ اخلاص کو رسول اللہ ﷺ نے ایک تہائی قرآن پاک کے برابر قرار دیا ہے۔ [صحیح بخاری، فضائل القرآن: ۵۰۱۳]

محدثین کرام نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ قرآن کریم احکام، اخبار اور توحید کے بیان پر مشتمل ہے چونکہ اس میں توحید خالص بیان کی گئی ہے، اس لئے اسے ثلث قرآن کے مساوی قرار دیا گیا ہے، اگرچہ بعض حضرات نے اس کی قراءت کے ثواب کو ایک تہائی قرآن پاک پڑھنے کے ثواب کے برابر بتایا ہے۔ [فتح الباری، ص: ۷۷، ج۹]

لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ انسان سوال میں ذکر کردہ اعداد وشمار کی جمع تفریق میں لگا رہے اور قرآن کریم کی تلاوت کو نظر انداز کردے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ اگر کوئی رمضان المبارک میں عمرہ کرتا ہے تو اسے حج کے برابر ثواب ملتا ہے۔ اس کا مطلب فریضہ حج سے صرف نظر کرنا قطعاً نہیں ہے بعض سورتوں کے فضائل احادیث میں مروی ہیں لیکن وہ احادیث محدثین کے معیار صحت پر پوری نہیں اترتیں، جیسا کہ سورۃ الزلزال کے متعلق ہے کہ وہ نصف قرآن پاک اور سورۃ الکافرون ربع قرآن کے مساوی ہے لیکن اس کی سند میں یمان بن مغیرہ نامی راوی ضعیف ہے، نیز بعض احادیث میں ہے کہ سورۃ النصر ربع قرآن اور آیت الکرسی بھی ربع قرآن کے برابر ہے لیکن اس کی سند میں ایک راوی سلمہ بن وردان ضعیف ہے، جیسا کہ محدثین کرام نے اس کی وضاحت کی ہے۔ [فتح الباری، ص: ۷۸، ج۹]

مذکورہ کتابچہ میں بعض احادیث مسند دیلمی کے حوالہ سے بیان کی گئی ہیں۔ محدثین کرام کے فیصلے کے مطابق اس کتاب کی بیشتر احادیث موضوعہ اور خود ساختہ ہیں۔

بہرحال سورۂ اخلاص کی فضیلت صحیح احادیث سے ثابت ہے لیکن کسی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ یا دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن کریم کی تلاوت کو نظر انداز کرکے صرف سورۂ اخلاص کو تین مرتبہ پڑھنے کو کافی سمجھ لیا ہو، عام مشہور ہے کہ برگد کے دودھ میں والدہ کے دودھ کی تاثیر ہوتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ بچے کو والدہ کا دودھ نہ پلایا جائے، صرف برگد کے دودھ پر اکتفا کرلیا جائے۔ اسی طرح قرآنی آیات سورتوں کی فضیلت اپنی جگہ درست ہے لیکن اعداد وشمار کے پیش نظر صرف انہیں پڑھتا رہے اور قرآن کریم کی تلاوت نہ کرے یہ کسی صورت میں صحیح نہیں ہے۔

سوال وہ کون سے اوقات ہیں جن میں دعا قبول ہوتی ہے، نیز ان شخصیات کی بھی نشاندہی کریں جن کی دعا اللہ تعالیٰ کے ہاں شرف پذیرائی سے نوازی جاتی ہے؟

جواب دعا ایک عبادت ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''دعا عبادت ہے۔'' پھر آپ نے تائید کے طور پر یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

''تمہارے رب نے فرمایا ہے مجھے پکارو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا جو لوگ میری عبادت سے ناک بھوں چڑھاتے ہیں وہ عنقریب ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔'' [۴۰/المؤمن:۶۰]

اس سے معلوم ہوا کہ دعا ہی تو اصل عبادت ہے۔ [ابن ماجہ، الدعا:۳۸۲۹]

اگر دعا کرنے کے بعد ہمیں مطلوبہ چیز حاصل نہ ہو تو عبادت تو کسی صورت میں ضائع نہیں ہوگی، لیکن اس کے کچھ آداب اور شرائط ہیں۔

پہلا ادب یہ ہے کہ خلوص دل سے دعا کی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعا کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور سے سوال نہ کیا جائے، نیز دعا کرنے میں جلد بازی کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔ وہ اس طرح کہ اگر دعا کا نتیجہ سامنے نہ آئے تو انسان اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا ہی ترک کر دے۔ [صحیح مسلم، الذکر:۶۹۳۶]

پھر دعا کرتے وقت خیر و برکت کا سوال کرنا چاہیے، کوئی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ کی جائے۔ [صحیح مسلم، الدعاء:۶۹۳۶]

چوتھی شرط یہ ہے کہ حضور قلب سے دعا کی جائے کیونکہ غفلت شعار دل کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ [مسند امام احمد، ص:۱۷۷، ج۲]

پانچواں ادب یہ ہے کہ دعا کی قبولیت کے لئے رزق حلال کا اہتمام کیا جائے۔ [صحیح مسلم، الزکوٰۃ:۲۳۴۶]

پھر جن اوقات میں دعا قبول ہوتی ہے، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ رات کے آخری حصہ میں کیونکہ اس وقت بندہ اپنے رب کے بہت قریب ہوتا ہے۔ [صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین:۱۷۷۵]

☆ اذان اور اقامت کے درمیان بھی دعا قبول ہوتی ہے۔ [صحیح ابن خزیمہ، ص:۲۲۲، ج۱]

☆ سجدہ کی حالت میں بھی بندہ اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتا ہے اور دعا قبول ہوتی ہے۔ [صحیح مسلم، الصلوٰۃ:۱۰۸۳]

☆ فرض نماز سے فراغت کے بعد قبولیت کا وقت ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو وصیت کی تھی۔ [مسند امام احمد، ص:۲۴۴، ج۵]

☆ بارش کے نزول اور مرغ کے اذان دیتے وقت۔ [ترمذی، الدعوات:۳۴۵۹]

☆ اذان اور معرکہ حق و باطل کے وقت بھی دعا مسترد نہیں ہوتی۔ [ابوداود، الجہاد:۱۴۱۱]

☆ عرفہ کے دن اور قدر کی رات بھی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دعائیں قبول کرتے ہیں۔ [مسند امام احمد، ص:۴۱۹، ج۱]

جن شخصیات کی دعا کو مسترد نہیں کیا جاتا ان میں سے مظلوم، مسافر، والد، حج اور عمرہ کرنیوالا، غازی اور کسی کے لئے غائبانہ دعا کرنے والے سرفہرست ہیں۔ اختصار کے پیش نظر ان کے حوالہ جات ذکر نہیں کئے گئے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے ہاں عام طور پر میت کو قبر میں دفن کرنے کے بعد اس کے سر کی طرف کھڑے ہو کر سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات اور اس کے پاؤں کی طرف سورۂ بقرہ کی آخری آیات پڑھی جاتی ہیں اور اس سلسلہ میں [مشکوٰۃ المصابیح حدیث نمبر ۱۷۱۷] کا حوالہ دیا

جاتا ہے۔اس حدیث اور عمل کے متعلق وضاحت فرمائیں؟

جواب صاحب مشکوٰۃ نے اس روایت کو امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کی معروف کتاب ''شعب الایمان'' کے حوالہ سے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مذکورہ روایت مرفوع نہیں بلکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے موقوف ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نہیں ہے بلکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول اور عمل ہے۔

شعب الایمان کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اسے مرفوع روایت کے طور پر بیان کیا ہے۔[شعب الایمان،ص:۳۰۹،ج۱۶]

لیکن اس روایت میں ایک راوی یحییٰ بن عبداللہ البابلتی انتہائی ضعیف ہے۔ [تہذیب،ص:۲۳۰ج۱۱،میزان ص:۳۹۰،ج۴]

چنانچہ اس روایت کو علامہ ہیثمی نے بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اسے امام طبرانی نے معجم کبیر میں بیان کیا ہے لیکن اس کی سند میں یحییٰ بن عبداللہ البابلتی راوی ضعیف ہے۔ [مجمع الزوائد،ص:۴۴ج۳]

اس کے علاوہ مذکورہ راوی کا شیخ ایوب بن نہیک الحلبی بھی ضعیف ہے۔تفصیل کے لئے اس حدیث پر محدث العصر علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیق دیکھئے۔ [مشکوٰۃ مع تعلیق البانی،ص:۵۳۸،ج۱]

صحیح بات یہ ہے کہ یہ روایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے موقوفاً بیان ہوئی ہے، جیسا کہ صاحب مشکوٰۃ نے امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے لکھا ہے اور انہوں نے خود بھی شعب الایمان میں وضاحت کی ہے، چنانچہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایک دوسری کتاب میں عبدالرحمٰن بن علاء بن اللجلاج کے حوالہ سے اس عمل کو بیان کرکے لکھا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اس عمل کو پسند کرتے تھے۔

[السنن الکبریٰ،ص:۵۶،ج۴]

اس کے متعلق علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ موقوف روایت بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اس میں عبدالرحمٰن بن علاء اللجلاج راوی مجہول ہے۔ [احکام الجنائز،ص:۱۹۲،حاشیہ نمبر۲]

مجہول راوی کون ہوتا ہے اور اس کی بیان کردہ روایت کا کیا حکم ہے؟اس کے متعلق کچھ تفصیل پیش خدمت ہے۔محدثین کرام نے اسباب ضعف کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ راوی کی جہالت بھی حدیث کے ناقابل قبول ہونے کا ایک سبب ہے۔راوی کی جہالت یہ ہے کہ اس کے متعلق متعین طور پر عدالت و جرح کا پتہ نہ چل سکے۔ [نزہۃ النظر،ص:۴۴]

اس قسم کی جہالت جس راوی میں پائی جائے اسے مجہول کہتے ہیں اس کی دو اقسام حسب ذیل ہیں:

(الف) مجہول العین: جس کی توثیق نہ کی گئی ہو اور اس سے بیان کرنے والا صرف ایک راوی ہو۔

(ب) مجہول الحال: جس کی توثیق نہ کی گئی ہو اور اس سے دو یا دو سے زیادہ راوی بیان کریں اسے مستور بھی کہتے ہیں۔

[نزہۃ النظر،ص:۵۰]

مجہول راوی کی روایت کے متعلق اکثر محدثین کا موقف ہے کہ اس کی بیان کردہ روایت قابل قبول نہیں ہوگی اور نہ ہی اسے بطور دلیل پیش کیا جاسکتا ہے۔ [فتح المغیث،ص:۳۱۹،ج۱]

اس وضاحت کے بعد ہم مذکورہ موقوف روایت کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں بھی ایک راوی عبدالرحمٰن بن علاء

مجہول ہے، اس کے متعلق کتب رجال میں کسی قسم کی توثیق بیان نہیں ہوئی اور اس سے بیان کرنے والا صرف ایک شخص مبشر بن اسماعیل الحلبی ہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اس سے روایت بیان نہیں کرتا، چنانچہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس عبدالرحمٰن بن علاء سے ایک روایت بیان کی ہے۔ [کتاب الجنائز:۹۷۹]

اس روایت کو بیان کرنے والا صرف ایک شاگرد مبشر بن اسماعیل الحلبی ہے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ سے عبدالرحمٰن بن علاء کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ عبدالرحمٰن بن علاء بن اللجلاج ہے۔ انہوں نے صرف اسی طریق سے اس کی پہچان کرائی، علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ اس کے متعلق کسی قسم کی جرح وتعدیل کا ذکر کئے بغیر کہتے ہیں کہ اس سے صرف مبشر بن اسماعیل الحلبی بیان کرتا ہے۔ [میزان الاعتدال، ص:۵۷۹، ج۲]

علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو ایک اور سند سے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسے طبرانی نے المعجم الکبیر میں بیان کیا اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ [مجمع الزوائد، ص:۴۴، ج۳]

جب امام طبرانی کی المعجم الکبیر کو دیکھا گیا تو اس میں بھی عبدالرحمٰن بن علاء بن اللجلاج ہے۔ [ص:۴۴۴، ج۱۲، رقم:۱۳۶۱۳]

جس کے متعلق ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ وہ مجہول ہے، مزید برآں اس عمل کے متعلق اس کا باپ علاء بن اللجلاج کہتا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے وہ اس عمل کو بیان کرتے تھے۔ [مجمع الزوائد، ص:۴۴، ج۳]

علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کہ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اگر اس مفروضہ کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو راویوں کی ثقاہت اور بات ہے لیکن صحت حدیث کے لئے سند کا متصل ہونا ضروری ہے جو اس روایت میں مفقود ہے کیونکہ علاء بن اللجلاج ایک تابعی ہے اور وہ بغیر واسطہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ عمل کیونکر بیان کر سکتے ہیں یقیناً درمیان میں کوئی راوی محذوف ہے جس کے متعلق ہمیں علم نہیں کہ وہ کس حیثیت کا حامل ہے، محدثین کرام کی اصطلاح میں اس قسم کی روایت مرسل کہلاتی ہے اور اس کے متعلق جمہور محدثین اور اکثر اصولیین کا فیصلہ ہے کہ نا قابل قبول اور مردود ہوتی ہے، اس لحاظ سے بھی یہ عمل محل نظر ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہم نے جریدہ ''اہلحدیث'' مجریہ، ۲۹ اکتوبر ۲۰۰۴ شمارہ نمبر ۳۹ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ جو حضرات نماز سے فراغت کے بعد اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر ایک مخصوص دعا پڑھتے ہیں، اس کا ثبوت کتاب وسنت سے نہیں ملتا۔ اس کے متعلق ہمارے ایک دیرینہ عزیز لکھتے ہیں:

''آپ نے فرض نمازوں کے بعد سر پر ہاتھ رکھ کر پڑھی جانے والی دعا کے متعلق بحث فرمائی، ہمارے ہاں عام طور پر یہ عمل نہیں کیا جاتا لیکن یکم ستمبر ۲۰۰۳ء کے صحیفۂ اہلحدیث میں اس کو قابل عمل اور اس سے متعلقہ حدیث کو حسن لکھا گیا ہے، مفتی صاحب نے روایت میں مذکورہ عثمان الشمام راوی کے ضعف کو معمولی خیال کرتے ہوئے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔ جب میں نے اصل کتاب میں مراجعت کی تو اس سند میں عثمان الشمام نامی راوی سرے سے موجود ہی نہیں بلکہ وہ اس سے پہلی حدیث کی سند میں ہے۔ مذکورہ فتویٰ میں سنن نسائی کا حوالہ بھی دیا گیا، مجھے نسائی میں بھی یہ حدیث نہیں مل سکی، اس کے متعلق آپ کسی موقعہ پر وضاحت فرما دیں؟

جواب مذکورہ عمل اور اس سے متعلقہ روایت کی مزید وضاحت کرنے سے پہلے ہم صحیفہ اہلحدیث کے متعلق گزارش کرنا چاہتے

ہیں کہ یہ پندرہ روزہ مؤقر جریدہ جماعت غرباء اہل حدیث کا ترجمان ہے یہ جماعت عرصہ دراز سے مسلک اہل حدیث کی نشر اشاعت میں مصروف عمل ہے۔لیکن اس جماعت کا یہ ترجمان نقل روایت کے سلسلہ میں انتہائی تساہل واقع ہوا ہے کیونکہ جس خودساختہ عمل کو صحیح ثابت کرنے کے لئے اس میں جو کوشش کی گئی ہے وہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ارباب حل وعقد کو فتاویٰ نویسی کے شعبہ پر خصوصی توجہ دینا چاہیے۔

اس بناوٹی عمل کو مولانا رشید احمد نے فتاویٰ رشیدیہ میں بغیر کسی حوالہ کے لکھا ہے۔ [ص:۳۶۳]

علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس عمل کو بحوالہ طبرانی اور مسند البزار دو مختلف الفاظ سے بیان کیا ہے، پھر اس روایت کے ایک راوی زید العمی کے متعلق لکھا ہے کہ اسے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ [مجمع الزوائد،ص:۱۱۰،ج۱۰]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ زید بن الحواری العمی پانچویں درجے کا کمزور راوی ہے۔ [تقریب،ص:۱۱۲]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے ہمیں طبرانی اوسط اور خطیب بغدادی کے حوالہ سے اس روایت کی نشاندہی کی ہے لیکن کثیر بن سلیم راوی کی وجہ سے اس کی سند کو انتہائی کمزور لکھا ہے۔اس کے متعلق امام بخاری اور امام ابوحاتم رحمۃ اللہ علیہما کہتے ہیں کہ یہ راوی ''منکر الحدیث'' ہے۔امام نسائی اور علامہ ازوی رحمۃ اللہ علیہما نے اسے متروک لکھا ہے، واضح رہے کہ جس راوی کے متعلق امام بخاری ''منکر الحدیث'' کہہ دیں اس سے روایت لینا بھی جائز نہیں ہے، جیسا کہ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن قطان سے نقل کیا ہے۔[میزان الاعتدال،ص۵،ج۱]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ مزید لکھتے ہیں کہ مجھے اس روایت کی ایک اور سند ملی ہے جسے محدث ابن السنی نے اپنی کتاب ''عمل الیوم واللیلۃ'' رقم:۱۱۰اور محدث ابونعیم نے اپنی (تالیف حلیۃ الاولیاء ص:۳۰۱ ج۲) میں بایں سند بیان کیا ہے۔**عن سلامة عن زيد العمي عن معاوية بن قرة عن انس رضی اللہ عنه**

اس سند میں ایک راوی سلامۃ الطّویل ہے، جسے محدثین نے کذاب کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روایت کا یہ طریق خودساختہ اور بناوٹی ہے۔ [سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ،رقم:۶۶۰]

سعودی عرب کی فتویٰ کمیٹی نے اس مسئلہ کے متعلق لکھا ہے کہ نماز سے فراغت کے بعد سر پر ہاتھ رکھنا مسنون عمل نہیں ہے بلکہ یہ ایک خودساختہ بدعت ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ''جس نے ہمارے دین میں نیا کام ایجاد کیا جس کا تعلق دین سے نہیں وہ مردود اور نا قابل عمل ہے۔'' [فتاویٰ ہیئۃ کبار العلماء،ص:۳۵۲،ج۲]

جو حضرات فضائل اعمال میں ضعیف روایت کے متعلق نرم گوشہ رکھتے ہیں ان سے گزارش ہے کہ محدثین کے ہاں اس کے لئے کچھ شرائط ہیں جن کا یہاں وجود نہیں کیونکہ

(الف) مذکورہ روایت فضیلت عمل سے متعلق نہیں بلکہ ایجاد عمل کے بارے میں ہے جس کا ثبوت صحیح احادیث سے نہیں ملتا ہے۔

(ب) اس روایت میں معمولی درجے کا ضعف نہیں ہے جس کی تلافی کثرت طرق سے ہوسکتی ہو بلکہ اس کا ضعف سنگین قسم کا ہے۔

اس بنا پر ایسے اعمال سے اجتناب کرنا چاہیے جو قرآن وسنت سے ثابت نہیں ہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال فجر کی سنتیں پڑھنے کے بعد دائیں جانب لیٹنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے، اگر لیٹنا جائز ہے تو اس دوران کونسی دعا پڑھنی

چاہیے؟

جواب فجر کی سنتیں پڑھ کر دائیں جانب لیٹنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور فرمان دونوں سے ثابت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فجر کی دو سنتیں پڑھ لیتے تو دائیں جانب لیٹ جاتے۔ [صحیح بخاری، التہجد: ۱۱۶۰]

اس حدیث پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے "فجر کی دو سنتوں کے بعد دائیں جانب لیٹنے کا بیان" اس کے متعلق آپ کا ارشاد ہے، جسے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی فجر کی سنتیں پڑھ لے تو اپنی دائیں جانب لیٹ جائے۔" [ابوداؤد، التطوع: ۱۲۶۱]

فجر کی دو سنتوں کے بعد دائیں جانب لیٹنا ایک پسندیدہ عمل ہے، لیکن ضروری نہیں جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فجر کی دو سنتیں پڑھ لیتے تو اگر میں بیدار ہوتی تو میرے ساتھ گفتگو کرتے۔ بصورت دیگر آپ اپنے دائیں پہلو پر لیٹ جاتے۔ [صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین: ۱۳۳]

چنانچہ اس حدیث پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے "فجر کی دو سنتوں کے بعد لیٹنے کے بجائے گفتگو کرنا" امام ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی موقف کو اختیار کیا ہے کہ فجر کی دو سنتوں کے بعد لیٹنا ضروری نہیں ہے، چنانچہ انہوں نے اس حدیث پر یوں عنوان قائم کیا ہے۔ "فجر کی دو سنتوں کے بعد لیٹنے کو ترک کیا جا سکتا ہے۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ لوگوں کو اس سے منع کیا کرتے تھے ممکن ہے کہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مبارک اور ارشاد گرامی نہ پہنچا ہو، جیسا حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے۔ [فتح الباری]

ہمارے ہاں عام طور پر فجر کی دو سنتوں کے بعد لیٹنے کے دوران دعا نور پڑھنے کا رواج ہے اس کا کسی حدیث میں صراحت کے ساتھ ذکر نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس دعا کا پڑھنا ثابت ہے لیکن محل کی تعیین کے متعلق مختلف روایات ہیں، مثلاً:

(الف) تہجد سے فراغت کے بعد۔ [الادب المفرد: ۶۹۶]

(ب) نماز یا سجدہ میں۔ [صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین: ۱۸۷]

(ج) فجر کے لئے مسجد کی طرف جاتے وقت۔ [صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین: ۱۹۱]

بہتر ہے کہ فجر کی سنتوں کے بعد لیٹنے سے پہلے اس دعا کو پڑھ لیا جائے کیونکہ دل کی نرمی اور اس میں گداز پیدا کرنے کے لئے یہ کیمیا اثر ہے۔ واضح رہے کہ دعا نور سے مراد "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِيْ قَلْبِيْ نُوْرًا الی آخرہ" ہے۔ فجر کی سنتوں کے بعد درج ذیل دعا کا پڑھنا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے:

"اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَائِيْلَ وَإِسْرَافِيْلَ وَمِيْكَائِيْلَ وَمُحَمَّدٍ النَّبِيِّ ﷺ اَعُوْذُبِكَ مِنَ النَّارِ۔"

[مستدرک حاکم، ص: ۶۲۲، ج ۳]

اسے تین مرتبہ پڑھا جائے۔

سوال ہماری اکثر و بیشتر یہ کیفیت ہوتی ہے کہ دعا کرتے کرتے تھک جاتے ہیں لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہیں ہوتی،

کیا قرآن وحدیث میں قبولیت دعا کے لئے مخصوص شرائط ہیں، اگر ایسا ہے تو ہمیں ان سے آگاہ کریں تا کہ مایوسی کے بادل چھٹ جائیں؟

جواب اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اہل ایمان سے وعدہ کیا ہے کہ تم دعا کرو، میں اسے قبول کروں گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ تم مجھ سے دعا کرو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا، بلاشبہ جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔'' [۴۰/المؤمن:۶۰]

اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ کیا ہے اور وہ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا ،لیکن اللہ تعالیٰ کا مذکورہ وعدہ چند ایک شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔جنہیں دعا کرنے والے کو پورا کرنا ہو گا وہ حسب ذیل ہیں:

☆ انسان کو چاہیے کہ وہ دعا کرتے وقت اخلاص کا ثبوت دے۔اللہ تعالیٰ کی طرف اپنے دل کو حاضر رکھے، نیز اس کی طرف صدق دل سے رجوع کرے، اس بات پر ایمان رکھے کہ وہ دعا قبول کرنے پر قادر ہے۔اس کے بعد قبولیت کی امید سے دعا کرے۔

☆ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے میں اکتاہٹ کا شکار نہ ہو اور جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرے وہ اس طرح کہ قبولیت دعا کے اثرات نہ دیکھ کر دعا کرنا چھوڑ دے، ایسا کرنا انتہائی بدبختی کی علامت ہے۔

☆ دعا کرتے وقت یہ ایمان رکھے کہ مجبور اور بے بس انسان کی دعا صرف اللہ تعالیٰ ہی قبول کرتا ہے اور وہی ہر قسم کی مشکلات کو دور کرنے والا ہے۔اگر کوئی اللہ سے بے نیاز ہو کر دعا کرتا ہے تو اس کی دعا کسی صورت میں قبول نہیں ہوگی۔

☆ رزق حلال کا اہتمام کیا جائے ،حرام خوری قبولیت دعا میں حائل ہو جاتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ ایسے شخص کا ذکر فرمایا، جس نے طویل سفر کیا اور وہ پریشان اور غبار آلودہ ہے وہ اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر کہتا ہے ''اے رب، اے رب'' آپ نے فرمایا: ''کہ ایسے حالات میں اس کا کھانا حرام کا ہے اور پینا بھی حرام کا ہے، اس کا لباس بھی حرام کا ہے اور حرام ہی کے ساتھ اس نے پرورش پائی ایسے حالات میں اس شخص کی دعا کیسے قبول ہو؟'' [صحیح مسلم، الزکوٰۃ:۱۰۱۵]

ان شرائط کے باوجود بھی اگر دعا قبول نہ ہو تو اس میں ضرور اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت کارفرما ہوگی، جسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ ممکن ہے جو چیز اللہ سے مانگی جا رہی ہے وہ مانگنے والے کیلئے بہتر نہ ہو۔یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے کوئی بڑی مصیبت کو دور کرنا چاہتا ہو، یا اس دعا کو قیامت کے دن کے لئے ذخیرہ کرنا چاہتا ہو، اس لئے ہمیں دعا کرتے وقت یقین رکھنا چاہیے کہ وہ ہماری دعاؤں کو سنتا ہے اور قبول کرتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمیں ہماری مطلوبہ چیز ہی دے، بلکہ اس کا متبادل بھی اسے دیا جا سکتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے مقدر میں جو لکھا ہے وہ ہر صورت مل کر رہے گا اور جو ہمارے مقدر میں نہیں لکھا گیا وہ ہمیں کسی صورت میں نہیں مل سکتا۔ایسے حالات میں دعا کرنے کا کیا فائدہ ہے اور یہ کیا کردار ادا کرتی ہے۔کتاب وسنت کی روشنی میں اس الجھن کو حل کریں؟

جواب دین اسلام کے ارکان وشعار کے متعلق اس قسم کے اعتراضات پہلے بھی ہوئے ہیں اور ہمارے اسلاف نے ان کے اعتراضات کے جوابات بھی دیے ہیں۔اس کے متعلق صحیح جواب یہ ہے کہ دنیا کے معاملات کا وقوع پذیر ہونا اسباب کے ساتھ معلق

کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اگر کسی بیج کے متعلق یہ مقدر ہے کہ اس نے اگنا ہے اور پھلنا پھولنا ہے تو اس کی یہ تقدیر اسباب و ذرائع کے بجالانے سے معلق ہوگی۔ اسے زمین میں کاشت کیا جائے گا۔ پھر اسے پانی بھی دیا جائے، زمینی آفات سے اس کی نگرانی بھی کی جائے گی۔ اس کے بعد یہ امید رکھی جاسکتی ہے کہ یہ بیج اُگے گا اور پھلے پھولے گا۔ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس سوال کا جواب اپنے مخصوص انداز میں دیا ہے کہ سوال میں بیان کردہ صورت حال کا تقاضا ہے کہ ہم ہر قسم کے اسباب و ذرائع کو معطل کردیں اور انہیں بالکل عمل میں نہ لائیں کیونکہ اگر ہمارے مقدر میں سیر ہونا لکھا ہے تو ہو کر رہے گا، خواہ ہم کھانا کھائیں یا نہ کھائیں، اسی طرح اگر ہمارے مقدر میں اولاد ہے تو وہ ہو کر رہے گی، خواہ ہم شادی کریں نہ کریں اور شادی کرنے کے بعد بیوی کے پاس جائیں یا نہ جائیں، کیا کوئی عقل مند آدمی اس بات کا اقرار کرتا ہے؟ بلکہ دنیا میں اسے احمق کہا جائے گا، کیونکہ کسی چیز کا وقوع پذیر ہونا اسباب سے معلق ہے، وہ اسباب بھی تقدیر کا حصہ ہیں، ان کی بجا آوری ضروری ہے، ہمارا رزق طے شدہ ہے لیکن اس کے لئے بھاگ دوڑ، محنت مشقت اور ذرائع واسباب کا استعمال کرنا ضروری ہے۔ گھر بیٹھ رہنے سے وہ مقدر حاصل نہیں ہوگا، چنانچہ اس بات کی وضاحت ایک حدیث میں بایں الفاظ ہے۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ’’عمر میں کسی کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے اضافہ ہوتا ہے، بُری تقدیر کو دعا ٹال دیتی ہے اور آدمی بعض اوقات اپنے برے کردار کی وجہ سے رزق سے محروم کردیا جاتا ہے۔‘‘ [مسند امام احمد، ص: ۲۷۷، ج ۵]

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نیکی اور حسن سلوک انسان کی عمر میں اضافہ کا سبب ہے۔ جب اسے عمل میں لایا جائے گا تو سبب، یعنی عمر میں اضافہ ہوگا اور یہ دونوں باتیں، یعنی نیک عمل کرنا اور عمر میں اضافہ ہونا تقدیر کا حصہ ہیں۔ اسی طرح پریشانی یا بیماری میں مبتلا ہونا تقدیر کا حصہ ہے اور دعا یا دوا سے اس کا دور ہونا بھی اللہ کے ہاں لکھا ہوا ہے چونکہ ہم اسباب و ذرائع کو استعمال کرنے کے پابند ہیں۔ اس لئے ان کی بجا آوری بھی ضروری ہے، چنانچہ یہ بات اللہ کے علم میں ہے کہ فلاں آدمی فلاں گناہ کے ارتکاب سے رزق سے محروم ہوگا، جب وہ گناہ کرے گا تو ضرور اس رزق سے محروم ہوگا اگرچہ احتیاطی تدابیر بعض اوقات کارگر ثابت نہیں ہوتیں۔ تاہم دعا ایک ایسی احتیاطی تدبیر ہے کہ یہ کسی صورت میں ضائع نہیں ہوتی، جیسا کہ ایک حدیث میں واضح اشارہ ملتا ہے۔

[مسند امام احمد، ص: ۲۳۴، ج ۵]

سوال کیا نوافل میں قرآن مجید سے دیکھ کر قراءت کی جاسکتی ہے یا نہیں، نیز سونے سے پہلے سورۂ ملک اور سورۂ سجدہ پڑھنے کے متعلق حدیث میں آیا ہے، اگر ان دونوں سورتوں کو نوافل میں پڑھ کر سو جائے تو کیا ایسا کرنا درست ہے؟

جواب نماز میں قرآن پاک سے دیکھ کر قراءت کی جاسکتی ہے لیکن اس پر دوام درست نہیں ہے، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ایک ذکوان نامی غلام جماعت کراتے ہوئے قرآن سے دیکھ کر قراءت کرتا تھا۔ [صحیح بخاری تعلیقا، باب امامۃ العبد]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ امام ابوداود رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تالیف ’’المصاحب‘‘ اور ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مصنف میں اسے موصولاً بیان کیا ہے اور رمضان المبارک میں تراویح پڑھاتے ہوئے وہ ایسا کرتے تھے، بعض حضرات نے عمل کثیر کی وجہ سے اسے ناپسند کیا ہے لیکن اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے کیونکہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے یہ عمل سرانجام پاتا تھا اگر ناپسند ہوتا تو آپ

ضرور منع فرمادیتیں۔ نیز بعض اوقات اس کی ضرورت پڑسکتی ہے جب دوران نماز بچہ اٹھانا جائز ہے تو قرآن پاک اٹھانے میں چنداں حرج نہیں، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی نواسی حضرت امامہ بنت ابی العاص رضی اللہ عنہا کو نماز میں اٹھالیتے تھے۔
[صحیح بخاری، الصلوٰۃ:۵۱۶]

البتہ اسے بطور عادت اپنانا درست نہیں بلکہ زبانی یاد کرکے پڑھنا ہی افضل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا عمل مبارک تھا کہ آپ سونے سے پہلے سورۃ الملک اور سورۃ السجدہ پڑھتے تھے۔ [ترمذی]

لیکن پڑھنے کی کیفیت کا ذکر احادیث میں نہیں ہے۔ اس کے اطلاق کے پیش نظر انہیں نوافل میں پڑھا جاسکتا ہے بہتر ہے کہ کبھی نوافل میں پڑھ کر سوجائے اور کبھی سونے سے پہلے ویسے تلاوت کرے۔ [واللہ اعلم]

سوال دکان میں سامان کی حفاظت کے لئے آیت الکرسی کتنی مرتبہ پڑھنی چاہیے، پھر اسے دکان بند کرنے سے پہلے یا بعد پڑھا جائے، نیز پھونک بھی مارنا چاہیے یا نہیں؟

جواب احادیث میں ہے کہ آیت الکرسی پڑھنے سے انسان، شیاطین سے محفوظ ہوجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ اس کی حفاظت کے لئے تعینات کردیا جاتا ہے بشرطیکہ سوتے وقت بستر پر بیٹھ کر اسے پڑھا جائے۔ [بخاری:۲۳۱۲]

یہ وظیفہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو شیطان نے بتایا تھا جب وہ صدقۃ الفطر چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ تاہم رسول اللہ ﷺ کی تصدیق سے اس وظیفہ کی حقانیت واضح ہوگئی، لیکن سامان وغیرہ کی حفاظت کے لئے بھی ہمارے ہاں اسے پڑھا جاتا ہے، جیسا سوال سے معلوم ہوتا ہے اس کا حدیث میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال یہ کون سی حدیث ہے کہ حافظ قرآن دس یا ستر گناہگاروں کی سفارش کرے گا؟

جواب حدیث میں ہے کہ جس نے قرآن یاد کیا اور اس کے حلال وحرام کی پابندی کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور اپنے اہل خانہ سے ایسے دس افراد کی سفارش کرے گا جن کے متعلق جہنم واجب ہونے کا فیصلہ ہوچکا ہوگا۔ [ترمذی، فضائل القرآن:۲۹۰۵]

لیکن اس حدیث کے متعلق امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے خود ہی وضاحت کردی ہے کہ ایک راوی حفص بن سلیمان کی وجہ سے اس کی سند صحیح نہیں ہے، نیز اس میں کثیر بن زاذان راوی مجہول ہے۔ اس بنا پر یہ حدیث انتہائی کمزور ہے۔ [مرعاۃ المفاتیح ص:۳۴۲، ج۳]

ستر آدمیوں کی سفارش کے متعلق کوئی حدیث ہماری نظر سے نہیں گزری۔ [واللہ اعلم]

سوال دکان میں کرسی پر بیٹھ کر قرآن کی تلاوت کرنا شرعاً کیسا ہے جبکہ پاؤں میں جوتے پہنے ہوئے ہوں؟

جواب رسول اللہ ﷺ سے جوتا پہن کر نماز پڑھنا ثابت ہے، اس حدیث کے پیش نظر جوتا پہن کر قرآن مجید کی تلاوت کی جاسکتی ہے۔ نماز کے لئے تو جوتوں کا پاک ہونا ضروری ہے لیکن تلاوت قرآن کے لئے بہتر ہے کہ جوتے پاک ہوں، ضروری نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی گود میں سر رکھ کر قرآن پڑھنا صحیح احادیث سے ثابت ہے جبکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حالتِ حیض میں ہوتی تھیں۔ بہرحال کرسی پر بیٹھ کر جوتوں سمیت تلاوت قرآن کرنا جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال کوئی وظیفہ یا ورد ہاتھ کے پوروں پر پڑھنا چاہیے یا تسبیح وغیرہ پر ادا کیا جائے؟

جواب شریعت میں تین، سات، دس،، پچیس، تینتیس اور سو تک کوئی بھی وظیفہ پڑھنا مطلوب ہے۔ اس کے بعد پانچ صد، ہزار یا پانچ ہزار تک، اوراد و وظائف پڑھنا ایجاد بندہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ شرعی حد تک وظائف کے لئے اپنی انگلیوں کو استعمال کرتے تھے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ہاتھوں کے پوروں سے تسبیحات پڑھتے دیکھا۔ [ترمذی:۳۶۵۱]

بعض روایات میں دائیں ہاتھ کی وضاحت ہے۔ [ابوداؤد:۱۵۰۲]

پھر آپ نے خواتین اسلام کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی انگلیوں کے پوروں سے تسبیحات کریں کیونکہ قیامت کے دن یہ پورے بول کر گواہی دیں گے۔ [ترمذی:۳۸۳۵]

تاہم بعض متقدمین سے تسبیح کے استعمال کا جواز منقول ہے بشرطیکہ اس سے نمائش مقصود نہ ہو۔ [فتاویٰ ابن تیمیہ،ص:۵۰۶،ج۲۲]

واضح رہے کہ وظائف کے لئے کاونٹر کا استعمال جس سے ٹک ٹک کی آواز پیدا ہو، نمائش اور ریاکاری ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرنا چاہیے یا نہیں؟ راہنمائی فرمائیں۔

جواب دعا کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرنے کے متعلق متعدد احادیث مروی ہیں۔ جنہیں امام ابوداؤد، امام ترمذی اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہم نے بیان کیا ہے لیکن ان کی اسناد انتہائی کمزور ہیں۔ البتہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اور زبیر رضی اللہ عنہ سے دعا کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرنا صحیح سند سے ثابت ہے، اس سلسلہ میں امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ یہ ہے کہ دوران نماز اگر ہاتھ اٹھا کر دعا کی جائے تو چہرے پر ہاتھ نہ پھیرے جائیں، کیونکہ نماز میں کسی ایسے کام کی اجازت نہیں جس کا ثبوت صحیح احادیث سے نہ ملتا ہو، البتہ خارج نماز دعا کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرے جاسکتے ہیں۔ [سنن الکبریٰ،ص:۲۱۲،ج۲]

سوال گیارھویں کے علاوہ کسی دوسرے دن قرآن پڑھ کر ختم دینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب قرآن مجید پڑھ کر ختم دینا ایک مخصوص اصطلاح ہے جس کا ثبوت صالحین سے نہیں ملتا، پیٹ کا دھندہ چلانے کے لئے اس قسم کی باتوں کو ایجاد کیا گیا ہے، گیارہویں کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اسی طرح دوسرے ایام بھی ختم دینے کا کوئی جواز نہیں، قرآن پاک پڑھنا حرام نہیں، بلکہ اسے خلاف سنت استعمال کرنا حرام ہے، لہٰذا اس قسم کی محفل میں شریک ہونا یا کھانا استعمال کرنا شرعاً درست نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال کیا امام دعا کرتے وقت آیت کریمہ میں "انی کنت" کے بجائے "انا کنا" پڑھ سکتا ہے؟

جواب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''عنقریب میری امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو پانی کے استعمال اور دعا کرنے میں حد اعتدال سے تجاوز کریں گے۔'' [ابوداؤد، الوتر:۱۴۸۰]

قرآن وحدیث میں وارد ادعیہ ماثورہ میں تبدیلی بھی حد اعتدال سے تجاوز ہے۔ اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما کو رسول اللہ ﷺ نے ایک دعا سکھائی جس میں یہ الفاظ تھے ''وَنَبِيِّكَ الَّذِيْ اَرْسَلْتَ '' انہوں نے جب اسے دھرایا تو ''وَرَسُوْلِكَ الَّذِيْ اَرْسَلْتَ'' پڑھ دیا، یعنی نبیك کے بجائے رسولك پڑھ دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''نبیك

کے الفاظ ہی یاد کرو۔" یعنی رسول اللہ ﷺ کی تعلیم دی ہوئی دعا میں ترمیم کو آپ نے قبول نہ فرمایا، لہٰذا ہمارے نزدیک نماز جنازہ میں مرد اور عورت کا خیال کرتے ہوئے ضمائر کو بدلنا یا واحد اور جماعت کے پیش نظر مفرد کے صیغے کو جمع لانا صحیح نہیں ہے۔ اس لئے امام کو چاہیے کہ آیت کریمہ پڑھتے وقت اگر مقتدیوں کو شامل کرنا ہے تو الفاظ وہی پڑھے، جو آیت میں موجود ہیں۔ انہیں بدلنے کے بجائے مقتدی حضرات کو نیت میں شامل کرے۔ [واللہ اعلم]

سوال مجھے اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور قرآن مجید سے انتہائی محبت ہے۔ پانچ وقت نماز باقاعدگی سے ادا کرتی ہوں میری دوست کا بھائی حافظ قرآن اور پابند شریعت ہے۔ میں نے اس سے متاثر ہو کر رابطہ کیا اور دل میں اس کے متعلق محبت محسوس کی، لیکن معاشرتی طور پر اپنے والدین کی مرضی کے بغیر ہم اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ کیا میں ایسے شخص کو اللہ سے مانگ سکتی ہوں، اگرچہ یہ پوچھنے والی بات نہیں مگر میں نہیں چاہتی کہ اللہ اس بندے کو میرے لئے شر بنا دے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "انسان برائی کے لئے ایسے ہی دعا کرتا ہے، جیسے بھلائی کے لئے دراصل انسان بڑا جلد باز واقع ہوا ہے۔" [۱۷/بنی اسرائیل:۱۱]

آپ چونکہ عالم دین اور علما کی نمایندگی کرتے ہیں اور میں آپ کی بیٹیوں جیسی ہوں، اس لئے میرے اس سوال کو نظر انداز نہ کریں شاید آپ کے جواب سے دوسروں کا بھلا ہو جائے؟

جواب قارئین کرام! مجھے یہ سوال موبائل سے ایک پیغام کی صورت میں موصول ہوا ہے جو تقریباً دو صفحات پر مشتمل تھا اور اردو لکھنے کے لئے انگریزی زبان کو استعمال کیا گیا تھا، میں نے اپنے طور پر اسے مختصر کیا ہے میں اس پیغام کے حوالہ سے والدین سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنی اولاد پر گہری نظر رکھیں، ان کی بظاہر پارسائی اور دینداری پر اکتفا نہ کریں اس پیغام میں بظاہر دینداری کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ لیکن یہ اس سمندر کی طرح ہے جس کی سطح پر خاموشی ہوتی ہے لیکن اس کی تہہ میں طوفان برپا ہوتا ہے، آپ اپنی اولاد کی محبت میں اس حد تک گرفتار نہ ہوں کہ آپ کو ان کی ہر جائز و ناجائز خواہش کو پورا کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ اپنی ازواج مطہرات کی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے اللہ کی حلال کردہ چیز کو خود پر حرام ٹھہرا لیا تھا تو اللہ نے پوری ایک سورت نازل فرما کر اس کا نوٹس لیا، اس سورت کو بایں الفاظ شروع فرمایا: "اے نبی! جس چیز کو اللہ نے آپ کے لئے حلال کیا آپ اسے حرام کیوں ٹھہراتے ہیں کیا آپ اپنی بیویوں کی خوشی چاہتے ہیں۔" [۶۶/التحریم:۱]

اس سورت میں مرکزی پیغام حسب ذیل ہے "اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اہل و عیال کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں، اس پر تند خو اور سخت گیر فرشتے تعینات ہیں۔" [۶۶/التحریم:۶]

بلاشبہ دور حاضر میں موبائل فون ایک مفید ایجاد ہے، لیکن یہ اب ضرورت کی حدود تجاوز کر کے فضولیات میں داخل ہو چکا ہے۔ اس کی ایک زندہ مثال موجودہ "پیغام" ہے، آخر اس بیٹی نے موبائل کے ذریعے اپنی دوست کے بھائی سے رابطہ قائم کیا، جب کسی وجہ سے ناکامی ہوئی تو دینداری کا سہارا اوڑھ لیا گیا ہے، دراصل یہ ہمارا (والدین) کا قصور ہے کہ ہم نے اس اولاد کی محبت میں گرفتار ہو کر بچے کے ہاتھ میں موبائل دے دیا ہے بلکہ کچھ "سمجھ دار" بچے ٹیوشن وغیرہ پڑھا کر اس سلسلہ میں خود کفیل ہو چکے ہیں اس کے متعلق وہ والدین کے بھی محتاج نہیں ہیں۔ بہر حال اگر والدین محسوس نہ کریں تو میں عرض کروں گا کہ موجودہ دور میں موبائل

ہماری اولاد کو تباہی کے گڑھے کی طرف دھکیل رہا ہے اگر آپ اس پر کنٹرول کرنے کی پوزیشن میں ہیں تو کرلیں بصورت دیگر اگر پانی سر سے گزر گیا تو کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ آپ اس اختصار شدہ پیغام میں بھی بیٹی کی پراگندہ خیالی اور انتشار فکری ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ اس نے ایک لڑکے کی بظاہر دینداری سے متاثر ہو کر از خود اس سے رابطہ کیا نا معلوم ''سلام و پیغام'' کا یہ منحوس سلسلہ کتنی دیر تک چلتا رہا۔ پھر معاشرتی طور پر مایوس ہو کر والدین کی رضا مندی کا لبادہ اوڑھ کر اللہ سے مانگنے کی فکر دامنگیر ہوئی لیکن پھر اس پر بھی ضمیر مطمئن نہ ہوا کہ جسے اللہ سے مانگا جا رہا ہے وہ ہمارے لئے کہیں ''شر'' ہی نہ بن جائے آیت کا حوالہ دے کر ہماری طرف رجوع کیا گیا ہے کہ ایسے حالات میں ''شرع و شریعت'' کیا فتویٰ صادر کرتی ہے ہمارے نزدیک اس کا حل حسب ذیل ہے:

① سب سے پہلے خالی ذہن ہو کر اللہ سے طلب خیر کیا جائے، یعنی استخارہ کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ سے بایں طور پر سوال کیا جائے کہ اگر دینی اور دنیاوی اعتبار سے میری مطلوبہ چیز تیرے ہاں بہتر اور اچھی ہے تو اسے حاصل کرنا میرے لئے آسان کر دے اور اسے میرے مقدر میں کر دے اور اگر دینی اور دنیاوی لحاظ سے یہ چیز میرے لئے شر کا پہلو رکھتی ہے تو اس سے میرا دل اچاٹ کر دے اور اسے مجھ سے دور کر دے، پھر میرے لئے جو بہتر ہے اس کے حصول کے لئے راستہ ہموار کر دے، اللہ کے حضور نہایت عاجزی و انکساری سے دعا کی جائے کہ مطلوبہ شخص اگر میرے لئے ہر لحاظ سے بہتر ہے تو اس کے وسائل پیدا ہو جائیں۔

② ہماری مشرقی روایت کے مطابق بیٹے اور بیٹیاں از خود رشتہ طے کرنے کی بجائے ان کے والدین یہ فریضہ ادا کرتے ہیں، اس لئے تمام معاملات والدین کے ذریعے طے کئے جائیں۔ ''پریشان بیٹی'' کو چاہیے کہ وہ اپنے والدین کو اعتماد میں لے اس کے بعد بات چیت کو آگے بڑھایا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''تم گھروں میں ان کے دروازوں سے ہی آیا کرو۔'' [۲/البقرہ:۱۸۹] دیواروں کو پھلانگ کر گھر میں داخل ہونا عقل مندی نہیں ہے۔

③ اس امر پر غور کر لینا مناسب ہے اگر مطلوبہ متدین شخص شادی شدہ ہے تو اسے ایسی حالت میں قبول کرنا ہوگا کہ پہلی بیوی کو طلاق دلوا کر خود وہاں آباد ہونے کی خواہش غیر اسلامی اور ناجائز ہے حدیث میں اس کی ممانعت ہے۔ [صحیح بخاری، النکاح:۵۱۵۲]

جنائز و زیارت قبور
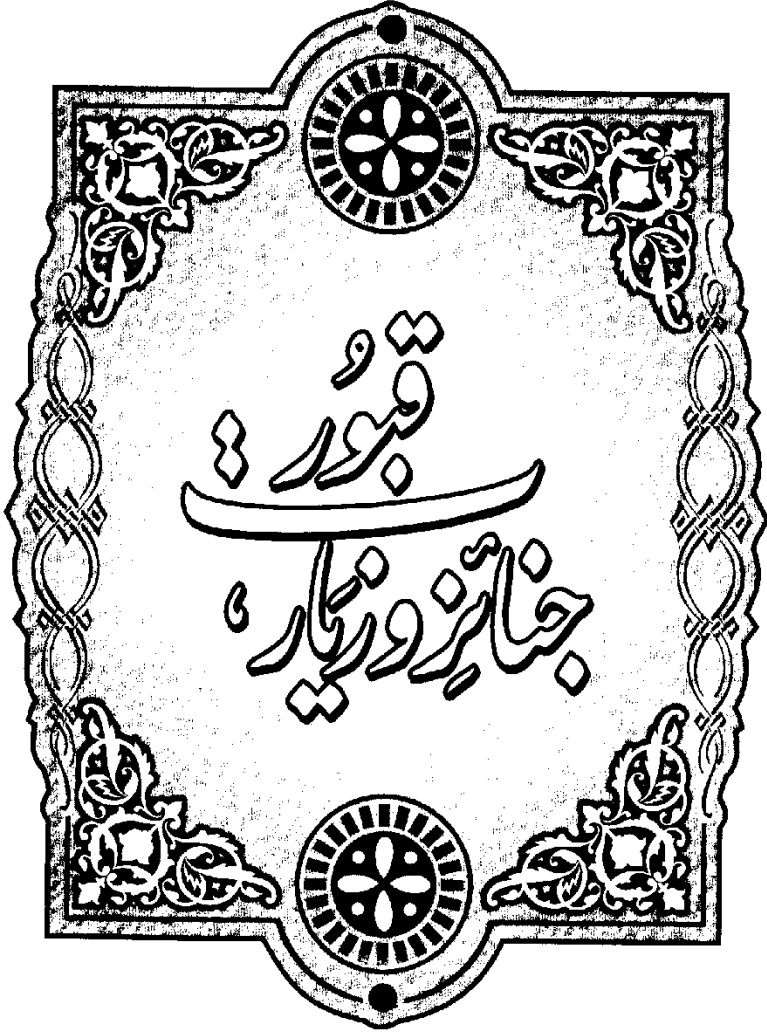
جنائز و زیارت قبور

سوال کتب حدیث میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ جب حسن بن حسن بن علی فوت ہو گئے تو اس کی بیوی نے ان کی قبر پر سال بھر خیمہ لگائے رکھا، نیز حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کی قبر پر خیمہ لگا ہوا دیکھا تو وہاں بیٹھے ہوئے غلام کو کہا کہ اس خیمہ کو اکھاڑ دیا جائے۔ (بخاری) سوال یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں ایسے امور کہاں تک درست تھے اور کیوں ایسے امور سے قبر پرست حضرات دلیل لیتے ہیں کہ قبروں پر مجاور بن کر بیٹھنا جائز ہے وضاحت فرمائیں؟

جواب قبر پرستوں کی عجیب ذہنیت ہے کہ ناجائز امور کو جائز قرار دینے کے لئے جن واقعات کو بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے، ان واقعات میں ہی ان کی تردید موجود ہے لیکن اس تردید کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ سوال میں ذکر کردہ واقعات صحیح بخاری میں موجود ہیں لیکن سائل نے انہیں نامکمل ذکر کیا ہے۔ حقیقت حال کی وضاحت کے لئے ہم انہیں مکمل طور پر ذکر کرتے ہیں۔ ۹۷ھ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بیٹے حسن فوت ہوئے تھے تو ان کی بیوی نے ایک سال تک ان کی قبر پر خیمہ لگائے رکھا جب خیمہ اکھاڑ دیا گیا تو ہاتف غیبی سے آواز آئی ''کیا اپنی گم شدہ چیز کو انہوں نے حاصل کر لیا۔'' پھر جواب میں ایک اور آواز سنائی دی ''حاصل کیا ہونا تھا بلکہ مایوس ہو کر واپس چلے گئے ہیں۔'' [صحیح بخاری، الجنائز، تعلیقاً باب نمبر: ٦١]

اس روایت پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے کہ ''قبروں کو جائے سجدہ قرار دینا مکروہ ہے۔'' واضح رہے کہ خیمہ لگانے والی خاتون حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی لخت جگر حضرت فاطمہ تھیں۔ انہیں اپنے خاوند سے انتہائی محبت تھی۔ شدت جذبات میں آ کر محض اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے انہوں نے اپنے خاوند کی قبر پر خیمہ لگایا۔ انہوں نے اہل قبر سے روحانی فیض حاصل کرنے کے لئے یہ کام نہیں کیا تھا اس کے باوجود ہاتف غیبی سے جو آواز آئی ہے اس سے اس عمل کے ناپسندیدہ ہونے کا واضح اشارہ ملتا ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ ابن المنیر کے حوالہ سے لکھا ہے۔ [فتح الباری، ص: ٢٥٦، ج ٣]

سوال میں ذکر کردہ دوسرے واقعہ کو بھی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تعلیقاً ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کی قبر پر خیمہ لگا دیکھا تو کہا اے غلام! اسے اکھاڑ دو کیونکہ اس کا عمل ہی اس پر سایہ فگن ہوگا۔ [صحیح بخاری، الجنائز، باب: ٨١]

ابن سعد نے اس روایت کو موصولاً ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کی قبر کے پاس سے گزرے تو وہاں خیمہ لگا دیکھا تو آپ نے فرمایا کہ اے غلام! اسے اکھاڑ دو کیونکہ اس کا عمل ہی سایہ کے لئے کافی ہے۔ غلام نے کہا کہ میری مالکہ مجھ پر ناراض ہو گی اور مارے گی آپ نے فرمایا ایسا نہیں ہو سکتا، چنانچہ اس نے خیمہ کو ختم کر دیا۔ [فتح الباری، ص: ٢٨٤، ج ٣]

ابن سعد کی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خیمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے لگوایا تھا لیکن وہ روایت صحیح نہیں ہے کیونکہ اس میں ایک مجہول راوی ہے، پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا شرک کے معاملہ میں بہت حساس تھیں اگر اس اثر کی صحت کو تسلیم بھی کر لیا جائے

تو بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا موقف صحیح قرار پاتا ہے کیونکہ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قبر پر عمارت بنانا حرام ہے۔ خیمہ لگانا بھی اسی قبیل سے ہے چونکہ اس سے شرک کا دروازہ کھلتا ہے، اس لئے دیگر وسائل شرک کی طرح یہ بھی حرام ہے۔ بہر حال یہ دونوں واقعات قبر پرستوں کی دلیل نہیں بن سکتے بلکہ ان کے اندر ہی شرکیہ موقف کی تردید موجود ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے جو رشتہ دار فوت ہو چکے ہیں ان کی قبر پر جا کر دعا کرنے سے انہیں فائدہ ہوگا یا جہاں چاہے دعا کرنے سے رفع درجات کا باعث ہوگا؟

جواب اگر کوئی شخص اپنے فوت شدگان کے لئے دعا کرتا ہے تو وہ ضرور اس کی دعا سے بہرہ ور ہوتے ہیں بشرطیکہ قبولیت کے آداب و شرائط موجود ہوں۔ حدیث میں ہے کہ اگر کوئی مسلمان اپنے بھائی کے لئے غائبانہ دعا کرتا ہے تو وہ ضرور قبول ہوتی ہے۔ اللہ کی طرف سے ایک فرشتہ تعینات کر دیا جاتا ہے جب غائبانہ طور پر کوئی مسلمان دوسرے کے لئے دعا کرتا ہے تو فرشتہ اس پر آمین کہتا ہے اور اسے اللہ کے ہاں اس کے مثل اجر ملنے کی دعا کرتا ہے۔ [مسند امام احمد، ص:۴۵۲، ج۶]

میت کی قبر پر کھڑے ہو کر دعا کرنا صرف جائز اور مشروع ہے قبولیت دعا کے آداب و شرائط سے نہیں ہے۔ قبولیت دعا کی شرائط کچھ حسب ذیل ہیں:

☆ دعا کرتے وقت انسان کو خلوص سے سرشار ہونا چاہیے، ریاکاری کا شائبہ تک موجود نہ ہو۔ خاص طور پر میت کے لئے دعا کرتے وقت اس کی شرط کا پایا جانا انتہائی ضروری ہے۔ [ابوداؤد:۳۱۸۳]

☆ دعا کرتے وقت دل کا حاضر باش ہونا بھی ضروری ہے۔ غفلت شعار دل سے نکلی ہوئی دعا قبول نہیں ہوتی۔ [ترمذی، الدعوات:۳۴۷۹]

☆ اکل حلال اور صدق مقال کے بغیر بھی دعا قبولیت کا درجہ حاصل نہیں کر پاتی۔ [صحیح مسلم]

پھر قبولیت کے لئے کچھ آداب بھی چند ایک حسب ذیل ہیں:

☆ دعا میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھا جائے۔

☆ دعا کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے متعلق حسن ظن رکھنا چاہیے کہ وہ ہماری دعاؤں کو قبول کرتا ہے۔

☆ دعا کے وقت اس کی قبولیت کے متعلق پورا عزم اور یقین بھی انتہائی ضروری ہے۔

☆ قبر پر کھڑے ہو کر دعا کرنا اگرچہ دعا کے آداب یا شرائط سے نہیں ہے، البتہ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دعا کرنے والے کو آخرت اور قبر یاد آتی ہے تو اس میں عاجزی اور مسکنت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قبر کو سامنے پا کر میت کے متعلق اس کے مخلصانہ جذبات میں مزید نکھار پیدا ہوتا ہے، اس لئے وہ میت کے لئے دل کی گہرائی سے دعا کرتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ قبر پر کھڑے ہو کر دعا کرنا جائز ہے، ضروری نہیں ہے، اس لئے میت کی مغفرت کے لئے ہر جگہ دعا کی جا سکتی ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال میت کو غسل دینے کا کیا طریقہ ہے؟ احادیث کی روشنی میں تفصیل سے لکھیں۔ اگر میت کا جسم صاف نہ ہو تو کیا تین مرتبہ سے زیادہ اس پر پانی بہایا جا سکتا ہے؟

جواب میت کو غسل دینے کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اسے استنجا کرایا جائے، یعنی اس کی شرم گاہ کو دھویا جائے۔ دھونے سے پہلے مٹی کے ڈھیلے صفائی کے لئے استعمال کئے جاسکتے ہیں، پھر اسے غسل دیا جائے۔ اعضائے وضو سے شروع کرے اور اسے وضو کرائے، لیکن میت کے منہ اور ناک میں پانی داخل نہ کیا جائے بلکہ غسل دینے والے کو چاہیے کہ کپڑے کے ایک ٹکڑے کو گیلا کر کے اس کے ساتھ میت کے منہ اور ناک کو صاف کرے پھر اس کے باقی جسم کو غسل دے۔ بہتر ہے کچھ پانی میں بیری کے پتے کوٹ کر ڈال دیئے جائیں یا انہیں پانی میں جوش دیا جائے۔ اس پانی سے اس کے سر اور داڑھی کو دھویا جائے۔ بیری کے پتوں کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے جسم بہت زیادہ صاف ہو جاتا ہے۔ بیری کے پتے استعمال کرنا مسنون عمل ہے۔ ان کی جگہ صابن استعمال کرنا بھی جائز ہے۔ آخری غسل میں ''کافور'' بھی استعمال کیا جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ جسم کو سخت کر دیتا ہے اور کیڑوں مکوڑوں کو بھگا دیتا ہے۔ اگر میت کو زیادہ میل کچیل لگی ہے تو اسے زیادہ بار بھی غسل دیا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی لخت جگر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو غسل دینے والی خواتین سے فرمایا تھا: ''اسے تین یا پانچ بار غسل دو، اگر ضرورت محسوس کرو تو اس سے بھی زیادہ مرتبہ غسل دو۔'' [صحیح بخاری، الجنائز:۱۲۵۳]

میت کو غسل دینے والا اگر محسوس کرے کہ میت کے جسم سے آلائش وغیرہ نکل کر اسے لگی ہے تو اسے چاہیے کہ میت کو غسل سے فراغت کے بعد خود بھی غسل کرے، اگر اسے یقین ہے کہ میت سے کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی تو غسل دینے والے کو نہانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میت کو غسل دینے کے بعد اسے صاف ستھرا کفن پہنا دیا جائے۔ [واللہ اعلم]

سوال قرآن وحدیث کی روشنی میں تعزیت کا طریقہ کیا ہے، میت کے لواحقین کے پاس جا کر میت کے لئے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا اور رواداری کے طور پر قل خوانی میں شرکت کر لینا، لیکن کھانے پینے سے اجتناب کرنا، اسی طرح محض علاقے داری کی وجہ سے جنازہ پڑھنا جبکہ جنازہ سنت کے مطابق نہ پڑھایا جارہا ہو، ان تمام مسائل کی شرعی حیثیت واضح کریں؟

جواب اہل میت کو تسلی دینا اور انہیں صبر کی تلقین کرنا تعزیت کہلاتا ہے، نیز میت کے لئے دعا کرنا بھی تعزیت میں شامل ہے لیکن دعا کے لئے ہاتھ اٹھانا محض ایک رسم ہے۔ احادیث میں تعزیت کی فضیلت بایں الفاظ وارد ہے کہ ''جو اپنے کسی مسلمان بھائی کی کسی مصیبت میں تعزیت کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے سبز رنگ کا حلہ پہنائیں گے جس کی وجہ سے وہ قیامت کے دن لوگوں کے لئے باعث رشک ہوگا۔'' [مصنف ابن ابی شیبہ، ص:۱۶۴، ج۴]

رسول اللہ ﷺ عام طور پر ان الفاظ سے تعزیت کیا کرتے تھے کہ ''اللہ تعالیٰ ہی کا تھا جو اس نے لے لیا اور جو اس نے دیا وہ بھی اسی کا ہے۔ اللہ کے ہاں ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔ ہمیں ثواب لینے کی نیت سے صبر کرنا چاہیے۔'' [مسند امام احمد، ص:۲۰۴، ج۵]

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ جب فوت ہوئے تو رسول اللہ ﷺ تعزیت کے لئے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور انہیں تسلی دی، نیز میت کے گناہوں اور اس کے لئے رفع درجات کی دعا کی۔ [مسند امام احمد، ص:۲۹۷، ج۲]

تعزیت کے لئے تین دنوں کی تحدید بھی درست نہیں ہے بلکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی شہادت کے تین دن بعد ان کے اہل خانہ سے تعزیت کی تھی۔ [مستدرک حاکم، ص:۲۹۸، ج۲]

تعزیت کے سلسلہ میں دو چیزوں سے اجتناب کرنا چاہیے:

(الف) گھر یا مسجد میں مخصوص طریقہ سے تعزیت کے لئے اجتماع کرنا۔

(ب) اہل میت کا مہمانوں کے لئے کھانے کا اہتمام کرنا، ان دونوں کاموں کی احادیث میں ممانعت آئی ہے۔قل خوانی میں شرکت درست نہیں ہے اور نہ ہی علاقہ داری کے طور پر جنازہ پڑھنا جائز ہے، بلکہ جنازے کا مقصد میت کے لئے دعا کرنا ہے، اس مقصد کے پیش نظر اگر سنت کے مطابق جنازہ نہ بھی پڑھا جائے تو بھی شرکت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال کیا عورتیں قبرستان میں جا سکتی ہیں؟

جواب رسول اللہ ﷺ نے مدنی زندگی کے آغاز میں مرد و عورت دونوں کو زیارت قبور سے منع فرمایا، اس کے بعد آپ نے دونوں کو اجازت دے دی، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ''میں نے تمہیں زیارت قبور سے منع فرمایا تھا اب ان کی زیارت کیا کرو، کیونکہ ان میں سامان عبرت ہے۔'' [مسند امام احمد، ص:۳۸، ج۳]

حضرت عبداللہ بن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے برادر مکرم حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کی قبر کی زیارت کر کے آئیں تو میں نے عرض کیا اماں جان! رسول اللہ ﷺ نے زیارت قبور سے منع فرمایا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ پہلے منع تھا، پھر آپ نے اجازت دے دی تھی۔ [مستدرک حاکم، ص:۳۷۶، ج۱]

زیارت قبور کے وقت جو دعا پڑھی جاتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تعلیم دی تھی کہ قبروں کی زیارت کرتے وقت اسے پڑھا کرو۔ [صحیح مسلم، الجنائز:۲۲۵۶]

جس روایت میں عورتوں کے لئے منع کے الفاظ ہیں وہاں مبالغہ کا صیغہ (زوارات) استعمال ہوا ہے۔اس کی دو صورتیں ہیں:

① گروہ کی صورت میں جانا۔

② انفرادی طور پر بار بار جانا۔عورتوں کے لئے یہ دونوں صورتیں منع ہیں، البتہ انفرادی طور پر کبھی کبھار جانے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ [ترمذی، الجنائز:۱۰۵۵]

سوال جو بچہ مردہ پیدا ہو، اس کی نماز جنازہ کے متعلق کیا حکم ہے؟

جواب حدیث میں ہے کہ جب بچہ اپنی ماں کے پیٹ میں چار ماہ کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس میں روح پھونک دی جاتی ہے۔

[بخاری:۳۲۰۸]

اگر چار ماہ کی مدت کے بعد مردہ بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے۔ضروری نہیں ہے۔اس سلسلہ میں ایک صریح حدیث مروی ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''بچے کی نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے۔'' [ترمذی، الجنائز:۱۰۳۶]

ایک روایت میں ہے کہ نا تمام بچے کی نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے۔ [ابوداؤد، الجنائز:۳۱۸۰]

واضح رہے کہ نا تمام سے مراد وہ بچہ ہے جس کے چار ماہ مکمل ہو چکے ہوں اور اس میں روح پھونک دی گئی ہو، پھر مردہ پیدا

ہو۔اس مدت سے پہلے اگر کسی صورت میں ساقط ہو جائے تو اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی کیونکہ میت کہلا ہی نہیں سکتا۔جس روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جب نا تمام چیخ پڑے تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور اسے وارث بھی بنایا جائے گا یہ روایت قابل استدلال نہیں ہے۔ [احکام الجنائز:ص۸۱]

البتہ وارث بننے کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندہ پیدا ہو۔امام ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ بچہ جب زندہ پیدا ہو اور چیخ پڑے بعد میں اسے موت آجائے تو اس کی نماز جنازہ بالاتفاق جائز ہے اور چیخ مارے بغیر مردہ پیدا ہو تو اس کے متعلق امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر حمل کے چار ماہ بعد پیدا ہوا ہے تو اسے غسل بھی دیا جائے گا اور اس کی نماز جنازہ بھی پڑھی جا سکتی ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا ایک نواسہ مردہ پیدا ہوا تھا تو آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی تھی۔ [مغنی لابن قدامہ،ص:۴۵۸،ج۳]

مردہ بچے کی نماز جنازہ پڑھتے وقت اس کے والدین کے لئے مغفرت اور رحمت کی دعا کرنی چاہیے نیز اسے مسلمانوں کے قبرستان میں ہی دفن کرنا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال اگر کوئی شخص نماز ظہر کے فرض یا سنت پڑھ رہا ہو،اس کے دوران ہی امام صاحب نماز جنازہ کھڑی کر دیں تو جنازہ میں شامل ہونا چاہیے یا نہیں، یا اپنی نماز کو جاری رکھنا چاہیے، نیز اگر کسی سے نماز جنازہ کی ایک یا دو تکبیریں رہ جائیں تو وہ کیا کرے سورت فاتحہ اور درود شریف پڑھے گا یا نہیں؟

جواب اگر کوئی فرض یا سنت یا نوافل پڑھ رہا ہے اس دوران مساجد میں جنازہ آجائے تو اسے آتے ہی شروع نہیں کر دیا جاتا بلکہ چند منٹ تک دوسرے لوگوں کا انتظار کیا جاتا ہے، یا وضو کرنے کے لئے لوگوں کو کچھ مہلت دی جاتی ہے۔اس دوران نماز پڑھنے والا اپنی نماز پوری کر سکتا ہے اگر کبھی ایسی صورت بن جائے جس کا سوال میں ذکر کیا گیا ہے تو نمازی کو چاہیے کہ نماز ختم کر کے نماز جنازہ میں شامل ہو جائے۔اس سے فراغت کے بعد اپنی نماز پڑھ لے کیونکہ جنازہ کی تلافی نہیں ہو سکے گی جبکہ نماز کی تلافی ممکن ہے اور اگر نماز جاری رکھے تو بھی اس کے لئے جائز ہے کیونکہ جنازہ میں شمولیت ضروری نہیں ہے تاہم بہتر ہے، کہ جنازہ میں شمولیت اختیار کر کے اضافی ثواب حاصل کرے۔اس طرح اگر کسی سے جنازہ کی ایک یا دو تکبیریں رہ جائیں تو ان کی قضا کے متعلق بھی متقدمین میں اختلاف ہے۔بعض حضرات امام کے سلام کے بعد فوت شدہ تکبیرات کو پورا کرنے کے قائل و فاعل ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ نماز کا جو حصہ تمہیں مل جائے اسے پڑھ لو اور جو رہ جائے اسے بعد میں پورا کر لو۔ [صحیح بخاری، الاذان:۶۳۶]

جبکہ بعض حضرات کا موقف ہے کہ وہ امام کے ساتھ ہی سلام پھیر دے۔فوت شدہ تکبیرات کی قضا ضروری نہیں، جیسا کہ عیدین کی تکبیرات رہ جانے کی صورت میں انہیں بعد میں پورا نہیں کیا جاتا، نیز حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ نماز جنازہ کی تکبیرات کے قائل نہیں تھے۔ [مصنف ابن ابی شیبہ،ص:۳۰۶،ج۳]

ہمارے نزدیک فوت شدہ تکبیرات کی قضا ضروری ہے کیونکہ پہلی تکبیر کے بعد فاتحہ پڑھی جاتی ہے جس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ دوسری تکبیر کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا ہے وہ بھی نماز جنازہ کا حصہ ہے، انہیں عیدین کی تکبیرات پر قیاس کرنا درست نہیں ہے کیونکہ عیدین کی تکبیرات میں کوئی خاص ذکر پڑھنے کا اہتمام احادیث سے ثابت نہیں ہے۔اس لئے نماز جنازہ

کی اگر پہلی یا دوسری تکبیر رہ جائے تو امام کے سلام پھیرنے کے بعد اس کی قضا ضروری ہے تا کہ ان میں سورۂ فاتحہ اور درود کو پڑھا جاسکے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے ہاں ایک جنازہ پڑھایا گیا۔ فراغت کے بعد مولوی صاحب نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی جب ان سے دلیل کا مطالبہ کیا تو انہوں نے ایک حدیث کا حوالہ دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میت پر نماز جنازہ پڑھنے سے فارغ ہو جاؤ تو اس کے لئے خلوص نیت سے دعا کرو۔'' انہوں نے مزید کہا کہ اس حدیث میں شرط اور جزا کا بیان ہے اور ان دونوں میں تغایر ہوتا ہے، پھر اس میں حرف فا کا استعمال ہوا ہے۔ جو تعقیب کے لئے استعمال ہوتی ہے، یعنی ایک کام کے بعد دوسرا کام کیا جائے، یعنی نماز جنازہ پڑھنے کے بعد دعا کی جائے، قرآن و حدیث کی روشنی میں اس مسئلے کی وضاحت کریں؟

جواب حقیقت یہ ہے کہ بدعت کو ثابت کرنے کے لئے بڑی ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ علمی دھونس سے لوگوں کو اپنے جال میں پھنسایا جائے اور پھنسے ہوئے لوگوں کو قابو میں رکھا جائے۔ قارئین کرام نے خود ملاحظہ فرمایا ہے کہ سوال میں پیش کردہ حدیث سے انتہائی چابکدستی کے ساتھ خود ساختہ عمل کو کشید کیا گیا ہے حالانکہ اس بدعتی عمل کا حدیث کے ساتھ دور کا بھی تعلق نہیں ہے، جیسا کہ ہم اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ جس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: ''إِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ فَأَخْلِصُوْا لَهُ الدُّعَاءَ'' [ابوداؤد، الجنائز:۳۱۹۹]

''جب میت پر نماز جنازہ پڑھو تو اس کے لئے خلوص نیت سے دعا کرو۔'' اس سے مراد یہ ہے کہ نماز جنازہ کے دوران جب میت کے لیے دعا کی جائے، بدعتی حضرات نے اس حدیث کا جو معنی کیا ہے وہ قطعی طور پر مراد نہیں ہے اس کی درج ذیل وجوہات ہیں:

(الف) جب نماز جنازہ شروع کرنا ہو تو امام کو کہاں کھڑا ہونا چاہیے۔

(ب) نماز جنازہ کے لئے تکبیرات کا بیان۔

(ج) نماز جنازہ میں قراءت کا بیان۔

(د) میت کے لئے دعا کا بیان، پھر اس عنوان کے تحت حدیث بالا کو بیان کیا ہے۔

(ھ) سب سے آخر میں نماز جنازہ میں پڑھی جانے والی دعاؤں کا ذکر فرمایا ہے۔

عنوان بندی کی اس ترتیب سے پتہ چلتا ہے کہ محدث ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس حدیث کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دوران نماز میت کے لئے جو دعا کی جائے وہ کس انداز سے ہونی چاہیے، وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انتہائی اخلاص کے ساتھ میت کے لئے دعا کرنا چاہیے، کیونکہ اس وقت ہم میت کو صرف دعاؤں کا تحفہ ہی دے سکتے ہیں۔ محدث کے انداز میں دور دراز تک اس بات کا اشارہ نہیں ملتا کہ نماز جنازہ سے فراغت کے بعد وہیں کھڑے کھڑے میت کے لئے دعا کی جائے اور نہ ہی کسی دوسری حدیث میں اس مسئلہ کا ذکر ہے۔ کسی بھی محدث نے مذکورہ بالا حدیث سے اس خود ساختہ مسئلہ کا استنباط نہیں کیا ہے۔

☆ کتب حدیث میں جتنی احادیث مروی ہیں ان پر خود رسول اللہ ﷺ نے یا آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کسی نہ کسی صورت میں عمل ضرور کیا ہے۔ کیا مذکورہ بدعتی عمل، رسول اللہ ﷺ یا آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ ہم پورے وثوق

سے کہتے ہیں کہ نماز جنازہ سے فراغت کے بعد وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ اٹھا کر میت کے لئے دعا کرنے کا یہ عمل رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے قطعاً ثابت نہیں ہے۔ اگر کسی کے پاس عملی ثبوت ہے تو اسے پیش کریں علمی دھاندلی سے کم علم لوگوں کو مرعوب تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس سے کوئی مسئلہ ثابت نہیں کیا جاسکتا ہے۔

☆ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ حدیث شرط اور جزا پر مشتمل ہے، یعنی جب تم میت پر نماز جنازہ پڑھو تو یہ شرط ہے، اور اس کے لئے خلوص نیت سے دعا کرو یہ جواب شرط یا جزا ہے اور ان دونوں میں تغایر ہے۔ نماز جنازہ پڑھنا اور خلوص نیت سے دعا کرنا دو الگ الگ چیزیں ہیں لیکن فاتعقیب کا معنی دیتی ہے لیکن ہر مقام پر یہ معنی درست نہیں ہوتا کہ ایک کام سے فراغت کے بعد دوسرا کیا جائے، جیسا درج ذیل حدیث میں تعقیب کا معنی نہیں پایا جاتا ہے۔

(الف) رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا ''إِذَا أَذَّنْتَ فَتَرَسَّلْ وَإِذَا أَقَمْتَ فَاحْدُرْ'' [ترمذی، الصلوٰۃ:۱۹۶]

''جب تم اذان کہو تو ٹھہر ٹھہر کر اور اقامت کہو تو جلدی جلدی کیا کرو'' اس حدیث میں فاتعقیب کے لئے نہیں ہے کہ اذان کہنے کے بعد ٹھہرنا تکبیر کہنے کے بعد جلدی کرنا بلکہ معنی یہ ہے کہ اذان کہتے ہوئے اس کے کلمات ٹھہر ٹھہر کر ادا کئے جائیں اور اقامت کہتے وقت اس کے کلمات جلدی جلدی کہے جائیں۔

(ب) رسول اللہ ﷺ نے سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: ''إِذَا صَلَّيْتُمْ فَأَقِيمُوا صُفُوفَكُمْ'' [مسند امام احمد، ص:۳۹۳، ج۴]

''جب نماز پڑھو تو اپنی صفوں کو ضرور سیدھا کیا کرو'' اس حدیث کا قطعاً یہ مفہوم نہیں ہے کہ نماز سے فراغت کے بعد اپنی صفوں کو سیدھا کیا کرو بلکہ دوران نماز اپنی صفوں کو سیدھا کرنے کا حکم ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس مقام پر حرف فاتعقیب کے لئے نہیں ہے۔ واضح رہے کہ حرف فا کے کئی ایک فوائد ہیں، مثلاً: بعض اوقات کلام میں خوبصورتی اور حسن پیدا کرنے کے لئے لائی جاتی ہے اس کے علاوہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، بعض اوقات عطف یعنی یہ بتانے کے لئے کہ اس کا مابعد ماقبل کے حکم میں شامل ہے جب عطف کا معنی دے تو اس کی تین اقسام ہیں: ترتیب، تعقیب اور سببیت، بعض اوقات حرف فا اپنے قبل اور مابعد کے درمیان رابطہ کے لئے آتا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ فا کا مابعد شرط بننے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، مذکورہ بالا حدیث میں حرف فا صرف رابطہ کے لئے استعمال ہوا ہے تعقیب وغیرہ اس میں نہیں ہے۔ [تفصیل دیکھئے: مغنی اللبیب، ص:۱۶۱، ج۱]

بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ بدعت اس وقت جگہ پکڑتی ہے جہاں سنت کا قرار ہوتا ہے۔ دیکھئے سنت یہ ہے کہ نماز جنازہ میں میت کے لئے دعائیں کی جائیں، لیکن وہاں تو ہم جھٹکا کرتے ہیں لیکن جس جگہ پر رسول اللہ ﷺ سے دعا کرنا ثابت نہیں ہے وہاں دعا کرنے کے لئے ڈیرے ڈال دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین

سوال جنازہ دیکھ کر کھڑے ہونے کے متعلق روایات بیان کی جاتی ہیں۔ اس کے متعلق وضاحت فرمائیں کہ جنازہ دیکھ کر کھڑا ہونا چاہیے یا نہیں؟

جواب جنازے کے لئے قیام کی دو اقسام ہیں:

① جنازہ دیکھ کر کھڑے ہونا۔

② جنازے کے ہمراہ جانے والے کھڑے رہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں قسم کے لیے احادیث پیش کی ہیں، چنانچہ عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم جنازہ دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ حتی کہ وہ تمہیں پیچھے چھوڑ جائے۔'' [صحیح بخاری، الجنائز: ۱۳۰۷]

لیکن جنازہ دیکھ کر کھڑے ہونے کا اہتمام ابتدائی دور میں تھا، پھر اس قیام کو ترک کر دیا گیا، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں جنازے کے لیے کھڑے ہونے کا حکم دیا تھا، پھر آپ اس کے بعد بیٹھنے لگے اور ہمیں بھی بیٹھے رہنے کا حکم دیا۔ [مسند امام احمد، ص: ۸۲ ج ۱]

اس حدیث کی وجہ سے اگر کوئی جنازہ دیکھ کر بیٹھا رہے تو جائز ہے قیام ضروری نہیں ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری اقسام کے قیام کے لیے بایں الفاظ عنوان کیا ہے:

''جو شخص جنازے کے ہمراہ ہو اسے چاہیے کہ کندھوں سے نیچے رکھے جانے سے قبل نہ بیٹھے، اگر بیٹھ جائے تو اسے کھڑے ہونے کے لئے کہا جائے۔'' اس سلسلہ میں انہوں نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث پیش کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم جنازہ دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ اور جو شخص جنازے کے ہمراہ ہو وہ نہ بیٹھے حتی کہ اسے رکھ دیا جائے۔''

[صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۱۳۱۰]

اگرچہ بعض روایات میں لحد میں رکھے جانے کا حکم ہے لیکن امام ابو داود رحمۃ اللہ علیہ نے زمین پر رکھے جانے کی روایت کو ترجیح دی ہے۔ دوسری روایات سے بھی اس موقف کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم نے کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا کہ آپ کسی جنازہ میں شریک ہوں اور اسے رکھے جانے سے قبل بیٹھ گئے ہوں۔

[نسائی، حدیث نمبر: ۱۹۱۸]

لیکن جنازے کے لئے قیام کی یہ دوسری قسم بھی ضروری نہیں کیونکہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنازوں کے ساتھ کھڑے رہتے جب تک اسے زمین پر نہ رکھ دیا جاتا اور آپ کے ساتھ لوگ بھی کھڑے رہتے اور پھر اس کے بعد آپ نے بیٹھنا شروع کر دیا اور لوگوں کو بھی بیٹھنے کا حکم دیا۔ [بیہقی، ص: ۲۷، ج ۴]

اس موقف کی وضاحت ایک دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت کھڑے رہتے جب تک جنازے کو لحد میں نہ رکھ دیا جاتا پھر ایک یہودی عالم کا گزر ہوا تو اس نے کہا کہ اس طرح تو ہم کرتے ہیں تب آپ نے بیٹھنا شروع کر دیا اور فرمایا: ''تم بھی بیٹھا کرو اور ان کی مخالفت کرو۔'' [ابو داود، الجنائز: ۳۱۷۶]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی موقف کو اختیار کیا ہے۔ [احکام الجنائز، ص: ۷۷، ۷۸]

اس لئے ہمارے نزدیک جنازے کو دیکھ کر کھڑے ہونا ضروری نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال کفن دینے کے لئے کتنے کپڑے ہونے چاہییں۔ ہمارے ہاں عام طور پانچ کپڑوں میں کفن دینے کا رواج ہے جبکہ نئی تحقیق کے مطابق مرد اور عورت کے کفن میں کوئی فرق نہیں۔ اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی فرمائیں۔ واضح رہے کہ اس سلسلہ میں

عورتوں کا موقف یہ ہے کہ جو عورت تمام زندگی پردہ کرتی ہے اسے صرف تین کپڑوں میں کفن دینا اس کی توہین ہے۔ اس لئے ان کا کہنا ہے کہ عورت کے سر پر اضافی سکارف یا دوپٹہ اور ایک اضافی تہبند ضروری ہے جو تین کپڑوں سے الگ ہو؟

جواب عام طور پر عورت کے کفن سے متعلق مندرجہ ذیل حدیث پیش کی جاتی ہے۔

حضرت لیلیٰ بنت نائف رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ میں ان خواتین میں شامل تھی جنہوں نے حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی وفات کے وقت انہیں غسل دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہمیں تہبند دیا، پھر کرتہ اس کے بعد اوڑھنی، پھر ایک بڑی چادر، پھر اسے ایک دوسری چادر میں لپیٹ دیا گیا، حضرت لیلیٰ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی لخت جگر کا کفن لے کر دروازے کے پاس بیٹھے تھے اور ہمیں ایک، ایک کپڑا دیتے جاتے تھے۔ [مسند امام احمد، ص: ۳۸۰، ج۶]

اس روایت کو امام ابوداؤد نے بھی "کفن المرأۃ" کے عنوان سے اپنی سنن میں بیان کیا ہے اس روایت کے پیش نظر ہمارے ہاں عورت کو پانچ کپڑوں میں کفن دینے کا رواج ہے جس کی تفصیل اس طرح بیان کی جاتی ہے:

① تہبند جو ناف سے ٹخنوں تک ہوتا ہے۔

② سر بند یا اوڑھنی جو سر اور اس کے بال باندھنے کے لئے ہوتی ہے۔

③ کرتہ یا کفن جو پہلوؤں کی طرف سے کھلا ہوا اور نیچے اوپر گردن سے ہوتا ہوا گھٹنوں تک عام طور پر یہ شکل ہوتی ہے۔

④ دو بڑی چادریں جس میں سارا جسم لپیٹ دیا جاتا ہے۔

اس کے برعکس مرد حضرات کے لئے صرف تین چادریں ہوتی ہیں کیونکہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تین سفید لمبی چادروں میں کفن دیا گیا۔ [صحیح بخاری، الجنائز:۱۲۶۶]

لیکن مرد اور عورت کے کفن میں فرق کرنے کے لئے جو روایت پیش کی جاتی ہے، وہ انتہائی ضعیف ہے کیونکہ اس میں نوح بن حکیم نامی راوی مجہول ہے جس کی ثقاہت و عدالت ثابت نہیں ہو سکی، اس کے علاوہ زیلعی نے ایک اور سبب ضعف بیان کیا ہے اس کی سند میں ایک داؤد نامی راوی ہے جسے ام حبیبہ بنت ابی سفیان نے جنا تھا، وہ لیلیٰ بنت نائف رضی اللہ عنہا سے بیان کرتا ہے۔ اس داؤد کے متعلق پتہ نہیں چل سکا کہ کون ہے۔ کتب رجال میں ایک داؤد بن ابی عاصم بن عروہ بن مسعود ثقفی ہیں جو عثمان بن ابی العاص، ابن عمر، سعید بن میسب سے بیان کرتا ہے اور اس سے ابن حریج، یعقوب بن عطا اور قیس بن سعد بیان کرتے ہیں امام ابوزرعہ اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ قابل اعتماد اور ثقہ ہیں لیکن سند میں موجود داؤد نامی یہ نہیں ہے کیونکہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا جب حبشہ سے واپس آئی ہیں تو ان کے ہمراہ صرف ان کی ایک بیٹی تھی۔ جس کا نام حبیبہ ہے۔ جس کی بنا پر ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کو ام حبیبہ کہا جاتا ہے۔ اگر بیٹی کا خاوند ابو عاصم بن عروہ ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ سند میں مذکورہ داؤد نامی راوی داؤد بن ابی عاصم عروہ بن مسعود ہے لیکن یہ بات تاریخی اعتبار سے ثابت نہیں ہے کیونکہ حبیبہ کا خاوند ابو عاصم نہیں بلکہ داؤد بن عروہ بن مسعود ہے۔ [طبقات ابن سعد، ص: ۶۸، ج۸]

اور سند میں مذکورہ داؤد نامی راوی داؤد بن عروہ بن مسعود نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ وہ حضرت ام حبیبہ کا خاوند ہے اس کا بیٹا نہیں، جبکہ سند میں ہے داؤد حضرت ام حبیبہ کا بیٹا ہے اس بنا پر بھی مذکورہ روایت کمزور اور ناقابل اعتبار ہے۔ [نصب الرایہ، ص: ۲۵۸، ج۲]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں اسباب ضعف کی وجہ سے لکھا ہے کہ مرد اور عورت کا کفن ایک جیسا تین چادریں ہیں کیونکہ ان دونوں میں فرق کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ [احکام الجنائز، ص:۶۵]

سوال میں عورتوں کے حوالے سے جو عقلی توجیہ بیان کی گئی ہے اسے ''دین خواتین'' تو کہا جاتا ہے لیکن شریعت اسلام ایسی باتوں سے ثابت نہیں ہوتی اس کے لئے ضروری ہے کہ کتاب اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔ احادیث کے ثبوت کے لئے سند کا صحیح ہونا ضروری ہے جبکہ مذکورہ حدیث کی سند محدثین کرام رحمہم اللہ کے قائم کردہ معیار صحت پر پوری نہیں اترتی ،اس طرح عورتوں کے لئے کرتہ یا کفنی جس طرح بنائی جاتی ہے اس کا ثبوت بھی تعامل امت سے نہیں ملتا،اس لئے مردوں کی طرح صرف تین چادروں میں عورت کو کفن دینا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے ہاں عام طور پر شہید کی غائبانہ نماز جنازہ کے متعلق اشتہارات شائع کئے جاتے ہیں پھر بڑی دھوم دھام سے نماز جنازہ ادا کی جاتی ہے،اور نماز سے پہلے کافی دیر تقاریر کا سلسلہ جاری رہتا ہے،کیا شرعی طور پر ایسا کیا جا سکتا ہے۔کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں؟

جواب یہاں تین باتیں قابل غور ہیں۔

① غائبانہ نماز جنازہ۔ ② شہید کی نماز جنازہ۔ ③ شہید کی غائبانہ نماز جنازہ۔

غائبانہ نماز جنازہ کے متعلق محدثین نے چند شرائط کے ساتھ صرف جواز کی حد تک اجازت دی ہے،چنانچہ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ہر غائبانہ میت کا نماز جنازہ پڑھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول نہ تھا آپ کے عہد مبارک میں بے شمار مسلمان مدینہ سے باہر فوت ہوئے ،ان کی غائبانہ نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی ،صرف حبشہ کے سربراہ نجاشی کا آپ نے غائبانہ جنازہ پڑھا ہے۔

[زاد المعاد،ص:۲۰۵،ج۱]

تاہم ہمارے نزدیک اس کے متعلق موقف ہے کہ ہر مرنے والے کا غائبانہ جنازہ پڑھنا غیر مشروع ہے،ہاں ،جس کی علمی، ملی اور سیاسی خدمات ہوں،اس کا غائبانہ نماز جنازہ پڑھنے میں چنداں حرج نہیں ہے وہ بھی ضروری نہیں ہے۔دوسری قابل غور بات شہید کے جنازہ سے متعلق ہے،شہید کا جنازہ بھی ضروری نہیں ہے،کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہدائے احد کو ان کے خونوں سمیت دفن کرنے کا حکم دیا اور ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ [صحیح بخاری،الجنائز:۱۳۴۳]

شہدائے بدر کے متعلق بھی نماز جنازہ کا کوئی ذکر احادیث میں منقول نہیں۔اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نماز جنازہ پڑھی ہوتی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسے ضرور بیان کرتے ،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہداء کی نماز جنازہ دوسرے مسلمانوں کی طرح واجب نہیں ہے صرف جواز کی حد تک اجازت ہے،جیسا کہ دیگر روایات میں اس کی صراحت ہے،مثلاً صحیح بخاری، مغازی:۴۰۴۲، ابوداود، جنائز:۳۱۳۷ اور نسائی، جنائز:۱۹۵۵ میں ہے۔

تیسری بات کہ شہید کا غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا تو اس کے متعلق خیر القرون میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی ،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی میں حضرت عبداللہ بن رواحہ اور حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہما مدینہ سے باہر ایک جنگ میں شہید ہوئے ،بذریعہ وحی آپ

کواطلاع دی گئی لیکن رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے آپ نے ان کی غائبانہ نماز جنازہ کا اہتمام کیا ہو،سوال میں چند ایک امتیازی علامتوں کے ساتھ شہید کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھنے کا ذکر ہے۔ بلا شبہ ہمارے ہاں بعض ناگزیر حالات کی بنا پر دھوم دھام سے شہید کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھنے کا رواج چل نکلا ہے اور اس کے مندرجہ ذیل امور کی بجا آوری کو ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

① شیر دل شہید کے غائبانہ جنازے کے لئے بڑے بڑے اشتہارات شائع کرکے درودیوار پر لگائے جاتے ہیں، چھوٹے چھوٹے اشتہارات انفرادی طور پر تقسیم کئے جاتے ہیں۔

② مساجد اور دینی مراکز میں اس کے متعلق اعلانات کئے جاتے ہیں۔

③ کسی قدآور شخصیت کو غائبانہ نماز جنازہ کی امامت کے لئے مدعو کیا جاتا ہے۔

④ علاقہ بھر سے لوگوں کو جمع کرنے کے لئے مختلف ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں۔

⑤ خواتین کو وہاں لے جانے کے لئے بسوں کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔

⑥ مزعومہ تحریک کو زندہ رکھنے کے لئے تقاریر کا اہتمام کیا جاتا ہے جس کے لئے مقررین کو دعوت دی جاتی ہے۔

⑦ دھواں دار تقاریر سے خوب لوہا گرم کیا جاتا ہے، پھر شعبہ مالیات کو مضبوط کرنے کے لئے خواتین وحضرات سے چندہ کی اپیل کی جاتی ہے۔

⑧ آخر میں پانچ منٹ، دس منٹ میں شہید کا غائبانہ نماز جنازہ پڑھ کر عوام الناس کو فارغ کردیا جاتا ہے۔

اس انداز سے شہید کا غائبانہ نماز جنازہ پڑھنے کے متعلق خود تحریک جہاد برپا کرنے والے بعض حضرات بھی مطمئن نہیں ہیں اور اپنے عدم اطمینان کا برملا اظہار کرتے ہیں لیکن بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر تحریک کے ساتھ وابستہ رہنے میں عافیت محسوس کرتے ہیں بوقت ضرورت ان کی نشاندہی بھی کی جاسکتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی طرف سے جہاد کے احکام ومسائل کا انسائیکلو پیڈیا ''الجہاد الاسلامی'' نامی کتاب جو تقریباً 900 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں شہید کی غائبانہ نماز جنازہ کا عنوان سرے سے غائب ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کو خود بھی اس کے متعلق شرح صدر حاصل نہیں۔ بہرحال ہمارے نزدیک مذکورہ بالا انداز سے شہید کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا محل نظر ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ عذاب قبر کی کوئی حقیقت نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حساب وکتاب کے لئے قیامت کا دن رکھا ہے، اس دن میں لوگوں کا حساب ہوجائے گا تو پھر جزا وسزا کا معاملہ شروع ہوگا جب تک حساب وکتاب نہیں ہوجاتا اس وقت تک نہ کوئی سزا ہے نہ جزا قبر صرف مردوں کو دفن کرنے کے لئے ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ عذاب قبر کے متعلق قرآن وحدیث کے مطابق ہماری راہنمائی فرمائیں، واضح رہے کہ جن لوگوں کا موقف بیان ہوا ہے ان کا کہنا ہے کہ عذاب قبر سے متعلق احادیث صحیح نہیں ہیں؟

جواب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں عذاب قبر کے متعلق ایک عنوان قائم کیا ہے، اس کے تحت ایک حدیث لاتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک یہودی عورت آئی اور عذاب قبر کا تذکرہ کرتے ہوئے ذکر کیا کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو عذاب قبر

سے محفوظ رکھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ''عذاب قبر برحق ہے''۔ [صحیح بخاری، الجنائز:۱۳۷۲]

اس کے علاوہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد احادیث کا حوالہ دیا ہے جن میں عذاب قبر کی صراحت ہے لیکن سوال میں جن لوگوں کا حوالہ دیا گیا ہے وہ احادیث کے منکر ہیں کیونکہ یہ ان کے موقف کے خلاف ہیں اس لیے ایسے لوگوں کیساتھ جزوی مسائل میں الجھنے کی بجائے بنیادی مسئلہ پر بات کرنی چاہیے کہ حدیث کی کیا حیثیت ہے؟ کیا اس کی بنیاد وحی پر مبنی ہے؟ کیا ان کے بغیر تمام شریعت کو صرف قرآن پاک سے ثابت کیا جا سکتا ہے چونکہ سوال عذاب قبر کے متعلق ہے، وہ بھی ان لوگوں کے حوالہ سے جو صحیح احادیث کو نہیں مانتے، اس لئے ہم اسے قرآن سے ثابت کرتے ہیں، اختصار کے پیش نظر صرف ایک آیت پیش خدمت ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تو اس سلسلہ میں متعدد آیات کا حوالہ دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور آل فرعون خود ہی برے عذاب میں گھر گئے وہ صبح و شام آگ پر پیش کیے جاتے ہیں۔

اور جس دن قیامت قائم ہوگی تو (حکم) ہوگا کہ آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کر دو۔'' [۴۰/المؤمن:۴۶]

اس آیت میں صراحت ہے کہ آل فرعون کے غرق ہونے کے دن سے لے کر قیامت تک ان کی ارواح کو ہر روز صبح و شام اس دوزخ پر لا کھڑا کیا جاتا ہے، جس میں وہ قیامت کے دن اپنے جسموں سمیت داخل ہونے والے ہیں۔ موت سے قیامت تک کا عرصہ ''برزخ'' کہلاتا ہے اور یہ قبر کے جملہ مراحل ہیں۔ اس آیت کریمہ میں عذاب برزخ، دوسرے الفاظ میں ''عذاب قبر'' کی صراحت ہے۔ جس سے منکر حدیث کو بھی انکار نہیں، عذاب قبر عقلی لحاظ سے بھی غیر ممکن نہیں، ہمارے ہاں ملزم کو پکڑ کر حوالات میں رکھا جاتا ہے وہاں وہ مصائب و آلام سے دوچار ہوتا ہے، اس پر مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ فیصلے کے دن کے بعد اسے حوالات سے نکال کر جیل کی کوٹھری میں بند کر دیا جاتا ہے، جرم ثابت ہونے سے پہلے اسے جس قید و بند میں رکھا جاتا ہے اور وہاں اسے تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسے کس کھاتہ میں ڈالا جائے گا؟ عذاب قبر کا بھی یہی معاملہ ہے کہ اسے ایک ملزم کی حیثیت سے قبر میں رکھا جاتا ہے اور اسے تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے، پھر قیامت کے دن اس پر فرد جرم عائد کی جائے گی اور متعدد شہادتوں سے اس کے جرم کو ثابت کر کے، پھر مجرم کی حیثیت سے دوزخ کے حوالے کیا جائے گا مذکورہ آیت کریمہ میں تمام مراحل کو آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال نماز جنازہ پڑھتے وقت بعض لوگ دعائے استفتاح میں "وجل ثناؤك" کا اضافہ کرتے ہیں، کیا یہ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔؟

جواب ہم نے کسی سابقہ فتویٰ میں لکھا تھا کہ نماز جنازہ میں دعائے استفتاح پڑھنا محل نظر ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا پڑھنا ثابت نہیں، پھر اس دعا میں "وجل ثناؤك" کا پیوند لگا کر نماز جنازہ میں پڑھنا مزید خدشات و خطرات کا باعث ہے۔ ہمارے علم کے مطابق یہ اضافہ حدیث کی کسی معتبر یا غیر معتبر کتاب میں منقول نہیں ہے، کتب فقہ میں مثلاً: ہدایہ اور درمختار وغیرہ میں کسی قسم کے حوالہ کے بغیر ان الفاظ کو ذکر کیا گیا ہے، حدیث میں ہے کہ ''جس نے ہمارے امر یا عمل کے خلاف کوئی کام کیا وہ مردود ہے۔''

[صحیح بخاری، الاعتصام، باب نمبر:۲۰ تعلیقاً]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "جس نے ہمارے دین میں کسی نئی چیز کو رواج دیا وہ بھی مردود ہے۔" [صحیح بخاری، الصلح: ۲۶۹۷]

ان حقائق کے پیش نظر دعائے استفتاح میں مذکورہ اضافہ انتہائی محل نظر ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال عورت معقول انتظام اور پردے کا بندوبست ہونے کی صورت میں نماز جنازہ میں شرکت کر سکتی ہے یا نہیں؟ کتاب و سنت کے مطابق جواب دیا جائے۔

جواب خواتین نماز جنازہ میں شرکت کر سکتی ہیں لیکن مردوں کی طرح جنازے کے پیچھے چل کر جانا ان کے لئے جائز نہیں ہے۔ روایات میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مسجد میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے جنازہ میں شرکت کی تھی۔

[صحیح مسلم، الجنائز: ۹۷۳]

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ہمیں، یعنی عورتوں کو جنازے کے ساتھ چلنے سے منع کیا گیا ہے، لیکن اس سلسلہ میں ہم پر سختی نہیں کی جاتی تھی یا تاکیداً منع نہیں کیا جاتا تھا۔ [صحیح بخاری، الجنائز: ۱۲۷۸]

اس روایت اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے عمل کے پیش نظر خواتین نماز جنازہ میں شرکت کر سکتی ہیں، لیکن انہیں دور دراز سے باقاعدہ اہتمام کے ساتھ جنازوں میں شرکت کے لئے لانا، اس شرکت کے لئے تحریک چلانا اور بسوں کا اہتمام کرنا شرعاً محل نظر ہے۔ زیادہ سے زیادہ مسجد وغیرہ میں اگر جنازے کا اہتمام ہو تو مسجد کے آس پاس کی خواتین اس جنازہ میں شریک ہو سکتی ہیں۔ اس کے لئے "شد رحال" کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ایسا کرنا شرعاً ثابت نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]
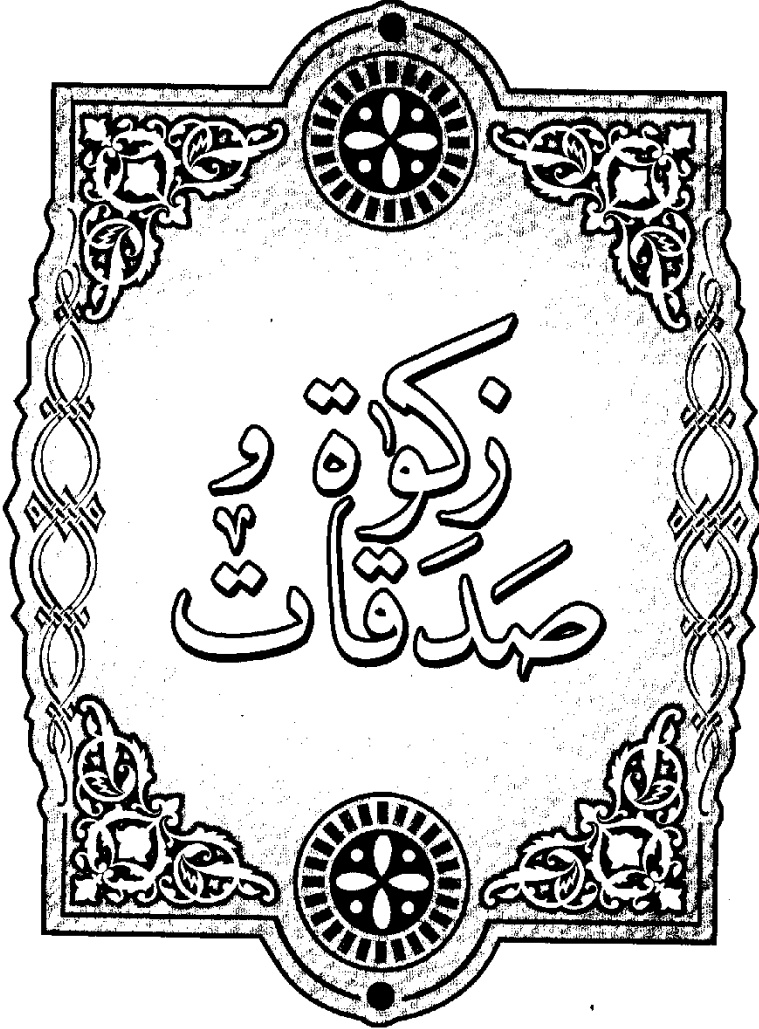
زکوٰۃ و صدقات

زکوٰۃ و صدقات

سوال عشر، زمین کی کس قسم کی پیداوار سے کتنا ادا کرنا پڑتا ہے، نیز پھلوں اور سبزیوں کے متعلق شریعت میں کیا حکم ہے، تفصیل سے لکھیں؟

جواب عشر کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ’’فصل کاٹتے ہی اس سے اللہ کا حق ادا کردو۔‘‘ [۶/الانعام:۱۴۱]

نیز قرآن کریم میں ہے کہ ’’اے ایمان والو! جو کچھ تم نے کمایا ہے اور جو کچھ ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا ہے اس میں سے اچھی چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔‘‘ [۲/البقرہ:۲۶۷]

پہلی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے حق سے مراد صدقہ ہے جو اللہ کے نام پر زمین کی پیداوار سے فقراء اور مساکین کو دیا جائے، کیونکہ یہ فصل اللہ نے ہی اپنے فضل سے پیدا کی ہے۔ اس مقام پر اس ’’حق‘‘ کی مقدار معین نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کی تعیین خود رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے، چنانچہ آپ کا فرمان ہے: ’’وہ زمین جسے بارش یا قدرتی چشمہ کا پانی سیراب کرتا ہو یا کسی دریا کے کنارے ہونے کی وجہ سے خود بخود سیراب ہو جاتی ہو، اس قسم کی زمین کی پیداوار سے دسواں حصہ بطور عشر لیا جائے گا اور وہ زمین جسے کنویں وغیرہ سے پانی کھینچ کر سیراب کیا جاتا ہو اس کی پیداوار سے بیسواں حصہ لیا جائے گا۔‘‘ [صحیح بخاری، الزکوٰۃ:۱۴۸۳]

اس حدیث میں پیداوار دینے والی زمین کی حقیقت اور اس کی پیداوار پر مقدار عشر کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ شریعت نے مقدار عشر کے لئے زمین کی سیرابی، یعنی پیداوار لینے کے لئے پانی کو مدار قرار دیا۔ اگر کھیتی کو سیراب کرنے کے لئے پانی بسہولت دستیاب ہے اس پر کسی قسم کی محنت یا مشقت نہیں اٹھانا پڑتی تو اس میں پیداوار کا عشر، یعنی دسواں حصہ بطور زکوٰۃ نکالنا ہوگا اس کے برعکس اگر پانی حاصل کرنے کے لئے محنت و مشقت اٹھانا پڑتی ہے یا اخراجات برداشت کرنا پڑیں تو اس میں نصف عشر، یعنی بیسواں حصہ ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر زمینوں کی آبپاشی دو طرح سے ہے۔

(الف) نہری پانی، حکومت نے اس کے لئے ایک مستقل محکمہ ’’انہار‘‘ قائم کر رکھا ہے۔ اس پر زمیندار کو محنت و مشقت کے علاوہ اخراجات بھی برداشت کرنا پڑتے ہیں، آبیانہ وغیرہ ادا کرنا ہوتا ہے، اس کے باوجود نہری پانی فصلوں کے لئے کافی نہیں ہوتا، اس کے لئے دوسرے ذرائع سے ضروریات کو پورا کیا جاتا ہے۔

(ب) ٹیوب ویل: اول ٹیوب ویل لگانے کے لیے کافی رقم درکار ہوتی ہے۔ جب اس کی تنصیب مکمل ہو جاتی ہے، تو پھر محکمہ واپڈا کا حکم و کرم شروع ہو جاتا ہے، اس کا کنکشن حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اس کے بعد تیسرا مرحلہ جو مسلسل جاری رہتا ہے وہ ماہ بماہ کمر توڑ اور اعصاب شکن بجلی کے بل کی ادائیگی ہے یا پھر گھنٹے کے حساب سے پانی خرید کر فصل کو سیراب کیا جاتا ہے، لہٰذا زمین سے پیداوار لینے کے لئے ذاتی محنت و مشقت اور مالی اخراجات کے پیش نظر ہمارے ہاں پیداوار پر نصف، یعنی بیسواں حصہ بطور زکوٰۃ دینا ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ اس کے علاوہ جتنے بھی اخراجات ہیں ان کا تعلق زمین کی سیرابی یا آبپاشی سے نہیں بلکہ وہ اخراجات زمیندار پیداوار بچانے یا بڑھانے کے لئے کرتا ہے، مثلاً: کھاد یا سپرے وغیرہ یا پھر زمیندار اپنی محنت ومشقت سے بچنے اور اپنی سہولت کے پیش نظر کرتا ہے، مثلاً: بوتے وقت ٹریکٹر کا استعمال، کٹائی کے وقت مزدور لگانا، فصل اٹھاتے وقت تھریشر وغیرہ کا استعمال۔

مذکورہ حدیث میں مقدار جنس کو بیان کیا گیا ہے، یعنی کتنے نصاب پر عشر واجب ہوتا ہے؟ اس کی وضاحت ایک دوسری حدیث میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''پانچ وسق سے کم پیداوار میں زکوۃ، یعنی عشر نہیں ہے۔'' [صحیح بخاری، الزکوۃ:۱۴۸۴]

عشر کے لئے یہ غلہ کا نصاب ہے، اس سے کم پر عشر دینا ضروری نہیں کیونکہ اس سے کم مقدار تو کاشتکار یا زمیندار کے گھر کا سالانہ خرچہ ہی تصور کیا جائے گا۔ ہاں، پانچ وسق یا اس سے زیادہ عشر واجب ہوگا ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے گویا جنس کا نصاب 300 صاع ہوتا ہے۔ جدید اعشاری نظام کے مطابق ایک صاع 2 کلو 100 گرام کا ہوتا ہے اس حساب سے پانچ وسق کے 630 (چھ صد تیس) کلوگرام ہوتے ہیں جبکہ بعض اہل علم کے نزدیک ایک صاع اڑھائی کلو کے مساوی ہوتا ہے، لہٰذا ان کے ہاں نصاب 630 کلوگرام مقرر کیا جانا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ شریعت نے مقدار عشر کے لئے زمین کی سیرابی کو مدار بنایا ہے۔ اس کے علاوہ جو بھی اخراجات ہیں ان کا تعلق مقدار عشر سے نہیں، لہٰذا جہاں زمین کی سیرابی کے لئے قدرتی وسائل ہوں وہاں پیداوار سے دسواں حصہ (عشر) لیا جائے گا اور جہاں زمین کو سیراب کرنے کے لئے قدرتی وسائل نہیں بلکہ محنت ومشقت اور اخراجات کرنا پڑیں تو وہاں بیسواں حصہ، یعنی نصف عشر دینا ہوگا، ہمارے ہاں عام طور پر پیداوار کا بیسواں حصہ دیا جاتا ہے۔ پیداوار سے دسواں حصہ دینے والی زمین بہت کم ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے دور میں عام طور پر مہاجرین تجارت اور انصار زراعت پیشہ تھے۔ وہ لوگ زمین کو خود کاشت کرتے تھے اور خود ہی کاٹتے اور فصل اٹھاتے تھے۔ زمین کی سیرابی کے لئے محنت ومشقت اور اخراجات برداشت کرنے کی وجہ سے انہیں پیداوار سے بیسواں حصہ بطور عشر ادا کرنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ کسی قسم کے اخراجات پیداوار سے منہا نہیں کئے جاتے تھے۔ اب عشر کے متعلق کچھ مزید وضاحتیں پیش خدمت ہیں:

(الف) زرعی زکوۃ کے لئے سال گزرنے کی شرط نہیں ہے بلکہ جب بھی فصل کاٹی جائے اس وقت زکوۃ واجب ہوگی، جیسا کہ درج ذیل آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے: ''فصل کاٹتے وقت ہی اس سے اللہ کا حق ادا کرو۔'' [۶/الانعام:۱۴۱]

(ب) رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں گندم، جو، منقیٰ اور کھجور سے زکوۃ لی جاتی تھی، مگر ہمارے ہاں اور بھی اجناس بکثرت پیدا ہوتی ہیں، مثلاً: چاول، چنے، جوار، باجرہ اور مکئی وغیرہ ان سب اجناس پر زکوۃ واجب ہوتی ہے۔

(ج) ایسی سبزیاں اور ترکاریاں جو جلدی خراب نہیں ہوتیں، مثلاً: آلو، پیاز، لہسن، ادرک اور پیٹھا وغیرہ۔ ان پر زرعی زکوۃ، یعنی عشر واجب ہوگا۔ لیکن جو ترکاریاں تازہ استعمال ہوتی ہیں اور جلدی خراب ہو جاتی ہیں، مثلاً: کدو، ٹینڈا، کریلے اور توریاں وغیرہ ان پر زرعی زکوۃ نہیں بلکہ سال کے بعد ان کے منافع پر تجارتی زکوۃ عائد ہوتی ہے، یعنی اڑھائی فیصد یا چالیسواں حصہ ادا کرنا ہوتا ہے۔

(د) پھلوں میں بھی زرعی زکوۃ ہے۔ بشرطیکہ انہیں دیر تک استعمال کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں منقیٰ اور کھجور سے عشر

ادا کیا جاتا تھا لیکن ہمارے ہاں ان کے علاوہ اور بھی بہت سے خشک پھل پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً: اخروٹ، بادام، خوبانی، مونگ پھلی وغیرہ اگر اس قسم کے پھل حدِ نصاب کو پہنچ جائیں تو ان پر زرعی زکوۃ واجب ہوگی۔

(ھ) کپاس بھی زمینی پیداوار ہے اور ہمارے ملک میں خاصی منفعت بخش فصل ہے، لہٰذا اس میں بھی عشر ادا کرنا ہوگا، یعنی بیس من سے ایک من بطور عشر ادا کیا جائے اگر کوئی کاشت کار تجارت پیشہ بھی ہے تو اسے چاہیے کہ اگر کپاس کی پیداوار حد نصاب کو پہنچ جائے تو اس سے پہلے عشر ادا کرے اور پھر اگر اسے تجارت میں فروخت کر دیتا ہے تو اس کی رقم حد نصاب کو پہنچ جائے تو تجارتی زکوۃ بھی ادا کرے، یعنی کھیتی کا حساب علیحدہ ہوگا اور تجاری مال کی زکوۃ کا حساب الگ ہوگا۔ تجارتی مال کی رقم، خواہ کہاں سے بھی آئے، اس سے زکوۃ ادا کرنا ضروری ہے۔ کپاس کا ذکر حدیث میں بھی ہے، چنانچہ ابیض بن حمال رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور صدقہ وغیرہ کی معافی کے لئے درخواست کی تو آپ نے فرمایا: ''اے قوم سبا سے تعلق رکھنے والے! صدقہ کی ادائیگی ضروری ہے۔'' پھر اس نے مزید وضاحت کی کہ ہم تو صرف کپاس کاشت کرتے ہیں اور سبا پر جب آفت آتی ہے تو مارب مقام پر تھوڑی بہت کپاس کاشت ہوتی ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ستر جوڑے سالانہ وصول کرنے پر اس سے صلح کر لی۔ [ابوداود، الخراج: ۳۰۲۸]

مختصر یہ ہے کہ کپاس سے بھی عشر دینا ہوگا۔

(و) ہمارے بعض علاقوں میں گنا بھی کاشت کیا جاتا ہے۔ اگر اسے ملوں کو فروخت کر دیا جائے تو اس پر تجارتی زکوۃ ہوگی اور اگر اسے بطور چارہ استعمال کر لیا جائے تو قابل معافی ہے، اگر اس کماد سے گڑ شکر یا چینی بنائی جائے تو اس سے عشر دینا ہوگا بشرطیکہ حد نصاب کو پہنچ جائے۔

(ز) اگر کسی نے اپنی زمین کسی دوسرے کو عاریۃً برائے کاشت دی ہے تو اس صورت میں جس نے فصل کاٹی ہے وہی اس کا عشر وغیرہ ادا کریگا۔ مالک زمین کے ذمے اس کی ادائیگی نہیں ہے کیونکہ اسے کوئی فائدہ نہیں ہورہا، اگر زمین کے مالک نے کسی دوسرے کو طے شدہ حصے پر کاشت کرنے کے لئے دی ہے تو اس صورت میں دو موقف ہیں:

① ہر ایک کا حصہ اگر حد نصاب کو پہنچ جائے تو اس سے عشر دینا ہوگا اگر کسی کا بھی حصہ نصاب تک نہیں پہنچتا تو کسی پر عشر واجب نہیں، یعنی جس شخص کا حصہ حد نصاب کو پہنچ جائے گا اسے اپنے حصے سے عشر دینا ہوگا۔

② امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کا یہی موقف ہے کہ اگر مجموعی پیداوار حد نصاب کو پہنچ جائے تو ہر ایک اپنے حصے کے مطابق عشر دے گا یا عشر ادا کرنے کے بعد دونوں طے شدہ حصوں کے مطابق پیداوار کو تقسیم کر لیں گے۔

ہمارے نزدیک یہ دوسرا موقف وزنی معلوم ہوتا ہے، نیز اس میں غرباء و مساکین کا بھی فائدہ ہے۔ خیبر کی زمین بھی پیداوار کے لئے طے شدہ حصے کے عوض کاشت کی جاتی تھی چونکہ یہودی عشر ادا کرنے کے پابند نہیں تھے اس کے لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جو حصہ ملتا اگر وہ حد نصاب کو پہنچ جاتا تو اس سے اللہ تعالیٰ کا حصہ الگ کر دیتے تھے۔ اگر زمین کو ٹھیکے پر دے دیا جائے تو زمیندار چونکہ زمین کا مالک ہوتا ہے وہ ٹھیکے کی اس رقم کو اپنی مجموعی آمدنی میں شامل کر کے زکوۃ ادا کرے گا۔ بشرطیکہ وہ نصاب کو پہنچ جائے اور اس کی ضروریات سے فاضل ہو اور اس پر سال بھی گزر جائے۔ زمین، ٹھیکے پر لینے والا کاشت کرنے میں خود مختار ہوتا ہے اور پیداوار کا

مالک بھی وہی ہوتا ہے۔ وہ صاحب اختیار ہونے کی حیثیت سے عشر ادا کرے گا۔ ٹھیکے کی رقم اس سے منہا نہیں کی جائے گی، کاشت کار کو متعدد مالی اخراجات کی وجہ سے بیسواں حصہ دینے کی رعایت دی گئی ہے۔ اگر اس رعایت کے باوجود ٹھیکہ کی رقم، کھاد، سپرے کے اخراجات، کٹائی کے لئے مزدوری اور تھریشر وغیرہ کے اخراجات بھی منہا کر دیئے جائیں تو باقی کیا بچے گا۔ جو عشر کے طور پر ادا کیا جائے گا۔ لہٰذا ہمارا رجحان یہ ہے کہ کاشتکار کسی قسم کے اخراجات منہا کئے بغیر اپنی پیداوار سے بیسواں حصہ بطور عشر ادا کرے گا، بشرطیکہ اس کی پیداوار پانچ وسق تک پہنچ جائے۔ اگر اس سے کم ہے تو عشر نہیں، ہاں اگر چاہے تو فی سبیل اللہ دینے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال صدقۃ الفطر رمضان کے پہلے عشرہ میں ادا کیا جا سکتا ہے؟ احادیث اور تعامل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جواب مطلوب ہے؟

جواب صدقۃ الفطر کی فرضیت کا سبب فطر رمضان ہے۔ اس بنا پر یہ صدقہ، فطر کے ساتھ مقید ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اسے فطر رمضان سے پہلے نہیں ادا کرنا چاہیے تاہم اس کی ادائیگی کے دو وقت ہیں:

① وقت جواز، یہ عید سے ایک یا دو دن پہلے ہے یعنی اسے عید سے ایک یا دو دن پہلے ادا کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق حدیث میں ہے کہ وہ صدقہ فطر عید سے ایک یا دو دن پہلے سرکاری طور پر صدقہ وصول کرنے والوں کے حوالے کر دیتے تھے۔ [صحیح بخاری، الزکوٰۃ: ۱۵۱۱]

② وقت فضیلت: یہ عید کے دن نماز عید سے پہلے کا وقت ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے صدقہ فطر نماز سے پہلے ادا کر دیا تو یہ صدقہ قبول ہوگا اور جس نے اسے نماز عید کے بعد ادا کیا تو یہ صدقات میں سے ایک عام صدقہ ہے یعنی صدقہ فطر نہیں ہے۔'' [سنن ابی داود، الزکوٰۃ: ۱۶۰۹]

اگر کوئی نماز عید کے بعد تک اسے مؤخر کرتا ہے تو ایسا کرنا جائز نہیں ہے اس سے صدقہ فطر ادا نہیں ہوگا۔ ان تصریحات کے پیش نظر ہمارا رجحان یہ ہے کہ صدقہ فطر رمضان کے پہلے عشرہ میں ادا کرنا صحیح نہیں ہے۔ اہل علم کے ہاں راجح قول یہی ہے کہ صدقہ فطر کو اس قدر قبل از وقت ادا کرنا درست نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال میں کویت میں مقیم ہوں جبکہ میرے اہل خانہ پاکستان میں ہیں۔ کیا وہ میری طرف سے صدقہ فطر ادا کر سکتے ہیں اگر ادا کر سکتے ہیں تو کس حساب سے دیں گے؟

جواب صدقہ فطر کے دو مقاصد ہیں: ایک تو روزوں کی تطہیر کا باعث ہے اور دوسرا مساکین کی غذائی ضروریات کو پورا کرنا ہے۔ پہلے سبب کی وجہ سے صدقہ فطر روزے دار کے بدن کے تابع ہے یعنی جہاں وہ رہتا ہے وہ خود اپنی طرف سے صدقہ فطر ادا کرے۔ ہمارے نزدیک قیمت کی بجائے جنس سے اس کی ادائیگی ہونی چاہیے، کیونکہ محدثین کرام کا یہی موقف ہے۔ اگر اس نے قیمت ادا کرنی ہے تو ظاہر ہے جس ملک میں وہ رہائش پذیر ہے اسی ملک کی کرنسی کے مطابق وہ اس کی ادائیگی کرنے کا پابند ہے۔ البتہ یہ جائز ہے کہ اس کی طرف سے پاکستان میں رہنے والے اہل خانہ صدقہ فطر ادا کریں لیکن قیمت ادا کرتے وقت اس ملک کی کرنسی کا اعتبار کرنا ہوگا۔ جہاں وہ خود رہائش پذیر ہے۔ نیز اگر رہائشی ملک میں صدقہ فطر لینے والے مساکین نہیں ہیں تو اس صورت

میں کسی دوسرے ملک میں رہنے والے اس کی طرف سے صدقہ فطر ادا کر سکتے ہیں تاکہ وہاں کے مساکین کو دیا جاسکے۔اسی طرح اگر کوئی دائمی بیمار یا بوڑھا اپنے روزوں کا فدیہ دینا چاہتا ہو تو اسے بھی چاہیے کہ اپنے ملک کے حساب سے اس کی ادائیگی کرے، مثلاً: پاکستان میں تقریباً -/1500 روپے میں ایک ماہ تک دو ٹائم کا کھانا کھایا جاسکتا ہے، جبکہ کویت میں رہنے والے حضرات کم از کم تقریباً ایک دینار روزانہ کے حساب سے فدیہ ادا کریں گے۔اسی طرح انہیں پاکستانی کرنسی میں تقریباً چھ ہزار روپے ادا کرنا ہوں گے۔ بہرحال دوسرے ممالک کے رہنے والے اس کی طرف سے صدقۂ فطر ادا کر سکتے ہیں اور انہیں فدیہ بھی دیا جاسکتا ہے۔لیکن اخراجات کے لئے اپنے اس ملک کی کرنسی کا اعتبار ہوگا جہاں وہ رہائش رکھے ہوئے ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال صدقۂ فطر کس چیز سے ادا کیا جائے، کیا جنس کے بجائے اس کی قیمت دینا جائز ہے یا نہیں، نیز چاول وغیرہ بطور فطرانہ دیے جاسکتے ہیں؟

جواب احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن اجناس کو انسان بطور غذا استعمال کرتا ہے ان سے صدقۂ فطر ادا کیا جاسکتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں عموماً جو، کھجور، منقیٰ اور پنیر وغیرہ بطور خوراک استعمال ہوتے تھے، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو انہی اجناس خوردنی سے صدقہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے دور میں اپنی خوراک سے ایک صاع بطور فطرانہ ادا کرتے تھے اور ان دنوں ہماری خوراک جو، کھجور، منقیٰ اور پنیر ہوا کرتی تھی۔ [صحیح بخاری، الزکوۃ:۱۵۱۰]

اس حدیث کے پیش نظر صدقۂ فطر ہر اس چیز سے ادا کیا جاسکتا ہے جو سال کے بیشتر حصہ میں بطور خوراک استعمال ہوتی ہو، اس روایت میں گندم کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ صدقۂ فطر میں گندم دینا بھی جائز ہے، البتہ گندم کا ذکر ایک دوسری روایت میں آیا ہے۔ چنانچہ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں گندم میں سے دو مد، یعنی نصف صاع بطور فطرانہ ادا کرتے تھے۔ [مسند امام احمد، ص:۳۵۰، ج۶]

عرب میں دوسری اشیاء خوردنی کے مقابلہ میں گندم چونکہ مہنگی ہوتی تھی، اس لئے نصف صاع کا اعتبار کیا گیا ہے، بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کے باوجود گندم سے بھی ایک صاع دینے کے قائل اور فاعل تھے۔ ہمارے ہاں گندم عام دستیاب ہے اس لئے گندم سے ایک صاع ہی ادا کرنا چاہیے۔اسی طرح چاول بھی بطور صدقہ فطر ادا کئے جاسکتے ہیں، بہرحال حالات و ظروف کو مدنظر رکھتے ہوئے فطرانہ ادا کیا جائے اور اس میں مساکین کی پسندیدگی کا بھی خیال رکھا جائے۔ ہمارے ہاں عام طور پر مساکین کی ضرورت کے پیش نظر صدقۂ فطر میں نقدی دی جاتی ہے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے قیمت ادا کرنا ثابت نہیں ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فطرانہ کا مقصد ''مساکین کی خوراک ٹھہرایا'' ہے۔ [سنن ابن ماجہ، الزکوۃ:۱۸۲۷]

اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ فطرانہ میں اشیاء خوردنی ہی دی جائیں محدثین کرام میں سے کسی نے بھی اس بات کی صراحت نہیں کی ہے کہ فطرانہ میں قیمت دینا جائز ہے بلکہ محدث ابن خزیمہ نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے اس باب میں صدقۂ فطر کے طور پر ہر قسم کی اشیاء خوردنی ادا کرنے کا بیان ہے، نیز اس شخص کے خلاف دلیل ہے جو صدقۂ فطر میں پیسے اور نقدی ادا کرنے کو

جائز خیال کرتا ہے۔ [صحیح ابن خزیمہ، کتاب الزکوٰۃ]

البتہ کسی عذر کی بنا پر قیمت ادا کی جاسکتی ہے، مثلاً: ایک شخص روزانہ بازار سے آٹا خرید کر استعمال کرتا ہے تو اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ پہلے بازار سے غلہ خریدے اور پھر اس سے صدقۂ فطر ادا کرے بلکہ وہ بازار کے نرخ کے مطابق اس کی قیمت ادا کرسکتا ہے۔ [مرعاۃ المفاتیح ص:۱۰۰،ج۴]

سوال موجودہ حالات میں بیت المال کی شرعی حیثیت کیا ہے کیا کسی گاؤں یا شہر میں بیت المال قائم کیا جاسکتا ہے۔ بیت المال میں کون سی چیزیں جمع ہوسکتی ہیں، نیز اس کے مصارف کون کون سے ہیں کیا اس سے مقامی مدرسہ اور مسجد کے اخراجات پورے کئے جاسکتے ہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ بیت المال کا قیام عمل میں لائے، کیا اس کے موارد اور مصارف اجتماعیت کا تقاضا کرتے ہیں۔ قرون اولیٰ میں اسلامی حکومتیں اس پر عمل پیرا تھیں اگر مسلمان حکومتیں اس فریضہ کو سرانجام نہ دیں تو کم از کم جماعتی سطح پر اس کا اہتمام ہونا چاہیے، لیکن انفرادی طور پر اسے قائم کرکے، پھر برائے نام جماعت سازی کرنا شرعاً درست نہیں ہے کیونکہ یہ تو مسلمانوں کا مال باطل ذرائع سے جمع کرنا اور صرف کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں دوسری بات یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ بیت المال میں مال جمع ہونے سے اس کی حیثیت نہیں بدل جاتی کہ اسے اپنی مرضی سے استعمال کیا جائے، اس سلسلہ میں جو روایات پیش کی جاتی ہیں کہ لوگ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو صدقہ کا گوشت دے دیتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے بطور ہدیہ قبول کرلیتے تھے۔ یہ روایت صحیح ہے لیکن اس کا استعمال برمحل نہیں ہے کیونکہ روایات کے مطابق صدقہ اپنے محل پر پہنچ جاتا تھا پھر جسے صدقہ دیا گیا ہو وہ اپنی مرضی سے استعمال کرتا تھا۔ لیکن بیت المال میں جو مال جمع ہوتا ہے وہ امانت کے طور پر ہوتا ہے تاکہ اس کا نگران اسے صحیح جگہ پر صرف کرے، وہ اپنی مرضی سے ایسی جگہ خرچ کرنے کا مجاز نہیں جو اس کا مصرف نہ ہو، ہمارے ہاں عام طور پر ''اپنا مال اپنوں پر'' خرچ کرنے کے لئے مندرجہ ذیل حضرات بیت المال قائم کرنے کا اہتمام کرتے ہیں:

☆ غیر معیاری اسلامی حکومتیں بیت المال قائم کرلیتی ہیں تاکہ بینکوں کے ذریعے لوگوں کے جمع شدہ سرمایہ سے جبراً اس سے زکوٰۃ کاٹی جائے، پھر اسے غلط مقاصد کی برآری کے لئے اپنی مرضی سے استعمال کیا جائے۔ اس حکومتی بیت المال میں دیگر ناجائز ذرائع کا مال جمع ہوتا ہے۔ مدارس کو چاہیے کہ وہ اس طرح کے بیت المال سے کسی قسم کا حکومتی تعاون قبول نہ کریں۔

☆ بڑی فیکٹریوں کے مالکان یا وسیع کاروبار رکھنے والے مذہبی حضرات اپنے ہاں ایک بیت المال کا اہتمام کرتے ہیں جس میں زکوٰۃ وغیرہ کو جمع کردیا جاتا ہے پھر فیکٹری میں قائم کردہ مسجد یا مدرسہ کے اخراجات اسی مد سے پورے کئے جاتے ہیں نیز فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدوروں کا تعاون بھی اس سے کیا جاتا ہے۔

☆ دینی ذہن رکھنے والے کسی گاؤں یا شہر کے رہائشی ایک ''اجتماعی'' بیت المال بنالیتے ہیں اس میں زکوٰۃ عشر، فطرانہ اور چرمہائے قربانی سے آمدہ رقم جمع کی جاتی ہے، پھر اس سے مسجد کے امام وخطیب کی تنخواہ یا لائبریری وغیرہ کے اخراجات کو پورا کیا جاتا ہے۔

☆ بعض دور اندیش حضرات اپنے طور پر ایک انفرادی سا بیت المال بنالیتے ہیں، پھر لوگوں سے چندہ مانگ کر اسے بھرا جاتا ہے

پھراس سے بچیوں کے جہیز کے نام سے استعمال کیا جاتا ہے، نگران ہونے کے حیثیت سے اپنی ضروریات کو بھی اس سے پورا کیا جاتا ہے۔اکثر مدارس کے مہتمم حضرات اس میں مبتلا ہیں اس انفرادی بیت المال پر اجتماعیت کا ٹھپہ لگانے کے لئے کاغذی طور پر جماعت سازی کا اہتمام بھی کرلیا جاتا ہے۔ان حالات کے پیش نظر ضروری ہے کہ بیت المال کی حیثیت کا تعین کیا جائے اوراس کے موارد و مصارف کے متعلق کتاب وسنت کی روشنی میں تفصیل سے گفتگو کی جائے۔لغوی اعتبار سے ہراس گھر کو بیت المال کہا جاتا ہے جو کسی قسم کے مال کی حفاظت کے لئے تیار کیا جائے لیکن اصطلاحی طور پراس سے مراد وہ ادارہ ہے جو مسلمانوں سے ان کے اجتماعی اموال وصول کر کے ان کے اجتماعی کاموں پر صرف کرنے کا ذمہ دار ہو،اسے اسلام کے ابتدائی دور میں بیت مال المسلمین یا بیت مال اللہ کہا جاتا تھا آخر کار اس پر بیت المال کا اطلاق ہونے لگا۔رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں اس قسم کے اجتماعی مال کو فوراً خرچ کردیا جاتا تھا۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں جزوی طور پر کتب تاریخ میں بیت المال کے قیام کا ذکر ملتا ہے، باضابطہ طور پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کا اہتمام کیا اوراس کے موارد و مصارف کے لئے ایک محکمہ تشکیل دیا،اس ترقی یافتہ دور میں بعض اسلامی ممالک کے ہاں وزارت مال ہے۔بیت المال یا بیت التمویل کے نام سے شعبہ قائم کردیا جاتا ہے۔

اسلامی دور میں بیت المال کو موارد و مصارف کے اعتبار سے چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔اگر ایک حصہ میں رقم نہ ہوتی تو اس کے مصارف ادا کرنے کے لئے دوسرے حصہ سے قرض لیا جاتا، پھر وسائل مہیا ہونے پر وہ رقم اس حصہ کو واپس کردی جاتی ،ان چار حصوں کی مختصر وضاحت حسب ذیل ہے:

① بیت الزکوٰۃ:اس میں ہر قسم کی زکوٰۃ جمع کی جاتی ہے اور زرعی پیداوار کا عشر بھی اس میں داخل کیا جاتا،قرآن کریم کے بیان کردہ آٹھ مصارف کو ادا کیا جاتا ہے۔چرمہائے قربانی اور فطرانہ وغیرہ بیت المال میں جمع نہیں ہوتا تھا بلکہ اسے فوراً حقداروں تک پہنچادیا جاتا تھا۔

② بیت الاخماس:مال فیئ اور غنیمت کا خمس اس مد میں جمع کیا جاتا،اگر کسی کو دور جاہلیت کا مدفون خزانہ ملتا تو اس کا خمس بھی اسی حصہ میں جمع ہوتا، پھر اسے قرآن کریم کے بیان کردہ پانچ حقداروں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

③ بیت الضوائع:لوگوں کا گراپڑا مال اس بیت المال میں جمع ہوتا تھا۔اس کے علاوہ مال مسروقہ کا مالک اگر نہ ملتا تو اسے بھی اس کھاتہ میں رکھا جاتا۔اگر اس قسم کے مال کا مالک نہ ملتا تو اسے ان محتاجوں پر خرچ کیا جاتا جن کا کوئی والی وارث یا سرپرست نہ ہوتا تھا۔

④ بیت مال فیئ:اسلامی بیت المال کا یہ اہم شعبہ ہوتا تھا۔اس کا ذریعہ مندرجہ ذیل جہات ہوتی تھیں:

☆ ہر قسم کا مال فیئ اس میں جمع ہوتا جس کی تقریباً نو اقسام ہیں۔

☆ مال غنیمت سے اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول ﷺ کا خمس۔

☆ سرکاری زمینوں کی پیداوار۔

☆ اس مسلمان کا ترکہ جس کا کوئی وارث نہ ہوتا۔

☆ قدرتی معدنیات، پٹرول، تیل اور گیس کی پیداوار کا پانچواں حصہ۔

☆ مختلف اوقات میں ضرورت رعایا پر لگایا جانے والا ٹیکس۔

☆ دوسرے ممالک سے سامان تجارت درآمد یا برآمد کرنے پر عائد کردہ کسٹم۔

☆ دوران ڈیوٹی سرکاری کارندوں کو عوام سے ملنے والے تحائف وغیرہ اسے دیانت دار حاکم وقت اپنی صوابدید پر مسلمانوں کی عام ضروریات پر خرچ کرنے کا مجاز ہوتا ہے، اس کی تفاصیل کتب فقہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس مختصر تمہیدی گزارشات کے بعد ہم سوال میں پیش کردہ شقوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں قائم شدہ غیر معیاری اسلامی حکومتوں کی غلط پالیسیوں اور غیر معتدل کارکردگی کی بنا پر بیت المال کا قیام جماعتی سطح پر ضروری ہے۔ لیکن یہ بیت المال جہادی تنظیموں جیسا نہیں ہونا چاہیے جس میں غریبوں، یتیموں، بیواؤں اور ناداروں کے مال پر شب خون مار کر اسے صوابدیدی فنڈ کے طور پر استعمال کیا جائے بلکہ حسب تفصیل بالا ہر مد کو اس کے بیان کردہ مصارف میں ہی استعمال کیا جائے۔ اسی طرح انفرادی طور پر بیت المال چلانے والوں پر کڑی نظر رکھتے ہوئے ان کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے، پھر صوبائی، ضلعی اور تحصیلی سطح پر اس کی شاخیں قائم ہوں۔ شہروں اور دیہاتوں میں بھی ذیلی یونٹ قائم کیے جائیں، البتہ ہر مسجد کا الگ بیت المال ہو، یہ غیر اسلامی فکر ہے۔ اس سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ ایسا کرنے سے اجتماعی نظم کمزور ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں چونکہ اسلامی قوانین کا فقدان ہے، اس لئے ہم اپنے بیت المال میں صرف زکوٰۃ اور عشر وغیرہ جمع کرسکتے ہیں۔ چرمہائے قربانی اور فطرانہ وغیرہ کو جمع تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس سے حاصل ہونے والی رقوم کو فوراً محتاجوں اور ضرورت مندوں میں خرچ کردیا جائے، زکوٰۃ اور عشر کے وہی آٹھ مصارف ہیں جنہیں قرآن کریم نے بیان کیا ہے اسے مقامی مسجد میں یا مقامی مدرسہ یا مقامی لائبریری پر صرف نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے لئے الگ فنڈ قائم کیا جائے جس میں مخیّر حضرات کے عطیات، عام صدقہ وخیرات وغیرہ جمع کئے جائیں۔ ہاں، اگر کوئی ایسا مدرسہ ہے جہاں مسافر غریب طلبا زیر تعلیم ہیں تو ان کی جملہ ضروریات بیت المال سے پوری کی جاسکتی ہیں اگر طلباء کی ضرورت کے پیش نظر مسجد بنانا ہو تو اس قسم کی مسجد پر زکوٰۃ وعشر کی رقم کو لگایا جاسکتا ہے، اسی طرح اگر کسی گاؤں کے رہائشی زکوٰۃ کے حقدار ہوں تو ایسے لوگوں کے لئے زکوٰۃ کی مد سے مسجد بھی بنوائی جاسکتی ہے، البتہ عام مساجد کے اخراجات بیت المال سے ادا نہیں کئے جاسکتے ہیں اور نہ ہی اسے مقامی مدرسہ یا مقامی لائبریری پر صرف کیا جاسکتا ہے، اپنے طور پر بیت المال کا اہتمام کرکے اس میں زکوٰۃ، عشر چرمہائے قربانی اور فطرانہ کی رقم جمع کرنا اور پھر اسے مسجد کی ضروریات پر صرف کرنا یا اس سے امام مسجد کی تنخواہ یا مقامی بچوں کی تعلیم کے لئے مدرس کی تنخواہ ادا کرنا ایک چور دروازہ ہے، جسے بند ہونا چاہیے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال پچھلے دنوں جب پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں قیامت خیز زلزلہ آیا تو ہر درددل رکھنے والے پاکستانی اور غیر پاکستانی نے اس کی ٹیسیں محسوس کیں، ملک بھر سے اہل ثروت حضرات نے فون پر رابطہ کیا کہ کیا ماہ رمضان کے مبارک مہینہ میں اپنے فاقہ زدہ متاثرین کا مال زکوٰۃ کے ذریعے تعاون کیا جاسکتا ہے؟

جواب بلاشبہ اللہ کی طرف سے ایسی نشانیاں ہمارے حکمرانوں اور عوام کی عبرت کے لئے ہوتی ہیں، تاکہ ہم اپنی روش اور طرز زندگی پر نظر ثانی کریں۔ ایسے حالات میں کئی ایک پہلوؤں سے ہمارا امتحان ہوتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ توبہ واستغفار کے ساتھ

ساتھ اپنی عملی زندگی کو بھی سنوارنے کی کوشش کریں۔ یقیناً اس قسم کے مصائب و آلام ہماری بداعمالی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ صورت مسئولہ میں ہمارا فرض ہے کہ سماوی اور زمینی آفتوں سے متاثرین کے ساتھ دل کھول کر تعاون کریں۔ صرف مال زکوٰۃ سے ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی اپنی جیب سے ان پر ایثار کریں۔ ایک دفعہ قبیلۂ مضر کے فاقہ زدہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے ننگے بدن لیکن جذبہ جہاد سے سرشار تلواریں لٹکائے ہوئے صرف اپنی تہبند پہنے ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کی حالت زار کو دیکھا تو انتہائی پریشان ہوئے۔ اس پریشانی کے عالم میں آپ کا رنگ فق ہو گیا۔ آپ نے ان سے دست تعاون بڑھانے کے لئے بایں الفاظ اپیل کی ''لوگو! نقد مال، غذائی مواد اور پہننے کے لئے لباس وغیرہ سے اپنے بھائیوں کے ساتھ تعان کرو، حتی کہ اگر کسی کے پاس کھجور کا ایک ٹکڑا دینے کی ہمت ہے تو وہ بھی ان پر صدقہ کر دے۔'' اس اپیل کا یہ اثر ہوا کہ پہننے کے لئے کپڑوں اور کھانے پینے کی اشیاء کے مسجد نبوی میں دو الگ الگ ڈھیر لگ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کی دریادلی دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور آپ کا چہرہ انور خوشی سے سونے کی طرح چمک اٹھا۔ [صحیح مسلم، الزکوٰۃ:۱۰۱۱]

حضرت قبیصہ بن مخارق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کسی شخص کی ضمانت دی، پھر اس کا ذمہ دار قرار پایا اور اس تاوان کے نیچے دب گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا کہ میرے ساتھ تعاون کریں آپ نے فرمایا کہ ''تم میرے پاس ٹھہرو جب صدقہ کا مال آئے گا تو تجھے بقدر حصہ دیا جائے گا، پھر اس مناسبت سے آپ نے اسے بطور وعظ فرمایا: ''صدقہ خیرات سے متعلق صرف تین شخص سوال کر سکتے ہیں ان میں سے ایک وہ شخص جسے ایسی آفت نے دبوچ لیا ہو کہ اس کا تمام مال ہلاک ہو جائے، ایسے شخص کے لئے سوال کرنا جائز ہے تاکہ اس کے حالات بہتر ہو جائیں اور اس کی محتاجی اور فاقہ زدگی دور ہو جائے۔'' [صحیح مسلم، الزکوٰۃ:۱۰۴۴]

ان احادیث کے پیش نظر قیامت خیز زلزلہ سے متاثرین کے ساتھ تعاون کرنا ضروری ہے، خواہ زکوٰۃ سے ہو یا عام صدقہ و خیرات سے یا اپنی جیب خاص سے، ہمیں اس نہج پر سوچنا چاہیے کہ کل ہم بھی متاثرین میں شامل ہو سکتے ہیں اگر آج ہم نے کسی کے ساتھ تعاون کیا تو کل ہمارا بھی تعاون ہو سکتا ہے یہ تعاون کرتے وقت دو چیزوں سے ہوشیار رہنا ہو گا:

1. آج کل حکومت نے تقریباً ہر بینک میں متاثرین کی امداد کے لئے اکاؤنٹ کھول دیئے ہیں اس حکومت کی دینی اور مذہبی پالیسی کے پیش نظر ہمیں توقع نہیں ہے کہ مصیبت زدگان تک ہمارا تعاون پہنچ سکے گا۔ ویسے بھی بیرونی حکومتوں نے اس قدر بھرپور تعاون کا اعلان کیا ہے کہ اس سے نقصان کی تلافی کے ساتھ ساتھ مسمار شدہ مکانات کی تجدید نو بھی ہو سکتی ہے لیکن ہمارا تجربہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ متاثرین کی اشک شوئی بہت کم ہوتی ہے۔ لہٰذا متاثرین کی امداد کرنے والے حضرات اس پہلو سے چوکس رہیں۔
2. زلزلہ آنے کے بعد نام نہاد سماجی تنظیمیں بھی ملک بھر میں متحرک ہو چکی ہیں۔ جگہ جگہ انہوں نے اپنے کیمپ لگا لیے ہیں اور گھر گھر جا کر متاثرین کے لئے تعاون جمع کرنے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ متاثرین کی امداد کرنے والے حضرات نام بدل بدل کر سامنے آنے والی تنظیموں سے بھی ہوشیار رہیں، ان کے ہاں بھی پیٹ پوجا زیادہ اور مصیبت زدگان کے لئے ہمدردی کے جذبات برائے نام ہوتے ہیں۔ متاثرین ہمارے ملک کے باسی ہیں ہمیں چاہیے کہ چند اہل دل مل کر کسی کو نمائندہ بنائیں اور خود متاثرین تک اپنا تعاون پہنچانے کا بندوبست کریں۔

سوال ایک آدمی حج کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے پاس صرف پچاس ہزار روپے تھے جو فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے کافی نہیں، چند مخیر حضرات نے زکوٰۃ سے اس کی بقیہ رقم پوری کر دی، اس شخص کی حج کے لئے درخواست منظور ہوگئی لیکن وہ حج پر جانے سے پہلے فوت ہوگیا، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ حج کے لئے بینک میں جمع شدہ رقم کی کیا حیثیت ہوگی کیا وہ تمام رقم زکوٰۃ شمار ہوگی یا مرحوم کا ترکہ خیال کیا جائے گا یا صرف وہی رقم زکوٰۃ شمار ہوگی جو مخیر حضرات نے زکوٰۃ سے دی تھی۔ قرآن وحدیث کے مطابق اس کا جواب دیں تاکہ ہماری الجھن دور ہو جائے؟

جواب بشرط صحت سوال واضح رہے کہ صورت مسئولہ میں مذکورہ آدمی کے پاس جو رقم پہلے سے موجود تھی اور جو مخیر حضرات نے مال زکوٰۃ سے اسے دی سب اس کی ذاتی شمار ہوگی اور اس کے فوت ہونے کے بعد اس کے ورثاء اس ترکہ کے حقدار ہیں۔ اس میں زکوٰۃ اور غیر زکوٰۃ کی تمیز نہیں ہوگی۔ کیونکہ صدقہ وخیرات جب اپنے مقام پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے احکام بدل جاتے ہیں اور لینے والے کے لئے ذاتی ملکیت بن جاتی ہے، پھر وہ اس میں جیسے چاہے تصرف کرسکتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ گوشت لایا گیا دریافت کرنے پر بتایا گیا کہ یہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا پر صدقہ کیا گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق فرمایا: ''یہ گوشت بریرہ کے لئے صدقہ تھا اور ہمارے لئے ہدیہ ہے۔'' [صحیح بخاری، الهبہ: ۲۵۷۷]

حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے وہ گوشت ہدیہ کے طور پر آپ کے گھر بھیجا تھا۔ اس لئے آپ نے اسے اپنے لئے ہدیہ قرار دیا۔ اسی طرح ایک واقعہ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کے متعلق بھی مروی ہے کہ آپ نے اسے قبول کرتے ہوئے فرمایا تھا یہ گوشت اپنے مقام پر پہنچ چکا ہے۔ [صحیح بخاری، الهبہ: ۲۵۷۹]

اس پر امام بخاری رحمہ اللہ نے یوں باب قائم کیا ہے: ''جب صدقہ کی حیثیت تبدیل ہو جائے'' حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ صدقہ جب فقیر کے پاس پہنچ جاتا ہے تو اس میں اس کے لئے تصرف کرنا جائز ہے، یعنی اسے فروخت کرنا یا کسی دوسرے کو ہبہ کرنا جائز ہے۔ [فتح الباری، ص۴۴۹، ج۳]

مذکورہ سوال کی وجہ سے جو رقم مخیر حضرات نے بطور زکوٰۃ اسے دی تھی اب وہ اس کی ملکیت شمار ہوگی، اس کے مرنے کے بعد اس تمام رقم میں وراثت کا قانون جاری ہوگا۔ [واللہ اعلم]

سوال میں آڑھت کا کاروبار کرتا ہوں اس کے ساتھ زمیندارہ بھی کر رکھا ہے۔ جس رقبہ پر کاشتکاری کرتا ہوں وہ میں نے ٹھیکہ پر لیا ہوا ہے کاشتکاری پر جو خرچ آتا ہے وہ رقم آڑھت کے ہی سرمایہ سے لیتا ہوں اور میں نے اس رقم کی زکوٰۃ ادا کر رکھی ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ پیداوار کا عشر ٹھیکہ کی رقم منہا کر کے ادا کرنا ہے یا مجھے کل پیداوار سے ادا کرنا ہوگا، نیز جو رقم میں آڑھت کے سرمایہ سے زمیندارہ پر خرچ کرتا ہوں اسے بطور قرض شمار کر کے خود کو مقروض قرار دے سکتا ہوں؟

جواب ہم نے اہلحدیث مجریہ ۱۷ اپریل ۲۰۰۴ شمارہ نمبر ۱۴ میں عشر سے متعلق ایک فتویٰ میں لکھا تھا کہ اگر زمین کو ٹھیکے پر دے دیا جائے تو زمیندار چونکہ زمین کا مالک ہوتا ہے وہ ٹھیکے کی اس رقم کو اپنی مجموعی آمدنی میں شامل کر کے زکوٰۃ ادا کرے گا بشرطیکہ وہ نصاب کو پہنچ جائے اور اس کی ضروریات سے فاضل ہو، نیز اس پر سال بھی گزر جائے۔ زمین ٹھیکے پر لینے والا کاشت کرنے میں

خود مختار ہوتا ہے اور پیداوار کا مالک بھی وہی ہوتا ہے تو وہ صاحب اختیار ہونے کی حیثیت سے عشر ادا کرے گا۔ ٹھیکے کی رقم اس سے منہا نہیں کی جائے گی۔ اس پر مزید عرض ہے کہ ایک آدمی زمین خرید لیتا ہے اور اس کا مالک بن جاتا ہے۔ خریدنے کے لئے ادا شدہ رقم کو زرعی پیداوار سے منہا نہیں کیا جاتا بلکہ کل پیداوار سے عشر ادا کیا جاتا ہے، اسی طرح ٹھیکے پر زمین کاشت کرنے والا بھی ایک یا دو سال تک زمین کا مالک ہی ہوتا ہے وہ بھی ٹھیکہ کی رقم کو پیداوار سے منہا نہیں کرے گا بلکہ وہ زمین کی مجموعی پیداوار سے عشر ادا کرے گا۔ اگر اس نے قرض لے کر ٹھیکہ ادا کیا ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں:

① وہ قرض کسی دوسرے شخص سے لیا ہے اور وہ اس کے ذمے واجب الادا ہے۔ ایسا قرض پیداوار سے منہا کیا جائے گا اس کے بعد جو پیداوار فاضل ہوگی اس سے عشر ادا کرنا ہوگا۔

② وہ ''قرض'' اس نے اپنے ہی کسی کاروبار سے لے کر زمین کا ٹھیکہ ادا کیا ہے اور اس کے ذمے واجب الادا نہیں ہے، اس قسم کا ''قرض'' پیداوار سے منہا نہیں ہوگا۔ صورت مسئولہ میں سائل نے اپنے ہی ایک کاروبار آڑھت سے رقم نکال کر ٹھیکہ ادا کیا ہے یہ ایسا قرض نہیں ہے جو اس کے ذمہ واجب الادا ہو، لہٰذا اس صورت میں وہ ''مقروض'' شمار نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح بعض لوگ پیداوار کے سلسلہ میں اٹھنے والے اخراجات کو پیداوار سے منہا کرنے کی گنجائش تلاش کرتے ہیں کاشتکار کو متعدد مالی اخراجات کی وجہ سے پیداوار نصف عشر، یعنی بیسواں حصہ دینے کی رعایت دی گئی ہے اگر اس رعایت کے باوجود ٹھیکہ کی رقم، کھاد، سپرے کے اخراجات اور کٹائی کے لئے تھریشر کی مزدوری بھی منہا کر دی جائے تو اس کے بعد باقی کیا بچے گا جس سے عشر ادا کیا جائے، لہٰذا ہمارا رجحان یہ ہے کہ کاشت کار کسی قسم کے اخراجات منہا کئے بغیر اپنی کل پیداوار سے بیسواں حصہ بطور عشر ادا کرے بشرطیکہ اس کی پیداوار پانچ وسق تک پہنچ جائے۔ جس کا جدید نظام کے مطابق 630 کلوگرام وزن بنتا ہے۔ اگر اس سے کم ہے تو عشر نہیں ہے، ہاں، اگر وہ چاہے تو فی سبیل اللہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ایک آدمی اپنے دو شادی شدہ بیٹوں کے ساتھ رہائش رکھے ہوئے ہے گھر میں کھانا وغیرہ بھی اکٹھا ہی کھایا جاتا ہے میری بیوی اور دونوں بیٹوں کی بیویوں کا زیور اگر جمع کیا جائے تو نصاب کو پہنچ جاتا ہے کیا ہمیں اس زیور سے زکوٰۃ دینا پڑے گی؟

جواب زکوٰۃ کے لئے ضروری ہے کہ انفرادی طور پر ایک کا زیور ےتولہ ۶ ماشہ ہو، اس میں چالیسواں حصہ زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر انفرادی طور پر ہر ایک کا اتنا نہیں ہے تو اس میں زکوٰۃ نہیں ہوگی، ان تمام کے زیورات کا مجموعی وزن اگر نصاب کو پہنچ جاتا ہے تو اس میں زکوٰۃ نہیں ہے اگرچہ کھانا وغیرہ اکٹھا ہی کیوں نہ ہو۔

سوال ایک آدمی کے ذمہ کچھ رقم واجب الادا ہے اور اب وہ اس قدر خستہ حال ہو چکا ہے کہ کسی صورت میں رقم ادا نہیں کر سکتا رقم لینے والا اپنی طرف سے زکوٰۃ کی مد سے کچھ رقم اسے دے دیتا ہے زکوٰۃ دینے کے بعد وہ آدمی خود یا اس کا کوئی عزیز مفلوک الحال آدمی سے اصل واجب الادا رقم کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے اور وہ اسے رقم واپس کر دیتا ہے قرآن و حدیث کی رو سے ان کا اس طرح لین دین کرنا کیسا ہے؟

جواب واضح رہے کہ صورت مسئولہ میں اگر نادہندہ آدمی واقعی اس قدر مفلوک الحال ہو چکا ہے کہ وہ زکوٰۃ کا حقدار ہے تو اس

صورت میں زکوٰۃ بھی ادا ہو جائے گی، پھر واجب الادا رقم کی واپسی کا مطالبہ اور اس کی واپسی بھی صحیح اور جائز ہے، اگر نادہندہ انسان مستحق زکوٰۃ نہیں ہے تو اس صورت میں نہ زکوٰۃ ادا ہو گی اور نہ ہی اس کی واپسی کو درست قرار دیا جائے گا کیونکہ ایسا کرنے سے محض حیلہ گری کے ذریعے اپنی رقم نکالی گئی تصور ہو گی کیونکہ جسے زکوٰۃ دی گئی ہے وہ سرے سے زکوٰۃ کا مستحق ہی نہیں تھا اگرچہ پہلی صورت میں بھی حیلہ کیا گیا ہے لیکن وہ جائز حیلہ ہے، جس کا قرآن و حدیث سے ثبوت ملتا ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام سے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

''اس طرح ہم نے یوسف علیہ السلام کے لئے تدبیر کی۔'' [۱۲/یوسف:۷۶]

اس میں یوسف علیہ السلام کا اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھنے کے لئے دوسرے بھائیوں کے سامان میں پیالہ رکھنا مراد ہے۔ اس آیت کریمہ سے مذکورہ حیلے کا جواز ملتا ہے، اس کے برعکس دوسری صورت میں جو حیلہ کیا گیا ہے، وہ ناجائز اور حرام ہے کیونکہ اس کے ذریعے ایک غیر مستحق کو حقدار ٹھہرا کر اسے زکوٰۃ دی گئی تاکہ اپنی سوختہ رقم برآمد کی جاسکے، لہٰذا جس حیلہ کے ذریعے کوئی حلال چیز حرام یا کوئی حرام چیز حلال ہو جائے وہ ناجائز ہو گا۔

مختصر یہ ہے کہ رقم نادہندہ مفلوک الحال کو زکوٰۃ دے کر اپنی رقم کا مطالبہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس طرح زکوٰۃ کی ادائیگی بھی ہو جائے گی۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی کو ہر ماہ ایک ہزار روپیہ بچت ہوتی ہے اور وہ ہزار روپیہ محفوظ ہی رہتا ہے، یعنی ایک سال کی بچت بارہ ہزار روپیہ ہے اب اس سے زکوٰۃ ادا کرنے کا کیا طریقہ ہو گا کیا وہ سال پورا ہونے پر ماہ بماہ زکوٰۃ دے گا کیونکہ بارہ ہزار روپیہ جمع ہونے کی بھی یہی صورت تھی یا کسی اور طریقہ سے زکوٰۃ کی ادائیگی ہو گی؟

جواب سال کے اختتام پر جو رقم بچت کی صورت میں موجود ہوتی ہے اگر وہ نصاب کو پہنچ جائے تو اس سے زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے زکوٰۃ ادا کرتے وقت یہ حساب نہیں لگایا جائے گا کہ رقم کے کچھ حصہ پر ابھی سال نہیں گزرا، اس کی حیثیت دکان جیسی ہے جس میں مال کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور سال کے آخر میں دکان کے موجودہ مال کی ملکیت پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے۔ خواہ کچھ مال زکوٰۃ ادا کرنے سے ایک ماہ قبل اس میں شامل ہوا ہو، تنخواہ دار ملازم کو چاہیے کہ سال کے اختتام پر اپنی پس انداز رقم سے اسی طریقہ کے مطابق زکوٰۃ ادا کرے، یعنی موجود رقم کا حساب کر کے زکوٰۃ نکالی جائے بشرطیکہ وہ نصاب کو پہنچ جائے، اسے ماہ بماہ زکوٰۃ ادا کرنے کے تکلف کی ضرورت نہیں اس میں زکوٰۃ دینے اور لینے والوں کی آسانی ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی کے پاس ایک لاکھ روپے ہیں جس کی اس نے زکوٰۃ ادا کر دی ہے اگلے سال پچاس ہزار مزید اس کے ساتھ مل جاتا ہے اب آئندہ پچاس ہزار روپے سے زکوٰۃ دینا ہو گی یا ایک لاکھ پچاس ہزار روپے سے کیونکہ ایک لاکھ روپے کی زکوٰۃ تو ادا کر دی گئی ہے۔

جواب زکوٰۃ کے لئے ضابطہ حسب ذیل ہے:

① پس انداز کیا ہوا مال نصاب کو پہنچ جائے۔

② وہ ضرورت سے زائد ہو۔

③ اس پر سال گزر جائے۔

صورت مسئولہ میں ڈیڑھ لاکھ پر زکوٰۃ دینا ہوگی کیونکہ اس میں مذکورہ شرائط پائی جاتی ہیں۔ ہاں، اگر اسے کسی مصرف میں استعمال کرلیا جائے تو اس میں زکوٰۃ وغیرہ نہیں ہوگی۔

سوال میں ایک سرکاری ملازم ہوں میرے پاس کوئی ذاتی مکان نہیں ہے میں نے اپنی تنخواہ میں سے تھوڑی رقم پس انداز کر کے اقساط پر دو پلاٹ اس لئے خریدے ہیں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ایک کو بیچ کر دوسرے پر مکان تعمیر کرسکوں، کیا ایسے ذاتی استعمال کے لئے خریدے گئے ان پلاٹوں پر زکوٰۃ دینا ضروری ہے؟ اولین فرصت میں جواب دیں۔

جواب زکوٰۃ کے لئے تین شرائط ہیں:

① رقم وغیرہ نصاب کو پہنچ جائے۔

② وہ ضروریات سے فاضل ہو۔

③ اس پر سال گزرے۔

صورت مسئولہ میں پلاٹوں کی مالیت اگرچہ نصاب کو پہنچتی ہے لیکن وہ ذاتی ضرورت کے لئے خریدے گئے ہیں، اس قسم کے پلاٹوں پر زکوٰۃ نہیں ہے، ہاں جو پلاٹ تجارتی مفاد کے پیش نظر خریدے گئے ہوں، ان کی بازاری قیمت کے مطابق ہر سال زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال موجودہ دور میں زکوٰۃ کے لئے سونے چاندی کا نصاب کیا ہے کیا ان کی زکوٰۃ میں قیمت دی جاسکتی ہے یا سونا چاندی ہی دینا ہوگا؟

جواب چاندی کا نصاب کم از کم پانچ اوقیہ ہے۔ [صحیح بخاری، الزکوٰۃ:۱۴۴۷]

ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے اس طرح دوصد درہم سے کم میں زکوٰۃ نہیں ایک درہم کا وزن 2.97 گرام ہے۔ اس طرح دوصد درہم کا وزن 594 گرام ہے اس سے کم مقدار میں زکوٰۃ نہیں ہے، اسی طرح سونے کے متعلق حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیس دینار سے نصف دینار اور چالیس دینار سے ایک دینار بطور زکوٰۃ وصول کرتے تھے۔ [ابن ماجہ، زکوٰۃ:۱۷۹۱]

تولہ ماشہ کے اعتبار سے چاندی کا نصاب ساڑھے باون تولے اور گرام کے لحاظ سے 594 گرام ہے۔ سونے کا نصاب ساڑھے سات تولہ اور گرام کے لحاظ سے 85 گرام ہے۔ اس نصاب پر چالیسواں حصہ یا اڑھائی فیصد زکوٰۃ دینا ہوتی ہے جس قدر مقدار زکوٰۃ دینا پڑے اس کی قیمت بھی موجودہ ریٹ کے لحاظ سے دی جاسکتی ہے۔ واضح رہے کہ سونا چاندی ڈھیلے کی شکل میں ہو یا زیورات کی صورت میں ہوں، ان میں زکوٰۃ فرض ہوگی، اسی طرح کاغذی نوٹ بھی سونے چاندی کے حکم میں ہیں جس شخص کے پاس سونے چاندی کے نصاب کی قیمت کے برابر یا اس سے زیادہ کرنسی نوٹ ہوں ان پر سال گزر چکا ہو اور وہ ضروریات سے فاضل ہوں تو زکوٰۃ دینا ہوگی۔ [واللہ اعلم]

حج و عمرہ

حج وعمرہ

سوال میں دمام میں رہتا ہوں۔ اپنی کمپنی کے ساتھ عمرہ کے لئے آیا لیکن عمرہ کے بعد حجامت بنائے بغیر ہی جلدی میں ان کے ساتھ دمام واپس آ گیا ہوں، اب میرے لئے کیا حکم ہے، میرا عمرہ ہوا ہے یا نہیں؟

جواب ہمارا معاملہ بھی عجیب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے معاملات کو بس اپنے مفادات کے مطابق ہی طے کرتے ہیں موجودہ صورت مسئولہ میں بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ کمپنی کی گاڑی عمرہ کے لئے مکہ آئی، لیکن اپنی مصروفیات کی وجہ سے حجامت بنوانے کا ٹائم نہیں مل سکا، اگر حجامت کے لئے کسی حجام کو تلاش کیا جاتا اور پھر حجامت بنوائی جاتی تو گاڑی کے نکل جانے کا اندیشہ تھا۔ اس موہوم خطرہ کے پیش نظر حجامت کئے بغیر ہی واپسی ہوگئی۔ اگر حجام کو تلاش کر کے حجامت بنوائی جاتی تو کون سی قیامت آ جاتی، زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ گاڑی نکل جاتی، حالانکہ ایسا ناممکن تھا کیونکہ جو گاڑی اپنے اہل کاروں کو لے کر آتی ہے اس نے انہیں لے کر جانا ہے۔ اگر بالفرض ایسا ہو جاتا تو اپنا کرایہ دے کر واپس جانے میں کون سی دشواری حائل تھی۔ دین اسلام میں بعض اوقات اگر کوئی مجبوری درپیش ہو تو اس کا حل موجود ہے، مثلاً: عمرہ حدیبیہ کے موقع پر حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کے سر میں اتنی جوئیں پڑ گئیں کہ وہ زمین پر گرنے لگیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کی مشکل کو دیکھا تو فرمایا کہ ''یہ جوئیں تمہارے لیے تکلیف کا باعث ہیں؟'' عرض کیا ہاں، فرمایا ''اپنے سر کو منڈوا دو، پھر فدیہ کے طور پر تین روزے رکھو یا چھ مساکین کو کھانا کھلا دو یا ایک بکری ذبح کر دو۔'' [صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۱۸۱۴]

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ قرآن کی آیت میرے متعلق ہی نازل ہوئی:

''جو شخص تم میں سے مریض ہو یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہو۔'' (تو سر منڈوا سکتا ہے بشرطیکہ) روزوں سے یا صدقہ سے یا قربانی سے ان کا فدیہ ادا کرے۔ [۲/البقرہ: ۱۹۶]

صورت مسئولہ میں بھی اگر بحالت احرام واپسی ہو جاتی اور وہاں جا کر حجامت بنوائی جاتی، پھر احرام کھول دیا جاتا تو اس کی گنجائش تھی، لیکن حجامت کے بغیر ہی احرام کھول دیا گیا، اس لئے سائل کو چاہیے کہ وہ تین دن کے روزے رکھ لے یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے یا ایک بکری بطور فدیہ ذبح کر دے اور اس کا گوشت فقراء میں تقسیم کر دے۔ اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار بھی کرے اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہم اپنے فوت شدہ بھائی کی طرف سے حج بدل کرانا چاہتے ہیں اس سلسلہ میں ہم نے اپنے قابل اعتماد قریبی رشتہ دار سے رابطہ قائم کیا جو مکہ مکرمہ میں رہتے ہیں اور انہیں پیشکش کی کہ اگر وہ ہمارے بھائی کی طرف سے حج بدل کریں تو اس سلسلہ میں اٹھنے والے جملہ اخراجات ہم برداشت کریں گے۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں حج بدل کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن کسی قسم کا خرچہ وغیرہ نہیں لوں گا کیا اس صورت میں ہمارے بھائی کی طرف سے حج بدل ہو جائے گا یا پاکستان سے کسی کو حج کے لئے بھیجنا ضروری ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب حج بدل کے سلسلہ میں کفایت شعاری سے کام نہیں لینا چاہیے، بلکہ کھلے دل سے اس کے اخراجات برداشت کئے جائیں ۔اس کے لیے ضروری ہے کہ جو ساتھی حج بدل کرنا چاہتے ہیں وہ پہلے حج کر چکے ہوں، پھر جس کی طرف سے حج بدل کیا جا رہا ہے اس کی جائے سکونت کا اعتبار کیا جائے کہ اگر وہ حج کرتا تو گھر سے لے کر واپس آنے تک کتنے اخراجات درکار ہوں گے اتنے اخراجات برداشت کرنا ضروری ہیں، خواہ کسی کو پاکستان سے بھیج دیا جائے یا مکہ مکرمہ سے کسی کو حج بدل پر آمادہ کر لیا جائے، وہاں پر رہنے والے کو حج بدل کی پیشکش کرنا کہ ہم اس کے اخراجات برداشت کریں گے۔مفت حج بدل کے مترادف ہے، اس لئے ہمارے نزدیک بہتر صورت یہ ہے کہ پاکستان سے کسی نیک میرت نمازی کا انتخاب کیا جائے اور اس کے گھر سے گھر واپس آنے تک کے اخراجات برداشت کئے جائیں۔اس کے علاوہ بھی اس کی خدمت کی جائے تاکہ خوش دلی سے اس فریضہ کو سرانجام دے۔اس سلسلہ میں مکہ میں کسی رہنے والے کو حج بدل کرنے کے لئے آمادہ کرنا اور پھر وہاں کے حساب سے اخراجات برداشت کرنے کی پیشکش کرنا شاید جائز تو ہو لیکن کسی صورت میں بہتر نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال میرے والدگرامی کا چندروز قبل انتقال ہوا، زندگی میں ان پر حج فرض نہیں ہوا تھا کیونکہ جب ان کے پاس زادسفر (رقم) کا بندوبست ہوا تو صحت کے حوالے سے سفر حج کے قابل نہ تھے۔اب ان کی وفات کے بعد حج بدل کا حکم ان کے ورثاء پر لاگو ہوگا یا نہیں اور اگر ہوگا تو ان کی طرف سے کون حج ادا کر سکتا ہے؟

جواب حج ارکان اسلام میں سے پانچواں رکن ہے اور یہ اس شخص پر فرض ہے جو اس کی استطاعت رکھتا ہو، استطاعت سے مراد یہ ہے:

① بیت اللہ شریف جانے اور واپس آنے کا خرچہ اس کے پاس موجود ہو۔

② اس کی عدم موجودگی میں گھر کے اخراجات کے لئے فاضل رقم موجود ہو۔

③ سفر حج پر امن ہو اور اس کے مال و جان کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔

④ جسمانی صحت اس قابل ہو کہ اس سفر کی صعوبتوں کو برداشت کر سکتا ہو۔

اگر کسی کے پاس حج اور اہل خانہ کے اخراجات موجود ہیں اور راستہ بھی پر امن ہے، مگر جسمانی صحت ساتھ نہیں دیتی تو وہ کسی تندرست شخص کو اپنی طرف سے حج کروا سکتا ہے۔جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حجۃ الوداع کے موقع پر ایک عورت آئی اور اس نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ کا فریضہ جو اس کے بندوں پر عائد ہے اس نے میرے بوڑھے باپ کو پالیا ہے مگر وہ سواری پر بیٹھنے کے قابل نہیں ہے تو کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں تو اس کی طرف سے حج کر سکتی ہے۔'' [صحیح بخاری، الحج:۱۵۱۳]

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ معذور آدمی اگر چاہے تو کسی کو اپنا نائب مقرر کر کے حج کرا سکتا ہے، اسے ''حج بدل'' کہتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ جسے حج بدل کے لئے بھیجا جائے وہ پہلے خود اپنا فریضہ حج ادا کر چکا ہو، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو کہا تھا کہ ''پہلے اپنی طرف سے حج کرو پھر شبرمہ کی طرف سے حج کرنا۔'' [ابوداود، المناسک:۱۸۱۱]

صورت مسئولہ میں سائل کے والد کے پاس حج کے اخراجات تو موجود تھے لیکن وہ خود سفر حج کرنے کے قابل نہ تھے اور اسی حالت میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اب اگر مرحوم کی اولاد اس کی طرف سے حج بدل کرانا چاہتی ہے تو شرعاً اس کی اجازت ہے لیکن اس کے لئے ایسے نیک شخص کا انتخاب کیا جائے جو پہلے اپنا حج کر چکا ہو، لیکن اس سلسلہ میں ایک بات ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اگر مرحوم نے حج کے لئے کچھ رقم مختص کی تھی اور وہ وفات کے وقت موجود تھی تو اسے اب حج کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اب وہ رقم اس کا ''ترکہ'' شمار ہوگی، جسے ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا۔ اگر تمام ورثاء بطیب خاطر رضامند ہوں تو اس رقم کو حج کی مد میں استعمال کیا جا سکتا ہے یا پھر اولاد میں کوئی یا سب مل کر باپ کی طرف سے حج بدل کرانے کا بندوبست کریں۔ مختصر یہ ہے کہ ان کے ورثاء پر حج کا حکم لاگو نہیں ہے، ہاں، اگر چاہیں تو اس کی طرف سے حج بدل کرا سکتے ہیں اور جس نے حج بدل کرنا ہے پہلے وہ اپنا حج کر چکا ہو۔

[واللہ اعلم]

سوال حج کی ادائیگی سے پہلے عمرہ کرنے کے کیا احکام ہیں تفصیل سے تحریر کریں؟

جواب عمرہ کے طریقہ کے لئے بازار سے مستند کتب دستیاب ہیں۔ مختصراً اس کے مراحل حسب ذیل ہیں:

☆ میقات سے احرام باندھنا، احرام کی دو چادریں ہوتی ہیں۔ ایک کو اوڑھ لیا جائے اور دوسری کو پہن لیا جائے۔ احرام باندھتے وقت دونوں کندھے ڈھانپ لئے جائیں۔

☆ ''اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ عُمْرَةً'' کہہ کر نیت کی جائے، پھر حسب ذیل تلبیہ کہتے رہنا چاہیے: ''لَبَّیْكَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ لَبَّیْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ۔''

○ مسجد احرام میں داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھی جائے: ''اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ''

☆ طواف شروع کرنے سے پہلے دایاں کندھا ننگا کر لیا جائے۔

☆ حجر اسود کے سامنے کھڑے ہو کر ''بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ'' کہا جائے، ممکن ہو تو حجر اسود کو بوسہ دیا جائے یا اسے ہاتھ لگا کر چوم لیا جائے یا صرف ہاتھ سے اشارہ کر دیا جائے۔

☆ بیت اللہ کے سات چکر لگائے جائیں، پہلے تین چکر آہستہ آہستہ دوڑ کر لگائے جائیں، عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔

☆ یا تین چکروں کے بعد دونوں کندھے ڈھانپ لئے جائیں ہر چکر کی کوئی خاص دعا حدیث سے ثابت نہیں۔

☆ ہر چکر میں رکن یمانی کو ہاتھ لگائیں اگر ممکن نہ ہو تو ویسے ہی گزر جائیں۔

☆ رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان مندرجہ ذیل دعا پڑھیں۔ ''رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔''

☆ سات چکر مکمل کرنے کے بعد مقام ابراہیم کے پاس دو رکعت نماز برائے طواف ادا کریں۔

○ آب زمزم سیر ہو کر پئیں، اگر موقعہ ملے تو پھر حجر اسود کو چومیں یا ہاتھ لگائیں۔

☆ ممکن ہو تو ملتزم سے چمٹ کر خوب دعائیں کریں، پھر سعی کے لئے صفا کا رخ کریں۔

☆ صفا پر چڑھ کر قبلہ کی طرف منہ کر کے تین مرتبہ اللہ اکبر کہیں، پھر تین مرتبہ مندرجہ ذیل دعا پڑھیں:" لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ اَنْجَزَ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهُ" پھر حسب ضرورت دعا پڑھیں۔

☆ صفا سے نیچے اتر کر چلنا شروع کریں۔ جب سبز رنگ کی لائٹ کے پاس پہنچیں تو دوسری سبز لائٹ تک صرف مرد ذرا تیز دوڑیں، پھر مروہ پر پہنچ کر وہی کچھ کریں جو صفا پر کیا تھا۔

☆ صفا سے مروہ تک ایک چکر ہوتا ہے۔اس طرح کل سات چکر پورے کریں۔

☆ سعی کرنے کے بعد اپنے بال منڈوائیں یا کتروائیں لیکن منڈوانا افضل ہے اس کے بعد احرام کھول دیں۔

☆ اب عمرہ مکمل ہو چکا ہے۔اپنے معمول کے کپڑے پہن لیں۔

سوال حج مبرور کیا ہوتا ہے اور اس کی کیا فضیلت ہے؟

جواب رسول اللہ ﷺ نے حج مبرور کو افضل ترین اعمال سے شمار کیا ہے، چنانچہ آپ سے سوال کیا گیا کہ سب سے افضل عمل کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ''اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا'' پھر سوال ہوا اس کے بعد کس عمل کا درجہ ہے؟ فرمایا: ''اللہ کی راہ میں جہاد کرنا'' پھر سوال کیا گیا کہ اس کے بعد؟ تو آپ نے فرمایا کہ ''حج مقبول۔'' [صحیح بخاری، الحج:۱۵۱۹]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! ہمارے خیال کے مطابق جہاد فی سبیل اللہ افضل ترین عمل ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''تمہارے یعنی عورتوں کے لئے افضل ترین عمل حج مبرور ہے۔'' [صحیح بخاری، الحج: ۱۵۲۰]

حج کی فضیلت کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جو شخص حج کرے اور دوران حج شہوت انگیز اور اخلاق سے گری ہوئی باتوں سے پرہیز کرے، نیز اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے، تو گناہوں سے ایسے صاف ہو جاتا ہے، جیسے آج ہی اپنی ماں کے بطن سے پیدا ہوا۔'' [صحیح بخاری، الحج:۱۵۲۱]

ہمارے نزدیک حج مبرور یہی ہے کہ جس حج میں مذکورہ بالا فضیلت مل جائے، یعنی اسے کامل آداب وشرائط کے ساتھ اس طرح ادا کیا جائے کہ انسان کے سابقہ گناہ دھل جائیں اور آئندہ ان سے اجتناب کا خیال کرے، ویسے محدثین وعلمانے اس کی مختلف تعریفیں کی ہیں جن کی وضاحت حسب ذیل ہے:

☆ وہ حج جس کے دوران کسی گناہ کا ارتکاب نہ کیا جائے، حج مبرور کہلاتا ہے۔

☆ اس سے مراد وہ حج ہے۔ جو عند اللہ مقبول ہو جائے اس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ آئندہ اسے گناہوں سے نفرت ہو جائے۔

☆ وہ حج ہے جس میں ریاکاری، شہرت، فحاشی، لڑائی جھگڑا نہ کیا گیا ہو۔

☆ حج مبرور یہ ہے کہ آدمی پہلے کی نسبت بہتر ہو کر لوٹے اور گناہوں کی کوشش نہ کرے۔

☆ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حج مبرور یہ ہے کہ انسان اس کے بعد دنیا سے بے رغبت اور آخرت کا طلبگار بن جائے۔

درحقیقت حج میں تمام امور بالا شامل ہوتے ہیں۔ [مرعاۃ المفاتیح:۶/۱۹۰]

سوال ایک آدمی حج کے لئے تیار ہے جبکہ دوسری طرف طاغوتی طاقتیں اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے متحد ہو چکی ہیں، کیا ایسے حالات میں حج کے لئے جانا ضروری ہے یا اس کا خرچہ دعوت وجہاد میں دینا بہتر ہے کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب واضح رہے کہ ہوس ملک گیری اور باہمی افتراق نے عالم اسلام کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے، نتیجہ کے طور پر آج ہم صحیح اسلامی قیادت سے محروم ہیں اور ناگفتہ حالات سے دوچار ہیں۔ایک طرف ہمارے پڑوس میں ہندو غنڈے ہماری عزتوں سے کھیل رہے ہیں اور والدین کی آنکھوں کے سامنے ان کی جوان بیٹیوں کی عصمتوں کو تارتار کیا جا رہا ہے۔ دوسری طرف عام مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ انہیں خواہشات نفس اور دنیا پرستی کے علاوہ کوئی دوسری فکر دامن گیر نہیں ہے۔ایسے پرفتن حالات میں طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کرنا ہمارا ایک اہم فریضہ ہے۔صورت مسئولہ میں اگر حج فرض ہے تو اسے حج ادا کرنا چاہیے اور اپنی بساط کے مطابق دعوت وجہاد میں بھی حصہ لینا چاہیے لیکن ایسا کرنے سے فریضہ حج ساقط نہیں ہوگا۔اب چونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے فریضہ حج سے سبکدوش ہونے کے لئے موقع فراہم کر دیا ہے، اس لئے بہتر ہے کہ اسے ضائع نہ کیا جائے اور دعوت وجہاد کے لئے اپنی ہمت کے مطابق حصہ ڈالتا رہے۔ [واللہ اعلم]

روزہ و اعتکاف

روزہ واعتکاف
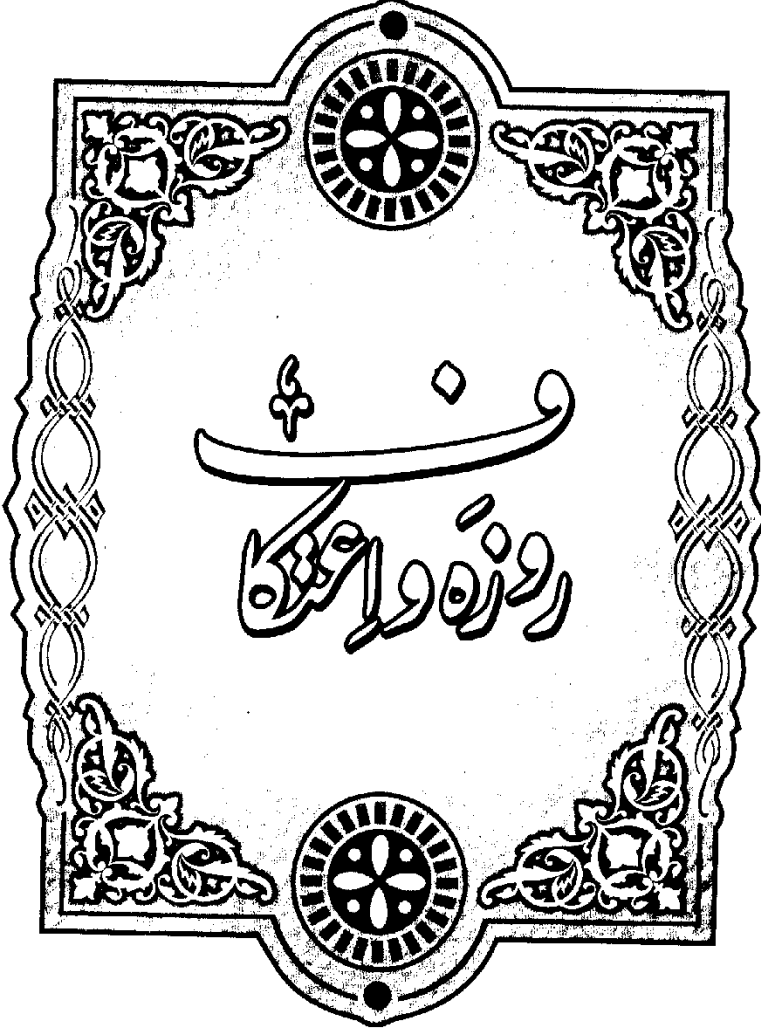
سوال بچے کو دودھ پلانے والی کو جب روزہ رکھنے سے دودھ میں کمی آجاتی ہو، کیا ایسے حالات میں اسے روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے اگر روزہ چھوڑ دے تو اس کی تلافی کیسے ہوگی؟

جواب دودھ پلانے والی اور حاملہ عورت کو اگر روزہ رکھنے سے اپنی یا بچے کی صحت خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو وہ روزہ چھوڑ سکتی ہے۔ اسی طرح اگر روزہ رکھنے سے دودھ کم ہونے کا اندیشہ ہو تو اسے روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے۔ ایسے حالات میں اسے رمضان کے بعد روزوں کی قضا دینا ہوگی۔ اگر آئندہ رمضان تک دودھ پلانے کا عذر قائم رہے اور اسے قضا دینے کی فرصت نہ ہو تو فدیہ دے کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائے۔ حدیث میں ہے کہ ’’اللہ تعالیٰ نے مسافر کو روزہ اور نصف نماز معاف کر دی ہے، اسی طرح حاملہ اور دودھ پلانے والی کو بھی روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی ہے۔‘‘ [مسند امام احمد، ص:۲۹، ج۵]

نیز اس قسم کی عورت مریض کے مشابہہ ہے جس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ’’اور جو بیمار ہو یا دوران سفر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر ان کی گنتی پوری کر لے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے کسی قسم کی سختی کا ارادہ نہیں رکھتا۔‘‘ [۲/البقرہ:۱۸۵]

اگر یہ عذر ہمیشہ کے لئے ہے تو وہ ایسے مریض کے مشابہہ ہے جو ہمیشہ مرض میں مبتلا رہتا ہے۔ دائمی مریض کے لئے قضا کے بجائے فدیہ دینا ہے، اس بنا پر دودھ پلانے والی عورت کا عذر بھی اگر دائمی ہے تو وہ فدیہ دے کر ترک کردہ روزوں کی تلافی کر سکتی ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال میری والدہ نے روزہ رکھا تھا اسے دوران روزہ قے آ گئی اس کے متعلق کیا شرعی حکم ہے، کیا قے آنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب قے آنے کی دو صورتیں ہیں:

① جان بوجھ کر ارادی طور پر قے کی جائے، ایسا کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

② خود بخود قے آ جائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ اس سلسلہ میں ایک حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جسے خود بخود قے آ جائے اس پر قضا نہیں ہے اور جو شخص جان بوجھ کر قے کرے وہ بعد میں اس روزہ کی قضا دے۔‘‘ [ابوداود، الصوم:۲۳۸۰]

اس بنا پر ہمارے نزدیک اگر قے کا غلبہ ہو تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا اگر دانستہ قے کی جائے تو روزہ جاتا رہے گا۔ اگر انسان محسوس کرے کہ اس کے معدے میں ہلچل برپا ہے اور اس میں جو کچھ ہے۔ وہ خارج ہو جائے گا تو اس صورت میں اسے جذب کرنے کی کوشش نہ کی جائے اور نہ ہی اسے روکا جائے۔ معمول کے مطابق وہ کھڑا یا بیٹھا رہے۔ اگر اس نے ارادۃً قے کی ہے تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا اگر ارادی فعل کے بغیر قے آ گئی تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، البتہ سیدنا امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ رجحان ہے کہ ہر قسم کی قے روزہ کے لئے نقصان دہ نہیں ہے، خواہ ارادی ہو یا غیر ارادی کیونکہ انہوں نے ایک عنوان قائم کر کے کچھ آثار پیش کئے ہیں جن میں سے ان کے موقف کی تائید ہوتی ہے، مثلاً: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ’’جب کوئی قے کرے

تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ وہ قے باہر نکالتا ہے کوئی چیز اپنے اندر داخل نہیں کرتا۔" [صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب نمبر:۳۲]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ "روزہ اس چیز سے ٹوٹتا ہے جو داخل ہو اور اس سے نہیں ٹوٹتا جو باہر خارج ہو۔"

[صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب نمبر:۳۲]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان آثار سے ایک قاعدہ اخذ کیا ہے کہ روزہ اس چیز سے فاسد ہوتا ہے جو پیٹ میں داخل ہو، باہر نکلنے والی چیز سے روزہ نہیں ٹوٹتا لیکن قاعدہ عمومی تو ہوسکتا ہے کلی نہیں ہے، کیونکہ خروج منی سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے ممکن ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مذکورہ بالا روایت صحیح نہ ہو، جس میں قے کے متعلق تفصیل بیان ہوئی ہے، جیسا کہ انہوں نے "التاریخ الکبیر" میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے واضح طور پر لکھا ہے کہ افطار اس صورت میں ہے جب دانستہ قے کرے اور غلبہ قے کی صورت میں عدم افطار ہے۔ ائمہ اربعہ کا بھی یہی موقف ہے اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ غلبہ قے کی صورت میں اس کے پیٹ میں جانے کا خوف نہیں ہوتا، کیونکہ طبیعت مدافعت کرتی ہے اور جب دانستہ قے کی جائے تو طبیعت مدفوع حصہ سے بخل کرتی ہے۔ اس بنا پر اس کے واپس لوٹنے کا احتمال رہتا ہے، اس لئے دانستہ قے کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ [فتح الباری، ص:۲۲۳، ج۴]

بہر حال ہمارے نزدیک تفصیل بالا کے مطابق خود بخود قے آنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا اور اگر دانستہ قے کی جائے تو اس سے روزہ ختم ہو جاتا ہے اور رمضان کے بعد اس کی قضا دی جائے۔ [واللہ اعلم]

سوال بحالت روزہ مشت زنی سے منی کا اخراج ہو جائے تو کیا اس سے روزہ ختم ہو جاتا ہے۔ اگر ختم ہو جاتا ہے تو اس کی تلافی کیسے ہوگی؟

جواب اگر روزہ دار نے بحالت روزہ مشت زنی کی اور اس سے انزال ہو گیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا اور اس پر اس روزے کی قضا لازم ہے۔ کفارہ کے متعلق مجھے اس کی صراحت نہیں مل سکی ہے، اگرچہ قرآن و حدیث میں کفارہ صرف جماع کی صورت میں واجب ہوتا ہے، لیکن مشت زنی کرنے والا، بحالت روزہ رمضان کی بے حرمتی کا مرتکب ہوا ہے اور اس نے جماع کی طرح لذت بھی حاصل کی ہے، اس لئے ہمارے رجحان کے مطابق سزا کے طور پر قضا کے ساتھ ساتھ اسے کفارہ بھی دینا چاہیے تاکہ آئندہ وہ ایسی حرکت نہ کرے، کفارہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے، جیسا کہ جماع کے متعلق کفارہ کی تفصیل حدیث میں بیان ہوئی ہے۔

[صحیح بخاری، ۱۹۳۶]

سوال اگر بحالت روزہ احتلام ہو جائے تو کیا اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

جواب احتلام سے روزہ خراب نہیں ہوتا کیونکہ احتلام انسان کا غیر ارادی فعل ہے، اس کے علاوہ وہ بحالت نیند مرفوع القلم ہوتا ہے، اس لئے روزہ کی حالت میں اگر کسی کو احتلام ہو جائے تو اس کا روزہ صحیح ہے۔ اس سے روزہ ٹوٹنے کی صراحت قرآن و حدیث میں بیان نہیں ہوئی، البتہ ایک چیز کی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ بعض لوگ رمضان المبارک کی راتیں فضول باتوں میں گزارتے ہیں، پھر سارا دن گہری نیند سوئے رہتے ہیں، اسی گہری نیند میں پراگندہ خیالات کی وجہ سے احتلام ہو جاتا ہے، ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے بلکہ روزے کو تلاوت قرآن، ذکر الٰہی اور دیگر ایسے امور کا ذریعہ بنایا جائے، جس سے اللہ تعالیٰ خوش ہو۔ رات کے وقت

گپیں لگاتے رہنا اور دن کو روزہ رکھ کر سوئے رہنا دانشمندی نہیں ہے اور نہ ہی ایسا کرنے سے روزے کا مقصد پورا ہوتا ہے۔

سوال کسی مجبوری کی وجہ سے بحالت روزہ ٹیکہ لگوانا جائز ہے۔ کیا اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟ شریعت اس سلسلہ میں ہماری کیا راہنمائی کرتی ہے۔

جواب روزے کی حالت میں ٹیکہ لگوانے کے متعلق ہم نے پہلے بھی فتویٰ دیا تھا۔ جیسے اب نقل کیا جا رہا ہے۔ روزے کی حالت میں ٹیکہ لگوانا کچھ تفصیل کا متقاضی ہے ''اگر ٹیکے کی حیثیت جسم کو غذا اور طاقت فراہم کرنے کی ہے تو یہ ٹیکہ تو بحالت روزہ کسی صورت میں جائز نہیں ہے کیونکہ اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس طرح کا ٹیکہ ورید، یعنی رگ میں لگایا جائے یا جسم کے کسی اور حصہ، یعنی گوشت وغیرہ میں اگر ٹیکہ بطور دوا لگوانا ہے یا کسی جگہ بہت درد ہے، اسے آرام دینے کے لئے ٹیکہ لگوانے کی ضرورت ہے یا جسم کے کسی حصہ کو بے حس کرنا ہے، جیسا کہ دانت نکلواتے وقت کیا جاتا ہے۔ ان صورتوں میں ٹیکہ لگانے کی گنجائش ہے بعض دفعہ شدید بخار ہوتا ہے اس کی شدت کو کم کرنے کے لئے ٹیکہ لگوایا جاسکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ تعالیٰ نے تم پر دین کے متعلق کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔'' [۲۲/الحج:۷۸]

سوال کیا روزہ دار خون ٹیسٹ کرا سکتا ہے ایسا کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں تفصیل سے وضاحت کریں؟

جواب اس سلسلہ میں اصل قاعدہ یہ ہے کہ روزہ رکھنے کے بعد وہ باقی رہتا ہے کسی شرعی دلیل کے بغیر ہم اسے فاسد قرار نہیں دے سکتے اور ایسی کوئی دلیل نہیں ہے، جس سے معلوم ہو کہ خون کی معمولی مقدار سے روزہ ٹوٹ جاتا ہو، لہٰذا ٹیسٹ کے لئے خون لینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ طبیب کو بسا اوقات بیماری کی تشخیص کے لئے مریض سے خون لینے کی ضرورت ہوتی ہے، اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا کیونکہ یہ خون کی بہت معمولی مقدار ہے جو جسم پر سینگی لگوانے کی طرح اثر انداز نہیں ہوتی، البتہ بحالت روزہ کسی مریض کی جان بچانے کے لئے خون کا عطیہ دینے سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔ خون دینے والے کو بعد میں اس کی قضا دینا ہوگی اسے سینگی لگوانے کے عمل پر قیاس کیا جاسکتا ہے کیونکہ عطیہ دینے کے لئے کافی مقدار میں خون جسم سے خارج ہو جاتا ہے۔ البتہ نکسیر، مسواک یا دانت نکلواتے وقت خون آجانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، اگر مریض کو غروب آفتاب سے پہلے خون دینے کی ضرورت ہو اور اطبا کی رائے کے مطابق اس کے مرض کے ازالہ کے لئے ایسا کرنا ضروری ہو تو اس حالت میں خون کا عطیہ دیا جاسکتا ہے، لیکن اس سے قوت ختم ہو جائے گی۔ خون دینے والے کو چاہیے کہ وہ کچھ کھائے پیئے تاکہ اس کی قوت واپس لوٹ آئے اور اس دن کی قضا ادا کرنا اس پر لازم ہوگی۔

سوال مختصر طور پر روزے کے آداب بیان کر دیں تاکہ روزے کے فوائد و ثمرات ہمیں حاصل ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے؟

جواب روزے کا اہم ادب یہ ہے کہ اسے احکام الٰہی کی بجا آوری اور ممنوع احکامات سے اجتناب کا ذریعہ بنایا جائے اور اس دوران حصول تقویٰ کی کوشش کی جائے جو روزے کا اہم مقصد ہے، اس مرکزی ادب کے علاوہ دیگر آداب حسب ذیل ہیں:

☆ جھوٹی باتوں، چغلی اور عیب جوئی سے پرہیز کیا جائے۔ حدیث میں اس کے متعلق بہت سخت وعید مروی ہے: ''اللہ تعالیٰ کو ایسے

روزے کی قطعاً ضرورت نہیں جو بحالت روزہ جھوٹی بات اور اس کے مطابق عمل کو ترک نہیں کرتا۔'' [صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۰۳]

☆ روزے کی حالت میں کثرت کے ساتھ صدقہ اور لوگوں کے ساتھ احسان کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ سخی تھے، لیکن رمضان میں جب حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کا دور کرتے تو آپ سراپا جود وسخا بن جاتے۔ [صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۰۲]

☆ روزے کے یہ بھی آداب ہیں کہ سحری کھائی اور تاخیر کے ساتھ تناول کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''سحری کھاؤ! کیونکہ سحری کھانے میں برکت ہے۔'' [صحیح مسلم، الصیام: ۱۰۹۵]

☆ کھجور کے ساتھ روزہ افطار کیا جائے، اگر تازہ کھجور میسر نہ ہو تو خشک کھجور کے ساتھ افطار کیا جائے، بصورت دیگر پانی کا گھونٹ پی لیا جائے۔

☆ جب یقین ہو جائے کہ سورج غروب ہو گیا ہے تو فوراً روزہ افطار کر لینا چاہیے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''لوگ ہمیشہ خیر و برکت سے رہیں گے جب تک افطار کرنے میں جلدی کریں گے۔'' [صحیح مسلم، الصیام: ۱۰۹۸]

☆ وقت افطار قبولیت دعا کا وقت ہے افطار کرتے وقت درج ذیل دعا پڑھے: ''اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ وَعَلٰی رِزْقِکَ اَفْطَرْتُ'' [ابوداؤد، الصیام: ۲۳۵۸]

''اے اللہ میں نے تیرے لئے روزہ رکھا اور تیرے ہی رزق پر افطار کیا۔'' رسول اللہ ﷺ سے درج ذیل دعا بھی ثابت ہے: ''ذَھَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ۔'' [ابوداؤد، الصیام: ۲۳۵۷]

''پیاس ختم ہو گئی رگیں تر ہو گئیں اور ان شاء اللہ اس کا اجر ثابت ہو گیا۔'' یہ مختصر آداب ہیں۔ تفصیل کے لئے کتب حدیث کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

سوال رمضان المبارک میں نماز تراویح باجماعت پڑھائی جاتی ہے، عام طور پر ستائیسویں رات قرآن کریم ختم کیا جاتا ہے، اس موقع پر مٹھائی وغیرہ تقسیم کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے اس کی شرعی حیثیت کیا ہے کیا ایسے موقع پر یہ اہتمام اسلاف سے ثابت ہے؟

جواب رمضان المبارک میں تکمیل قرآن کے موقع پر مٹھائی وغیرہ تقسیم کرنے کے متعلق ہم افراط وتفریط کا شکار ہیں بعض انتہا پسند اسے بدعت قرار دے کر اسے ضلالت و گمراہی سے تعبیر کرتے ہیں، پھر اسی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ یہ کام کرنے والوں کو جہنم رسید کر کے سانس لیتے ہیں، جبکہ دوسری طرف جو تساہل پسند ہیں ان کا رویہ انتہائی قابل اعتراض اور محل نظر ہے کیونکہ وہ ایسے موقع پر کھانے پینے کا اس قدر تکلف کرتے ہیں کہ اللہ کا گھر شادی محل معلوم ہوتا ہے بلکہ بعض مساجد میں آخری عشرہ اسی انداز سے گزارا جاتا ہے کہ طاق راتوں میں دیگیں پکائی جاتی ہیں، تقریر اور وعظ ونصیحت کے لئے جید اور خوش الحان علمائے کرام کو مدعو کیا جاتا ہے اور ساری رات کھانے پینے اور وعظ ونصیحت سننے سنانے میں گزر جاتی ہے۔ ہمارے نزدیک اس قسم کی افراط وتفریط درست نہیں، بلاشبہ رمضان المبارک نماز تراویح میں قرآن کریم پڑھنا اور سننا ایک بہترین عمل ہے۔ اس کے لئے کسی متدین اور متشرع حافظ قرآن کی خدمات بھی حاصل کی جا سکتی ہیں جو خوش الحانی کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کرے، نماز تراویح میں مکمل قرآن کریم

کو پڑھنے اور سننے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز تراویح پڑھانے کے لئے بہترین قراء کا انتخاب کرتے تھے۔ کتب احادیث میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما اور حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ کا نام بطور خاص ملتا ہے۔ راوی بیان کرتا ہے کہ نماز تراویح میں حافظ قرآن سو آیات کی تلاوت کرتا اور یہاں تک کہ قیام کے طویل ہونے کی وجہ سے بعض مقتدی اپنی لاٹھیوں کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتے، پھر اس قیام سے صبح صادق کے قریب فراغت حاصل کرتے۔ [مؤطا امام مالک، ص:۱۳۷، ج۱]

تکمیل قرآن کے لئے ہماری رائے یہ ہے کہ انتیسویں رات کا انتخاب کیا جائے اس کے لئے خاص اہتمام کا تکلف نہ کیا جائے، بلکہ سادگی کے ساتھ اسے سرانجام دیا جائے۔ تکلفات سے بالاتر ہو کر اگر کوئی نمازی اپنی طرف سے مٹھائی وغیرہ کا اہتمام کرتا ہے تو اسے قابل گردن زنی جرم نہ قرار دیا جائے۔ ہم لوگ خوشی کے موقع پر اپنے گھروں میں اس طرح کا اہتمام کرتے رہتے ہیں لیکن اس کے لئے آخری عشرہ کے آغاز سے تحریک چلانا اور تقسیم شرینی کے نام سے چندہ اکٹھا کرنا، باقاعدہ ہر نماز کے بعد اس کا اعلان کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں حافظ عبداللہ روپڑی رحمۃ اللہ علیہ کا معتدل فتویٰ حسب ذیل ہے:

''بعض تفاسیر میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب سورۂ بقرہ ختم کی تو دس اونٹ ذبح کیے، اس سے معلوم ہوا کہ کسی دینی کتاب کے ختم ہونے پر اگر کوئی خوشی کی جائے تو حرج نہیں لیکن اس کا التزام کرنا اور اس کو ضروری سمجھنا، جیسا کہ آج کل ہوتا ہے یہ طریقہ مناسب نہیں، کیونکہ سلف میں اس قسم کے التزام کا ثبوت نہیں ہے۔'' [فتاویٰ اہلحدیث، ص:۶۷۰، ج۱]

واضح رہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عمل کا حوالہ اب مجھے مستحضر نہیں ہے اس موقع پر یہ گزارش کرنا بھی ضروری ہے کہ نماز تراویح پڑھانے والے حافظ قرآن کو چاہیے کہ وہ لوجہ اللہ اس کام کو سرانجام دے، دل میں کسی قسم کا طمع اور لالچ نہ رکھے، نیز انتظامیہ کو بھی چاہیے کہ وہ برسرعام اس حافظ قرآن کی عزت نفس اور خودداری کو مجروح کرنے کے بجائے خاموشی کے ساتھ اس کی جو خدمت کرنا چاہیں کر دیں۔ بھری مسجد میں ایسی باتوں کا اعلان کرنا صحیح نہیں ہے، بہر حال ہمیں اعتدال کے دامن کو تھامنا ہو گا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میانہ روی اور اعتدال کو ہی بہتر قرار دیا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال رمضان المبارک میں اور دیگر مہینوں میں حافظ قرآن کے ہاں شبینہ پڑھنے کا رواج ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب قرآن کریم پڑھنے کا ادب یہ ہے کہ اسے آہستہ آہستہ خوب سوچ کر پڑھا جائے، اسے جلدی جلدی پڑھنا کہ اس کے الفاظ و حروف کا پتہ نہ چلے یا ان کی ادائیگی صحیح طور پر نہ ہو، ایسا کرنا آداب تلاوت کے خلاف ہے۔ ویسے بھی تین دن سے کم مدت میں اسے مکمل کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے ختم کے لیے کم از کم مدت تین دن مقرر فرمائی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا: ''چالیس دن میں قرآن کریم ختم کیا کرو۔'' ان کے عرض کرنے پر فرمایا کہ ''ایک ماہ میں ختم کیا کرو۔'' پھر بیس دن اس کے بعد پندرہ دن اس کے بعد آپ نے ایک ہفتہ میں قرآن کریم ختم کرنے کی اجازت دی۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں اس سے بھی کم مدت میں قرآن کریم ختم کرنے طاقت رکھتا ہوں تو آپ نے فرمایا: ''جو اسے تین دن سے کم مدت میں ختم کرتا ہے وہ

اسے سمجھ نہیں سکا۔" [ابوداؤد، الصلوٰۃ: ۱۳۹۰، ۱۳۹۵]

الغرض قرآن کریم کی تلاوت کے آداب سے ہے کہ اسے تین دن سے کم مدت میں ختم نہ کیا جائے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے ہاں عام طور پر غروب آفتاب کے بعد احتیاطاً دو تین منٹ روزہ افطار کرنے میں انتظار کیا جاتا ہے، اس "احتیاط" کی شرعاً کیا حیثیت ہے؟

جواب حدیث میں ہے کہ افطاری کا وقت غروب آفتاب ہے اگر کسی شرعی عذر کی بنا پر کبھی کبھار ایک دو منٹ تاخیر ہو جائے تو چنداں حرج نہیں، البتہ احتیاط کے پیش نظر ہمیشہ تاخیر کرنا مکروہ بلکہ ممنوع ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "جب ادھر رات آجائے اور ادھر دن چلا جائے اور سورج بھی غروب ہو جائے تو روزے دار کو روزہ افطار کر دینا چاہیے۔" [صحیح مسلم، الصیام: ۱۱۰۰]

حضرت ابوعطیہ فرماتے ہیں کہ میں اور حضرت مسروق ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور عرض کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے دو ایسے ہیں کہ ایک جلدی روزہ افطار کرتے ہیں اور جلدی نماز پڑھتے ہیں جبکہ دوسرے تاخیر سے روزہ کھولتے ہیں اور نماز بھی تاخیر سے ادا کرتے ہیں۔ (ان میں کون سنت کے مطابق عمل کرتا ہے؟) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دریافت فرمایا کہ جلدی کرنے والا کون ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ بھی اسی طرح عمل کرتے تھے، یعنی ان کا عمل سنت کے عین مطابق ہے۔ دوسرے صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ہیں۔ [صحیح مسلم، الصیام: ۱۰۹۹]

افطاری جلدی کرنے کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "لوگ اس وقت تک خیر و برکت میں رہیں گے جب تک افطاری کرنے میں دیر نہیں کریں گے۔" [صحیح بخاری، الصیام: ۱۹۵۷]

ابن حبان کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ غروب آفتاب کے بعد احتیاط کا بہانہ بنا کر دیر کرنا یہود و نصاریٰ کا شیوہ ہے، چنانچہ فرمان نبوی ﷺ ہے کہ "یہود و نصاریٰ تاخیر سے افطار کرتے ہیں تم روزہ جلد افطار کیا کرو۔" [صحیح ابن حبان: ۶/۲۰۹]

بلکہ ایک روایت میں مزید وضاحت ہے کہ "میری امت کے لوگ اس وقت تک میرے طریقے پر گامزن رہیں گے، جب تک وہ روزہ افطار کرنے کے لئے ستاروں کے چمکنے کا انتظار نہیں کریں گے۔" [بیہقی: ۴/۲۳۸]

احادیث میں رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کا ایک امتیازی وصف بایں الفاظ بیان ہوا ہے کہ وہ افطاری جلدی کرتے اور سحری دیر سے تناول فرماتے تھے۔ [ترمذی، کتاب الصوم]

رسول اللہ ﷺ کا روزے کے متعلق افطار کا عمل اس قدر جلدی ہوتا کہ آپ دوسروں کے احتیاطی رویہ کو مسترد فرما دیتے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ماہ رمضان میں سفر کر رہے تھے۔ جب سورج غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا: "سواری سے اتر کر ستو تیار کرو۔" عرض کیا گیا کہ ابھی تو دن کی روشنی نظر آ رہی ہے ذرا تاخیر کر لی جائے تو بہتر ہوگا آپ نے فرمایا: "سواری سے اتر کر ستو تیار کرو۔" چنانچہ آپ کے لئے ستو تیار کیے گئے۔ آپ نے انہیں نوش فرمایا، اس کے بعد وہی الفاظ استعمال کئے جو پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ [صحیح مسلم، الصیام: ۱۱۰۱]

احادیث کے پیش نظر ہمیں چاہیے کہ جب سورج غروب ہونے کا اطمینان ہو جائے تو روزہ افطار کر دینا چاہیے، احتیاط کے پیش نظر دیر کرنا صحیح نہیں ہے۔ اسے یہود و نصاریٰ کی علامت بتایا گیا ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال دوا کے ساتھ غرارے کرنے سے کیا روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟

جواب رسول اللہ ﷺ نے روزے دار کو بوقت وضو مبالغہ کے ساتھ ناک میں پانی چڑھانے سے منع کیا ہے، حدیث میں ہے کہ ''وضو کرتے وقت ناک میں مبالغہ کے ساتھ پانی چڑھاؤ الا یہ کہ تم بحالت روزہ ہو۔'' [ابوداود، الطہارۃ: ۱۴۲]

رسول اللہ ﷺ نے روزے دار کے لئے یہ پابندی، اس لئے لگائی ہے کہ مبادا پانی پیٹ میں چلا جائے اور اس کا روزہ خراب ہو جائے۔ غرارے کرنے کو بھی اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر اس کے بغیر چارہ نہ ہو تو احتیاط کے ساتھ غرارے کیے جائیں، تاکہ پانی حلق کے نیچے نہ اترے، ایسا کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، مگر یاد رہے کہ انتہائی شدید ضرورت کے پیش نظر ایسا کرنا چاہیے۔ گلے میں خراش کے لئے نمک یا کوئی اور محلول پانی میں ملا کر غرارے کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک عورت جو حافظہ قرآن ہے وہ گھر میں عورتوں کو نماز تراویح باجماعت پڑھاتی ہے کیا عورت تراویح کی جماعت کرا سکتی ہے؟

جواب امت کے اکثر علمائے سلف اس بات کے قائل ہیں کہ عورت کا عورتوں کی جماعت کرانا صحیح اور جائز ہے۔ اگرچہ کچھ حضرات نے اس موقف سے اختلاف کیا ہے، تاہم عورت کا جماعت کرانا صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ محدثین کرام نے اپنی کتب حدیث میں اس کے متعلق باقاعدہ عنوان بھی بیان کئے ہیں، چنانچہ ابوداود نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے کہ ''عورتوں کی امامت کا بیان۔'' پھر اس عنوان کو ثابت کرنے کے لئے شہیدہ فی سبیل اللہ حضرت ام ورقہ بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا تھا کہ ''وہ اپنے اہل خانہ کی نماز باجماعت کے لئے امامت کے فرائض سرانجام دے۔'' اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے مولانا شمس الحق عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے عورتوں کی امامت اور ان کی نماز باجماعت کے اہتمام کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ [عون المعبود: ۱/۲۳۰]

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے کہ ''عورتوں کی امامت کے اثبات کا بیان۔'' پھر انہوں نے صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ نماز کے لئے عورتوں کے درمیان کھڑے ہو کر ان کی امامت کرائی تھی۔ [بیہقی: ۳/۱۳۰]

حضرت ام حسن رحمۃ اللہ علیہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی زوجہ محترمہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو عورتوں کی امامت کراتے دیکھا کہ آپ ان کے درمیان کھڑی تھیں۔ [مصنف ابن ابی شیبہ: ۱/۵۳۶]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ عورت دیگر عورتوں کی جماعت کرا سکتی ہے لیکن وہ آگے کھڑے ہونے کے بجائے عورتوں کے درمیان کھڑی ہو۔ [مصنف ابن ابی شیبہ: ۱/۵۳۶]

تابعین میں سے حضرت حمید بن عبدالرحمٰن اور امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ [مصنف ابن ابی شیبہ حوالہ مذکورہ]

ان احادیث و آثار کے پیش نظر عورت دوسری عورتوں کی جماعت کرا سکتی ہے لیکن جماعت کراتے وقت اسے عورتوں کے درمیان کھڑے ہونا چاہیے، بعض روایات میں امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ رمضان المبارک میں عورت دوسری عورتوں کو نماز تراویح پڑھا سکتی ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال روزے رکھنے کے لئے مانع حیض ادویات کا استعمال شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب خون حیض ایک فاسد مادہ ہے۔ جسے روکنا اچھا نہیں ہے۔ اگر کسی عورت کا صرف ارادہ ہو کہ میں رمضان میں ہی اپنے روزے مکمل کرلوں تاکہ میرے ذمے ان کا قرض باقی نہ رہے تو یہ کوئی مستحسن اقدام نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اطبا کی رپورٹ ہے کہ مانع حیض ادویات کا استعمال عورت کے رحم، اعصاب اور نظام خون کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے۔ ان کے استعمال سے مہینے کی عادت بھی بگڑ جاتی ہے اور جسم نحیف اور کمزور پڑ جاتا ہے، لہٰذا ہمارا مشورہ ہے کہ عورتوں کو ان کے استعمال سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اگرچہ ان کے استعمال کے بعد جو روزے رکھے جائیں گے ان کا فرض تو بہر حال ادا ہو جائے گا، البتہ علما نے ایسی ادویات کے استعمال کو چند شرائط کے ساتھ مشروط کیا ہے:

① ان کے استعمال سے نقصان کا اندیشہ نہ ہو، اگر نقصان کا خطرہ ہے تو پرہیز کیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو۔'' [۲/البقرہ:۱۹۵]

نیز فرمایا: ''اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر بہت مہربان ہے۔'' [۴/النساء:۲۹]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ضرر رساں چیز کے استعمال سے منع فرمایا حدیث میں ہے کہ نقصان اٹھانا اور نقصان پہنچانا دونوں کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔ [مسند امام احمد، ص:۳۱۳، ج۱]

② خاوند سے اجازت لی جائے اگر خاوند موجود ہو کیونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ عورت عدت کے ایام میں ہوتی ہے، وہ مانع حیض ادویات کے استعمال سے ایام عدت کو طویل کرنا چاہتی ہے تاکہ دیر تک اس سے نان و نفقہ وصول کیا جائے ایسے حالات میں اس سے اجازت لینا ضروری ہے۔ اسی طرح اگر ثابت ہو جائے کہ ایسی ادویات کے استعمال سے حمل میں رکاوٹ ہو سکتی ہے اس حالت میں بھی عورت کا خاوند سے اجازت لینا ضروری ہے۔ ایسی ادویات کا استعمال اگرچہ جائز ہے، تاہم بہتر ہے کہ فطرت سے چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے، البتہ اگر کوئی مجبوری ہو تو الگ بات ہے۔ ہمارے نزدیک رمضان المبارک میں اپنے روزے مکمل کرنے کی نیت سے ایسی ادویات استعمال کرنا کوئی معقول عذر نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہماری بچی نے قرآن حفظ کیا ہے گھریلو خواتین نماز تراویح میں با جماعت اس کا قرآن سنتی ہیں بعض حضرات کی طرف سے اعتراض ہوا ہے کہ عورت جماعت نہیں کرا سکتی، اس سلسلہ میں وضاحت کریں کہ عورت اپنے گھر میں با جماعت نماز تراویح پڑھا سکتی ہے یا نہیں؟

جواب عورت کا جماعت کرانا حدیث سے ثابت ہے۔ محدثین نے اپنی تصانیف میں اس کے متعلق باقاعدہ عنوانات قائم کئے ہیں، چنانچہ امام ابو داؤد نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''عورتوں کی امامت کا بیان۔'' پھر انہوں نے اس کے تحت حضرت

ام ورقہ بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجازت دی تھی کہ وہ اپنے اہل خانہ کی نماز باجماعت کے لیے امامت کے فرائض سرانجام دے۔ [ابوداود، الصلوۃ:۵۹۲]

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی سنن میں ایک عنوان بیان کیا ہے: ''عورتوں کی امامت کا اثبات۔'' پھرانہوں نے صدیقہ کائنات عائشہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ نقل کیا ہے۔انہوں نے ایک دفعہ فرض نماز کے لئے عورتوں کے درمیان کھڑی ہوکران کی امامت کرائی تھی۔

[بیہقی ص:۱۳۰،ج۳]

حضرت ام حسن کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو عورتوں کی امامت کراتے دیکھا کہ آپ ان کے درمیان کھڑی تھیں۔ [مصنف ابن ابی شیبہ،ص:۵۳۶،ج۳]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ عورت دیگر عورتوں کی جماعت کرا سکتی ہے۔لیکن وہ آگے کھڑے ہونے کے بجائے درمیان میں کھڑی ہو۔ [مصنف ابن ابی شیبہ،ص:۵۳۶ج۳]

ان احادیث وآثار کے پیش نظر عورت دوسری عورتوں کی جماعت کرا سکتی ہے لیکن اسے جماعت کراتے وقت عورتوں کے درمیان کھڑا ہونا چاہیے،اس لئے بچی اگر صاحب شعور ہے تو نماز تراویح میں قرآن سنا سکتی ہے اور اسے عورتوں کی جماعت کرانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے ہاں مسجد کی گیلری میں عورتوں کے لئے نماز تراویح کا اہتمام کیا گیا ہے،صحن مسجد میں نماز تراویح کی وجہ سے اس صورت میں عورتیں گیلری میں امام کے آگے ہوجاتی ہیں،کیا اس طرح ان کا نماز تراویح پڑھنا درست ہے؟

جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک میں عورتیں،مردوں کے پیچھے کھڑی ہوتی تھیں۔اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''عورتوں کی بہترین صف آخری اور بدترین پہلی صف ہے۔'' [صحیح مسلم،الصلوۃ:۴۴۰]

اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں کی آخری صف مردوں سے زیادہ دور اور ان کی پہلی صف مردوں سے زیادہ قریب ہوگی،ہاں، اگر عورتوں کے لئے نماز کی الگ جگہ مخصوص ہو،یعنی ''مصلی النساء'' الگ ہو تو اس صورت میں مردوں کی طرح ان کی پہلی صف ہی بہتر ہوگی،بہرحال مذکورہ حدیث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عورتیں مردوں کے پیچھے کھڑی ہوتی تھیں،عورتوں کا مردوں کے آگے کھڑا ہونا اسوۂ نبوی کے خلاف ہے۔کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی دادی حضرت ملیکہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے گئے،تو آپ نے وہاں نماز پڑھی،حضرت انس رضی اللہ عنہ اور ان کا بھائی آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے اور حضرت ملیکہ رضی اللہ عنہا اکیلی ان دونوں کے پیچھے کھڑی ہوئیں،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دو رکعت پڑھائیں۔ [صحیح بخاری،الصلوۃ:۳۸۰]

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ جب امام کے ساتھ ایک مرد اور ایک عورت ہو تو مرد کو امام کی دائیں جانب اور عورت کو ان دونوں کے پیچھے کھڑا ہونا چاہیے۔ [ترمذی،الصلوۃ:۲۳۴]

ویسے بھی صورت مسئولہ میں عورتیں امام سے بھی آگے ہوجاتی ہیں جو کسی حالت میں درست نہیں ہے۔اس لئے عورتوں کے لئے نماز تراویح پڑھانے کا کوئی متبادل بندوبست کرلیا جائے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہماری مسجد میں باہمی اختلاف کی وجہ سے بیک وقت نماز تراویح کی دو جماعتیں ہوتی ہیں کیا نوافل کی جماعت کے وقت دوسری جماعت ہو سکتی ہے؟

جواب سوال میں ذکر کردہ صورت حال انتہائی تکلیف دہ ہے۔ ہم لوگ آپس کی لڑائی، جھگڑے وغیرہ کا انتقام مسجد اور اس کے معاملات سے لینے کے عادی ہو چکے ہیں، حالانکہ مسجد میں نماز با جماعت ہمیں اتحاد اور یگانگت کا سبق دیتی ہے، پاؤں سے پاؤں ملانے سے دلوں کا باہمی ملاپ ہوتا ہے۔ ایک جماعت کی صورت میں دوسری جماعت شرعاً جائز نہیں ہے اگرچہ احادیث میں فرض نماز کے متعلق یہ وعید ہے، تاہم موجودہ صورت حال کے پیش نظر نوافل کی بیک وقت دو جماعتوں کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ ایسا کرنے سے اختلاف کی خلیج مزید وسیع ہو گی۔ جماعتی احباب کو چاہیے کہ اتحاد و اتفاق کی فضا کو ہموار کیا جائے، اگر کوئی لڑائی جھگڑے سے بچنے کے لیے اپنے حق سے دستبردار ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ جنت میں اسے جگہ دینے کی بشارت دی ہے، ہمیں چاہیے کہ ایسے حالات میں اپنا غصہ تھوک کر باہمی شیر و شکر ہو جائیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اپنے اختلافات کو برقرار رکھنے کے لئے شرعی طور پر کوئی جواز تلاش کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو صاف رکھے اور آپس میں محبت اور پیار سے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

سوال دمے کا مریض بعض اوقات بھاپ کی طرح دوا استعمال کرتا ہے جس سے سانس کی آمد و رفت میں آسانی ہو جاتی ہے روزے کی حالت میں یہ عمل کرنا جائز ہے؟

جواب ضیق النفس، یعنی دمے کا مریض اس طرح کی دوا استعمال کر سکتا ہے اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ اس کے استعمال سے دوا کے اجزا معدہ تک نہیں پہنچتے۔ یہ دوا دھواں بن کر اڑ جاتی ہے اور صرف سانس کو کشادہ کرتی ہے۔ اس کا کوئی جز معدہ تک نہیں پہنچتا، لہٰذا روزہ کی حالت میں اسے استعمال کرنا جائز ہے۔ اس سے روزہ باطل نہیں ہوتا، اس طرح روزہ کی حالت میں آکسیجن بھی لی جا سکتی ہے بشرطیکہ اس کے ساتھ کوئی اور دوا نہ ہو کیونکہ یہ سانس لینا ہے اور سانس کے ذریعے ہوا لینے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا اور نہ ہی اس پر کھانے پینے کا اطلاق ہوتا ہے اگر اس کے ساتھ اور کسی دوا کے اجزا ہوں تو پھر روزہ برقرار نہیں رہے گا۔ بعض اوقات ناک بند ہو جاتی ہے، ایسی صورت میں وکس وغیرہ سونگھنے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا، اس کی حیثیت خوشبو سونگھنے کی طرح ہے، جس طرح خوشبو سونگھنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا اس طرح وکس وغیرہ دوا جس سے بند ناک کھل جاتی ہے اس سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا۔ [واللہ اعلم]

سوال میں سعودیہ جانے کے لئے لاہور ایئر پورٹ پر تھا کہ اذان مغرب ہونے لگی میں نے روزہ افطار کر لیا، پھر مجھے ہوائی جہاز کی پرواز کے دوران سورج نظر آیا تو ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟

جواب ایسی حالت میں کھانے پینے پر کوئی پابندی نہیں ہے کیونکہ جب روزہ افطار کیا تو زمین کے اعتبار سے سورج غروب ہو چکا تھا، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جب تم دیکھو کہ رات ادھر سے آ گئی تو روزہ دار اپنا روزہ افطار کر لے۔''

[صحیح بخاری، الصیام: ۱۹۴۱]

اب جب روزے دار اپنا روزہ افطار کرنے کے بعد ہوائی جہاز میں محو پرواز ہے تو اسے کھانے پینے سے منع کرنا درست نہیں، کیونکہ اس نے شرعی دلیل کے مطابق روزہ افطار کیا ہے اور اب شرعی دلیل کے ساتھ ہی اسے کھانے پینے سے منع کیا جا سکتا ہے۔

اس بنا پر اسے اس تکلف میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ وہ کھانے پینے سے باز رہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال کیا حالت روزہ میں ناک میں دوا کے قطرے ڈالے جا سکتے ہیں اس کے متعلق شرعی حکم بیان کریں؟

جواب ناک میں ڈالے جانے والی دوا کا قطرہ اگر معدہ تک پہنچ جائے تو اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''ناک میں پانی چڑھانے میں خوب مبالغہ کرو الا یہ کہ تم روزے کی حالت میں ہو۔'' [سنن نسائی، الطہارۃ:۸۷]

اس حدیث کی بنا پر روزے دار کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ ناک میں ایسا قطرہ ڈالے جو اس کے معدے میں پہنچ جائے اگر ناک میں ڈالا جانے والا دوائی کا قطرہ معدے تک نہ پہنچے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، البتہ آنکھوں اور کان میں قطرے ڈالنے کی کوئی ممانعت نہیں ہے اور نہ ہی ان کے استعمال سے روزہ ٹوٹتا ہے۔ اسی طرح سر میں تیل کی مالش کرنے سے بھی روزہ متاثر نہیں ہوتا۔ [واللہ اعلم]

سوال مستورات کا مسجد میں اعتکاف کرنا شرعاً کیسا ہے؟ محرم کے بغیر عورت اکیلی سفر نہیں کر سکتی تو مسجد میں دس یوم تک اکیلی اعتکاف کیسے کر سکتی ہے اگر کر سکتی ہے تو اس کے لیے کیا لوازم ہیں، نیز کیا نابالغ بچی اعتکاف کر سکتی ہے۔ کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دیں؟

جواب واضح رہے کہ دنیاوی علائق سے الگ تھلگ ہو کر تقرب الٰہی کی نیت سے کچھ وقت مسجد میں قیام کرنے کو شرعاً اعتکاف کہا جاتا ہے۔ اس بنا پر اگر تقرب الٰہی کی نیت نہ ہو چکی تھی۔ نیت تو ہے لیکن مسجد میں قیام نہیں ہے تو ان دونوں صورتوں کو شرعی اعتکاف نہیں کہا جائے گا۔ مسجد کی شرط اس لئے ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور جب تم مساجد میں اعتکاف بیٹھے ہو تو ان (بیویوں) سے مباشرت نہ کرو۔'' [۲/البقرۃ:۱۸۷]

آیت کریمہ میں مساجد کا بطور خاص ذکر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اعتکاف کے لئے مسجد کا ہونا ضروری ہے۔ اس بنا پر عورتوں کا گھروں میں اعتکاف کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ انہیں بھی اعتکاف مسجد میں ہی بیٹھنا چاہیے، البتہ انہیں مندرجہ ذیل شرائط کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا:

☆ عورت کے لئے مردوں سے بایں طور پر الگ انتظام ہو کہ مردوں کے ساتھ اختلاط کا قطعاً کوئی امکان باقی نہ رہے کیونکہ اختلاط کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے پسند نہیں کیا ہے۔

☆ خاوند سے اعتکاف بیٹھنے کی اجازت حاصل کی جائے، بصورت دیگر اعتکاف صحیح نہیں ہوگا۔

☆ بحالت اعتکاف مخصوص ایام کے آجانے کا بھی اندیشہ نہ ہو۔

☆ کسی قسم کے فتنہ و فساد کا خطرہ بھی نہ ہو۔

☆ خورد و نوش اور دیگر لوازم کا باقاعدہ انتظام ہو، تاکہ باہر جانے کی ضرورت نہ پڑے۔

اگر یہ شرائط پوری نہ ہوں تو عورتوں کے لئے اعتکاف سے اجتناب زیادہ بہتر ہے، ایسے حالات میں گھر کے کسی گوشہ میں شوق عبادت پورا کر لینا چاہیے، لیکن اسے شرعی اعتکاف نہیں کہا جائے گا اور نہ ہی اعتکاف کی پابندیاں اس پر عائد ہوں گی بعض

حضرات کی طرف سے عورتوں کے لئے اعتکاف کو غیر مشروع کہا جا رہا ہے، لیکن اس کی کوئی دلیل پیش نہیں کی جاتی، چونکہ ازواج مطہرات کا رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد اعتکاف کرنا صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ [صحیح بخاری، الاعتکاف: ۲۰۲۶]

اس لئے شرائط بالا کو ملحوظ رکھتے ہوئے عورت مسجد میں اعتکاف کر سکتی ہے۔ صورت مسئولہ میں جو حدیث اس کے عدم جواز پر پیش کی گئی ہے وہ سفر سے تعلق رکھتی ہے اس کا اعتکاف سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ نابالغ بچی شرعی احکام کی پابند نہیں ہے۔ اس لئے اعتکاف جیسی پاکیزہ اور مقدس عبادت کو بازیچہ اطفال نہیں بنانا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال اعتکاف کرنے والے کو اپنی جائے اعتکاف میں کب داخل ہونا چاہیے، نیز معتکف کے لئے بوقت ضرورت اعتکاف گاہ سے باہر نکلنا جائز ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں؟

جواب ماہ رمضان کے آخری عشرہ میں آدمی کا خود کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے مسجد کے اندر روک لینا ''اعتکاف'' کہلاتا ہے۔ رمضان کے علاوہ بھی اعتکاف کرنا ثابت ہے، تاہم ماہ رمضان میں اعتکاف کرنا سنت مؤکدہ ہے۔ اعتکاف کرنے والے کو چاہیے کہ وہ بیس رمضان کی شام کو مسجد میں پہنچ جائے اور رات مسجد میں اعتکاف کی نیت سے گزارے، اگلے روز، یعنی اکیسویں رمضان کو نماز فجر سے فراغت کے بعد اعتکاف میں داخل ہو جائے کیونکہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ آخری عشرہ کا اعتکاف کرتے تھے۔ [صحیح بخاری، الاعتکاف: ۲۰۲۳]

آخری عشرہ بیسویں رمضان کو مغرب کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی صراحت کو ملایا جائے کہ رسول اللہ ﷺ جب اعتکاف کا ارادہ فرماتے تو نماز فجر پڑھ کر اپنی جائے اعتکاف میں داخل ہوتے۔ [ترمذی، الصوم: ۷۹۱]

صحیح بخاری میں بھی صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر رمضان میں اعتکاف کیا کرتے تھے جب صبح کی نماز پڑھ لیتے تو اس جگہ تشریف لے جاتے جہاں اعتکاف کرنا ہوتا۔ [صحیح بخاری، الاعتکاف: ۲۰۴۱]

ان احادیث کے مطابق اعتکاف کرنے والے کو چاہیے کہ بیس رمضان کو نماز مغرب مسجد میں ادا کرے اور یہ رات بحالت اعتکاف مسجد میں گزارے، پھر صبح کی نماز پڑھ کر اپنی جائے اعتکاف میں چلا جائے۔ معتکف کا کسی ایسے امر کے لئے باہر نکلنا جائز ہے جس کے بغیر شرعاً یا طبعاً چارہ کار نہ ہو، مثلاً: وضو اور غسل کے لئے مسجد سے باہر نکلنا جبکہ مسجد میں ان کا انتظام نہ ہو، اس طرح سحری و افطاری کے لئے اپنے گھر آنا جبکہ کوئی کھانا لانے والا دستیاب نہ ہو، لیکن اعتکاف کے منافی امور کے لئے مسجد سے نکلنا جائز نہیں ہے، مثلاً: خرید و فروخت کے لئے باہر جانا یا بیوی سے اپنی جنسی خواہش پوری کرنے کے لئے اپنے گھر آنا، کیونکہ یہ فعل شرعاً حرام ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال رمضان کے بعد شوال کے چھ روزے رکھنے کی افضل صورت کون سی ہے؟

جواب شوال کے چھ روزوں کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی حسب ذیل ہے: ''جس نے ماہ رمضان کے روزے رکھے، پھر اس کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے تو اس نے گویا زمانہ بھر کے روزے رکھ لیے۔'' [صحیح مسلم، الصیام: ۱۱۶۴]

اس حدیث کے پیش نظر افضل صورت یہ ہے کہ شوال کے چھ روزے عید کے فوراً بعد رکھ لئے جائیں، پھر انہیں مسلسل

رکھا جائے کیونکہ حدیث میں لفظ ''اتباع'' کا یہی تقاضا ہے۔حزم واحتیاط کا بھی یہی تقاضا ہے کہ انسان کو جب بھی فرصت کے لمحات میسر آئیں تو انہیں ضائع نہیں کرنا چاہیے کیونکہ معلوم نہیں کہ آئندہ کس طرح کے حالات پیش آئیں ،لہٰذا فرصت کے لمحات کو غنیمت خیال کرتے ہوئے فوراً نیکی کا کام کرلینا چاہیے ،البتہ جائز صورت یہ بھی ہے کہ وہ سارے مہینہ میں جس وقت چاہیے انہیں رکھ لے، مہینے کے ابتدائی ،درمیانی یا آخری حصہ میں جب چاہے انہیں رکھ لے،خواہ مسلسل رکھے یا انہیں متفرق طور پر پورے کرے ،اگر بہتر صورت اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس مہینہ کی ابتدا میں مسلسل روزے رکھ لے، نیز نیکی کے کاموں میں سبقت کا بھی یہی تقاضا ہے۔

[واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی کسی مجبوری کی وجہ سے ماہ رمضان کے کچھ روزے نہیں رکھ سکا ،وہ شوال کے روزے کب رکھے، ماہ رمضان کے روزے جو رہ گئے ہیں ان کی قضا کے بعد رکھے گا یا ماہ شوال کے چھ روزے عید کے فوراً بعد رکھنے کی اجازت ہے قرآن وحدیث کے مطابق وضاحت کریں؟

جواب ماہ شوال کے چھ روزے رکھنے کے متعلق حدیث کے الفاظ حسب ذیل ہیں: ''جو شخص رمضان کے روزے رکھے، پھر اس کے بعد شوال کے روزے رکھ لے۔'' [صحیح مسلم ،حدیث نمبر:١١٦٤]

ان الفاظ کا تقاضا ہے کہ جس شخص کے رمضان کے کچھ روزے رہ گئے ہوں تو وہ پہلے رمضان کے روزوں کو پورا کرے پھر وہ شوال کے روزے رکھے۔مثلاً: کسی نے ماہ رمضان کے چوبیس روزے رکھے اور چھ روزے کسی وجہ سے نہ رکھے جاسکے تو اس نے قضا روزے رکھنے سے قبل شوال کے روزے رکھ لئے تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے رمضان کے روزے رکھنے کے بعد شوال کے روزے رکھے ہیں۔اس شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے رمضان کے روزے پورے کرے،اس کے بعد وہ شوال کے چھ روزے رکھے۔اس بنا پر ماہ شوال کے روزوں کی فضیلت اسی صورت میں حاصل کی جاسکتی ہے کہ وہ پہلے قضا شدہ روزوں کو پورا کرے۔اس کے بعد ماہ شوال کے روزے رکھے۔ان کا ثواب اسی صورت میں مل سکے گا جب رمضان کے روزے پورے کرلئے گئے ہوں ،البتہ مندرجہ ذیل صورتوں میں قضائے رمضان کو صیام شوال سے مؤخر کیا جاسکتا ہے:

① وہ عورت جسے اندیشہ ہو کہ قضائے رمضان کے روزوں کے بعد اسے ایام سے دوچار ہونا پڑے گا اور شوال کے روزے ماہ شوال میں نہیں رکھے جاسکیں گے۔

② ایک آدمی عید کے بعد چوبیس شوال تک بیمار رہا اب اگر وہ قضائے رمضان کے روزے رکھے تو ماہ شوال ختم ہوجائے گا اور نفلی روزے شوال میں نہیں رکھے جاسکیں گے۔

③ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جیسا عارضہ کسی عورت کو لاحق ہو،وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مصروفیت کی وجہ سے میں قضائے رمضان کے روزے ماہ شعبان میں رکھا کرتی تھی بہرحال آدمی ایسے حالات میں خود اندازہ لگا سکتا ہے کہ قضائے رمضان کے روزوں کے بعد اگر اتنے دن باقی بچ جائیں کہ ان میں ماہ شوال کے چھ روزے بسہولت رکھے جاسکیں تو پہلے قضائے رمضان کے روزے رکھے جائیں بصورت دیگر انہیں مؤخر کرکے پہلے شوال کے چھ روزے رکھے جاسکتے ہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال اکثر علما سے سنا ہے کہ ٹوتھ پیسٹ یا ٹوتھ پاؤڈر استعمال کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے کتاب وسنت کی روشنی میں اس کے متعلق وضاحت کریں؟

جواب بعض چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں نہ تھیں اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے وقت ان کا وجود تھا، انسانوں نے انہیں اپنے فائدہ کے لئے ان زریں ادوار کے بعد ایجاد کیا ہے۔ ان میں سے ٹوتھ پیسٹ اور ٹوتھ پاؤڈر (منجن) ہے۔ روزے کی حالت میں ان کے استعمال کے متعلق شرعی حکم جاننے کے لئے اشباہ اور نظائر کو سامنے رکھنا ہوگا۔ ہم اسے مسواک پر قیاس کرتے ہیں بحالت روزہ مسواک کے متعلق امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک باب بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''روزے دار کے لئے تازہ یا خشک مسواک کا حکم۔'' پھر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے متعدد مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روزہ کی حالت میں مسواک کرتے دیکھا تھا۔ اس روایت کو امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے متصل سند سے بیان کیا ہے۔ [مسند امام احمد، ص:۴۴۶، ج۳]

اس سلسلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار بھی نقل کئے ہیں، چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق بیان کیا ہے کہ وہ روزے کی حالت میں دن کے شروع اور آخر وقت میں مسواک کرتے تھے، لیکن اس سے پیدا ہونے والے لعاب کو نہیں نگلتے تھے۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نماز ظہر کے لئے جانے کا ارادہ کرتے تو روزے کی حالت میں مسواک کرتے، اسی طرح امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ہے کہ ان کے پاس ایک آدمی آیا اور کہنے لگا کہ روزے دار کے متعلق مسواک کرنا شرعاً کیسا ہے؟ آپ نے فرمایا اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ کہنے لگا کہ اس کی تازہ شاخ میں ذائقہ ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ پانی کا بھی ذائقہ ہوتا ہے جبکہ اس سے وضو کیا جاتا ہے۔ [فتح الباری، ص:۱۹۷، ج۴]

ان آثار کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارا موقف ہے کہ روزہ دار بوقت ضرورت ٹوتھ پیسٹ یا ٹوتھ پاؤڈر استعمال کرسکتا ہے لیکن یہ احتیاط کریں کہ اس سے پیدا ہونے والا لعاب حلق کے نیچے نہ جانے دے۔ اگر چہ اس کا ذائقہ ہوتا ہے، تاہم مسواک کی انواع کو دیکھتے ہیں کہ ان کے بھی مختلف ذائقے ہوتے ہیں، مثلاً: پیلو کی مسواک نمکین، نیم کی کڑوی، شیشم کی میٹھی اور کیکر کی مسواک کسیلی ہوتی ہے۔ اگر روزہ کی حالت میں مختلف ذائقوں والی مسواک کی جاسکتی ہیں تو ذائقے دار ٹوتھ پیسٹ یا منجن کے استعمال میں کیا حرج ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق بیان کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ روزے کی حالت میں ہنڈیا کا ذائقہ چکھا جاسکتا ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ نے اس اثر کو متصل سند سے بیان کیا ہے۔ [فتح الباری، ص:۱۹۷، ج۴]

اس لئے ٹوتھ پیسٹ ذائقہ دار ہونے کے باوجود بحالت روزہ استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ استعمال کرتے وقت یہ احتیاط ضروری کی جائے کہ اس کا لعاب حلق کے نیچے نہ اترنے پائے کیونکہ ممکن ہے معدے میں چلا جائے اور اس سے روزہ خراب ہوجائے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک حافظ قرآن جو بے نماز اور اس کی حجامت سنت کے خلاف ہے اسے رمضان میں نماز تراویح کے لئے امام بنانا شرعاً کیسا ہے؟ رمضان میں بھی وہ نماز تراویح پڑھانے کی غرض سے صرف عشاء کی نماز پڑھتا ہے۔ وضاحت سے جواب دیں۔

جواب صورت مسئولہ میں ذکر کردہ حافظ قرآن کو نماز تراویح کے لئے امام بنانا جائز نہیں ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ تم اپنے سے بہتر کسی شخص کو امام بناؤ، اس قسم کے حفاظ کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے۔ اس کے علاوہ بے نمازی کا تو ایمان بھی مشکوک ہے، جیسا کہ اس کے متعلق بکثرت احادیث کتب حدیث میں مروی ہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال اعتکاف سے فراغت کے بعد معتکف کے گلے میں ہار پہنانا اور اسے گلے ملنا، نیز عید کے دن عید سے فارغ ہونے کے بعد معانقہ کرنا یا عید مبارک کہنا شرعی لحاظ سے کیا حکم رکھتا ہے؟

جواب رسول اللہ ﷺ جب تک مدینہ منورہ میں رہے، رمضان المبارک میں اعتکاف کرتے رہے۔ آپ کے بعد ازواج مطہرات بھی اعتکاف کرتی رہیں، کتب حدیث میں کسی مقام پر اشارہ تک نہیں ملتا کہ اعتکاف سے فراغت کے بعد معتکف کو اعتکاف گاہ سے پروٹوکول کے ساتھ نکالا جائے، اس کے گلے میں ہار پہنائے جائیں اور جلوس کی شکل میں اسے گھر پہنچایا جائے، شنید ہے کہ بعض مقامات پر معتکف حضرات کی یادگار تصاویر بھی بنائی جاتی ہیں۔ دین اسلام میں ایسے کاموں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اعتکاف کا مقصد یہ ہے کہ دل کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ رابطہ ہو جائے، اس کے ذریعہ سکون وطمانیت میسر آ جائے، معتکف کو گناہوں سے نفرت اور امور خیر سے محبت ہو، اگر دوران اعتکاف یہ چیزیں حاصل ہو جائیں تو ایسے انسان کو قطعاً ضرورت نہیں ہے کہ وہ فراغت کے بعد اپنے گلے میں پھولوں کے ہار پہنے یا لوگوں کی مبارک باد وصول کرے، بلکہ اسے چاہیے کہ فراغت کے بعد چپکے سے اپنا بستر کندھے پر رکھے اور سادگی کے ساتھ اپنے گھر روانہ ہو جائے۔ گلے میں ہار پہنانے اور گلے ملنے سے ریا کاری اور نمائش کا اندیشہ ہے، پھر ایسا کرنا اسلاف سے ثابت بھی نہیں ہے، اسی طرح عید کے دن معانقہ کرنا یا مبارک باد دینا بھی احادیث سے ثابت نہیں ہے، البتہ عید کے بعد ایک دوسرے سے بایں الفاظ دعائیہ کلمات کہے جا سکتے ہیں ''تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَمِنْكُمْ'' کیونکہ ایسا کہنا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے، چنانچہ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب عید کے دن ملتے تو مذکورہ الفاظ سے مبارک باد دیتے تھے۔ [فتح الباری، ص: ۴۴۶، ج ۳]

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ عید کے دن مذکورہ الفاظ کے ساتھ مبارک باد دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

[المغنی، ص ۲۹۴ ج ۳]

لیکن عید کے دن مصافحہ اور معانقہ کرنا ایک رواج ہے جس کا ثبوت قرآن وحدیث سے نہیں ملتا، مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے اس کے متعلق سوال کیا تو آپ نے بایں الفاظ بڑا جامع جواب دیا مصافحہ بعد از سلام آیا ہے۔ عید کے روز بھی بنیت تکمیل سلام مصافحہ کریں تو جائز ہے بنیت خصوص عید، بدعت ہے، کیونکہ زمانہ رسالت وخلافت میں مروج نہ تھا۔

[فتاویٰ ثنائیہ، ص: ۴۵۰، ج ۱]

سوال ہم نیو سنٹر جیل بہاولپور قیدیان سزائے موت ہیں اور ہمارا جیل میں گیارہواں سال ختم ہو رہا ہے ہم عرصہ دس سال سے جیل میں ہی اہل حدیث ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں شرک وبدعت سے تائب ہونے کی توفیق بخشی، ہماری اپیل رحم ہوم سیکرٹریٹ میں موجود ہے وہاں سے نمبر آنے پر صدر پاکستان کے ہاں اسلام آباد جائے گی، آپ سے گزارش ہے کہ آپ مرکز

میں اکابرین خصوصاً حضرت الامیر پروفیسر ساجد میر حفظہ اللہ سے دعا کی درخواست کریں کہ اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے صلح کی کوشش کو کامیاب کرے اور ہماری جان بچ جائے۔ ہماری جملہ اہلحدیث حضرات سے بھی دعا کی اپیل ہے، ہم نے مرکز میں عرصۂ دراز سے اکابرین جماعت سے رابطہ رکھا ہوا ہے۔ ہماری طرف سے ایک سوال پیش خدمت ہے اس کا جواب بذریعہ اہلحدیث دیں۔ کیا قید کے اندر بھی مالدار قیدی پر زکوٰۃ فرض ہے، نیز کیا قیدی کے لئے حرام مال جائز ہے اگرچہ اسے اس کے حرام ہونے کا علم بھی ہو؟

جواب آپ کے خط کا خلاصہ ہم نے شائع کر دیا ہے، امید ہے کہ اکابرین جماعت اور دیگر اہل حدیث ضرور آپ کے معاملہ میں دلچسپی لیں گے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ وہی برتاؤ کرے جس میں وہ خوش اور راضی ہو۔ (آمین) ارسال کردہ سوال کے متعلق گزارش ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے مندرجہ ذیل شرائط کا ہونا ضروری ہے:

① وہ مال جس سے زکوٰۃ ادا کرنا ہے وہ حلال ذرائع سے کمایا گیا ہو اور وہ انسان کی ملکیت ہو۔

② انسانی ضروریات سے فاضل ہو، گھر کے اخراجات اور دیگر مصارف سے پس انداز کیا ہوا ہو۔

③ اتنی مالیت ہو کہ سونے یا چاندی کے نصاب کو پہنچ جائے۔

④ اس پر ایک سال گزر جائے۔

اگر یہ شرائط کسی مال میں پائی جاتی ہیں تو اس سے ڈھائی فیصد، یعنی چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے، اس میں قیدی یا غیر قیدی کی پابندی نہیں، اس لئے اگر آپ حضرات کے پاس اتنا مال ہو (خواہ آپ کے ہاں یا آپ کے گھر میں ہے) تو اس سے زکوٰۃ ادا کریں، نیز قرآن وحدیث میں ہمیں اس بات کا پابند بنایا گیا ہے کہ ہم حلال اور طیب مال استعمال کریں۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیا علیہم السلام، اہل ایمان اور عام لوگوں کو الگ الگ خطاب کیا گیا ہے کہ ''حلال اور پاکیزہ مال استعمال کرو اور نیک اعمال بجالاؤ۔'' قرآن وحدیث میں کہیں نہیں ہے کہ قیدیوں کو اس پابندی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہو، اسلامی احکام تمام کے لئے یکساں ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو خدمت دین کی توفیق دے اور ہم سب کا خاتمہ ایمان پر کرے۔ باوضو ہو کر آیت کریمہ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔'' کثرت سے پڑھا کریں، اس میں بہت خیر وبرکت ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال یکم ذوالحجہ سے نو ذوالحجہ تک روزے رکھنے جائز ہیں، کیا اسلاف سے یہ عمل ثابت ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟

جواب ذوالحجہ کے پہلے عشرہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''ان دنوں ہر نیک عمل اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! دوسرے دنوں میں جہاد بھی ان دنوں کے نیک عمل سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا، آپ نے فرمایا: ''ان دنوں نیک عمل دوسرے دنوں میں جہاد فی سبیل اللہ سے بڑھ کر ہے، ہاں، اس شخص کی فضیلت زیادہ ہے جو اللہ کے راستہ میں جہاد کے لئے نکلے اور اپنی جان اور مال سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان کر دے اور کچھ بھی لے کر واپس نہ آئے۔''

[مسند احمد، ص: ۲۲۴، ج ۱]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ان دنوں ہر نیکی کا کام کیا جاسکتا ہے جن میں روزے رکھنا بھی شامل ہے، اگرچہ ان دنوں

روزے رکھنا عملی طور پر رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے، تاہم مذکورہ حدیث کے پیش نظر نفلی روزے رکھے جاسکتے ہیں۔صحیح بخاری میں بیان ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں ایک دن کا روزہ رکھا، اللہ تعالیٰ ستر سال کی مسافت تک اس کے چہرے کو آگ سے دور کردیں گے۔ [صحیح بخاری، الجہاد: ۲۸۴۰]

اس حدیث کے عموم سے ذوالحجہ کے پہلے نو دنوں کے روزے رکھنے کا جواز معلوم ہوتا ہے، سنن ترمذی میں ایک حدیث ہے، ذوالحجہ کے پہلے دس دنوں میں عبادت کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے۔ان میں ایک دن کا روزہ سال کے روزوں کے برابر ہے ایک رات کا قیام شب قدر کے قیام کے برابر ہے۔ [ترمذی، الصوم: ۷۵۸]

سند کے اعتبار سے یہ حدیث ضعیف ہے، جیسا کہ امام ترمذی نے وضاحت کی ہے لیکن بطور تائید پیش کی جاسکتی ہے، البتہ نویں ذوالحجہ کا روزہ رکھنے کی بہت فضیلت ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عرفہ کے دن روزہ رکھنے سے ایک سال گزشتہ اور ایک سال آئندہ کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔'' [صحیح مسلم، الصوم: ۲۷۴۷]

البتہ حج کرنے والے حضرات یوم عرفہ، یعنی نویں ذوالحجہ کا روزہ نہ رکھیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے دوران حج اس دن کا روزہ نہیں رکھا تھا۔ [صحیح بخاری، الصیام: ۱۹۹۸]

ہمارے رجحان کے مطابق ذوالحجہ کے پہلے نو دنوں کے روزے رکھے جاسکتے ہیں احادیث کے عموم سے جواز معلوم ہوتا ہے، اگرچہ عملی طور پر رسول اللہ ﷺ سے ان دنوں روزے رکھنا ثابت نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہم جب یوم عرفہ کا روزہ رکھتے ہیں تو یوم عرفہ گزر چکا ہوتا ہے کیا ہمیں اس دن کا روزہ رکھنا چاہیے جس دن حاجی لوگ میدان عرفات میں ہوتے ہیں یا ہمیں نویں ذوالحجہ کو روزہ رکھنا چاہیے، خواہ سعودیہ میں یوم عرفہ گزر چکا ہو؟

جواب یوم عرفہ نو ذوالحجہ کو ہوتا ہے حجاج کرام کو اس دن روزہ رکھنا منع ہے، رسول اللہ ﷺ نے حج کے موقع پر اس دن کا روزہ نہیں رکھا ہے، چنانچہ حضرت ام فضل بنت حارث رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے ذوالحجہ کی نویں تاریخ کو میدان عرفات میں رسول اللہ ﷺ کے لئے دودھ کا ایک پیالہ بھیجا تو آپ نے اسے نوش فرمایا جبکہ آپ اونٹ پر بیٹھے تھے۔ [صحیح بخاری، الحج: ۱۶۶۱]

البتہ جو لوگ میدان عرفات میں نہیں ہیں ان کے لئے اس کا روزہ رکھنے کی بہت فضیلت ہے لیکن وہ نویں ذوالحجہ کا روزہ رکھیں گے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے بھی نویں ذوالحجہ کا روزہ رکھا تھا۔حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نو ذوالحجہ، یوم عاشورہ (دس محرم) اور ہر ماہ میں تین دن کے روزے رکھتے تھے۔ [ابوداؤد، الصیام: ۲۴۳۴]

ہم نے اپنے حساب سے نو ذوالحجہ کا روزہ رکھنا ہے، اس سلسلہ میں ہم سرزمین مقدس کا حساب نہیں رکھیں گے کیونکہ سعودیہ سے مشرق والے ایک یا دو دن پیچھے ہیں اگر وہاں ۱۵ ذوالحجہ ہے تو ہمارے ہاں تیرہ یا چودہ ذوالحجہ ہوگی اور سعودیہ سے مغربی علاقے ایک یا دو دن آگے ہیں اگر سعودیہ میں ۱۵ ذوالحجہ ہے تو وہاں سولہ یا سترہ ذوالحجہ ہوگی ہے۔اگر ذوالحجہ کی نویں تاریخ کے روزے کو سعودیہ کے حساب سے رکھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے جو علاقے سعودیہ سے ایک دن یا دو دن آگے ہیں وہاں سعودیہ کی نویں تاریخ دس یا گیارہ ذوالحجہ ہوگی، یعنی وہاں عید ہوگی اور عید کا روزہ رکھنا شرعاً ممنوع ہے۔اسی لئے ہم نے اپنے حساب سے نویں

ذوالحجہ کا روزہ رکھنا ہے۔ہم اس سلسلہ میں قطعی طور پر سعودیہ کے پابند نہیں ہیں؟ [واللہ اعلم]

سوال احادیث میں شب قدر کی تعیین منقول ہے یا نہیں؟

جواب اس کی تعیین کے متعلق بہت اختلاف ہے۔حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً چالیس اقوال نقل کیے ہیں۔

[فتح الباری،ص:۷۹۴،ج۴]

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ شب قدر رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں ہے،جیسا کہ ارشاد نبوی ہے:''لیلۃ القدر کو رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔'' [صحیح بخاری،حدیث نمبر:۲۰۱۷]

بعض حضرات نے ستائیسویں رات کو شب قدر قرار دیا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق فرمایا:''یہ ستائیسویں رات ہے۔'' [صحیح مسلم،الصلوٰۃ:۱۲۳۶]

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیشہ یہی رات شب قدر ہوگی،ممکن ہے کہ آپ نے یہ اس وقت فرمایا ہو کہ جس سال ستائیسویں رات کو شب قدر تھی۔ [واللہ اعلم]

سوال کیا عورت اپنے گھر میں اعتکاف بیٹھ سکتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد امہات المومنین رضی اللہ عنہن نے مسجد میں اعتکاف کیا تھا؟

جواب اعتکاف کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو تو پھر بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔'' [۲/البقرہ:۱۸۷]

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ اعتکاف صرف مسجد میں ہی ہوسکتا ہے کیونکہ اعتکاف کے دوران بیوی سے مباشرت کرنا تو ہر حال میں منع ہے،پھر مساجد کے حوالہ سے اسے کیوں بیان کیا گیا ہے؟اس پر تمام اہل علم کا اجماع ہے کہ اعتکاف کے لئے مسجد کا ہونا ضروری ہے اس کے علاوہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ مسجد کے علاوہ اعتکاف نہیں ہوتا۔ [دارقطنی،ص:۲۰۱،ج۲]

اعتکاف کے لئے مرد اور عورت کی تفریق بھی صحیح نہیں ہے کہ مردوں کے لئے مسجد کو ضروری قرار دے دیا جائے اور عورتوں کے متعلق گھر میں اعتکاف کرنے کی اجازت دی جائے جبکہ طریقہ نبوی اس کے خلاف ہے،کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ازواج مطہرات مسجد میں ہی اعتکاف کرتی تھیں،جیسا کہ ایک مرتبہ آپ نے اعتکاف کا ارادہ فرمایا جب آپ اعتکاف کے لئے مسجد میں اپنے خیمہ کی طرف گئے تو دیکھا کہ آپ کی بیویوں نے بھی مسجد نبوی میں اعتکاف کے لئے خیمے لگا رکھے ہیں۔آپ نے یہ دیکھ کر فرمایا:''ان بیویوں نے یہ کام حسن نیت کی بنا پر بلکہ جذبہ رقابت کی وجہ سے کیا ہے۔''آپ نے ان سب کے خیمے اکھاڑ دینے کا حکم دیا،پھر آپ نے اپنا خیمہ بھی اکھڑوا دیا۔ [صحیح بخاری،الاعتکاف:۲۰۳۴]

اگر خواتین کے لئے مسجد کے علاوہ گھروں میں اعتکاف کرنا صحیح ہوتا تو آپ انہیں گھروں میں اعتکاف کرنے کا حکم دے دیتے لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کے لئے بھی مسجد کا اہتمام ضروری ہے لیکن اس کیلئے چند شرائط ہیں:

(۱) عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے خاوند یا سرپرست سے اجازت لے۔

(۲) مسجد میں اعتکاف کرنے سے کسی قسم کے فتنہ وفساد کا اندیشہ نہ ہو۔

(۳) مسجد میں سحری وافطاری کا معقول انتظام ہو یا کوئی گھر سے لانے والا ہو، رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے اعتکاف کیا تھا اگرچہ مسجد کی صراحت احادیث میں نہیں ہے۔ تاہم آثار وقرائن سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے مسجد میں ہی اعتکاف کیا تھا۔ [واللہ اعلم]

سوال جو شخص رمضان کے روزے نہ رکھ سکے تو وہ رمضان کے بعد اس کی گنتی پوری کرے گا لیکن جو دائمی بیمار یا شوگر کا مریض ہو جو بالکل روزہ ہی نہ رکھ سکے، اس کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب کسی فرض کو وقت کے بعد بجالانا قضا کہلاتا ہے۔ روزے کے متعلق بعض عذر ایسے ہیں جو قضا کا باعث ہیں اور بعض عذر فدیہ کا موجب ہیں، مثلاً: اگر معمولی بیماری ہے اور روزہ رکھنے میں کوئی دقت نہیں تو روزہ رکھ لینا بہتر ہے اور اگر بیماری زیادہ ہے کہ روزہ رکھنے سے مشقت ہوتی ہے یا بیماری بگڑنے کا اندیشہ ہے تو روزہ چھوڑا جاسکتا ہے۔ قرآن کریم نے اجازت دی ہے کہ دوران بیماری جتنے روزے رہ جائیں انہیں بعد میں رکھ لیا جائے۔ جیسا کہ صورت مسئولہ میں بھی اس بات کی وضاحت ہے اگر دائمی مریض ہے یا شوگر کی وجہ سے روزہ رکھنے کی ہمت نہیں ہے تو روزہ چھوڑ دیا جائے اور فدیہ کے طور پر کسی دوسرے شخص کو روزے رکھوا دیئے جائیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور جو لوگ روزہ کی طاقت نہیں رکھتے وہ فدیہ کے طور پر ایک مسکین کو کھانا کھلائیں''۔ [۲/البقرہ:۱۸۴]

اسی طرح اگر کوئی اس قدر ضعیف ہو کہ روزہ نہ رکھ سکتا ہو وہ بھی اپنے روزوں کا فدیہ دے گا، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فتویٰ ہے ''بہت بوڑھے کے لئے رخصت ہے کہ وہ خود روزہ رکھنے کی بجائے ہر دن ایک مسکین کو دو وقت کا کھانا دے، اس کے ذمے روزہ کی قضا نہیں ہے۔'' [مستدرک حاکم:۱/۴۴۰]

اس آیت کریمہ اور فتویٰ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پیش نظر دائمی مریض یا شوگر کا عارضہ لاحق ہو تو بیمار رمضان کے بعد روزہ رکھنے کے بجائے رمضان میں ہی کسی مسکین کو روزہ رکھنے کے اخراجات مہیا کردے۔ [واللہ اعلم]

سوال کیا اعتکاف کرنے والا کسی بیمار کی تیمارداری یا کسی عزیز کے جنازہ میں شریک ہوسکتا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب اعتکاف کا لغوی معنی ''بند رہنا اور کسی چیز کو لازم پکڑ لینا'' ہے۔ اور اس کی شرعی تعریف یہ ہے کہ خاص کیفیت کے ساتھ کسی شخص کا خود کو مسجد میں روک لینا اعتکاف کہلاتا ہے۔ اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ مبارکہ یہ ہے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ اعتکاف بیٹھتے تو کسی سخت حاجت کے بغیر گھر میں داخل نہ ہوتے۔ [صحیح بخاری، الاعتکاف:۲۰۲۹]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اعتکاف کرنے والے پر سنت یہ ہے کہ سوائے کسی ضروری حاجت کے مسجد سے باہر نہ نکلے۔'' [بیہقی،ص:۳۲۱،ج۴]

ان احادیث کے پیش نظر اعتکاف کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسجد سے باہر نہ نکلے، ہاں، اگر سخت ضرورت ہے

جو مسجد سے نکلے بغیر پوری نہیں ہو سکتی تو ایسے حالات میں مسجد سے نکلنا جائز ہے، مثلاً:

☆ مسجد میں نہانے یا قضائے حاجت کا بندوبست نہیں ہے یا مسجد میں پانی وغیرہ کا نظام خراب ہو چکا ہے، ایسے حالات میں وہ گھر جا کر اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہے۔

☆ کھانا وغیرہ لانے والا کوئی نہیں ہے تو گھر جا کر کھانا وغیرہ کھا سکتا ہے لیکن لازم ہے کہ ضرورت پورا ہوتے ہی مسجد میں واپس آ جائے۔

☆ ایک دفعہ دوران اعتکاف رسول اللہ ﷺ کی زیارت کے لئے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا تشریف لائیں تو آپ انہیں گھر چھوڑنے گئے کیونکہ رات کافی گزر چکی تھی۔ [صحیح بخاری، الاعتکاف: ۲۰۳۵]

بیمار کی تیمارداری کرنا یا جنازہ میں شریک ہونا ایسی ضروریات سے نہیں ہے، لہٰذا معتکف کسی کی تیمارداری یا جنازہ میں شریک نہیں ہو سکتا، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اعتکاف کرنے والے کے لئے سنت یہ ہے کہ وہ کسی مریض کی تیمارداری کرے اور نہ ہی کسی کا جنازہ پڑھے۔ [ابوداؤد، الصوم: ۲۴۷۳]

ہاں، اگر مسجد میں جنازہ آ جائے تو شریک ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے، اسی طرح اگر کوئی نمازی مسجد میں آ کر بیمار ہو گیا ہے تو مسجد میں اس کی تیمارداری کی جا سکتی ہے، مسجد سے باہر نکل کر یہ کام کرنے درست نہیں ہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی رمضان کے روزے نہیں رکھ سکتا وہ کیا کرے؟

جواب اگر کوئی بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے روزے نہیں رکھ سکتا اگر آئندہ تندرست ہونے کی امید نہ ہو تو قضا کی بجائے وہ فدیہ ادا کرے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ”اور جو لوگ روزہ کی طاقت نہیں رکھتے وہ فدیہ کے طور پر ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔“ [۲/البقرہ: ۱۸۴]

اگر کوئی اتنا بوڑھا ہو گیا ہو کہ روزہ رکھنے کی ہمت نہیں رہی تو وہ بھی فدیہ دے، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فتویٰ ہے فرماتے ہیں کہ بہت بوڑھے کے لئے رخصت ہے کہ وہ خود رکھنے کے بجائے ہر دن کسی ایک مسکین کو دو وقت کا کھانا دے دے اور اس پر روزہ کی قضا نہیں ہے۔ [مستدرک حاکم، ۴۴۰، ج ۱]

سوال میرا دوست سعودیہ میں ایک روزہ رکھ کر یکم رمضان کو پاکستان آیا اب وہ مسلسل روزہ رکھتا رہے تو تیس رمضان کو اس کے اکتیس روزے ہو جائیں گے اب اسے کیا کرنا چاہیے؟

جواب رمضان کے متعلق شرعی قاعدہ یہ ہے کہ اگر انتیس کو چاند نظر نہ آئے تو تیس روزے پورے کئے جائیں، اس کے بعد عید کی جائے۔ صورت مسئولہ میں متعلقہ شخص کے ہمارے ہاں انتیس رمضان کو تیس روزے ہو جائیں گے اسے مزید روزہ رکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ ہمارے ہاں تیس تاریخ کو روزہ نہ رکھے، البتہ احترام رمضان کے پیش نظر وہ برسر عام کھانے پینے سے اجتناب کرے، اسی طرح اگر کوئی پاکستان سے سعودیہ جاتا ہے تو اس کے روزے کم ہوں گے، اسے چاہیے کہ وہاں لوگوں کے ساتھ عید منانے کے بعد اپنے روزے کی کمی کو پورا کرے، یعنی عید کے بعد قضا کرے، اگر کسی کے تیس سے زیادہ روزے بنتے ہیں تو اسے تیس سے زائد رکھنے کی ضرورت نہیں، البتہ عید لوگوں کے ساتھ کرنا ہو گی، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ”روزے کم ہونے کی صورت میں انہیں عید کے بعد پورے کرے۔“ [واللہ اعلم]
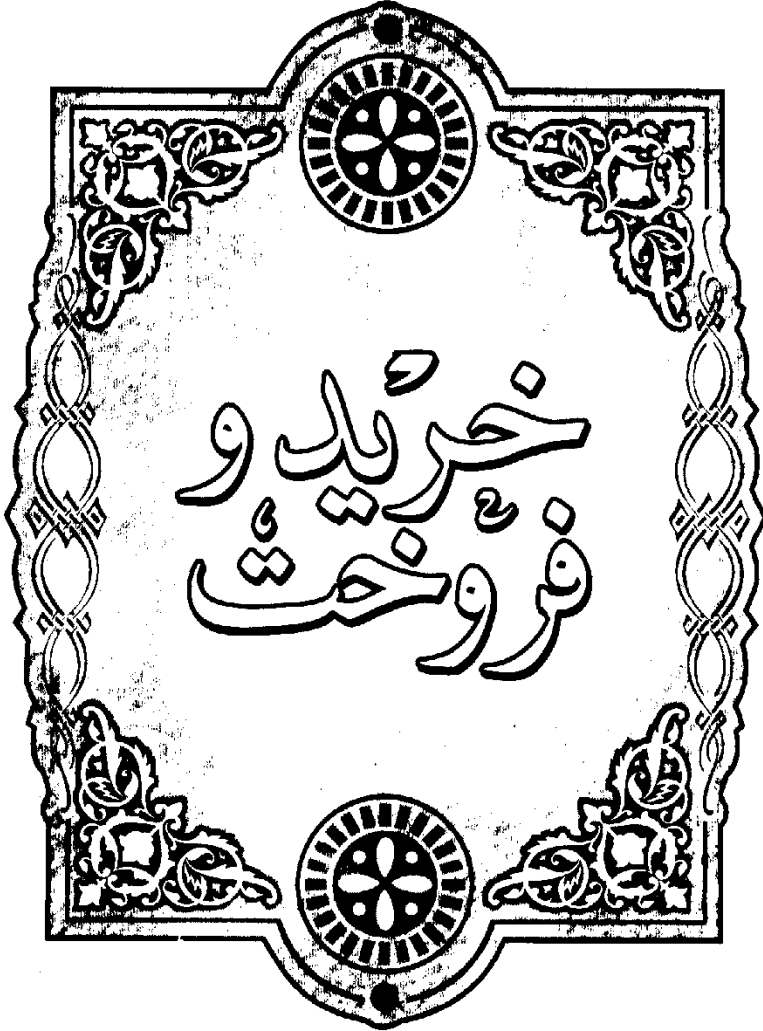
خرید و فروخت

خرید و فروخت

سوال میں کپڑے کا کاروبار کرتا ہوں ہمارا کاروبار خرید و فروخت میں نقد اور ادھار پر منحصر ہوتا ہے، اس سلسلہ میں چند ایک سوالات ہیں، جن کی وضاحت درکار ہے۔ آج بھی اس وضاحت کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے، اس بنا پر یہ سوالات مع جوابات پیش خدمت ہیں:

☆ ہمارے پاس گاہک آیا، اس نے ہم سے ریٹ پوچھا اور نقد رقم کی ادائیگی پر ہم سے مال لیا اور چلا گیا۔ اس سودے بازی میں ہماری کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ نفع کمایا جائے اور گاہک کی کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ رعایت لی جائے، اس سلسلہ میں شرعی طور پر ہم کس شرح سے نفع لے سکتے ہیں؟

جواب اسلام میں خرید و فروخت کے جائز ہونے کی چند ایک شرائط حسب ذیل ہیں:

① فریقین باہمی رضامندی سے سودا کریں۔

② فروخت کردہ اشیا اور ان کا معاوضہ مجہول نہ ہو۔

③ قابل فروخت چیز فروخت کنندہ کی ملکیت ہو اور وہ اسے خریدار کے حوالے کرنے پر قادر ہو۔

④ فروخت کردہ چیز میں کسی قسم کا کوئی عیب چھپا ہوا نہ ہو۔

⑤ کسی حرام چیز کی خرید و فروخت نہ ہو۔

⑥ کاروبار میں سودی لین دین بطور حیلہ جائز نہ قرار دیا گیا ہو۔

⑦ اس خرید و فروخت میں کسی فریق کو دھوکہ دینا مقصود نہ ہو۔

⑧ تجارتی لین دین میں حق رجوع کو برقرار رکھا گیا ہو۔

اگر مذکورہ بالا شرائط کسی خرید و فروخت میں پائی جاتی ہیں تو وہ جائز اور حلال ہے، لیکن اسلام میں کوئی شرح منافع مقرر نہیں ہے، البتہ کسی کی مجبوری سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے بلکہ ایک دوسرے کے لئے ہمدردی اور ایثار کے جذبات ہونے چاہییں۔ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے 100% نفع کمایا۔ رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف اسے برقرار رکھا بلکہ ان کے لیے خیر و برکت کی دعا فرمائی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کو ایک دینار دیا تا کہ وہ آپ کے لئے ایک بکری خرید کر لائیں، اس نے منڈی سے ایک دینار کی دو بکریاں خریدیں، پھر ان میں سے ایک کو ایک دینار کے عوض فروخت کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کے پاس نفع کا ایک دینار اور خرید کردہ بکری پیش کر دی، رسول اللہ ﷺ نے اس کے لئے خیر و برکت کی دعا کی۔ اس دعا کا یہ اثر تھا کہ اگر وہ مٹی بھی خرید لیتے تو اس سے بھی نفع کماتے۔ [صحیح بخاری، المناقب: ۳۶۴۲]

اسی طرح حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے ایک دینار دیا تا کہ وہ اس سے قربانی کا جانور خرید لائے، انہوں نے ایک بکری ایک دینار کے عوض خریدی، راستہ میں انہیں گاہک ملا اسے وہ دو دینار کے عوض فروخت کر دی، وہ دوبارہ منڈی

گئے وہاں سے ایک دینار کے عوض ایک اور بکری خریدی اور حاصل کردہ نفع اور خرید کردہ بکری رسول اللہ ﷺ کے حوالے کردی۔ رسول اللہ ﷺ نے حاصل کردہ نفع ایک دینار بھی صدقہ کردینے کا حکم فرمایا۔ [ابوداود، البیوع:۳۳۸۶]

ان روایات سے معلوم ہوا کہ شرح منافع کا شریعت نے کوئی تعین نہیں کیا ہے، فریقین باہمی رضامندی سے خرید وفروخت کرنے کے مجاز ہیں۔

سوال بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ گاہک آیا اور اس نے ہم سے ریٹ پوچھا اور طے کرکے ہم سے سودا لیا، ہمیں سودے بازی کرتے وقت یہ پتہ نہیں ہوتا کہ گاہک ادھار سودا لے گا یا نقد وہ کبھی نقد رقم دے جاتا ہے اور کبھی ادھار پر مال لے جاتا ہے، کیا اس طرح سودا کرنے میں کوئی قباحت تو نہیں ہے؟

جواب اس سودے بازی میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نقد قیمت ادا کرکے چیزیں خریدی ہیں اور ادھار پر بھی اشیاء صرف لی ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک اونٹ خریدا اور اس کی قیمت نقد ادا کردی۔

[صحیح بخاری، البیوع:۲۷۱۸]

نیز رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے ادھار رقم کی ادائیگی پر کچھ جو خریدے اور بطور اعتماد اس کے پاس اپنی ذرہ گروی رکھ دی۔ [صحیح بخاری، الاستقراض:۲۳۸۶]

اس لئے نقد وادھار خرید وفروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

سوال ہم سے گاہک نے مال دیکھا اور ریٹ طے کیا، ہمیں پتہ ہے کہ یہ گاہک ادھار رقم کی ادائیگی پر مال خریدے گا، اس بنا پر ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ادھار لینے والے گاہک سے عام گاہک کی نسبت زیادہ نفع کمایا جائے، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

جواب ایسا کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ فروخت کار کو شریعت نے یہ اختیار دیا ہے کہ اپنی چیز کی جو چاہے قیمت لگائے، یہی وجہ ہے کہ کسی چیز کا بھاؤ متعین کردینا شرعاً جائز نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنے سے فروخت کار کی حق تلفی ہوتی ہے۔ ایک دفعہ اہل مدینہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ آپ اشیاء کے بھاؤ متعین کردیں تو آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ہی ان اشیاء کا خالق اور ان کے اتار چڑھاؤ کا مالک ہے، نیز وہ تمام مخلوق کا رازق بھی ہے، میں یہ نہیں چاہتا کہ قیامت کے دن میرے ذمے کسی کا کوئی حق ہو۔'' [مسند امام احمد:۳/۱۵۶]

اس حدیث کے پیش نظر اشیاء کی قیمتیں توقیفی نہیں کہ ان میں کمی بیشی نہ ہوسکتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے ریٹ طے کرنے کا اختیار فروخت کار کو دیا ہے، چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عنوان بایں الفاظ ذکر کیا ہے: ''چیز کا مالک بھاؤ لگانے کا زیادہ حق دار ہے'' پھر آپ نے اس حدیث کا حوالہ دیا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے بنو نجار کو کہا تھا کہ اس احاطہ کا بھاؤ لگاؤ جس میں کھنڈرات اور کھجوریں وغیرہ تھیں اور آپ مسجد تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ [صحیح بخاری، البیوع:۲۱۰۶]

پھر نقد اور ادھار کی قیمت کی مالیت میں نمایاں فرق ہے، شریعت نے اس فرق کو برقرار رکھا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے فرمایا تھا کہ وہ ایک لشکر ترتیب دیں اور اس کے لئے لوگوں سے حاضر اونٹ اس شرط پر خریدلیں کہ

جب زکوٰۃ کے اونٹ آئیں گے تو ایک اونٹ کے عوض دو اونٹ دیے جائیں گے۔ [مستدرک حاکم، البیوع: ۲۳۴۰]

لہٰذا فروخت کار کا حق ہے کہ ادھار لے جانے والے سے اگر چاہے تو عام گاہک سے اپنے مال کی زیادہ قیمت وصول کرے، اس میں بظاہر شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

سوال ایک صورت بازار میں یہ بھی رائج ہے کہ اگر نقد ادائیگی ہوگی تو ریٹ یہ ہوگا اگر ادھار لوگے تو اتنے دام زیادہ ہوں گے، کیا نقد وادھار کی قیمت میں فرق کرنا شرعاً جائز ہے؟

جواب شرعی لحاظ سے نقد اور ادھار کی صورت میں کسی چیز کی قیمت کو کم وبیش کرنا جائز ہے بشرطیکہ مجلس عقد میں چیز کی مقدار اور ادا قیمت کی معیاد مقرر کرلی جائے، اگرچہ ادھار دینے کی صورت میں مختلف مدتوں کے مقابلہ میں مختلف قیمتیں مقرر کرلی جائیں، لیکن عاقدین کے درمیان عقد بیع کے وقت مختلف مدتوں اور قیمتوں کے درمیان کسی ایک مدت اور قیمت کا تعین ہونا ضروری ہے۔ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے ائمہ اربعہ، جمہور فقہا اور محدثین کا مسلک بایں الفاظ بیان کیا ہے کہ خرید وفروخت کے عمومی دلائل کے پیش نظر ادھار بیع میں نقد کی نسبت قیمت زیادہ وصول کرنا جائز ہے بشرطیکہ خریدار اور فروخت کار ادھار یا نقد کا قطعی فیصلہ کرکے کسی ایک قیمت پر متفق ہوجائیں۔ [نیل الاوطار: ۱۷۲/۵]

اس بنا پر اگر کہے کہ میں یہ چیز نقد اتنے میں اور ادھار اتنے میں فروخت کرتا ہوں اس کے بعد کسی ایک بھاؤ پر اتفاق کیے بغیر دونوں جدا ہوجائیں تو جہالت ثمن کی وجہ سے یہ بیع ناجائز ہوگی لیکن اگر عاقدین مجلس عقد میں ہی کسی ایک شق اور کسی ثمن پر اتفاق کرلیں تو بیع جائز ہوگی۔ چنانچہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

بعض اہل علم نے ''بیعتین فی بیعة'' کی تشریح بایں الفاظ کی ہے کہ فروخت کار خریدار سے کہے کہ میں یہ کپڑا تجھے نقد دس اور ادھار بیس روپے میں فروخت کرتا ہوں، پھر اگر ان دونوں میں سے کسی ایک پر اتفاق ہونے کے بعد جدائی ہوئی تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ معاملہ ایک طے ہوگیا۔ [ترمذی، البیوع: ۱۲۳۱]

نقد اور ادھار کی قیمت میں فرق کرنے کے متعلق ہمارا مفصل فتویٰ اہل حدیث مجریہ ۷ جون ۲۰۰۲ شمارہ ۲۲ میں شائع ہوچکا ہے۔

نوٹ: ہمارے ہاں بعض علما ادھار کی وجہ سے قیمت میں اضافے کو ناجائز کہتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ قیمت میں یہ اضافہ مدت کے عوض میں ہے اور جو اضافہ مدت کے عوض میں ہو وہ سود ہے جسے شریعت نے حرام کیا ہے لیکن یہ اضافہ مدت کا عوض نہیں بلکہ مدت کی وجہ سے ہوتا ہے کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ اس ادھار کی قیمت میں کچھ قیمت تو بیع کی ہو اور کچھ قیمت اس مدت کی ہو جو عاقدین نے قیمت کی ادائیگی کے لئے طے کی ہے بلکہ بعض مخصوص معاشرتی حالات کے پیش نظر ادھار میں جو سہولت میسر آتی ہے اس کی وجہ سے کچھ اضافہ ہوا ہے۔ آسانی کے پیش نظر یوں بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ یہاں پر قیمت میں اضافہ ادھار کی وجہ سے ہے، ادھار کے عوض میں نہیں ہے۔ تفصیل کے لئے ہمارے فتویٰ کا مطالعہ کیجئے جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے۔

سوال بعض اوقات ہمارے پاس بیوپاری آتے ہیں ان کے پاس مال کے نمونے ہوتے ہیں، فریقین باہمی رضامندی سے ریٹ طے کرلیتے ہیں، ہمیں علم ہوتا ہے کہ یہ سودا مہنگا ہے کیونکہ ادھار لے رہے ہیں لیکن باہمی رضامندی سے یہ طے کرلیا جاتا ہے

کہ ہفتہ وار کل رقم کا 1/4 یا 1/8 ادا ہوگا، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب اس معاملہ کی دو صورتیں ممکن ہیں پہلی یہ کہ جب سودا ہو رہا تھا تو فروخت کار کے پاس مال موجود تھا اگرچہ اس کے سٹور میں ہو۔ وہ معاملہ طے ہونے کے بعد مال مہیا کر دیتا ہے اس کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ معاملہ طے کرتے وقت اس کے پاس صرف نمونہ ہی تھا اس کے پاس مال موجود نہ تھا اس نے آگے کسی سے خرید کر یا خود تیار کر کے مال مہیا کرنا ہے، یہ صورت نا جائز ہے۔ کیونکہ کسی کو ایسی چیز فروخت کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے جو سودا طے کرتے وقت اس کی ملکیت نہ ہو یا وہ اس وقت مہیا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایسی چیز مت فروخت کرو جو تمہارے پاس نہیں ہے۔'' یہ حکم امتناعی اس وقت جاری فرمایا جب حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ! میرے پاس ایک آدمی آتا ہے اور وہ مجھ سے ایسی چیز طلب کرتا ہے جو میرے پاس نہیں، میں سودا طے کرنے کے بعد بازار سے خرید کر اسے مہیا کرتا ہوں تو آپ نے اس سے منع فرمایا۔ [ابوداود، البیوع:۳۵۰۳]

سوال بعض اوقات ہم پورا مال نقد بازار ریٹ پر خرید لیتے ہیں لیکن ادھار خریدنے کے لئے یہ ہوتا ہے کہ اگر پندرہ دن کا ادھار ہے تو 50 پیسے اور اگر ایک ماہ کا ادھار ہے تو ایک روپیہ فی میٹر ریٹ زیادہ ہوتا ہے، مزید مدت بڑھ جائے تو ریٹ بھی بڑھتا جائے گا؟

جواب اس کی پہلے وضاحت ہو چکی ہے کہ نقد اور ادھار ریٹ میں فرق کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ایک بھاؤ طے کر لیا جائے۔ طے ہونے کے بعد مدت کے بڑھنے سے ریٹ کا بڑھانا صریح سود ہے، معاملہ کرتے وقت جو ریٹ طے ہوا ہے، اس کے مطابق ادائیگی ہونی چاہیے۔

سوال کوئی کپڑا بازار میں موجود نہیں، ہم کسی کارخانہ دار کو اس کا نمونہ دے دیتے ہیں اس سے مال فراہم کرنے کی مدت طے کر لیتے ہیں اور ریٹ بھی طے ہو جاتا ہے۔ اس مال کی فراہمی میں نقد ادائیگی پر ریٹ علیحدہ اور ادھار پر علیحدہ ہوتا ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب شرعی اصطلاح میں اسے بیع سلم کہا جاتا ہے۔ اس میں رقم پیشگی ادا کی جاتی ہے جبکہ مال بعد میں فراہم کرنا ہوتا ہے، اس میں بھاؤ، وقت فراہمی، جنس، وصف اور پیمائش وغیرہ پہلے سے طے کرنا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص کسی چیز کے متعلق بیع سلم یا سلف کرتا ہے اسے چاہیے کہ متعلقہ چیز کی پیمائش یا وزن اور وقت ادائیگی طے کرے۔'' [صحیح بخاری، مسلم:۲۲۴۰]

اگر اس مدت میں مال مہیا نہ کیا جائے تو تاجروں کے عرف میں اسے جرمانہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن ریٹ وغیرہ میں کمی کرنے کا دباؤ نہیں ڈالا جا سکتا، اس میں رقم پیشگی ہی ادا کرنا پڑتی ہے، بصورت دیگر طرفین سے ادھار ہوگا جو شرعاً درست نہیں ہے۔

سوال ایک اور صورت جو بازار میں رائج ہے کہ ایک آدمی ایک ماہ کے ادھار پر مال لیتا ہے، پھر معینہ مدت میں ادائیگی نہیں کر سکتا تو فروخت کار تقاضا کرتا ہے کہ جتنی رقم اس کے ذمے بنتی ہے نئی متوقع مدت کے مطابق اتنی رقم کے مال کا نیا بل بنوا لے، پھر یہ بل زائد رقم کا بنایا جاتا ہے، جبکہ حقیقت میں نہ خریدار کوئی مال لیتا ہے اور نہ ہی فروخت کار کوئی مال دیتا ہے جتنی مدت خریدار

بڑھا لے اتنا نفع فروخت کار بڑھا لیتا ہے۔ اس کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب اگر مجلس عقد میں پہلے سے بھاؤ اور ادا قیمت کی معیاد طے کر لی گئی تھی تو پھر اگر خریدار بروقت رقم مہیا نہ کر سکے تو از سر نو اضافہ کے ساتھ قیمت کا تعین کرنا جائز نہیں۔ جیسا کہ صورت مسئولہ میں وضاحت کی گئی ہے اگر ایسا کیا گیا تو واضح طور پر سود ہے جس سے شریعت نے منع کیا ہے۔ فروخت کار کو ایسے موقع پر رواداری سے کام لینا چاہیے کہ ادائیگی کی مدت قیمت میں اضافہ کے بغیر بڑھا دی جائے۔ حدیث میں اس طرح کے تنگ دست کے ساتھ نرمی اور مزید مہلت دینے پر بہت فضیلت آئی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کو صرف اس لئے معاف کر دیا تھا کہ وہ مفلوک الحال اور تنگ لوگوں کو مزید مہلت دیا کرتا تھا اگر خریدار رقم دیر سے ادا کرنے کا عادی مجرم ہے تو اس کے سد باب کے لئے جرمانہ وغیرہ کیا جا سکتا ہے، لیکن از سر نو سابقہ رقم بڑھا کر نیا بل بنانا شرعاً حرام ہے۔ ایسا کرنا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کرنے کے مترادف ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ایک انشورنس کمپنی E.F.U کا دعویٰ ہے کہ ہم رقم کو بزنس میں لگاتے ہیں اور منافع یا نقصان سرمایہ لگانے والوں میں تقسیم کر دیتے ہیں ہم بنک یا دوسری سیونگ سکیموں کی طرح منافع کی شرح فکس نہیں کرتے، اس کے متعلق واضح کریں کہ ایسی کمپنی میں سرمایہ کاری کرنا شرعاً درست ہے؟

جواب انشورنس جسے بیمہ کہا جاتا ہے ایک جدید کاروباری معاملہ ہے جس کا اسلامی فقہ کے ابتدائی دور میں کوئی وجود نہیں تھا، یہی وجہ ہے کہ دور حاضر کے جن ماہرین علم نے اس پر بحث کی ہے ان کی آراء مختلف ہیں۔ بعض اس کے جائز ہونے کی طرف رجحان رکھتے ہیں جبکہ بعض دور رس اور باریک بین حضرات نے اس کے برعکس اس کی حرمت کا فتویٰ دیا ہے، لہٰذا اس کے متعلق شرعی حکم معلوم کرنے سے پہلے اس معاملہ کی اصل حقیقت جاننا انتہائی ضروری ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بیمہ نظریہ کے اعتبار سے باہمی تعاون اور امداد محض پر قائم ہے۔ نظریے کی حد تک یہ ایک ایسا امر ہے جس میں شریعت نے بھی ابھارا ہے۔ دین اسلام نے ہمیں باہمی تعاون، ایک دوسرے کی مدد، ایثار اور قربانی دینے کی ترغیب دی ہے، جس کی عملی صورت معاملات، عطیات اور صدقات وخیرات ہیں۔ شریعت اسلامیہ نے جہاں اغراض ومقاصد بیان کئے ہیں وہاں ان ذرائع و وسائل کو بھی بیان کیا ہے جو ان مقاصد کے حصول کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں۔ بیمہ نظریہ اور نظام کے اعتبار سے تو تعاون محض پر قائم تھا لیکن عملی طور پر جو ذرائع استعمال کئے گئے ہیں وہ اس نظریہ کی نفی کرتے ہیں، جیسا کہ آئندہ معلوم ہو گا دراصل امداد باہمی پر مبنی یہ نظام جب یہودیانہ ذہنیت کی بھینٹ چڑھا تو اسے پہلے تو کاروباری شکل دے دی گئی، پھر سود، دھوکہ اور جوئے جیسے بدترین عوامل وعناصر کو اس میں شامل کر کے اس پر سے تعاون محض کی چھاپ کو اتار دیا گیا یہ بیمہ اشخاص اور کمپنی کے درمیان ایک خاص عقد کا نام ہے جس میں افراد اور کمپنیوں کے درمیان مندرجہ ذیل امور طے پاتے ہیں

① طالب بیمہ ایک معینہ مدت تک بالاقساط ادا کرتا ہے اس کے عوض بیمہ کمپنیاں اسے خطرات سے تحفظ اور گراں قدر سالانہ منافع پیش کرتی ہیں۔

② یہ کمپنیاں اپنی صوابدید کے مطابق جہاں چاہیں اس رقم کو صرف کریں۔ طالب بیمہ اس سے قطعی طور پر لاتعلق ہوتا ہے۔ یہ رقم

جائز وناجائز کاموں پرصرف کی جاتی ہے جیسے عمارات کی تعمیراور بھاری شرح سود پرآگے بڑی کمپنیوں کوقرض دیناوغیرہ۔

③ طالب بیمہ اگر معینہ مدت تک زندہ رہے اور پوری رقم بالاقساط ادا کردے تو وہ کمپنی سے ادا کردہ رقم سے زائد وصول کرنے کا حقدار ہوجاتا ہے۔اگر اس مدت سے پہلے مرجائے تو اس کی طرف سے نامزد شخص زربیمہ کا مستحق ہوتا ہے۔

④ اگر طالب بیمہ معینہ مدت سے پہلے اپنی اقساط بند کرکے معاہدہ بیمہ کو ختم کرنا چاہے تو جمع شدہ رقم کمپنی ضبط کرلیتی ہے۔

بیمہ کی تعریف مختصر طور پریوں کی جاسکتی ہے کہ یہ ایک ایسا معاہدہ ہے جس کی رو سے تحفظ دھندہ،یعنی بیمہ کمپنی پر یہ لازم ہوجاتا ہے کہ وہ اس شخص کو جس نے بیمہ پالیسی خریدی ہے حادثہ یا نقصان پہنچنے کی صورت میں ایک مخصوص رقم ادا کرے۔اس تعریف سے بیمہ کے تین عناصر کا پتہ چلتا ہے وہ یہ ہیں:

① بیمہ کی قسط ② خطرہ ③ بیمہ کی رقم

خطرہ سے مراد امکانی حادثہ ہے جو مستقبل میں کسی وقت بھی پیش آسکتا ہے یہ خطرہ اور حادثہ ہی اس کاروبار بیمہ میں بنیادی حیثیت کا حامل ہے اور باقی دوسرے عناصر کے لئے بنیاد فراہم کرتا ہے۔اس کاروبار کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ معاہدہ کی رو سے فریقین ذمہ دار بن جاتے ہیں اس میں ایک فریق خطرات سے تحفظ فراہم کرنے والا ہے اور دوسرا وہ جسے تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔جسے طالب بیمہ کہتے ہیں اس کی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ اقساط بیمہ کی ادائیگی کا بروقت بندوبست کرے،یہ ذمہ داری معاہدہ کی تکمیل کے وقت ہی شروع ہوجاتی ہے جبکہ اس کے مقابلہ میں بیمہ کمپنی کی ذمہ داری غیر یقینی اور احتمالی ہوتی ہے کیونکہ اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ حادثہ پیش آنے کی صورت میں بیمہ کی رقم ادا کرے،اس ذمہ داری کے وجود کا تصور اس کے بغیر ممکن ہی نہیں کہ کوئی حادثہ پیش آئے،اس وجہ سے دھوکہ اور احتمال اس کاروبار کا بنیادی رکن اور لازمی عنصر ہے کیونکہ بیمہ کا کاروبار اس کے بغیر ناممکن ہے اور یہ دھوکہ اپنی نوعیت اور قسم کے لحاظ سے انتہائی سنگین ہے۔کیونکہ حصول معاوضہ کے سلسلہ میں اس کی مقدار اور اس کی مدت کے بارے میں پایا جاتا ہے جبکہ شریعت نے کاروباری معاملات میں دھوکہ کی معمولی قسم کو بھی حرام ٹھہرایا ہے۔دھوکے کو عربی زبان میں ''غرر'' کہتے ہیں جس کی تعریف یہ ہے کہ ''وہ غیر طبعی،غیر معمولی اور غیر یقینی صورت حال جس کے پیش نظر کسی معاملہ یا لین دین کے ضروری پہلو متعین نہ کئے جاسکیں اور فریقین آخر وقت تک اس معاملہ میں غیر یقینی کا شکار رہیں کہ ان کے معاملہ کی اصل صورت بالآخر کیا ہوگی۔'' غرر کی متعدد تعریفات سے اس کے جو اہم عناصر سامنے آئے ہیں،وہ شک وشبہ،غیر یقینی کیفیت اور معاملہ کے بنیادی اجزاء کا غیر معلوم اور غیر معین ہونا ہے۔جس معاملہ میں یہ عناصر پائے جائیں وہ معاملہ مبنی بر دھوکہ سمجھا جائے گا اور شریعت میں ایسا معاملہ ناجائز اور حرام ہے۔ہم اس مقام پر یہ وضاحت کردینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ بیمہ کے متعلق محل اختلاف اس کا نظریہ اور نظام ہرگز نہیں ہے بلکہ محل اختلاف وہ طریق کار اور ذریعہ ہے جو اس کے نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔اس کے طریق کار کے پیش نظر کاروبار غیر یقینی اور سنگین دھوکے والا معاملہ ہے۔اس کے غیر یقینی ہونے سے یہ مراد ہے کہ اس میں فریقین میں سے ہر ایک کو معاہدہ کی تکمیل کے وقت معاوضہ کی اس مقدار کا علم نہیں ہوتا جو وہ ادا کرے گا یا وصول کرے گا۔اس لئے کہ وہ تو اس خطرہ کے وقوع یا عدم وقوع پر موقوف ہوتا ہے جس سے تحفظ دیا گیا ہے اور یہ بات اللہ کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا کہ

حادثہ پیش آئے گا یانہیں، اگر آئے گا تو کب آئے گا؟ بعض اوقات طالب بیمہ ایک ہی قسط ادا کرنے کے بعد حادثے سے دوچار ہوجاتا ہے اور رقم بیمہ کا حقدار بن جاتا ہے جبکہ بعض اوقات پوری اقساط ادا کرنے کے باوجود حادثہ پیش نہیں آتا، اس طرح تحفظ فراہم کرنے والی بیمہ کمپنی کو معاہدہ کے وقت علم نہیں ہوتا کہ وہ کیا وصول کرے گی اور کیا ادا کرے گی کیونکہ بعض اوقات ایک ہی قسط وصول کرنے کے بعد حادثہ پیش آجاتا ہے اور اسے بیمہ کی رقم طالب بیمہ کو ادا کرنا پڑتی ہے اور بعض اوقات پوری اقساط وصول کرلیتی ہے، لیکن حادثہ پیش ہی نہیں آتا، اس طرح یہ معاملہ سراسر ایک ''اندھا سودا'' ہے۔ جس میں دھوکے کا پہلو نمایاں طور پر موجود ہے جس کی مزید وضاحت حسب ذیل ہے:

مالی معاملات میں دھوکہ چار طرح سے ہوسکتا ہے۔

① خود کسی چیز کے وجود میں دھوکہ ہو، جیسا کہ گم شدہ اونٹ کی خرید وفروخت۔

② کسی چیز کے حصول میں دھوکہ ہو، جیسے اڑتے ہوئے پرندوں کی خرید وفروخت۔

③ کسی چیز کی مقدار میں دھوکہ ہو، جیسا کہ پتھر پھینکنے کی جگہ تک زمین کی خرید وفروخت۔

④ مدت حصول میں دھوکہ، جیسا کہ حمل کے جنم تک قیمت ادا کرنا وغیرہ کاروبار بیمہ میں دھوکہ کی یہ چاروں اقسام پائی جاتی ہیں۔

☆ کسی چیز کے وجود میں دھوکے کا پایا جانا، یہ دھوکہ کی شدید ترین قسم ہے یہی وجہ ہے کہ فقہا نے صرف معدوم چیز کے معاوضہ پر ہی بطلان کا حکم نہیں لگایا بلکہ وہ اس کے حکم کے تحت ہر اس چیز کو شامل کرتے ہیں جس کے وجود اور عدم دونوں کا احتمال ہو، دھوکہ کی یہ قسم کاروبار بیمہ میں پوری طرح دیکھی جاسکتی ہے کیونکہ بیمہ کی جو رقم کمپنی کے ذمے ہوتی ہے اس کا وجود غیر یقینی ہے کیونکہ اس کا وجود حادثہ پر موقوف ہوتا ہے اور وہ خود غیر یقینی ہے۔

☆ کسی چیز کے حصول میں دھوکہ پایا جانا اس کے معاوضہ کو باطل کردیتا ہے، جیسا کہ دریا میں تیرتی ہوئی مچھلیوں کی قیمت ادا کرنا کیونکہ جو شخص ان کی قیمت ادا کرتا ہے وہ گویا ان کے حصول کو داؤ پر لگا رہا ہے وہ معاملہ کرتے وقت یہ نہیں جانتا کہ اس نے جس چیز کی قیمت ادا کی ہے وہ اسے حاصل بھی کرسکے گا یا نہیں، جبکہ اس نے معاوضہ صرف اس چیز کو حاصل کرنے کے لئے ادا کیا ہے بیمہ کے کاروبار میں بھی یہ دھوکہ پایا جاتا ہے کیونکہ طالب بیمہ معاہدہ کرتے وقت یہ نہیں جانتا کہ آیا بیمہ کی جس رقم کے بدلے اس نے اقساط ادا کی ہیں وہ اسے حاصل کرسکے گا یا نہیں، کیونکہ اس کا حصول تو اس حادثہ پر موقوف ہے جس کا واقع ہونا یقینی نہیں ہے۔

☆ معاوضہ کی مقدار کا دھوکہ بھی وجود اور حصول کی طرح معاوضہ کو باطل کردیتا ہے، جیسا کہ مٹھی بند روپوں کے عوض کوئی چیز خریدنا شرعاً باطل ہے اس طرح نقصانات کے بیمہ میں طالب بیمہ کو معاہدہ کرتے وقت اس معاوضہ کی مقدار کا علم نہیں ہوتا جو بیمہ کمپنی حادثہ پیش آنے کی صورت میں ادا کرے گی اور اس طرح بیمہ کمپنی بھی معاہدہ طے ہوتے وقت اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ وہ طالب بیمہ سے جو کچھ حاصل کرے گی اس کی مقدار کیا ہوگی، کیونکہ بعض اوقات ایک ہی قسط وصول کرنے کے بعد حادثہ پیش آجاتا ہے جبکہ بعض اوقات تمام اقساط وصول کرنے کے باوجود حادثہ پیش نہیں آتا۔

☆ معاوضے والے معاملات میں اگر مدت معلوم نہ ہو تو بھی معاملہ باطل ہوجاتا ہے، جیسا کہ حمل کی خرید وفروخت، اس لئے منع

ہے کہ اس کی معیاد غیر متعین ہوتی ہے۔ اسی طرح تا حیات بیمہ پالیسی میں بیمہ کمپنی، بیمہ کی رقم طالب بیمہ کے مرنے کی صورت میں ادا کرنے کا عہد کرتی ہے، جبکہ یہ معیاد، یعنی اس کے مرنے کا وقت نا معلوم اور غیر متعین ہے۔

بیمہ کا معاملہ ''جوے'' پر مشتمل ہے۔

بیمہ کا کاروبار اس لئے بھی حرام اور نا جائز ہے کہ اس میں جوا پایا جاتا ہے جو قرآن کریم کی نظر میں ایک شیطانی عمل ہے حصول زر کی ہر وہ شکل جوا ہے جس میں اسے حاصل کرنے کا دارومدار محض اتفاق و بخت پر ہو اور دوسرے یکساں حق رکھنے والوں کے مقابلہ میں ایک شخص کسی لاٹری، قرعہ اندازی یا محض کسی اور اتفاق کے نتیجہ میں رقم کو حاصل کرلے۔ یہ تمام جوے کی اقسام ہیں جوے کی تعریف کاروبار بیمہ پر اس طرح صادق آتی ہے کہ جوے میں فریقین اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ وہ دوسرے کو ایک مقررہ رقم کوئی حادثہ پیش آنے پر ادا کرے گا، کاروبار بیمہ میں بھی یہی ہوتا ہے کہ بعض اوقات طالب بیمہ ایک قسط ادا کرنے کے بعد مر جاتا ہے، تو اس کے نامزد کردہ وارث کو ادا کردہ رقم سے کئی گنا زیادہ رقم مل جاتی ہے اس کا اس طرح مرنا ہی ایک اتفاقی حادثہ ہے جو نامزد وارث کے لئے کثیر رقم ملنے کا باعث بنا ہے تھوڑی سی محنت کرکے اتفاقی طور پر بہت زیادہ رقم ہتھیا لینا ''میسر'' کہلاتا ہے۔ جس سے قرآن کریم نے منع فرمایا ہے۔ اس طرح طالب بیمہ اگر معینہ مدت سے پہلے اپنے عقد کو فسخ کرنا چاہے اور بقیہ اقساط کی ادائیگی روک لے تو اس صورت میں کمپنی جمع شدہ رقم کی مالک بن جاتی ہے۔ یہ بھی ''قمار'' کی ایک قسم ہے جس کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔

اس کاروبار میں سود کی دونوں قسمیں پائی جاتی ہیں۔

طالب بیمہ جو رقم اقساط کی صورت میں کمپنی کو ادا کرتا ہے اگر حادثہ کے وقت اس کے مساوی رقم واپس ملے تو ایک طرف سے نقد ادائیگی اور دوسری طرف سے ادھار ہونے کی بنا پر یہ ادھار کا سود ہے جسے شریعت کی اصطلاح میں ''ربا النسیئة'' کہتے ہیں اور اگر وہ ادا کردہ رقم سے زیادہ ہے تو یہ اضافے کا سود ہے جسے ''ربا الفضل'' کہا جاتا ہے کیونکہ یہ زائد رقم اس کی ادا کردہ رقم کے عوض ملتی ہے سود یہی ہوتا ہے کہ ایک آدمی کچھ رقم کسی دوسرے کو دیتا ہے، پھر ایک خاص مدت کے بعد اس رقم کے عوض وصول کرتا ہے۔ جبکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تم توبہ کرلو تو صرف اپنی رقم کے حقدار ہو۔'' [۲/البقرہ:۲۷۹]

نیز معینہ مدت تک زندہ رہنے اور تمام اقساط ادا کرنے کی صورت میں طالب بیمہ مجموعی رقم سے زائد زر بیمہ لینے کا مستحق ہوتا ہے یہ اضافہ کے ساتھ خطیر رقم یکمشت یا بالاقساط لے سکتا ہے۔ یہ سود کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

کاروبار بیمہ ضابطہ وراثت سے متصادم ہے۔

یہ کاروبار اس لئے بھی نا جائز ہے کہ اس پر عمل کرنے سے ضابطہ وراثت مجروح ہوتا ہے کیونکہ مرنے کی صورت میں زر بیمہ کا مالک وہ نامزد شخص بن جاتا ہے جو طالب بیمہ نے اپنی زندگی میں مقرر کیا ہوتا ہے۔ باقی ورثاء اس سے محروم ہوتے ہیں، حالانکہ اس کے ترکہ میں تمام شرعی ورثاء شریک ہوتے ہیں۔ دور جدید میں فلمی اداکارہ کے حسن و جمال اور ایک مغنیہ اور گلوکارہ کی آواز کا بیمہ بھی ہوتا ہے، اس بیمہ نے ایسے نام نہاد مفادات کو جنم دیا ہے جنہیں شریعت سرے سے کوئی مفاد ہی تسلیم نہیں کرتی، اس طرح اس کاروبار میں ''التَّعَاوُنُ عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ'' بھی پایا جاتا ہے، لہٰذا اس کے حرام ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ سوال میں اس پہلو

کو بھی اٹھایا گیا ہے کہ کاروبار بیمہ میں جو رقم جمع ہوتی ہے، اسے کاروبار میں لگایا جاتا ہے، پھر اس کے منافع یا نقصانات کو سرمایہ لگانے والوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، یعنی یہ مضاربت کی ایک قسم ہے اس کاروبار کو مضاربت قرار دینا درج ذیل وجوہات کی بنا پر محل نظر ہے:

☆ مضاربت کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ اس میں منافع کی شرح نسبت کی بنیاد پر ہو، مثلاً: ایک آدمی محنت کرتا ہے اور دوسرا رقم دیتا ہے تو اخراجات کے بعد جو منافع ہوگا وہ ایک خاص شرح کے مطابق تقسیم ہوگا۔ مثلاً: 50% محنت کرنے والا اور 50% رقم خرچ کرنے والا اور کوئی شرح مقرر کر لی جاتی ہے لیکن صرف رقم پر معین منافع عقد مضاربت کے لئے مفسد قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ بیمہ زندگی میں ہوتا ہے، مثلاً: جمع شدہ رقم پر 10% نفع دیا جائے گا، اس لئے دونوں کو ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ بادیٔ النظر دونوں میں مشابہت پائی جاتی ہے۔

☆ اگر مضاربت میں نقصان ہو تو اس نقصان کو صرف سرمایہ لگانے والا برداشت کرتا ہے، مضاربت کی محنت تو ضائع ہوتی ہے، اس کے علاوہ مالی نقصان میں وہ شریک نہیں ہوتا جبکہ بیمہ کے کاروبار میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی، اس کاروبار میں سرمایہ کار کو ہر صورت منافع ہی ملتا ہے، نقصان کی صورت میں کمپنی ذمہ دار ہوتی ہے۔

☆ مضاربت میں اگر سرمایہ کار فوت ہو جائے تو ورثاء کو صرف اتنا ہی سرمایہ ملتا ہے جتنا اس نے بوقت عقد جمع کرایا تھا جبکہ بیمہ میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ بعض صورتوں میں وہ موت کے بعد بڑی رقم کا مالک بن جاتا ہے۔

☆ مضاربت میں سرمایہ کار کو علم ہوتا ہے کہ میری رقم کس قسم کے کاروبار میں صرف ہو رہی ہے جبکہ بیمہ میں سرمایہ کار کو اس قسم کے معاملات سے بالکل لاتعلق رکھا جاتا ہے۔

☆ مضاربت میں اگر سرمایہ کار مر جائے تو اس کی رقم ورثاء کو ملتی ہے جبکہ بیمہ کے کاروبار میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ موت کی صورت میں اس کا حقدار اس کا نامزد کردہ ہوتا ہے، شرعی ورثاء اس کے حقدار نہیں ہوتے۔ اس میں قانون وراثت کی صریح خلاف ورزی ہے۔

ہماری بیان کردہ وجوہات کی بنا پر بیمہ کا کاروبار مضاربت سے مشابہت نہیں رکھتا۔

بیمہ کی جائز صورتیں:

بیمہ عملی طور پر جن صورتوں پر مشتمل ہے، اس کی تین اقسام ہیں:

(۱) اجتماعی بیمہ: اسے حکومت یا اس کا نامزد کردہ کوئی ادارہ چلاتا ہے عام طور پر محنت مزدوری کرنے والوں کو اس میں شامل کیا جاتا ہے۔ مزدوری کرتے وقت جو حوادث یا امراض لاحق ہوتے ہیں جن کی وجہ سے مزدور معذور ہو جاتے ہیں یا وہ بڑھاپے میں پہنچ کر ناکارہ ہو جاتے ہیں تو ان کا بیمہ کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے آجر، اجیر اور حکومت اپنا اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ کاروبار نہیں بلکہ ایک خدمت ہے جسے شریعت نے پسند کیا ہے اور ایسا کرنے کی ترغیب دی ہے۔

(۲) باہمی بیمہ: یہ کاروبار امداد باہمی کی انجمنیں چلاتی ہیں جو ایسے ارکان سے مل کر تشکیل پاتی ہیں جنہیں ایک ہی طرح کے خطرات کا سامنا ہوتا ہے اگر کسی کو حادثہ پیش آ جائے تو جمع شدہ رقم سے اس کی تلافی کر دی جاتی ہے۔ اس کے جائز ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

(۳) مقررہ اقساط والا بیمہ: بیمہ کی یہی صورت تھی جسے سابقہ سطور میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک بیمہ کی یہ صورت حرام اور ناجائز ہے کیونکہ اس میں دھوکہ جوا، سود جیسے عناصر شامل ہیں۔ بعض لوگ اس سلسلہ میں شیخ الاسلام مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے ایک فتویٰ کا حوالہ بھی دیتے ہیں کہ انہوں نے اسے جائز لکھا ہے۔ حالانکہ ان کے فتویٰ میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے موجودہ بیمہ کاری کا جواز کشید کیا جائے۔ تفصیل کے لئے فتاویٰ ثنائیہ، ص: ۳۷۱، ج ا کا مطالعہ مفید رہے گا۔ اس پر مولانا محمد داؤد راز رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شرف الدین محدث دہلوی کے توضیحی اشارات بھی ہیں۔[واللہ اعلم بالصواب]

سوال ہمارے پڑوس میں ایک مدرسہ ہے۔ وہاں بکثرت گوشت آتا ہے۔ اہل مدرسہ ضرورت سے زائد گوشت کو بازار سے کم قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں، جبکہ وہ گوشت صدقہ و خیرات کے طور پر مدرسہ میں لایا جاتا ہے، کیا اس طرح ضرورت سے فاضل گوشت کی خرید و فروخت جائز ہے؟

جواب مخیر حضرات جو مدرسہ کے لئے اشیائے خوردنی دیتے ہیں ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ علم دین حاصل کرنے والے طلباء اسے استعمال کریں اور خود کھائیں، ان کی نیت اور نیک مقصد کے پیش نظر فاضل گوشت کی خرید و فروخت سے پرہیز کرنا چاہیے، اگر گوشت وغیرہ کسی مدرسہ کی ضرورت سے زائد ہے تو اہل مدرسہ کو فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی دوسرے مدرسہ کو دے دینا چاہیے یا اہل مدرسہ گوشت دینے والے کو کہہ دیں کہ ہمیں اب اس کی ضرورت نہیں، آپ اس کے متبادل اور چیز دے دیں یا آپ کسی اور مدرسہ کو دے دیں۔ گوشت کو فروخت کرنے سے عامۃ الناس میں علما کے متعلق یہ بدگمانی بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ یہ لوگ حقداروں کو کھلانے کے بجائے اشیائے خوردنی آگے بیچ دیتے ہیں، پھر ایسی باتوں کو بنیاد بنا کر ان کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات کو ابھارا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ ضرورت سے زائد گوشت فروخت کرنے سے دینے والے کی نیت پوری نہیں ہوتی، ان اسباب کے پیش نظر اس کی خرید و فروخت سے اجتناب کرنا بہتر ہے بلکہ کسی دوسرے مدرسہ کو دے دینا بہتر ہے، البتہ اس بات کی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ حقدار کے پاس پہنچ جانے کے بعد صدقہ و خیرات کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے پاس آنے والا صدقے کا گوشت تناول کر لیتے تھے۔ اس کے متعلق آپ فرماتے تھے کہ ''یہ گوشت بریرہ کے لئے صدقہ ہے اور ہمارے لئے ہدیہ ہے۔'' [صحیح بخاری، الزکوٰۃ: ۱۴۹۳]

اس پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بایں الفاظ میں عنوان قائم کیا ہے: ''جب صدقے کی حیثیت بدل جائے، تو وہ صدقہ نہیں رہتا۔'' اس لئے عشر وغیرہ کی گندم جو مدرسے کی ضرورت سے زائد ہو، اسے آگے فروخت کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے کیونکہ مدرسہ میں پہنچنے کے بعد اس کی صدقہ وغیرہ کی حیثیت ختم ہو چکی ہے، تاہم گوشت اور سبزی وغیرہ کو فروخت کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔[واللہ اعلم]

سوال ایک مسلمان کو دوسرے تجارت پیشہ مسلمانوں کی موجودگی میں کسی کافر کے ساتھ مل کر کاروبار کرنے کی شرعاً کس حد تک اجازت ہے۔ کیا اس سلسلہ میں اسلاف کا کوئی عمل پیش کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو نظر انداز کر کے کسی کافر کے ساتھ کاروبار میں شراکت کی ہو؟

جواب کاروبار کی بنیاد امانت داری، صداقت، نرمی، خیر خواہی اور بردباری ہے، ان صفات کے ساتھ دین اسلام کی نعمت

سونے پر سہاگہ ہے۔ ایک تجارت پیشہ مسلمان کو چاہیے کہ وہ ترجیحی بنیادوں پر کاروبار میں شرکت کے لئے کسی ایسے شخص کا انتخاب کرے جو دین اسلام کے ساتھ ساتھ مذکورہ بالا صفات کا بھی حامل ہو، لیکن اگر کوئی نام نہاد مسلمان فریبی، دغاباز، خیانت پیشہ، سخت گیراور دوسروں کا بدخواہ ہے اوراس کے مقابلہ میں ایک کافر دیانتداری اور صداقت وخیر خواہی کو اپنائے ہوئے ہے تو اس کا کافر ہونا دوسروں کے لئے شراکت میں رکاوٹ کا باعث نہیں ہونا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے خود مشرکین کے حق ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے خرید وفروخت کی ہے، چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے، اچانک پراگندہ بال اور لمبے قد والا ایک مشرک کچھ بکریاں ہانک کر لایا تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے دریافت فرمایا کہ یہ بکریاں برائے فروخت ہیں یا بطور عطیہ دینے کے لیے ہیں؟ اس نے کہا کہ یہ بکریاں بیچنے کے لیے ہیں۔ آپ نے اس سے ایک بکری خرید فرمائی۔ [صحیح بخاری، البیوع: ۲۲۱۶]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ ایک عنوان قائم کیا ہے: ''مشرکین اوراہل حرب سے خرید وفروخت کرنا۔'' اس عنوان اور پیش کردہ حدیث کا مقصد یہ ہے کہ کفار ومشرکین سے معاشرتی طور پر ان کے حقوق تسلیم کرتے ہوئے معاملات طے کیے جاسکتے ہیں۔ اگر ان سے جنگ کی نوبت آجائے تو ان کے لئے اسلام کا ایک الگ ضابطہ ہے بصورت دیگر ان کا خون اور مال ہمارے لئے اہل اسلام کے خون اور مال کی طرح قابل احترام ہے۔ ان کے کفروشرک کی وجہ سے وہ قابل گردن زدنی نہیں ہیں۔ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ کفار سے معاملہ داری کرنا جائز ہے مگر ایسا معاملہ درست نہیں جس سے وہ اہل اسلام کے خلاف جنگ کرنے میں مدد حاصل کریں، نیز کافر کی خرید وفروخت صحیح اور اسلامی قانون کی رو سے انہیں اموال کا مالک تسلیم کیا جائے گا۔ [فتح الباری، ص: ۵۱۸، ج ۴]

جہاں تک اسلاف کے عمل کا تعلق ہے تو رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کی موجودگی میں خیبر کی زمین یہود کو بٹائی پر دی۔
[صحیح بخاری، الاجارۃ: ۲۲۸۵]

چونکہ مسلمان دیانت دار تو تھے لیکن کھیتی باڑی سے نا آشنا تھے، اس لئے یہود سے بٹائی کا معاملہ طے کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہجرت کے موقع پر ایک کافر کے ساتھ راستہ کی راہنمائی کے لئے اجرت پر معاملہ طے کیا تھا۔
[صحیح بخاری، الاجارۃ: ۲۲۶۳]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر بایں طور عنوان قائم کیا ہے: ''مشرکین کو بوقت ضرورت اجرت پر رکھا جاسکتا ہے یا جب کوئی مسلمان مزدور نہ ملے۔'' حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کاروباری طور پر مجھے اُس دور سے بھی واسطہ پڑا ہے کہ مجھے معاملہ کرنے میں کسی چیز کی پرواہ نہ ہوتی، کیونکہ امانت ودیانت کا یہ عالم تھا کہ اگر فریق ثانی مسلمان ہوتا تو اسے اسلام کا قانون حقوق کی ادائیگی پر مجبور کرتا اور اگر وہ عیسائی ہوتا تو قانون اور اپنے افسران بالا کے احترام کے پیش نظر وہ میرے ساتھ صحیح معاملہ کرتا اور جبکہ آج حال یہ ہے کہ امانت ودیانت کا خون ہوچکا ہے اور میں صرف فلاں فلاں سے خرید وفروخت کا معاملہ کرتا ہوں۔
[صحیح بخاری، الرقاق: ۶۴۹۷]

اس مقام پر یہ وضاحت کرنا بھی ضروری ہے کہ اگر شراکت دار دشمنِ اسلام ہے اور وہ تجارت سے حاصل ہونے والے منافع کو اسلام کے خلاف استعمال کرتا ہو، جیسا کہ قادیانی حضرات کرتے ہیں تو ایسے حالات میں کسی مسلمان کا ہی انتخاب کرنا چاہیے۔ خواہ وہ غیر معیاری ہی کیوں نہ ہو۔ اس سلسلہ میں سورۃ الممتحنہ ایک فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے، اس میں کافر، دشمن اور کافر غیر دشمن کے کردار کو بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ کافر غیر دشمن کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے ''اللہ تعالیٰ تمہیں ان سے منع نہیں کرتا جو نہ تم سے دین کے معاملات میں لڑے اور نہ تمہیں گھروں سے نکالے اس بات سے کہ تم ان سے بھلائی کرو اور ان سے انصاف کرو۔''

[۶۵/الممتحنہ:۸]

کافر دشمن کے متعلق فرمایا: ''اللہ تمہیں ان سے منع کرتا ہے، جنہوں نے دین کے بارے میں تم سے لڑائی کی اور تمہیں گھروں سے نکالا اور تمہارے اخراج پر ایک دوسرے کی مدد کی۔ اس بات سے کہ تم انہیں دوست بناؤ۔'' [۶۵/الممتحنہ:۹]

گویا قطع موالات اور معاملات کا اصل سبب ان کی اسلام دشمنی ہو سکتی ہے نہ کہ کفر و شرک، اس بنا پر ہمارا رجحان یہ ہے کہ ایک بندہ مسلم کو کاروبار میں شراکت کے لئے اپنے جیسے مسلمان کا ہی انتخاب کرنا چاہیے۔ اگر مسلمان نہ مل سکیں یا مل سکیں لیکن انتہائی بددیانت اور غیر معیاری تو ایسے حالات میں کافر کے ساتھ کاروبار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر وہ کافر خلاف اسلام سازشوں میں ملوث ہے یا اپنے منافع کو اسلام یا اہل اسلام کے خلاف استعمال کرتا ہے تو ایسے حالات میں مسلمانوں کو ترجیح دینا چاہیے، خواہ وہ غیر معیاری ہی کیوں نہ ہو۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے ہاں ایک پروفیسر نے نظام اشتراکیت کی تائید میں سورۂ بقرہ کی آیت کا حوالہ دیا کہ ضروریات سے زائد تمام مال حکومت کی ملکیت ہے اس سلسلہ میں انہوں نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے موقف کا بھی حوالہ دیا۔ اس کے متعلق قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟

جواب نظام اشتراکیت کے سلسلہ میں جس آیت کا حوالہ دیا ہے وہ حسب ذیل ہے:

''لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں خرچ کریں، ان سے کہہ دیں کہ جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہو، وہ سب اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔'' [۲/البقرہ:۲۱۹]

لیکن یہ آیت کریمہ نفلی صدقات کی آخری حد ہے اور صدقہ کی کم از کم حد فرضی صدقہ زکوٰۃ ہے جو کفر اور اسلام کی سرحد پر واقع ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان صدقہ کی کم از کم حد کی ادائیگی نہ کرے تو وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایسے ہی لوگوں کے خلاف جہاد کیا تھا۔ ان دونوں حدوں کے درمیان ایک وسیع میدان ہے اور اہل خیر جتنی چاہیں نیکیاں کما سکتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ ہمارے ہاں اشتراکی ذہن رکھنے والے حضرات نے قرآنی آیات میں ''العفو'' کے مفہوم کو بہت غلط معنوں میں استعمال کیا ہے، اشتراکی نظریہ کے مطابق ہر چیز کی مالک حکومت ہوتی ہے اور اس قسم کی حکومت میں انفرادی ملکیت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی کی ذاتی ملکیت ہی نہ ہو تو وہ پس انداز کیا کرے گا اور خرچ کیا کرے گا اور انفاق کے متعلق کیا پوچھے گا؟ گویا جس آیت سے اشتراکی نظریہ کشید کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہی آیت اس نظریہ کی تردید

پر بڑی واضح دلیل ہے کیونکہ آیت سے واضح ہوتا ہے کہ سوال کرنے والے خود اپنے اموال کے مالک تھے اور اپنی مرضی سے ہی ان اموال میں تصرف کرنے کا حق رکھتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جہاد کے موقع پر یہ سوال کیا تھا جبکہ اس کے لئے مصارف کی شدید ضرورت تھی، ایسے حالات میں مسلمانوں کی تربیت کی گئی کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ سے اگر سارا مال دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں، لیکن اس کے برعکس اگر کوئی سارا مال نہیں دے سکتا تو اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی جبکہ اشتراکیت بالکل اس کے برعکس ہے جو حالات جنگ کے بغیر عام حالات میں بھی لوگوں کو حق ملکیت سے محروم کر دیتا ہے، لہٰذا اس آیت کریمہ میں نظریہ اشتراکیت کشید کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سورۂ توبہ کی ایک آیت کے پیش نظر یہ موقف رکھتے تھے کہ ضروریات سے فالتو سرمایہ رکھنا شرعاً درست نہیں ہے بلکہ وہ کنز کے حکم میں ہے جس کے متعلق قرآن میں سخت وعید آئی ہے۔ دراصل حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سنتے جس میں سخت حکم ہوتا تھا تو اسے اپنی قوم کو پہنچا دیتے۔ اس کے متعلق کچھ نرمی آ جاتی لیکن حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ پہلے حکم پر ہی عمل پیرا رہتے، جیسا کہ مال جمع کرنے کے متعلق ان کا موقف ہے۔ اس سلسلہ میں جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس موقف سے اتفاق نہیں کیا۔ [فتح الباری، ص: ۳۴۵، ج ۳]

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک اعرابی نے سوال کیا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں المناک عذاب کی خبر دیں۔'' [۹/توبہ: ۳۴]

اس قرآنی آیت کا کیا مطلب ہے؟ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جواب دیا کہ جس نے مال جمع کیا اور اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی اس کے لئے ہلاکت ہے۔ آیت میں مذکورہ وعید زکوٰۃ کے نازل ہونے سے پہلے تھی، جب زکوٰۃ کا حکم نازل ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اسے اموال کی پاکیزگی کا ذریعہ بنا دیا۔ [صحیح بخاری: ۱۴۰۴]

بہرحال قرآنی آیت اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے موقف سے اشتراکی نظریہ کی قطعاً تائید نہیں ہوتی ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک شخص بنک سے ایک خاص شرح سود پر قرض لے کر کاروبار کرتا ہے، پھر وہ اس قسم کی کمائی سے مدارس سے تعاون کرتا ہے کیا ایسے شخص کا تعاون لینا اور اس کے گھر سے کھانا پینا جائز ہے؟

جواب بنک سے سود پر قرض لے کر کاروبار کرنا ایک سودی کاروبار ہے۔ سودی قرضے دو طرح ہوتے ہیں:

① ذاتی قرضے، یعنی وہ قرضے جو کوئی شخص اپنی ذاتی ضرورت کے لئے کسی مہاجن یا بنک سے لیتا ہے۔

② تجارتی قرضے، یعنی وہ قرضے جو تاجر یا صنعت کار اپنی کاروباری اغراض کے لئے سود پر لیتا ہے۔

شریعت میں دونوں قسم کے قرضوں کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ ان پر سود دیا جاتا ہے قرآن کریم نے ذاتی قرض کے سلسلہ میں فرمایا ہے کہ ''اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کی پرورش کرتا ہے''۔ [۲/البقرہ: ۲۷۶]

گویا اللہ تعالیٰ نے سود کے خاتمہ کے لئے ذاتی قرضوں کا حل ''صدقات'' تجویز فرمایا ہے اور تجارتی قرض کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔'' گویا اللہ تعالیٰ نے تجارتی قرضوں سے نجات کے لئے شراکت اور مضاربت کی راہ دکھائی ہے۔ جو حلال اور جائز ہے۔ یہ وضاحت، اس لئے ضروری تھی کہ آج بہت سے مسلمان

سودخور یہودیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس سود کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے وہ ذاتی قرضے ہیں۔ جن کی شرح سود بہت ظالمانہ ہوتی تھی اور جو تجارتی سود ہے وہ حرام نہیں کیونکہ اس وقت تجارتی قرض لینے دینے کا رواج نہیں تھا حالانکہ نزول قرآن کے وقت تجارتی سود موجود تھا اور سود کی حرمت سے قبل حضرت عباس رضی اللہ عنہ تجارتی سود کا کاروبار کرتے تھے۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں لفظ ''ربوا'' مطلق ہے جو ذاتی اور تجارتی دونوں اقسام پر مشتمل ہے۔ اس لئے تجارتی سود کو حرمت سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ اس قسم کی حرام کمائی سے اللہ کی راہ میں مدارس وغیرہ کا تعاون کرنا بھی حرام ہے۔ کیونکہ فرمان نبوی ہے: ''اللہ تعالیٰ صرف پاکیزہ کمائی سے ہی صدقہ قبول کرتا ہے۔'' [صحیح بخاری، الزکوۃ: ۱۴۱۰]

ایک دوسری روایت میں اس کی وضاحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے لوگو! اللہ پاک ہے اور وہ صرف پاک مال قبول کرتا ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو بھی اسی بات کا حکم دیا ہے جس کا اس نے اپنے رسولوں کو حکم دیا، چنانچہ فرمایا: ''اے پیغمبر! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔'' اور فرمایا: ''اے ایمان والو! وہ پاکیزہ چیزیں کھاؤ جو ہم نے تمہیں دی ہیں۔'' [ترمذی، التفسیر: ۲۹۸۹]

سودی کاروبار کرنے والے حضرات یہ خیال کرتے ہیں کہ اس حرام کمائی سے تھوڑا بہت اللہ کی راہ میں دینا، اس سے وہ گناہ معاف ہو جاتا ہے جس کا وہ سودی کاروبار کی شکل میں ارتکاب کرتے ہیں۔ اہل مدارس کو اللہ پر توکل کرتے ہوئے ان حضرات کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے اور ان سے صدقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ اس غیرت وحمیت کے بدلے بہت سے ایسے راستے کھول دے گا جن کا اہل مدارس کو وہم وگمان بھی نہیں ہوگا۔ تحدیث نعمت کے طور پر عرض کیا ہے کہ راقم الحروف نے اپنے ادارہ کے لئے ایسے کاروباری حضرات کا بائیکاٹ کیا ہے جو سود لیتے دیتے ہیں۔ اللہ کا دین ایسی گندگی اور نحوست کا قطعاً محتاج نہیں ہے۔ اس بائیکاٹ کی برکت سے ہمیں ادارے کے سلسلہ میں کبھی مالی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ صورت مسئولہ میں بنک سے سودی شرح پر قرضہ لے کر کاروبار کرنے والے کا مالی تعاون قبول نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی ان کی دعوت کو قبول کرنا چاہیے۔ حدیث میں ہے: ''جو چیز تجھے شک میں ڈالے اسے چھوڑ کر اس چیز کو اختیار کیا جائے جو شک میں نہیں ڈالتی۔'' [مسند امام احمد، ص: ۱۵۳، ج ۳]

البتہ اسے وعظ وتبلیغ کے ذریعے اس کاروبار کی سنگینی سے ضرور آگاہ کرتے رہنا چاہیے۔

سوال شریعت میں شرح منافع کا کوئی تعین ہے تو اس کی نشاندہی کریں ہمارا میڈیکل سٹور ہے بعض ادویات پر قیمت فروخت 28 روپے لکھی ہوتی ہے جبکہ ہمیں کمپنی کی طرف سے تقریباً 13 روپے میں ملتی ہے اس طرح ہمیں 15 روپے نفع ہوتا ہے اتنا منافع لینے کی شرعاً اجازت ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب شریعت میں شرح منافع کا کوئی تعین نہیں ہے جائز تجارت میں جس قدر چاہے نفع کما لیا جائے۔ اس پر کوئی پابندی نہیں ہے یہ غلط طور پر مشہور ہے کہ شرح منافع آٹے میں نمک کے برابر ہونا چاہیے۔ البتہ کسی کی مجبوری سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے اور نہ ہی خرید وفروخت کرتے وقت جھوٹ بولا جائے بلکہ ایک دوسرے کے لئے ہمدردی اور ایثار کے جذبات ہونے چاہییں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قیمت خرید پر 100 فیصد منافع کمایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اس شرح کو برقرار رکھا بلکہ ان کے لئے خیر وبرکت کی دعا فرمائی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عروہ بارقی رضی اللہ عنہ کو ایک دینار دیا

تا کہ وہ آپ کے لئے ایک بکری خرید لائے اس نے منڈی سے ایک دینار کی دو بکریاں خریدیں، پھر ان میں سے ایک کو ایک دینار کے عوض فروخت کر دیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس نفع کا ایک دینار اور خرید کردہ بکری پیش کر دی، رسول اللہ ﷺ نے اس کے لئے خیر و برکت کی دعا فرمائی۔ اس دعا کا یہ اثر تھا کہ اگر وہ مٹی بھی خرید لیتے تو اس سے بھی نفع کماتے۔ [صحیح بخاری، المناقب: ۳۶۴۲]

اسی طرح حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے ایک دینار دیا تا کہ وہ اس سے قربانی کا جانور خرید لائے۔ انہوں نے ایک بکری ایک دینار کے عوض خریدی، راستہ میں اسے گاہک ملا، اسے دو دینار کے عوض فروخت کر دیا، پھر دوبارہ منڈی گئے وہاں سے ایک دینار کے عوض ایک اور بکری خریدی، حاصل کردہ نفع اور خرید کردہ بکری رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش فرمائی تو آپ نے حاصل کردہ نفع، یعنی ایک دینار بھی صدقہ کر دینے کا حکم دیا۔ [ابوداود، البیوع: ۳۳۸۶]

ان روایات سے معلوم ہوا کہ شرح منافع کا شریعت نے کوئی تعین نہیں کیا ہے۔ فریقین باہمی رضامندی سے خرید وفروخت کرنے میں آزاد ہیں۔ بس ایسے امور سے اجتناب کیا جائے جن سے شریعت نے منع کیا ہے، نیز دوسرے شخص کی مجبوری سے بھی ناجائز فائدہ نہ اٹھایئے، ان شرائط کو پورا کرتے ہوئے قیمت خرید پر حسب منشا نفع لینے پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال دو بھائیوں کا مشترکہ کاروبار ہے۔ ایک بھائی فیکٹری میں تیار ہونے والے مال کو فروخت کرتا ہے اور رقم وغیرہ بھی اس کے پاس ہوتی ہے وہ مشترکہ رقم سے اپنے ذاتی اخراجات بلاحساب پورے کرتا ہے، جبکہ دوسرا بھائی فیکٹری کو سنبھالے ہوئے ہے اس کے پاس رقم نہیں ہوتی، اپنے اخرجات اپنی جیب سے پورے کرتا ہے پھر اخراجات کے بل پیش کر کے بھائی سے رقم وصول کرتا ہے اس بنا پر دوسرا بھائی سخت ذہنی اذیت میں مبتلا رہتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ شرعی طور پر میں اپنے بھائی کے اس فعل کو معاف نہیں کروں گا۔ کیا پہلا بھائی شرعی طور پر حساب دینے کا پابند نہیں ہے؟

جواب مشترکہ کاروبار سے مشترکہ طور پر بلاحد وحساب ذاتی اخراجات پورے کرنا ایسی صورت میں سودمند ہوتا ہے، جبکہ فریقین ایثار و محبت اور رواداری اور ہمدردی کو عمل میں لائیں اگر اس کے برعکس کسی کے دل میں گھٹن اور تنگی ہے جس کی وجہ سے وہ ذہنی پریشانی میں مبتلا رہتا ہے تو اس صورت میں ذاتی اخراجات کی حد بندی ہونی چاہیے۔ بصورت دیگر کاروبار کے ٹھپ ہو جانے کا اندیشہ ہے، اس لئے ہمارا مشورہ ہے کہ آمدن اور اخراجات کا باقاعدہ حساب ہو اور ذاتی اخراجات کی بھی حد بندی ہونی چاہیے تا کہ کسی قسم کا الجھاؤ پیدا نہ ہو چونکہ یہ مسئلہ حقوق العباد سے تعلق رکھتا ہے اس بنا پر ہم یہ وضاحت کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ حدیث کے مطابق اگر کسی نے دوسرے پر ظلم وزیادتی کی ہوگی وہ قیامت کے دن کئی قسم کے اندھیروں کا پیش خیمہ ہوگی، نیز رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ "اگر کسی نے زیادتی کا ارتکاب کیا تو اسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہونے سے پہلے پہلے معافی یا تلافی کے ذریعے اس سے نجات حاصل کرے۔ بصورت دیگر قیامت کے دن زیادتی کا حساب چکانے کے لئے درہم و دینار نہیں ہوں گے صرف نیکیاں اور برائیاں ہی زرمبادلہ کے طور پر وہاں کام آئیں گی۔" یعنی حق دار کو اپنی نیکیاں دے کر اپنی خلاصی کرانا ہوگی اگر نیکیاں نہ ہوئیں تو برائیاں حق دبانے والے کے نامہ اعمال میں رکھ دی جائیں گی۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے انسان کو مفلس قرار دیا ہے جس کی نیکیاں قیامت کے دن دوسروں کے کام آئیں اور ان کی برائیاں اس کے کھاتے میں ڈال دی جائیں

اور بالآخر جہنم میں جانا پڑے، اس لئے مشتر کہ کاروبار کرنے والوں کو مندرجہ بالا وضاحت کو ذہن میں رکھنا چاہیے وگرنہ اندیشہ ہے کہ قیامت کے دن ناانصافیوں کی وجہ سے ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ [واللہ اعلم]

سوال بکر نے زید کی دکان سے مبلغ دولاکھ روپیہ کی مختلف اجناس خریدیں اور ادائیگی نہ کی، زید پانچ برس تک اپنی رقم کا مطالبہ کرتا رہا۔ بالآخر تنگ آ کر زید نے بکر کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا عدالت نے یہ فیصلہ کیا کہ بکر دولاکھ روپے ادا کرنے تک 14 فیصد تک بنک منافع کے مطابق مزید ادا کرے، یعنی اصل رقم کے علاوہ مذکورہ شرح کے مطابق ''منافع'' بھی ادا کرے گا، اب کیا مدعی اپنی اصل رقم کے ساتھ عدالت کی جاری کردہ ڈگری کے مطابق مدعا علیہ سے زیادہ رقم وصول کرسکتا ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں راہنمائی فرمائیں۔

جواب واضح رہے کہ صاحب حیثیت کا دوسروں کے واجبات کی ادائیگی میں دانستہ ٹال مٹول کرنا صریح ظلم ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مالدار کا واجبات کی ادائیگی میں دانستہ دیر کرنا صریح زیادتی ہے۔'' [بخاری، کتاب الحوالات: ۲۲۸۷]

حدیث میں یہ بھی ہے کہ ایسے انسان کو بے عزت کر کے سزا کے طور پر قید بھی کیا جاسکتا ہے۔ [صحیح بخاری، کتاب الاستقراض تعلیقا باب: ۱۳]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا: ''صاحب حق اپنا حق وصول کرنے کے لیے سختی سے کام لے سکتا ہے۔''

[صحیح بخاری، ۲۴۰۱]

صورت مسئولہ میں ایک شخص عرصہ دراز سے رقم کی ادائیگی میں ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے، صاحب حق نے اپنا حق وصول کرنے کے لئے عدالت سے رجوع کیا اس پر جو اخراجات اٹھے ہیں اس کا باعث بھی وہی ہے۔ جس کے ذمہ واجبات کی ادائیگی ہے، اس لئے عدالت کے فیصلہ کے مطابق زید اپنی اصل رقم سے زائد وصول کرسکتا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں حق کی وصولی کے لئے جو رقم خرچ ہوئی ہے وہی وصول کرنے کا مجاز ہے۔ اس سے زائد رقم وصول کرنے کا حق دار نہیں ہے۔ دراصل یہ ایک تاوان ہے جو دیر کرنے کی وجہ سے اس پر ڈالا گیا ہے اور صاحب حق کی ایک دادرسی کی صورت ہے جس کی خاطر وہ ذہنی طور پر پریشان رہا، نیز یہ رقم ''سود'' کے زمرہ میں نہیں آتی اگرچہ ظاہری طور پر ایسا نظر آتا ہے لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال مختلف کمپنیوں کے موبائل کارڈ مارکیٹ میں مختلف قیمتوں پر دستیاب ہوتے ہیں بعض کمپنیاں ٹیکس وصول کرتی ہیں، پھر دکاندار اصل قیمت سے زیادہ پر آگے فروخت کرتے ہیں کمپنی کا ٹیکس وصول کرنا اور دکاندار کا اصل قیمت سے زائد فروخت کرنا کہاں تک درست ہے کیا اس میں سود کا اندیشہ تو نہیں ہے؟

جواب موبائل یا دوسرے کالنگ کارڈ کا معاملہ یوں ہے کہ وہ حکومت سے یونٹ خریدتے ہیں، پھر انہیں صارفین کو فروخت کرتے ہیں۔ گورنمنٹ کمپنی سے فروخت کرنے پر تقریباً 9% ٹیکس وصول کرتی ہے اسے سیل ٹیکس کہا جاتا ہے۔ جو ہر فروخت ہونے والی چیز پر لگایا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک حکومت کا یہ اقدام شرعاً درست نہیں ہے۔ بہر حال کمپنی یا صارفین مجبور ہیں جو اس ٹیکس کو ادا کرتے ہیں۔ کمپنی اس ٹیکس کو صارفین کے کھاتے میں ڈال دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ 100 کے کارڈ میں 90.90 روپے ہوتے ہیں چونکہ یہ نقدی کی خرید وفروخت نہیں ہے کہ اس میں کمی بیشی ناجائز ہو بلکہ یونٹ فروخت اور خریدے جاتے ہیں، لہٰذا اس میں کمی بیشی

کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، پھر نفع کے لئے شریعت نے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے اسے فروخت کنندہ اور خریدار کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ باہمی رضامندی سے معاملہ طے کریں۔ بہرحال صورت مسئولہ میں سود وغیرہ کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال نئے نوٹ اضافی قیمت پر فروخت کرنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟

جواب نئے پرانے نوٹوں کی مالیت میں کوئی فرق نہیں ہوتا، ایک ہی جنس کا تبادلہ برابر برابر تو ہو سکتا ہے بشرطیکہ نقد بہ نقد ہو، ان میں کمی بیشی کرنا سود ہے، جیسا کہ حدیث میں اس کی صراحت ہے۔ [صحیح بخاری، البیوع، ۲۰۶۳]

البتہ کرنسی تبدیل ہو جائے تو کمی وبیشی سے فروحت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ صورت مسئولہ میں ایک ملک کی کرنسی کو کمی بیشی سے فروخت کیا جاتا ہے اس کے سود ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں جو بہانے پیش کئے جاتے ہیں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال اگر غیر مسلم اپنے تہوار کے موقع پر کوئی چیز بھیجیں تو ہم اسے کھا سکتے ہیں یا نہیں، حالانکہ وہ چیز مارکیٹ سے خرید کردہ ہو صرف تہوار کی وجہ سے ہم تک پہنچی ہو؟

جواب شرعی طور پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ اور ہنود و مجوس کی مخالفت کریں۔ اس مخالفت کا تقاضا ہے کہ ہم کسی بھی پہلو سے ان کے تہواروں میں شریک نہ ہوں۔ ان کے تہوار کے موقع پر ان کے تحائف قبول کرنا ان کی خوشی میں شرکت کرنا ہے جس کی شرعاً اجازت نہیں ہے، بلکہ ان کی مخالفت کرنا سنت نبوی ہے۔ کتنے ہی معاملات ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے ان کی مخالفت کی ہے۔ اگر ہم ان کے تہوار کے موقع پر بھیجی ہوئی چیزیں قبول کریں اور اسے استعمال کریں تو یہ مخالفت نہیں ہے، بلکہ ان کی حوصلہ افزائی اور ہمنوائی ہے۔ حدیث میں ہے: ''جس قوم کی مشابہت اختیار کی ہے وہ انہی سے ہے۔'' [ابوداؤد]

اس بنا پر اسلامی غیرت کا تقاضا ہے کہ ہم غیر مسلم لوگوں کے تہواروں پر ان کے تحائف قبول نہ کریں، اگرچہ وہ مارکیٹ سے خرید کر ہی کیوں نہ بھیجے گئے ہوں۔ یہود و نصاریٰ کی ہر رسم ہماری تہذیب کے لیے زہر قاتل ہے۔ اس سے اجتناب کرنا ہمارا مذہبی فریضہ ہے۔ صورت مسئولہ میں اگر کوئی غیر مسلم اپنے تہوار کے موقع پر ہمیں کوئی چیز بھیجتا ہے تو ہمیں قبول نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی اسے کسی استعمال میں لانا چاہیے۔ تہوار کے علاوہ تبادلہ تحائف میں کوئی حرج نہیں جبکہ مقصود غیر مسلم کو اسلام کے قریب لانا ہو۔

[واللہ اعلم]

وصیت و وراثت

وصیت و وراثت
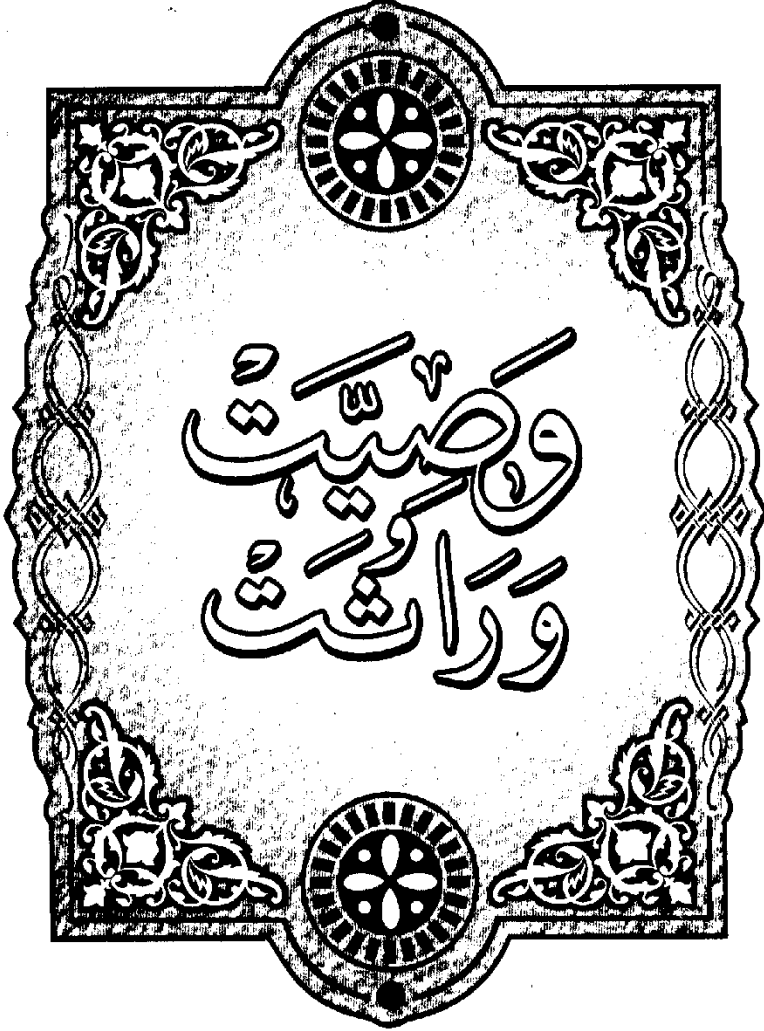
سوال میرے مندرجہ ذیل چار سوالات ہیں براہِ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں ان کا جواب دیا جائے۔

☆ میری اولاد، تین لڑکے اور تین لڑکیوں پر مشتمل ہے۔ میری زرعی جائیداد 40 ایکڑ ہیں جسے میرا ایک بیٹا کاشت کرتا ہے جس کی محنت اور کارگردگی سے ہمارا سارا کنبہ مستفید ہوتا ہے، میں نے اپنی بیوی اور اولاد کی تحریری رضامندی سے اس کاشت کار بیٹے کے نام حق الخدمت کے طور پر اپنی اراضی سے تین عدد ایکڑ لگوا دیئے ہیں۔ باقی زمین مشترکہ ہے کیا ایسا کرنا شرعاً درست ہے؟

☆ میرا بڑا بیٹا شادی کے بعد گھر سے الگ ہو گیا، اس نے الگ ہونے کے بعد اپنی کمائی سے کچھ جائیداد خریدی ہے، باقی دونوں بیٹوں نے بھی جو میرے ساتھ ہیں، اپنی کمائی سے اپنے نام گاؤں میں زرعی اراضی خریدی ہے۔ بڑا بیٹا ہمیں اپنی کمائی سے کچھ نہیں دیتا بلکہ بے ادب گستاخ ہے اور وہ دونوں بیٹوں کی خرید کردہ اراضی سے حصہ مانگتا ہے، کیا وہ اس قسم کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے؟

☆ میری زرعی اراضی کی ہر قسم کی پیداوار سے بڑے لڑکے کو ہر سال اس کا حصہ دیا جاتا ہے لیکن اس کا مطالبہ ہے کہ جائیداد کو تقسیم کر کے اس کا حصہ دیا جائے جبکہ میرے ذمے ایک لڑکے کی شادی کے علاوہ اور بہت گھریلو کام ہیں۔ بڑا لڑکا ویسے بھی ہمارے گھر میں عار محسوس کرتا ہے۔ کیا زندگی میں ایسے نافرمان لڑکے کو اس کا حصہ دینا درست ہے یا وہ میرے مرنے کے بعد اپنا حصہ وصول کرے گا؟

جواب ترتیب وار جواب حسب ذیل ہیں:

☆ آدمی جب تک زندہ ہے۔ اسے شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنے مال و جائیداد میں تصرف کرنے کا پورا پورا حق ہے لیکن اس تصرف میں اولاد کے درمیان برابری اور مساوات ضروری ہے۔ صورت مسئولہ میں باپ نے جو اپنے کاشتکار بیٹے کو تین عدد ایکڑ دیئے ہیں یہ بطور حق الخدمت عطیہ کی شکل ہے، چونکہ تمام ورثاء نے اپنی رضامندی سے بلا جبر و اکراہ اس تصرف کو قبول کیا ہے اور اسے برقرار رکھتے ہوئے اپنے دستخط ثبت کئے ہیں۔ اس بنا پر شرعاً کوئی قباحت نہیں اور یہ جائز ہے، البتہ کاشت کار بیٹے کو یہ عطیہ ملنے کے بعد باقی مشترکہ زمین سے بھی بطور وراثت حصہ ملے گا ایسا کرنے سے اس کا وراثتی کا حصہ ختم نہیں ہوگا۔ بشرطیکہ باپ کی وفات کے وقت وہ زندہ ہو۔

☆ الگ ہونے والے لڑکے نے اپنی کمائی سے جو جائیداد بنائی ہے وہ اس کا حق ہے اور باقی دونوں لڑکوں نے جو زرعی اراضی خریدی ہے یہ ان کا حق ہے، لہٰذا طمع اور لالچ کے پیش نظر ایک دوسرے کے حق پر ڈاکہ ڈالنا شرعاً درست نہیں ہے۔ باپ کی زرعی اراضی سے جو اسے حصہ مل رہا ہے وہ اس کی بے ادبی اور گستاخی کی وجہ سے ساقط نہیں ہوگا اور نہ ہی دونوں بیٹوں کی کمائی سے خرید کردہ زرعی اراضی سے حصہ لینے کا مطالبہ کرنا اس کے لئے جائز ہے، کیونکہ یہ ان کی اپنی کمائی سے خرید کردہ ہے اور وہ باپ کی ملکیت نہیں ہے۔

☆ بڑے بیٹے کا اپنے والد کو مجبور کرنا کہ وہ اپنی زندگی میں مجھے میرا حصہ دے جائے، درست نہیں کیونکہ وراثت کا اجرا مرنے کے بعد ہوتا ہے۔ اپنی زندگی میں جو کسی کو کچھ دیا جاتا ہے وہ عطیہ ہے۔ جس میں بیٹے اور بیٹیاں مساویانہ طور پر حق دار ہوتے ہیں۔ باپ کو زندگی میں مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی جائیداد خود ورثاء میں تقسیم کر دے۔ خاص طور پر جبکہ باپ کی بے شمار ضروریات زندگی اور دیگر حقوق کی ادائیگی اس کے ذمے باقی ہے۔ ہاں، اگر والد اپنی مرضی سے کچھ دینا چاہے تو مساوات کے ساتھ دے سکتا ہے لیکن اس پر جبر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کی وفات کے بعد اولاد کو ان کا حصہ شرعی مل ہی جائے گا۔ [واللہ اعلم]

سوال سمندا نامی ایک شخص 658 کنال اراضی چھوڑ کر فوت ہوا، اسکے تین بیٹے اسماعیل، جعفر، بہاول اور ایک بیٹی بھڑی زندہ تھے۔ ان میں اسماعیل اپنی ایک بیٹی بھاگے بی بی چھوڑ کر فوت ہو گیا۔ اسی طرح جعفر اور بھڑی بھی لاولد فوت ہو گئے، نیز بہاول بھی اپنی پانچ بیٹیاں بشیراں، نذیراں، رسولاں اور فاطمہ اور بی بی چھوڑ کر فوت ہو گیا۔ سمندا کی زمین تقسیم نہ ہوئی، اس پر بہاول کی پانچوں بیٹیاں قابض ہیں جبکہ اسماعیل کی بیٹی بھاگے بی بی ابھی تک محروم ہے، انہیں سمندا کی متروکہ جائیداد سے کیا ملے گا؟

جواب مذکورہ سوال میں خاصا ابہام ہے۔ اس میں اسماعیل کی وفات کے وقت صرف اس کی بیٹی بھاگے بی بی کو زندہ ظاہر کیا گیا ہے جبکہ اس کے دوسرے بھائیوں اور ایک بہن کے متعلق نہیں بتایا گیا کہ وہ اس کی وفات کے وقت زندہ تھے یا فوت ہو چکے تھے۔ اسی طرح جعفر اور بھڑی کی وفات کے وقت کون کون زندہ تھے۔ ان کے متعلق بھی وضاحت نہیں کی گئی، وراثت کے مسائل اس قسم کی تفصیل کے بغیر حل نہیں ہوتے، ظاہر صورت حال کے پیش نظر مسئلہ کا حل حسب ذیل ہے:

اولاً: سمندا کی جائیداد کو اس کی اولاد میں اس طرح تقسیم کیا جائے گا کہ اس کے ایک لڑکے کو اس کی لڑکی سے دوگنا حصہ ملے، یعنی اس کی جائیداد کے سات حصے کر لئے جائیں دو، دو حصے فی لڑکا اور ایک حصہ لڑکی کو دے دیا جائے۔ 658 کنال میں سے 188 کنال فی لڑکا اور 94 کنال لڑکی کو دیا جائے گا۔

ثانیاً: اسماعیل جب فوت ہوا تو اس کی وارث صرف اس کی لڑکی بھاگے بی بی کو ظاہر کیا گیا ہے۔ لہٰذا اسماعیل کو اپنے باپ سے ملنے والا حصہ 188 کنال اس کی لڑکی بھاگے بی بی کو منتقل ہو جائے گا، اسی طرح بہاول کو اپنے باپ سے ملنے والا حصہ 188 کنال اس کی پانچ لڑکیوں کو مل جائے گا۔

ثالثاً: جعفر اور اس کی بہن بھڑی جو لاولد فوت ہوئے ہیں ان کا حصہ 188+94=282 کنال بھی ان کی بھتیجیوں کو ذوی الارحام کی حیثیت سے ملے گا، یعنی دونوں کے حصہ کو اسماعیل کی بیٹی اور بہاول کی پانچ بیٹیوں میں برابر تقسیم کر دیا جائے۔ اس طرح ہر لڑکی کو 47 کنال حصہ ملے گا اب حصص کی تفصیل اس طرح ہوگی:

بھاگے بی بی کو باپ سے ملنے والا حصہ	188: کنال
بھاگے بی بی کو اپنے چچا اور پھوپھی سے ملنے والا حصہ	47: کنال
میزان	235: کنال
بہاول کی پانچ بیٹیوں کو باپ سے ملنے سے والا حصہ	188: کنال

بہاول کی پانچ بیٹیوں کو اپنے چچا اور پھوپھی سے ملنے والا حصہ :235 کنال

میزان :423 کنال

بہاول کی ہر لڑکی کو ملنے والا حصہ :84.60=5/423 کنال یا 84 کنال 4 مرلے، [واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی کی دو بیویاں ہیں اور دونوں ہی صاحب اولاد ہیں ایک بیوی کے بطن سے چھ لڑکیاں اور پانچ لڑکے پیدا ہوئے اور دوسری بیوی کا صرف ایک لڑکا ہے۔ دوسری بیوی فوت ہو چکی ہے اب یہ آدمی فوت ہو جاتا ہے، اس کی جائیداد پس ماندگان میں کیسے تقسیم ہو گی؟

جواب واضح رہے کہ صورت مسئولہ میں متوفی کے ورثاء بیوہ میں چھ لڑکیاں اور پانچ لڑکے ہیں۔ قرآن مجید کے بیان کردہ ضابطۂ وراثت کے مطابق اولاد کی موجودگی میں بیوہ کو میت کی جائیداد سے آٹھواں حصہ ملتا ہے اور باقی متوفی کی اولاد میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ایک لڑکے کو لڑکی کے مقابلہ میں دوگنا حصہ دیا جائے گا۔ سہولت کے پیش نظر مرحوم کی میت کی جائیداد کے 144 حصے کئے جائیں، پھر آٹھواں حصہ، یعنی 18 حصص بیوہ کے لئے، 84 حصص لڑکوں کے لئے جو 14 حصص فی لڑکا کے حساب سے تقسیم ہوں گے۔ اس طرح 42 حصص لڑکیوں کے لئے جو سات حصہ فی لڑکی کے حساب سے تقسیم دیے جائیں۔

سوال میرے شوہر نے اپنی وفات سے دس بارہ سال پہلے ایک شراکت نامہ تحریر کیا تھا، جس کی رو سے، یعنی مرحوم کی بیوہ، تین بیٹیاں اور ایک لے پالک بیٹا ''واحد اینڈ کمپنی'' نامی فرم میں شریک کار ہیں اور ہم میں سے ہر ایک مقررہ فراہم کردہ سرمایہ کے مطابق نفع اور نقصان کے مالک ہیں اس کاروبار میں مرحوم شریک نہیں ہوئے، البتہ دکان ان کی تھی، جس میں کاروبار شروع کیا گیا۔ مرحوم کے تین بھائی اور ایک بہن بھی بقید حیات ہے۔ مرحوم کی دکان کے علاوہ جو جائیداد تھی وہ شرع کے مطابق تقسیم ہو چکی ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان کی وفات سے شراکت نامہ میں تو کوئی ردوبدل نہیں کرنا پڑے گا، نیز دکان سے بھائیوں اور بہن کو بھی حصہ ملے گا یا اس کے وہی حق دار ہیں جنہیں وہ اپنی زندگی میں شراکت نامہ لکھ کر دے گئے ہیں؟

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ کاروبار کے لئے جو شراکت نامہ تحریر کیا گیا ہے۔ اس میں متوفی شامل نہیں ہے، لہٰذا اس کی وفات سے شراکت نامہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ کاروبار حسب معمول جاری رہے گا۔ اس کے نفع و نقصان میں صرف شرکاء ہی شامل ہوں گے، متوفی کے بھائی یا بہن اس میں قطعی طور پر شریک نہیں ہوں گے، کیونکہ شراکت نامہ میں انہیں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ دکان کا معاملہ کاروبار سے ذرا الگ حیثیت رکھتا ہے، اگر کمپنی نے دکان کو خرید لیا ہے اور وہ مرحوم کے نام نہیں ہے اگر تھی تو اسی کمپنی کے نام ہبہ کر دی تھی تو اس صورت میں بھائیوں اور بہن کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی انہیں اس سے کچھ حصہ ملے گا کیونکہ مرحوم کی وفات کے وقت وہ دکان مرحوم کی ملکیت تھی اور کمپنی اس میں صرف کاروبار کرتی تھی اور مرحوم کی زندگی میں دکان خرید کر کمپنی کے نام حق ملکیت منتقل نہیں ہوا تو اس کی حقیقت جداگانہ ہے۔ مندرجہ ذیل تفصیل کے مطابق اسے تقسیم کیا جائے۔ بیوہ کو 1/8، بیٹیوں کو 2/3 اور باقی 5/24 بہن بھائیوں کا ہے۔ وہ اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ایک بھائی کو بہن سے دوگنا ہے۔ سہولت کے پیش نظر اسے 168 حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ بیوہ کو 21، بیٹوں کو 112 اور بہن بھائیوں کو 35 حصے دیے جائیں، پھر بہن

بھائی اپنے حصوں کو اس طرح تقسیم کریں کہ ایک بھائی کو دس اور بہن کو پانچ حصے دیے جائیں۔ واضح رہے اگر دکان مرحوم کی ملکیت ہے تو لے پالک مرحوم کی جائیداد سے قطعی طور پر محروم ہے، اسے کچھ حصہ نہیں ملے گا، البتہ کاروبار میں وہ شریک رہے گا کیونکہ کاروبار کا مرحوم کی جائیداد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال مرحوم منظور حسین کا صرف ایک بیٹا محمد ایوب تھا، خاوند کی وفات کے بعد ایوب کی والدہ نے دوسری شادی کر لی۔ دوسرے خاوند سے اس کی تین بیٹیاں ہیں، یعنی ایوب کی تین مادری بہنیں ہیں۔ اب محمد ایوب بعمر 14 سال فوت ہو چکا ہے اس کا کوئی حقیقی بہن بھائی نہیں ہے۔ پس ماندگان میں سے محمد ایوب کی دادی، تین چچا، دو پھوپھی بقید حیات ہیں۔ وضاحت فرمائیں کہ اس کی وراثت کیسے تقسیم ہوگی؟

جواب سوال میں یہ وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ والدہ جس نے عقد ثانی کیا ہے اور اس کے بطن سے تین سوتیلی بہنیں ہیں۔ وہ زندہ ہیں یا نہیں، ہم دونوں صورتوں کی وضاحت کیے دیتے ہیں:

① اگر محمد ایوب کی والدہ زندہ ہے تو اسے بیٹے کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے 1/6 حصہ ملے گا، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور اگر میت کے بہن بھائی بھی ہوں تو ماں کا چھٹا حصہ ہے۔'' [۴/النسآء:۱۱]

سوتیلی بہنوں، یعنی مادری تین بہنوں کو کل جائیداد کا 1/3 حصے ملے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر وہ (مادری) بہن بھائی زیادہ ہوں تو وہ سب تہائی میں شریک ہوں گے۔'' [۴/النسآء:۱۲]

والدہ کی موجودگی میں ایوب کی دادی محروم ہوگی، کیونکہ قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور کا رشتہ دار محروم ہو جاتا ہے، اس لئے دادی کو کچھ نہیں ملے گا۔

مقررہ حصہ لینے والے ورثا کو ان کا حصہ دینے کے بعد جو بچے گا اس کے وارث مرحوم کے تین چچا ہیں دو پھوپھی جان بھی محروم ہیں کیونکہ وہ ذوی الارحام سے متعلق ہیں۔ سہولت کے پیش نظر کل جائیداد کے 18 حصے کر لئے جائیں، ان میں سے 1/6 یعنی تین حصے والدہ کے اور 1/3 یعنی 6 حصے سوتیلی، یعنی مادری بہنوں کے ہیں وہ آپس میں دو دو حصے بانٹ لیں گی باقی ماندہ نو حصے تین چچا کے ہیں وہ تین، تین حصوں کے مالک ہیں۔ صورت مسئلہ یوں ہے:

میت 18/6

والدہ	تین مادری بہنیں	تین چچا	دادی	دو پھوپھی
1/6(3)	1/3(6)	باقی ماندہ(9)	محروم	محروم

② اگر محمد ایوب کی والدہ زندہ نہیں ہے تو اس کی جگہ پر دادی وارث ہوگی اسے 1/6 یعنی تین حصے دینے کے بعد باقی جائیداد تقسیم بالا کے مطابق دیگر ورثا کو مل جائے گی جس کی صورت مسئلہ یہ ہے:

میت 18/6

دادی	تین مادری بہنیں	تین چچا	دو پھوپھی

1/6(3)   1/3(6)   9باقی ماندہ حصص   محروم

نوٹ: اگر کوئی عورت خاوند کی وفات کے بعد عقد ثانی کر لیتی ہے تو اس کا پہلے خاوند کی اولاد سے جو اس کے بطن سے پیدا ہوئی ہو اس سے رشتہ منقطع نہیں ہو جاتا۔ اسی طرح دوسرے خاوند سے پیدا ہونے والی اولاد کا پہلے خاوند کی اولاد سے مادری رشتہ قائم رہتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہم چار بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ والدہ فوت ہو چکی ہے۔ والد محترم نے اپنی زندگی میں ہمیں مختلف مالیت کے پلاٹ خرید کر دیئے ہیں جبکہ بہنوں کو کچھ نہیں دیا، پلاٹوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① محمد عثمان کے پاس 300 فٹ کا مکان ہے جس کی قیمت دو لاکھ روپے ہے۔

② عبدالستار کے پاس کمرشل پلاٹ ہے جس کی مالیت 12 لاکھ روپے ہے۔

③ سیف اللہ کے پاس پلاٹ اور دوکان ہے جس کی مجموعی قیمت 10 لاکھ روپے ہے۔

④ ثناء اللہ کے پاس ایک پلاٹ ہے جس کی قیمت 5 لاکھ روپے ہے۔

والد صاحب اپنی زندگی میں فرماتے تھے کہ جس کے پاس پلاٹ ہے وہ اس کا مالک ہے کیا یہ تقسیم قرآن و سنت کے مطابق ہے؟ جبکہ ہم اس تقسیم پر مطمئن نہیں ہیں؟

جواب اللہ تعالیٰ آپ کے والد محترم کو معاف فرمائیں انہوں نے اپنی زندگی میں دو کام خلاف شریعت کئے ہیں۔ اپنی بیٹیوں کو محروم کرنا اور بیٹوں کے درمیان غیر منصفانہ تقسیم، کوئی انسان بھی اپنی زندگی میں اپنی جائیداد کو بطور وراثت تقسیم کرنے کا مجاز نہیں ہے کیونکہ وراثت مرنے کے بعد تقسیم ہوتی ہے۔ اپنی زندگی میں والد اپنی اولاد کو جو کچھ دیتا ہے اس کی حیثیت ہبہ اور عطیہ کی ہے۔ اس کے لیے بنیادی طور پر شرط یہ ہے کہ بیٹوں کو مساویانہ حصہ دیا جائے، بیٹیوں کو محروم کرنا، پھر بیٹوں کے درمیان غیر مساویانہ تقسیم کی صورت میں صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مجھے میرے والد نے عطیہ دیا ہے۔ میری والدہ نے اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنانے کے متعلق کہا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے تو آپ نے فرمایا: ''کیا تو نے اپنی تمام اولاد کو اتنا عطیہ دیا۔'' عرض کیا نہیں، اس پر آپ نے فرمایا: ''میں ظلم پر گواہی نہیں دیتا، اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان عدل کیا کرو، اس کے بعد اس نے یہ عطیہ واپس لے لیا۔'' [صحیح بخاری، الھبہ: ۲۵۸۷]

اس حدیث کے پیش نظر مسؤلہ صورت میں شرعی حل یہ ہوگا کہ باپ نے اپنی زندگی میں جو کچھ کسی کو دیا ہے اسے اکٹھا کر لیا جائے، پھر اسے سات حصوں میں تقسیم کر کے مساوی رقم ہر بیٹے اور بیٹی کو دی جائے۔ مرحوم نے چاروں بیٹوں کو جو دیا ہے اس کی مالیت /2900000 انتیس لاکھ ہے اس کو سات حصوں میں تقسیم کرنے سے ایک حصہ 414285.71 بنتا ہے ہر ایک لڑکے اور لڑکی کو اتنا دیا جائے، جس کے پاس قیمتی پلاٹ ہے وہ اپنی طرف سے رقم دے کر حساب برابر کرے۔ دوسری صورت شرعی وراثت کی ہے کہ موجودہ مالیت کو بیٹے کے لئے دو حصے اور بہن کے لئے ایک حصہ، اس حساب سے تقسیم کی جائے۔ اس صورت میں اسے گیارہ پر تقسیم کیا جائے، اس طرح ایک حصہ 263636.36 روپے بنتا ہے، یہ ایک لڑکی کو دیا جائے، پھر اسے ڈبل کر کے یعنی

527272.72 روپے ایک لڑکے کو دیئے جائیں، ممکن ہے کہ ایسا کرنے سے آخرت میں مرحوم کے لئے تلافی کی صورت پیدا ہو جائے کیونکہ ظالمانہ تقسیم کی وجہ سے اخروی باز پرس کا اندیشہ ہے۔ اس لئے بچوں کو چاہیے کہ وہ اپنی دنیا بنانے کی بجائے اپنے والد کی آخرت سنوارنے کی کوشش کریں۔ [واللہ اعلم]

سوال میں اپنے بچوں میں اندیشہ فساد کے پیش نظر اپنی جائیداد کو خود تقسیم کر دینا چاہتا ہوں، کیا شرعاً مجھے ایسا کرنے کا حق ہے اگر ایسا کر سکتا ہوں تو یہ تقسیم کس شرح سے ہوگی؟

جواب اللہ تعالیٰ نے انسان کو شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے خود مختار بنایا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جیسے چاہے استعمال کرے، مال و جائیداد بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ اس میں بھی اسے اپنی مرضی سے جائز تصرف کا حق ہے۔ اس بنا پر اپنی زندگی میں اپنے مال کو اپنی اولاد میں تقسیم کر سکتا ہے اور جتنا چاہے اپنے لئے بھی رکھ سکتا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''ہر انسان اپنے مال میں تصرف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہے۔ وہ اسے جہاں چاہے جیسے چاہے استعمال کر سکتا ہے۔'' [بیہقی، ص: ۱۷۸، ج ۶]

لیکن زندگی میں یہ تقسیم ضابطہ میراث کے مطابق نہیں ہوگی کیونکہ وراثت غیر اختیاری طور پر حق ملکیت اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہونے کا نام ہے جبکہ یہ تقسیم اپنی زندگی اپنے اختیار اور ارادہ سے کی جا رہی ہے۔ ہاں یہ عطیہ کی ایک شکل ہے جس میں لڑکے اور لڑکی کا لحاظ کئے بغیر اپنی اولاد میں مساویانہ طور پر مال تقسیم کرنا ہوتا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک باب یوں قائم کیا ہے ''باب الهبة للولد'' یعنی اولاد کو ہبہ کرنے کا بیان، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس کے تحت لکھتے ہیں:

اگر باپ اپنی اولاد میں کسی کو کچھ دیتا ہے تو اسے جائز قرار نہیں دیا جائے گا تا آنکہ وہ عدل و انصاف سے کام لیتے ہوئے دوسروں کو بھی اس کے برابر حصہ دے۔ اس کے بعد امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان بطور دلیل پیش کیا ہے۔

''عطیہ دیتے وقت اپنی اولاد کے درمیان عدل و انصاف سے کام لیا کرو۔'' [صحیح بخاری، الھبہ ۱۲]

اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حسب ذیل فرمان ایک فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ ''عطیہ دیتے وقت اپنی اولاد کے درمیان برابری کیا کرو۔ اگر (کسی کمزوری کے پیش نظر) میں کسی کو زیادہ چاہتا تو عورتیں اس بات کی زیادہ حقدار ہیں کہ انہیں دوسروں سے زیادہ دیا جائے۔'' [بیہقی، ص: ۱۷۷، ج ۶]

ارشاد نبوی کے پیش نظر زندگی میں اپنی جائیداد تقسیم کرتے وقت مساوات کو سامنے رکھنا ہوگا۔ ہاں، اگر اولاد میں کوئی معذور، اپاہج یا مفلوک الحال ہے تو باپ کو حق ہے کہ اسے دوسروں سے زیادہ دے، تاہم اس کے لئے معقول وجہ کا ہونا ضروری ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال اخبارات میں جو عاق نامہ دیا جاتا ہے اس کی شرعی حیثیت کیا ہے کیا والد کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے نافرمان بیٹے کو وراثت سے محروم کر سکے؟

جواب انسان کے مرنے کے بعد اس کی جائیداد کو تقسیم کرنے کا طریقہ کار خود اللہ تعالیٰ کا وضع کردہ ہے۔ اس میں کسی کو ترمیم و اضافہ کا حق نہیں ہے جو حضرات قانون وراثت کو پامال کرتے ہوئے آئے دن اخبارات میں اپنی اولاد میں سے کسی کے متعلق

''عاق نامہ'' کے اشتہارات دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑے خوفناک عذاب کی دھمکی دی ہے۔ ہمارے معاشرے میں کہیں تو عورتوں کو وراثت سے مستقل طور پر محروم کر دیا جاتا ہے اور کہیں دوسرے بچوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف لڑکے کو ہی وراثت کا حق دار ٹھہرا دیا جاتا ہے، یہ سب اللہ تعالیٰ کے وضع کردہ ضابطہ میراث کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''مردوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لئے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، خواہ وہ مال تھوڑا یا بہت ہو اور یہ حصہ (اللہ کی طرف) سے مقرر ہے۔'' [۴/النساء:۷]

اس آیت کریمہ کے پیش نظر کسی وارث کو بلا وجہ شرعی وراثت سے محروم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ماہرین وراثت نے ان وجوہات کو بڑی دلیل سے بیان کیا ہے جو وراثت سے محرومی کا باعث ہیں عام طور پر اس کی دو اقسام ہیں:

پہلی قسم میں وہ موانع شامل ہیں جو فی نفسہ وراثت سے محرومی کا باعث بنتے ہیں ان میں غلامی، قتل ناحق اور اختلاف ملت یعنی کفر و ارتداد وغیرہ ہیں۔

دوسری قسم میں وہ موانع ہیں جو فی نفسہ تو رکاوٹ کا باعث نہیں، البتہ بالتبع محرومی کا ذریعہ ہوتے ہیں ان میں وارث اور مورث کا اشتباہ بر سر فہرست ہے، جیسے ایک ساتھ غرق ہونے والے، آگ میں جل کر اس دنیا سے رخصت ہونے والے ہیں۔ اگر ان کے درمیان وراثت کا رشتہ قائم ہو تو ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے بشرطیکہ پتہ نہ چل سکے کہ ان میں پہلے اور بعد کون فوت ہوا ہے۔ احادیث میں بھی اس کی وضاحت ملتی ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جو کسی کی وراثت کو ختم کرتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے مقرر کیا ہے، اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی وراثت کو ختم کر دیں گے۔'' [شعب الایمان للبیہقی:۱۴/۱۱۵]

اس طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو اپنے وارث کو حصہ دینے سے راہ فرار اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا حصہ جنت سے ختم کر دیں گے۔'' [ابن ماجہ، کتاب الوصایا:۲۷۰۳]

اگرچہ مؤخر الذکر روایت میں ایک راوی زید العمی ضعیف ہے، تاہم اس قسم کی روایت بطور تائید پیش کی جا سکتی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اگر بیٹا نافرمان ہے تو وہ اپنی سزا اللہ تعالیٰ کے ہاں پائے گا۔ لیکن والد کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اسے جائیداد سے محروم کر دے۔ بعض لوگ محض ڈرانے کے لئے ایسا کرتے ہیں لیکن ایسا کرنا بھی کئی ایک قباحتوں کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا رائج الوقت ''عاق نامہ'' کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے والد صاحب فوت ہو چکے ہیں جو تھوڑی سی زرعی اراضی چھوڑ گئے ہیں پسماندگان میں سے ہماری والدہ، ہم دو بھائی اور دو بہنیں زندہ ہیں تقسیم جائیداد کیسے ہوگی، نیز ہماری ایک بہن والد مرحوم کی زندگی میں فوت ہو گئی تھی۔ کیا اسے بھی ہمارے والد کی جائیداد سے حصہ ملے گا یا نہیں؟

جواب قرآن کریم کی وضاحت کے مطابق صورت مسئولہ میں بیوہ کو آٹھواں حصہ اور باقی جائیداد بہن بھائی اس طرح تقسیم کریں کہ بھائی کو ایک بہن سے دوگنا حصہ ملے۔ سہولت کے پیش نظر منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کے 48 حصے کر لئے جائیں۔ ان میں سے آٹھواں حصہ، یعنی 6 حصے مرحوم کی بیوہ کو ملیں گے اور باقی 42 حصوں میں سے ہر ایک بھائی 14,14 اور ہر ایک بہن کو 7

7,حصے دیے جائیں۔

میت/ 48 بیوہ 6 لڑکا 14 لڑکا 14 لڑکی 7 لڑکی 7

کسی کی وفات کے وقت جو شرعی ورثا زندہ موجود ہوں، انہیں ترکہ سے حصہ ملتا ہے بشرطیکہ وہاں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ چونکہ مرحوم کی ایک بیٹی اس کی زندگی میں فوت ہو چکی تھی، لہٰذا مرحوم کی جائیداد سے اس فوت شدہ بیٹی کو کچھ نہیں ملے گا اور نہ ہی اس کی اولاد یا اس کے داماد کا اس میں کوئی حق ہے۔ جائیداد میں صرف وہ ورثاء شریک ہوتے ہیں جو متوفی کی وفات کے وقت زندہ موجود ہوں۔[واللہ اعلم]

سوال میرے بھائی فوت ہو گئے ہیں، پس ماندگان میں چھ بیٹیاں اور میں ایک بھائی ہوں، اس کا صرف ایک مکان ہے، اس کی تقسیم کتاب وسنت کی روشنی میں کیسے ہو گی؟

جواب قرضہ کی ادائیگی اور شرعی حدود میں رہتے ہوئے وصیت کے نفاذ سے مرحوم کی بیٹیاں دوتہائی کی حقدار ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اگر اولاد میں صرف لڑکیاں ہی ہوں اور وہ دو سے زائد ہوں تو ان کا ترکہ سے دوتہائی حصہ ہے۔'' [۴/النساء:۱۱]

بیٹیوں کو ان کا مقررہ حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے وہ مرحوم کا بھائی عصبہ ہونے کی حیثیت سے لے گا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''حق داروں کو مقررہ حصص دینے کے بعد جو باقی بچے وہ میت کے قریبی رشتہ دار کے لیے ہے۔'' [صحیح بخاری، الفرائض: ۶۷۳۵]

سہولت کے پیش نظر مکان کی مالیت کو تین حصوں میں تقسیم کر لیا جائے، ان میں سے دو حصے چھ بیٹیوں کو اور ایک حصہ بھائی کو دے دیا جائے۔ صورت مسئولہ اس طرح ہو گی:

میت:18/3 چھ بیٹیاں 12/2 ایک بھائی 6/1۔

نوٹ: اگر حصہ داروں کے لئے حصص پوری طرح تقسیم نہ ہوں تو حصوں کی تعداد کو بڑھا دیا جاتا ہے، جیسا کہ مذکورہ مسئلہ میں تین حصوں کو بڑھا کر اٹھارہ کر لیا گیا ہے ان میں سے دو، دو حصے فی بیٹی اور چھ حصے اس کے بھائی کو دیئے جائیں۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے دفتر میں ایک آدمی حرکت قلب بند ہونے سے فوت ہو گیا ہم نے مندرجہ ذیل رقوم اس کی بیوہ کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیں (۱) فیملی پنشن (۲) بیمہ پالیسی کی رقم (۳) جی پی فنڈ (۴) سٹاف کی طرف سے جمع شدہ تعاون مرحوم کے والد کا موقف ہے کہ قرآن کریم میں بیان شدہ ضابطہ میراث کے لحاظ سے ان رقوم میں والدین کا بھی حق وراثت بنتا ہے۔ مرحوم کے والد کا موقف کس حد تک درست ہے؟

جواب بشرط صحت سوال واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے میت کے ترکہ میں ضابطۂ وراثت جاری فرمایا ہے اور ترکہ سے مراد ہر وہ مال ہے جو کوئی شخص چھوڑ کر فوت ہو جائے اور وہ اس کی جائز ملکیت ہو، خواہ وہ جائیداد منقولہ ہو یا غیر منقولہ، خواہ موت کے وقت وہ اس کے قبضہ میں ہو یا ابھی تک اس پر قبضہ نہ ہو سکا ہو۔ اسی طرح ہر وہ چیز اس کے ترکہ میں داخل سمجھی جائے گی جس کا سبب ملک اس

کی زندگی میں قائم ہو چکا تھا مگر وہ اس کی ملکیت میں موت کے بعد داخل ہوئی، جیسا کہ کسی شخص نے کسی کمپنی کے حصص خریدنے کی درخواست دی تھی لیکن وہ حصص اس کے مرنے کے بعد الاٹ ہوئے، یہ حصص بھی میت کے ترکہ میں شمار ہوں گے۔ ترکہ کے متعلق چند اصولی باتیں حسب ذیل ہیں:

☆ ایسا مال جو مرتے وقت میت کے قبضہ میں تھا لیکن شریعت کی نظر میں وہ مال نہیں، وہ ترکہ میں شمار نہیں ہوگا، جیسے ذخیرۂ شراب وغیرہ۔

☆ جو مال چوری، خیانت، رشوت اور غصب کر کے حاصل کیا ہو، وہ بھی میت کے ترکہ میں شامل نہیں کیا جائے گا۔

☆ بیمہ سے حاصل ہونے والی رقم میت کے ترکہ میں داخل نہ ہوگی کیونکہ اس میں واضح طور پر غرر، یعنی دھوکہ پایا جاتا ہے اور یہ رقم کھلے طور پر جوئے کے حکم میں ہے، البتہ میت کی طرف سے ادا شدہ رقم اس کے ترکہ میں شمار ہوگی۔

(بیمہ کے متعلق ہمارا تفصیلی فتویٰ عنقریب اشاعت پذیر ہوگا)

☆ اسی طرح جی پی فنڈ کے متعلق بھی ہمارا تفصیلی فتویٰ شائع ہو چکا ہے کہ اس میں میت کی وہی رقم ترکہ میں شامل کی جائے گی جو اس کی تنخواہ سے ماہ بماہ کاٹی جاتی تھی۔ اس سے زائد ملنے والی رقم سود ہونے کی وجہ سے اس کے ترکہ میں شمار نہیں ہوگی۔ اس قسم کے اموال جو اوپر بیان ہوئے ہیں اگر ورثا انہیں آپس میں بحصہ شرعی تقسیم کرتے ہیں تو وہ اللہ کے ہاں جوابدہ ہیں، جیسا کہ میت کا بھی اس کے متعلق مواخذہ ہوگا، لاعلمی کی صورت میں ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کر دے۔

☆ میت کی پنشن جو اس کی زندگی میں حکومت یا کسی ادارہ کے ذمے واجب ہو چکی تھی، وہ میت کا ترکہ شمار ہوگی کیونکہ یہ رقم حسب قواعد، ملازمت کی ایک مدت کے اختتام پر ملازم کا حق قرار پاتی ہے اور یہ حق قابل چارہ جوئی عدالت ہوتا ہے۔ اگر پنشن حکومت یا ادارہ کی طرف سے انعام بھی ہو، جیسا کہ بعض اہل علم کا خیال ہے تو بھی اس انعام کو میت کے ترکہ میں ہی شمار کیا جائے گا، جیسا کہ مقتول کی دیت کو اس کے ترکہ میں شمار کر کے ورثا میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ صورت مسئولہ میں مرحوم کی وفات کے بعد جو امدادی فنڈ بیوہ یا اس کے بچوں کو ملا ہے وہ انہی کا حق ہے۔ والدین کو اس سے کچھ نہیں ملے گا کیونکہ اسے ترکہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا اور جو رقم امدادی فنڈ کے طور پر نہیں اس پر ضابطہ وراثت جاری ہوگا۔ اس میں والدین کا چھٹا، چھٹا حصہ ہے یعنی دونوں (ماں باپ) 1/6، 1/6 کے حقدار ہیں۔ ان میں جو رقم شریعت کی خلاف ورزی پر حاصل ہوئی ہے، اس سے ورثا کو دستبردار ہو جانا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ اس نے اپنی ایک لڑکی کے نام اپنی 188 ایکڑ زمین میں سے 10 ایکڑ زمین الاٹ کر دی۔ اس کے بعد اس لڑکی نے اپنی اور اپنے لڑکے کی رضامندی سے اپنے باپ سے ملنے والی زمین اپنے پوتے کے نام منتقل کر دی۔ اب لڑکی کا بھتیجا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ زمین واپس لی جائے اور جس کے نام زمین باہمی رضامندی سے الاٹ کی گئی تھی وہ واپس نہیں کرتا۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کا کیا حل ہے؟۔

جواب جو زمین لڑکی کو اپنے والد کی طرف سے ملی ہے وہ اس میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کر سکتی ہے کیونکہ وہ اب اس کی ملکیت ہے۔ اگر اس نے اپنے قریبی وارث بیٹے کی موجودگی میں اس کی رضامندی سے اپنے پوتے کے نام منتقل کر دی ہے تو اس

میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ یہ ہبہ کی ایک صورت ہے۔اب بھائی کے لڑکے یعنی بھتیجے کو اس پر اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے جب ہبہ برضا و رغبت بلا جبر و اکراہ ہو تو اسے واپس نہیں لیا جا سکتا۔حدیث میں ہے کہ ''جو ہبہ دے کر واپسی کا مطالبہ کرتا ہے وہ کتے کی طرح ہے جو قے کرنے کے بعد اسے چاٹتا ہے۔'' [ابوداؤد،البیوع:۳۵۴۰]

لہٰذا اس کا حل یہی ہے کہ پوتے کے نام الاٹ شدہ زمین واپس نہ لی جائے اور کسی دوسرے کو اس عطیہ پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے،کیونکہ یہ اچھے اور خوشگوار ماحول میں سرانجام پایا ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ہم پانچ بھائی اور تین بہنیں ہیں اور ایک بہن والدین کی زندگی میں ہی فوت ہو چکی تھی،اس کی اولاد موجود ہے،بڑے تینوں بھائیوں کی شادی ہو چکی ہے۔وہ والدین سے الگ رہتے ہیں،والد محترم نے قرض لے کر کسی شہر میں جگہ خریدی اور اس کی رجسٹری بھی ان کے نام ہے۔چھوٹے دو بھائیوں نے محنت مزدوری کر کے والد محترم کا قرضہ اتارا اور جگہ کی تعمیر پر اٹھنے والے اخراجات برداشت کئے۔اس کے علاوہ بہنوں کی شادیاں بھی کیں۔اس میں بڑے بھائیوں کا کوئی حصہ نہیں ہے،جب عمارت پر اخراجات کی بات ہوتی تو والد محترم کہتے کہ اس میں اسی کا حصہ ہوگا جس نے خرچ کیا ہے۔اب والدین فوت ہو چکے ہیں اس شہری مکان کے متعلق اب بھائیوں نے کہنا شروع کر دیا کہ اس میں فلاں فلاں کا حصہ ہے۔براہ کرم اس کا کوئی ایسا شرعی حل بتائیں کہ والد محترم پر بھی کوئی بوجھ نہ ہو اور کسی بھائی کی حق تلفی بھی نہ ہو؟

جواب تقسیم جائیداد کے سلسلہ میں چند چیزوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

☆ مرنے کے بعد ہر قسم کی جائیداد قابل تقسیم ہوتی ہے،خواہ وہ وراثت کے طور پر ملی ہو یا محنت کر کے اسے اپنی جائیداد میں شامل کیا ہو،یہ ذہن غلط ہے کہ صرف وہ ترکہ قابل تقسیم ہوتا ہے جو وراثت کے طور پر ملا ہو۔

☆ جائیداد سے ان رشتہ داروں کو حصہ ملتا ہے جو وفات کے وقت بقید حیات ہوں،اگر کوئی رشتہ دار پہلے فوت ہو چکا ہے تو اس کا حصہ نہیں رکھا جاتا اور نہ ہی اس کی اولاد کو منتقل ہوتا ہے۔لہٰذا صورت مسئولہ میں جو بہن والد کی زندگی میں فوت ہو چکی تھی اسے کچھ نہیں ملے گا اور نہ ہی اس کی اولاد کو کچھ دیا جا سکتا ہے۔ہاں،اگر بھائی چاہیں تو اپنے حصے سے انہیں دے سکتے ہیں۔

☆ مرنے والے کی جائیداد سے حصہ لینے کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ کون والد کا خدمت گزار تھا اور کون اس خدمت سے پیچھے رہتا تھا۔البتہ شادی کے بعد والدین کی خدمت کا فریضہ ساقط نہیں ہو جاتا کہ وہی بچے والدین کی خدمت کریں جو اس کے ساتھ رہتے ہیں۔اس لئے صورت مسئولہ میں وہ مکان مشترکہ طور پر تقسیم ہوگا جس کی یہ صورت ہوگی کہ اس کی موجودہ مارکیٹ کے مطابق قیمت لگائی جائے،پھر اسے بارہ حصوں میں تقسیم کر کے دو،دو حصے ہر ایک بیٹے کو اور ایک ایک حصہ ہر ہر بیٹی کو دے دیا جائے،اگر اور کوئی جائیداد ہے تو اسے بھی اسی شرح سے تقسیم کیا جائے۔

☆ چونکہ اس جگہ کی خریداری پر لیا گیا قرضہ چھوٹے دو بھائیوں نے اتارا ہے اور تعمیر پر اٹھنے والے اخراجات انہوں نے برداشت کئے ہیں،اس لئے قرضہ اور تعمیر کے اخراجات دیگر ورثا کی طرف سے انہیں ادا کر دیے جائیں۔اس کے بعد مکان میں انہیں شریک کیا جائے،ان پر زیادتی کسی صورت میں نہیں ہونی چاہیے۔انہیں بھی چاہیے کہ جو اخراجات انہوں نے تعمیر کے سلسلہ میں برداشت

کئے ہیں انہیں دیانت داری کے ساتھ ظاہر کیا جائے۔

☆ والد محترم نے زندگی میں جو کہا تھا کہ اس مکان میں وہی شریک ہوگا جس نے اس کے اخراجات برداشت کئے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے اسے کسی صورت میں بنیاد نہ بنایا جائے۔

☆ بہنوں کی شادیوں پر جو اخراجات ہوئے ہیں انہیں مکان کی مجموعی قیمت سے منہا نہ کیا جائے، یہ ایک ذمہ داری تھی جسے ادا کیا گیا ہے۔ [ہذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب]

سوال میرا داماد فوت ہوگیا ہے۔ اس کی جائیداد صرف ایک مکان ہے جس کی مالیت تقریباً چار لاکھ ہے۔ پس ماندگان میں بیوہ، ایک بیٹا، دو بیٹیاں اور باپ موجود ہے۔ کتاب و سنت کی روشنی میں کس وارث کو کتنا حصہ ملے گا؟

جواب قرآن میں بیان کردہ ضابطہ میراث کے مطابق بیوہ کو آٹھواں حصہ، باپ کو چھٹا حصہ پھر باقی جائیداد اولاد میں اس طرح تقسیم کردی جائے کہ بیٹے کو بیٹی سے دوگنا حصہ ملے۔ صورت مسئولہ میں مرحوم کی کل جائیداد کے 96 حصے کرلئے جائیں، ان میں بیوہ کا 1/8 یعنی 12 حصے اور باپ کا حصہ 1/6 یعنی 16 حصے، پھر باقی جائیداد سے 34 حصے بیٹے کو اور 17,17 حصے دونوں بیٹیوں کو مل جائیں گے۔ چونکہ مکان کی مالیت چار لاکھ روپے ہے، اس لئے حسب ذیل شرح سے یہ رقم تقسیم کرلی جائے:

بیوہ: 400000 کا 1/8=50000 روپے (پچاس ہزار روپے)

باپ: 400000 کا 1/6=66666.66 روپے (چھیاسٹھ ہزار چھ صد چھیاسٹھ روپے چھیاسٹھ پیسے)

باقی: 400000-116666.66=283333.34

بیٹے کا حصہ: 141666.66 (ایک لاکھ اکتالیس ہزار چھ صد چھیاسٹھ روپے چھیاسٹھ پیسے)

ایک بیٹی کا حصہ: 70833.34 (ستر ہزار آٹھ صد تینتیس روپے چونتیس پیسے)

دوسری بیٹی کا حصہ: 70833.34 (ستر ہزار آٹھ صد تینتیس روپے چونتیس پیسے) [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ایک شخص فوت ہوا، پس ماندگان میں سے والدہ، ایک حقیقی بھائی اور یتیم بھتیجے زندہ ہیں۔ وفات کے کچھ عرصہ بعد اس کی والدہ بھی فوت ہوگئیں، اب اس کی جائیداد کیسے تقسیم ہوگی۔ کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں کہ اس کی جائیداد سے یتیم بھتیجوں کو حصہ ملے گا یا نہیں؟

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ صورت مسئولہ میں فوت ہونے والے کا حقیقی بھائی عصبہ ہونے کی حیثیت سے اس کی کل جائیداد کا وارث ہوگا۔ یتیم بھتیجوں کو بھائی کی موجودگی میں کچھ نہیں ملتا کیونکہ بھتیجوں کے مقابلہ میں بھائی کا رشتہ سب سے زیادہ قریبی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس کا ترکہ پہلے اس کی والدہ اور بھائی کے درمیان تقسیم ہوگا چونکہ والدہ بھی فوت ہوچکی ہے، اس لئے فوت شدہ بیٹے کی جائیداد سے ملنے والا حصہ بھی زندہ بیٹے کو منتقل ہوجائے گا، یعنی پہلے اسے بھائی کی جائیداد سے حصہ ملا، پھر باقی ماندہ والدہ کی جائیداد سے مل گیا، اسی طرح میت کا بھائی اپنے فوت شدہ بھائی کی کل جائیداد کا مالک ہوگا۔ جائیداد حاصل کرنے میں اور کوئی رشتہ دار اس میں شریک نہیں ہے، چونکہ بیماری کے دوران یتیم بھتیجوں نے اس کی خدمت کی ہے، اس لئے بہتر ہے کہ ان کی

دلجوئی اور حوصلہ افزائی کے طور پر انہیں بھی کچھ دے دیا جائے لیکن انہیں کچھ دینا زندہ بھائی کی صوابدید پر موقوف ہے، اگر وہ نہ چاہے تو اس پر جبر نہیں کیا جاسکتا۔ اصولی طور پر مرنے والے کی جائیداد کا مالک صرف اس کا بھائی ہوگا۔ یتیم بھتیجے اس کی موجودگی میں محروم ہیں۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ایک آدمی فوت ہوا، پس ماندگان میں ایک بیٹی، ایک بھتیجا، ایک نواسا اور دو نواسیاں موجود ہیں۔ اس کا کل ترکہ 21 کنال زرعی رقبہ ہے اس کی شرعی تقسیم کیا ہوگی، کیا وہ لڑکی جو اس کی زندگی میں فوت ہوگئی تھی، اس کا حصہ اس کی اولاد، یعنی مرنے والے کی نواسیوں اور نواسوں کو ملے گا یا نہیں؟

جواب جب کوئی آدمی فوت ہو جاتا ہے تو اس کے ترکہ سے حصہ پانے والوں کی تین اقسام ہیں:

☆ اصحاب الفروض: جن کا حصہ قرآن وسنت میں طے شدہ ہے۔ سب سے پہلے انہیں ان کا مقررہ حصہ دیا جاتا ہے۔

☆ عصبات: جن کا حصہ طے شدہ نہیں ہوتا بلکہ اصحاب الفروض سے بچا ہوا ترکہ لیتے ہیں اگر کوئی چیز نہ بچے تو یہ محروم قرار پاتے ہیں۔ اگر اصحاب الفروض نہ ہوں تو تمام ترکہ انہیں مل جاتا ہے۔

☆ اولوالارحام: وہ رشتہ دار جو کسی عورت کے واسطے سے میت کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ اصحاب الفروض اور عصبات کے نہ ہونے کی صورت میں انہیں حصہ دیا جاتا ہے۔ صورت مسئولہ میں بیٹی اصحاب الفروض اور بھتیجا عصبات سے ہے جبکہ نواسا اور دو نواسیاں اولوالارحام سے تعلق رکھتی ہیں۔ بیٹی کا حصہ قرآن کریم میں طے شدہ ہے، یعنی مرنے والے کی جائیداد سے نصف ترکہ اسے دیا جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''اگر (بیٹی) ایک ہی ہو تو اس کا نصف حصہ ہے۔'' [۴/النساء:۱۱]

اور بھتیجا عصبات سے ہے اور بیٹی سے بچے ہوئے ترکہ کا حق دار ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''مقررہ حصے حق داروں کو دو، ان سے جو بچ جائے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ داروں کے لئے ہے۔'' [صحیح بخاری، الفرائض:۶۷۴۶]

ایک نواسے اور دو نواسیوں کا تعلق چونکہ اولوالارحام سے ہے، اصحاب الفروض اور عصبات کی موجودگی میں انہیں کچھ نہیں ملتا جو لڑکی مرحوم کی زندگی میں فوت ہوگئی تھی اسے بھی ترکہ سے کچھ نہیں دیا جائے گا کیونکہ ترکہ لینے کے لئے شرط ہے کہ صاحب جائیداد کی وفات کے وقت زندہ ہو، جب اس بیٹی کو ترکہ سے حصہ نہیں ملتا تو اس کی اولاد کو بھی کچھ نہیں ملے گا۔ سہولت کے پیش نظر مرحوم کی جائیداد کو دو حصوں میں تقسیم کرلیا جائے ایک حصہ بیٹی کو اور دوسرا حصہ بھتیجے کو دے دیا جائے، یعنی 21 کنال میں سے دس کنال دس مرلے بیٹی کو اور دس کنال دس مرلے بھتیجے کو دے دیے جائیں۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے والد محترم وفات پاچکے تھے اور ان کے چار بچے، یعنی دو بیٹے اور دو بیٹیاں بقید حیات ہیں، جبکہ ایک بیٹی ان کی وفات سے پہلے فوت ہوچکی تھی۔ ان کی اولاد میں سے دو بیٹے اور دو بیٹیاں شادی شدہ موجود ہیں، کیا مرحوم کے ترکہ سے فوت شدہ بہن یا اس کی موجودہ اولاد کو کچھ حصہ ملے گا یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب وراثت کا ایک ضابطہ ہے کہ قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور والا رشتہ دار محروم ہوتا ہے، مثلاً: بیٹے کی موجودگی میں پوتا یا بیٹی کی موجودگی میں نواسہ یا نواسی محروم ہوگی۔ صورت مسئولہ میں مرحوم کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہی وارث ہوں گی۔ ان کی موجودگی

میں والد کی وفات سے پہلے فوت ہونے والی بیٹی یا اس کی موجودہ اولاد وارث نہیں ہو گی۔ ہاں، مرحوم وصیت کے ذریعے اپنے نواسے یا نواسیوں کو دے سکتا تھا اور وہ بھی کل جائیداد سے 1/3 تک جائز ہے اس کے علاوہ کسی صورت میں مرحوم کی جائیداد سے انہیں حصہ نہیں مل سکتا۔ مرحوم کی اولاد اگر چاہے تو انہیں کچھ دے سکتی ہے یہ ان کی اپنی صوابدید پر موقوف ہے واضح رہے کہ موجودہ پس ماندگان اس طرح جائیداد تقسیم کریں کہ لڑکے کو لڑکی سے دوگنا حصہ ملے۔ سہولت کے پیش نظر جائیداد کے کل چھ حصے کر لئے جائیں۔ دو، دو حصے فی لڑکا اور ایک، ایک فی لڑکی تقسیم کر دیا جائے۔ واضح رہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے ''پوتے کو وراثت اس وقت ملتی ہے جب بیٹا موجود نہ ہو۔'' پھر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ پوتا بیٹے کی موجودگی میں وارث نہیں ہوتا۔ [صحیح بخاری، کتاب الفرائض]

اسی طرح بیٹوں اور بیٹیوں کی موجودگی میں کسی بھی بیٹی کی اولاد محروم ہوتی ہے، خواہ وہ بیٹی زندہ ہو یا مرحوم سے پہلے فوت چکی ہو، لہٰذا نواسیاں نواسے اپنے نانا کی جائیداد کے کسی صورت میں حقدار نہیں ہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک شخص کی وفات کے وقت اس کے تین بھتیجے اور ایک نواسی زندہ تھی۔ وراثت اس کے بھتیجوں کو مل گئی، کافی عرصہ بعد اس کی نواسی نے عدالت میں دعویٰ کر دیا ہے کہ نانا کی وراثت میں میرا حق ہے۔ قرآن و حدیث کے مطابق بتایا جائے کہ نواسی کو کچھ حصہ ملتا ہے یا نہیں؟۔

جواب قرآن کریم کے ضابطۂ وراثت کے مطابق میت کی جائیداد کے سب سے پہلے حقدار وہ ورثا ہیں جن کے حصص قرآن یا حدیث میں مقرر ہیں جنہیں اصحاب الفروض کہا جاتا ہے۔ ان سے بچا ہوا ترکہ عصبات کو ملتا ہے۔ صورت مسئولہ میں نواسی نہ تو اصحاب الفروض سے ہے اور نہ ہی عصبات میں اس کا شمار ہوتا ہے بلکہ نواسی ذوی الارحام میں شامل ہے جو اصحاب الفروض اور عصبات کی عدم موجودگی میں وارث ہوتے ہیں۔ مرحوم کی وفات کے وقت اس کے بھتیجے زندہ تھے۔ ایسے حالات میں اس کی جائیداد کے وہ وارث ہیں کیونکہ ان کا شمار عصبات میں ہوتا ہے۔ ان کی موجودگی میں نواسی محروم ہے، لہٰذا اس کا عدالت میں دعویٰ کرنا درست نہیں ہے اور نہ ہی اسے مرحوم کی بیٹی کے قائم مقام سمجھ کر وراثت کا حقدار قرار دیا جا سکتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ ''حصے داروں کو حصہ دینے کے بعد میت کے قریبی مذکر رشتہ دار وارث بنتے ہیں۔''

اس حدیث کے پیش نظر بھتیجے قریبی مذکر رشتہ دار ہیں جو وراثت کے حقدار ہوں گے نواسی ان میں شامل نہیں ہے، اس بنا پر نانا کی جائیداد سے اس کا کوئی حق نہیں بنتا۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی بقید حیات ہے اور اس کے دو بیٹے بھی زندہ ہیں جبکہ اس کا ایک بیٹا اور بیٹی فوت ہو چکے ہیں ان فوت شدگان کی نرینہ اور مادینہ اولاد موجود ہے کیا اس آدمی کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں کی موجودگی میں اس کے پوتے، پوتیاں، نواسے اور نواسیاں اس کی جائیداد کے حقدار ہیں اگر ہیں تو وہ کس قدر حصہ پائیں گے؟۔

جواب اسلام کے نظام وراثت کا قاعدہ ہے کہ وفات کے وقت جو قریبی ورثا زندہ ہوں انہیں مرحوم کی جائیداد سے حصہ ملتا ہے اور جو رشتہ دار اس کی زندگی میں وفات پا چکے ہیں یا وفات کے وقت قریبی رشتہ دار موجود ہوں تو دور کی قرابت رکھنے والے محروم

ہوتے ہیں۔صورت مسئولہ میں جو بیٹا اور بیٹی وفات پا چکے ہیں وہ کسی صورت میں باپ کی جائیداد کے حقدار نہیں ہیں۔اس طرح اس کے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں بھی وراثت سے حصہ نہیں پائیں گے کیونکہ اس سے زیادہ قرابت رکھنے والے دو بیٹے موجود ہیں۔لہٰذا اگر باپ فوت ہو جائے تو موجودہ حالات کے پیش نظر صرف اس کے بیٹے وارث ہوں گے۔ [واللہ اعلم]

سوال میرے والد گرامی پچھلے دنوں ایک حادثہ میں فوت ہو گئے ہیں پس ماندگان میں سے ہماری والدہ ہم تین بھائی اور ایک بہن ہے والد کا ترکہ کیسے تقسیم ہوگا؟

جواب بشرط صحت سوال خاوند کے فوت ہونے کے بعد اگر اس کی اولاد موجود ہے تو بیوہ کو آٹھواں حصہ ملتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:''اور اگر تمہاری اولاد ہے تو بیویوں کے لئے آٹھواں حصہ ہے۔'' [۴/النسآء:۱۲]

بیوہ کو اس کا مقررہ حصہ دینے کے بعد باقی سات حصے مرحوم کی اولاد میں اس طرح تقسیم کئے جائیں گے کہ بیٹے کو بیٹی کے مقابلہ میں دگنا حصہ ملے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:''اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے متعلق حکم دیتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہوگا۔'' [۴/النسآء:۱۱]

سہولت کے پیش نظر مرحوم کے ترکہ کو آٹھ حصوں میں تقسیم کر دیا جائے ،ایک حصہ بیوہ کے لئے اور دو حصے ہر لڑکے کو پھر ایک حصہ لڑکی کو دے دیا جائے ،مثلاً:اگر کل ترکہ آٹھ لاکھ ہے تو ایک لاکھ بیوہ کو دو،دو لاکھ ہر بیٹے کو اور ایک لاکھ بیٹی کو ملے گا۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی نے دو عورتوں سے نکاح کیا لیکن کسی سے اولاد نہیں ہوئی ،سوئے اتفاق سے اس نے دونوں کو طلاق دے دی ،اس کی دکانیں اور مکان ہے اس کا کہنا ہے کہ زندگی بھر میں اس مکان میں رہائش رکھوں گا اور دکانوں کا کرایہ وصول کروں گا اس کے بعد کسی مدرسہ یا مسجد کے لئے وقف ہوں گی جبکہ اس کے بھائی اور بہنیں بقید حیات ہیں ،کیا شرعاً وہ ایسا کر سکتا ہے؟

جواب خاوند کا اپنی بیویوں کو اس بنا پر طلاق دینا تو صحیح نہیں ہے کہ ان سے کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی کیونکہ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں بلکہ ایسے معاملات سب اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔اس کا زندگی کے بعد کل ترکہ (مکان و دکانات) کا وقف کرنا بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ حدیث میں اس کی ممانعت ہے۔چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں ایک مالدار آدمی ہوں اور میری وارث صرف ایک بیٹی ہے تو کیا میں دو تہائی مال صدقہ کر دوں؟ آپ نے فرمایا''نہیں'' انہوں نے دوبارہ عرض کیا کہ میں اپنے مال کا نصف خیرات کر دوں ،آپ نے فرمایا:''نہیں'' انہوں نے تیسری مرتبہ عرض کیا تو کہا میں ایک تہائی مال صدقہ کر سکتا ہوں ،آپ نے فرمایا:''ہاں ،ایک تہائی صدقہ کر سکتے ہو،مگر ایک تہائی بھی بہت زیادہ ہے تیرا اپنے ورثا کو غنی چھوڑ جانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ تو ان کو محتاج چھوڑ جائے اور وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں وہ انہیں دیں یا نہ دیں۔'' [صحیح بخاری ،حدیث نمبر:۱۲۵۹]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ کاش!لوگ وصیت کو ثلث سے ربع تک کم کریں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ثلث بھی بہت زیادہ ہے۔ [صحیح بخاری ،الوصایا:۲۷۴۳]

سوال ایک عورت فوت ہوئی تو اس کے ورثا میں ایک بھائی اور ایک بہن ہے ایک بھائی اس کی زندگی میں ہی فوت ہو گیا

تھا اس فوت شدہ کی اولاد بھی اپنی پھوپھی کی جائیداد سے حصہ مانگتی ہے کیا بہن بھائی کی موجودگی میں بھتیجے وغیرہ بھی حصہ پاتے ہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب اسلامی ضابطہ وراثت کے مطابق مرحوم کی جائیداد کے تین حصے کر دیئے جائیں، ان میں دو بھائی کو اور ایک بہن کو دے دیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''(میت کلالہ ہونے کی صورت میں) اگر کوئی بہن بھائی، یعنی مرد اور عورتیں ملے جلے ہوں تو مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملے گا۔'' [۴/النساء:۱۷۶]

صورت مسئولہ میں مرنے والی عورت کلالہ ہے اس کا ایک بھائی اور ایک بہن ہے تو درج بالا شرح کے مطابق اس کی جائیداد کو تقسیم کر دیا جائے جو بھائی اس کی زندگی میں فوت ہو چکا ہے اسے یا اس کی اولاد کو مرحومہ کے ترکہ سے کچھ نہیں دیا جائے گا کیونکہ وراثت زندہ موجود لوگوں کو ملتی ہے اور اس کی اولاد اس لئے محروم ہے کہ قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں دور والے محروم رہتے ہیں۔ عورت کے ساتھ بہن بھائی کا رشتہ قریبی ہے ان کی موجودگی میں بھتیجے وغیرہ محروم ہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی فوت ہوا، پس ماندگان میں اس کے والدین اور دو بیٹے موجود ہیں اس کا ترکہ تین لاکھ روپے ہے یہ ترکہ کیسے تقسیم ہوگا؟

جواب اولاد کی موجودگی میں ماں اور باپ دونوں کو چھٹا چھٹا حصہ ملتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر میت کی اولاد بھی ہو تو والدین میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے۔'' [۴/النساء:۱۱]

اس صورت میں ماں اور باپ دونوں کا حصہ برابر ہوگا انہیں دینے کے بعد جو باقی بچے گا وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ دار کو دیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''جن ورثا کے حصے مقرر ہیں ان کا حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ داروں کو دیا جائے۔''

[صحیح بخاری، الفرائض:۶۷۳۵]

ماں اور باپ کو چھٹا چھٹا حصہ دینے کے بعد باقی 2/3 بیٹوں کو دیا جائے گا۔ سہولت کے پیش نظر جائیداد کو چھ حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ان میں سے ایک حصہ باپ اور ایک حصہ ماں کو دیا جائے باقی چار حصے بیٹوں کو دیے جائیں، یعنی پچاس ہزار باپ کو اور پچاس ہزار ماں کو۔ ایک لاکھ ایک بیٹے کو ایک لاکھ دوسرے بیٹے کو دیا جائے گا، اس تفصیل کے مطابق تین لاکھ روپے تقسیم کیے جائیں گے۔ [واللہ اعلم]

سوال زید نامی ایک شخص اپنے پیچھے دو بیٹے اور ایک بیٹی چھوڑ کر فوت ہوا، ان میں سے ایک لڑکے اور لڑکی کی شادی کر دی گئی، زید کی جائیداد تقسیم ہونے سے پہلے شادی شدہ بیٹا اور بیٹی کسی حادثہ میں لاولد فوت ہو گئے، اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ لڑکے کی بیوی اور لڑکی کے خاوند کو زید کی جائیداد سے کوئی حصہ ملے گا جبکہ لڑکے کی بیوی نے آگے شادی کر لی ہے قرآن وحدیث کے مطابق فتویٰ درکار ہے؟

جواب بشرط صحت سوال صورت مسئولہ میں لڑکے کی بیوی اور لڑکی کا خاوند براہِ راست زید کی جائیداد سے کوئی حصہ نہیں لے سکتے، البتہ زید کی وفات کے بعد اس کے بیٹے یا بیٹی کو جو حصہ ملے گا اس حصہ سے بیوی 1/4 اور خاوند 1/2 کا حقدار ہے جس کی تفصیل یوں ہے کہ زید کی جائیداد کے پانچ حصے بنا دیئے جائیں۔ دو حصے فی لڑکے اور ایک حصہ فی لڑکی کے حساب سے تقسیم کر دیا جائے گویا ایک لڑکے کو کل جائیداد کا 2/5 اور لڑکی کو کل جائیداد کا 1/5 ملے گا۔ اب بیوہ کو اپنے خاوند کے حصہ رسدی 2/5 سے چوتھائی حصہ دیا جائے گا اسی طرح خاوند کو اپنی بیوی کے حصہ رسدی 1/5 سے نصف دیا جائے گا چونکہ وراثت کی اصطلاح میں مسئلہ کا تعلق مناسخہ سے ہے جس میں تقسیم در تقسیم ہوتی ہے، اس لئے یہاں دو دفعہ تقسیم ہوگی جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

زید کی وفات کے بعد پہلی تقسیم اس طرح ہوگی کہ بیٹے کو بیٹی کے مقابلہ میں ڈبل حصہ دیا جائے گا، یعنی ہر بیٹے کو 2/5 اور بیٹی کو 1/5 دیا جائے۔ اس کے بعد شادی شدہ بیٹے اور بیٹی کا حصہ دوبارہ تقسیم ہوگا، اس سے بیوہ اور لڑکی کے خاوند کا حصہ نکال کر باقی دوسرے بیٹے کو مل جائے گا اس دوسری تقسیم کے دو اجزا ہیں:

(الف) بیٹے کا حصہ جو 2/5 ہے وہ بیوی اور بھائی کے درمیان تقسیم ہوگا۔ بیوہ کا حصہ 2/5 کا 1/4 = 2/20 ہے اور باقی 2/5-2/20=6/20 متوفی کے بھائی کو ملے گا۔ واضح رہے کہ بھائی کو اپنے باپ سے بھی 2/5 ملا تھا اور اب فوت شدہ بھائی کی جائیداد سے بیوہ کا حصہ نکالنے کے بعد 6/20 ملا ہے اس طرح اسے 14/20 ملا۔

(ب) بیٹی کا حصہ جو 1/5 ہے وہ اس کے خاوند اور بھائی کے درمیان تقسیم ہوگا۔ خاوند کا حصہ 1/5 کا 1/2=1/2 اور باقی 1/5-1/10=1/10 اس کے بھائی کو ملے گا۔ سہولت کے پیش نظر ہم زید کی جائیداد کے کل بیس حصے کریں گے جن سے آٹھ، آٹھ حصے دونوں بیٹوں اور چار حصے بیٹیوں کو دیے جائیں گے، پھر فوت شدہ بیٹے کے آٹھ حصوں سے چوتھائی حصہ بیوہ کا اور باقی چھ حصے اس کے بھائی کو ملیں گے۔ اسی طرح فوت شدہ بیٹی کے چار حصوں سے نصف، یعنی اس کے خاوند کو اور باقی دو بھائی کو ملیں گے گویا مرنے والے کی بیوی کو دو حصے مرنے والی کے خاوند کو دو حصے اور بیس حصوں سے باقی سولہ زید کے زندہ بیٹے کو ملیں گے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہماری ایک عزیزہ فوت ہوگئی ہے اس کی تین لڑکیاں اور چچا کی اولاد (لڑکے اور لڑکیاں) موجود ہیں۔ متوفیہ کی جائیداد سے کس کو کتنا حصہ ملے گا؟

جواب بشرط صحت سوال صورت مسئولہ میں مرحومہ کی جائیداد سے دو تہائی کی حقدار اس کی بیٹیاں ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اگر اولاد صرف لڑکیاں ہوں (یعنی دو یا) دو سے زیادہ تو کل ترکہ میں ان کا 2/3 ہے۔'' [۴/النسآء:۱۱]

لڑکیوں کو ان کا حصہ دینے کے بعد جو ایک تہائی 1/3 باقی ہے اس کی حقدار چچا کی نرینہ اولاد ہے۔ حدیث میں ہے کہ مقررہ حصے لینے والے ورثا سے جو ترکہ بچ جائے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ داروں کے لئے ہے۔ [صحیح بخاری، الفرائض:۶۷۳۲]

سوال میں ذکر کردہ ورثا میں چچا کی نرینہ اولاد ہی مذکر قریبی رشتہ دار ہے، لہٰذا بیٹیوں کو دینے کے بعد جو ترکہ باقی بچتا ہے وہ انہیں دے دیا جائے۔ سہولت کے پیش نظر میت کی کل منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کے نو حصے کر لئے جائیں، ان میں دو، دو حصے تینوں بیٹیوں اور باقی تین حصے چچا کی نرینہ اولاد کے لئے ہیں۔ چچا کی مادینہ اولاد، یعنی لڑکیوں کو اس سے کچھ نہیں ملے گا۔

واضح رہے کہ صورت مسئولہ میں ضابطہ وراثت اس وقت جاری ہوگا جب میت کی تجہیز و تکفین اور دفن کے اخراجات، نیز قرض کی ادائیگی ہو جائے اور اگر کوئی وصیت وغیرہ ہے تو اسے بھی کل جائیداد کے 1/3 سے پورا کر دیا جائے صورت مسئلہ میں بایں طور ہے۔ میت 9/

بیٹی	بیٹی	بیٹی	چچازاد نرینہ اولاد	چچازاد مادینہ اولاد
2	2	2	3	محروم

سوال اگر والدین اپنی اولاد کو کسی جائیداد کے متعلق وصیت کر جائیں اور اس میں بے انصافی اور حق تلفی کی گئی ہو، اولاد نافرمانی سے بچنے کے لئے اسے قبول کرلے تو کیا جن بچوں پر زیادتی ہوئی ہے وہ بذریعہ عدالت یا پنچائت اس کی تلافی کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں؟

جواب ہمارے ہاں عام طور پر وصیت کے متعلق افراط و تفریط سے کام لیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں بیشتر اوقات یہ کوتاہی دیکھنے میں آتی ہے کہ جو چیزیں وصیت کے قابل ہوتی ہیں انہیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''ایک مسلمان کے شایان شان نہیں کہ وہ کسی قابل وصیت کام کے متعلق وصیت کرنا چاہتا ہو، پھر دو رات بھی اس کے بغیر گزار دے، یعنی اس کے پاس ہر وقت وصیت لکھی ہونا چاہیے۔'' [صحیح بخاری، الوصیۃ: ۲۷۳۸]

چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہر وقت اپنی تحریری وصیت اپنے پاس رکھا کرتے تھے اور وصیت کے متعلق افراط بایں طور پر کیا جاتا ہے کہ جن ورثا کے لئے وصیت ناجائز ہوتی ہے ان کے لئے وصیت کا بندوبست کر دیا جاتا ہے یا جن کے لئے وصیت کرنا جائز ہے ان کے لئے شریعت کی قائم کردہ حد سے زیادہ وصیت کر دی جاتی ہے یا پھر وصیت بے انصافی اور ظلم پر مبنی ہوتی ہے۔ پھر لواحقین اس قسم کی ظلم پر مبنی وصیت کو ایسی پختہ لکیر خیال کرتے ہیں جسے مٹانا یا اس میں ترمیم کرنا ان کے ہاں کبیرہ گناہ ہے۔ حالانکہ اس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ہاں، جو شخص وصیت کرنے والے کی طرف سے جانب داری یا حق تلفی کا اندیشہ رکھتا ہو اگر وہ آپس میں ان کی اصلاح کر دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔'' [البقرہ: ۱۸۲]

خود رسول اللہ ﷺ نے بعض غلط وصایا کی اصلاح فرمائی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ایک انصاری کی کل جائیداد چھ غلام تھے۔ اس نے وصیت کے ذریعہ انہیں آزاد کر دیا۔ اس کے مرنے اور کفن و دفن کے بعد اس کے ورثا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حقیقت حال سے آپ کو آگاہ کیا تو آپ نے مرنے والے کو سخت برا بھلا کہا، پھر اس کی وصیت کو کالعدم کرتے ہوئے ان چھ غلاموں کے متعلق قرعہ اندازی کی چھ کا ایک تہائی، یعنی دو غلام آزاد کر دیے اور باقی چار ورثا کے حوالے فرما کر ان کے نقصان کی تلافی کر دی۔ [صحیح مسلم، الایمان: ۱۶۶۸]

دیگر روایات میں اس کے متعلق قول شدید کی وضاحت بھی ہے، چنانچہ آپ نے فرمایا: ''اگر ہمیں اس کی حرکت کا پہلے علم ہوتا تو ہم اس کی نماز جنازہ نہ پڑھتے۔'' [مسند امام احمد، ص: ۴۴۳، ج ۴]

بلکہ ایک روایت میں ہے کہ ''ہم اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کرتے۔'' [ابوداود، العتق: ۳۹۵۸]

ان احادیث کے پیش نظر ہمیں وصیت کے معاملہ میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔صورت مسئولہ میں وصیت کے متعلق جو کوتاہی کی گئی ہے لواحقین کو چاہیے کہ پنچائتی سطح پر اس کی اصلاح کی جائے تاکہ مرحوم کو اخروی باز پرس سے نجات ملے۔ناجائز وصیت کی اصلاح کرنا ضروری ہے اور یہ قرآن کریم کا ایک اہم ضابطہ ہے۔جس میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہم تین بھائیوں نے اپنے والد محترم کے ساتھ مل کر ایک قطعہ زمین خریدا تھا۔ہمارا چوتھا بھائی عرصۂ دراز سے بالکل الگ تھلگ رہتا ہے اور اس نے مذکورہ زمین کی خریداری میں کوئی پائی پیسہ بھی نہیں دیا تھا۔وہ بھی اس قطعہ زمین سے حصہ لینے کا دعویدار ہے۔والد کی وفات کے بعد شرعی طور پر اس زمین میں اس کا کتنا حصہ بنتا ہے، نیز ہماری دو بہنوں اور والدہ کا حصہ بھی بتا دیں؟

جواب باپ کے پاس رہنے والی اولاد کی کمائی باپ کی ہی شمار ہوتی ہے اِلَّا یہ کہ اولاد کا الگ حق ملکیت تسلیم کر لیا جائے۔ صورت مسئولہ میں قطعہ زمین خریدتے وقت تینوں بیٹے باپ کے ساتھ شراکت کے طور پر حصہ دار بنے ہیں، یعنی ان کا الگ حق ملکیت تسلیم کر لیا گیا ہے۔ایسی صورت حال کے پیش نظر اگر باپ کو ضرورت ہو تو وہ قطعہ زمین اپنے لئے رکھ سکتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے:''تو اور تیرا مال باپ کے لئے۔''لیکن باپ کی طرف سے اس قسم کی ضرورت کا اظہار کئے بغیر بھائی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس حدیث کی آڑ میں پورے قطعہ زمین سے اپنا حق لینے کا دعویٰ کرے۔وہ صرف اتنے حصے میں شریک ہوگا جو باپ کا حصہ رسدی ہے، مثلاً:اگر زمین خریدتے وقت باپ کا چوتھا حصہ تھا تو اس کا وہ بیٹا جو زمین خریدنے میں شریک نہیں ہوا صرف باپ کے چوتھے حصے میں دوسرے ورثا کے ساتھ شریک ہوگا۔اب باپ کی وفات کے بعد پس ماندگان میں اس کی بیوہ، دو بیٹیاں اور چار بیٹے ہیں، اس لئے باپ کی کل جائیداد سے بیوہ کو 1/8 اور باقی 7/8 بیٹے اور بیٹیاں اس طرح تقسیم کریں کہ ایک بیٹے کو بیٹی سے دوگنا ملے۔ سہولت کے پیش نظر متوفی کی کل جائیداد کے 80 حصے کر لئے جائیں۔ان میں آٹھواں حصہ، یعنی 10 حصے بیوہ کو دیے جائیں اور باقی 70 حصوں کو چودہ حصے فی لڑکا اور سات حصے فی لڑکی کے حساب سے تقسیم کر دیے جائیں۔

متوفی:80=بیوہ 10 لڑکا 14 لڑکا 14 لڑکا 14 لڑکا 14 لڑکی 7 لڑکی 7 [واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی فوت ہوا اس کی دو بہنیں اور دو بھتیجے زندہ ہیں اس کی اولاد یا والدین موجود نہیں ہیں اس کے ترکہ کی شرعی تقسیم کیا ہوگی؟

جواب اگر کسی فوت ہونے والے کے والدین یا اولاد میں سے کوئی زندہ نہ ہو تو اسے کلالہ کہا جاتا ہے۔اس کے ترکہ کے متعلق شرعی ہدایات یہ ہیں کہ اگر اس کی ایک حقیقی بہن ہے تو اسے کل جائیداد سے نصف ملے گا اگر دو یا دو سے زیادہ بہنیں ہوں تو انہیں دو تہائی ملتا ہے۔قرآن مجید میں اس کی صراحت ہے۔ [۴/النساء:۱۷۶]

صورت مسئولہ میں فوت ہونے والے کی دو بہنیں ہیں، لہٰذا انہیں فوت ہونے والے کی جائیداد سے دو تہائی دیا جائے گا اور باقی ایک تہائی اس کے دو بھتیجوں میں تقسیم ہوگی، جیسا کہ حدیث میں ہے:''مقررہ حصہ لینے والوں سے جو حصہ بچ جائے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ دار کو دیا جائے۔'' [صحیح بخاری، الفرائض:۶۷۳۲]

متروکہ جائیداد کے کل چھ حصے کر لئے جائیں دو، دو حصے دو بہنوں کو دیے جائیں پھر باقی دو حصوں کو برابر برابر بھتیجوں پر تقسیم کر دیا جائے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی فوت ہوا، اس کی ایک بیٹی، ایک حقیقی بہن اور ایک چچازاد بھائی ہے ان کے علاوہ اور کوئی وارث نہیں ہے فوت ہونے والے کی جائیداد کیسے تقسیم ہوگی؟

جواب بیٹی کو مرحوم کی کل جائیداد سے نصف حصہ دیا جائے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر (مرنے والے کی) صرف ایک ہی لڑکی ہو تو اس کا نصف حصہ ہے۔'' [۴/النساء:۱۱]

حقیقی بہن اور چچازاد بھائی کے متعلق مختلف احادیث میں ہے کہ بہنوں کو بیٹیوں کے ہمراہ عصبہ بناؤ، یعنی بیٹی کی موجودگی میں بہن عصبہ مع الغیر ہے اور اسے بیٹی سے بچا ہوا ترکہ دیا جائے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس موقف سے اختلاف کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ بیٹی کو نصف دینے کے بعد باقی دوسرے عصبہ کو دیا جائے اگر کوئی عصبہ نہیں ہے تو باقی نصف بھی بیٹی کو دے دیا جائے اور بہن کو کسی صورت میں کچھ نہ دیا جائے۔ [فتح الباری،ص:۳۰، ج۱۲]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ مقررہ حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ داروں کو دیا جائے۔ [صحیح بخاری، حدیث نمبر:۶۷۳۲]

اس حدیث کا تقاضا ہے کہ بیٹی کو اس کا حصہ دینے کے بعد باقی نصف چچازاد بھائی کو دیا جائے، اب ہم نے وجوہ ترجیح کی بنیاد پر ایک کو حصہ دینا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وراثت میں عام طور پر یہ اصول ہے کہ قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں دور کے رشتہ دار محروم ہوتے ہیں۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں میت کے ساتھ اس کی بہن کا رشتہ چچازاد بھائی کے اعتبار سے قریبی ہے، اس لئے بہن کو عصبہ قرار دے کر اسے وارث بنایا جائے اور چچازاد کو محروم کیا جائے گا۔دوسری وجہ ترجیح یہ ہے کہ وراثت کا قاعدہ ہے کہ جب بہن عصبہ مع الغیر ہوتی ہے تو اسے بھائی کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے، یہ بہن ہر رشتہ دار کو محروم کر دیتی ہے جسے بھائی محروم کرتا ہے۔اس ضابطہ کے مطابق بھی چچازاد بھائی محروم ہے کیونکہ حقیقی بھائی کی موجودگی میں چچازاد بھائی محروم ہوتا ہے جب بھائی اسے محروم کرتا ہے تو بہن جو عصبہ مع الغیر ہونے کی حیثیت سے بھائی کے قائم مقام ہے وہ کیوں محروم نہ کرے گی۔اس بنا پر ہمارے نزدیک صورت مسئولہ میں نصف بیٹی کو دے کر باقی نصف حقیقی بہن کو دیا جائے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے، میاں بیوی خود بھی حیات ہیں شرعی اعتبار سے جائیداد کی تقسیم کیسے ہوگی؟

جواب سوال میں اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی کہ کس کی جائیداد کو تقسیم کرنا ہے، پھر زندگی میں یا مرنے کے بعد جائیداد تقسیم کرنے کا مسئلہ درپیش ہے۔قارئین کرام سے گزارش ہے کہ وہ وراثت کے سوالات خوب واضح کر کے لکھا کریں، زندگی میں انسان اپنی جائیداد کے متعلق خود مختار ہے۔اپنی ضروریات کے لئے جتنی جائیداد چاہیے صرف کر دے اس سے کوئی باز پرس نہ ہوگی۔البتہ اپنی اولاد میں تقسیم کرنے کے لئے مساوات کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔اس مساوات میں مرد و زن کی بھی تفریق نہیں ہے، یعنی لڑکوں اور لڑکیوں میں برابر برابر تقسیم ہوگی۔صورت مسئولہ میں بیوی کو صوابدیدی حصہ دے کر باقی جائیداد کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا

جائے، تین لڑکوں اور ایک لڑکی کو ایک حصہ دے دیا جائے، اگر بعد از موت تقسیم جائیداد کا مسئلہ ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں:

(الف) باپ کی وفات کے وقت اگر مذکورہ اولاد زندہ ہو تو ان میں جائیداد تقسیم اس طرح ہوگی کہ بیوی کا آٹھواں حصہ نکالنے کے بعد بقیہ سات حصے اولاد میں یوں تقسیم کر دیے جائیں کہ لڑکے کو دو دو حصے اور لڑکی کو ایک حصہ دیا جائے، یعنی کل جائیداد کو آٹھ حصوں میں تقسیم کر لیا جائے ایک حصہ بیوہ کے لئے دو دو حصے فی لڑکے اور ایک حصہ لڑکی کو دے دیا جائے۔

(ب) ماں کی وفات کے وقت اگر مذکورہ اولاد زندہ ہو تو جائیداد تقسیم اس طرح ہوگی کہ خاوند کا چوتھا حصہ نکالنے کے بعد باقی تین حصے اولاد میں اس طرح تقسیم کر دیے جائیں کہ لڑکے کو لڑکی کے حصہ سے دوگنا ملے۔ صورت مسئولہ میں سہولت کے پیش نظر جائیداد کے کل 28 حصے کر لئے جائیں ان کا 1/4 یعنی سات حصے خاوند کو، پھر چھ چھ حصے ہر لڑکے کو اور تین حصے لڑکی کو دیے جائیں۔

پہلی تقسیم :8/ بیوہ (1) لڑکا (2) لڑکا (2) لڑکا (2) لڑکی (1)=8

دوسری تقسیم :8/ خاوند (7) لڑکا (6) لڑکا (6) لڑکا (6) لڑکی (3)=28 [واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی فوت ہوا اس کی تین بیویاں تھیں متوفی کی اولاد بھی ہے، کیا ہر ایک بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا یا وہ تمام آٹھویں حصہ کو تقسیم کریں گی نیز ایک بیوی نے آگے نکاح کر لیا ہے کیا اسے بھی حصہ دیا جائے گا؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب خاوند کے ترکہ کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تمہاری اولاد ہے تو ان بیویوں کا آٹھواں حصہ ہے۔''

[۴/النسآء:۱۲]

یعنی تمام بیویاں آٹھویں حصے کو آپس میں تقسیم کریں گی ہر ایک کو آٹھواں آٹھواں حصہ نہیں دیا جائے گا، اس طرح اگر کسی بیوی نے عدت گزارنے کے بعد آگے نکاح کر لیا ہے تو اسے فوت شدہ خاوند کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ نکاح کرنا اس کا حق ہے جو اس نے حاصل کر لیا ہے۔ اسے فوت شدہ خاوند کی جائیداد سے بھی حصہ ملنا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی فوت ہوا پس ماندگان میں اس کی تین لڑکیاں، بھائی اور بھتیجے زندہ ہیں ان میں ترکہ کیسے تقسیم ہوگا؟

جواب بشرط صحت سوال میں مرنے والے کی جائیداد سے تین لڑکیوں کو دو تہائی ملے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر اولاد میں صرف لڑکیاں ہوں اور وہ دو سے زائد ہوں تو ان کا ترکہ سے دو تہائی حصہ ہے۔'' [۴/النسآء:۱۱]

لڑکیوں کا حصہ دینے کے بعد باقی ترکہ اس کے بھائی کو مل جائے گا اور بھتیجے وغیرہ محروم ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''مقررہ حصہ دینے کے بعد جو بچ جائے اس کا حق دار قریب ترین رشتہ دار ہے۔'' [صحیح بخاری، الفرائض:۶۷۳۲]

کل جائیداد کے نو حصے کر لئے جائیں، دو تہائی، یعنی چھ حصے بیٹیوں کے ہیں، یعنی ہر ایک کو دو دو حصے دیئے جائیں اور باقی تین حصے بھائی کو ملیں گے چونکہ بھتیجوں کا رشتہ بھائی کی نسبت دور کا ہے، اس لئے بھائی کی موجودگی میں انہیں محروم ہونا ہوگا۔ [واللہ اعلم]

سوال بیوہ، خاوند کی جائیداد تقسیم ہونے سے پہلے آگے نکاح کر لیتی ہے، کیا اس صورت میں وہ پہلے خاوند کی جائیداد سے حصہ لے گی؟

جواب بیوہ کو عدت وفات گزارنے کے بعد عقد ثانی کی اجازت ہے۔ اس دوران خاوند کی جائیداد کو تقسیم کر دینا چاہیے۔ اگر کسی وجہ سے جائیداد تقسیم نہیں ہوتی ہے تو عقد ثانی کرنے سے اس کا پہلے خاوند کی جائیداد سے حصہ ختم نہیں ہو جاتا ہے اگر خاوند کی اولاد ہے تو اسے کل جائیداد سے آٹھواں حصہ اگر اولاد نہیں ہے تو بیوہ چوتھے حصہ کی حقدار ہے۔ عقد ثانی اس کے وراثتی حصہ پر اثر انداز نہیں ہوگا، ایسی باتیں جہلاء کی پھیلائی ہوئی ہیں۔

سوال ہم چھ بھائی اور چار بہنیں ہیں، ایک بہن اور دو بھائیوں کا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔ ہمارے والد فوت ہو چکے ہیں جبکہ والدہ بقید حیات ہیں۔ واضح رہے کہ ہمارا ایک بھائی والد مرحوم کی زندگی میں فوت ہو چکا تھا، اس کے تین بچے ہیں۔ قرآن وحدیث کے مطابق والد مرحوم کی وراثت کیسے تقسیم ہوگی موجودہ جائیداد کی تفصیل کچھ اس طرح ہے، ایک بیٹا والد کی زندگی میں اپنا الگ کاروبار کرتا تھا، اس نے بیوی کا زیور بیچ کر ایک مکان خریدا جس کی موجودہ مالیت 35 لاکھ ہے، اسے والد نے ایک دکان بھی دی اس کی مالیت تقریباً ساٹھ لاکھ ہے۔ دو بیٹے والد کے ساتھ کاروبار کرتے تھے، ایک بیٹے کو 35 لاکھ کا مکان لے کر دیا جو والد کی زندگی میں فوت ہو گیا، دوسرے بیٹے کو ساڑھے آٹھ لاکھ کا مکان دیا جس کی موجودہ مالیت 30 لاکھ ہے۔ والد مرحوم نے اپنی زندگی میں دو دکانیں اور ایک گودام مزید خریدا تھا۔ ہماری والدہ نے ایک مکان کے دو حصے کر کے آدھا حصہ ایک بیٹے کو دوسرا نصف مرحوم بیٹے کی اولاد کو دے دیا۔ اس کی مالیت بھی 80 لاکھ ہے اور دوسری دکان ایک دوسرے بیٹے کو دے دی جس کی مالیت 45 لاکھ ہے اس کے پاس 30 لاکھ مالیت کا مکان بھی موجود ہے۔ والدہ نے ایک پلاٹ جو والد کی ملکیت تھا اپنے تیسرے بیٹے کو دے دیا جس کی مالیت 2 لاکھ ہے والد کا خریدا ہوا گودام 28 لاکھ میں فروخت ہوا۔ اس سے پانچ لاکھ والد مرحوم کا قرضہ اتارا اور 1/2-7 لاکھ اپنی بہو کو دے دیا کیونکہ بیٹے کا ذہنی توازن درست نہیں، باقی 1/2-15 لاکھ اپنی بیٹی کو دینے کا ارادہ ہے، ہمارے والد کے ترکہ کی تقسیم شریعت کے مطابق کیسے ہوگی؟

جواب تقسیم جائیداد سے قبل چند ایک باتوں کا بتانا ضروری ہے۔

① جو بیٹا والد کی زندگی میں فوت ہوا ہے اسے اور اس کی اولاد کو باپ کی جائیداد سے کچھ نہیں ملے گا، اس لئے والد کا ترکہ پانچ بیٹوں اور چار بیٹیوں میں تقسیم ہوگا۔

② والد کو اپنی زندگی میں کمی بیشی کے ساتھ جائیداد دینے کی شرعاً ممانعت ہے، اس لئے اس نے اپنی زندگی میں جس کو جو جائیداد دی ہے وہ کالعدم ہے۔ سب جائیداد کو اکٹھا کر کے ازسرنو تقسیم کرنا ہوگا۔ یاد رہے کہ والد نے اپنے بیٹے کو مشترکہ کاروبار سے 35 لاکھ روپے کا جو مکان دیا تھا اور وہ اس کی زندگی میں فوت ہو گیا مذکورہ مکان کی مالیت متروکہ جائیداد میں شمار ہوگی۔

③ والدہ کو بھی یہ اختیار نہیں تھا کہ وہ اپنے مرحوم شوہر کے ترکہ کو اپنی مرضی سے تقسیم کرے، اس لئے اس کی تقسیم بھی کالعدم ہے۔ حتی کہ جو نصف دکان جس کی مالیت 80 لاکھ ہے۔ اپنے مرحوم بیٹے کی اولاد کو دی ہے وہ بھی باپ کے ترکہ میں شامل ہوگی۔

④ جس بیٹے نے اپنی بیوی کا زیور بیچ کر مکان خریدا جس کی موجودہ مالیت 35 لاکھ روپے ہے، وہ باپ کے ترکہ میں شامل نہیں ہوگا کیونکہ وہ بیٹا والدین سے الگ تھا اور اپنا علیحدہ کاروبار کرتا تھا اور اس نے اپنی بیوی کے زیورات بیچ کر مکان خریدا تھا۔

⑤ نقد رقم 15,50,000 (ساڑھے پندرہ لاکھ) جو والدہ نے اپنی بیٹیوں کو دینے کے ارادہ سے اپنے پاس رکھی ہے، اسے بھی باپ کے ترکہ میں جمع کیا جائے گا۔کل ترکہ سے 5 لاکھ منہا کیا جائے گا جو قرضے کی حد میں قرض خواہ کو دیا گیا ہے۔اس طرح باپ کا قابل تقسیم ترکہ چار کروڑ روپے ہے۔بیوہ کا 1/8 ہے جو کل جائیداد سے آٹھواں حصہ پچاس لاکھ بنتا ہے۔باقی ساڑھے تین کروڑ اولاد میں اس طرح تقسیم کیا جائے گا کہ ایک لڑکے کو لڑکی سے دگنا ملے گا۔چونکہ پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں، اس لئے بیوی کا حصہ نکالنے کے بعد باقی ترکہ کو چودہ حصوں میں کیا تو ایک حصہ پچیس لاکھ ہے جو ایک لڑکی کا حصہ ہے۔اس سے دگنا حصہ، یعنی پچاس لاکھ ایک لڑکے کو ملے گا۔تفصیل اس طرح ہوگی:

بیوی کا حصہ: پچاس لاکھ روپے۔

چار لڑکیوں کا حصہ: ایک کروڑ فی لڑکی پچیس لاکھ روپے۔

پانچ لڑکوں کا حصہ: دو کروڑ پچاس لاکھ روپے فی لڑکا پچاس لاکھ روپے۔

میزان: 4 کروڑ روپے۔

نوٹ: مرحوم نے اپنے بیٹے مرحوم کی اولاد کے متعلق کوئی وصیت نہیں کی ہے، ہمدردی کے طور پر مذکورہ ورثا اگر ان یتیم بچوں کو کچھ دینا چاہیں تو اس پر کوئی پابندی نہیں بلکہ ان کے ساتھ ہمدردی کرنا ضروری ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے ہاں ماموں کو جو اپنے والدین، یعنی ہمارے نانا اور نانی کی طرف سے جائیداد ملی تھی، اس سے بہن، یعنی ہماری والدہ کو حصہ نہیں دیا گیا جبکہ وہ جائیداد کی تقسیم کے وقت زندہ تھی کیا ہم اپنے ماموں سے اپنی والدہ کے حصہ کا مطالبہ کر سکتے ہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب مردوں اور عورتوں کے حصہ کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''مردوں کے لئے اس مال سے حصہ ہے جو والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں (اسی طرح) عورتوں کے لئے بھی اس مال سے حصہ ہے جو والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں، خواہ یہ ترکہ تھوڑا یا زیادہ ہو ہر ایک کا طے شدہ حصہ ہے''۔ [۴/النسآء:۷]

عرب معاشرے میں عورتوں کو جائیداد سے حصہ دینے کا دستور نہ تھا بلکہ عورت خود ورثہ شمار ہوتی تھی۔اس آیت کریمہ کی رو سے اللہ تعالیٰ نے عورت کو اس ذلت کے مقام سے نکال کر وراثت میں حصہ دار بنایا ہے لیکن ہم لوگ اس صنف نازک کو محروم کر کے دور جاہلیت کی طرف پلٹ رہے ہیں۔صورت مسئولہ میں سائل کے نانا، نانی کے ترکہ سے جہاں اس کے ماموں کو حصہ ملا ہے اس میں والدہ بھی شریک ہے اگر ماموں نے اپنی بہن کو زندگی میں اسے والدین کے ترکہ سے محروم رکھا ہے تو بھانجے کو حق ہے کہ وہ اس سے اپنی والدہ کے حصہ کا مطالبہ کرے۔یہ اس کا قانونی اور شرعی حق ہے جو کسی صورت میں ساقط نہیں ہو سکتا۔

سوال ایک آدمی کی دو بیویاں ہیں پہلی بیوی سے ایک بیٹی اور دوسری سے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔وہ آدمی فوت ہو چکا ہے۔اس کی جائیداد 31 کنال رقبہ ہے۔اس میں تمام ورثا شریک ہیں۔دوسری بیوی جس سے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی ہے اسے اپنے والد کی طرف سے 20 کنال زمین ملی ہے، اب دونوں بیویاں فوت ہو چکی ہیں کیا پہلی بیوی کی بیٹی کو دوسری بیوی کی جائیداد

سے حصہ مل سکتا ہے؟ اسی طرح اس کے دو سوتیلے بھائی بھی فوت ہو چکے ہیں جو کہ مرحوم کی دوسری بیوی سے ہیں، کیا ان کی جائیداد سے سوتیلی بہن کو کچھ مل سکتا ہے اگر حصہ ملے گا تو کتنا؟ کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب وراثت کے لئے ضروری ہے کہ مرحوم اور اس کے پسماندگان کے درمیان کوئی خونی یا سسرالی رشتہ ہو جبکہ صورت مسئولہ میں پہلی بیوی کا دوسری بیوی سے کوئی خونی یا سسرالی رشتہ نہیں ہے، اس لئے سوتیلی بیٹی اپنی سوتیلی ماں کی جائیداد سے کچھ نہیں حاصل کر سکتی، اس طرح پہلی بیوی کی بیٹی کا دوسری بیوی کی اولاد سے خونی رشتہ ہے کیونکہ وہ پدری بہن بھائی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے وارث بن سکتے ہیں بشرطیکہ حقیقی بہن بھائی موجود نہ ہوں۔ صورت مسئولہ میں دوسری بیوی کے بطن سے جو اولاد پیدا ہوئی ہے ان میں سے دو بیٹے فوت ہوئے ہیں اور اس کے تین بیٹے اور ایک بیٹی زندہ ہے۔ فوت ہونے والے بھائیوں کی جائیداد صرف حقیقی بہن بھائیوں کو ملے گی جو 2:1 کی نسبت سے اسے تقسیم کریں گے، یعنی بھائی کو بہن سے دگنا حصہ دیا جائے گا۔ البتہ سوتیلی بہن جو صرف باپ کی طرف سے ہے وہ ان حقیقی بہن بھائیوں کی موجودگی میں محروم ہوگی، مختصر یہ ہے کہ پہلی بیوی کی بیٹی کو اپنی سوتیلی ماں اور سوتیلے بھائیوں سے کچھ نہیں ملے گا۔ [واللہ اعلم]

سوال میرا ایک حقیقی چچا ہے جس کی اولاد نہیں، اس کی سات بہنیں ہیں جو ہماری پھوپھیاں ہیں۔ ہمارے چچا ہمارے ساتھ ہی رہتے ہیں اور ہم اس کی ہر طرح سے خدمت کرتے ہیں چچا نے تمام رقبہ جو اس کے نام تھا میرے نام لگوا دیا ہے، جس کے لئے ہم تقریباً چالیس ہزار روپیہ خرچ کر چکے ہیں۔ ہماری پھوپھیوں نے بھی اپنے بھائی سے ملنے والا حصہ زبانی طور پر مجھے دے دیا ہے، اس کی شرعی حقیقت واضح کریں؟

جواب کسی کے فوت ہونے کے وقت جو رشتہ دار زندہ ہوں انہیں مرحوم کی جائیداد سے حصہ دیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ وراثت کے اسباب بھی موجود ہوں اور وہاں کوئی مانع، یعنی رکاوٹ نہ ہو۔ صورت مسئولہ میں کسی کو علم نہیں ہے کہ کس نے پہلے موت کا لقمہ بننا ہے، اس لئے موجودہ صورت حال کے پیش نظر بطور وراثت جائیداد تقسیم کرنا صحیح نہیں ہے۔ اگر چچا پہلے فوت ہو جائے تو اس کے حقیقی ورثا سات بہنیں اور سائل، یعنی حقیقی بھتیجا ہے۔ اگر پھوپھیوں نے برضا و رغبت کسی قسم کے دباؤ کے بغیر اپنا حصہ سائل کو دیدیا ہے جو چچا کے فوت ہونے کی صورت میں انہیں ملنا تھا تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ لیکن معاشرتی طور پر ہم اسے بہتر نہیں سمجھتے کیونکہ پھوپھیوں کی اولاد بھی ہوگی۔ ان کا پیٹ کاٹنا کسی صورت میں صحیح نہیں ہے، اس لئے جب انہیں حقیقتاً حصہ مل جائے تو پھر انہیں تصرف کرنے کا پورا پورا اختیار ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے ہاں ایک آدمی فوت ہوا، پس ماندگان میں دو بیویاں، چھ لڑکے اور سات لڑکیاں موجود ہیں، اس نے اپنی زندگی میں جائیداد لگوادی جبکہ کچھ لڑکے اس کی زندگی میں برسر روزگار تھے، انہیں کچھ نہیں دیا گیا، باضابطہ طور پر انہیں الگ نہیں کیا گیا تھا برسر روزگار بیٹوں نے کچھ جائیداد ذاتی طور پر بنائی ہے۔ ان حالات کے پیش نظر چند ایک سوالات کا جواب مطلوب ہے:

☆ مرحوم کی دونوں بیویاں اور اولاد کے اس کے ترکہ سے کیا حصص ہوں گے۔

☆ کیا باپ کو اپنی زندگی میں کسی بیٹے کو کچھ دینے کا اختیار ہے اگر ہے تو اس کا ضابطہ کیا ہے۔

☆ کیا باپ اپنے کسی نافرمان بیٹے کو اپنی جائیداد سے عاق کرسکتا ہے۔

☆ کیا باپ کے فیصلے کو اس کے مرنے کے بعد کالعدم کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔

☆ اگر باپ کی زندگی میں اس کے بچے کاروبار کرتے ہیں تو ان کی کمائی سے حاصل شدہ جائیداد کی کیا حیثیت ہوگی، کیا اسے باپ کے ترکے میں شمار کیا جائے گا یا اسے اس کے ترکے سے الگ رکھا جائے گا، کتاب و سنت کی روشنی میں ان کا جواب مطلوب ہے؟

جواب مندرجہ بالا سوالات کے جوابات بالترتیب حسب ذیل ہیں:

☆ دونوں بیویوں کو اس کی منقولہ غیر منقولہ جائیداد سے آٹھواں حصہ ملے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر اولاد ہو تو بیویوں کے لئے اس کے ترکے سے 1/8 ہے۔'' [۴/النسآء:۱۲]

بیویوں کو حصہ دے کر جو باقی بچے اسے اولاد میں اس طرح تقسیم کردیا جائے کہ ایک لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ ملے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ تعالیٰ اولاد کے متعلق حکم دیتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہوگا۔'' [۴/النسآء:۱۱]

سہولت کے پیش نظر مرحوم کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کے 152 حصے کرلئے جائیں، ان میں سے 152 کا 1/8 یعنی 19 حصے دونوں بیویوں میں تقسیم کردیے جائیں اور باقی 133 حصے اس طرح تقسیم ہوں گے کہ 14,14 حصے فی لڑکا اور 7,7 حصے فی لڑکی کو دیے جائیں، یعنی ایک لڑکے کو ایک لڑکی کے مقابلہ میں دوگنا حصہ ملے۔

دونوں بیویوں کے حصے: 19۔

چھ لڑکوں کے حصے: 14×6=84۔

سات لڑکیوں کے حصے: 7×7=49۔

میزان: 152 کل جائیداد۔

☆ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں خود مختار بنا کر بھیجا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جس طرح چاہے استعمال کرسکتا ہے۔ مال بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت ہے، اس میں بھی تصرف کرنے کا پورا پورا حق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''ہر مالک اپنے مال میں تصرف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہے، وہ اس حق کو جیسے چاہے استعمال کرسکتا ہے۔'' [بیہقی ص:۱۷۸، ج۶]

(ا) اس تصرف کا ضابطہ یہ ہے کہ یہ تصرف کسی ناجائز اور حرام کے لئے نہ ہو۔

(ب) جائز تصرف کرتے وقت کسی شرعی وارث کو محروم کرنا مقصود نہ ہو۔

(ج) اگر یہ تصرف بطور ہبہ ہے تو نرینہ اولاد کے ساتھ مساویانہ سلوک پر مبنی ہو۔

(د) اگر یہ تصرف بطور وصیت عمل میں آئے تو کسی صورت میں 1/3 سے زیادہ نہ ہو اور نہ ہی کسی شرعی وارث کے لئے وصیت کی گئی ہو۔

صورت مسئولہ میں باپ کو چاہیے تھا کہ جائیداد دیتے وقت تمام اولاد بیٹوں اور بیٹیوں کو برابر برابر جائیداد دیتا، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کو اس کے والد نے ایک غلام بطور عطیہ دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر گواہ بنانا چاہا

تو آپ نے فرمایا: ''کیا تو نے دوسرے بیٹوں کو بھی اس قدر عطیات دیئے ہیں۔'' اس نے عرض کیا نہیں، آپ نے فرمایا: ''اس عطیہ سے رجوع کرلو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اولاد میں عدل وانصاف کیا کرو۔'' [صحیح بخاری، الھبہ: ۲۵۸۶]

ایک روایت میں ہے کہ ''اگر میں عطیہ کے سلسلہ میں برتری دینا چاہتا تو عورتوں کو برتری دیتا۔'' [بیہقی ص: ۱۷۷، ج۶]

اس لئے حدیث کے پیش نظر باپ کا یہ اقدام غلط ہے کہ وہ کسی ایک بیٹے کے نام جائیداد لگوادے اور دوسروں کو اس سے محروم کردے۔

☆ انسان کو اللہ تعالیٰ نے یہ حق نہیں دیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ قانون وراثت کو پامال کرتے ہوئے کسی نافرمان بیٹے کو اپنی جائیداد سے محروم کردے، اخبارات میں ''عاق نامہ'' کے اشتہارات اللہ تعالیٰ کے ضابطہ وراثت کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''مردوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور رشتے داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور رشتے داروں نے چھوڑا ہو، خواہ وہ مال تھوڑا ہو یا زیادہ لیکن اس میں یہ حصہ اللہ کی طرف سے مقرر ہے۔'' [۴/النسآء: ۷]

اس آیت کے پیش نظر کسی وارث کو بلاوجہ شرعی وراثت سے محروم نہیں کیا جاسکتا، احادیث میں بھی اس کی وضاحت ملتی ہے۔ فرمان نبوی ہے کہ ''جو کسی کی وراثت ختم کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے مقرر کی ہے اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی وراثت ختم کردیں گے۔'' [شعب الایمان بیہقی ص: ۱۱۵، ج۱۴]

اگر بیٹا نافرمان ہے تو وہ اس نافرمانی کی سزا قیامت کے دن اللہ کے ہاں ضرور پائے گا لیکن والد کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اسے جائیداد سے محروم کردے، ایسا کرنے سے انسان کی عاقبت کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔

☆ اگر باپ نے اپنی زندگی میں کوئی غلط فیصلہ کیا ہے تو اسے مرنے کے بعد توڑا جاسکتا ہے بلکہ اسے کالعدم کرکے اس کی اصلاح کرنا ضروری ہے، یہ کوئی پختہ لکیر نہیں ہے جسے مٹانا کبیرہ گناہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ہاں جو شخص وصیت کرنے والے کی طرف سے جانب داری یا حق تلفی کا اندیشہ رکھتا ہو اگر وہ آپس میں ان کی اصلاح کردے، تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔'' [۲/البقرہ: ۱۸۲]

خود رسول اللہ ﷺ نے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے غلط فیصلوں کی ان کے مرنے کے بعد اصلاح فرمائی ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ ایک انصاری صحابی کی کل جائیداد چھ غلام تھے، اس نے وصیت کے ذریعے ان سب کو آزاد کردیا، اس کے مرنے اور کفن ودفن کے بعد اس کے شرعی ورثا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حقیقت حال سے آپ کو آگاہ کیا تو آپ نے مرنے والے کو سخت برا بھلا کہا، پھر اس کی وصیت کو کالعدم کرتے ہوئے، ان چھ غلاموں کے متعلق قرعہ اندازی کی جنہیں بذریعہ وصیت آزاد کردیا تھا، 6 کا 1/3 یعنی دو غلام آزاد کردیے اور باقی چار ورثا کے حوالے کرکے ان کے نقصان کی تلافی کردی۔ [صحیح مسلم، الایمان: ۱۶۶۸]

دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس شخص کے متعلق فرمایا: ''اگر ہمیں اس کی حرکت کا پہلے علم ہوجاتا تو ہم اس کی نماز جنازہ ہی نہ پڑھتے۔'' [مسند امام احمد ص: ۴۴۳، ج۴]

بلکہ ایک روایت میں ہے کہ ہم اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کرتے۔ [ابوداؤد، العتق:۳۹۵۸]

ان احادیث کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ باپ نے اگر زندگی میں حقوق العباد کے سلسلہ میں کوئی غلط اقدام کیا تھا تو اس کے مرنے کے بعد کالعدم کیا جاسکتا ہے اوراس میں مناسب ترمیم کر کے کتاب وسنت کے مطابق کرنا ضروری ہے۔ مرحوم کے ساتھ ہمدردی کا بھی یہی تقاضا ہے کہ اس کے غلط اقدام کو برقرار رکھ کر اس کے بوجھ کو زیادہ وزنی نہ بنائیں بلکہ اس کی اصلاح کر کے اس کی عاقبت کو سنوارنے کی فکر کی جائے۔

☆ اولاد کی دو حیثیتیں ہیں ایک یہ ہے کہ وہ باپ کے ساتھ ہی کاروبار میں شریک ہوتی اوراس کے ساتھ ہی ایام زندگی گزارتی ہے اس صورت میں باپ کے پاس رہنے والی اولاد کی کمائی باپ کی ہی شمار ہوتی ہے کیونکہ حدیث میں ہے: ''تو اور تیرا مال سب تیرے باپ کے لئے ہے۔'' [مسند امام احمد، ص۲۰۴ ج۲]

ایسے حالات میں کسی بیٹے کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ چالو کاروبار سے کچھ رقم پس انداز کر کے اپنی الگ جائیداد بنالے، اگر ایسا کیا گیا ہے تو ایسی جائیداد کو باپ کی جائیداد سمجھتے ہوئے اس کے ترکے میں شمار کرنا ہوگا۔ ہاں، اگر اولاد کا حق ملکیت تسلیم کرلیا جائے تو اولاد میں کسی کو الگ جائیداد بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے یا کوئی ملازمت پیشہ بیٹا اپنے باپ سے کہہ دے کہ میری اس رقم سے آپ نے میرے لئے کوئی پلاٹ یا مکان خریدنا ہے، ایسے حالات میں اس کی خریدی ہوئی جائیداد کو بیٹے کی جائیداد سمجھا جائے گا اوراسے باپ کے ترکے میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اگر کسی بیٹے نے قرض وغیرہ پکڑ کر پراپرٹی خریدی یا مکان بنایا ہے تو مکان یا پلاٹ کو باپ کے ترکے میں شامل کرتے وقت اس قرضہ کو مشترکہ جائیداد سے منہا کرنا ہوگا۔ اولاد کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ کوئی بیٹا شادی شدہ ہے باپ نے باضابطہ طور پر اسے الگ کردیا ہے اب وہ خود محنت کرتا ہے اوراپنے گھر کا نظام بھی خود چلاتا ہے باپ کے ذمے اس کا کوئی بوجھ نہیں ہے ایسی صورت میں اگر وہ بیٹا کوئی مکان یا پلاٹ یا جائیداد بناتا ہے تو اسے باپ کے ترکہ میں شمار نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس کا الگ حق ملکیت تسلیم کرلیا گیا ہے، ایسے حالات میں باپ اس کے لین دین کا بھی ذمہ دار نہیں ہے۔

آخر میں ہم اس بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ حقوق العباد کا معاملہ بہت ہی نازک ہے۔ قیامت کے دن اس کی معافی نہیں ہوگی، اپنی نیکیاں دے کر اور دوسروں کی برائیاں اپنے کھاتے میں ڈال کر اس کی تلافی کی جائے گی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ہم قیامت کے دن انصاف پر مبنی ترازو قائم کریں گے اس بنا پر کسی کی کچھ بھی حق تلفی نہ ہوگی اوراگر کسی کا، رائی کے دانے کے برابر بھی ظلم ہوا تو وہ بھی سامنے لایا جائے گا اور ہم حساب لینے کے لئے کافی ہیں۔'' [۲۱/الانبیاء:۴۷]

یہ دنیا کا مال ومتاع دنیا میں رہ جائے گا، اس کی خاطر اپنی آخرت کو برباد نہ کیا جائے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ہفت روزہ اہل حدیث شمارہ نمبر:24 کے احکام ومسائل میں آپ نے لکھا ہے کہ پوتا اپنے دادا کی جائیداد سے محروم رہتا ہے۔ آپ کا جواب شکوک شبہات کا باعث ہے۔ یعنی آدمی کا بیٹا فوت ہوجائے۔ فوت ہونے والے کی چھوٹی اولاد بھی ہو۔ ایسے حالات میں بیوہ اور یتیم اولاد کو وراثت سے محروم کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ اسلام کی حقانیت سے انکار ممکن نہیں، لیکن یہاں اسلام

نے یتیموں اور بیواؤں کے حق کو کیوں ساقط کر دیا ہے جبکہ دوسرے مذاہب یتیم پوتوں کو حق دیتے ہیں اور انہیں کسی صورت میں محروم نہیں کرتے۔ مہربانی فرما کر مفصل جواب دیں؟

جواب بندہ مسلم کی شان یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام بجالاتا ہے اور سمع و اطاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو اسلام کے حوالے کر دیتا ہے۔ دین اسلام دیگر ادیان کے مقابلہ میں، اس لئے بلند و برتر ہے کہ اس میں اعتدال کا حسن ہے۔ درج ذیل سوال میں سطحی جذبات کے پیش نظر اسلام کی حقانیت کو چیلنج کیا گیا ہے، حالانکہ جس قدر یتیموں کے حقوق کا خیال دین اسلام کی تعلیمات میں ہے دیگر ادیان میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ اس تمہیدی گزارش کے بعد واضح ہو کہ اسلام نے میراث کے سلسلہ میں اقربا کے فقر واحتیاج اور ان کی بے چارگی کو بنیاد نہیں بنایا؟ جیسا کہ یتیم پوتے کے متعلق سوال میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ مستقبل میں مالی معاملات کے متعلق ذمہ داری کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اگر اس سلسلہ میں کسی کا محتاج اور بے بس ہونا بنیاد ہوتا تو ارشاد باری تعالیٰ بایں الفاظ نہ ہوتا کہ ''مذکر کے لئے دو مونث کے برابر حصہ ہے۔'' بلکہ اس طرح ہوتا کہ مونث کے لئے دو مذکر کے برابر حصہ ہے کیونکہ لڑکے کے مقابلہ میں لڑکی مال و دولت کی زیادہ حاجت مند ہے اور اس بے چارگی کے سبب میت کے مال سے اسے زیادہ حقدار قرار دیا جانا چاہیے تھا۔ اسی طرح شوہر کو زوجہ کی اولاد نہ ہونے پر نصف جائیداد کا مستحق قرار دیا گیا ہے جبکہ زوجہ کو شوہر کی اولاد نہ ہونے کی صورت میں ایک چوتھائی کا حقدار ٹھہرایا گیا ہے، حالانکہ حاجت مندی، بے چارگی، عدم کسب معاش اور نسوانی وصف کا تقاضا تھا کہ شوہر کے لئے ایک چوتھائی اور بیوی کے لئے نصف مقرر ہوتا۔ ان حقائق کا واضح مطلب ہے کہ وراثت میں حاجت مند ہونا یا عدم اکتساب یا بے چارگی قطعاً ملحوظ نہیں ہے۔ موجودہ دور میں وراثت کے متعلق جس مسئلہ کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے وہ میت کی اپنی حقیقی اولاد موجود ہونے کے باوجود یتیم پوتے، پوتی، نواسے اور نواسی کی میراث کا مسئلہ ہے، یعنی دادا یا نانا کے انتقال پر اس کے اپنے بیٹے کے موجود ہوتے ہوئے اس کے مرحوم بیٹے یا بیٹی کی اولاد دادا یا نانا کے ترکہ سے میراث پانے کی مستحق ہے یا نہیں، اس مسئلہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ کے زمانہ سے لے کر بیسویں صدی تک کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا کہ دادا یا نانا کے انتقال پر اگر اس کا کوئی بیٹا موجود ہو تو اس کے دوسرے مرحوم بیٹے یا بیٹی کی اولاد کو کوئی حصہ نہیں ملے گا، اس مسئلہ میں نہ صرف اہل سنت کے مشہور فقہی مذاہب، حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنبلیہ، نیز شیعہ، امامیہ و زیدیہ اور ظاہریہ سب متفق ہیں، بلکہ غیر معروف ائمہ فقہا کا بھی کوئی قول اس کے خلاف منقول نہیں، البتہ حکومت پاکستان نے ۱۹۶۱ء میں مارشل لا کے ذریعے ایک آرڈیننس جاری کیا جس کے تحت یہ قانون نافذ کر دیا گیا کہ اگر کوئی شخص مر جائے اور اپنے پیچھے ایسے لڑکے یا لڑکی کی اولاد کو چھوڑ جائے جو اس کی زندگی میں فوت ہو چکا ہو تو مرحوم یا مرحومہ کی اولاد دیگر بیٹوں کی موجودگی میں اس حصے کو پانے کی مستحق ہوگی جو ان کے باپ یا ماں کو ملتا اگر وہ اس شخص کی وفات کے وقت موجود ہوتے۔ پاکستان میں اس قانون کے خلاف شریعت ہونے کے متعلق عظیم اکثریت نے دوٹوک فیصلہ کر دیا تھا کہ یہ قانون امت مسلمہ کے اجتماعی نقطۂ نظر کے خلاف ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں ہے:

''اللہ تعالیٰ تمہیں اولاد کے متعلق حکم دیتا ہے کہ مذکر کے لئے اس کا حصہ دو مونث کے حصہ کے برابر ہے۔'' [۴/النساء:۱۱]

اس آیت کریمہ میں اولاد، ولد کی جمع ہے جس کے معنی جننے کے ہیں۔ جو جنے ہوئے معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن ولد کے

معنی دو طرح مشتمل ہیں

① ایک حقیقی جو بلا واسطہ جنا ہوا ہو، یعنی بیٹا اور بیٹی۔

② دوسرے مجازی جو کسی واسطہ سے جنا ہوا ہو، یعنی پوتا اور پوتی۔

بیٹیوں کی اولاد نواسی اور نواسے اس کے مفہوم میں شامل نہیں ہیں کیونکہ نسب باپ سے چلتا ہے، اس بنا پر نواسہ اور نواسی لفظ ولد کی تعریف میں شامل نہیں ہیں۔ یہ بھی ایک مسلمہ اصول ہے کہ جب تک حقیقی معنی کا وجود ہوگا مجازی معنی مراد لینا جائز نہیں ہے، یعنی لفظ ولد کے حقیقی معنی بیٹا یا بیٹی کی موجودگی میں پوتا اور پوتی وغیرہ مراد نہیں لیے جاسکیں گے، لہٰذا آیت کریمہ کا مطلب یہ ہوا کہ بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتے پوتی کا کوئی حق نہیں ہے وہ پوتا پوتی زندہ بیٹے سے ہوں یا مرحوم بیٹے سے، امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

''امت کے اہل علم کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حق تعالی کے مذکورہ ارشاد میں حقیقی اولاد مراد ہے اور نہ اس میں اختلاف ہے کہ پوتا حقیقی بیٹے کے ساتھ اس میں داخل نہیں ہے اور نہ اس میں اختلاف ہے کہ اگر حقیقی بیٹا موجود نہ ہو تو مراد بیٹوں کی اولاد سے۔ بیٹیوں کی نہیں، لہٰذا یہ لفظ صلبی اولاد کے لئے ہے اور جب صلبی نہ ہو تو بیٹے کی اولاد کو شامل ہے۔'' [احکام القرآن، ص:٦٩، ج٢]

پھر احادیث میں ہے کہ وراثت کے مقررہ حصے ان کے حقداروں کو دو، پھر جو بچے وہ میت کے سب سے قریبی مذکر رشتہ دار کے لئے ہے۔ [صحیح بخاری، الفرائض:٦٧٣٢]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے مقرر حصے لینے والوں کے بعد وہ وارث ہوگا جو میت سے قریب تر ہوگا، چنانچہ بیٹا پوتے سے قریب تر ہے، اس لئے پوتے کے مقابلے میں بیٹا وارث ہوگا۔

شریعت نے وراثت کے سلسلہ میں اقرب فالاقرب کے قانون کو پسند فرمایا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے کہ ''ہر ایک کے لئے ہم نے موالی بنائے ہیں، اس ترکہ کے جسے والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں۔'' [٤/النسآء:٣٣]

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور والا رشتہ دار محروم ہوگا، لہٰذا بیٹے کی موجودگی میں پوتا وراثت سے حصہ نہیں پائے گا۔

البتہ اسلام نے اس مسئلہ کا حل بایں طور پر فرمایا ہے کہ مرنے والے کو چاہیے کہ وہ اپنے یتیم پوتے، پوتیوں، نواسے، نواسیوں و دیگر غیر وارث حاجت مند رشتہ داروں کے حق میں مرنے سے پہلے اپنے ترکہ سے 1/3 کی وصیت کر جائے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:

''تم پر یہ فرض کر دیا گیا ہے کہ اگر کوئی اپنے پیچھے مال چھوڑے جا رہا ہے تو موت کے وقت اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لئے وصیت کرے، یہ پرہیز گاروں پر فرض ہے۔'' [٢/البقرۃ:١٨٠]

چونکہ حدیث کے مطابق وارث رشتہ دار کے لئے وصیت جائز نہیں ہے، اس لئے والدین کے لئے وصیت جائز نہیں ہے، البتہ دیگر رشتہ دار جو محتاج اور لاچار ہیں ان کے لئے وصیت کرنا ضروری ہے اگر کوئی یتیم پوتے، پوتیوں کے موجود ہوتے ہوئے دیگر غیر وارث افراد یا کسی خیراتی ادارہ کے لئے وصیت کرتا ہے تو حاکم وقت کو اختیار ہونا چاہیے کہ وہ حاجت مند یتیم پوتے، پوتیوں

کے حق میں اس وصیت کو نافذ قرار دے، ہاں، اگر دادا نے اپنی زندگی میں یتیم پوتے، پوتیوں کو بذریعہ ہبہ ترکہ کا کچھ حصہ پہلے ہی دے دیا ہو تو اس کی وصیت کالعدم قرار دینے کے بجائے اس کو نافذ کر دیا جائے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال لالہ موسیٰ سے بواسطہ ذیشان خریداری نمبر: ۵۶۹۵ قاضی محمد خاں کا ایک سوال اہل حدیث مجریہ ۵ ستمبر ۲۰۰۳ شمارہ نمبر ۳۶ میں شائع ہوا تھا کہ میری بیوی فوت ہوگئی ہے، اس کے نہ والدین زندہ ہیں نہ ہی اس کی کوئی اولاد ہے۔ صرف اس کا خاوند اور تین حقیقی بہنیں زندہ ہیں، اس کی جائیداد کیسے تقسیم ہوگی، ہم نے اس کے جواب میں لکھا تھا کہ صورت مسئولہ کلالہ کی ایک صورت ہے چونکہ اولاد نہیں، اس لئے خاوند کو اس کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے نصف ملے گا اور تین حقیقی بہنوں کو کل جائیداد سے 2/3 دیا جائے گا۔ تقسیم میں سہولت کے پیش نظر ہم نے لکھا تھا کہ کل جائیداد کے چھ حصے کر لئے جائیں، نصف، یعنی تین حصے خاوند کو اور دو تہائی یعنی چار حصے تینوں بہنوں کو دیئے جائیں چونکہ چھ حصوں سے ورثا کو ملنے والا سہام زیادہ ہیں، اس لئے یہاں عول ہوگا اس لئے کل جائیداد کے چھ حصے کے بجائے سات حصے کر لئے جائیں۔ ان سات حصوں میں سے تین خاوند کو باقی چار بہنوں کو مل جائیں گے۔ آخر میں یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ جائیداد کی تفصیلی تقسیم محکمہ مال، یعنی پٹواری کے ذمے ہے۔ وراثت کے فتویٰ میں صرف حصوں کا تعین کیا جاتا ہے تقسیم کا عمل مفتی کے ذمے نہیں ہے۔ ادارہ ''اہل حدیث'' کی وساطت سے ہمیں ایک خط موصول ہوا جس میں قاضی محمد خان لکھتے ہیں کہ ''میرے حق وراثت کے سوال پر جو مشورہ دیا گیا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کی مخالفت کرتا ہے، نیز یہ مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اس میں بڑی محنت درکار ہے۔ اسے عول یا پٹواریوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا ہے۔ الیٰ آخرہ

جواب ہم نے سوال کا جواب قرآن پاک کی آیات کے حوالہ سے دیا تھا ہمارے نزدیک ہر مسئلہ ہی بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے، اس لئے سوالات کے جواب میں محنت بھی کی جاتی ہے اور احساس ذمہ داری بھی ہوتا ہے کیونکہ ہمارے نزدیک مفتی کا منصب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نیابت میں رہتے ہوئے سوالات کے جواب دیتا ہے۔ اس مختصر وضاحت کے بعد کچھ ملاحظات پیش خدمت ہیں:

① پرچہ ''اہل حدیث'' کوئی کاروباری میگزین نہیں ہے کہ اس سے دنیاوی منفعت ہوتی ہو، بلکہ دنیاوی لحاظ سے دینی جرائد خسارے میں رہتے ہیں، البتہ دینی لحاظ سے یہ مفاد ضرور ہوتا ہے کہ ان سے دین اسلام کی سربلندی اور اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت مقصود ہوتی ہے۔ شاید سوالات کے جواب کے لئے خریداری نمبر کی پابندی بھی اس لئے ہے کہ اس کے خریدار زیادہ ہوں لیکن یہ بات اخلاقی لحاظ سے صحیح نہیں ہے کہ دوسروں کے خریداری نمبر کا سہارا لے کر سوالات پوچھے جائیں۔ ویسے بھی سوال و جواب کے کالم میں خریدار یا غیر خریدار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے جواب دیے جاتے ہیں۔

② عول کا سہارا مجبوراً لیا جاتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے عول کا حکم دیا تھا۔ ان کے زمانے میں ایک ایسی صورت واقع ہوئی کہ اصحاب الفروض کے سہام ترکہ کی اکائی سے زیادہ تھے، جیسا کہ موجودہ صورت مسئولہ میں ہے۔ آپ نے کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا۔ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے عول کا مشورہ دیا، جس سے صحابہ نے اتفاق فرمایا، ان میں حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم جیسے مجتہدین صحابہ کرام شامل تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت ابن

عباس رضی اللہ عنہما نے عول کے مسئلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متفقہ مسئلہ میں اختلاف رائے کیا۔ اگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مخالفت مشہور نہ ہوتی تو عول کے مسئلہ پر اجماع قطعی کا حکم لگا دینا یقینی ہو جاتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عول کی ضرورت کو بایں الفاظ بیان فرمایا: ''مجھے قرآن کریم سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مقرر حصہ لینے والوں میں سے کون قابل تقدیم ہے، کون قابل تاخیر تاکہ مقدم کو پہلے اور مؤخر کو بعد میں کر دیا جائے، اس لئے انہوں نے تمام اصحاب الفروض کے درمیان یکسانیت پیدا کرنے کے لئے عول کا طریقہ جاری فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک خاوند قوی حق دار ہے، اس لئے اسے پورا پورا حصہ دیا جائے اور بہنیں کمزور حصہ دار ہیں ان کے حصوں میں کمی کی جائے۔ صورت مسئولہ میں مسئلہ چھ سے بنتا ہے لیکن سہام سات ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک خاوند کو کل جائیداد سے نصف، یعنی 1/2 دے دیا جائے اور بہنوں کے چار حصوں سے ایک حصہ کم کر کے انہیں صرف تین حصے دیے جائیں۔ اس طرح عول کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا موقف، اس لئے درست نہیں ہے کہ تمام مقرر کردہ حصہ لینے والے حقدار جو کسی درجہ میں جمع ہوں ازروئے استحقاق برابر ہیں اور کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ چونکہ سب کا استحقاق بذریعہ قرآن کریم نازل ہوا ہے، لہٰذا سب کا استحقاق برابر ہو گا اور ہر شخص اپنا اپنا پورا حصہ لے گا اور اگر سب حصص موجود نہ ہوں، جیسا کہ موجودہ صورت میں ہے تو سب کے حصوں میں برابر کمی کی جائے گی اور عول کے ذریعے سے جو مخرج بڑھایا جاتا ہے اس کی وجہ سے جو نقصان عائد ہو وہ تمام مستحقین پر بقدر تناسب پھیلا دیا جائے۔ یہی راجح ہے اور اسی پر امت کا عمل ہے، البتہ شیعہ حضرات نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے موقف سے اتفاق کرتے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر جملہ حصص کی میزان جائیداد کی اکائی سے متجاوز کر جائے تو اس اضافہ کو بیٹیوں اور بہنوں کے حصص سے منہا کر دیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ صورت مسئولہ میں قاضی محمد خان کو بھی اس لئے اختلاف ہے کہ خاوند ہونے کی حیثیت سے ان کے حصہ میں عول کی وجہ سے معمولی سی کمی واقع ہوئی ہے، دلوں کے حالات تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ بظاہر قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ باقی پٹواریوں کا حوالہ اس لئے دیا گیا کہ جائیداد اگر زمین کی شکل میں ہو تو ہر وارث کو کتنی کنال یا مرلے یا کتنی سرسائیاں ملیں گیں اس تقسیم کی ذمہ داری مفتی پر نہیں ہے کیونکہ اس نے علم وراثت پڑھا ہے محکمہ مال کے کورس نہیں کئے ہیں، لہٰذا ہم نے فتویٰ میں جو مشورہ دیا ہے اس میں اللہ کی کسی حد کو نہیں توڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ حق سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ [واللہ اعلم]

سوال میرے ایک دوست کی شادی تقریباً تین سال پہلے ہوئی، اب وہ فوت ہو چکا ہے اور اس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ پس ماندگان میں سے بیوہ اور اس کا ایک بڑا بھائی ہے، واضح رہے کہ لڑکی کا سامان جہیز لڑکی کے پاس ہے اب اس کی جائیداد اور سامان جہیز کے جائز حقدار کون ہیں اور اس کی تقسیم کا کیا طریق کار ہے؟

جواب واضح رہے کہ والدین شادی کے موقع پر جہیز کی صورت میں جو کچھ اپنی بچی کو دیتے ہیں وہ شرعاً اور عرفاً لڑکی کا حق ہے اور اس کی ملکیت ہوتا ہے اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ شادی کے بعد وہ سامان خاوند کی ملکیت نہیں بن جاتا، لہٰذا خاوند کی وفات کے بعد سامان جہیز کو وراثت کے طور پر تقسیم نہیں کیا جائے گا۔ صورت مسئولہ میں متوفی کی جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ کے حقدار صرف

اس کی بیوی اور بڑا بھائی ہے۔ بیوہ کو 1/4 ملے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو تمہاری بیویوں کا اس میں چوتھا حصہ ہے''۔ [۴/النسآء:۱۲]

بیوہ کا حصہ نکالنے کے بعد باقی رقم 3/4 اس کے بڑے بھائی کا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ''مقررہ حصہ لینے والوں سے جو جائیداد بچ جائے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ دار کے لئے ہے۔'' [صحیح بخاری، الفرائض:۶۷۳۲]

اس لئے بیوہ کو اس کا مقرر حصہ، یعنی 1/4 دے کر باقی جائیداد 3/4 اس کے بڑے بھائی کے حوالے کر دی جائے۔

صورت مسئولہ یوں ہوگی:

میت/4 بیوہ:1 بھائی:3۔ [واللہ اعلم]

سوال میرے بھائی نے اپنی بیوی کو طلاق دی، وہ ابھی عدت گزار رہی تھی کہ بھائی کا کسی حادثہ کی وجہ سے انتقال ہو گیا اب لڑکی والے بھائی کی جائیداد سے اس کی مطلقہ بیوی کا حق وراثت طلب کرتے ہیں، کیا ایسی عورت اپنے خاوند کی جائیداد سے وراثت لے سکتی ہے؟

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ جس عورت کو طلاق دی جائے وہ دوران عدت اپنے خاوند کی بیوی ہی شمار ہوتی ہے اسی وجہ سے کہ عدت کے اندر اندر خاوند کو اس سے نکاح کے بغیر رجوع کرنے کا پورا پورا حق ہے اگر طلاق دینے سے ہی نکاح ٹوٹ جائے تو دوران عدت نکاح کے بغیر رجوع صحیح نہیں ہونا چاہیے، اسی طرح اگر وہ دوران عدت فوت ہو جائے تو خاوند کو اس کی جائیداد سے حصہ ملتا ہے۔ صورت مسئولہ میں اس کا خاوند اس وقت فوت ہوا جبکہ اس کی مطلقہ بیوی ابھی عدت کے ایام پورے کر رہی تھی۔ اس لئے وہ اپنے خاوند کی شرعاً حقدار ہے اگر خاوند کی اولاد نہیں ہے تو اسے 1/4 بصورت دیگر 1/8 کی حقدار ہے اس بنا پر لڑکی والوں کو خاوند کی جائیداد سے اس کی مطلقہ بیوی کا حصہ رسدی لینے کا پورا پورا حق ہے۔

واضح رہے کہ اب اس عورت کو از سر نو عدت وفات گزارنا ہوگی جو چار ماہ دس دن ہے اور اگر حاملہ ہے تو حمل جنم دینے کے بعد اسے آگے نکاح کرنے کی اجازت ہوگی۔ [واللہ اعلم]
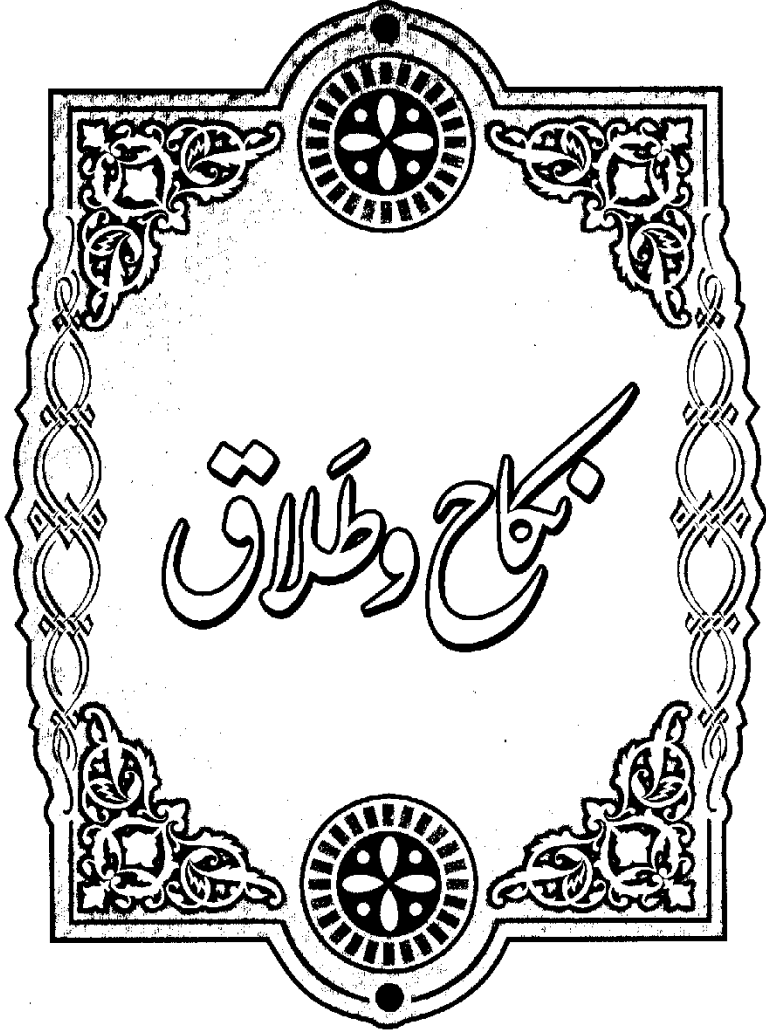
نکاح وطلاق

نکاح وطلاق

سوال میرا گھر میں اپنی بیوی سے جھگڑا ہوا، میں نے اپنی پھوپھی سے اس کا تذکرہ کیا تو اس نے کہا کہ تم اسے طلاق دے دو، میں اپنی لڑکی سے تیرا نکاح کر دیتی ہوں، انہوں نے خود طلاق نامہ لکھوایا اور اس پر میرے دستخط کرانے کے بعد اصل مجھے دے دی اور اس کی فوٹو کاپی اپنے پاس رکھ لی، جب میں واپس آیا تو سوچا کہ میری طرف سے یہ زیادتی ہے، میں نے اس تحریر کو پھاڑ کر پھینک دیا اور گھر میں بیوی خاوند کی حیثیت سے زندگی گزارتا رہا، پھر میرا نکاح پھوپھی زاد سے ہوگیا، کسی وجہ سے میرا اس سے جھگڑا ہوا تو انہوں نے چھ سال بعد طلاق نامہ کی فوٹو کاپی کے ذریعے مجھے خاندان میں بدنام کرنا شروع کر دیا ہے، اب مجھے بتایا جائے کہ اس پرانی فوٹو کاپی کی شرعاً حیثیت کیا ہے جبکہ اصل میں نے خود پھاڑ دی تھی اور اسے کالعدم قرار دے دیا تھا؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں میری راہنمائی کریں؟

جواب صورت مسئولہ کے متعلق دو تین امور کی وضاحت کرنا ضروری ہے:

☆ طلاق ہمارے معاشرے کا بہت نازک مسئلہ ہے لیکن ہم اس کے متعلق انتہائی غیر ذمہ دار واقع ہوتے ہیں۔ طلاق کا انتہائی اقدام کرنے سے پہلے قرآن کریم کی ہدایت کے مطابق تین چار اقدامات کرنا ہوتے ہیں لیکن ہم انہیں عمل میں لائے بغیر معمولی جھگڑے کو بنیاد بنا کر طلاق دے ڈالتے ہیں، جسے شریعت نے پسند نہیں کیا ہے۔ سائل کا گھر میں اپنی بیوی سے معمولی اختلاف ہوا، ردعمل کے طور پر فوراً طلاق تک نوبت پہنچ گئی۔

☆ اپنی بیٹی یا بہن کے رشتہ کی پیشکش کرتے ہوئے پہلی بیوی کو طلاق دینے کا مطالبہ کرنا انتہائی گھٹیا حرکت ہے۔ حدیث میں اس کی سخت ممانعت آئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی عورت کے لئے جائز نہیں کہ وہ نکاح سے قبل اپنی (دینی) بہن کی طلاق کا مطالبہ کرے تاکہ جو کچھ اس کے برتن میں ہے اسے انڈیل دے اسے وہی کچھ ملے گا جو اس کے مقدر میں ہے۔''

[صحیح بخاری، النکاح: ۵۱۵۲]

یہ ایسی شرط ہے جس کا نکاح جیسے معاملات میں جواز نہیں ہے۔ صورت مسئولہ میں اس حدیث کی بھی خلاف ورزی کی گئی ہے۔

☆ نکاح کے بعد طلاق دینا خاوند کا اختیار ہے اس کے لئے بیوی کو اطلاع دینا ضروری نہیں ہے۔ زبانی طلاق دینا یا تحریر کر دینا کافی ہے اس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے، یعنی خاوند کو جو اللہ تعالیٰ نے بیوی کو تین طلاق دینے کا اختیار دیا ہے ایسا کرنے سے ایک اختیار استعمال کر بیٹھتا ہے۔ صورت مسئولہ میں خاوند نے ایک اختیار استعمال کر لیا ہے۔

☆ طلاق کے بعد رجوع کا اختیار بھی خاوند کو حاصل ہے بشرطیکہ دوران عدت ہو، اس کے لئے بیوی کی رضامندی ضروری نہیں، صورت مسئولہ میں خاوند کا اپنی بیوی کے ساتھ تعلقات زن وشوئی قائم کرنا رجوع ہی کی ایک صورت ہے۔ طلاق نامہ کو اپنی مرضی سے پھاڑنا بھی رجوع ہے، اگر یہ واقعات حقیقت پر مبنی ہیں تو خاوند نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر اس سے رجوع کر لیا ہے، اس رجوع کے بعد اگر کسی دوسرے کے پاس اصل طلاق نامہ کی فوٹو کاپی ہے تو اس کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اسے استعمال کرنا کوئی

حیثیت نہیں رکھتا۔ الغرض صورت مسئولہ میں ایک طلاق ہو چکی ہے اور اس سے رجوع بھی صحیح ہے۔ دوسری بیوی کے سسرال کا طلاق نامہ کی فوٹو کاپی استعمال کرنا اور رشتہ داروں میں اسے بدنام کرنا شرعاً ناجائز ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال میرے خاوند نے مجھے طلاق دی، پھر میرے کہنے پر وہ دوران عدت ملتا رہا، باہمی ملاقات اس طرح ہوتی رہی کہ وظیفہ زوجیت کے علاوہ سب کچھ ہوتا رہا، جو میاں بیوی میں ہوتا ہے ایک دوسرے کے جسم کو ہاتھ لگانا اور بوس و کنار کرنا یہاں تک کہ بے لباس بھی ہو جانا، لیکن اس دوران میرا خاوند مجھے یہ بھی کہتا رہا، کہ میرا رجوع کا ارادہ نہیں ہے صرف آپ کی خوشی کے لئے ایسا کر رہا ہوں۔ کیا شریعت کی نظر میں طلاق کے بعد ایسے تعلقات سے رجوع ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی فرمائیں۔

جواب طلاق کے بعد رجوع کرنا خاوند کا حق ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ان کے خاوند دوران عدت انہیں لوٹا لینے کا زیادہ حق دار ہیں اگر ان کا ارادہ اصلاح کا ہو۔'' [۲/البقرہ: ۲۲۸]

اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ جب کوئی آزاد شخص اپنی آزاد بیوی کو پہلی یا دوسری رجعی طلاق دے تو وہ اس سے رجوع کرنے کا زیادہ حق دار ہے، خواہ عورت اسے ناپسند ہی کیوں نہ کرتی ہو۔ [مغنی، ص: ۵۴۷، ج ۱۰]

اور رجوع قول اور عمل دونوں سے ہو سکتا ہے، یعنی گفتگو اور کلام وغیرہ سے کہے کہ میں اپنی بیوی سے رجوع کرتا ہوں یا اپنی بیوی سے جماع اور ہم بستری کرے۔ فقہا کی اکثریت نے ہم بستری سے رجوع کی صورت میں نیت اور ارادہ کو ضروری قرار نہیں دیا ہے جبکہ امام مالک اور اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں کہ ہم بستری کے ذریعے اس وقت رجوع ہوگا جب اس کی نیت ہو بصورت دیگر رجوع نہیں ہوگا۔ ہمارے نزدیک جماع کی صورت میں رجوع کی صحت کے لئے ارادہ کی شرط لگانا صحیح نہیں ہے۔ لیکن صورت مسئولہ میں وظیفہ زوجیت کے علاوہ بیوی سے بوس و کنار یا ایک دوسرے کے جسم کو ہاتھ لگانا سے رجوع ہو سکے گا یا نہیں، اس میں اختلاف ہے، امام احمد فرماتے ہیں کہ بیوی سے بوس و کنار کرنا، اسے شہوت سے ہاتھ لگانا یا اس کی شرمگاہ کو دیکھنا اور بغل گیر ہونا یہ رجوع کے لئے کافی نہیں ہے جب تک وہ عملاً جماع نہ کرے۔ [مغنی، ص: ۵۶۰، ج ۱۰]

جبکہ احناف کا موقف ہے کہ بیوی سے بوس و کنار اور شہوت کے ساتھ ہاتھ لگانا رجوع ہے، اسی طرح شرمگاہ کو دیکھ لینا بھی رجوع ہے۔ [احکام القرآن للقرطبی، ص: ۱۵۸، ج ۱۸]

ان حضرات کا کہنا ہے کہ مذکورہ امور رجوع کے مترادف ہیں کیونکہ خاوند اسے بیوی خیال کر کے ہی ایسا کرتا ہے لیکن ہمارے نزدیک وظیفہ زوجیت کے علاوہ مذکورہ امور رجوع کے لئے کافی نہیں ہیں اور یہ کہنا کہ خاوند اسے بیوی خیال کر کے یہ امور سر انجام دیتا ہے۔ رجوع کے لئے کافی نہیں ہیں کیونکہ دوران عدت مطلقہ بیوی ہی رہتی ہے، خواہ خاوند مذکورہ امور سر انجام دے یا نہ دے۔ یہی وجہ ہے کہ بیوی خاوند میں سے اگر کوئی دوران عدت فوت ہو جائے تو زندہ رہنے والے کو مرنے والے کا وارث بنایا جاتا ہے اور اس کے ترکہ سے اسے حصہ دیا جاتا ہے۔

لیکن صورت مسئولہ میں تو خاوند یہ امور سر انجام دینے کے باوجود برملا کہتا ہے میرا قطعی طور پر رجوع کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ صرف بیوی کو خوش رکھنے کے لئے یہ کام کئے ہیں۔ بہرحال ہمارے نزدیک مذکورہ امور رجوع کے لئے کافی نہیں ہیں، اگر

بیوی خاوند نے انہیں رجوع خیال کر کے اکٹھا رہنا شروع کر دیا ہے حتی کہ عدت گزر چکی ہے تو ان کا نکاح بھی ختم ہو چکا ہے اب انہیں فوراً الگ ہو جانا چاہیے، استبرائے رحم کے لئے چند دن تک توقف کیا جائے، پھر نکاح جدید سے اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز کیا جائے، نکاح جدید کے بغیر بیوی خاوند کی حیثیت سے زندگی گزارنا گناہ کی زندگی ہے جس سے ایک مسلمان کو اجتناب کرنا چاہیے۔

[واللہ اعلم]

سوال اپنی منگیتر کو دیکھنے کے لئے کیا حدود ہیں، کیا انٹرنیٹ کے ذریعے اس کام کو سرانجام دیا جا سکتا ہے، تصاویر کا تبادلہ کرنا منگنی کے لئے جائز ہے یا نہیں، یہ اس لئے کیا جاتا ہے تا کہ آیندہ شادی کرنے یا نہ کرنے کے متعلق فیصلہ کر سکیں، اس کے متعلق تفصیل سے آگاہ کریں۔ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں؟

جواب شرعی طور پر اپنی منگیتر کو دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس کی وجہ سے باہمی شادی کرنے کا فیصلہ آسان ہو جاتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''جب تم میں سے کوئی کسی عورت سے منگنی کرے تو اگر ممکن ہو تو اس سے وہ کچھ دیکھ لے جو اس کے لئے نکاح کا باعث ہو۔'' راوی حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی مذکورہ ہدایت کے مطابق میں نے ایک لڑکی کو پیغام نکاح بھیجا، میں اسے چھپ کر دیکھنے کی کوشش کرتا رہا، بالآخر میں نے اس کے ان اعضاء کو دیکھ ہی لیا جو اس سے نکاح کے لئے باعث رغبت تھے۔ اس کے بعد میں نے اس سے نکاح کر لیا۔ [مسند امام احمد، ص:۳۳۴، ج۳]

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس موجود تھا، اتنے میں ایک آدمی آیا اور اس نے بتایا کہ میں نے ایک انصاری عورت سے شادی کا ارادہ کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تو نے اسے دیکھا ہے؟'' اس نے عرض کیا نہیں؟ آپ نے فرمایا: ''جاؤ اور اسے دیکھ لو کیونکہ انصار کی آنکھوں میں کوئی بیماری ہوتی ہے۔'' [صحیح مسلم، النکاح:۱۴۲۴]

جمہور علما کے ہاں منگیتر کا صرف چہرہ اور ہتھیلیاں دیکھنا مباح ہے کیونکہ چہرے سے اس کی خوبصورتی اور بدصورتی کا پتہ چلتا ہے اور ہتھیلیوں سے عورت کے بدن کے نرم، درشت اور باریک اور موٹے ہونے کا علم ہوتا ہے لیکن الگ سے ملاقات کرنا، خلوت میں گفتگو کرنا شرعاً حرام ہے۔ اگر دیکھنا ممکن نہ ہو تو کسی عورت کو اس کے دیکھنے پر مامور کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک عورت سے شادی کرنا چاہی، تو ایک عورت کو اسے دیکھنے کے لئے بھیجا اور اسے کہا کہ اس کے اگلے دانت سونگھے اور اس کی ایڑیوں کے اوپر والے حصے کو دیکھے۔ [مستدرک حاکم، ص:۱۶۶، ج۲]

اس حدیث میں معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو بھیجنے سے وہ فوائد حاصل ہو سکتے ہیں جو خود دیکھنے سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ بہر حال اپنی منگیتر کو دیکھنا جائز ہے لیکن اس کے لئے خاص اہتمام کرنا حرام ہے اور دیکھنے کے لئے چار شرائط کا پایا جانا ضروری ہے:

① نکاح کرنے کا ارادہ ہو، اسے محض دل لگی اور مشغلہ کے طور پر سرانجام نہ دیا جائے۔

② خلوت نہ ہو، حدیث کے مطابق ایسے حالات میں شیطان گھس آتا ہے۔

③ فتنے یا فساد کا ڈر نہ ہو۔

④ مشروع مقدار سے زیادہ نہ دیکھا جائے، اس سے مراد وہ حصے ہیں جو لڑکی عام طور پر اپنے بھائی بیٹے اور باپ کے سامنے جو کچھ

ظاہر کرتی ہے، چونکہ برصغیر کا معاشرہ ابھی تک اس قدر ترقی یافتہ یا تربیت یافتہ نہیں کہ اس میں نکاح کا پیغام دینے والے کے لئے اپنی بیٹی یا بہن کے دکھانے کا اہتمام کیا جائے۔ اس بنا پر اس کے جواز کی آڑ میں دیکھنے دکھانے پر اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔ والدین بھی اسے اپنی عزت کا مسئلہ نہ بنائیں اور نہ ہی برخورداران اسے بطور مشغلہ اپنائیں۔ انٹرنیٹ کے ذریعے براہ راست لڑکے کا لڑکی سے رابطہ کرنا اور پیغام نکاح دینا بھی صحیح نہیں ہے۔ ہمارے جن گھروں میں انٹرنیٹ یا کیبل کی سہولت ہے انہیں اس پہلو کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ بچے اس سہولت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے والدین کو اس وقت خبر دیتے ہیں جب عدالتی نکاح کے ذریعے وہ خود کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر لیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک منگنی کے لئے تصاویر کا تبادلہ بھی جائز نہیں ہے اس کی درج ذیل وجوہات ہیں:

① تصویر بنانے کے لئے یہ کوئی حقیقی ضرورت نہیں ہے، پھر اسے دیکھنے میں دوسرے بھی شریک ہو سکتے ہیں۔

② تصویر سے حسن و جمال رنگ اور کردار کا پتہ ہی نہیں چلتا، کتنی ہی ایسی تصاویر ہیں جو حقیقت کے برعکس ہوتی ہیں، تصویر دیکھنے کے بعد جب اصل کو دیکھا گیا تو اس میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

③ یہ بھی ممکن ہے کہ منگنی پایہ تکمیل تک نہ پہنچے اور وہ تصویر منگیتر کے پاس رہے جسے بعد میں بلیک میل کرتا رہے۔ ہمارے نزدیک بہتر ہے کہ منگنی کے جملہ معاملات اپنے والدین کے ذریعے پایہ تکمیل تک پہنچائے جائیں، اسی میں خیر و برکت ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال میرے ایک دوست کی شادی کو تقریباً دو سال ہو چکے ہیں۔ اس نے تقریباً ایک سال قبل اپنی بیوی کو طلاق دی، پھر چند روز بعد رجوع کر لیا، پھر تقریباً چھ ماہ قبل دوبارہ اپنی بیوی کو طلاق دیدی، طلاق دینے کے دوسرے روز باہمی رضامندی سے رجوع کر لیا، اب اس نے بایں الفاظ اپنی بیوی کو تیسری طلاق دے ڈالی ہے کہ تجھے یکم جون ۲۰۰۶ء میں طلاق ہو جائے گی اب بیوی خاوند کے درمیان جھگڑے کی بنیاد ختم ہو چکی ہے اور دونوں آئندہ خوشگوار زندگی گزارنے کے خواہاں ہیں۔ کیا ان کے لئے مل بیٹھنے کی کوئی صورت ممکن ہے؟

جواب واضح رہے کہ شریعت اسلامیہ کی رو سے خاوند کو اپنی زندگی میں دو مرتبہ طلاق رجعی دینے کا حق ہے جو شخص اپنی منکوحہ کو دو مرتبہ طلاق دے کر اس سے رجوع کر چکا ہو وہ آئندہ جب کبھی اس بیوی کو تیسری طلاق دے گا عورت اس سے مستقل طور پر جدا ہو جائے گی اور شوہر کے لئے حق رجوع بھی ساقط ہو جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''طلاق دوبار دے، پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقے سے اس کو رخصت کر دیا جائے۔''

[۲/البقرہ:۲۲۸]

صورت مسئولہ میں خاوند نے اپنی بیوی کو دو مختلف اوقات میں دو طلاقیں دی ہیں اور پھر ان سے رجوع بھی کر چکا ہے۔ اب اس نے مستقبل سے وابستہ مزید طلاق دے ڈالی ہے۔ ظاہر ہے کہ شوہر دو دفعہ اپنا حق رجوع استعمال کر چکا ہے، اب اسے رجوع کا کوئی موقع اور حق نہیں رہا۔ مستقبل سے وابستہ طلاق کو بھی ائمہ کرام نے نافذ العمل قرار دیا ہے، البتہ اس کے وقت تاثیر میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک فوراً نافذ العمل ہوگی۔ آئندہ وقت کا انتظار نہیں کیا جائے گا جبکہ امام شافعی

اور امام احمد رحمہما اللہ کا موقف ہے کہ جب مستقبل میں وقت آئے گا جس پر طلاق کو وابستہ کیا ہے۔ اس وقت مؤثر ہوگی اس سے پہلے پہلے غیر مؤثر ہے، البتہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے اس قسم کی رائے کا اظہار کیا ہے کہ اس طرح کی طلاق سرے سے واقع نہیں ہوتی اب نہ آئندہ۔ (محلی ابن حزم)

ہمارے نزدیک امام ابوحنیفہ اور امام ابن حزم رحمہما اللہ کا موقف افراط وتفریط پر مبنی ہے۔ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کی رائے میں وزن معلوم ہوتا ہے، لہٰذا دونوں یکم جون ۲۰۰۶ء تک میاں بیوی کی حیثیت سے اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ ماہ جون ۲۰۰۶ء کا دن ان کے لئے ہمیشہ جدائی کا دن ہوگا۔ اس صورت میں رجوع کریں تو کس چیز سے رجوع کیا جائے، کیونکہ رجوع کا موقع ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ اس قسم کی بے احتیاطی، بے اعتدالی اور نادانی کا نتیجہ ندامت اور شرمساری ہی ہوا کرتا ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ایک شخص اپنی بیوی کو ایسے آشیانہ میں چھوڑ کر سفر آخرت پر روانہ ہوا جہاں عزت وآبرو اور جانی تحفظ نہیں ہے۔ اس کا ذاتی مکان یا ترکہ بھی نہیں، کیا اس کی بیوی اس پر وحشت ماحول اور اجنبی گردوپیش میں عدت کے ایام گزارے یا اپنے والدین کے ہاں عدت گزارنے کی اجازت ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے، حدیث کی روشنی میں اسے درج ذیل امور کی پابندی کرنا ضروری ہے:

☆ جس گھر میں خاوند کی وفات کے وقت رہائش پذیر ہو وہیں چار ماہ دس دن گزارنا یا حمل کی صورت میں وضع حمل تک وہاں رہنا ضروری ہے۔ اس گھر سے بلاوجہ باہر رہنا جائز نہیں ہے۔

☆ اسے خوبصورت لباس پہننے کی بھی اجازت نہیں ہے بلکہ سادہ لباس زیب تن کر کے یہ دن گزارے جائیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا حکم دیا ہے۔

☆ دوران عدت سونے چاندی اور ہیرے جواہرات وغیرہ کے زیورات بھی نہیں پہننا چاہیے، یعنی ہار، کنگن اور انگوٹھی وغیرہ انہیں زیورات میں شامل کیا جاتا ہے لہٰذا ان کے استعمال سے اجتناب کرے۔

☆ خوشبو اور دیگر عطریات کے استعمال سے بھی پرہیز کرے لیکن حیض سے فراغت کے بعد بو دور کرنے کے لئے خوشبو وغیرہ استعمال کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے۔

☆ سرمہ اور پاؤڈر وغیرہ جو کہ چہرے کی زیبائش کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، انہیں بھی استعمال نہ کیا جائے، البتہ غسل کرتے وقت صابن استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ان کے علاوہ کچھ پابندیاں خودساختہ ہیں، مثلاً: کسی سے بات چیت نہ کرنا، ہفتہ میں صرف ایک بار غسل کرنا، گھر میں ننگے پاؤں چلنا یہ سب خرافات ہیں۔ اگر حالات سازگار ہوں تو بیوہ کا اس مکان میں عدت کے ایام پورا کرنا ضروری ہے، خواہ وہ اس کی ملکیت نہ ہو، جیسا کہ حضرت فریعہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ اس کا خاوند اپنے بھاگے ہوئے نئے غلاموں کی تلاش میں نکلا تھا۔ انہوں نے اسے قتل کر دیا تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے میکے جانے کے متعلق دریافت کیا کیونکہ میرے خاوند نے اپنا ذاتی مکان یا نفقہ نہیں چھوڑا تھا۔ آپ نے اجازت دیدی۔ جب واپس جانے لگی تو آپ نے مجھے آواز دی اور فرمایا: ''تم اپنے پہلے مکان میں ہی رہو حتی کہ تمہاری عدت پوری ہو جائے۔'' چنانچہ میں نے عدت کے ایام اسی سابقہ مکان میں ہی

بسر کیے۔ [ابوداؤد،طلاق:۲۳۰۰]

اس حدیث کی روشنی میں بیوہ کو اپنے خاوند کے گھر میں عدت گزارنی چاہیے لیکن بعض اوقات عدت گزارنے والی عورت میں یا اس گھر کے متعلق کوئی اضطراری حالت پیدا ہو جاتی ہے: مثلاً: جان و مال کا خوف، عزت وآبرو کا ڈر، مکان کا انہدام، گردو پیش میں فاسق، فاجر لوگوں کا رہنا جہاں اس کی جان، عزت، آبرو کو خطرہ لاحق ہو تو ایسے حالات میں وہاں سے منتقل ہونا جائز ہے لیکن شرط یہ ہے کہ دوسری رہائش میں منتقل ہو کر وہ ان احکام کی پابندی کرے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

صورت مسئولہ میں اگر واقعی ایسے ہی حالات ہیں، جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے تو بیوہ کو اپنے والدین کے ہاں ایام عدت گزارنے کی اجازت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ کسی کو طاقت سے بڑھ کر زیادہ تکلیف نہیں دیتا ہے''۔ [۲/بقرہ:۲۸۶]

ایسے حالات میں بیوہ کا اپنے خاوند کے گھر قیام رکھنا اسے مشقت میں ڈالنا ہے، تاہم بہتر ہے کہ اس کی والدہ یا بھائی یا کوئی اور محرم بیوہ کے ساتھ خاوند کے گھر میں رہائش رکھ لے تاکہ نصوص کی خلاف ورزی نہ ہو اگر ایسا ممکن نہ ہو تو اسے وہاں سے اپنے میکے منتقل ہونے پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ محقق ابن قدامہ نے اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے۔ [مغنی ابن قدامہ ۱۱/۲۹۲]

عرب شیوخ نے بھی ایسے حالات میں بیوہ کو اپنے خاوند کے گھر سے باہر عدت کے ایام پورے کرنے کی اجازت دی ہے۔

(فتاویٰ نکاح وطلاق، ۴۷۴) [واللہ اعلم]

سوال ایک لڑکی اپنے گھر سے بھاگ کر اپنے آشنا کے پاس آ گئی اور اس سے شادی کا ارادہ ظاہر کیا، آشنا نے لڑکی کے والدین سے فون پر رابطہ کر کے اس سے شادی کی اجازت طلب کی تو انہوں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ وہ گھر سے بھاگ کر گئی ہے اور آپ سے شادی کرنا چاہتی ہے، اس لئے ہماری طرف سے اجازت ہی ہے لیکن ہماری طرف سے کوئی بھی شادی میں شریک نہیں ہوگا، آشنا نے اپنے دوستوں کو گواہ بنا کر عدالتی نکاح کر لیا، چند سال بعد لڑکی کے والدین سے صلح ہو گئی۔ اس نکاح کو تقریباً 15 سال ہو گئے ہیں چار بچے بھی ہیں۔ اس نکاح کی شرعی حیثیت سے ہمیں آگاہ کریں کہ صلح کے بعد انہیں دوبارہ نکاح کرنا چاہیے تھا یا پہلا نکاح ہی کافی تھا؟

جواب ہمارے معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ ہم ایک کام کو اپنے ہاتھوں خراب کر دیتے ہیں، پھر اس خرابی کو موجود رکھتے ہوئے اس کا کوئی شرعی حل تلاش کرتے ہیں۔ صورت مسئولہ میں ایسا ہی معاملہ درپیش ہے کہ لڑکی خود گھر سے بھاگ کر آئی ہے اور اپنے آشنا سے شادی کرنے کا اظہار کرتی ہے۔ آشنا کو بھی علم ہے کہ والد کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے فوراً لڑکی کے والد سے نکاح کی اجازت لینے کے لئے رابطہ کیا۔ لڑکی والوں نے جو جواب دیا ہے اس سے ان کی اجازت کو کشید نہیں کیا جا سکتا، بلکہ انہوں نے اپنی غیرت کا اظہار کیا ہے کہ جب ہماری لڑکی گھر سے بھاگ گئی ہے تو ہماری عزت تو اس وقت پامال ہو چکی ہے، اب ہم اجازت دیں یا نہ دیں اس سے معاملہ کی سنگینی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، اس لئے ''ہماری طرف سے اجازت ہی اجازت ہے'' کے الفاظ کو حقیقی اجازت پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے برملا کہا کہ ہماری طرف سے اس ''شادی'' میں کوئی شرکت نہیں کرے گا۔ حق تو یہ تھا کہ لڑکی کو سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیا جاتا، پھر حالات سازگار ہونے پر نکاح کی بات چیت

ہوتی، لیکن لڑکی اور لڑکا دونوں جذباتی تھے اس جذباتی رو میں شادی ہو گئی۔ اس کے بعد لڑکی کے والدین نے حالات سے مجبور ہو کر صلح کر لی۔ حدیث میں بیان ہے کہ سرپرست کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''ولی کی اجازت کے بغیر نکاح درست نہیں۔'' [مسند امام احمد، ص:۳۹۴، ج۴]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس عورت نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا تو اس کا نکاح باطل ہے۔'' آپ نے تین مرتبہ یہ الفاظ دہرائے۔ [ابوداود، النکاح:۲۰۸۳]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی عورت کسی دوسری عورت کا نکاح نہ کرے، یعنی نکاح میں اس کی سرپرستی نہ کرے اور نہ ہی کوئی عورت خود اپنا نکاح کرے، بلاشبہ وہ بدکار عورت ہے جس نے اپنا نکاح خود کر لیا۔''

[ابن ماجہ، النکاح:۱۸۸۲]

ان احادیث کا تقاضا ہے کہ صورت مسئولہ میں جو نکاح ہوا ہے وہ سرپرست کی اجازت کے بغیر ہوا ہے جبکہ اس کی اجازت انعقاد نکاح کے لئے شرط ہے، لہٰذا اس ''عدالتی نکاح'' کو نکاح تسلیم نہیں کیا جا سکتا، ہمارے نزدیک دو صورتوں میں عدالتی نکاح صحیح ہوتا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ جس عورت کا کوئی بھی سرپرست نہ ہو تو عدالت کی سرپرستی میں اس کا نکاح کیا جا سکتا ہے اگر عدالت تک رسائی مشکل ہو تو گاؤں یا محلے کے سنجیدہ اور پختہ کار لوگوں پر مشتمل پنچائت کی سرپرستی میں بھی نکاح کیا جا سکتا ہے۔

☆ کسی عورت کا ولی موجود ہے لیکن وہ اپنی ولایت سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہے یا اپنے مفادات کی وجہ سے لڑکی کا کسی غلط جگہ پر نکاح کرنے پر تلا ہوا ہے تو ایسے حالات میں بھی عدالت یا پنچائت کی سرپرستی میں نکاح ہو سکتا ہے۔

چونکہ اس نے نکاح سے پہلے اپنے والد سے رابطہ کیا اور اس کے ان الفاظ سے کہ ''اجازت ہی اجازت ہے'' سے فائدہ اٹھا کر عدالتی نکاح کیا ہے۔ لہٰذا اس شبہ نکاح کا فائدہ ''ملزم'' کو ملنا چاہیے۔ اس کا فائدہ صرف اتنا ہی ہونا چاہیے کہ اس کی اولاد کو صحیح النسب قرار دیا جائے لیکن حقیقت کے اعتبار سے نکاح صحیح نہیں ہے۔ اس لئے آئندہ اسے گناہ کی زندگی سے بچانا چاہیے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ ان کے درمیان فوراً علیحدگی کر دی جائے۔ ایک ماہ تک دونوں ''میاں بیوی'' ایک دوسرے سے الگ رہیں۔ انہیں اس فعل شنیع پر ملامت بھی کی جائے۔ انہیں اللہ تعالیٰ سے معافی اور استغفار کی تلقین کرنی چاہیے، پھر ایک ماہ بعد از سر نو نکاح کیا جائے اور نکاح کی شرائط کو ملحوظ رکھا جائے۔ ہمارے نزدیک احتیاط کا تقاضا یہی ہے۔ امید ہے کہ ایسا کرنے سے دونوں قیامت کے دن مواخذہ سے محفوظ رہیں گے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی نے شراب کے نشہ میں مدہوش اپنی بیوی کو طلاق دے دی، جب اسے ہوش آیا تو اسے بتایا گیا کہ تو نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے تو اس نے سراسر انکار کر دیا کہ مجھے اس کا علم نہیں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ نشہ اور بیماری کی مدہوشی میں طلاق ہو جاتی ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب طلاق کے لئے ضروری ہے کہ خاوند طلاق دیتے وقت خود مختار، مکلّف اور کامل ہوش و حواس میں ہو، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ’’طلاق اور آزادی اغلاق میں نہیں ہوتی۔‘‘ [ابوداود، الطلاق:۲۱۹۳]

محدثین نے اغلاق کے دو مفہوم بیان کیے ہیں:

① زبردستی لی جانے والی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

② شدید غصے اور سخت نشہ میں جب انسان کی عقل پر پردہ پڑ جائے تو ایسی صورت میں دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حالت نشہ میں موجود انسان اور مجبور شخص کی طلاق جائز نہیں ہے ایسی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ [صحیح بخاری، الطلاق:۱۰]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ’’پاگل اور بحالت نشہ کی طلاق نہیں ہے۔‘‘ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک ایسا آدمی لایا گیا جس نے نشہ کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دی تھی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اسے شراب کی حد لگائی جائے اور اس کی بیوی کو الگ کر دیا جائے، ان سے حضرت ابان بن عثمان نے بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نزدیک جنون اور نشہ کی حالت میں دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ اس کے بعد آپ نے صرف حد لگائی لیکن اس کی بیوی کو اس سے الگ نہ کیا کیونکہ اس حالت میں دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی ہے۔ [بیہقی،ص:۳۵۹، ج۷]

ہمارے نزدیک نشہ کی حالت میں عقل ماؤف ہونے کے اعتبار سے دیوانگی کی ہی ایک قسم ہے۔ جنون کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’تین آدمی مرفوع القلم ہیں۔ ایک سونے والا حتی کہ بیدار ہو جائے، دوسرا بچہ حتی کہ وہ بالغ ہو جائے اور تیسرا پاگل حتیٰ کہ عقل مند ہو جائے۔‘‘ [نسائی، الطلاق:۳۴۳۲]

اس بنا پر نشہ کی حالت میں دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی لیکن اس بات کا بغور جائزہ لینا ہوگا کہ نشے کی حالت میں جب طلاق دی گئی تھی تو اس وقت نشہ ابتدائی مرحلہ میں تھا یا پورے عروج پر تھا۔ اگر ابتدائی مرحلہ ہے کہ نشہ کرنے والا کا عقل وشعور پوری طرح ختم نہیں ہوا بلکہ اسے طلاق دینے کا علم تھا تو ایسی حالت میں طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر نشہ کرنے والا ایسی حالت میں ہے کہ اسے عقل وشعور نہیں بلکہ اسے طلاق دینے کا قطعاً علم نہیں تو ایسی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوگی کیونکہ طلاق دہندہ کی عقل ماؤف ہو چکی ہے جبکہ طلاق کے مؤثر ہونے کے لئے بقائم ہوش وحواس ہونا ضروری ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال میں اپنے چھوٹے بھائی کے نکاح کے لئے تقریباً 7 سال قبل اپنے خالو کے پاس گیا انہوں نے کہا تم بھی اپنی ہمشیرہ کا نکاح میرے بیٹے سے کردو، میں نے کہا کہ میری ہمشیرہ تو دینی درس گاہ میں زیر تعلیم ہے۔ فراغت کے بعد سوچ وبچار کروں گا، اسی دوران میرے بھائی کا رشتہ کر دیا گیا مجھے بعد میں علم ہوا کہ اس طرح کا مشروط نکاح وٹہ سٹہ کے زمرے میں آتا ہے، اس لئے میں نے اپنی ہمشیرہ کا رشتہ دینے سے یکسر انکار کر دیا لیکن برادری والے مجھے یہ کام کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ میرے والد نے اپنی زندگی میں میری بہن کی منگنی میرے چچازاد سے کردی تھی۔ میرے والد کے فوت ہونے کے بعد برادری کی طرف سے دباؤ ڈالا جارہا ہے کہ میں اپنی ہمشیرہ کی منگنی اپنے خالوزاد بھائی سے کروں۔ قرآن وسنت کی روشنی میں ہماری راہنمائی کریں کہ واقعی اس قسم کا نکاح وٹہ سٹہ کے زمرے میں آتا ہے؟

جواب بشرط صحت سوال میں واضح ہو کہ مذکورہ صورت وٹہ سٹہ کی ہی ہے، جسے شریعت نے حرام اور ناجائز ٹھہرایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس قسم کے نکاح سے منع فرمایا ہے۔ [صحیح بخاری، النکاح: ۵۱۱۲]

بلکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''دین اسلام میں نکاح وٹہ سٹہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔'' [صحیح مسلم، النکاح: ۳۴۶۸]

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے۔ ''نکاح شغار اور اس کا بطلان۔'' حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ اس کی تفسیر بایں طور پر فرماتے ہیں ''کہ آدمی اپنی بیٹی یا عزیزہ کسی دوسرے شخص سے اس شرط پر کرے کہ وہ بھی اپنی بیٹی یا عزیزہ کا نکاح اس سے کر دے گا۔'' [صحیح مسلم، کتاب النکاح]

بعض روایات میں اس شرط کے ساتھ یہ الفاظ بھی ملتے ہیں کہ دونوں لڑکیوں کا کوئی الگ حق مہر مقرر نہ کیا جائے۔ [صحیح بخاری، النکاح: ۵۱۱۲]

واضح رہے کہ مہر ہونے یا نہ ہونے سے نفس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ نتیجہ اور انجام کے اعتبار سے دونوں صورتیں یکساں حکم رکھتی ہیں، اگر ناچاقی کی صورت میں ایک لڑکی کا گھر برباد ہوتا ہے تو دوسری بھی ظلم وستم کا نشانہ بن جاتی ہے۔ قطع نظر کہ نکاح کے وقت ان کا الگ الگ حق مہر مقرر کیا گیا تھا یا نہیں۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسی طرح کے ایک نکاح کو باطل قرار دیا تھا، حالانکہ ان کے درمیان مہر بھی مقرر تھا، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''یہی وہ شغار ہے جس سے رسول اللہ ﷺ نے ہمیں منع فرمایا تھا۔'' [ابوداؤد، النکاح: ۲۰۷۵]

ہمارے نزدیک اس قسم کے نکاح کی تین صورتیں ممکن ہیں:

① نکاح کا معاملہ کرتے وقت ہی رشتہ دینے لینے کی شرط کر لی جائے یہ صورت بالکل باطل حرام اور ناجائز ہے۔

② نکاح کے وقت شرط تو نہیں کی، البتہ آثار وقرائن ایسے ہیں کہ شرط کا سا معاملہ ہے۔ انجام کے اعتبار سے یہ بھی شغار ہے اور ایسا کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ صرف جواز کا حیلہ تلاش کرنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے۔

③ نکاح کرتے وقت شرط بھی نہیں کی اور نہ ہی آثار وقرائن شرط جیسے ہیں۔ اس صورت کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اس قسم کا تبادلہ نکاح محض اتفاق ہے۔ اس طرح کے نکاح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں متعدد مرتبہ ہوئے ہیں۔

صورت مسؤلہ میں نکاح کی پہلی شکل ہے کہ خالو نے بات چیت کے وقت ہی اس شرط کا اظہار کر دیا تھا لیکن دوسری طرف سے اس شرط کو قبول نہیں کیا گیا بلکہ آیندہ کے حالات وظروف پر اسے چھوڑ دیا گیا، پھر لڑکی کے والد نے کسی اور کے ساتھ اس کی منگنی بھی کر دی ہے، اب برادری کی طرف سے منگنی توڑ کر خالو زاد سے منگنی کرنے پر دباؤ ڈالنا صحیح نہیں ہے بلکہ ایسا کرنا کتاب وسنت کے خلاف ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال طلاق کے مندرجہ ذیل نکتۂ نظر کی وضاحت کریں۔

ہفت روزہ ''اہلحدیث'' مجریہ ۳ رمضان المبارک ۱۴۲۶ھ میں ایک فتویٰ شائع ہوا ہے جو صریحاً مسلک اہلحدیث کے خلاف ہے سوال یہ تھا کہ ایک آدمی اپنی بیوی کو ہر ماہ ایک طلاق ارسال کر کے تین طلاق کا نصاب پورا کر دیتا ہے، کیا اس کے بعد رجوع

کا تعلق ہے یا عورت اس پر دائمی حرام ہوگئی ہے اس کا جواب دیا گیا ہے کہ اگر آدمی وقفہ وقفہ سے تین طلاق دے چکا ہو، جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے تو نہ عدت کے اندر رجوع ممکن ہے اور نہ عدت گزارنے کے بعد نکاح کیا جا سکتا ہے، یہ جواب فقہ حنفی کے مطابق ہے۔مسلک اہل حدیث کی ترجمانی نہیں کرتا کیونکہ اہل حدیث نکتۂ نظر کے مطابق پہلی طلاق کے بعد جب تک رجوع (دوران عدت) یا نکاح جدید (بعد از عدت) نہ ہو اس وقت تک دوسری اور تیسری طلاق لغو اور غیر مؤثر ہوتی ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں صرف ایک رجعی طلاق واقع ہوئی ہے، لہٰذا بعد از عدت اگر عورت رضامند ہو تو اس سے دوبارہ نکاح کیا جا سکتا ہے۔

جواب ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس کی مہربانی سے ہماری جماعت میں ایسے ''نامعلوم علما'' موجود ہیں جو وقتاً وقتاً ہماری راہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے مسلک اہل حدیث کا طرۂ امتیاز ہے کہ اس میں مسائل کے استنباط میں کسی کی اجارہ داری نہیں ہے بلکہ کتاب وسنت کو برتری حاصل ہے۔امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں اسی مسلک کو اختیار کیا ہے کہ وہ قرآن وحدیث سے شرعی احکام کا استنباط کرتے ہیں۔وہ اس بات کو قطعاً خاطر میں نہیں لاتے کہ مذکورہ شرعی حکم کس امام کے مطابق ہے اور کس کے مخالف ہے، الحمد اللہ ہمارا اہل حدیث حضرات کا بھی یہی موقف ہے کہ ہم نے شرعی احکام کے بیان کرنے میں کتاب وسنت کو مدنظر رکھا ہے۔وہ کس کے مطابق یا مخالف ہے ہمیں اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔زیر نظر مسئلہ میں ہمارے موقف کی بنیاد یہ ہے کہ ہم ایک مجلس میں دی گئی تین طلاق کو ایک رجعی شمار کرتے ہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انداز سے دی گئی تین طلاق کو ایک رجعی طلاق قرار دیا ہے۔ [مسند امام احمد، ص:۱۶۵،ج۱]

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مجلس تبدیل ہو جائے ،مثلاً: ہر ماہ ایک طلاق دے، اس طرح تین مہینوں میں نصاب طلاق (تین طلاق) مکمل کر دے تو اس نے مکمل طور پر اپنی بیوی کو زوجیت سے فارغ کر دیا ہے۔اگر اس انداز سے دی گئی تین طلاق کو ایک رجعی شمار کرنا ہے تو مجلس اور غیر مجلس کی تفریق بے سود اور لایعنی ہے۔چنانچہ اس سلسلہ میں امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے ''طلاق سنت کا بیان'' اس کے تحت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس کی وضاحت نقل کی ہے کہ طلاق سنت حالت طہر میں ہم بستری کئے بغیر طلاق دینا ہے، پھر حیض کے بعد طہر میں طلاق دے، پھر اس طرح آیندہ حیض کے بعد طہر میں طلاق دے۔

[نسائی، الطلاق:۳۴۲۳]

اس میں پہلی طلاق کے بعد رجوع یا نکاح جدید کی شرط کو بیان نہیں کیا۔ایسی شرائط محض تکلف ہیں کیونکہ دوران عدت وہ عورت اس کی بیوی رہتی ہے اور وہ اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے وہ عورت دوران عدت بھی طلاق کا محل ہے، ہاں، تیسری طلاق کے بعد اس کا نکاح ختم ہو جائے گا۔اب دوران عدت رجوع کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو بایں الفاظ نقل فرمایا ہے: ''طلاق سنت یہ ہے کہ خاوند اپنی بیوی کو ہر طہر میں ایک طلاق دے۔'' آخری طلاق کے بعد بیوی اس عدت کو پورا کرے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ [سنن بیہقی،ص:۳۳۲،ج۷]

ہمارے ''مہربان'' نے ہر ماہ طہر میں دی ہوئی تین طلاق کو ایک رجعی شمار کر کے عدت گزرنے کے بعد جو نکاح ثانی کا مشورہ دیا ہے وہ جمہور اہل علم کے موقف کے بالکل خلاف ہے۔اسے کسی کا تفرد یا انفرادی طور پر موقف تو قرار دیا جا سکتا ہے لیکن مسلک

اہل حدیث کی ترجمانی نہیں کہا جاسکتا۔ واضح رہے کہ ہم نے انتہائی اختصار کے ساتھ اپنے موقف کو بیان کیا ہے۔ بصورت اس پر مزید دلائل بھی دیے جاسکتے ہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک خاتون اپنے گھر کے کام میں مصروف تھی کہ اس کے شوہر نے اس کی طرف ایک پرچی پھینکی اور باہر چلا گیا، عورت نے خیال کیا کہ کوئی حساب کی پرچی ہے اسے دوسرے دن پتہ چلا کہ اس پر تین مرتبہ طلاق کا لفظ تحریر تھا۔ محلے کی کسی عورت نے بتایا کہ اس طرح طلاق نہیں ہوتی ہے کیونکہ تم نے اسے نہ پڑھا نہ ہی سنا اور نہ اسے ہاتھ لگایا، ایک مولوی صاحب تشریف لائے تو شوہر نے اس کے روبرو اقرار کیا کہ اس نے طلاق دے دی تھی جس پر وہ خاتون اپنا گھر چھوڑ کر میکے چلی گئی، اس پر تقریباً دو سال گزر چکے ہیں۔ عورت، مرد اور بچے سب پریشان ہیں۔ مرد مسلسل اس کوشش میں ہے کہ خاتون واپس آجائے، کتاب وسنت کی روشنی میں اس الجھن کو حل کریں؟

جواب طلاق کا لغوی معنی ''بندھن کھول دینا'' ہے اور شرعی طور پر نکاح کی گرہ کھول دینے کو طلاق کہا جاتا ہے۔ ہر مکلف وخود مختار شخص جب اپنی بیوی کو اس کے برے اخلاق یا کسی اور وجہ سے ناپسند کرتا ہو تو اسے طلاق دے سکتا ہے۔ طلاق کے لئے صرف یہی شرط ہے کہ خاوند عاقل وبالغ ہو اور اپنے عزم وارادہ سے صراحت کے ساتھ اس لفظ کو استعمال کرے۔ اس کے نافذ ہونے کے لئے بیوی کے علم میں لانا ضروری نہیں ہے، اگر آدمی دو گواہوں کی موجودگی میں اس کا اقرار کرے تو طلاق ہو جاتی ہے یا تحریر کر کے اپنے دستخط کر دے تب بھی طلاق ہو جائے گی۔ بیوی تک اس کا پہنچانا یا اس کا وصول کرنا نہ کرنا اس کے نفاذ کے لئے شرط نہیں ہے، چنانچہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اگر کسی نے اپنی بیوی کو طلاق لکھ دی کہ میری طرف سے تجھے طلاق ہے تو فوراً طلاق واقع ہو جائے گی بیوی کو یہ تحریر پہنچے یا نہ پہنچے۔'' [مغنی ص:۵۰۵، ج۱۰]

اس لئے اگر کسی نے اپنی بیوی کو طلاق لکھی اور اسے روانہ نہ کیا یا حوالہ ڈاک کر دیا کہیں راستہ میں گم ہوگئی یا بیوی کے پاس پہنچی لیکن اس نے وصولی سے انکار کر دیا وصول کرنے کے بعد پھاڑ دیا یا اس کے والدین میں سے کسی نے کہہ دیا کہ ہم اسے نہیں مانتے۔ ان تمام صورتوں میں طلاق ہو جائے گی۔ اگر طلاق دینے کی نیت سے طلاق نویس کے پاس گیا اس نے طلاق نامہ لکھ دیا اور طلاق دہندہ نے نیچے اپنے دستخط ثبت کر دیے۔ لیکن ارسال کرنے کی بجائے فوراً اسے پھاڑ دیا تو بھی طلاق واقع ہو جائے گی، تاہم اس کا پھاڑنا رجوع شمار ہوگا۔ بہر حال طلاق دینا خاوند کا حق ہے۔ اگر وہ کسی بھی صورت میں اسے استعمال کرتا ہے تو ہم اپنی طرف سے اس پر ناروا پابندیاں لگانے کے مجاز نہیں ہیں، چنانچہ عرب شیوخ لکھتے ہیں:

''طلاق دینے کے لئے کوئی شرط نہیں کہ خاوند اپنی بیوی کے سامنے طلاق کے الفاظ کہے اور نہ ہی یہ شرط ہے کہ بیوی کو اس کا علم ہو۔ جب کبھی آدمی نے طلاق کے الفاظ بولے یا طلاق دی تو طلاق صحیح ہوگی، اگرچہ اس کا بیوی کو علم نہ ہی ہو۔''

شیخ ابن عثیمین رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ ایک آدمی اپنی بیوی سے لمبے عرصے تک غائب رہا اور اسے طلاق دے دی جس کا علم صرف اسے ہی ہے اور اگر وہ اپنی بیوی کو نہ بتائے تو کیا طلاق واقع ہو جائے گی؟ تو شیخ نے جواب دیا طلاق واقع ہو جائے گی، اگرچہ

وہ اپنی بیوی کو اس کا نہ بھی بتائے، اگر کوئی آدمی یہ کہہ دے کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو اس سے اس کی بیوی کو طلاق ہو جائے گی، خواہ بیوی کو اس کا علم ہو یا نہ ہو۔ اس بنا پر فرض کریں اگر عورت کو طلاق کا علم تین حیض گزر جانے کے بعد ہو تو اس کی عدت پوری ہو چکی ہو گی حالانکہ اسے اس کا علم ہی نہیں تھا اس طرح اگر کوئی آدمی فوت ہو جائے اور اس کی بیوی کو خاوند کی وفات کا علم عدت گزرنے کے بعد ہو تو اس پر کوئی عدت نہیں، اس لئے عدت کی مدت تو پہلے گزر چکی ہے۔ [فتاویٰ، نکاح وطلاق: ۴۲۸]

صورت مسئولہ میں کسی عورت کا یہ مشورہ دینا غلط ہے کہ اس طرح طلاق نہیں ہوتی کیونکہ تم نے اسے پڑھا نہ سنا اور نہ ہی اسے ہاتھ لگایا۔ ایسے مشوروں کو ''دین خواتین'' ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے، پھر خاوند نے اس کا اقرار بھی کر لیا ہے اور اس پر دو سال کا عرصہ بھی گزر چکا ہے اب مرد، عورت اور بچوں کی پریشانی دور کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ خاوند تجدید نکاح کے ساتھ رجوع کرے۔ کتاب وسنت کی روشنی میں ایک مجلس کی تین طلاق ایک ہی ہوتی ہیں، اس لئے اگر یہ پہلا یا دوسرا واقعہ ہے تو خاوند کو رجوع کا حق ہے لیکن عدت گزر چکی ہے، اب انہیں نئے حق مہر کے ساتھ نکاح کرنا ہو گا۔ [واللہ اعلم]

سوال شرعی طور پر وٹہ سٹہ کی شادی کے متعلق کیا حکم ہے؟

جواب وٹہ سٹہ کی دو صورتیں ہیں کہ کسی شخص نے اپنے بھائی کو اپنی بیٹی کا رشتہ دے دیا، اس کے بعد اس نے اپنی بیٹی کا رشتہ اپنے بھائی کے بیٹے سے کر دیا، نکاح کرتے وقت کوئی شرط وغیرہ نہیں رکھی گئی، اس کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، دوسری قسم وٹہ سٹہ ارادی ہے، یعنی نکاح کرتے وقت یہ شرط کر لی جائے تم اپنی بیٹی کا رشتہ میرے بیٹے سے کرو گے، اسے شریعت کی اصطلاح میں ''شغار'' کہتے ہیں۔ شرعی طور پر ایسا کرنا ناجائز اور حرام ہے۔ حدیث میں بیان ہے کہ شغار کا اسلام میں کوئی وجود نہیں ہے۔

[صحیح مسلم، النکاح: ۳۴۶۸]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح شغار سے منع کیا ہے [صحیح بخاری، النکاح: ۵۱۱۲]

حدیث میں شغار کی تعریف بایں الفاظ کی گئی ہے: ''کوئی آدمی اپنی بیٹی کا نکاح اس شرط پر کرے کہ دوسرا بھی اپنی بیٹی کا نکاح اس سے کرے گا اور درمیان میں کوئی حق مہر نہ ہو۔'' [صحیح بخاری، الحیل: ۶۹۶۰]

بعض علما کا خیال ہے کہ اگر درمیان میں مہر رکھ دیا جائے تو نکاح شغار کے دائرہ سے نکل جاتا ہے، حالانکہ اس تعریف میں حق مہر کا ذکر اتفاقی ہے احترازی نہیں ہے، جیسا کہ ایک اور حدیث میں ہے کہ عباس بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی کا نکاح عبدالرحمٰن بن حکم سے کر دیا اور عبدالرحمٰن نے اپنی بیٹی عباس بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے عقد میں دے دی، انہوں نے درمیان میں مہر بھی رکھا، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو جب اس نکاح کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے گورنر مروان کو مدینے میں خط بھیجا کہ ان کے درمیان فوراً تفریق کرا دی جائے کیونکہ یہ وہی شغار ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا۔ [ابوداود، النکاح: ۲۰۷۵]

جب معاشرتی طور پر نکاح شغار کو دیکھا جاتا ہے کہ مہر ہونے یا نہ ہونے سے اس کی قباحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ جب خرابی پیدا ہوتی ہے تو دونوں گھر اجڑ جاتے ہیں، حالانکہ قصور ایک کا ہوتا ہے اور دوسرا بلاوجہ زیادتی کے لئے تختہ مشق بن جاتا ہے، لہٰذا اس قسم کے نکاح سے اجتناب کرنا چاہیے، اگرچہ احناف کا موقف ہے کہ اگر اس قسم کا نکاح ہو جائے تو درمیان میں حق مہر رکھنے کے

بعد اسے سند جواز مہیا کی جاسکتی ہے لیکن اس قسم کی حیلہ گری کا اسلام میں کوئی وجود نہیں ہے۔ وٹہ سٹہ کا نکاح سرے سے منعقد نہیں ہوتا۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال نکاح کے وقت کلمے پڑھائے جاتے ہیں اور اسے شرائط نکاح کا نام دیا جاتا ہے قرآن وحدیث کی رو سے اس کی کیا حیثیت ہے۔ اور اگر کسی کا نکاح ان کے بغیر پڑھا دیا گیا تو کیا نکاح درست ہے نکاح کے وقت نکاح خواں لڑکی کے پاس جا کر ایجاب وقبول کراتا ہے کیا عورت کا ولی ایجاب وقبول نہیں کرا سکتا۔ نیز بتائیں کہ نکاح میں گواہوں کی تعداد کیا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں ان سوالات کا جواب دیں۔

جواب نکاح کے وقت ایمان مجمل، ایمان مفصل، کلمۂ طیب، کلمۂ شہادت، کلمۂ تمجید، کلمۂ توحید، کلمۂ استغفار اور کلمۂ ردکفر وغیرہ کی تلقین کتاب وسنت سے ثابت نہیں ہے، بلکہ اس طرح کے ایمان وکلمات کا وجود ہی محل نظر ہے۔ چہ جائیکہ انہیں نکاح کے موقع پر پڑھایا جائے۔ نکاح صرف ایجاب وقبول کا نام ہے۔ عورت کی رضامندی ولی کی اجازت، حق مہر اور دو گواہوں کی موجودگی، نکاح کی شرائط ہیں، جن کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا، اس بنا پر اگر کسی کا نکاح ان کلمات کے پڑھائے بغیر کر دیا جاتا ہے تو اس کے صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہے بلکہ ہمارے نزدیک نکاح کے وقت دولہا اور دلہن کو ان چھ کلمات کی تلقین بدعت سیئہ ہے ان کے پڑھنے پڑھانے سے گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔ ہمارے ہاں نکاح کے وقت بہت سی غلط رسومات ادا کی جاتی ہیں، ان میں بدترین رسم یہ ہے کہ نکاح خواں جو محرم نہیں ہوتا لڑکی کے پاس جاتا ہے اور ایجاب کا فریضہ سرانجام دیتا ہے، حالانکہ یہ کام اس کے محرم رشتہ داروں کے کرنے کا ہے۔ نکاح کی پیشکش کرنے کے لئے ابتدائی کلام کو ایجاب کہا جاتا ہے جو عام طور پر عورت کی طرف سے ہوتا ہے یا عورت کی طرف سے اس کا سرپرست ادا کرتا ہے یا نکاح خواں ان کا نمائندہ بن کر ایجاب کے کلمات کہتا ہے اس پیشکش کو منظور کرنے کے لئے جو کلام کی جاتی ہے اسے قبول کہا جاتا ہے اور قبول کا فریضہ خود دولہا سرانجام دیتا ہے۔ یہی ایجاب و قبول نکاح کا ستون ہے، یہ ایجاب وقبول اصالتاً اور وکالتاً دونوں طرح ادا کرنا جائز ہے، البتہ یہ کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ نکاح خواں لڑکی کے پاس جائے اور اس سے نکاح کی پیشکش کرنے کے اختیارات حاصل کرے، یہ کام لڑکی کا باپ، چچا، بھائی یا اور کوئی محرم رشتہ دار سرانجام دے۔ نکاح کے لئے کم از کم دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے جو مسلمان عاقل اور بالغ ہوں، پھر ان گواہوں کے لئے طرفین کے ایجاب وقبول کی سماعت ضروری ہے۔ صرف ایک گواہ کی موجودگی میں نکاح منعقد نہیں ہوتا، اگر گواہوں نے صرف ایک فریق کا کلام (ایجاب یا قبول) سنا یا ایک گواہ نے ایک کا اور دوسرے نے دوسرے کا تو اس طرح بھی نکاح نہیں ہوگا، یعنی یہ امر لازم ہے کہ دونوں گواہ ایجاب وقبول کے وقت موجود رہیں اور اپنے کانوں سے ایجاب وقبول کی سماعت کریں۔ یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ شہادت، نکاح کے لئے شرط ہے۔ حدیث میں ہے کہ سرپرست اور دو دیانتدار گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔

[بیہقی ص: ۱۲۵، ج ۷]

البتہ اس میں اختلاف ہے کہ شہادت کی یہ شرط صحت نکاح کے لئے ہے یا تکمیل نکاح کے لئے ہمارے نزدیک صحت نکاح کے لئے شہادت بنیادی شرط ہے، چنانچہ اس وقت تک نکاح منعقد ہی نہیں ہوگا جب تک کہ ایجاب وقبول کے وقت گواہ موجود نہ

ہوں۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی صراحت کی ہے۔ (ترمذی، النکاح، حدیث نمبر:۱۱۰۳) [واللہ اعلم]

سوال ایک لڑکی کو اس کے خاوند نے باہمی ناچاقی کی وجہ سے اپنے گھر سے نکال دیا وہ اپنے والدین کے ہاں رہنے لگی بالآخر ایک سال بعد اس نے طلاق دے کر اسے فارغ کر دیا۔ کیا لڑکی کے لئے سال بھر مجبور ہو کر والدین کے ہاں بیٹھے رہنا اور پھر طلاق کے بعد عدت گزرنے تک کے اخراجات خاوند کو برداشت کرنا ہوں گے یا نہیں؟

جواب قرآن کریم نے بیوی رکھنے کا مقصد اطمینان اور راحت وسکون حاصل کرنا بیان کیا ہے۔ خاوند اپنی بیوی کے اخراجات برداشت کرے وہ بھی اسی لئے ہے کہ بیوی وظیفۂ زوجیت اور دیگر ہر طرح کے سکون، آرام کا موقع فراہم کرتی ہے، اس تمہید کے بعد لڑکی کا اپنے والدین کے ہاں بیٹھ رہنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

☆ بعض اوقات بیوی از خود ناراض ہو کر والدین کے ہاں چلی جاتی ہے اور کسی دوسرے کے بہلانے پھسلانے پر اپنے خاوند کے گھر واپس نہیں آتی جبکہ خاوند کی انتہائی کوشش اپنا گھر آباد کرنے کی ہوتی ہے اس صورت میں والدین کے ہاں بلاوجہ بیٹھ رہنے والی بیوی اپنے خاوند کی طرف سے نان ونفقہ کی حقدار نہیں ہے کیونکہ اس نے نہ صرف خاوند کے حقوق کو پامال کیا ہے بلکہ اس کے لئے وہ مزید پریشانی اور ذہنی کوفت کا باعث بنی ہے۔

☆ دوسری صورت یہ ہے کہ خاوند بلاوجہ اسے اپنے گھر سے نکال دیتا ہے اور لڑکی مجبور ہو کر اپنے والدین کا سہارا لیتی ہے، ایسے حالات میں بیوی جتنا عرصہ والدین کے گھر بیٹھی رہے گی خاوند کو اس کا خرچہ برداشت کرنا ہوگا کیونکہ اس صورت میں حقوق کی عدم ادائیگی کا باعث وہ خود ہے۔ صورت مسؤلہ میں اگر مذکورہ لڑکی کو واقعی گھر سے نکالا گیا ہے اور وہ مجبور ہو کر اپنے والدین کے ہاں بیٹھی ہے تو اس کے جملہ اخراجات بذمہ خاوند ہیں۔ اسی طرح رجعی طلاق کے بعد بیوی کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنی عدت کے ایام اپنے خاوند کے گھر گزارے اور خاوند اس کے لئے رہائش اور دیگر اخراجات فراہم کرے۔ لیکن اگر حالات ایسے پیدا کر دیے جائیں کہ بیوی اپنے خاوند کے پاس نہ رہ سکتی ہو بلکہ اپنے والدین کے ہاں ایام عدت گزارنے پر مجبور ہو تو اس صورت میں بھی عدت گزارنے تک کا خرچہ بذمہ خاوند ہوگا۔ خاوند کو چاہیے کہ وہ اس سلسلہ میں کسی قسم کی کوتاہی کو روا نہ رکھے اور عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنی بیوی پر اٹھنے والے اخراجات اس کے حوالہ کرے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ دوبارہ مل بیٹھنے کا کوئی راستہ کھول دے۔ [واللہ اعلم]

سوال میں نے اپنی بیوی کو بحالت غصہ ایسے طہر میں طلاق دی جس میں وظیفۂ زوجیت ادا کر چکا تھا، پھر چند دنوں بعد رجوع کر کے ہم نے اپنی ازدواجی زندگی کو بحال کر لیا اس عرصہ بعد میں نے اسے تحریری طور پر دوسری طلاق دی، پھر رجوع کر لیا۔ آخر کار اس کے معاندانہ رویے سے تنگ آ کر میں نے تیسری طلاق بھی لکھ کر روانہ کر دی۔ اب ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے ایسے حالات میں رجوع کرنے کی کوئی صورت ممکن ہے؟ کچھ علما نے مجھے کہا ہے کہ چونکہ پہلی طلاق طریقہ اسلام سے ہٹ کر دی گئی تھی لہٰذا وہ کالعدم ہے اب گویا دو طلاقیں ہوئیں، لہٰذا رجوع کیا جا سکتا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ میری صحیح راہنمائی فرمائیں۔

جواب طلاق کا معاملہ انتہائی نزاکت کا حامل ہے، اس لئے یہ اقدام کرنے سے پہلے خوب سوچ بچار کر لینا چاہیے۔ رسول

اللہ ﷺ نے ہنسی مذاق سے یہ معاملہ سرانجام دینے کو بھی سنجیدہ قرار دیا ہے اور قانونی اعتبار سے اسے نافذ العمل کہا ہے۔

[ابوداؤد، الطلاق:۲۱۹۴]

پھر وہ معاملات جو حلال وحرام سے متعلق ہیں ان میں بہت حزم واحتیاط سے کام لینا چاہیے۔اس کا اندازہ درج ذیل واقعہ سے ہوتا ہے۔

فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے زمعہ کی لونڈی کا ناجائز بیٹا قانونی اعتبار سے زمعہ کا بیٹا قرار دیتے ہوئے اس کے دوسرے بیٹوں کے حوالے کر دیا لیکن چونکہ اس کی شکل وصورت زانی مرد سے ملتی جلتی تھی،اس لئے آپ نے زمعہ کی بیٹی ام المؤمنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ ''تم نے اپنے اس ''قانونی بھائی'' سے پردہ کرنا ہے۔''چنانچہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے آخری دم تک اسے نہیں دیکھا۔ [صحیح بخاری، البیوع:۲۰۵۳]

اس مختصر تمہید کے بعد ہم صورت مسئولہ کا جائزہ لیتے ہیں۔شریعت کی نظر میں شوہر کی طرف سے مخصوص الفاظ کے ذریعے نکاح کی گرہ کھول دینے یا اس کے کمزور کر دینے کا نام طلاق ہے، پھر طلاق دیتے وقت اگر رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کیا جائے تو اسے طلاق سنت کہا جاتا ہے اور اس طریقہ کے خلاف طلاق دینے کو طلاق بدعت کہا جاتا ہے۔امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے طلاق سنت کی تعریف بایں الفاظ کی ہے کہ دو گواہوں کے سامنے خاوند اپنی بیوی کو بحالت طہر ایک طلاق دے بشرطیکہ اس طہر میں بیوی سے مباشرت نہ کی ہو۔ [صحیح بخاری، الطلاق، باب نمبر:۱]

واضح رہے کہ طلاق سنت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس طرح طلاق دینے میں کچھ ثواب ملے گا کیونکہ طلاق فی نفسہ عبادت نہیں کہ اسے اختیار کرنے میں ثواب کی امید رکھی جائے، پھر طلاق سنت کے مقابلہ میں طلاق بدعت کی درج ذیل صورتیں ہیں:

① طہر کے بجائے حالت حیض یا حالت نفاس میں طلاق دی جائے۔

② ایسے طہر میں طلاق دی جائے جس میں خاوند اپنی بیوی سے مباشرت کر چکا ہو۔

③ ایک طلاق کے بجائے بیک وقت تین طلاق دیدے۔

④ دو گواہوں کے بغیر طلاق دے یہ بھی یاد رہے کہ حالت حمل میں طلاق دینا بھی طلاق سنت ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے فرمایا تھا: ''تم اپنی بیوی کو حالت طہر یا حالت حمل میں طلاق دو۔'' [صحیح مسلم، الطلاق:۱۴۷۱]

طلاق بدعت کی مندرجہ بالا صورتوں میں طلاق کے نافذ ہونے کے متعلق اختلاف ہے۔جمہور ائمہ اربعہ رحمۃ اللہ علیہم ان حالات میں دی ہوئی طلاق کے واقع ہونے کا موقف رکھتے ہیں اگرچہ خلاف سنت طریقہ اختیار کرنے سے گناہ اور معصیت ہے۔اس کے برعکس امام ابن تیمیہ، امام ابن قیم، امام ابن حزم، علامہ شوکانی اور نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہم کا موقف ہے کہ ایسے حالات میں دی ہوئی طلاق نافذ نہیں ہوگی کیونکہ یہ طلاق بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہوتی ہے تو گمراہی سے کسی قسم کا حکم ثابت نہیں ہوتا، نیز حدیث میں ہے کہ ''جس نے کوئی ایسا کام کیا جس پر ہمارا حکم نہیں وہ مردود ہے۔'' [صحیح بخاری:۲۶۹۷]

چونکہ طلاق بدعت کا حکم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے نہیں دیا، جب یہ مردود ہے تو اسے شمار کیونکر کیا جاسکتا ہے لیکن

جمہور علما اپنے مؤقف کے متعلق بہت مضبوط دلائل رکھتے ہیں جن میں سرفہرست امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور ہمارا رحجان بھی اسی طرف ہے۔ ہم اختصار کے پیش نظر طلاق بدعت کی پہلی صورت کا جائزہ لیتے ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے:

''جب حائضہ کو طلاق دی جائے تو وہ اس طلاق کی وجہ سے عدت گزارے گی۔'' [صحیح بخاری، الطلاق، باب نمبر:۲]

بخاری کے ایک نسخہ میں ہے کہ دوران حیض دی ہوئی طلاق کو شمار کیا جائے گا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کو ذکر کیا ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ ''وہ رجوع کرے'' ایک راوی کہتا ہے کہ آیا کیا گیا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کیوں نہیں۔ [صحیح بخاری، الطلاق:۵۲۵۲]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے مختلف طریق ذکر کرنے کے بعد اس بات کو ثابت کیا ہے کہ دوران حیض دی گئی طلاق کو شمار کیا جائے گا۔ [ارواء الغلیل، ص:۱۳۳، ج۷]

اسے طلاق شمار کرنے کے متعلق کچھ آثار وقرائن حسب ذیل ہیں:

① رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو رجوع کا حکم دیا اور رجوع ہمیشہ طلاق کے بعد ہوتا ہے، اس رجوع کو لغوی قرار دینا سخن سازی اور سینہ زوری ہے۔ [بیہقی، ص:۹، ج۴]

② اس حدیث کے بعض طرق میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم نے جو طلاق دی ہے وہ ایک ہے۔'' [دار قطنی، ص:۹، ج۴]

③ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ طلاق جو اس نے دی ہے، شمار کی جائے گی۔'' [بیہقی، ص:۲۳۶، ج۷]

④ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما خود کہتے ہیں کہ یہ طلاق مجھ پر شمار کرلی گئی۔ [صحیح بخاری:۵۲۵۳]

ایک راویت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کچھ بھی خیال نہ فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس طریقہ کار کو درست خیال نہ فرمایا۔ صورت مسئولہ میں ہے کہ خاوند نے پہلی طلاق ایسے طہر میں دی تھی جس میں وہ بیوی سے مقاربت کر چکا تھا۔ اس کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ لیکن جمہور علما اس بات کے قائل ہیں کہ اس طرح طلاق دینا اگرچہ گناہ اور معصیت ہے لیکن اس کے باوجود طلاق واقع ہو جائے گی، جیسا کہ مسروقہ چھری سے جانور ذبح کرنا اگرچہ گناہ ہے لیکن جانور ذبح ہو جائے گا۔ اسی طرح گواہوں کے بغیر طلاق دینے سے بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے، حالانکہ ایسا کرنا گناہ ہے۔ اب ہم صورت مسئولہ کو دیکھتے ہیں کہ سائل نے پہلی مرتبہ طلاق کے بعد رجوع کرلیا، پھر تحریری طور پر دوسری طلاق دی، پھر رجوع کرلیا آخر کار بیوی کے معاندانہ رویے کی وجہ سے تیسری طلاق بھی دے دی اور اب ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ سائل نے بیوی کو طلاق دینے کا نصاب پورا کرلیا ہے کیونکہ خاوند کو زندگی میں صرف تین طلاق دینے کا اختیار دیا گیا ہے ان میں پہلی دو رجوعی اور آخری قطعی ہوتی ہے اس کے بعد عام حالات میں رجوع نہیں ہوسکتا، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''طلاق (رجعی) دوبار ہے، پھر یا تو سیدھی طرح سے اپنے پاس رکھا جائے یا بھلے طریقے سے اسے رخصت کر دیا جائے۔'' [۲/البقرہ:۲۲۹]

پھر اگر مرد (تیسری مرتبہ) طلاق بھی دیدے تو اس کے بعد وہ عورت اس کے لئے حلال نہ رہے گی تا آنکہ وہ کسی شخص سے

نکاح کرے۔ [۲/البقرہ:۲۳۰]

ان آیات کے پیش نظر صورت مسئولہ میں سائل نے وقفہ وقفہ کے ساتھ رجوع کے بعد اپنے اختیارات کو استعمال کر لیا ہے۔ اگر چہ پہلی طلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقہ کے خلاف دی ہے، تاہم گناہ اور معصیت ہونے کے باوجود تیر اپنے ترکش سے نکل چکا ہے اور نشانے پر لگ گیا ہے، اسی طرح باقی دو طلاق بھی دے چکا ہے ہمارے نزدیک اب رجوع کی کوئی صورت نہیں ہے۔ قرآن کریم کے مطابق صرف ایک صورت باقی ہے کہ وہ عورت آبادی کی نیت سے آگے نکاح کرے کسی قسم کی حیلہ گری پیش نظر نہ ہو، پھر ازدواجی زندگی بسر کرنے کے بعد وہ اسے طلاق دیدے یا فوت ہو جائے تو عدت گزارنے کے بعد پہلے خاوند سے نکاح ہو سکتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ہاں، اگر وہ دوسرا اسے طلاق دیدے تو پھر پہلا خاوند اور یہ عورت دونوں اگر ظن غالب رکھتے ہوں کہ وہ حدود اللہ کی پابندی کر سکیں گے تو وہ آپس میں رجوع کر سکتے ہیں اور ان پر کچھ گناہ نہیں ہوگا۔'' [۲/البقرہ:۲۳۰]

اگر چہ ہمارے بعض اہل علم کا موقف ہے کہ پہلی طلاق طریقہ نبوی کے مطابق نہیں دی گئی اس بنا پر وہ واقع نہیں ہوئی، لہٰذا ابھی رجوع کی گنجائش ہے لیکن ہمیں اس موقف سے اتفاق نہیں کیونکہ جمہور امت کے خلاف ہے، نیز حزم و احتیاط کا بھی تقاضا ہے کہ ایسے مشتبہ امور سے اجتناب کیا جائے اور شکوک و شبہات والے معاملات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال میں نے اپنے والدین کے کہنے پر اپنی مرضی کے خلاف پہلے سے تیار کردہ طلاق نامہ پر دستخط کئے ہیں جبکہ میں نے زبان سے طلاق وغیرہ کے الفاظ نہیں کہے اور نہ ہی میرا طلاق دینے کا ارادہ تھا، اب ہم صلح کرنا چاہتے ہیں میری راہنمائی فرمائیں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

جواب بشرط صحت سوال میں واضح ہو کہ صورت مسئولہ میں جبر و اکراہ کی کوئی صورت نہیں ہے کہ اس میں دی ہوئی طلاق کو غیر مؤثر قرار دیا جائے، طلاق دیتے وقت زبان سے اقرار ضروری نہیں بلکہ طلاق دینا یا لکھے ہوئے طلاق نامہ پر دستخط کرنا بھی اقرار ہی کی ایک صورت ہے۔ اس بنا پر مذکورہ طلاق رجعی ہے بشرطیکہ پہلی یا دوسری طلاق ہو، طلاق رجعی کے بعد عدت کے اندر اندر رجوع ہو سکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''اگر ان کا آپس میں صلح و اتفاق کا ارادہ ہو تو خاوند حضرات انہیں دوران عدت واپس لینے کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔'' [۲/البقرہ:۲۲۸]

عدت گزر جانے کے بعد بھی تجدید نکاح سے تعلقات کو استوار کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر:۲۳۲ میں اس کی صراحت ہے لیکن اس صورت میں عورت کی رضامندی، سرپرست کی اجازت سے نئے حق مہر کے ساتھ گواہوں کی موجودگی میں تجدید نکاح ہوگا۔ [واللہ اعلم]

سوال میرے ایک دوست نے مجھے نشہ آور شربت پلا دیا جس کے نتیجہ میں مجھے کوئی ہوش نہ رہا نشے میں آ کر میں اپنے سسر کو گالی گلوچ کرتا رہا اور اپنی بیوی کو طلاق، طلاق کہتا رہا، جب مجھے ہوش آیا تو میرے گھر والوں نے بتایا کہ تو نے اپنے سسر کو گالیاں اور اپنی بیوی کو طلاق دیدی ہے، کیا ایسے حالات میں طلاق ہو جاتی ہے؟

جواب بحالت نشہ دی جانے والی طلاق کے متعلق متقدمین ائمۂ کرام کا اختلاف ہے مگر راجح موقف یہی ہے کہ ایسی حالت

میں طلاق واقع نہیں ہوتی، البتہ یہ ضروری ہے کہ طلاق دینے والے کی عقل نشہ کی وجہ سے معطل ہو چکی ہو اور وہ ہذیان بکنے لگا ہو، نیز اسے اپنے نفع ونقصان کا بھی پتہ نہ ہو چونکہ معاملات میں تصرف کرنے کے لئے عقل بنیادی حیثیت بلکہ اولین شرط ہے جو بحالت نشہ زائل ہو چکی ہے، اس لئے ایسے حالات میں طلاق واقع نہیں ہوگی، جیسا کہ عقل کے فقدان کی وجہ سے دیوانے اور بچے کی دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ ''مجنون اور نشہ والے کی طلاق نہیں ہے''۔

[صحیح بخاری، کتاب الطلاق تعلیقاً]

نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فرمان ہے کہ ''نشہ والے اور بے اختیار انسان کی طلاق جائز نہیں ہے۔'' [بخاری حوالۂ مذکورہ]

صورت مسؤلہ میں چونکہ طلاق دہندہ نشہ کی حالت میں اپنے منہ سے نکلنے والی باتوں سے بالکل بے خبر تھا ایسے حالات میں دی ہوئی طلاق کا کوئی اعتبار نہیں، عقل بھی اس بات کا تقاضا کرتی ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال میں نے ایک عورت سے شادی کی، نکاح کے چھ ماہ بعد پتہ چلا کہ وہ پہلے کسی کی منکوحہ ہے اور اس سے طلاق نہیں لی گئی، ایسے حالات میں میرے لئے کیا حکم ہے؟

جواب قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''نیز وہ تمام عورتیں بھی حرام ہیں جن کے شوہر موجود ہوں مگر وہ کنیزیں جو تمہارے قبضہ میں آجائیں۔'' [۴/النساء:۲۴]

اس آیت کے پیش نظر وہ عورت جس کا خاوند پہلے سے موجود ہو اس سے نکاح جائز نہیں ہے، ہاں، اگر وہ اسے طلاق دے دے یا فوت ہو جائے تو عدت گزارنے کے بعد اس سے نکاح کرنا جائز ہے۔ صورت مسؤلہ میں جس عورت سے نکاح کیا گیا ہے وہ پہلے سے کسی دوسرے کی منکوحہ ہے۔ اس لئے شرعاً نکاح صحیح نہیں ہے، اس لئے ضروری ہے کہ فوراً اس سے علیحدگی اختیار کی جائے چونکہ کسی شبہ کی بنا پر اس سے وظیفہ زوجیت ادا کر چکا ہے، اس لئے حق مہر سے اسے کچھ نہیں ملے گا وہ عورت کا ہے اس سے نکاح صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ پہلا خاوند اسے طلاق دے، پھر عدت گزارنے کے بعد کسی دوسرے سے نکاح ہو سکتا ہے۔ اس کے بغیر اسے نکاح میں رکھنا ناجائز اور حرام ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال میرے خاوند نے عرصہ دو سال سے طلاق دے کر اپنی زوجیت سے فارغ کر دیا ہے، اب میرا اللہ کے علاوہ کوئی سہارا نہیں ہے۔ میں زندگی گزارنے کے لئے کسی سہارے کی تلاش میں ہوں، کیا شریعت کی رو سے مجھے نکاح ثانی کرنے کی اجازت ہے؟ از راہ کرم اس سلسلہ میں میری راہنمائی فرمائیں۔

جواب جس عورت کو طلاق دی جاتی ہے دوران عدت خاوند کو اس سے رجوع کرنے کا پورا پورا حق ہوتا ہے، عدت گزرنے کے بعد عورت آزاد ہے، شریعت نے اسے نکاح ثانی کرنے کی اجازت دی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور جب تم عورتوں کو طلاق دیدو اور ان کی عدت پوری ہو جائے تو انہیں دوسرے شوہروں کے ساتھ نکاح کرنے سے مت روکو جبکہ وہ آپس میں معروف طریقہ کے مطابق رضامند ہوں۔'' [۲/البقرہ:۲۳۲]

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہے اور عورت عدت گزارنے کے بعد کہیں دوسری جگہ نکاح کرنا چاہتی ہے

تو اس کے سابقہ شوہر کو ایسی کمینی حرکت نہیں کرنی چاہیے کہ اس کے نکاح میں رکاوٹ بنے اور یہ کوشش کرے کہ جس عورت کو اس نے چھوڑا ہے اسے کوئی دوسرا اپنے نکاح میں لانا پسند نہ کرے۔ کیونکہ دوسری جگہ نکاح کرنا عورت کا حق ہے سابق شوہر کو اس حق میں حائل ہونے کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔ لیکن نکاح ثانی کے لئے چند چیزوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

☆ اپنے سرپرست کی اجازت انتہائی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔

☆ حق مہر اور گواہوں کی موجودگی بھی لازمی ہے۔

☆ اس نکاح کو خفیہ نہ رکھا جائے بلکہ جہاں عورت رہائش پذیر ہے اس کے قرب وجوار میں رہنے والوں کو اس نکاح کا علم ہونا چاہیے۔ صورت مسئولہ میں سائلہ کو مذکورہ شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے نکاح ثانی کرنے کی اجازت ہے۔ شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی نے اپنی بیوی کو ایک طلاق دے کر گھر سے نکال دیا تھا، چار سال بعد وہ اپنی مطلقہ بیوی سے رجوع کرنا چاہتا ہے۔ کیا شریعت میں اس کی گنجائش ہے؟

جواب بیوی کو ایک رجعی طلاق دینے کے بعد خاوند کو اس سے دوران عدت رجوع کرنے کا حق ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر ان کے شوہر تعلقات درست کرنے پر آمادہ ہوں تو وہ دوران عدت انہیں اپنی زوجیت میں واپس لینے کے زیادہ حق دار ہیں۔''

[۲/البقرہ:۲۲۸]

آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ دوران عدت اگر رجوع کرنا چاہے تو سابقہ نکاح سے ہی پھر گھر آباد کیا جاسکتا ہے، اگر عدت گزر جانے کے بعد رجوع کا خیال آیا ہے تو نئے نکاح کے ساتھ رجوع ہو سکے گا جس کے لئے سرپرست کی اجازت، بیوی کی رضا مندی، نیز حق مہر اور گواہوں کا بھی از سر نو اہتمام کرنا ہوگا۔ صورت مسئولہ میں ایک رجعی طلاق دینے کے بعد چار سال کا عرصہ گزر چکا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ عدت کے ایام ختم ہو چکے ہیں، اب عورت اگر رضا مند ہے اور اس کا سرپرست بھی اجازت دیتا ہے تو نکاح جدید سے رجوع ممکن ہے اب عورت پر دباؤ نہیں ڈالا جا سکتا ہے، کیونکہ عدت گزر جانے کے بعد وہ آزاد ہے۔ اس کی مرضی ہو تو آگے کسی دوسرے شخص سے بھی نکاح کر سکتی ہے، اگر چاہے تو پہلے خاوند کے پاس بھی واپس آ سکتی ہے۔ بہر صورت اسے نکاح جدید کرنا ہوگا۔ صورت مسئولہ میں پہلا خاوند اگر معروف طریقہ کے مطابق اسے اپنے گھر آباد کرنے کا خواہش مند ہے تو مطلقہ بیوی سے نکاح جدید ہوسکتا ہے لیکن آئندہ اتفاق ومحبت سے زندگی بسر کرنے کا عہد کرنا ہوگا۔ [واللہ اعلم]

سوال میں اپنی بیوی کو یونین کونسل کی وساطت کے بغیر اپنے طور پر ہر ماہ طلاق بذریعہ ڈاک ارسال کرتا رہا ہوں، نصاب طلاق یعنی تین طلاقیں مکمل ہو جانے کے بعد مجھے کہا گیا کہ اپنے طور پر طلاق بھیجنا درست نہیں کیونکہ قانونی اعتبار سے ایسی طلاق غیر مؤثر ہے، پھر میں نے رائج الوقت قوانین کے مطابق بذریعہ یونین کونسل چوتھی طلاق ارسال کر دی، کیا اس طرح طلاق دینے سے بیوی مجھ پر ہمیشہ کے لئے حرام ہوگئی یا رجوع کرنے کی گنجائش ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ کے ہاں حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے کیونکہ اس فعل سے صرف میاں بیوی کے

تعلقات ہی متاثر نہیں ہوتے بلکہ اس سے دو خاندانوں میں دائمی طور پر نفرت اور دشمنی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔لہٰذا انسان کو چاہیے کہ اپنے حق طلاق کو بہت سوچ سمجھ کر استعمال کرے،طلاق کوئی کھلونا نہیں ہے کہ اسے کوئی ہاتھ میں لے کر کھیلنے کے لئے بیٹھ جائے۔ لیکن بعض اوقات انسان اس قدر مجبور ہو جاتا ہے کہ حق طلاق اس کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب میاں بیوی کے درمیان اختلاف اس قدر شدت اختیار کر جائیں کہ دونوں ضد اور ہٹ دھرمی پر اتر آئیں، پھر دونوں مل کر زندگی گزارنے پر کسی طرح بھی راضی نہ ہوں،ایسے حالات میں طلاق دینا ہی مناسب ہوتا ہے،تاہم اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو ضابطہ وضع فرمایا ہے اس پر عمل پیرا ہونے سے باہمی مل بیٹھنے کی گنجائش باقی رہتی ہے،یعنی ایک یا دو طلاق دینے کی صورت میں اگر عدت گزر بھی جائے تو بھی مطلقہ عورت اور اس کے سابقہ شوہر کے درمیان باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔لیکن اگر آدمی وقفہ وقفہ سے تین طلاق دے چکا ہو،جیسا کہ صورت مسؤلہ میں ہے تو نہ عدت کے اندر رجوع ممکن ہے اور نہ عدت گزرنے کے بعد دوبارہ نکاح کیا جاسکتا ہے اِلَّا یہ کہ عورت کا نکاح کسی اور شخص سے ہو اور وہ نکاح صحیح نوعیت کا ہو سازشی نہ ہو، پھر دوسرا شوہر اس سے مباشرت بھی کر چکا ہو،اس کے بعد وہ اسے طلاق دیدے،یا فوت ہو جائے تو اس کے بعد اگر عورت اور اس کا سابق شوہر باہمی رضامندی سے ازسرنو نکاح کرنا چاہیں تو عدت طلاق یا عدت وفات کے بعد رشتہ ازدواج میں منسلک ہوسکتے ہیں۔صورت مسؤلہ میں اگرچہ طلاق ملکی قوانین کے مطابق نہیں دی گئی،تاہم شرع کے اعتبار سے وہ نافذ ہو چکی ہے،اس بنا پر تین طلاق دینے کے بعد طلاق دہندہ پر اس کی بیوی ہمیشہ کے لئے حرام ہوگئی ہے۔ملکی قوانین اگر شرعی قوانین سے متصادم نہ ہوں تو ان پر عمل ضروری ہے بصورت دیگر شرعی قوانین پر عمل ہوگا۔ [واللہ اعلم]

سوال مسماۃ ''ف'' کا اپنے خاوند سے کسی بات پر جھگڑا ہوا تو وہ اپنے بیٹے اور دو بیٹیوں کو لے کر گھر سے فرار ہوگئی، پھر اس نے اپنے بیٹے کو ولی بنا کر اپنے بھتیجے سے بیٹی کا نکاح کر دیا جبکہ حقیقی ولی لڑکی کا باپ موجود ہے،اس نکاح کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب بیوی کا گھریلو جھگڑے کی وجہ سے اپنے بچوں کو لے کر جانا انتہائی باغیانہ اقدام ہے حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:''اگر کسی عورت سے اس کا خاوند ناراض ہے تو اس کے راضی ہونے تک فرشتے اس عورت پر لعنت کرتے رہتے ہیں۔''
[صحیح مسلم،النکاح:۱۴۳۶]

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیوی کے لئے اس کے خاوند کو جنت یا جہنم قرار دیا ہے یعنی اس کی اطاعت باعث جنت اور نافرمانی موجب جہنم ہے۔ [مسند امام احمد،ص:۳۴۱،ج۴]

رسول اللہ ﷺ نے اس بات کی بایں الفاظ وضاحت فرمائی ہے کہ''جب عورت نماز پنجگانہ ادا کرتی ہے اور اپنے خاوند کی اطاعت کے ساتھ ساتھ عفت و پاکدامنی اختیار کرتی ہے تو قیامت کے دن اسے اختیار دیا جائے کہ جنت میں جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔'' [مسند امام احمد،حدیث نمبر:۱۶۶۱]

ان احادیث کے پیش نظر ہم اس عورت کو نصیحت کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو لے کر اپنے گھر چلی جائے تاکہ دنیا کے ساتھ اس کی آخرت برباد نہ ہو۔اس تمہیدی گزارش کے بعد مسئلہ کی وضاحت بایں طور پر ہے کہ قرآن و حدیث میں

نکاح کے لئے جو اصول وضوابط بیان ہوئے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ کوئی عورت اپنے سر پرست کی اجازت کے بغیر نکاح نہ کرے اور سر پرست کی بنیاد قرابت ورشتہ داری پر ہے، جیسے باپ اور بھائی وغیرہ نیز قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور کا رشتہ دار سر پرست نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جو سر پرست باعتبار رشتہ جتنا قریب ہوگا اتنا ہی اس کے دل میں اپنے زیر سر پرست کے لئے شفقت وہمدردی زیادہ ہوگی اور وہ اس کے مفادات کا زیادہ تحفظ کرے گا۔ باپ کو اس معاملہ میں اولیت اس وجہ سے حاصل ہے کہ اس کی موجودگی میں کوئی دوسرا رشتہ دار سر پرست نہیں ہوسکتا۔ اس والد کی اجازت کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ حدیث میں ہے کہ ''جس عورت نے بھی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا وہ نکاح باطل ہے بے بنیاد اور بے سروپا ہے۔'' [مسند امام احمد، ص:۱۴۵، ج۶]

اسی طرح حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ولی کے بغیر نکاح نہیں ہے۔''

[مسند امام احمد، ص:۳۹۴، ج۴]

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو اپنی مستدرک میں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ مذکورہ روایت حضرت علی بن ابی طالب، عبداللہ بن عباس، معاذ بن جبل، عبداللہ بن عمر، ابوذر غفاری، مقداد بن اسود، عبداللہ بن مسعود، جابر بن عبداللہ، ابوہریرہ، عمران بن حصین، عبداللہ بن عمرو بن العاص، مسور بن مخرمہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔ اسی طرح ازواج مطہرات حضرت عائشہ، حضرت ام سلمہ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہن سے بھی اس مضمون کی روایات صحت کے ساتھ موجود ہیں۔ [مستدرک، ص:۱۷۲، ج۲]

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جس روایت کو دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیان کریں وہ مختار مذہب کے مطابق متواتر شمار ہوتی ہے۔ [تدریب الراوی، ص:۱۱۷، ج۲]

ان روایات کے مطابق صورت مسئولہ میں جو نکاح ہوا ہے وہ باطل ہے اسی طرح نکاح کرنے والا جوڑا گناہ کی زندگی بسر کرتا ہے۔ انہیں اللہ کے حضور صدق دل سے توبہ کرنے کے بعد اپنے والد کو اعتماد میں لے کر از سرنو نکاح کرنا ہوگا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جو امیر المؤمنین فی الحدیث ہیں ان کی مصالح عباد پر بڑی گہری نظر ہوتی ہے اس کے ساتھ ساتھ استدلال میں وہ نصوص کا پہلو بھی انتہائی مضبوط رکھتے ہیں۔ انہوں نے زیر بحث مسئلہ کے متعلق ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے۔

''جس شخص کا یہ موقف ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔''

پھر ایک دوسرا باب قائم کرتے ہیں: ''کوئی باپ یا رشتہ دار کسی کنواری یا شوہر دیدہ کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر نہ کرے۔''

ان دونوں ابواب کا منشا یہ ہے کہ نہ تو عورت مطلق العنان ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے نکاح کرے اور نہ ہی وہ اس قدر مقہور ومجبور ہے کہ اس کا سر پرست جہاں چاہے جس سے چاہے عقد کردے بلکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ایک عنوان اس طرح قائم کیا ہے: ''اگر کسی نے اپنی بیٹی کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر کردیا تو یہ نکاح مردود ہے۔'' درحقیقت شریعت اعتدال کو قائم رکھنا چاہتی ہے نہ تو سر پرست کو اتنے وسیع اختیارات حاصل ہیں کہ وہ اپنی بہن یا بیٹی کی مرضی کے بغیر جہاں چاہے اس کا نکاح کردے اور نہ ہی عورت کو اس قدر کھلی آزادی دی ہے کہ وہ از خود سر پرست کی اجازت کے بغیر نکاح کرکے اپنے خاندان کی عزت وآبرو کو خاک میں ملادے۔ ہاں، اگر باپ کے متعلق باوثوق ذرائع سے پتہ چل جائے کہ وہ اپنے

زیر سرپرست کے لئے مہر ووفا کے جذبات سے عاری ہے یا اس کے مفادات کا محافظ نہیں ہے تو وہ خود بخود حق ولایت سے محروم ہو جاتا ہے۔

حدیث میں اس کی وضاحت موجود ہے، چنانچہ بعض روایات میں ''ولی مرشد'' کے الفاظ ملتے ہیں۔ [بیہقی، ص:۱۲۴، ج ۷]

جس کا مطلب یہ ہے کہ جو سرپرست ہمدردی کے جذبات سے سرشار ہو وہی فریضہ نکاح کی اجازت کا حقدار ہے۔ بہرحال صورت مسئولہ میں بیان کردہ نکاح سرے سے منعقد نہیں ہوا کیونکہ حقیقی سرپرست کی اجازت کے بغیر ہوا ہے اور وہ اپنی بچی کے متعلق ہمدردی کے جذبات بھی رکھتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک عورت کا کسی شخص سے نکاح ہوا، کچھ مدت کے بعد عورت کو پتہ چلا کہ اس کا خاوند ناکارہ، جوئے باز اور فحش کار ہے اور بیوی کے جملہ حقوق پورا کرنے سے بھی قاصر ہے، عورت نے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے غیر شرعی دھندا شروع کر دیا جس کی بنا پر بیوی اور خاوند کا ہمیشہ جھگڑا رہنے لگا، نوبت بایں جا رسید کہ ایک دن مذکورہ خاوند نے اپنی بیوی کو مار پیٹ کر اپنے گھر سے نکال دیا، چنانچہ وہ اپنے والدین کے ہاں چلی گئی والدین نے صلح کی کوشش کی لیکن ناکام رہے، بالآخر اس کی بیوی نے اس سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لئے عدالتی چارہ جوئی کی۔ بالآخر عدالت نے یک طرفہ کارروائی کرتے ہوئے عورت کے حق میں تنسیخ نکاح کا فیصلہ دے دیا۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ وہ عورت عدالتی تنسیخ نکاح کے بعد آگے کسی اور دوسرے شخص سے نکاح کر سکتی ہے؟

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ ائمہ کرام کا اس کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ عدالت کا فیصلہ نافذ العمل ہے، جبکہ کچھ حضرات کہتے ہیں کہ عدالت مصالحت تو کرا سکتی ہے لیکن طلاق چونکہ خاوند کا حق ہے، اس لئے عدالت کو یہ اختیار نہیں کہ وہ ان کے مابین تنسیخ نکاح کا فیصلہ کرے۔ ہماری ناقص رائے کے مطابق پہلے حضرات کا موقف صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ شریعت نے خاوند کو عورت کے متعلق معاشرت بالمعروف کا پابند کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''تم ان سے دستور کے مطابق زندگی بسر کرو۔'' [۴/النسآء:۱۹]

اخراجات کی ادائیگی اور دیگر حقوق کی بجا آوری بھی خاوند کے ذمے ہے، جو صورت مسئولہ میں وہ پوری نہیں کر رہا، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو تکلیف دینے کی غرض سے گھروں میں روکے رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ فرمان الٰہی ہے: ''تم انہیں تکلیف دینے کے لئے مت روکو کہ تم زیادتی کا ارتکاب کرو۔'' [۲/البقرہ:۲۳۱]

ان حالات کے پیش نظر عورت اگر مجبور ہو کر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے تو یہ اس کا حق ہے خاوند کو چاہیے تھا کہ وہ عدالت میں حاضر ہو کر اپنی صفائی پیش کرتا، تاکہ عدالت کو یک طرفہ کارروائی کرنے کا موقع نہ ملتا، اب دو ہی صورتیں ہیں:

① اپنے خلاف لگائے گئے الزامات کو صحیح سمجھتے ہوئے عدالت میں حاضر نہیں ہوا۔

② وہ اپنی بیوی کو اپنے گھر بسانا نہیں چاہتا۔

دونوں صورتوں میں عدالت کا فیصلہ صحیح اور نافذ العمل ہے۔ عدت گزارنے کے بعد عورت کسی بھی دوسرے آدمی سے نکاح

کر سکتی ہے۔ یہ اس کا حق ہے جسے شریعت کسی بھی صورت میں پامال نہیں کرنا چاہتی۔ مسئلہ کی وضاحت کے ساتھ ہم اس تلخ حقیقت کا اظہار کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتے، کہ بدقسمتی سے ہمارا شریعت سے تعلق صرف ذاتی مفادات کی حد تک ہے، چنانچہ صورت مسئولہ میں مذکورہ عورت نے اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے جو طریقہ کار اپنایا وہ انتہائی قابل نفریں اور باعث لعنت ہے۔ ایک غیرت مند آدمی اس بے حیائی کو اپنے گھر کب گوارا کر سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک خاوند کا زدوکوب کرنے کے بعد اسے گھر سے نکال دینے کا یہ اقدام اس کی غیرت کا تقاضا تھا، چنانچہ اس نے اپنے آپ پر دیوث ہونے کا دھبہ نہیں لگنے دیا، جب سر پر مصیبت پڑی ہے تو شریعت کی طرف توجہ کی گئی ہے حق تو یہ تھا کہ جب خاوند اخراجات پورے نہیں کرتا تھا تو اسی وقت شریعت کی طرف رجوع کیا جاتا یا عدالتی چارہ جوئی کے ذریعے اپنا حق لیا جاتا، لیکن شریعت کو نظر انداز کر کے بدکاری اور بے حیائی کا راستہ اختیار کیا گیا، اس طرح حالات مزید خراب ہو گئے، اب اس عورت کو سوچنا چاہیے کہ قرآن وسنت کی درج ذیل آیت کہیں اس پر تو نہیں چسپاں ہو رہی

''بدکار عورتیں بدکار مردوں کے لئے فحش کار مرد فحش کار عورتوں کے لئے ہیں۔'' [۲۴/النور:۲۶]

عورت کو چاہیے کہ وہ اللہ کے حضور اپنے گناہ کی معافی مانگے اور آئندہ ایسا اقدام نہ کرنے کا عزم کرے، جس سے اس کی عزت وناموس مجروح ہوتی ہو، تاکہ وہ کسی شریف آدمی کے لئے مزید رسوائی اور خرابی کا باعث نہ ہو۔ مختصر یہ ہے کہ عدالتی فیصلہ کے بعد وہ عدت گزارنے کی پابند ہے۔ اس کے بعد وہ نکاح ثانی کرنے میں آزاد ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال میرے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ میں اپنی زندگی میں ان تمام کی شادیاں کر کے ان کے حقوق سے فارغ ہو چکا ہوں، اب بڑے لڑکے نے میرے ساتھ محاذ آرائی شروع کر دی ہے، میری بیوی بھی اس گستاخ اور نافرمان بیٹے کی ہم نوا ہے اور میری خدمت سے انکاری ہے۔ چھوٹا بیٹا میرے ساتھ ہے میرے پاس کچھ جائیداد باقی ہے۔ بچیاں اپنی خوشی سے میرے چھوٹے بیٹے کے حق میں دستبردار ہو چکی ہیں۔ اب میں اپنے نافرمان بیٹے کو اپنی جائیداد سے محروم کرنا چاہتا ہوں کیا میں شرعاً ایسا کر سکتا ہوں، نیز ان حالات میں جبکہ میری بیوی نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے کیا میں اسے طلاق دے سکتا ہوں، مجھے قیامت کے دن اس کا مواخذہ تو نہیں ہوگا۔ کتاب وسنت کی روشنی میں میری راہنمائی فرمائیں؟

جواب واضح ہو کہ بلاشبہ اولاد کا والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کرنا اور ان کا گستاخ ونافرمان ہونا کبیرہ گناہ ہے۔ حدیث کے مطابق قیامت کے دن اس قسم کے نافرمان اور گستاخ بچے اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت سے محروم ہوں گے اور انہیں کسی بھی صورت میں پاکیزہ قرار نہیں دیا جائے گا بلکہ انہیں اس جرم کی پاداش میں اللہ کے ہاں دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لیکن ان حالات کے باوجود والد کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی جائیداد سے محض نافرمان اور گستاخ ہونے کی وجہ سے کسی کو محروم کر دے، جائیداد سے محرومی کے اسباب شریعت نے متعین کر دیے ہیں، مثلاً: کفر، قتل، ارتداد وغیرہ، ان میں اولاد کا نافرمان ہونا یا گستاخ ہونا کوئی ایسا سبب نہیں ہے جسے بنیاد بنا کر اسے اپنی جائیداد سے محروم کیا جا سکے۔ قرآن کریم میں بیان ہے کہ ''يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ'' فرما کر ہر قسم کی اولاد کو ضابطہ میراث میں شامل کیا ہے۔ البتہ جو اولاد نص قطعی سے اس ضابطہ سے متصادم ہوگی اسے خارج قرار دیا جائے گا، جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے۔ ضابطہ میراث بیان کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (ضابطہ میراث

پر عمل کیا جائے) جبکہ وصیت جو کردی گئی ہے اسے پورا کیا جائے اور قرض جو میت کے ذمے ہے اس کی بھی ادائیگی کردی جائے بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو۔'' [۴/النسآء:۱۲]

اس مقام پر مفسرین نے لکھا ہے کہ وصیت میں ضرر رسانی یہ ہے کہ ایسے طور پر وصیت کی جائے جس سے مستحق رشتہ داروں کے حقوق تلف ہوتے ہوں یا کوئی ایسی چال چلے کہ جس سے مقصود اصل حقداروں کو محروم کرنا ہو۔ حدیث میں ہے کہ ''کسی کو بلا وجہ اپنی جائیداد سے محروم کرنا اس قدر سنگین جرم ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جنت میں ملنے والے حصے سے محروم کردیں گے۔'' (بیہقی) اس بنا پر نافرمانی اور گستاخی جیسے انتہائی سنگین جرم کے باوجود اولاد کو اپنی جائیداد سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے اپنے کسی بچے کو ایک غلام عطیہ کے طور پر دیا، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنانا چاہا تو آپ نے فرمایا کہ ''تو نے سب بچوں کو ایک ایک غلام دیا ہے؟'' صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ نہیں، اس پر آپ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے معاملہ میں عدل وانصاف سے کام لو۔'' [صحیح بخاری، الھبۃ: ۲۵۸۷]

بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اپنی اولاد کے درمیان مساوات کیا کرو۔'' [بیہقی، کتاب الھبات]

اگرچہ بعض علما نے یہ گنجائش نکالی ہے کہ باپ اولاد کے مخصوص حالات کے پیش نظر تقسیم میں تفاوت کرسکتا ہے، مثلاً: ایک لڑکا معذور، اپاہج یا بیمار ہے یا وہ طلب علم میں مصروف ہے لیکن انہوں نے ایسے حالات میں بھی دوسرے بھائیوں کی رضامندی کو ضروری قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ باپ کوئی ایسا اقدام نہ کرے جو بھائیوں کے درمیان دشمنی اور عداوت کا باعث ہو اور وہ اس کے کسی اقدام سے اس کی نافرمانی کا باعث بنیں۔ صورت مسئولہ میں بھی حالات کچھ اس قسم کے ہیں خرابی کی اصل وجہ یہی ہے کہ والد بڑے لڑکے کو محروم کرنا چاہتا ہے اگر اس نے بڑے لڑکے کو کلیتاً محروم کردیا تو اس سے مزید بگاڑ ہوگا۔ ممکن ہے کہ یہ بگاڑ چھوٹے بیٹے اور خود باپ کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن جائے۔ حالات کا تقاضا یہی ہے کہ باپ فرمانبردار اور نافرمان کی تمیز کئے بغیر اپنی اولاد میں مساوات قائم رکھے، شاید ایسا کرنے سے نفرت وکدورت کی آگ بھسم ہوجائے گی اور باپ کی طرف سے عدل وانصاف پر مبنی فراخ دلی آپس میں دلوں کے ملا دینے کا باعث ہو۔ ممکن ہے کہ اس انصاف پسندی کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کوئی اتفاق کی صورت پیدا کردے گا۔

سوال کا دوسرا حصہ نافرمان بیوی کو طلاق دینے سے متعلق ہے۔ ہمارے نزدیک ایسے معاملات میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ طلاق دینا اگرچہ مباح ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک ناپسندیدہ عمل بھی ہے۔ اگر حالات ایسے ہوں کہ نباہ کی کوئی صورت نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے خاوند کو اختیار دیا ہے کہ وہ اپنی نافرمان بیوی کو طلاق دے کر اپنی زوجیت سے الگ کردے تاکہ اسے ذہنی کوفت سے نجات مل جائے، عین ممکن ہے کہ بیوی اس لئے خدمت سے راہ فرار اختیار کرچکی ہو کہ وہ اولاد کے درمیان مساوات اور برابری دیکھنا چاہتی ہو۔ لیکن خاوند گستاخ اور نافرمان اولاد کو محروم کردینے پر تلا ہوا ہو۔ امید ہے کہ اولاد کے درمیان برابری کی تقسیم کرنے پر بیوی بھی فرمانبردار اور خدمت گزار بن جائے، بہرحال ہمیں اولاد کے معاملہ میں اپنے رویے پر نظر ثانی کرنا ہوگی اور اس سلسلہ میں روا رکھی جانے والی زیادتی اور ناہمواری کو ختم کرنا ہوگا۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ایک شخص نے شدید غصہ کی حالت میں اپنی بیوی کو کئی بار طلاق کے لفظ کہے لیکن غصہ کی بنا پر اسے پتہ نہیں رہا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، البتہ ایسے شواہد ملتے ہیں کہ اس نے کہا ''میں اپنی منکوحہ کو طلاق دیتا ہوں اور کچھ شواہد اس بات پر ہیں کہ اس نے یوں کہا: میرے گھر سے نکل جا، بصورت دیگر میں طلاق دے دوں گا، بہر حال غصہ اس قدر شدید تھا کہ خاوند کو ہوش نہ رہا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کیا کر رہا ہوں، برائے مہربانی ہماری اس الجھن کو دور کر دیں؟

جواب حالت غصہ میں دی ہوئی طلاق کے واقع ہونے یا نہ ہونے کے متعلق علمائے امت کا اختلاف ہے بعض کا خیال ہے کہ غصہ میں دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ بحالت اغلاق نہ طلاق ہوتی ہے اور نہ ہی غلام کو آزادی ملتی ہے۔

[ابوداؤد، الطلاق:۲۱۹۳]

اس حدیث میں آمد لفظ ''اغلاق'' کا معنی امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے غضب منقول ہے۔ یعنی بحالت غصہ طلاق دینا اور غلام کو آزاد کرنا شرعاً کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اغلاق کا یہی معنی کیا ہے فرماتے ہیں "الاغلاق اظنه فی الغضب" ابوداؤد کے بعض نسخوں میں بایں الفاظ عنوان قائم کیا گیا ہے: "باب الطلاق علی غضب" یعنی ''بحالت غصہ طلاق دینے کا بیان۔'' ان حضرات کے نزدیک غصہ کی حالت میں دی ہوئی طلاق نافذ نہیں ہوتی۔ جبکہ بعض دوسرے علمائے کرام کے ہاں بحالت غصہ دی ہوئی طلاق نافذ ہو جاتی ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ رضا و رغبت اور خوشی سے کوئی بھی طلاق نہیں دیتا بلکہ حالات خراب ہونے پر غصہ کی حالت میں ہی طلاق دی جاتی ہے۔ اگر غصہ کی حالت میں دی ہوئی طلاق کا اعتبار نہ کیا جائے تو کوئی بھی طلاق موثر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ہمیشہ طلاق حالت غصہ میں ہی دی جاتی ہے۔ امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہما نے اس موضوع پر ذرا تفصیل سے گفتگو کی ہے فرماتے ہیں کہ غصہ کی تین حالتیں ہوتی ہیں:

① ابتدائی حالت: یہ وہ حالت ہے جس میں غصہ تو ہوتا ہے لیکن انسان کے ہوش و حواس قائم رہتے ہیں، اس حالت میں دی ہوئی طلاق بالاتفاق ہو جاتی ہے۔

② انتہائی حالت: یہ وہ حالت ہے جس میں شدید غصہ کی وجہ سے انسان کے ہوش و حواس قائم نہیں رہتے۔ اسے کوئی علم نہیں ہوتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں یا کیا کر رہا ہوں۔ اس حالت میں دی ہوئی طلاق بالاتفاق نہیں ہوتی کیونکہ یہ ایک جنونی کیفیت ہے اور دیوانگی کی ایک صورت ہے اور مجنون اور دیوانہ مرفوع القلم ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ''تین آدمیوں سے قلم اٹھا لیا گیا ہے، ان میں سے ایک مجنون بھی ہے۔'' [مسند امام احمد:۶/۱۰۲]

③ درمیانی حالت: یہ وہ حالت ہے کہ غصہ کی وجہ سے عقل بالکل تو زائل نہیں ہوتی، تاہم یہ غصہ اس کی قوت فکر پر اس حد تک اثر انداز ضرور ہوتا ہے کہ اس دوران کی ہوئی کوتاہی پر بعد میں نادم ہوتا ہے۔ [زاد المعاد، فصل طلاق فی الاغلاق]

آخری صورت محل اختلاف ہے۔ امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہما و دیگر حنابلہ کے نزدیک اس درمیانی حالت میں دی ہوئی طلاق بھی واقع نہیں ہوتی۔ ان کی دلیل مذکورہ بالا حدیث میں ہے، جبکہ دوسرے اس درمیانی حالت میں دی ہوئی طلاق کو نافذ خیال کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک موخر الذکر علما کا موقف ہی صحیح ہے۔ کیونکہ طلاق عموماً غصہ میں دی جاتی ہے اور درمیانی حالت میں

غصہ دیوانگی کی حد تک نہیں پہنچتا۔ اس حالت میں طلاق دہندہ کو مرفوع القلم قرار دیا جائے۔ لہٰذا اگر غیظ وغضب اس حد تک پہنچ جائے جو انتہائی حالت میں بیان ہوا ہے کہ انسان اپنے آپ سے باہر ہو جائے اور اس کے ہوش وحواس بالکل قائم نہ رہ سکیں۔ یہاں تک اسے یہ بھی معلوم نہ ہو کہ میرے منہ سے کیا نکلا ہے اور اس کا انجام کیا ہوگا۔ تو ایسی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوگی۔ مگر غصے کی یہ انتہائی حالت شاذونادر ہی ہوتی ہے اور ایسا بہت کم ہوتا ہے۔

اس تفصیل کے پیش نظر جب صورت مسئولہ کے ظاہری الفاظ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ طلاق دہندہ طلاق دیتے وقت انتہائی غصے کی حالت میں تھا۔ اس حالت میں دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ لیکن آیا وہ حقیقتاً ایسا ہی تھا تو یہ طلاق دینے والا ہی بہتر جانتا ہے۔ لہٰذا اسے خود سوچنا چاہیے کہ میں طلاق دیتے وقت کس حالت میں تھا۔ حقیقت حال کے خلاف الفاظ تحریر کر کے فتویٰ لے لینے سے حرام شدہ چیز حلال نہیں ہوگی۔ حلال وحرام کے معاملہ میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر واقعی طلاق دہندہ نے غصے کی انتہائی حالت میں طلاق دی ہے اس کے ہوش وحواس قائم نہیں تھے تو اس صورت میں سرے سے طلاق واقع نہیں ہوگی اور اگر غصہ کی ابتدائی یا درمیانی حالت ہے تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ بالخصوص جبکہ وہ کئی بار ایسا کر چکا ہے، جیسا کہ سوال میں ذکر ہے تو وہ اپنی بیوی سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ بشرطیکہ طلاق دینے کا معاملہ مختلف مواقع میں پیش آیا ہو۔ اب عام حالت میں صلح کی کوئی صورت نہیں ہے اور اگر ایک ہی مجلس میں ایسا ہوا ہے تو ایک طلاق ہوگی اور عدت کے اندر اندر رجوع ہو سکے گا اگر دو دفعہ ایسا ہوا تو بھی رجوع کا حق باقی ہے۔ لیکن تیسری دفعہ ایسا کرنے سے رجوع کا حق ختم ہو جاتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک عورت کو اس کے خاوند نے طلاق دیدی جبکہ وہ حاملہ تھی۔ تقریباً طلاق کے ڈیڑھ ماہ بعد وضع حمل ہوا۔ کیا رجوع ممکن ہے اگر رجوع ممکن نہیں تو دوران عدت اپنے اخراجات اور بچے کی پیدائش کا خرچہ لے سکتی ہے، نیز نوزائیدہ بچے کا ذمہ دار کون ہے جبکہ والدہ اسے اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتی۔ اس کے علاوہ نکاح کے وقت جو عورت کو والدین کی طرف سے ساز وسامان دیا گیا تھا یا خاوند کو سسرال کی طرف سے جو تحائف دیے گئے تھے، ان کی واپسی کا مطالبہ کرنا شرعاً کیسا ہے؟

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ اگر خاوند نے اپنی بیوی کو رجعی طلاق دی ہے تو عدت کے دوران اسے رجوع کرنے کا حق ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''ان کے خاوند اگر صلح کرنا چاہیں تو دوران عدت اپنی زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حق دار ہیں''۔

[۲/البقرہ:۲۲۸]

اگر عدت گزر جائے تو ایک دوسری شکل ہوگی وہ یہ کہ اگر بیوی آنے پر آمادہ ہو تو نئے حق مہر کے ساتھ گواہوں کی موجودگی میں نکاح جدید ہوگا کیونکہ عدت کے گزرنے سے نکاح ختم ہو جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انہیں پہلے خاوند سے نکاح کرنے سے نہ روکو جبکہ وہ معروف طریقہ سے آپس میں نکاح کرنے پر راضی ہوں۔''

[۲/البقرہ:۲۳۲]

صورت مسئولہ میں عورت بوقت طلاق حاملہ تھی اور حاملہ مطلقہ کی عدت وضع حمل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل ہے۔'' [۶۵/الطلاق:۴]

مذکورہ عورت کا طلاق کے بعد وضع حمل ہو چکا ہے، جس کے ساتھ ہی اس کی عدت بھی ختم ہو چکی ہے چونکہ نکاح بھی ختم ہو چکا ہے اب رجوع کی صرف ایک صورت ہے کہ اگر لڑکی اپنا گھر بسانے پر آمادہ ہے تو جدید نکاح سے ایسا ممکن ہے لیکن اس کے متعلق عورت پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا جا سکتا، کیونکہ اب معاملہ عورت کی صوابدید اور رضامندی پر موقوف ہے۔

دوران عدت خاوند کو اپنی مطلقہ بیوی کے جملہ اخراجات بھی برداشت کرنا ہوں گے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے''اور اگر (مطلقہ عورتیں) حمل سے ہوں تو وضع حمل تک ان کا خرچہ دیتے رہو۔'' [۶۵/الطلاق:۶]

اس کے علاوہ وضع حمل پر اٹھنے والے اخراجات کا بھی خاوند سے مطالبہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ عورت نے بچہ خاوند کا ہی جنم دیا ہے بچے کی پیدائش کے بعد جب تک ماں بچے کو دودھ پلاتی رہے گی تو اس کے جملہ اخراجات بھی بذمہ خاوند ہوں گے اور اس سے ان اخراجات کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''پھر اگر وہ بچے کو تمہارے کہنے پر دودھ پلائیں تو انہیں ان کی اجرت دو۔'' [۶۵/الطلاق:۶]

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:''اور دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور لباس دستور کے مطابق باپ کے ذمہ ہوگا۔'' [۲/البقرہ:۲۳۳]

اگر مطلقہ بیوی بچے کو دودھ نہیں پلانا چاہتی تو اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:''ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے نقصان نہ پہنچایا جائے۔'' [۲/البقرہ:۲۳۳]

اندریں حالات صورت مسئولہ میں اگر مطلقہ اس نوزائیدہ بچے کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے تو یہ اس کا حق ہے اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔واضح رہے کہ یہ تمام باتیں اس صورت میں ہیں جب عورت رجوع، یعنی تجدید نکاح پر رضامند نہ ہو اگر وہ رجوع پر راضی ہے تو کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔رجوع نہ ہونے کی صورت میں والدین کی طرف سے اپنی بچی کو جو ساز و سامان دیا گیا۔خاوند سے اس سامان کی واپسی کا مطالبہ کرنا شرعاً درست ہے کیونکہ وہ لڑکی کا ذاتی سامان ہے جو اس کے والدین نے اسے استعمال کے لئے دیا تھا طلاق کے بعد خاوند کا اس میں کوئی حق نہیں ہے لیکن جو سامان نکاح کے بعد استعمال ہو چکا ہے یا ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اس کا مطالبہ صحیح نہیں ہے۔اسی طرح سسرال کی طرف سے خاوند کو شادی کے موقع پر تحفہ یا ہدیہ دے کر پھر اس کی واپسی کا مطالبہ کرنا ایسا ہے جیسے کتا اپنی قے کو چاٹتا ہے۔شریعت نے اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:''ہمارے ہاں ہدیہ دے کر واپسی کا مطالبہ کرنے والے کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی بری مثال نہیں ہے کہ کتا اپنی قے کو چاٹتا ہے۔'' [صحیح بخاری، الھبۃ:۲۶۲۲]

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم قے کو حرام جانتے ہیں یعنی ہبہ دے کر واپسی کا مطالبہ کرنا حرام ہے۔

مختصر یہ ہے کہ حاملہ عورت کو اگر طلاق دی جائے تو اس کی عدت وضع حمل ہے۔دوران عدت نکاح جدید کے بغیر رجوع ہو سکتا ہے۔وضع حمل کے بعد عورت کی رضامندی سے نئے حق مہر کے ساتھ گواہوں کی موجودگی میں نیا نکاح کر کے رجوع ممکن ہے۔دوران عدت خاوند کو اپنی بیوی کے جملہ اخراجات برداشت کرنا ہوں گے اور بچے کی پیدائش پر اٹھنے والے اخراجات کا بھی وہ خود ذمہ دار ہے۔شادی کے موقع پر والدین نے جو بچی کو ساز و سامان دیا تھا اس کا مطالبہ خاوند سے کیا جا سکتا ہے، لیکن اس موقع پر

خاوند کو جو تحائف وغیرہ دیے گئے ہیں ان کی واپسی کا مطالبہ صحیح نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال عرصہ ہوا مجھے میرے خاوند نے طلاق دے دی، اس کے بعد کوئی رابطہ نہیں کیا۔ مجھے تین سال بعد پتا چلا ہے کہ اس نے نئی شادی کر لی ہے۔ کیا میں اپنے جہیز، حق مہر اور والدین کی طرف سے دیے گئے طلائی زیورات کا مطالبہ کر سکتی ہوں؟

جواب طلاق دینے کے بعد اگر عدت ختم ہو جائے تو رشتہ ازدواج منقطع ہو جاتا ہے۔ اندریں حالات بیوی کو حق ہے کہ وہ اپنے جہیز، حق مہر اور دیگر طلائی زیورات کی واپسی کا مطالبہ کرے۔ خاوند کو چاہیے کہ وہ خوشی سے اپنی سابقہ بیوی کو اس کی تمام چیزیں واپس کرے، کیونکہ یہ سب چیزیں اس کی ملکیت ہیں، ویسے بھی اللہ تعالیٰ نے خاوند حضرات کو حکم دیا ہے کہ ''وہ اپنی مطلقہ عورتوں کو معروف طریقہ سے کچھ دے دلا کر رخصت کریں اور یہ بات پرہیز گاروں کے لئے انتہائی ضروری ہے۔'' [۲/البقرہ:۲۴۱]

اس کا مطلب یہ ہے کہ پرہیز گاروں کا یہ شیوہ نہیں ہوتا کہ وہ طلاق دے کر مطلقہ عورت کو خالی ہاتھ گھر سے باہر کریں۔

صورت مسئولہ میں عورت کو اپنی اشیائے جہیز، حق مہر اور دیگر طلائی زیورات واپس لینے کا پورا پورا حق ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال میں نے عرصہ چار سال قبل اپنی بیوی کو طلاق دی تھی۔ مطلقہ عورت نے ابھی تک نکاح ثانی نہیں کیا اور نہ ہی میں نے دوسری شادی کی ہے، کیا ایسے حالات میں اس سے رجوع ممکن ہے اگر ہے تو کیسے؟

جواب طلاق کے بعد چار سال کا عرصہ گزر چکا ہے، لہٰذا پہلا نکاح ختم ہو چکا ہے دوبارہ مل بیٹھنے کے لئے ضروری ہے کہ عورت کی رضامندی اس کے سرپرست کی اجازت سے نئے حق مہر کے ساتھ گواہوں کی موجودگی میں ازسرنو نکاح کیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو پھر تم اس میں رکاوٹ نہ ڈالو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کر لیں جبکہ وہ معروف طریقہ کے مطابق آپس میں نکاح کرنے پر راضی ہوں''۔ [۲/البقرہ:۲۳۲]

اس آیت کی تفسیر میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ کو اس کے خاوند نے رجعی طلاق دیدی، پھر رجوع نہ کیا تا آنکہ عدت ختم ہوگئی، پھر عدت کے بعد دوبارہ نکاح کے لئے اس نے پیغام بھیجا، حضرت معقل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے غیرت اور غصہ کی وجہ سے انکار کر دیا اور قسم اٹھائی کہ اب اس سے نکاح نہ ہونے دوں گا اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تو میں نے اس حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور قسم کا کفارہ ادا کر دیا۔

[صحیح بخاری، النکاح، حدیث نمبر:۵۱۳۰]

صورت مسئولہ میں درج بالا شرائط کے مطابق نکاح جدید سے دوبارہ گھر آباد کیا جا سکتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال میں نے اپنی بیوی کو ماہ بماہ تین طلاقیں دے کر اپنی زوجیت سے فارغ کر دیا ہے۔ آخری طلاق دو سال قبل دی تھی، کیا اب رجوع ہو سکتا ہے۔ کتاب وسنت کے حوالہ سے جواب دیں؟

جواب اسلام کے ضابطہ طلاق کے مطابق خاوند کو زندگی میں تین طلاقیں دینے کا اختیار ہے پہلی اور دوسری طلاق کے بعد حق رجوع باقی رہتا ہے جس کی صرف دو صورتیں ہیں:

① دوران عدت نئے نکاح کے بغیر۔

② عدت گزرنے کے بعد تجدید نکاح کے ساتھ۔

اگر تیسری طلاق بھی دیدی جائے تو رجوع کا حق ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''اگر شوہر (دو طلاقوں کے بعد) اپنی بیوی کو تیسری طلاق دیدے تو اس کے بعد جب تک عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے اس (پہلے شوہر) پر حلال نہ ہوگی۔'' [۲/البقرہ:۲۳۰]

واضح رہے کہ اس آیت میں نکاح سے مراد وظیفہ زوجیت ادا کرنا ہے۔یہ بھی یاد رہے کہ مذکورہ نکاح بھی گھر بسانے کی نیت سے کیا جائے ،عارضی یا مشروط نکاح نہ ہو، جیسا کہ ہمارے ہاں بدنام زمانہ ''حلالہ'' کیا جاتا ہے کیونکہ ایسا کرنا شرعاً حرام ہے۔اگر دوسرا خاوند فوت ہو جائے یا وہ بھی کسی وجہ سے اسے طلاق دیدے تو عدت گزرنے کے بعد وہ عورت پہلے خاوند سے نکاح کر سکتی ہے، صورت مسئولہ میں چونکہ ماہ بماہ تین طلاقیں ہو چکی ہیں۔اس بنا پر اس عورت کا عام حالات میں پہلے خاوند سے نکاح نہیں ہوسکتا۔

[واللہ اعلم]

سوال میرے خاوند نے مجھے متعدد مرتبہ طلاق دی ، پھر برادری کے دباؤ پر صلح کرتے رہے، میری یادداشت کے مطابق کم از کم دس مرتبہ ایسا ہو چکا ہے۔اب اس نے پھر مجھے طلاق دے دی ہے برادری میرے والد کو صلح پر مجبور کر رہی ہے جبکہ مجھے علم ہوا ہے کہ اب ایسا کرنا گناہ کی زندگی گزارنے کے مترادف ہے، اس سلسلہ میں راہنمائی فرمائیں؟

جواب ہمارے اس ترقی یافتہ دور میں جہالت کی انتہا ہے کہ ہمیں روزمرہ کے دینی مسائل کا علم نہیں ہے۔قرآن کریم کے مطابق خاوند کو زندگی میں صرف تین طلاقیں دینے کا اختیار ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''طلاق (رجعی) دوبار ہے، پھر یا تو سیدھی طرح سے اسے اپنے پاس رکھا جائے یا بھلے طریقہ سے اسے رخصت کر دیا جائے۔'' [۲/البقرہ:۲۲۸]

دور جاہلیت میں مرد کو لاتعداد طلاق دینے کا حق تھا مرد جب بگڑ جاتا تو اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا، پھر دوران عدت رجوع کر لیتا اس طرح لا متناہی سلسلہ جاری رہتا، نہ اسے اچھی طرح اپنے پاس رکھتا اور نہ ہی اسے آزاد کرتا کہ وہ کسی دوسرے سے نکاح کر سکے، آیت کریمہ میں اس معاشرتی برائی کا سد باب کیا گیا ہے اور مرد کو صرف دوبار طلاق دینے اور اس سے رجوع کرنے کا حق دیا گیا ہے تیسری طلاق کے بعد بیوی ہمیشہ کے لئے خاوند پر حرام ہو جاتی ہے اور عام حالات میں رجوع کرنے کا کوئی اختیار نہیں رہتا۔صورت مسئولہ میں بیوی ، خاوند اس کے والدین اور پوری برادری جہالت کا شکار ہے۔اب بیوی کسی صورت میں خاوند کے لئے حلال نہیں ہے اگر برادری کے دباؤ پر پہلے کی طرح ''رجوع'' کیا تو واقعی یہ گناہ کی زندگی گزارنے کے مترادف ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک شخص نے اپنی ہمشیرہ کا نکاح کسی سے کر دیا ،ہمشیرہ کے فوت ہونے کے بعد اس کا خاوند کسی دوسری عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اس سے اولاد بھی پیدا ہو جاتی ہے، اب کیا پہلا آدمی اپنے بہنوئی کی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے جو بہنوئی کی دوسری بیوی سے پیدا ہوتی ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے چند ایک خونی، رضاعی اور سسرالی رشتوں کا ذکر کیا ہے جن سے نکاح نہیں کیا جاسکتا، ان کو تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ''مذکورہ محرمات کے علاوہ دوسری عورتیں تمہارے لئے حلال کر دی گئی ہیں۔'' [۴/النساء:۲۴]

حدیث میں ان رشتوں کے علاوہ ایک اور رشتے کی نشاندہی کی گئی ہے جنہیں اپنے عقد میں نہیں لایا جا سکتا، یعنی خالہ اور بھانجی، نیز پھوپھی اور بھتیجی کو بیک وقت اپنے نکاح میں نہیں رکھا جا سکتا۔ [صحیح بخاری، النکاح:۵۱۰۹]

صورت مسئولہ میں بہنوئی کی لڑکی سے نکاح کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس کی بہن کے بطن سے نہ ہو بلکہ اس کے علاوہ کسی دوسری بیوی سے پیدا ہوئی ہو، یہ محرمات میں شامل نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال میری لڑکی نے میری عدم موجودگی میں میری اجازت کے بغیر نکاح کر لیا ہے قرآن وحدیث کی رو سے ایسے نکاح کی کیا حیثیت ہے؟

جواب قرآن وحدیث کی رو سے ایسا نکاح جو سرپرست کی اجازت کے بغیر ہو اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، ایسا نکاح سرے سے ہی نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کا واضح فرمان ہے کہ ''سرپرست کی اجازت کے بغیر نکاح درست نہیں۔''

[ابوداود، النکاح:۲۰۸۵]

نیز آپ نے فرمایا: ''جس عورت نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا، وہ باطل ہے۔'' آپ نے یہ الفاظ تین مرتبہ کہے۔ [مسند امام احمد، ص:۴۷، ج۶]

ایک مرتبہ ایسی عورت کے متعلق بہت سنگین الفاظ استعمال فرمائے جو اپنا نکاح خود کر لیتی ہے آپ نے فرمایا: ''ایسی عورت بدکار اور زانیہ ہے۔'' [ابن ماجہ، النکاح:۱۸۸۲]

ان احادیث کی روشنی میں محدثین کا فیصلہ ہے کہ جو نکاح باپ کی مرضی کے بغیر ہو وہ درست نہیں بلکہ کالعدم ہے۔

سوال میری بیٹی امتحان میں بار بار فیل ہونے کی وجہ سے ذہنی توازن خراب کر بیٹھی ایک سال تک اسی بیماری کا شکار رہی، لیڈی ڈاکٹر کے کہنے پر اس کا نکاح کر دیا گیا اس کے ذہنی توازن کے بگڑنے کا جب سسرال والوں کو علم ہوا تو وہ اسے میرے پاس چھوڑ گئے، اب لڑکی صحت یاب ہے کیا اس کا پہلا نکاح صحیح تھا یا اب تجدید نکاح کی ضرورت ہے؟

جواب سوال سے واضح ہوتا ہے کہ نکاح کے وقت لڑکی کا ذہنی توازن صحیح نہیں تھا اس حالت میں شریعت نے انسان کو بے اختیار اور غیر مکلّف قرار دیا ہے، لہٰذا نکاح کے وقت اس کے ایجاب کی کوئی حیثیت نہیں جو نکاح کے لئے بنیادی شرط ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تین شخص مرفوع القلم ہیں: دیوانہ تا آنکہ وہ باشعور ہو جائے، سونے والا یہاں تک کہ وہ بیدار ہو جائے، بچہ تا آنکہ بالغ ہو جائے۔'' [ابوداود، الحدود:۴۴۰۳]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ پاگل عورت پر حد جاری کرنے کا حکم دیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''پاگل عورت تو مرفوع القلم ہے تا آنکہ وہ باشعور ہو جائے۔'' [صحیح بخاری، الحدود:۲۲ تعلیقاً]

ان احادیث کے پیش نظر لڑکی بے اختیار اور غیر مکلّف ہے اب اگر اس کے والد یا اس کی عدم موجودگی میں کسی دوسرے سرپرست نے لڑکی کی طرف سے ایجاب کی ذمہ داری کو اٹھایا ہے تو نکاح بالکل صحیح ہے، جیسا کہ نابالغ بچے کے نکاح کے وقت کیا جاتا ہے، لہٰذا پہلا نکاح صحیح ہے کسی قسم کے نئے نکاح کی ضرورت نہیں ہے اگر سسرال والوں کو اس نکاح میں شک وشبہ ہے تو لڑکے

سے دوبارہ نکاح پڑھا دیا جائے خاص طور پر جبکہ اب صحت یاب اور باشعور ہے تاکہ آپس میں مل بیٹھنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔

[واللہ اعلم]

سوال میرے ایک دوست نے اپنی بیوی کو ایک سال چار ماہ قبل کاغذ پر تین بار طلاق لکھ کر بھیج دی، اس کے بعد تحریری یا زبانی کوئی طلاق نہیں دی اب وہ رجوع کرنا چاہتا ہے، کتاب وسنت کے حوالے سے راہنمائی فرمائیں؟

جواب ہمارے ہاں آج کل علم وعمل کے اعتبار سے دینی حالت انتہائی ناگفتہ بہ ہے۔ صبر وتحمل کے بجائے غصہ واشتعال کا دور دورہ ہے۔ ذہنی پریشانیاں اس پر مستزاد ہیں۔ معمولی معمولی رنجش کی وجہ سے اپنی بیوی کو طلاق دے دینا عام معمول بن چکا ہے۔ دین سے ناواقفیت کی بنا پر اکٹھی تین طلاقیں دے دی جاتی ہیں، پھر جب غصہ دور ہوتا ہے اور جذبات ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں تو مسئلہ پوچھنے کی ضرورت پیش آتی ہے، حالانکہ بیک وقت تین طلاق دینا شریعت میں انتہائی ناپسندیدہ فعل ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاق دے ڈالیں تو رسول اللہ ﷺ نے انتہائی ناراضی کے عالم میں فرمایا: ''تم نے میری موجودگی میں کتاب اللہ کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ کی اس خفگی کو دیکھ کر ایک جاں نثار نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں اسے قتل نہ کر دوں۔ [نسائی، الطلاق:۳۴۳۱]

تاہم اس انداز سے طلاق دینے میں ایک رجعی طلاق ہوتی ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت اور عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی عہد حکومت میں ایک مجلس کی تین طلاق کو ایک ہی شمار کیا جاتا تھا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''جس کام میں لوگوں کو غور وفکر کرنے کی مہلت دی گئی تھی اس میں انہوں نے جلد بازی سے کام لینا شروع کر دیا ہے، اس بنا پر ان تینوں کو نافذ کر دینا چاہیے، چنانچہ انہوں نے تینوں کو جاری کر دیا۔''

[صحیح مسلم، الطلاق:۳۶۷۴]

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ اسماعیلی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اجتہادی اقدام مصالح امت کے لئے تھا، تاہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی عمر کے آخر حصہ میں اس پر افسوس وندامت کا اظہار کیا اور خواہش فرمائی کہ کاش! میں اس طریقہ سے طلاق دینے کو حرام ٹھہرا دیتا۔ [اغاثۃ اللھفان، ص:۳۰۲،ج۱]

رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں بیک وقت تین طلاق دینے کو ایک رجعی شمار کیا جاتا تھا، جیسا کہ حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو ایک ہی سانس میں تین طلاقیں دیدیں، پھر انہیں بہت غم اور افسوس لاحق ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے پوچھا کہ تو نے کس طرح طلاق دی تھی عرض کیا کہ میں نے ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے ڈالی ہیں آپ نے فرمایا کہ ''یہ تو ایک طلاق ہے اگر چاہو تو بیوی سے رجوع کر کے اپنا گھر آباد کر لو۔'' چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے رجوع کر لیا۔ [مسند امام احمد، ص:۲۶۵،ج۱]

اس حدیث کے متعلق حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ مسئلہ طلاق ثلاثہ کے متعلق یہ حدیث نص صریح کی طرح ایک فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے جس کی اور کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی۔ [فتح الباری، ص:۳۶۲،ج۹]

ان دلائل کی بنا پر ایک مجلس میں دی ہوئی تین طلاق ایک رجعی ہوتی ہے۔ چنانچہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''ہم نہیں جانتے کہ

رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں کسی شخص نے ایک ہی وقت، ایک ہی سانس سے تین طلاقیں دیدی ہوں تو آپ نے انہیں نافذ کردیا ہو۔" [فتاویٰ ابن تیمیہ، ص:۱۳، ج۳۳]

طلاق رجعی کے بعد خاوند کو رجوع کرنے کا حق ہے، پھر اس رجوع کی دو صورتیں ہیں:

① دوران عدت تجدید نکاح کے بغیر ہی رجوع کیا جاسکتا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اگر ان کے خاوند اس مدت میں آبادی کی نیت سے دوبارہ تعلقات استوار کرنے پر آمادہ ہوں تو وہ انہیں زوجیت میں واپس لینے کے زیادہ حقدار ہیں۔"

[۲/البقرہ:۲۲۸]

واضح رہے کہ یہ رجوع پہلی یا دوسری طلاق کے ساتھ مشروط ہے۔ تیسری طلاق کے بعد حق رجوع ختم ہو جائے گا۔

② عدت گزر جانے کے بعد تجدید نکاح سے رجوع ممکن ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اور جب عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت پوری ہونے کو آجائے تو انہیں اپنے پہلے خاوندوں سے نکاح کرنے سے نہ روکو جبکہ وہ معروف طریقہ سے آپس میں نکاح کرنے پر راضی ہوں۔" [۲/البقرہ:۲۳۲]

لیکن اس تجدید نکاح کے لئے چار چیزوں کا ہونا ضروری ہے، انہیں پورا کئے بغیر نکاح نہیں ہوگا۔

① از سر نو حق مہر کی تعیین۔ ② گواہوں کی موجودگی۔

③ سرپرست کی اجازت۔ ④ عورت کی رضامندی۔

صورت مسئولہ میں تین طلاق اکٹھی تحریر کی گئی ہیں۔ کتاب وسنت کے مطابق یہ ایک رجعی طلاق ہے لیکن اس تحریری طلاق پر ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، اس لئے اب تجدید نکاح سے دوبارہ گھر آباد کیا جاسکتا ہے اور یہ نکاح اسی طلاق دہندہ سے ہوگا کسی قسم کے بدنام زمانہ حلالہ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنا بے شرمی اور بے حیائی ہے۔

واضح رہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق کا ایک رجعی طلاق کا ہونا اس شخص کے لئے ہے جو کتاب وسنت پر عمل کو ہی اپنے لئے ذریعہ نجات خیال کرتا ہو لیکن اگر صرف مطلب برآری کے لئے ایسا کرنا چاہتا ہے تو یقیناً یہ سہولت اس کے لئے سودمند نہیں ہوگی کیونکہ یہ دنیوی مارکیٹ نہیں ہے کہ جہاں سودا سلف سستا ملے وہاں سے لے لے، دین کے لئے ایسی حیلہ گری کامیاب نہیں ہوسکتی، اس لئے طلاق دہندہ کو چاہیے کہ وہ کتاب وسنت پر عمل کرنے کا عزم کرتے ہوئے اپنی بیوی سے مذکورہ شرائط کے ساتھ دوبارہ نکاح کر لے۔ [واللہ اعلم]

سوال میں نے اپنی بیوی کو کسی معاملہ پر جھگڑتے وقت کہا: اگر تم نے میرا کہنا نہیں ماننا تو جاؤ، پھر میں نے تڑاق کا لفظ کہہ دیا میری بیوی اور اس کی دونوں بہنوں نے کہا تم نے لفظ طلاق بولا ہے۔ بہرصورت ہم بیوی خاوند اس واقعہ کے دوسرے دن سے ہی خوشگوار زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہمیں کسی نے کہا کہ ایسا کہنے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں بتایا جائے کہ کیا واقعی ایسا کہنے سے طلاق ہو جاتی ہے؟

جواب لفظ تڑاق کسی چیز کو توڑتے وقت جو آواز پیدا ہوتی ہے اس کے لئے استعمال ہوتا ہے اور یہ لفظ طلاق کے لئے صر

نہیں ہے۔ اگر خاوند نے اپنی بیوی کو محض ڈرانے دھمکانے کے لئے یہ لفظ استعمال کیا ہے تو سرے سے طلاق واقع نہیں ہوئی اور
اگر طلاق دینے کی نیت سے کہا تو ایسا کہنے سے رجعی طلاق ہو جاتی ہے، اس طلاق کا حکم یہ ہے کہ عدت کے اندر اندر تجدید نکاح کے
بغیر رجوع ہو سکتا ہے۔ صورت مسئولہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خاوند نے وقوعہ کے اگلے دن ہی بیوی سے رجوع کر لیا جو درست اور جائز
ہے، اب انہیں بیوی خاوند کے طور پر رہنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، البتہ ہم اتنی وضاحت کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ
بیوی کو ڈرانے دھمکانے کے لیے ایسا مبہم لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ جو باعث نزاع اور موجب اشتباہ ہو۔ مذکورہ صورت
میں بیوی اور اس کی دونوں بہنوں نے اسے طلاق ہی سمجھا، تاہم خاوند کی وضاحت سے یہ اشتباہ دور ہو گیا۔ لیکن ایسا کرنا درست نہیں
ہے۔ بہر حال طلاق کا معاملہ بہت نازک ہے خاوند کو چاہیے کہ وہ اپنے اس حق کو استعمال کرتے وقت خوب سوچ وبچار کرے ڈرانے
دھمکانے کے لئے کوئی اور طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اب بیوی خاوند کو چاہیے کہ آئندہ حزم اور احتیاط اور خوش اسلوبی سے
زندگی بسر کریں اور ایسی باتوں سے اجتناب کریں جو نزاع کا باعث ہوں۔ [واللہ اعلم]

سوال اگر بیوی اپنی مرضی سے خاوند کے والدین کی خدمت نہ کرے تو کیا خاوند اپنی بیوی کو اپنے والدین کی خدمت کے لئے
مجبور کر سکتا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں فتویٰ دیں۔

جواب انسان کے لئے دنیا میں اسلام کے بعد والدین کا زندہ ہونا سب سے بڑی نعمت ہے اور ان کا خوشگوار ہونا سعادت
مندی کی علامت ہے۔ بیوی کو چاہیے کہ وہ خاوند کی طرح اس کے والدین کی خدمت میں کسی قسم کی کوتاہی کو روا نہ رکھے، اگرچہ
قرآن وحدیث میں ان کی خدمت کرنے کے متعلق کوئی صریح نص موجود نہیں ہے، تاہم ایسے واضح اشارات ضرور ملتے ہیں جن
سے پتہ چلتا ہے کہ بہو کو اپنے سسرال کی خدمت کرنا چاہیے اور یہ سسرال کا حق ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اپنے لخت جگر
حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ملاقات کے لئے تشریف لائے تو اس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام گھر میں موجود نہیں تھے۔ حضرت
ابراہیم علیہ السلام واپسی کے وقت اپنے لخت جگر کو اپنی بہو کے متعلق طلاق دینے کا اشارہ فرما گئے تھے، اس کی دیگر وجوہات میں سے ایک
وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مطالبہ کے باوجود ان کی خدمت نہیں کی تھی بلکہ ناشکری کا اظہار کرتے ہوئے انتہائی
نازیبا کلمات کہے تھے۔ [صحیح بخاری، الانبیاء: ۳۳۶۵]

اسی طرح حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما نے جب ایک بیوہ سے شادی کی تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں کنواری سے شادی
کرنے کی ترغیب دی۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہما نے شوہر دیدہ کے انتخاب کی یہ وجہ بتائی کہ میرے والد گرامی غزوۂ احد میں شہید ہو گئے
ہیں اور پس ماندگان میں نو لڑکیاں ہیں جن میں صرف تین شادی شدہ ہیں میں نہیں چاہتا کہ گھر میں ان جیسی کسی ناتجربہ کار کنواری کو
لاؤں بلکہ میں نے تجربہ کار شوہر دیدہ سے شادی کی ہے تاکہ وہ ان کی کنگھی کرے اور ان کا ہر طرح سے خیال رکھے۔ رسول اللہ ﷺ
نے ان کے جذبات کی تصویب فرمائی۔ [صحیح بخاری، المغازی: ۴۰۵۲]

اس حدیث سے معلوم ہوا ہے کہ خاوند اپنی بیوی سے اپنی بہنوں کی خدمت کرا سکتا ہے تو والدین کا مقام بہنوں سے کہیں بڑھ
کر ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی دلائل دیے جا سکتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے خاوند

کی خدمت میں کوتاہی نہ کرے، وہاں اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ خاوند کے والدین میرے حقیقی والدین کی طرح ہیں، لہٰذا ان کی خدمت کرنے کو بھی اپنے لئے سعادت خیال کرے۔ خاوند کو چاہیے کہ وہ افہام وتفہیم کے ذریعے ایسے کاموں کو سرانجام دے اور محبت واتفاق کی فضا کو برقرار رکھتے ہوئے خود بھی والدین کی خدمت کرے اور اپنی بیوی کو بھی یہ سعادت حاصل کرنے کے لئے پابند بنائے۔ [واللہ اعلم]

سوال میری بیٹی کو اس کے خاوند نے عرصہ چھ سال سے چھوڑ رکھا ہے۔ ہم نے صلح کے لئے بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکے، بلکہ اس کا کہنا ہے میں نہ تو اسے گھر لانا چاہتا ہوں اور نہ ہی قیامت تک اسے آزاد کروں گا، ایسے حالات میں مجھے میری بچی کے متعلق شرعی فتویٰ دیا جائے تاکہ میں اسے کہیں آباد کر سکوں؟

جواب بیوی کے ساتھ ایسا سلوک کرنا کہ وہ عملاً بے شوہر ہو کر رہ جائے ایسی بیوی کو ''معلقہ'' کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ان کے ساتھ بھلے طریقہ سے زندگی بسر کرو۔'' [۴/النسآء:۱۹]

نیز فرمان الٰہی ہے کہ ''تم اپنی بیویوں کو محض ستانے کی خاطر مت روکے رکھو یہ تمہاری زیادتی ہے جو ایسا کرے گا وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرنے والا ہے''۔ [۲/البقرہ:۲۳۱]

ان آیات کے پیش نظر خاوند بہت ظلم اور زیادتی کا ارتکاب کر رہا ہے، چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اپنی بیوی کے حقوق ادا کرتا اور اس کے نان ونفقہ اور دیگر اخراجات کی ذمہ داری اٹھاتا یا اسے طلاق دے کر آزاد کر دیتا تاکہ وہ باعزت طور پر باقی ماندہ زندگی بسر کر سکے لیکن خاوند کسی صورت راضی نہیں ہے بلکہ اپنی بیوی کو معلقہ بنا کر چھوڑنا چاہتا ہے جو صریح زیادتی ہے چونکہ یہ صورت حال لڑکی کے لئے ناقابل برداشت ہے اور اللہ تعالیٰ نے کسی پر تنگی کو روا نہ رکھا اور نہ ہی کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف دیتا ہے، لہٰذا ایسے حالات میں بیوی کو فسخ نکاح کا حق ہے لیکن جدائی کا معاملہ نکاح سے زیادہ نازک ہے۔ جب نکاح سرپرست کے بغیر وہ خود بخود نہیں کر سکتی تو جدائی اپنے آپ کیونکر درست ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ عدالت کی طرف رجوع کرے، یونین کونسل اور پنچائت کے ذریعہ بھی اس مسئلہ کو حل کیا جا سکتا ہے۔ صرف اس فتویٰ کو بنیاد بنا کر علیحدگی اختیار کرنا، پھر آگے نکاح کر دینا کسی صورت درست نہیں ہے۔ مفتی کا کام کسی کے لئے اس کے حق کو ثابت کرنا ہے حق دلوانا عدالت کا کام ہے۔ بلاشبہ فسخ نکاح ایسے حالات میں لڑکی کا حق ہے لیکن اسے حق عدالت یا پنچائت کے ذریعے ہی مل سکتا ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ علیحدگی اختیار کرنے کے لئے دونوں میں کسی کو لایا جائے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک شخص کی شادی کسی دوسرے شخص کی ہمشیرہ سے ہوئی۔ اب دوسرا شخص چاہتا ہے کہ اس کی شادی اپنے بہنوئی کی بہن سے ہو جائے، اس سے پہلے کسی قسم کی کوئی شرط یا معاہدہ طے نہیں پایا۔ کیا ایسی صورت میں شادی کرنا شریعت میں جائز ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں فتویٰ دیں۔

جواب کسی قسم کی سابقہ شرط کے بغیر آپس میں ایک دوسرے کی ہمشیرہ سے شادی کرنا کوئی جرم نہیں ہے بلکہ صلہ رحمی کی ایک بہترین صورت ہے لیکن عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ آبائی رسم ورواج کی پابندی کے لئے ظاہری طور پر کسی مسئلہ کے جواز کا سہارا

لے لیا جاتا ہے، لہٰذا اس کی وضاحت کرنا انتہائی ضروری ہے۔ ہمارے ہاں بے شمار ایسی رسوم ہیں جو شریعت اسلامیہ کے سراسر منافی ہیں۔ ان میں ایک رسم نکاح وٹہ سٹہ بھی ہے۔ جسے عربی زبان میں ''نکاح شغار'' کہا جاتا ہے۔ دین اسلام میں یہ ناجائز اور حرام ہے رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق حکم امتناعی جاری فرمایا ہے ارشاد نبوی ہے کہ ''اسلام میں نکاح وٹہ سٹہ کا کوئی وجود نہیں ہے۔'' [صحیح مسلم، النکاح: ۳۴۶۹]

مذکورہ روایت میں ہی شغار کی بایں الفاظ تعریف کی گئی ہے کہ ''ایک آدمی دوسرے سے کہے کہ تم اپنی بیٹی کا نکاح مجھ سے کر دو میں اپنی بچی کا نکاح تجھ سے کر دیتا ہوں۔'' یہ تعریف ہمارے ہاں وٹہ سٹہ میں صادق آتی ہے سابقہ شرط کے بغیر تبادلہ نکاح اگرچہ جائز ہے، تاہم اختلاف کے وقت منفی اور انتقامی جذبات خود بخود فریقین میں سرایت کر جاتے ہیں۔ چونکہ انجام اور نتیجہ کے لحاظ سے اس طرح کا تبادلہ کوئی مفید چیز نہیں ہے، جیسا کہ تجربات اس کی شہادت دیتے ہیں۔ صورت مسئولہ میں ظاہری طور پر اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی لیکن اس کا نتیجہ شغار جیسا ہوگا۔ اصل دارومدار نیت پر ہے اگر اس میں کوئی فتور نہیں تو یقیناً اس طرح کا نکاح باعث خیر و برکت ہے کیونکہ دو خاندان آپس میں مل بیٹھنے کا پروگرام رکھتے ہیں۔ اگر نیت صرف جواز کے لئے حیلہ تلاش کرنا ہے تو اس غیر مشروط تبادلہ نکاح سے پرہیز کیا جائے کیونکہ مستقبل میں یہ نکاح کوئی مفید اور ثمر آور ثابت نہیں ہو سکے گا۔ نکاح کے مسئلہ میں انسان کو انتہائی دور اندیشی سے کام لینا چاہیے۔ کیونکہ زندگی کا یہ بندھن صرف ایک مرتبہ ہوتا ہے یہ کوئی بجلی کا بلب نہیں ہے کہ جب ضرورت پڑے تو لگا لیا جائے اور خراب ہونے پر اسے اتار دیا جائے۔ اپنی طرف سے نہایت اخلاص کے ساتھ کوشش کر کے پھر معاملات اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیے جائیں۔ [واللہ اعلم]

سوال میرے شوہر بیرون ملک ہوتے ہیں میں ان کی اجازت سے اپنے والدین کے گھر میں رہتی ہوں ہم دونوں خوش ہیں مگر جب وہ پچھلے سال پاکستان آئے تو میرے والدین سے کسی ناچاقی کی بنا پر انہوں نے مجھے کہا کہ اگر تم نے دوبارہ مجھے اپنے والدین کے ہاں جانے کے لئے کہا تو سب کچھ ختم ہو جائے گا، پھر ان کی ناراضی دور ہو گئی اور مجھ سے کہا کہ میں نے تم پر جو پابندی لگائی تھی اسے ختم کرتا ہوں مگر میں سخت پریشان ہوں کہ کہیں خلاف ورزی کی صورت میں ہمارے رشتے پر تو کوئی اثر نہیں پڑے گا، انہوں نے وضاحت بھی کی ہے کہ میرے نزدیک سب کچھ ختم ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم نے والدین کے ہاں جانے کو کہا تو کچھ عرصہ کے لئے تمہارا بائیکاٹ کروں گا، مگر میں خوف زدہ ہوں کہ سب کچھ ختم ہونا کہیں طلاق تو نہیں ہے۔ براہ کرم میری راہنمائی کریں کہ اگر وہ اپنے الفاظ واپس لیتے ہوئے مجھ سے یہ پابندی ختم کرتے ہیں تو کیا میں اس پابندی سے آزاد ہو سکتی ہوں؟

جواب اس قسم کے سوال کا تفصیلی جواب اہلحدیث مجریہ ۲۴ ستمبر شمارہ نمبر ۳۶ میں شائع ہو چکا ہے دراصل ہم گھریلو عائلی زندگی کے متعلق بہت افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ قصور کسی کا ہوتا ہے لیکن سزا کسی دوسرے کو دیتے ہیں۔ صورت مسئولہ میں اختلاف لڑکی کے والدین سے ہوا لیکن سزا لڑکی کو دی جا رہی ہے کہ اگر تو نے والدین کے ہاں جانے کو کہا تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ ہمارے معاشرہ میں سب کچھ ختم ہونے سے مراد تو اپنے گھر کو برباد کرنا ہے لیکن ''صاحب'' نے وضاحت کی ہے کہ اس سے مراد کچھ عرصہ کے لئے بیوی سے بول چال بند کرنا ہے دلوں کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتے ہیں ہم نے تو ظاہری الفاظ اور اس کی وضاحت کے مطابق

فتویٰ دینا ہے واضح ہو کہ طلاق کے نافذ ہونے کے اعتبار سے اس کی دو اقسام ہیں:

☆ جو فی الفور نافذ ہو جائے، مثلاً: یوں کہا جائے کہ میں تجھے طلاق دیتا ہوں۔

☆ جو فی الفور نافذ نہ ہو بلکہ اسے کسی کام کے کرنے یا چھوڑنے پر معلق کیا جائے، مثلاً: یوں کہا جائے کہ تو نے گھر سے باہر قدم رکھا تو تجھے طلاق ہے۔ اس صورت میں عورت جب بھی گھر سے باہر قدم رکھے گی اسے طلاق ہو جائے گی، لیکن اگر معلق طلاق میں خلاف ورزی سے پہلے پہلے اس شرط کو ختم کر دیا جائے تو پھر خلاف ورزی کی صورت میں طلاق نہیں ہوگی۔ کیونکہ پابندی عائد کرنے والے نے خود ہی اس پابندی کو ختم کر دیا ہے۔ صورت مسئولہ میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک تو سب کچھ ختم ہونے کی وضاحت خود پابندی لگانے والے کی ہے کہ اس سے مراد وقتی بائیکاٹ اور کچھ وقت کے لئے بول چال ختم کرنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس سے قطعی طور پر طلاق دینا مراد نہیں ہے۔ اس وضاحت کے بعد اگر پابندی نہ بھی ختم کی جاتی تو بھی خلاف ورزی کی صورت میں طلاق نہیں ہونا تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ پابندی لگانے والے نے خلاف ورزی سے قبل خود اسے واپس لے لیا ہے اور اسے ختم کر دیا ہے اس صورت میں خلاف ورزی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لہٰذا سائلہ خاوند کی طرف سے لگائی گئی پابندی سے آزاد ہے۔

نوٹ: نکاح، طلاق اور وراثت سے متعلقہ سوال کرنے والوں سے گزارش ہے کہ وہ اپنے ایڈریس یا کم از کم فون نمبر سے ضرور مطلع کیا کریں تاکہ ہمیں بوقت ضرورت رابطہ کرنے میں آسانی رہے۔ اس کے علاوہ ادارہ ''اہل حدیث'' کی طرف سے خریداری نمبر کا حوالہ بھی ضروری ہے۔ بصورت دیگر سوال کے جواب میں التوا یا تاخیر ہو سکتی ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال اہل حدیث رسالہ میں اکثر طلاق وغیرہ کے فتاویٰ ہوتے ہیں۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں طلاق کے متعلق جامع ہدایات کیا ہیں؟ تاکہ اس اہم معاشرتی مسئلہ کے متعلق ہمیں آگاہی حاصل ہو۔

جواب اس میں شک نہیں کہ ہم پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود نکاح وطلاق کے اکثر مسائل سے ناواقف ہیں، حالانکہ ان مسائل کا تعلق روزمرہ زندگی سے ہے۔ ہمارا دین ایک نظام زندگی پر مشتمل ہے، یعنی زندگی کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا حل اس میں موجود نہ ہو۔ جبکہ باقی ادیان وقتی طور پر اور ایک خاص قوم کے لئے تھے۔ یہودی مذہب میں خاوند کو صرف تحریری شکل میں اپنی بیوی کو طلاق دینے کا حق ہے۔ اس کے بغیر زبانی طلاق دینے کی اجازت نہیں ہے، نیز طلاق کے بعد خاوند کو اپنی مطلقہ بیوی سے رجوع کرنے کی قطعی اجازت نہیں ہے اس کے برعکس عیسائی اور ہندو مذہب میں انتہائی سنگین حالات کے پیش نظر بھی خاوند کو طلاق دینے کا اختیار نہیں جبکہ دین اسلام میں اس قسم کی افراط وتفریط سے بالاتر ہو کر اعتدال پر مبنی راستہ اختیار کیا گیا ہے اگر ہم اس پر عمل پیرا ہیں تو زندگی کے کسی موڑ پر ہمیں پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا، اس اعتدال کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① اللہ تعالیٰ نے اس رشتہ ازدواج کو اپنی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا ہے، پھر خاوند کو بیوی کے لئے اور بیوی کو خاوند کے لئے سکون واطمینان کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس طرح کہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے طالب بھی ہیں اور مطلوب بھی اور دونوں میں اس قدر محبت رکھ دی کہ وہ ایک دوسرے پر فدا ہونے کو تیار ہوتے ہیں، اسی جذبہ فدائیت کا نتیجہ ہے کہ دونوں اپنے مقدس رشتہ کو تا زیست نبھانے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ [۳۰/الروم:۲۱]

② اس رشتہ کی خشت اول یہ ہے کہ نکاح سے پہلے اپنی بننے والی بیوی کو سرسری نظر سے دیکھنے کی اجازت دی گئی ہے تا کہ شکل وصورت کی ناپسندیدگی آیندہ شقاق وفراق کا باعث نہ ہو۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک عورت کی طرف پیغام نکاح بھیجا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے دریافت فرمایا تو نے اسے دیکھا ہے؟ میں نے عرض کیا، نہیں، آپ نے فرمایا: ''اسے دیکھ لو اس طرح زیادہ توقع ہے کہ تم میں الفت پیدا ہو جائے۔'' [ابن ماجہ، النکاح: ۱۸۶۵]

③ نکاح کے بعد خاوند کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ اپنی بیوی سے حسن سلوک اور رواداری سے پیش آئے اور اس سے اچھا برتاؤ کرے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ان بیویوں کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔'' [۴/النسآء:۱۹]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اہل ایمان میں سب سے کامل وہ شخص ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں اور تم میں بہتر وہ لوگ ہیں جو اپنی بیویوں کے حق میں بہتر ہیں۔'' [مسند امام احمد، ص: ۲۵۰، ج۲]

④ خاوند کو اس بات کا بھی پابند کیا گیا ہے کہ اپنی بیوی کی معمولی معمولی لغزشوں کو خاطر میں نہ لائے بلکہ اس کی اچھی خصلتوں کی وجہ سے اس کی کوتاہیوں کو نظر انداز کرتا رہے ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز تمہیں ناگوار ہو مگر اللہ تعالیٰ نے اس میں بہت بھلائی رکھ دی ہو۔'' [۴/النسآء:۱۹]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ''کوئی مؤمن اپنی مؤمنہ بیوی سے بغض نہ رکھے اگر اسے اس کی کوئی عادت ناپسند ہوگی تو ضرور کوئی دوسری پسند بھی ہوگی''۔ [مسند امام احمد، ص: ۳۲۹، ج۲]

⑤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاوند کو عورت کی ایک فطری کمزوری سے بھی آگاہ کیا ہے تا کہ یہ جلد بازی میں کوئی ایسا اقدام نہ کر بیٹھے جس پر وہ آیندہ نادم و پریشان ہو۔ آپ نے فرمایا کہ ''عورت پسلی کی طرح ہے اگر تم اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو اسے توڑ دو گے اور اگر اس سے فائدہ اٹھانا چاہو تو اس کجی کی موجودگی میں فائدہ اٹھاتے رہو۔'' [صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۵۱۸۴]

صحیح مسلم میں ہے کہ ''اس کا توڑ دینا اسے طلاق دینا ہے''۔ [صحیح مسلم، الرضاع: ۳۶۴۳]

⑥ خاوند اس بات کا بھی پابند ہے کہ اگر بیوی میں کوئی ناقابل برداشت چیز دیکھے تو طلاق دینے میں جلدی نہ کرے بلکہ امکانی حد تک اصلاح احوال کی کوشش کرے جس کے تین قرآنی مراحل حسب ذیل ہیں۔

(الف) پہلا قدم یہ ہے کہ بیوی کو نرمی سے سمجھایا جائے اور اس سے اختیار کردہ رویے کے انجام سے آگاہ کیا جائے تا کہ وہ محض اپنی بہتری اور مفاد کی خاطر گھر کی فضا کر مکدر نہ کرے۔

(ب) اگر خاوند کے سمجھانے بجھانے کا اثر قبول نہیں کرتی تو خاوند اس سے الگ کسی دوسرے کمرے میں سونا شروع کر دے اور اس سے میل جول بند کر دے اگر بیوی میں کچھ سمجھ بوجھ ہوگی تو وہ اس سرد جنگ کو برداشت نہیں کر سکے گی۔

(ج) اگر خاوند کے اس اقدام پر بیوی کو ہوش نہیں آتا تو پھر آخری حربہ کے طور پر مارنے کی اجازت دی گئی ہے لیکن اس کی چند ایک شرائط حسب ذیل ہیں:

☆ مارتے وقت اسے برا بھلا اور گالی گلوچ نہ دی جائے۔

☆ اس کے چہرے پر نہ مارا جائے۔ [مسند امام احمد،ص:۲۵۱،ج۲]

☆ ایسی مار نہ ہو جس سے زخم ہو جائیں یا نشان پڑ جائیں۔ [مسند امام احمد،ص:۳۷،ج۵]

ان حدود وقیود کے ساتھ خاوند کو اضطراری حالت میں بیوی کو احتیاط کے ساتھ مارنے کی اجازت دی گئی ہے۔

⑦ ایسے حالات میں بیوی کو بھی تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنا مقام خاوند کے ہاں دیکھتی رہے کہ کیا ہے۔خاوند اس کیلئے جنت ہے وہی اس کے لئے آگ بھی ہے''۔ [مسند امام احمد،ص:۳۴۱،ج۴]

نیز''جب بھی دنیا میں کوئی عورت اپنے خاوند کو اذیت پہنچاتی ہے تو اس کی جنتی بیویوں میں سے ایک حور کہتی ہے اللہ تجھے برباد کردے اس کو تکلیف نہ دے یہ تو تیرے پاس مہمان ہے۔عنقریب تجھے چھوڑ کر ہمارے ہاں آجائے گا''۔ [ابن ماجہ،النکاح:۲۰۱۴]

⑧ اگر میاں بیوی کے درمیان اختلاف انتہائی سنگین صورت اختیار کر جائے کہ مذکورہ تینوں مراحل کارگر ثابت نہ ہوں تو فریقین اپنے اپنے خاندان میں سے ثالث منتخب کریں جو پوری صورتحال سمجھ کر نیک نیتی سے اصلاح کی کوشش کریں اور بروقت مداخلت کر کے حالات پر کنٹرول کریں۔اگر ان کی نیت بخیر ہوگی تو اللہ تعالیٰ بیوی خاوند میں موافقت کی ضرور کوئی راہ پیدا کرے گا یہ ثالث بیوی خاوند کی طرف سے ایک ایک، دو، دو اور تین تین بھی ہو سکتے ہیں۔جو بات بھی زوجین کو تسلیم ہو اختیار کی جا سکتی ہے۔ [۴/النسآء:۳۵]

⑨ اگر مذکورہ جملہ اقدامات سے حسن معاشرت کی کوئی صورت پیدا ہوتی نظر نہ آئے تو اسلام اس بات پر مجبور نہیں کرتا کہ ایک گھرانہ میں ہر وقت کشیدگی کی فضا قائم رہے اور دونوں میاں بیوی کے لئے وہ گھر جہنم زار بنا رہے۔اس سے بہتر ہے وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں، خواہ مرد طلاق دیدے یا عورت خلع لے لے، پھر دونوں کا اللہ مالک ہے وہ ان کے لئے کوئی نہ کوئی متبادل صورت پیدا کر دے گا۔ [۴/النسآء:۱۳۰]

لیکن مندرجہ ذیل امور کو پیش نظر رکھنا ہوگا:

☆ ایسے حالات میں اگرچہ طلاق دینا جائز ہے لیکن شریعت نے اسے ''ابغض الحلال'' سے تعبیر کیا ہے۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:''حلال اشیاء میں اللہ کے ہاں سب سے بری چیز طلاق ہے۔'' [مستدرک حاکم،ص:۱۹۶،ج۲]

طلاق دہندہ کو یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے زندگی بھر اپنی بیوی کو طلاق دینے کے لئے صرف تین اختیارات دیئے ہیں، وقفہ، وقفہ سے دو مرتبہ طلاق دینے سے رجوع کا اختیار بھی اسے دیا گیا ہے اور تیسری طلاق ایک فیصلہ کن مرحلہ ہے، اس کے بعد عام حالات میں رجوع کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔

☆ طلاق دیتے وقت اسے دیکھنا ہوگا کہ اس کی بیوی بحالت حیض نہ ہو۔شریعت نے اس حالت میں طلاق دینے سے منع کیا ہے تاکہ طلاق وقتی کراہت اور کسی عارضی ناگواری کی وجہ سے نہ ہو، نیز طلاق دیتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھے کہ اس طہر میں بیوی سے مقاربت بھی نہ کی ہو، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے فرمایا تھا کہ''بیوی کو ایسے طہر میں طلاق دو جس میں اس سے ہم بستری نہ کی ہو۔'' [صحیح بخاری،حدیث نمبر:۴۹۰۸]

☆ حالت حمل میں بھی طلاق دی جا سکتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ بات غلط مشہور ہو چکی ہے کہ دوران حمل دی ہوئی طلاق نافذ نہیں ہوتی، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ ''اسے حالت طہر یا حالت حمل میں طلاق دو، یہ طلاق جائز اور مباح ہے۔''

[1 صحیح مسلم، الطلاق: ۱۴۷۱]

شریعت نے طلاق دینے کا اختیار خاوند کو دیا ہے عورت کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ خود کو طلاق دے تاکہ ناقصۃ العقل ہونے کی بنا پر فطرتی جلد بازی میں کسی معمولی سی بات پر یہ اقدام نہ کر بیٹھے۔

⑩ اگر خاوند نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا عزم کر لیا ہے تو قرآن وحدیث کی ہدایات کے مطابق وہ صرف ایک طلاق دے، خواہ وہ تحریر کر کے یا زبانی کہے، اس کے بعد بیوی کو اپنے حال پر چھوڑ دے تاکہ سوچ وبچار کے راستے بند نہ ہوں اور فریقین سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اپنے آخری اقدام پر غور وفکر کر سکیں۔ ایسے حالات میں بیک وقت تین طلاق دینے سے شریعت نے انتہائی کراہت کا اظہار کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں ایک آدمی نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاق دے ڈالی تھیں تو آپ نے فرمایا ''میری موجودگی میں اللہ تعالیٰ کی کتاب سے کھیلا جا رہا ہے۔'' آپ اس قدر ناراض ہوئے کہ ایک آدمی آپ کا اظہار ناراضی دیکھ کر کہنے لگا: یا رسول اللہ! آپ مجھے اجازت دیں تاکہ میں اسے قتل کر دوں۔ [نسائی، الطلاق: ۳۴۳۰]

تاہم ایسا اقدام کرنے سے ایک رجعی طلاق واقع ہو گی۔ [ابوداود، الطلاق: ۲۱۹۶]

⑪ ایک طلاق دینے کے بعد رشتہ ازدواج منقطع نہیں ہوتا بلکہ دوران عدت اگر زوجین میں سے کوئی فوت ہو جائے تو انہیں ایک دوسرے کی وراثت سے باقاعدہ حصہ ملتا ہے۔ بہر حال خاوند کو شریعت نے ہدایت کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ خود نکلیں الا یہ کہ وہ کسی صریح برائی کی مرتکب ہوں۔''

⑫ طلاق کے بعد عورت نے عدت کے دن گزارنے ہیں جن کا شمار انتہائی ضروری ہے کیونکہ اس کی بنیاد پر کئی ایک نازک اور قانونی مسائل کا انحصار ہے۔ مختلف حالات کے پیش نظر عدت کے ایام بھی مختلف ہیں، جس کی تفصیل یہ ہے:

(الف) نکاح کے بعد اگر رخصتی عمل میں نہیں آتی تو ایسی عورت پر کوئی عدت نہیں ہے۔ [۳۳/الاحزاب: ۴۹]

(ب) مطلقہ بیوی اگر حمل سے ہو تو اس کی عدت بچہ جنم دینے تک ہے۔ [۶۵/الطلاق: ۴]

(ج) اگر حمل کے بغیر حیض منقطع ہے، یہ انقطاع بچپن، بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے ہو سکتا ہے تو ایسے حالات میں تین قمری مہینے عدت کے طور پر گزارنا ہوں گے اگر مہینوں کا شمار نہ ہو سکے تو 90 دن پورے کئے جائیں۔ اگر عورت کو ایام آتے ہیں تو تین حیض مکمل کرنا ہوں گے ایسی صورت حال کے پیش نظر تین ماہ یا نوے دن پورا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ [۲/البقرۃ: ۲۲۸]

⑬ دوران عدت خاوند کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی بیوی سے رجوع کرے لیکن شرط یہ ہے کہ اسے بسانے اور آباد کرنے کی نیت ہو اسے روک کر مزید اذیت پہنچانا مقصود نہ ہو۔ [۲/البقرۃ: ۲۲۸]

اس رجوع کے لئے کسی قسم کے کفارہ کی ضرورت نہیں ہے اگر عدت گزر جائے تو بھی تجدید نکاح سے اپنا گھر آباد کیا جا سکتا ہے۔ [۲/البقرۃ: ۲۳۲]

لیکن اس نکاح کے لئے عورت کی رضامندی، سرپرست کی اجازت، حق مہر کی تعیین اور گواہوں کا موجود ہونا ضروری ہے، نیز رجوع کا حق پہلی اور دوسری طلاق کے بعد ہے۔

⑭ اگر رجوع کا پروگرام نہیں ہے تو عدت گزرنے کے بعد عورت خود بخود آزاد ہو جائے گی۔ اس کے لئے کسی مزید اقدام کی ضرورت نہیں ہے لیکن ایسے حالات میں اسے الزام تراشی یا بدتمیزی سے رخصت نہ کیا جائے بلکہ اس سلسلہ میں اس کے جو حقوق ہیں انہیں فیاضی سے ادا کیا جائے۔ قرآن کریم نے ہدایت کی ہے کہ مطلقہ عورتوں کو بھی معروف طریقہ سے کچھ دے کر رخصت کرو، ایسا کرنا اہل تقویٰ کے لئے ضروری ہے۔ [۲/البقرہ:۲۴۲]

⑮ اگر تیسری طلاق بھی دے دی جائے تو رشتہ ازدواج ہمیشہ کے لئے منقطع ہو جاتا ہے، تاہم عورت کے لئے عدت گزارنا ضروری ہے لیکن عام حالات میں اس سے رجوع نہیں ہو سکے گا۔ اب رجوع کی صرف ایک صورت ہے کہ وہ عورت کسی سازش کے طور پر نہیں بلکہ آباد ہونے کی نیت سے آگے کسی سے نکاح کرے اور وہ خاوند اس سے مجامعت کے بعد طلاق دے یا فوت ہو جائے تو عدت طلاق یا عدت وفات گزارنے کے بعد پہلے خاوند سے نکاح ہو سکتا ہے۔ [۲/البقرہ:۲۳۰]

⑯ اگر عورت خاوند کی طرف سے بے اتفاقی کا شکار ہے اور وہ طلاق دے کر اسے فارغ بھی نہیں کرتا تو ایسی حالت میں عورت کو اختیار ہے کہ وہ بذریعہ عدالت اپنے خاوند سے علیحدگی اختیار کر سکتی ہے یا خود اس سے کوئی معاملہ طے کر کے طلاق حاصل کر لے، جیسا کہ خلع میں ہوتا ہے۔ [۲/البقرہ:۲۲۹]

سوال ایک آدمی نے کسی عورت سے نکاح کیا، اس سے اولاد بھی پیدا ہوئی پھر اس نے اپنی بیوی کو طلاق دیئے بغیر اس کی حقیقی بھانجی سے نکاح رچا لیا اور اس سے بھی اولاد پیدا ہوئی، اب خالہ اور بھانجی ایک ساتھ اس کے عقد میں ہیں۔ کتاب وسنت کی روشنی میں فتویٰ دیں کہ ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں، اگر جائز نہیں تو ان میں سے کون سا نکاح باطل ہوگا، نیز ناجائز نکاح سے پیدا ہونے والی اولاد کے متعلق کیا حکم ہے کیا وہ اپنے باپ کی حقدار ہوگی کیا حقیقی اولاد ان کے خلاف قانون وراثت کے تحت تمام جائیداد کے وارث ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ ناجائز نکاح کرنے پر اس جوڑے پر کوئی حد نافذ ہوگی اس قسم کا نکاح پڑھنے والے اور اس پر گواہ بننے والے کے متعلق کیا حکم ہے؟

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ وہ نکاح جو شرع کے عین مطابق ہو اور جملہ ارکان وشرائط کی پابندی کے ساتھ بلا کسی شرعی مانع کے منعقد ہوا ہو نکاح صحیح کہلائے گا۔ شریعت میں چار قسم کے ایسے موانع ہیں جن کی موجودگی میں نکاح کالعدم ہوتا ہے۔

① نسبی: اس سے مراد وہ موانع ہیں جو خون کے رشتہ سے پیدا ہوئے ہوں، مثلاً: ماں، بیٹی، بہن اور خالہ وغیرہ۔

② رضاعی: اس سے مراد وہ موانع ہیں جو کسی اجنبی عورت کا دودھ پینے کی بنا پر پیدا ہوئے ہوں، مثلاً: رضاعی بہن وغیرہ۔

③ ازواجی: اس سے مراد وہ موانع ہیں جو کسی سے نکاح کی بنا پر پیدا ہوئے، مثلاً: بیوی کی ماں وغیرہ۔

④ سببی: اس سے مراد وہ موانع ہیں جو مختلف اسباب کی بنا پر پیدا ہوئے ہوں، مثلاً: دوران عدت نکاح کرنا۔

اس مؤخر الذکر موانع کی متعدد صورتیں ہیں۔ ان میں سبب امتناع کے دور ہونے تک نکاح کرنا جائز نہیں ہے، مثلاً: کسی

دوسرے کی منکوحہ سے نکاح کرنا حرام ہے۔ جب سبب امتناع ختم ہوجائے تو نکاح کیا جا سکتا ہے، یعنی جب عورت کا خاوند فوت ہوجائے یا وہ اسے طلاق دیدے تو عدت گزرنے کے بعد اس سے نکاح کیا جا سکتا ہے کیونکہ سبب امتناع ختم ہو چکا ہے اس تفصیل کے بعد جب ہم صورت مسئولہ کا جائزہ لیتے ہیں تو اس نکاح ثانی میں سبب امتناع موجود ہے وہ یہ کہ خالہ کی موجودگی میں بھانجی سے نکاح نہیں ہوسکتا، چنانچہ حدیث میں ہے:

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عورت کی موجودگی میں اس کی پھوپھی یا اس کی خالہ سے نکاح کرنا ممنوع قرار دیا ہے۔ [صحیح بخاری، النکاح: ۵۱۰۸]

نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بھانجی اور خالہ، نیز بھتیجی اور پھوپھی کو بیک وقت نکاح میں جمع نہیں کیا جاسکتا۔'' [صحیح بخاری، النکاح: ۵۱۰۹]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم امتناعی تقریباً پندرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور خوارج کے ایک گروہ کے علاوہ اس قسم کے نکاح کے حرام ہونے پر امت کا اتفاق ہے۔ [فتح الباری، ص: ۲۰۲، ج ۹]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان ہے کہ اگر تم نے ایسا نکاح کیا تو قطع رحمی کے مرتکب ہوں گے۔
[صحیح ابن حبان، ص: ۱۶۶، ج ۶ حدیث: ۴۱۰۴]

فقہائے امت نے اس قسم کے نکاح کے متعلق تین صورتیں بیان کی ہیں۔

① اگر خالہ اور بھانجی سے بیک وقت نکاح کیا گیا ہے تو دونوں نکاح باطل ہیں کیونکہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو درست قرار دینے کی کوئی وجہ ترجیح موجود نہیں، جیسا کہ کسی عورت کا بیک وقت دو آدمیوں سے نکاح کر دیا جائے، اس صورت میں کسی سے بھی نکاح درست نہیں ہوگا۔

② اگر ایک سے پہلے اور دوسری سے بعد میں نکاح ہوا ہے تو پہلا نکاح صحیح ہوگا کیونکہ اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور دوسرا نکاح باطل ہوگا کیونکہ اس کے جواز کی کوئی دلیل نہیں بلکہ ناجائز ہونے کی دلیل موجود ہے کہ پہلے نکاح کی موجودگی میں دوسرا نکاح شرعاً جائز ہی نہیں اور دوسرا نکاح صرف اس صورت میں صحیح ہوسکتا تھا کہ پہلے نکاح کو ختم کیا جاتا اور پہلی بیوی اپنی عدت گزار لیتی جبکہ ایسا نہیں ہوا تو دوسرا نکاح سرے سے باطل ہوگا۔

③ دونوں نکاح یکے بعد دیگرے ہوئے ہوں لیکن اب معلوم نہیں پہلے کس سے ہوا اور بعد میں کس کو اپنے عقد میں لایا گیا، اس صورت میں بھی دونوں کو اپنے سے الگ کرنا ہوگا۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ ایک کو اپنے سے الگ کرکے دوسری سے تجدید نکاح کرے تو یہ اس کی صوابدید پر موقوف ہے اس کی تین صورتیں ممکن ہیں۔

(الف) نکاح کے بعد ان میں سے کسی کے ساتھ ابھی مباشرت کی نوبت نہیں آئی تو اس صورت میں ایک الگ کرکے اسی وقت دوسری سے نکاح کرسکتا ہے۔

(ب) اگر ان میں سے ایک کے ساتھ دخول کر چکا ہے اور اسے ہی اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے تو جسے ابھی تک چھوا نہیں اسے ایک

طلاق دے کر فارغ کر دے اور دوسری سے عدت گزرنے کے بعد نکاح کرے۔

(ج) اگر دونوں سے خلوت کر چکا ہے تو دونوں کو اپنے سے الگ کر دے۔ جب ان کی عدت گزر جائے تو جس سے چاہے نکاح کرے اگر کسی سے نکاح نہیں کرنا چاہتا تو بعد از عدت دونوں آزاد ہیں۔ وہ جس سے چاہیں نکاح کر لیں واضح رہے کہ اگر ان دونوں سے اولاد بھی ہو چکی ہے تو اولاد کی نسبت اسی کی طرف ہوگی کیونکہ نکاح صحیح ہے یا فاسد، دونوں صورتوں میں نسب کا الحاق اسی سے ہوگا۔ [مغنی ابن قدامہ، ص:۵۳۴، ج۹]

اس تفصیل کے بعد ہم جب صورت مسئولہ کا جائزہ لیتے ہیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص نے پہلے خالہ سے نکاح کیا اور اس سے اولاد بھی پیدا ہوئی اور یہ نکاح صحیح ہے اور اولاد بھی اسی کی ہے اس کے بعد دوسرا نکاح پہلی بیوی کی بھانجی سے کیا گیا جو شرعاً ناجائز ہے، جیسا کہ احادیث بالا سے واضح ہے چونکہ دوسری بیوی سے اولاد ہو چکی ہے۔ اس اولاد کی شرعی حیثیت کیا ہے اب دیکھنا ہوگا کہ دوسری سے نکاح کرتے وقت اس کی ذہنی کیفیت کیا تھی؟ اگر اس کی حرمت کو جانتے ہوئے دیدہ و دانستہ دوسرا نکاح کیا ہے تو اس صورت میں اولاد کی نسبت صرف ماں کی طرف ہوگی۔ باپ کی طرف سے انہیں منسوب نہیں کیا جائے گا اور یہ دونوں بدکاری کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مرد چونکہ شادی شدہ ہے اسے رجم کی سزا دی جائے اور جس سے نکاح کیا گیا ہے اسے سو کوڑے لگائے جائیں کیونکہ وہ پہلے سے شوہر دیدہ نہیں ہے۔ زنا کی سزا دینا حکومت کا کام ہے ہم قانون کو ہاتھ میں لے کر انہیں سزا دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ وہ از خود یا بذریعہ قانون ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں، ہمیں چاہیے کہ ایسے لوگوں سے مکمل بائیکاٹ کریں اور کسی قسم کے تعلق سے کلی طور پر اجتناب کریں۔ اگر اس نے دوسرا نکاح جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے کیا ہے تو بھی فوراً ان کے درمیان علیحدگی کرا دی جائے۔ البتہ اس صورت میں اولاد کی نسبت نکاح کرنے والے کی طرف ہوگی کیونکہ نکاح فاسد اور وطی بالشبہ کو بھی ثبوت نسب کے لئے حجت قرار دیا گیا ہے۔ شرع اسلام میں بچے کو صحیح النسب قرار دینے کی انتہائی کوشش کی گئی ہے تاکہ معاشرہ میں انتشار اور بداخلاقی نہ پھیلے۔ صورت مسئولہ میں اٹھائے گئے سوالات کا ترتیب وار جواب حسب ذیل ہے۔

① اس آدمی نے جو دوسرا عقد کیا ہے وہ کسی صورت میں جائز نہیں۔ واضح رہے کہ اس نکاح کی حرمت ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

② دوسرا نکاح باطل ہے کیونکہ خالہ اور بھانجی کو جمع کرنے کا سبب عقد ثانی ہے، پہلا نکاح صحیح ہے کیونکہ اس میں صحت کی تمام شرائط پائی جاتی ہیں اور اسے حرام قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

③ دوسری سے نکاح کے نتیجہ میں جو اولاد پیدا ہوئی ہے اس کی دو صورتیں ہیں اگر لاعلمی میں ایسا ہوا ہے تو پیدا ہونے والی اولاد صحیح النسب ہوگی اگر اس کی حرمت کا علم تھا اس کے باوجود نکاح کیا ہے تو بدکاری کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی اولاد صرف ماں کی طرف سے منسوب ہوگی۔ آدمی سے اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے دونوں صورتوں میں ان کے درمیان علیحدگی کرانا ضروری ہے۔

④ دوسری سے پیدا ہونے والی اولاد وراثت کی حق دار نہیں ہوگی اور نہ ہی منکوحہ اور ناکح کے درمیان وراثت کا سلسلہ چلے گا بلکہ پیدا ہونے والی اولاد کو صرف ماں کی طرف سے وراثت ملے گی، بشرطیکہ نکاح کے وقت انہیں اس کی حرمت کا علم تھا۔

⑤ حقیقی اولاد: اس ناجائز اولاد کے خلاف قانون وراثت کے تحت تمام جائیداد کے وارث ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ واضح رہے

کہ ہمارے ملک کے عائلی قوانین میں انہیں ناجائز قرار دینے کا کوئی قانون نہیں ہے۔

⑥ ناجائز نکاح کرنے پر اس جوڑے پر حد لگائی جاسکتی ہے جس کی تفصیل گزشتہ سطور میں بیان کر دی گئی ہے لیکن حد لگانا اسلامی حکومت کا کام ہے، ہم اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔

⑦ ہم لوگ عام طور پر نکاح پڑھنے والے اور اس پر گواہی دینے والوں کو قابل گردن زدنی قرار دیتے ہیں حالانکہ ان ''بے چاروں'' کو صحیح صورت حال سے آگاہ ہی نہیں کیا جاتا۔ خود راقم کے ساتھ ایسا ہوا کہ ایک نکاح پڑھایا گیا اور بتایا گیا کہ لڑکی کنواری ہے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ لڑکی شادی شدہ تھی اور پہلے خاوند سے طلاق بھی نہیں لی گئی تھی ایسے حالات میں نکاح خواں کا کیا قصور ہے، ہاں، اگر اس نے جانتے بوجھتے ہوئے یہ نکاح پڑھایا تو نکاح خواں بھی جرم میں برابر کا شریک ہے۔ اسی طرح گواہوں کا معاملہ ہے۔ ایسا کرنے کے باوجود ان کے نکاحوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ نکاح ختم ہونے کے لئے ضروری ہے کہ خاوند طلاق دے یا وہ دین اسلام سے برگشتہ ہو جائے۔ مذکورہ صورت میں کوئی ایسا کام نہیں ہوا جس کی بنا پر نکاح خواں یا گواہوں کے نکاح کو کالعدم قرار دیا جائے۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال میری شادی کو تقریباً دو سال ہو چکے ہیں اللہ تعالیٰ نے سال بعد ایک بیٹا عطا فرمایا جب وہ اپنی والدہ، یعنی میری بیوی کو تنگ کرتا تو وہ اسے گالیاں وغیرہ دے لیتی تھی۔ اس کا رویہ میرے لئے انتہائی پریشانی کا باعث تھا۔ بالآخر ایک دن میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تو نے آیندہ بچے کو گالی دی تو میری طرف سے تو فارغ ہے۔ میرے یہ الفاظ کہنے سے طلاق کا قطعی ارادہ نہیں تھا اور نہ ہی میرے وہم وگمان میں تھا کہ بیوی کو فارغ کہنے سے طلاق ہو جاتی ہے کچھ دنوں بعد اس نے، پھر گالی دی اور میرے ساتھ بدتمیزی کی، اس پر میں ناراض ہو گیا اور وہ مجھ سے معافی مانگنے لگی میں نے کہا کہ معافی کی ایک ہی صورت ہے کہ تم قرآن کریم پر ہاتھ رکھ کر کہو کہ اگر میں نے آیندہ بچے کو گالی دی یا بدتمیزی کی تو آپ کی طرف سے مجھے طلاق ہے، چنانچہ اس نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر یہ الفاظ کہہ دیے، اس کے بعد مجھے پریشانی ہوئی تو میں نے قریبی مسجد کے خطیب سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا اس نے بتایا کہ جو بات تمہارے درمیان ہوئی ہے اسے ختم کر دو، چنانچہ میں نے گھر آ کر اپنی شرط کو ختم کر دیا اور اپنی بیوی سے بچے کو گالی دینے کی پابندی اٹھا دی۔ میں نے اس بات کو مختلف الفاظ میں اتنی بار دھرایا کہ اس نے تنگ آ کر بچے کو گالی دی اور میرے ساتھ بدتمیزی بھی کر ڈالی پھر اس کا موڈ بھی خراب رہنے لگا۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تو نے اپنا رویہ درست نہ کیا تو میری طرف سے فارغ ہے، لیکن میری نیت طلاق کی نہ تھی۔ چنانچہ اس نے میری دھمکی کے بعد اپنا رویہ صحیح کر لیا، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ مذکورہ بالا ان تینوں صورتوں میں طلاق ہو جاتی ہے یا نہیں؟ میں آج کل پریشان اور الجھن کا شکار ہوں ازراہ کرم کتاب وسنت کی روشنی میں مجھے مطمئن فرمائیں۔

جواب راقم الحروف پچھلے دنوں بواسیر کے آپریشن کی وجہ سے تقریباً ایک ماہ تک صاحب فراش رہا، اسی دوران ''احکام و مسائل'' کے متعلق جو خطوط آئے ہیں ان پر بیماری کی وجہ سے توجہ نہ دی جاسکی، مندرجہ بالا سوال سے متعلق تین فل سکیپ صفحات پر مشتمل خط بھی اس دوران وصول ہوا۔ اس کے بعد سائل نے بذریعہ فون رابطہ کیا اور بار بار جواب کا اصرار کرتا رہا، حالانکہ وہ متعدد

اہل علم سے اپنے استفسار کا جواب حاصل کر چکا تھا۔میں نے بھی فون پر اسے مطمئن کیا لیکن سب کچھ کرنے کے باوجود اس نے دو دفعہ اپنے خط کی کاپی بذریعہ کوریئر سروس ارسال کی۔ان تمام مراحل سے معلوم ہوتا ہے کہ سائل انتہائی جذباتی اور سیلانی طبیعت کا حامل ہے اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ وہ وسواس زدہ اور شکوک وشبہات کا شکار ہے،ہمیں اس سلسلہ میں اپنے رویہ پر نظر ثانی کرنا ہو گی۔گھریلو عائلی زندگی کے متعلق ہم بہت افراط وتفریط کا شکار ہیں بالخصوص اپنی اہلیہ کے ساتھ حسن سلوک کرنے کے متعلق ہم فراخ دلی سے کام نہیں لیتے اگر کوئی بات اچھے انداز سے سمجھائی جاسکتی ہو تو ہم بھی اسے جذباتی انداز میں کہنے کے عادی ہیں۔رسول اللہ ﷺ اپنی عائلی زندگی کے متعلق فرماتے ہیں:

’’تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنے اہل خانہ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہے اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ انتہائی خوش اخلاقی اور خندہ روئی سے پیش آتا ہوں۔‘‘

لیکن بالعموم ہماری عادت یہ ہے کہ ہم گھر سے باہر بڑے خوش مزاج ہوتے ہیں۔لیکن گھر کی چار دیواری میں داخل ہوتے ہی اپنی آنکھوں کو سر پر رکھ لیتے ہیں جب کوئی گھر میں غصہ وناراضی کی بات ہوتی ہے تو ہماری ترکش سے پہلا تیر طلاق کا برآمد ہوتا ہے،حالانکہ قرآن کریم نے طلاق سے پہلے کم از کم چار پانچ مراحل کی نشاندہی کی ہے جب صلح وآشتی کے تمام حربے ناکام ہو جائیں،پھر طلاق کا حربہ استعمال کرنے کی اجازت دی ہے۔وہ اس انداز سے دی جائے کہ آئندہ باہمی مل بیٹھنے کے راستے مسدود نہ ہوں۔ہم لوگوں نے طلاق کو مذاق سمجھ رکھا ہے جب پانی سر سے گزر جاتا ہے تو پھر علما سے رابطہ کرنے کے لئے دوڑ دھوپ شروع ہوتی ہے تاکہ کہیں سے تھوڑی بہت گنجائش مل جائے۔

راقم نے مذکورہ سوال میں کانٹ چھانٹ کے بعد طباعت کے قابل بنایا ہے یہ خط بھی سائل کے منفی جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔بشرط صحت سوال واضح ہو کہ طلاق کے الفاظ کہنے کے اعتبار سے اس کی دو اقسام ہیں:

☆ طلاق صریح: واضح اور دوٹوک الفاظ میں استعمال کی جائے،اسے طلاق صریح کہتے ہیں۔اس میں انسان کے عزم اور ارادہ کو دیکھا جاتا ہے اور اس نے جانتے بوجھتے ہوئے اپنے ارادہ اختیار سے لفظ طلاق کو استعمال کیا ہے اگر اس نے ہنسی مذاق میں یہ لفظ کہہ دیا تب بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔اس میں انسان کی نیت کو کوئی دخل نہیں ہوتا ہاں،اگر بھول کر یا غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے یہ لفظ نکل گیا ہے تو ایسا کہنے سے طلاق نہیں پڑتی۔

☆ طلاق کنائی: لفظ طلاق واضح طور پر استعمال نہ کیا جائے بلکہ اس کی جگہ اشارے اور کنایہ وغیرہ سے کام لیا گیا ہو،شاید تو میری طرف سے فارغ ہے۔تیری میری بس تو پکی پکی اپنے گھر چلی جا،میں نے تمہیں اپنے پاس نہیں رکھنا وغیرہ اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے وقت انسان کی نیت کو دیکھا جاتا ہے اگر نیت طلاق کی ہے تو طلاق واقع ہو گی۔بصورت دیگر نہیں کیونکہ بعض اوقات مذکورہ الفاظ بطور دھمکی استعمال ہوتے ہیں۔رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ اپنی منکوحہ ’’ابنۃ جون‘‘ کو بایں الفاظ طلاق دی تھی تو اپنے گھر چلی جا۔‘‘ [صحیح بخاری،الطلاق:۵۲۵۴]

لیکن مذکورہ الفاظ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو کہے تھے اور ان کا ارادہ طلاق دینے کا نہیں تھا لہٰذا وہ طلاق

میں شمار نہیں ہوئے۔ [صحیح بخاری، المغازی: ۴۴۱۸]

اسی طرح طلاق کے نافذ ہونے کے اعتبار سے بھی اس کی دو اقسام ہیں:

① منجز: اس سے مراد ایسی طلاق ہے جو فی الفور نافذ ہو جائے، مثلاً: یوں کہا جائے کہ میں تجھے طلاق دیتا ہوں۔

② معلق: جو فی الفور نافذ العمل نہ ہو بلکہ اسے کسی کام کے کرنے یا چھوڑنے پر معلق کیا جائے، مثلاً: یوں کہا جائے کہ اگر تو نے گھر سے باہر قدم رکھا تو تجھے طلاق ہے۔ اس صورت میں جب بھی عورت گھر سے باہر قدم رکھے گی تو اسے طلاق ہو جائے گی لیکن اس سلسلہ میں یہ بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ خاوند اپنی بیوی پر جو پابندی عائد کرتا ہے۔ ذہنی طور پر اس کی حد بندی کہاں تک ہے۔ بظاہر زندگی بھر کے لئے اس پر یہ پابندی عائد کرنا اس کا مقصد نہیں ہے اور نہ ہی ایسا کہنا کسی عقلمند آدمی کو زیب دیتا ہے۔ اگر ذہن میں طے شدہ وقت کے بعد پابندی کی خلاف ورزی ہو تو طلاق غیر مؤثر ہوگی۔ کیونکہ پابندی کا وقت گزر چکا ہے اسی طرح معلق طلاق میں اگر پابندی کی خلاف ورزی سے پہلے پہلے اس شرط کو ختم کر دیا جائے تو بھی خلاف ورزی کی صورت میں طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ پابندی عائد کرنے والے نے خود ہی اس پابندی کو ختم کر دیا ہے۔ سائل نے جس انداز سے اپنی بیوی کو جو الفاظ کہے ہیں، یعنی اگر تو آئندہ بچے کو گالیاں دے تو میری طرف سے فارغ ہے۔ سائل نے خود ہی وضاحت کر دی ہے کہ ان الفاظ سے قطعی طور پر طلاق کا ارادہ نہیں تھا بلکہ میں نے دھمکی کے طور پر یہ لفظ کہے تھے یہ الفاظ طلاق کنائی کا حکم رکھتے ہیں جو کہنے والے کی نیت پر منحصر ہیں۔ لہٰذا اس صورت میں اگر بیوی نے خلاف ورزی کی ہے تو طلاق نہیں ہوگی کیونکہ اس نے طلاق کی نیت سے یہ الفاظ نہیں کہے تھے۔ دوسری صورت میں طلاق معلق میں اس نے صراحت کے ساتھ لفظ طلاق استعمال کیا ہے اگر اس کی خلاف ورزی پائی جاتی تو قطعی طور پر طلاق واقع ہو جاتی لیکن اس نے دانشمندی سے کام لیتے ہوئے خلاف ورزی کرنے سے پہلے اس شرط کو ختم کر دیا، لہٰذا یہ معلق طلاق خود بخود غیر مؤثر ہو گئی، یعنی اس صورت میں بھی طلاق نہیں ہوگی۔

تیسری صورت کنایہ کے الفاظ میں طلاق معلق ہے۔ سائل کی وضاحت کے مطابق اس کا طلاق دینے کا ارادہ نہیں تھا ویسے بھی بیوی نے اپنا رویہ صحیح کر لیا، لہٰذا اس صورت میں بھی طلاق نہیں ہوگی مختصر یہ ہے کہ ان تینوں میں طلاق واقع نہیں ہوگی۔ مسئلہ کی وضاحت کرنے کے بعد ہم پھر اپنی بات کو دہراتے ہیں کہ زندگی کے اس بندھن کو کھیل اور تماشا نہ بنایا جائے، یہ کوئی بجلی کا بلب نہیں جب چاہا لگا لیا اور جب چاہا اتار لیا۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ مبارکہ کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ [واللہ اعلم]

سوال میں نے غصہ میں آ کر اپنی بیوی کو دو دفعہ طلاق کا لفظ کہہ دیا۔ جب تیسری دفعہ کہنے لگا تو میری بہن نے مجھے کہا کہ بھائی جان! کچھ سمجھ داری سے کام لو یہ کیا کہہ رہے ہو، میں نے پھر کہہ دیا کہ میں اگر اسے اپنے گھر میں رکھوں تو میری ماں، بہن ہے یہ ساری باتیں غصے میں ہوئیں۔ قرآن وحدیث کے مطابق اب میرے لئے کیا حکم ہے؟

جواب واضح رہے کہ ہمارے معاشرے میں طلاق کا مسئلہ انتہائی نزاکت کا حامل ہے، لیکن ہم اس قدر اس کے متعلق غیر محتاط واقع ہوتے ہیں کہ معمولی سی ناگواری کی بنا پر اپنی بیوی کو طلاق، طلاق، طلاق کہہ دینا ایک عام رواج بن چکا ہے۔ طلاق دینا اگرچہ جائز اور حلال عمل ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں انتہائی ناپسندیدگی کا باعث ہے، اگرچہ بعض دفعہ انسان اس قدر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس

تیر کو اپنے ترکش سے نکالنا پڑتا ہے، لیکن اگر شریعت کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق طلاق دی جائے تو انسان کو بعد میں ندامت یا شرمندگی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ رسول اللہ ﷺ نے رواجی طریقہ طلاق کو نہ صرف ناپسند فرمایا ہے بلکہ اسے اللہ کی کتاب کے ساتھ مذاق کرنے کے مترادف قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک شخص نے اس انداز میں طلاق دی تو آپ بہت ناراض ہوئے، آپ کی ناراضی کو دیکھتے ہوئے ایک دوسرے شخص نے کہا اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں اسے قتل کر دوں۔

[نسائی، الطلاق: ۳۴۳۰]

صورت مسئولہ میں ہمارے نزدیک یہ ایک رجعی طلاق ہے چونکہ سائل نے اپنی بیوی کو ماں نہیں کہا ہے، اگرچہ ایسا کہنا بہت فضول اور ناپسندیدہ بات ہے، تاہم مالکیہ کہتے ہیں کہ یہ بھی ظہار ہے اور حنابلہ کا کہنا ہے کہ اس قسم کی بات اگر جھگڑے اور غصے کی حالت میں کہی گئی ہے تو ظہار ہے۔ بصورت دیگر یہ ظہار نہیں گویا بہت ہی بے ہودہ بات ہے۔ واضح رہے کہ ظہار کا کفارہ ساٹھ مساکین کو کھانا کھلانا ہے۔ ہمارے نزدیک اگرچہ ایسے حالات میں اپنی بیوی کو ماں یا بہن کہنا ظہار نہیں ہے کیونکہ ظہار میں تشبیہ کا معنی پایا جانا ضروری ہے جو موجودہ صورت میں نہیں ہے، تاہم شریعت نے اس انداز کو بھی پسند نہیں فرمایا ہے خاوند کو چاہیے کہ وہ آئندہ ایسی حرکات کا اعادہ نہ کرے۔ اس بنا پر یاددہانی کا تازیانہ ضرور ہونا چاہیے جو آئندہ اس کے سر پر لٹکتا رہے۔ اس کی یہ صورت ہوسکتی ہے کہ وہ ساٹھ مساکین کو کھانا کھلائے اور اللہ کے حضور اپنی توبہ اور استغفار کا نذرانہ پیش کرے۔ [واللہ اعلم]

سوال میرا بیوی سے جھگڑا ہو گیا ہے جبکہ وہ چار ماہ کی حاملہ تھی میں اسے میکے چھوڑ آیا، پھر اس کی غیر موجودگی میں تین بار طلاق طلاق، طلاق کہہ دیا۔ میری بیوی نے یہ الفاظ نہیں سنے، اس کے لیے عموماً یہ الفاظ استعمال کرتا رہا کہ میں نے اسے فارغ کر دیا ہے بعد ازاں اس نے ایک بچے کو جنم دیا حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ ہمیں صلح کرنا پڑی۔ کتاب وسنت کی روشنی میں اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟

جواب اپنی بیوی کو طلاق دینے کا یہ طریق کار انتہائی غلط اور خلاف شرع ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے انسان پر اظہار ناراضی فرمایا ہے، البتہ احناف کے نزدیک اس انداز سے دی ہوئی ایک مجلس کی تین طلاق تینوں ہی نافذ ہو جاتی ہیں اور طلاق دہندہ کی بیوی ہمیشہ کے لئے اس پر حرام ہو جاتی ہے جبکہ قرآن وحدیث کے مطابق اس انداز سے دی ہوئی تین طلاق صرف ایک رجعی واقع ہوتی ہے۔ صورت مسئولہ میں طلاق کے وقت بیوی حاملہ تھی اور حاملہ کی عدت وضع حمل ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل ہے''۔ [۶۵/ الطلاق: ۴]

لہٰذا مذکورہ عورت کی عدت وضع حمل کے بعد ختم ہو چکی ہے اب اگر بیوی اپنے سابقہ خاوند کے ہاں آنا چاہے تو نکاح جدید ہوگا کیونکہ عدت ختم ہوتے ہی نکاح بھی ختم ہو چکا ہے۔ تجدید نکاح کے بغیر رجوع کا موقع ہاتھ سے نکل چکا ہے اگر صلح نئے نکاح سے ہوتی ہے تو ٹھیک بصورت دیگر ابھی سے نیا نکاح کر لیا جائے اور نئے نکاح کے بغیر صلح کرنے کی غلطی پر اظہار ندامت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی جائے اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے مساکین کو صدقہ وخیرات بھی دیا جائے۔ آخر میں ہم یہ کہنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ خانگی معاملات میں جذبات میں آکر فیصلے نہ کئے جائیں بلکہ نہایت سنجیدگی اور ذہانت سے ایسے نازک

معاملات کو نبٹایا جائے اور شریعت کا دامن کسی وقت بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک شخص نے تحریری طور پر اپنی بیوی کو طلاق دی جو اس نے وصول کر لی تقریباً دو ماہ کے اندر اندر مذکورہ شخص رجوع کے ارادہ سے اپنے ایک رشتہ دار کے ہمراہ سسرال کے شہر گیا لیکن لڑائی جھگڑے کے خدشہ کے پیش نظر سسرال کے ہاں خود جانے کے بجائے اپنے رشتہ دار کو برائے مصالحت بھیج دیا اس وقت مصالحت نہ ہو سکی، اب تقریباً چار سال بعد ہماری بیوی صلح پر آمادہ ہے اور ایک ساتھ رہنے کے لئے تیار ہیں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ مذکورہ شخص کو رجوع کا فائدہ پہنچتا ہے یا انہیں دوبارہ نکاح کرنے کی ضرورت ہے؟

جواب ہمارے ہاں رجوع کے متعلق چند غلط فہمیاں ہیں، اس لئے پہلے رجوع کی حیثیت سمجھنا ضروری ہے، اس کے متعلق چند بنیادی باتیں حسب ذیل ہیں:

① طلاق، رجوع دونوں خاوند کا حق ہیں سسرال یا بیوی کا قبول کرنا یا اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کرنا ضروری نہیں ہے۔

② رجعی طلاق دینے کی صورت میں اگر دوران عدت رجوع کا پروگرام بن جائے تو سابقہ نکاح برقرار ہے۔ تجدید نکاح کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔

③ اگر عدت گزرنے کے بعد رجوع کا خیال آیا تو اب تجدید نکاح سے رجوع ہو سکے گا کیونکہ پہلا نکاح ختم ہو چکا ہے۔ اس صورت میں سرپرست کی اجازت، بیوی کی رضامندی ضروری ہے حق مہر اور گواہوں کا بھی از سر نو اہتمام کرنا ہوگا۔

④ رجوع گفتگو سے بھی ہو سکتا ہے اور وظیفہ زوجیت ادا کرنے سے بھی، خلوت صحیحہ کا میسر آنا بھی اس حکم میں ہے۔ بشرطیکہ رجوع کی نیت ہو۔

صورت مسئولہ میں اگر خاوند نے اپنے رشتہ دار کے سامنے رجوع کا زبانی اظہار کیا ہے اور اپنے سسرال کے ہاں یہ کہہ کر بھیجا ہے کہ میں نے رجوع کر لیا ہے اس بنا پر میرے ساتھ صلح کی جائے تو اس صورت میں اس کا رجوع صحیح ہے، چونکہ یہ تحریک دوران عدت ہی چلائی گئی تھی، لہٰذا نئے نکاح کی ضرورت نہیں ہے اگر اس کے برعکس اس نے زبانی طور پر اپنے رشتہ دار کے سامنے رجوع کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی اس نے سسرال بھیجتے وقت اسے یہ ہدایت دی ہے تو اس صورت میں رجوع نہیں ہوگا۔ اب چونکہ عدت گزرنے کے بعد فریقین صلح پر آمادہ ہوئے ہیں، لہٰذا مؤخر الذکر صورت میں انہیں تجدید نکاح کرنا ہوگا، البتہ اول الذکر صورت میں پہلا نکاح کافی ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہم نے اپنی بیٹی کے لئے تنسیخ نکاح کا مقدمہ دائر کیا تھا عدالت نے ہمارے حق میں فیصلہ دیدیا ہے اب کیا ہم اپنی بیٹی کا نکاح کسی دوسری جگہ کر سکتے ہیں؟ کتاب وسنت کے مطابق فتویٰ درکار ہے۔

جواب شریعت اسلامیہ نے خاوند کو اس بات کا پابند کیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو نان ونفقہ اور دیگر ضروریات زندگی فراہم کرے اور اگر وہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی اپنے اندر ہمت نہیں پاتا تو اچھے طریقے سے اسے چھوڑ دے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"تم معروف طریقہ سے ان عورتوں کو گھروں میں رکھو یا اچھے طریقہ سے انہیں چھوڑ دو"۔ [۲/البقرہ:۲۳۱]

بیوی کو تکلیف دینے کی غرض سے گھر میں روکے رکھنا اور اس کی ضروریات زندگی فراہم کرنے سے راہ فرار اختیار کرنا کوئی دانشمندانہ اقدام نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا ہے۔ فرمان الٰہی ہے: ''اور انہیں تکلیف دینے اور ان پر زیادتی کرنے کے لئے مت روکے رکھو''۔ [۲/البقرہ:۲۳۱]

جب خاوند اپنی بیوی کی جائز ضروریات زندگی کو پورا نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے دیگر حقوق ادا کرتا ہے اس پر مزید ظلم بایں طور کرتا ہے کہ اسے اپنی زوجیت سے بھی الگ نہیں کرتا تو ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ نے عورت کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنے آپ پر ہونے والے اس ظلم کو دور کرنے کے لئے عدالتی چارہ جوئی کرے۔ شریعت نے بھی بعض معاملات میں عدالت کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ معاملات کی چھان بین کرنے کے بعد تنسیخ نکاح کی ڈگری جاری کرے۔ صورت مسئولہ میں جب عورت کے سرپرست نے عدالت سے رجوع کیا ہے اور عدالت نے اپنے ذرائع کے مطابق تحقیق کرنے کے بعد عورت کے حق میں تنسیخ نکاح کا فیصلہ دے دیا ہے تو اب عورت کو حق ہے کہ عدت گزارنے کے بعد وہ اپنی زندگی کے باقی ماندہ ایام باعزت طور پر گزارنے کے لئے نکاح ثانی کرسکتی ہے اور اس کے لیے شرعاً کوئی امر مانع نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے خاندان کی دولڑکیوں کا نکاح وٹہ سٹہ کے طور پر ہوا بوقت نکاح ایک لڑکی بالغہ تھی اور اس کی رخصتی ہوگئی جبکہ دوسری لڑکی کی رخصتی نابالغہ ہونے کی وجہ سے نہ ہوسکی۔ بڑی لڑکی والوں نے فریق ثانی سے یہ شرط لکھوائی کہ اگر تم نے اپنی لڑکی کی رخصتی نہ کی تو مبلغ چالیس ہزار روپیہ ہمیں ادا کرنا ہوگا۔ بڑی لڑکی کے ہاں دو بچے پیدا ہوئے اور تیسری مرتبہ حاملہ تھی کہ اس کے خاوند نے خودکشی کرلی۔ بعض وجوہات کی بنا پر فریقین میں ناچاقی پیدا ہوچکی ہے۔ بیوہ کے والدین اپنی لڑکی کی آگے شادی کرنا چاہتے ہیں، جبکہ چھوٹی لڑکی والے اس میں رکاوٹ ڈالتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ پہلے ہماری لڑکی کو طلاق دو پھر اس کی آگے شادی کرو۔ بڑی لڑکی والوں کا موقف ہے کہ حسب شرط (جو تحریر شدہ ہے) تم مبلغ چالیس ہزار روپیہ ادا کرو، پھر ہم تمہاری لڑکی کو طلاق دیں گے۔ ایسے سنگین حالات میں کیا کرنا چاہیے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں راہنمائی فرمائیں۔

جواب ہمارے ہاں معاشرہ میں شریعت سے ناواقفیت کی بنا پر بعض لوگ جاہلانہ رسم ورواج کو بڑی سختی سے تھامے ہوتے ہیں ان میں سے ایک رسم نکاح وٹہ سٹہ ہے جسے عربی زبان میں نکاح شغار کہا جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ نکاح دور جاہلیت کی یادگار ہے اور اسلام نے اس کے متعلق حکم امتناعی جاری کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''دین اسلام میں نکاح وٹہ سٹہ کا کوئی وجود نہیں ہے۔'' [صحیح مسلم، النکاح:۱۴۱۵]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نکاح وٹہ سٹہ سے منع فرمایا ہے۔ [صحیح بخاری، النکاح:۵۱۱۲]

واضح رہے کہ نکاح وٹہ سٹہ ہر صورت میں حرام ہے، خواہ حق مہر رکھا گیا ہو یا تبادلہ نکاح کو ہی حق مہر قرار دیا گیا ہو۔ ان احادیث کے پیش نظر اصولی طور پر صورت مسئولہ میں دونوں نکاح باطل ہیں لیکن لاعلمی کی وجہ سے ایک لڑکی کی رخصتی ہوچکی ہے اور اس کے بطن سے اولاد بھی پیدا ہوئی ہے، نیز اس کا خاوند بھی فوت ہوچکا ہے اس بنا پر احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے متعلق گنجائش نکالی جائے، البتہ چھوٹی لڑکی جس کا صرف نکاح ہوا ہے ابھی رخصتی عمل میں نہیں آئی۔ اس کے نکاح کو کالعدم اور باطل

قرار دیا جائے، اس لئے بچی کے والدین فریق ثانی سے طلاق لئے بغیر آگے نکاح کر سکتے ہیں۔اسی طرح بڑی لڑکی کے والدین کا ان سے چالیس ہزار روپے کا مطالبہ کرنا بھی درست نہیں ہے۔کیونکہ ایسا کرنا صریح ظلم ہے جس کے متعلق شریعت اجازت نہیں دیتی ہے، نیز ایک حدیث کے مطابق جو شرط کتاب اللہ سے ٹکراتی ہو اور اس کا ثبوت شریعت میں نہ ملتا ہو وہ سرے سے باطل ہوتی ہے۔اس لئے نکاح کے ساتھ یہ شرط بھی کالعدم قرار پائے گی اگر چھوٹی لڑکی والے طلاق لینے پر اصرار کرتے ہیں تو بڑی لڑکی والوں کو چاہیے کہ وہ اسے اپنی عزت کا مسئلہ نہ بنائیں بلکہ اپنی لڑکی کا گھر بسانے کے لئے چھوٹی لڑکی کو طلاق دے دیں اور ہر قسم کے مطالبہ سے دستبردار ہو جائیں۔ویسے شریعت مطہرہ نے لڑکی کو بالغ ہونے کے بعد یہ اختیار دیا ہے کہ اگر وہ چاہیے تو بچپن میں ہونے والے نکاح کو مسترد کر دے لیکن یہ خیار بلوغ صرف اس صورت میں استعمال کیا جا سکتا ہے کہ وہ بلوغت کے فوراً بعد نکاح کے متعلق اپنی ناگواری کا اظہار کر دے۔یہ اختیار عرصۂ دراز تک کے لئے حاصل نہیں رہتا۔الغرض چھوٹی بچی کا نکاح شغار ہونے کی بنا پر کالعدم ہے اور اس کے سرپرست آگے نکاح کرنے کے مجاز ہیں۔اسی طرح کسی فریق کا دوسرے سے رقم وغیرہ کا مطالبہ کرنا بھی شرعاً صحیح نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال اگر خاوند فوت ہو جائے تو بیوہ ایام عدت کہاں گزارے، اپنے خاوند کے گھر یا جہاں وہ اپنے خاوند کے فوت ہونے کی اطلاع پائے، نیز یہ بھی بتایا جائے کہ دوران عدت اپنے خاوند کی قبر پر جا سکتی ہے یا نہیں؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کا حل پیش کریں۔

جواب عورت نے جس خاوند کے ساتھ زندگی کے ایام گزارے ہیں اس کے حق رفاقت و وفاداری اور اس کے رشتہ داروں کے ساتھ ہمدردی و غمگساری کا تقاضا یہ ہے کہ خاوند کے مرنے کے بعد اس کی بیوی عدت کے ایام اپنے خاوند کے گھر میں گزارے، خواہ وہ مکان تنگ ہو یا تاریک اور کتنا ہی وحشت ناک کیوں نہ ہو، چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت فریعہ بنت مالک رضی اللہ عنہا کا خاوند گھر سے باہر کسی دوسرے مقام پر قتل کر دیا گیا اور اس کا مکان انتہائی وحشت ناک مقام پر واقع تھا۔پھر وہ اس کی ملکیت بھی نہ تھا۔بیوہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی کہ مجھے والدین اور بہن بھائیوں کے ہاں منتقل ہونے کی رخصت دی جائے تاکہ عدت کے ایام امن و سکون سے وہاں گزار سکوں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اپنے اس گھر میں رہو جہاں تجھے خاوند کے فوت ہونے کی خبر ملی ہے یہاں تک کہ عدت کے ایام پورے ہو جائیں۔'' [مسند امام احمد، ص:۳۷۰، ج۳]

بعض احادیث میں ہے کہ اپنے گھر میں بیٹھی رہو۔ [نسائی، طلاق:۳۵۵۸]

یعنی کسی دوسری جگہ منتقل ہونے کی ضرورت نہیں۔

حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما اسی حکم کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔البتہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا موقف ہے کہ عورت عدت گزارنے کی پابند ہے، خواہ وہ کہیں گزارے۔ [نسائی، الطلاق:۳۵۶۱]

واضح رہے کہ حدیث میں تو یہ صورت ہے کہ عورت اپنے گھر میں تھی جبکہ خاوند باہر گیا تھا اور وہیں فوت ہو گیا، اگر خاوند اپنے گھر میں فوت ہوا اور اس کی بیوی اس وقت گھر میں موجود نہ ہو تو اس کے متعلق الفاظ اور حدیث اور حکمت حدیث کا تقاضا یہی ہے کہ

ایسی عورت بھی عدت کے ایام اپنے خاوند کے گھر میں پورے کرے، البتہ اس حکم سے درج ذیل دو صورتیں مستثنیٰ ہیں:

(الف) اگر عورت خانہ بدوش ہے اور کسی مقام پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے اگر اس کا خاوند فوت ہو جائے تو اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ چار ماہ دس دن اسی طرح ایک مقام پر گزارے بلکہ وہ جہاں قافلہ ٹھہرے گا اس کے ساتھ ہی اپنے ایام عدت گزارتی رہے گی۔

(ب) میاں بیوی کرایہ کے مکان میں رہائش پذیر تھے۔ خاوند کے فوت ہونے کے بعد آمدنی کے ذرائع مسدود ہو گئے جس کی وجہ سے کرایہ کی ادائیگی طاقت سے باہر ہو تو اس صورت میں بھی وہ کم کرایہ والے مکان میں منتقل ہو سکتی ہے۔

بعض اہل علم حدیث کے الفاظ ''جہاں تجھے خاوند کے فوت ہونے کی خبر ملے۔'' سے عورت کو پابند کرتے ہیں کہ وہ وہیں ایام عدت گزارے۔ جہاں اسے وفات کی خبر ملی ہے، خواہ وہ کسی کے پاس بطور مہمان ہی ٹھہری ہوئی ہو۔ اس طرح کی حرفیت پسندی اور بے جا پابندی شریعت کی منشا کے خلاف ہے۔

دوران عدت انتہائی ضروری کام کے لئے گھر سے نکلنے کی اجازت ہے لیکن اس صورت میں بھی رات گھر واپس آنا ضروری ہے۔ صورت مسئولہ میں ایام عدت میں خاوند کی قبر پر جانا کوئی ضروری امر نہیں ہے۔ جب عدت کے ایام پورے ہو جائیں تو پھر شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنے خاوند کی قبر پر جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال افتخار نامی ایک شخص نے پہلی بیوی کی موجودگی میں عقد ثانی کا ارادہ کیا دوسری بننے والی بیوی نے پہلی بیوی کو طلاق دینے کی شرط عائد کی، چنانچہ موصوف نے اسے مطمئن کرنے کے لئے پہلی بیوی کے نام طلاق تحریر کر کے دوسری ہونے والی بیوی کے حوالے کر دی کہ تم اس تحریر کو خود ہی ارسال کر دو۔ اس نے تحریر کو اپنے پاس رکھا، اس طرح شادی ہو گئی دوسری طرف سے اس نے پہلی بیوی سے کہہ دیا کہ اگر تجھے میری طرف سے تحریر ملے تو اسے وصول نہ کرنا یا اسے پھاڑ دینا، اس نکاح جدید کے دو سال تین ماہ بعد پہلی بیوی کے ہاں بچہ پیدا ہوا جو اس کے ساتھ رہائش رکھے ہوئے تھی۔ جب دوسری بیوی کو اس کا علم ہوا تو اس نے طلاق نامہ مع اپنا نکاح نامہ پہلی بیوی کو ارسال کر دیا۔ جب اس کے والدین کو پتہ چلا تو وہ اپنی لڑکی کو افتخار کے گھر سے لے گئے۔ اب اس کا موقف ہے کہ میں نے طلاق نامہ خوشی سے نہیں لکھا تھا بلکہ مجبوری اور دوسری سے نکاح کے لالچ میں تحریر کیا تھا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا یہ طلاق واقع ہو چکی ہے، افتخار کا اس دوران پہلی بیوی کے پاس رہنا درست تھا، کیا پہلی بیوی سے رجوع ہو سکتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ اس نے تینوں طلاق بیک وقت تحریر کر دی تھیں۔

جواب صورت مسئولہ میں نکاح ثانی کے وقت دین سے ناواقفی کی بنا پر کئی ایک غیر شرعی کام ہوئے ہیں پہلا تو یہ کہ کسی عورت کا پہلی بیوی کو طلاق دینے کا مطالبہ کرنا شرعاً درست نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق واضح طور پر منع کیا ہے فرمان نبوی ﷺ ہے کہ ''کوئی عورت نکاح کے وقت اپنی بہن کی طلاق کا مطالبہ نہ کرے تاکہ اس کے برتن کو انڈیل کر رکھ دے۔''

[صحیح بخاری، الشروط: ۲۷۲۳]

دوسری روایت میں ہے کہ اسے تو وہی کچھ ملے گا جو اس کا مقدر ہے۔ (اس لئے مطالبہ طلاق کے بغیر ہی نکاح کرے)

[صحیح بخاری، النکاح: ۵۱۵۲]

دوسرا غیر شرعی کام یہ ہے کہ خاوند نے اداکاری کے طور پر طلاق دی ہے، حالانکہ طلاق کا معاملہ انتہائی نزاکت کا حامل ہے وہ یوں کہ اگر کوئی بطور مذاق اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے تو وہ شرعاً نافذ ہوجاتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ تین کام ایسے ہیں کہ اگر کوئی سنجیدگی سے کرے یا ازراہ مذاق انہیں سرانجام دے وہ بہرصورت منعقد ہوجاتے ہیں وہ نکاح، طلاق اور رجوع ہے۔

[ابوداؤد، الطلاق:۲۱۹۴]

بنا بریں بیوی کی طلاق صحیح ہے، اگرچہ اس نے دوسری سے نکاح کے لالچ میں تحریر کی ہے۔ واضح رہے کہ طلاق کے وقت عورت کا موجود ہونا یا اسے مخاطب کرنا ضروری نہیں بلکہ یہ خالص خاوند کا حق ہے وہ جب بھی اپنے اختیارات کو استعمال کرے گا طلاق واقع ہوجائے گی۔ خواہ عورت طلاق نامہ کو وصول نہ کرے یا وصول کرکے اسے پھاڑ دے، ایسا کرنے سے طلاق پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اسی طرح نکاح ثانی بھی صحیح ہے کیونکہ اس کے لئے پہلی بیوی کی رضامندی ضروری نہیں ہے، پھر دوسری بیوی کی نکاح کے لئے شرط ناجائز تھی اس کا پورا کرنا بھی ضروری نہیں تھا تاہم خاوند نے اسے پورا کیا ہے۔ طلاق نامہ لکھ کر اس کے حوالے کردیا، اب رہا رجوع کا مسئلہ تو یہ دو طرح سے ہوسکتا ہے۔ خاوند اپنی زبان سے رجوع کرے یا دوسرا یہ کہ عملی طور پر وظیفہ زوجیت ادا کرے۔ سوال میں اس بات کی وضاحت نہیں ہے کہ اس نے طلاق کے کتنے عرصے بعد وظیفہ زوجیت ادا کیا ہے جس کے نتیجہ میں بچہ پیدا ہوا، اگر دوران عدت عملی رجوع ہوا ہے تو ایسا کرنا اس کا حق تھا۔ اگر عدت گزرنے کے بعد رجوع کیا تو یہ رجوع صحیح نہیں ہے کیونکہ عدت گزرنے کے بعد نکاح ختم ہوجاتا ہے، پھر بیوی اس کے لیے اجنبی عورت بن جاتی ہے۔ واضح رہے کہ ہمارے نزدیک ایک ہی مجلس میں تین طلاق کہنا یا تحریر کرنا اس سے ایک رجعی طلاق ہوتی ہے۔ دوران عدت تجدید نکاح کے بغیر رجوع ہوسکتا ہے جبکہ عدت کے بعد تجدید نکاح سے رجوع ممکن ہے بشرطیکہ یہ پہلا یا دوسرا واقعہ ہو۔ [واللہ اعلم]

سوال میرے خاوند نے عرصہ چھ سال قبل طلاق دی تھی ابھی رجوع نہیں کیا اور نہ ہی مجھے نان ونفقہ دیا کیا ان حالات میں مجھے نکاح ثانی کرنے کی اجازت ہے؟

جواب طلاق دینے کے بعد خاوند کو شریعت نے اجازت دی ہے کہ دوران عدت جب چاہے بلا تجدید نکاح اپنی بیوی سے رجوع کرسکتا ہے۔ عدت کی مدت مختلف حالات کے پیش نظر مختلف ہے، اگر طلاق کے وقت بیوی امید سے تھی تو اس کی عدت وضع حمل ہے، اگر ماہواری کے ایام کسی وجہ سے بند ہوچکے ہیں تو اس کی عدت چاند کے لحاظ سے تین ماہ، یعنی 90 دن ہے۔ اگر ایام جاری ہیں تو تین دفعہ ایام آنے تک یہ مدت باقی رہے گی۔ صورت مسئولہ میں چونکہ عدت ختم ہوچکی ہے اور اس کے ساتھ نکاح کا رشتہ بھی توڑ چکا ہے اب عورت کو اجازت ہے وہ نکاح ثانی کرنے کی مجاز ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"تم جب اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی مدت پوری کرلیں تو پھر اس میں تم رکاوٹ نہ بنو کہ وہ اپنے زیر تجویز شوہروں سے نکاح کرلیں جبکہ وہ معروف طریقہ کے مطابق زندگی گزارنے پر راضی ہوں۔" [۲/البقرہ:۲۳۲]

اگر عورت راضی ہو تو سرپرست کی اجازت سے نئے حق مہر کے ساتھ گواہوں کی موجودگی میں پہلے خاوند سے بھی دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال میرے سسر کی دو بیویاں ہیں ایک بیوی کی بیٹی میرے نکاح میں ہے دوسری بیوی کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے کیا وہ مجھ پر حرام ہے اور وہ مجھ سے پردہ کرے گی، اگر سسر اسے طلاق دے دیتا ہے تو کیا میں اس سے نکاح کر سکتا ہوں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیا جائے۔

جواب سسر کی دوسری بیوی محرمات میں شمار نہیں ہوگی کیونکہ وہ بیوی کی والدہ نہیں ہے۔ قرآن کریم نے بیوی کی والدہ کو محرمات میں شمار کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''تمہاری بیویوں کی مائیں (بھی تم پر حرام کر دی گئی ہیں)۔'' [۴/النساء:۲۳]
اس کے علاوہ سسر کی دوسری بیوی کے حرام ہونے کے متعلق قرآن وحدیث میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ جبکہ حرمت دلائل سے ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے محرمات کا ذکر فرمایا تو واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ ''ان کے علاوہ اور تمام عورتیں تمہارے لئے حلال کر دی گئی ہیں۔'' [۴/النساء:۲۴]

امام ابن رجب حنبلی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ مرد کی بیوی اور اس کی دوسری بیوی کی بیٹی دونوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا جائز ہے اکثر علما نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، البتہ بعض اسلاف نے اسے ناپسند کیا ہے۔ [جامع العلوم، ص:۴۱۱]
امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کسی شخص کی بیوی اور اس کی کسی اور بیوی سے بیٹی دونوں کو جمع کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ [کتاب الام، ص:۱۵۵، ج۷]

امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ مرد کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی عورت اور اس کے والد کی دوسری بیوی کو جمع کرے کیونکہ اس کے حرام ہونے کے متعلق کوئی نص نہیں ہے۔ [محلی ابن حزم، ص:۵۳۲، ج۹]

ان دونوں عورتوں کے درمیان کوئی قرابت نہیں ہے اور یہ دونوں اجنبیوں کی طرح ہیں، اس لئے انہیں بیک وقت نکاح میں جمع کیا جا سکتا ہے، چونکہ آپ اس دوسری بیوی کے داماد نہیں ہیں، اس لئے وہ آپ سے پردہ کرے گی، کیونکہ وہ آپ کے لئے ایک اجنبی عورت کی طرح ہے۔ اس سے خلوت کرنا اس کا محرم بن کر اس کے ساتھ سفر کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ دامادی کا رشتہ صرف اس عورت سے قائم ہوتا ہے جس کی بیٹی کا آپ سے نکاح ہوا ہے، البتہ آپ کے سسر کے بیٹے کے لئے وہ حرام ہوگی کیونکہ وہ اگرچہ اس کی ماں نہیں لیکن باپ کی منکوحہ ضرور ہے۔ بہرحال سسر کی بیوی داماد کے لئے محرمات میں شامل نہیں ہوگی اور نہ ہی اس کے ساتھ نکاح کرنا حرام ٹھہرے گا۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک لڑکے نے کسی لڑکی سے ناجائز تعلقات استوار کئے جس کے نتیجہ میں ناجائز حمل قرار پا گیا، ان کے والدین کو اس حرکت کا علم تھا۔ اب حمل ضائع کر کے لڑکے اور لڑکی کے اصرار پر ان کا نکاح کر دیا گیا ہے تاکہ عدالت کی گرفت میں نہ آ سکیں۔ واضح رہے کہ نکاح دونوں والدین کی اجازت اور رضامندی سے ہوا ہے کیا ایسا نکاح کرنا شرعاً جائز ہے؟

جواب قرآن مجید میں جہاں والدین کے حقوق بیان کئے گئے ہیں وہاں ان کے فرائض وواجبات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے انہیں اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ اپنی اولاد کی صحیح تعلیم وتربیت کا بندوبست کریں۔ اپنا گھریلو ماحول صاف ستھرا اور پاکیزہ رکھیں، معاشرتی برائیوں کے سلسلہ میں اپنی اولاد کی کڑی نگرانی کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ''دیوث'' پر لعنت فرمائی ہے اور اس پر

جنت کے حرام ہونے کی وعید سنائی ہے جو اپنے گھر میں برائی دیکھ کر اسے ٹھنڈے پیٹ برداشت کر لیتا ہے۔لڑکیوں کے متعلق تو خاص ہدایت ہے کہ ''جونہی مناسب رشتہ ملے ان کا نکاح کرنے میں دیر نہ کی جائے۔'' رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ وصیت کی تھی کہ ''تین کاموں میں دیر نہ کرنا، ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب لڑکی کے لئے مناسب رشتہ مل جائے تو اس کا نکاح کرنے میں لیت ولعل سے کام نہیں لینا چاہیے۔'' حدیث میں یہ بھی ہے کہ ''اخلاقی اور دینی طور پر مناسب رشتہ ملنے کے باوجود اگر کوئی ''بلند معیار'' کی تلاش میں دیر کرتا ہے تو وہاں ضرور فتنہ فساد رونما ہوگا۔''صورت مسئولہ میں ہم اس حقیقت کا نمایاں طور پر مشاہدہ کرتے ہیں کہ والدین کو اولاد کی اس حرکت شنیعہ کا علم ہے۔اس کے باوجود خاموش تماشائی کی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ آخر اس بدکاری پر نوبت یکبار نہیں پہنچ جاتی، بلکہ اس سے پہلے کچھ مقدمات اور ابتدائی محرمات ہوتے ہیں جو بدکاری کے راستہ کی طرف لے جاتے ہیں۔اس مقام پر ہمارا سوال یہ ہے کہ بدکاری کے مقدمات، محرکات اور اسباب کے سدباب کے لئے والدین نے کیا کردار سرانجام دیا ہے۔قرآن پاک نے نہ صرف زنا سے روکا ہے بلکہ اس کے ابتدائی محرکات کا بھی راستہ بند کیا ہے اور ان تمام شرمناک افعال سے منع کیا ہے جو بدکاری کا سبب بن سکتے ہیں۔ان ابتدائی گزارشات کے بعد ہم صورت مسئولہ کا جائزہ لیتے ہیں کہ صفائی کے بعد والدین کی رضامندی سے جو نکاح ہوا ہے وہ شرعاً درست اور جائز ہے۔اب انہیں چاہیے کہ اللہ کے حضور نہایت عاجزی اور ندامت کے جذبات سے توبہ کریں اور آئندہ اس قسم کی نازیبا حرکات سے اجتناب کرنے کا عزم کریں وگرنہ قرآن مجید کی رو سے یہ بھی صحیح ہے کہ ''بدکار مرد، نانہجار عورت سے ہی نکاح کرتا ہے۔'' [۲۴/النور:۳]

پھر اس سلسلہ میں جن مشکلات ومصائب کا سامنا کرنا پڑے گا وہ بہت سنگین ہیں، اس لئے بہتر ہے کہ توبہ کرکے اپنی آئندہ زندگی کو پاکیزہ کریں اور خوش اسلوبی سے بقیہ ایام گزارنے کا عزم رکھیں۔توبہ کرنے سے سابقہ گناہ نہ صرف معاف ہوجاتے ہیں بلکہ اگر اخلاص ہو تو پہلے گناہ نیکیوں میں بدل جاتے ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ [۲۵/الفرقان:۷۰]

سوال میرے داماد نے میری بیٹی کو طلاق دی، پھر رجوع کرلیا، کچھ عرصہ راضی خوشی رہے، اس دوران بیٹی کو حمل ٹھہرا تو اس نے پھر طلاق دے دی اور وضع حمل سے پہلے رجوع کرلیا وضع حمل کے بعد اس نے تیسری دفعہ طلاق دے دی، اب ہمارے لئے شرعی حکم کیا ہے؟

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ دین اسلام کے بیان کردہ ضابطہ طلاق کے مطابق خاوند کو زندگی بھر تین طلاق دینے کا اختیار ہے، پہلی اور دوسری طلاق کے بعد حق رجوع باقی رہتا ہے جس کی صورت یہ ہے کہ اگر دوران عدت رجوع کرلیا جائے تو نکاح جدید کی ضرورت نہیں، لیکن عدت گزرنے کے بعد نکاح جدید کے بغیر رجوع نہیں ہوسکے گا۔تیسری طلاق کے بعد حق رجوع ختم ہوجاتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''پھر اگر شوہر (دو دفعہ طلاق دینے کے بعد تیسری) طلاق دیدے تو اس کے بعد جب تک کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے اس (پہلے خاوند) پر حلال نہ ہوگی۔'' [۲/البقرہ:۲۳۰]

حدیث کے مطابق آیت مذکورہ میں نکاح سے مراد مباشرت ہے اور یہ بھی واضح رہے کہ یہ نکاح بھی گھر بسانے کی نیت سے کیا جائے، کوئی سازشی یا مشروط نکاح نہ ہو، جیسا کہ ہمارے ہاں بدنام زمانہ ''حلالہ'' کیا جاتا ہے، کیونکہ ایسا کرنا حرام اور باعث

لعنت ہے۔اس شرعی نکاح کے بعد اگر دوسرا خاوند فوت ہو جائے یا کسی وجہ سے اس عورت کو طلاق ہو جائے تو عدت گزارنے کے بعد وہ پہلے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے۔

صورت مسئولہ میں خاوند نے اپنی بیوی کو وقتاً فوقتاً تین طلاقیں دیدی ہیں۔اب عام حالات میں رجوع ممکن نہیں ہے کیونکہ تیسری طلاق کے بعد ہمیشہ کے لئے حرام ہوگئی ہے۔لڑکی کے باپ کو اس کی اطلاع ہونا ضروری نہیں۔کیونکہ طلاق دینا خاوند کا حق ہے جو اس نے استعمال کر لیا ہے۔عورت کا اسے قبول کرنا یا اس کے باپ کو اس کی اطلاع ہونا وقوع طلاق کے لئے ضروری نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال میرا اہل سسرال سے کچھ تنازعہ ہوا، وہ ناراض ہو کر میری بیوی کو اپنے گھر لے گئے ہیں میں نے جذبات میں آکر اپنی بیوی کو طلاق لکھ دی، لیکن اپنی بیوی کو نہ بھیجی بلکہ سال بھر وہ گھر میں پڑی رہی، پھر صلح کے نتیجہ میں میرے گھر والے میری بیوی کو میرے گھر لے آئے اور دوبارہ نکاح پڑھا دیا گیا، اس وقت بیوی کا کوئی سرپرست موجود نہ تھا کیا ایسا نکاح درست ہے؟

جواب ہماری سمجھ میں بات نہیں آئی کہ تنازعہ اہل سسرال سے ہوتا ہے لیکن تختہ مشق بیوی کو بنایا جاتا ہے آخر اس صنف نازک کا کیا قصور ہے؟ دراصل ہم لوگ جذباتی اور بحرانی کیفیت کا شکار ہیں اس کیفیت میں ہمیں اپنے آپ کا ہوش نہیں رہتا کہ کیا کر رہے ہیں یا کیا کرنا چاہیے۔دیکھیے! سائل نے بیوی کے نام طلاق لکھ کر سال بھر اپنے پاس رکھی، اس کا بیوی یا اس کے والدین کو علم نہ ہونے دیا۔اگر والدین کو علم ہو جاتا تو انہیں اپنی بیٹی کا گھر بسانے کے لئے اپنی غلطی کا احساس ہوتا اور اس کے تدارک کے لئے یقیناً کوشش کرتے ممکن تھا کہ ''عقد ثانی'' سے پہلے پہلے اپنی بیٹی کو خود واپس لے آتے لیکن سائل نے طلاق لکھ کر اپنے پاس رکھ لی، سال بھر پڑی رہی، عدت گزرنے کے بعد نکاح ثانی کرنے کی ضرورت پڑی، وہ بھی ولی اور سرپرست کے بغیر، نکاح کا اہم رکن ولی کی اجازت ہے جو اس نکاح ثانی میں موجود نہیں۔اگرچہ انہوں نے صلح کی تحریک چلائی اور اپنی بچی کو واپس بھیج دیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں اپنی بچی کا گھر آباد کرنا مقصود ہے۔وہ اس پر سرتاپا خوش ہیں، لیکن انہیں اندرونی معاملات کا قطعاً علم نہیں ہے کہ سطح سمندر کی خاموشی کے نیچے کس قدر ہلچل برپا تھی۔نکاح جدید کے لئے چار چیزوں کا ہونا ضروری ہے:

① بیوی کی رضامندی۔ ② حق مہر کا تعین۔

③ سرپرست کی اجازت۔ ④ گواہوں کی موجودگی۔

بہتر تھا ان چار شرائط کو پورا کرتے ہوئے نکاح کیا جاتا ہے۔ہمارے نزدیک اب اس کا حل یہ کہ اہل سسرال کے علم میں تمام معاملات لانے کے بعد انہیں اعتماد میں لیا جائے، کیونکہ مسئلہ حلال وحرام سے تعلق رکھتا ہے ایسے معاملات میں ہمیں نہایت سنجیدگی اختیار کرنی چاہیے۔نکاح سوچ و بچار کا متقاضی ہے اور مسئلہ طلاق بڑی نزاکت کا حامل ہے ان دونوں کو جذباتی انداز میں سرانجام نہیں دینا چاہیے، اللہ تعالیٰ نے عقد نکاح کو اپنی نشانی قرار دیا ہے، لہٰذا اسے اضحوکہ روزگار بنانے سے گریز کرنا چاہیے۔[واللہ اعلم]

سوال میں نے اپنی بیوی کو تین دفعہ ماں، بہن کہہ دیا ہے کیا ایسے کلمات کہنے سے طلاق ہو جاتی ہے، اگر ہو جاتی ہے تو رجوع کی کیا صورت ہوگی؟ کتاب وسنت کی روشنی میں میری مشکل حل کرنے میں مدد کریں۔

جواب عرب معاشرہ میں بسا اوقات یہ صورت پیش آتی تھی کہ جب میاں بیوی کا کسی معاملہ میں جھگڑا ہو جاتا تو خاوند غصہ میں آ کر کہتا: ''تو میرے لئے میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے۔'' مطلب یہ ہوتا ہے کہ تجھ سے مباشرت کرنا میرے لئے ایسا ہے جیسے اپنی ماں سے مباشرت کروں۔ اسے شریعت کی اصطلاح میں ''ظہار'' کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی بہت سے نادان لوگ بیوی سے لڑ کر اسے ماں، بہن اور بیٹی سے تشبیہ دے بیٹھتے ہیں مطلب یہ ہوتا ہے کہ گویا آدمی اب اسے بیوی نہیں بلکہ ان عورتوں کی طرح سمجھتا ہے جو اس کے لیے حرام ہیں۔ اس فعل کا نام ''ظہار'' ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی بات کو ناپسندیدہ اور جھوٹی بات قرار دیا ہے اور کفارہ کے طور پر اس کی کچھ سزا بھی رکھی ہے، جس کی تفصیل سورۂ مجادلہ میں بیان ہوئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی بیوی کو ایسے کلمات کہنا ایک بہت بڑا گناہ اور حرام فعل ہے۔ اس کا مرتکب سزا کا حق دار ہے۔ لیکن جو شخص اپنی بیوی کو ماں یا بہن کہہ دیتا ہے تشبیہ وغیرہ نہیں دیتا کیا یہ صورت بھی ظہار ہوگی یا نہیں؟ اس میں کچھ اختلاف ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اپنی بیوی کو بہن کہہ کر پکار رہا تھا۔ اس پر آپ نے بطور غصہ فرمایا: ''کیا یہ تیری بہن ہے؟'' آپ نے اسے ناپسند کرتے ہوئے منع فرمایا ہے۔ [ابوداود، الطلاق: ۲۲۱۰]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوی کو ماں یا بہن کہنے سے ظہار تو نہیں ہوتا، البتہ سخت بے ہودہ بات ضرور ہے۔ اس سے اجتناب کرنا چاہیے، البتہ مالکی حضرات اسے بھی ظہار قرار دیتے ہیں۔ حنابلہ کے ہاں اس میں کچھ تفصیل ہے کہ اگر ایسے کلمات بحالت غصہ کہے جائیں تو ظہار ہوگا۔ اگر پیار و محبت کی بات کرتے ہوئے ایسے کلمات کہہ دیے جائیں تو انتہائی ناپسندیدہ حرکت ہے لیکن اسے ظہار نہیں قرار دیا جائے گا۔ صورت مسؤلہ میں خاوند نے اپنی بیوی کو ماں، بہن کہا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ظہار نہیں ہے کیونکہ اس نے ابدی محرمات میں سے کسی عورت کے کسی ایسے عضو کے ساتھ تشبیہ نہیں دی، جس پر اس کا نظر ڈالنا حرام تھا۔ طلاق تو کسی صورت میں نہیں ہے چونکہ سائل نے ایک بے ہودہ اور ناپسندیدہ بات کہی ہے، اس لئے اسے چاہیے کہ اس گناہ کی تلافی کے لئے صدقہ و خیرات کرے اور آیندہ ایسی حرکت کرنے سے توبہ کرے، کیونکہ ایسا کرنا مؤمن کی شان کے خلاف ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال خلع کی صورت میں عورت سے حق مہر سے زیادہ مال وصول کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ قرآن و حدیث کی رو سے اس کا جواب درکار ہے۔

جواب عورت کا اپنے شوہر کو کچھ دے دلا کر اس سے طلاق حاصل کرنا ''خلع'' کہلاتا ہے۔ کیا خاوند کو حق مہر سے زیادہ مال وصول کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق بعض فقہا نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اگر عورت قصوروار ہونے کے باوجود طلاق کا مطالبہ کرتی ہے تو خاوند کو حق مہر سے زیادہ وصول کرنے کی اجازت ہے، لیکن محدثین کرام نے فقہا کے اس موقف سے اتفاق نہیں کیا۔ انہوں نے اس بات کو ناپسند کیا ہے کہ جو مال شوہر نے بیوی کو دیا ہے اس سے زیادہ کا مطالبہ کیا جائے۔ اگرچہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ بیوی خاوند کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے، لیکن احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حکم عام نہیں ہے بلکہ زیادہ دینے یا وصول کرنے سے منع کیا جاتا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب حضرت ثابت بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ کی بیوی نے رسول اللہ ﷺ کے پاس اپنے خاوند سے طلاق لینے کا مطالبہ کیا تو آپ نے فرمایا: ''کیا تو اس کا حق مہر میں دیا ہوا باغ واپس کر

دے گی؟'' ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے عرض کیا کیوں نہیں، بلکہ اس سے زیادہ بھی دوں گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''زیادہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں، صرف باغ ہی واپس لوٹا دے۔'' [دارقطنی: ۳/۲۵۵]

ایک روایت میں بیان ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی کو اس کا باغ واپس کر دینے کے متعلق کہا تو خاوند کو حکم دیا کہ اپنا باغ وصول کر لو اور اس سے زیادہ وصول نہ کرو۔ [ابن ماجہ، الطلاق: ۲۰۵۶]

اگرچہ بعض روایات میں اس عورت کی طرف سے زیادہ دینے کے الفاظ بھی ملتے ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کی طرف سے حق مہر سے زیادہ دینے کو برقرار نہیں رکھا، پھر یہ روایت محدثین کرام کے معیار صحت پر نہیں اترتی۔ اگر صحیح بھی ہو تو زیادہ دینا عورت کی اپنی صوابدید پر موقوف ہے۔ آدمی کی طرف سے مطالبے کے پیش نظر ایسا نہیں کیا گیا۔ اس بنا پر خاوند کو چاہیے کہ وہ حق مہر سے زیادہ وصول نہ کرے جو اس نے بیوی کو دیا ہے ویسے بھی حق مہر سے زیادہ وصول کرنا اخلاقی اصولوں کے خلاف معلوم ہوتا ہے لیکن عقل سلیم اس کی اجازت نہیں دیتی۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ایک عورت کی شادی کو پندرہ، سولہ سال گزر چکے ہیں شادی کے چار سال تک اپنے خاوند کے گھر آباد رہی، اس کا خاوند کویت چلا گیا اور وہاں سے تین طلاقیں روانہ کر دیں۔ عدالت میں نان ونفقہ کا دعویٰ بھی ہوا، فیصلہ لڑکی کے حق میں ہوا عدالت میں لڑکی نے کئی بار طلاق وصول کرنے کا اقرار کیا اب گیارہ بارہ سال بعد لڑکے والے کہتے ہیں کہ ہم نے طلاق نہیں دی لڑکی والوں نے تسلیم کر کے لڑکی کو روانہ کر دیا ہے آپ اس بات کی وضاحت کریں کہ طلاق ہوئی ہے کہ نہیں، واضح رہے کہ لڑکی کے ہاں طلاق کے بعد لڑکا بھی پیدا ہوا ہے؟

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ مذکورہ صورت مسئولہ کے متعلق لڑکی یا لڑکے والوں کو دریافت کرنا چاہیے بالآخر ہمیں کسی کے داخلی معاملات میں کیوں اتنی دلچسپی ہے بیان کردہ صورت حال سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکے نے طلاق نامہ بھیجا ہے اور عدت گزرنے کے بعد رجوع کیا ہے، چونکہ کتاب وسنت کی رو سے ایک مجلس میں تین طلاقیں دینے سے ایک طلاق ہوتی ہے، اگرچہ اس طرح طلاق دینا انتہائی قبیح حرکت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اس عمل پر اظہار ناراضی فرمایا ہے بلکہ اسے کتاب اللہ کے ساتھ کھیلنا بھی قرار دیا ہے۔ [نسائی، الطلاق: ۳۴۳۰]

حدیث میں بیان ہے کہ حضرت رکانہ بن عبد یزید رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ اپنی بیوی کو ایک ہی دفعہ تین طلاق کہہ دی تھیں۔ اس کے بعد بہت پریشان ہوئے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا علم ہوا تو آپ نے اس سے دریافت فرمایا کہ ''طلاق کیسے دی تھی؟'' عرض کیا کہ ایک ہی مجلس میں تین طلاق کہہ دی تھیں۔ آپ نے فرمایا: ''یہ تو ایک رجعی طلاق ہے اگر تم چاہو تو رجوع کر سکتے ہو۔'' چنانچہ اس نے دوبارہ رجوع کر کے اپنا گھر آباد کر لیا۔ [مسند امام احمد، ص: ۲۶۵، ج ۱]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث طلاق دلانے کے متعلق فیصلہ کن اور صریح نص کی حیثیت رکھتی ہے جس کی اور کوئی تاویل نہیں ہو سکتی۔ [فتح الباری، ص: ۳۶۲، ج ۹]

چونکہ طلاق کے بعد لڑکے کی پیدائش سے عدت ختم ہو چکی تھی، اس لئے رجوع کے لئے نئے نکاح کی ضرورت تھی جو یقیناً ہوا

ہوگا۔ اگر بلا وجہ تجدید نکاح لڑکی کو روانہ کر دیا گیا ہے تو جائز نہیں ہوا، ایسی صورت حال کے پیش نظر ان کے درمیان تفریق کرادی جائے۔ تجدید نکاح سے ہی دوبارہ صلح ہوسکتی ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال میں کویت میں مقیم ہوں میں نے اپنی بیوی کو جو فیصل آباد میں مقیم ہے بذریعہ متعلقہ ثالثی کونسل طلاق ارسال کی ہے کیا ایسا کرنے سے طلاق واقع ہو جائے گی جبکہ میری بیوی نے اسے وصول نہیں کیا؟

جواب شریعت اسلامیہ نے خاوند کو یہ حق دیا ہے کہ سنگین حالات کے پیش نظر جب میاں بیوی کے درمیان اتفاق واتحاد کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو اسے اپنی زوجیت سے الگ کر دے چونکہ صورت مسئولہ میں خاوند نے اپنی بیوی کو طلاق تحریری شکل میں لکھ کر بذریعہ ثالثی کونسل ارسال کر دی ہے، لہٰذا وہ واقع ہو گئی ہے۔ عورت نے عدت کے ایام گزارنا ہوتے ہیں، اس لئے اسے طلاق کا علم ضرور ہونا چاہیے۔ بیوی کے طلاق نامہ وصول کرنے یا نہ وصول کرنے سے طلاق کے واقع ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ البتہ طلاق دینے کا یہ اقدام اگر پہلی دفعہ ہے تو طلاق رجعی شمار ہوگی۔ دوران عدت خاوند کو رجوع کا حق ہے۔ عدت گزرنے کے بعد بیوی آزاد ہے اسے کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنے کی اجازت ہے۔ اگر اسی خاوند سے اتفاق کی کوئی صورت پیدا ہو جائے تو عدت کے بعد نکاح جدید کرنا ہوگا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی صحیح میں ایک حدیث لائے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے میری امت سے خیالات کو معاف کر دیا ہے۔ جب تک ان پر عمل نہ ہو یا ان کے مطابق کلام نہ کی جائے۔'' [صحیح بخاری، الطلاق: ۵۲۶۹]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں کہ جو اپنی بیوی کو تحریری شکل میں طلاق دے شرعاً اس کی طلاق ہو جائے گی کیونکہ اس نے دل سے ارادہ کیا، پھر اس کے مطابق تحریری شکل میں اس پر عمل کیا۔ جمہور اہل علم کا یہی قول ہے۔ [فتح الباری، ص: ۳۹۴، ج۹]

لہٰذا اگر یہ پہلا یا دوسرا واقعہ ہے تو رجعی طلاق ہوگی اور اگر تیسری مرتبہ یہ اقدام کر چکا ہے تو بیوی ہمیشہ کے لئے حرام ہو گئی ہے اب عام حالات میں اس سے رجوع ممکن نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال میں نے اپنی بیوی کو طلاق دی پھر چند دن کے بعد رجوع کر لیا، کچھ دنوں بعد حمل ٹھہرا تو پھر طلاق دیدی، وضع حمل سے قبل رجوع کر لیا، پھر اسے تیسری طلاق ارسال کر دی، لیکن سسرال والوں کو وضع حمل کے بعد موصول ہوئی، راہنمائی فرمائیں کہ اب اس عورت سے دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے یا نہیں؟

جواب واضح رہے کہ دین اسلام کے بیان کردہ ضابطہ طلاق کے مطابق خاوند کو اپنی زندگی میں صرف تین طلاق دینے کا اختیار ہے پہلی اور دوسری طلاق کے بعد حق رجوع باقی رہتا ہے جس کی صورت یہ ہے کہ اگر دوران عدت رجوع کر لیا جائے تو نکاح جدید کی ضرورت نہیں لیکن عدت کے بعد نکاح جدید کے بغیر رجوع نہیں ہو سکے گا۔ تیسری طلاق کے بعد حق رجوع ختم ہو جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''پھر اگر شوہر (دو طلاق کے بعد تیسری) طلاق عورت کو دے دے تو اس کے بعد جب تک عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کر لے اس (پہلے شوہر) پر حلال نہ ہوگی۔'' [۲/البقرہ: ۲۳۰]

حدیث کے مطابق آیت میں مذکورہ نکاح سے مراد مباشرت ہے اور یہ بھی واضح رہے کہ یہ نکاح بھی اپنا گھر بسانے کی نیت سے کیا جائے کوئی سازشی یا مشروط قسم کا نکاح نہ ہو، جیسا کہ ہمارے ہاں بدنام زمانہ ''حلالہ'' کیا جاتا ہے، کیونکہ ایسا کرنا حرام

اور باعث لعنت ہے۔اس شرعی نکاح کے بعد اگر دوسرا خاوند فوت ہو جائے یا کسی وجہ سے عورت کو طلاق ہو جائے تو عدت گزارنے کے بعد پہلے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے۔

صورت مسئولہ میں سائل نے اپنی بیوی کو یکے بعد دیگرے تین طلاق دیدی ہیں، اب عام حالات میں رجوع کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ تیسری طلاق کے بعد بیوی ہمیشہ کے لئے حرام ہوگئی ہے۔ سسرال والوں کو وضع حمل کے بعد موصول ہونا اس کے واقع ہونے پر کوئی اثر انداز نہیں ہوتا، کیونکہ طلاق دینا خاوند کا حق ہے جو اس نے استعمال کرلیا ہے۔عورت کا اسے قبول کرنا یا نہ کرنا اسے وضع حمل کے بعد موصول ہونا وقوع طلاق کے لئے شرط نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال اگر کسی عورت کا خاوند فوت ہو جائے اور اس کے دو گھر ہوں اور وہ دونوں کچھ فاصلے پر ہوں تو وہ کس گھر میں عدت پوری کرے گی کیا اسے دونوں گھروں میں آنے جانے کی اجازت ہے، کیونکہ وہ دونوں گھر اس کے اپنے ہیں؟ قرآن و حدیث سے راہنمائی کریں۔

جواب جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے، اس کے اپنے خاوند کے گھر میں عدت گزارنے کے متعلق دو قول ہیں۔ ان میں دلائل کے اعتبار سے مضبوط اور قوی موقف یہ ہے کہ وہ اپنے خاوند کے گھر میں ہی عدت گزارے، یعنی جس گھر میں اپنے خاوند کے ہمراہ رہائش پذیر تھی وہیں عدت کے ایام پورے کرے، جیسا کہ حضرت فریعہ بنت مالک رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا میرا خاوند اپنے بھاگے ہوئے غلاموں کی تلاش میں نکلا، انہوں نے موقع پا کر اسے قتل کر دیا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے والدین کے ہاں منتقل ہونے کے متعلق دریافت کیا کیونکہ میرے شوہر نے اپنی ملکیت میں کوئی مکان نہیں چھوڑا تھا اور نہ ہی نان ونفقہ کا کوئی معقول بندوبست تھا۔ آپ نے مجھے اپنے میکے چلے جانے کی اجازت دی، جب میں حجرے میں پہنچی تو آپ نے مجھے آواز دی اور فرمایا کہ تم اپنے پہلے مکان میں ہی رہو، یہاں تک کہ تمہاری عدت پوری ہو جائے، حضرت فریعہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ پھر میں نے اپنی عدت کی مدت چار ماہ دس دن اسی سابقہ مکان میں ہی پوری کی۔ [ابوداود، الطلاق: ۲۳۰۰]

صورت مسئولہ میں اگر خاوند کے دو مکان ہیں تو بیوی کو چاہیے کہ وہ عدت گزارنے کے لئے اس مکان کا انتخاب کرے، جس میں وہ اپنے خاوند کے ہمراہ رہا کرتی تھی دونوں مکانوں میں بیک وقت رہائش نہیں رکھی جاسکتی بلکہ ایک مکان رہائش وغیرہ کے لئے اور دوسرا بطور ڈیرہ یا مہمان خانہ کے طور پر استعمال ہوگا اس لئے عدت کے لئے اس مکان میں رہائش رکھے جس میں وہ خاوند کے ہمراہ رہتی تھی۔ ہاں دوسرے مکان میں بوقت ضرورت جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ضروریات کو پورا کرنے کے لئے گھر سے باہر جانے کی شرعاً اجازت ہے لیکن رات گھر واپس آجانا چاہیے۔ وہ ضروری بات بھی ایسی ہو جو اس کے بغیر پوری نہ ہوسکتی ہو۔ بہر حال بیوہ نے سوگ کے ایام نہایت سادگی کے ساتھ اپنے خاوند کے گھر میں گزارنے ہیں اور اسے شدید ضرورت کے بغیر گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال دو جوڑوں کا نکاح وٹہ سٹہ کی بنیاد پر ہوا، پھر گھریلو حالات خراب ہونے سے دونوں لڑکیاں اپنے اپنے والدین کے ہاں چلی گئی اور ان کا سامان بھی اٹھوا دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد پھر صلح کے لئے پنچائت کا اہتمام کیا گیا۔ وہاں ایک خاوند نے غصہ میں

آ کر تین دفعہ طلاق، طلاق، طلاق کہا۔ اب فریقین راضی نامہ کرنا چاہتے ہیں کیا ایسا کرنا ممکن ہے؟

جواب صورت مسئولہ میں پہلے وٹہ سٹہ کی شادی ہی محل نظر ہے۔ اسلام نے اس قسم کی ناروا شرائط کو جائز ہی قرار نہیں دیا جو کہ وٹہ سٹہ کی صورت میں ایک دوسرے پر عائد کی جاتی ہیں کیونکہ اس کا نتیجہ وہی برآمد ہوا جو صورت مسئولہ میں بیان کیا گیا ہے جو حضرات اس کے متعلق کوئی نرم گوشہ رکھتے ہیں وہ اس نکاح شغار کو چند ایک شرائط کے ساتھ جائز قرار دیتے ہیں۔ تاہم یہ مسئلہ اپنی جگہ پر قابل اعتبار ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق ایک رجعی شمار ہوتی ہے، جیسا کہ حضرت ابو رکانہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاق دیں تھیں پھر اس پر نادم و پشیمان ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو رکانہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا ''کہ یہ تو ایک رجعی طلاق ہے اگر چاہو تو رجوع کر لو۔'' چنانچہ حضرت ابو رکانہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی سے رجوع کر کے دوبارہ اپنا گھر آباد کر لیا تھا۔

[مسند امام احمد، ص: ۲۶۵، ج۱]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ یہ حدیث مسئلہ تین طلاق میں ایک فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے جس کی اور کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی۔ [فتح الباری، الطلاق]

اگرچہ اس انداز سے طلاق دینے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ کھیلنا قرار دیا ہے اور اس پر ناراضی کا اظہار کیا ہے۔ [نسائی، الطلاق: ۳۴۳۰]

واضح رہے کہ اس سہولت سے وہی لوگ فائدہ اٹھانے کے حقدار ہیں جو کتاب و سنت کو ہی آخری اتھارٹی قرار دیتے ہیں۔ البتہ جو حضرات تقلید کے بندھن میں جکڑے ہوئے ہیں انہیں مطلب پرستی کے طور پر اہلحدیث کی طرف رجوع کرنا قابل ستائش نہیں ہے۔ بہرحال صورت مسئولہ میں یہ ایک رجعی طلاق ہے اس کے بعد (دوران عدت از خود) رجوع کی گنجائش ہے اور بعد از عدت نکاح جدید کے ساتھ گھر پھر سے آباد کیا جا سکتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک شخص نے اپنی بیوی کو کہا، تجھے طلاق، تجھے طلاق، تجھے طلاق اس کے بعد لڑکی اپنے میکے چلی آئی ایک سال تک خاوند نے رجوع نہیں کیا، کیا اب لڑکی آگے نکاح کر سکتی ہے؟ واضح رہے کہ چند ایک معزز گواہان کی موجودگی میں اس نے طلاق دینے کا اقرار کیا ہے کتاب و سنت کی روشنی میں فتویٰ درکار ہے۔

جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور حکومت میں بیک وقت کی تین طلاق ایک رجعی شمار ہوتی تھی۔ [صحیح مسلم، کتاب الطلاق: ۳۶۷۳]

اسی طرح حضرت رکانہ بن عبد یزید رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی اسی طرح کا واقعہ پیش آیا کہ اس نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین دفعہ طلاق دے ڈالی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک رجعی طلاق قرار دیتے ہوئے رجوع کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی بیوی سے دوبارہ رجوع کر لیا تھا۔ [مسند امام احمد، ص: ۲۶۵، ج۱]

اس انداز سے طلاق دینے کے بعد خاوند کو حق ہے کہ دوران عدت رجوع کرے اگر عدت گزر جائے تو نکاح ختم ہو جاتا ہے۔ پھر ولی کی اجازت، عورت کی رضامندی، حق مہر اور گواہوں کی موجودگی میں نیا نکاح ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ارشاد باری تعالیٰ

ہے: ''جب عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت پوری ہو جائے تو ان کو دوسرے شوہروں کے ساتھ نکاح کرنے سے مت روکو جبکہ وہ آپس میں جائز طور پر راضی ہو جائیں۔'' [۲/البقرہ:۲۳۲]

صورت مسئولہ میں اگر خاوند نے واقعی اپنی بیوی کو طلاق دیدی ہے اور گواہان بھی قابل اعتبار ہیں اور اس نے دوران عدت رجوع بھی نہیں کیا تو عدت کے بعد عورت آزاد ہے۔ خواہ طلاق دہندہ سے دوبارہ نکاح کرے یا کسی دوسرے خاوند سے شادی کرے۔ سوال سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی عدت گزر چکی ہے اور خاوند نے دوران عدت رجوع بھی نہیں کیا۔ ایسے حالات میں عورت پر کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالا جائے۔ وہ نکاح کرنے میں خود مختار ہے، بشرطیکہ وہ ولی کی سرپرستی میں رہتے ہوئے اسے سرانجام دے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی کا کسی لڑکی سے صرف نکاح ہوا۔ اس نے قبل از رخصتی اسے طلاق دے دی۔ تحریر میں یہ بھی لکھا کہ آئندہ ہمارا آپ سے اور تمہارا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب وہ صلح کرنا چاہتے ہیں جبکہ طلاق پر چھ ماہ گزر چکے ہیں؟

جواب واضح رہے کہ میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات ختم ہونے پر صرف دو صورتیں ایسی ہیں کہ عام حالات میں وہ دوبارہ اکٹھے نہیں ہو سکتے ہیں۔

(الف) اگر خاوند زندگی میں وقفہ وقفہ بعد تین طلاقیں دے ڈالے۔ ایسی صورت میں مطلقہ عورت سابقہ خاوند کے لئے حرام ہو جاتی ہے، البتہ تحلیل شرعی کے بعد اکٹھا ہونے کی گنجائش ہے۔ (مروجہ حلالہ سے مراد نہیں کیونکہ یہ باعث لعنت ہے)

(ب) لعان کے بعد میاں بیوی کے درمیان جو جدائی عمل میں آتی ہے اس کی وجہ سے وہ آئندہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ کسی صورت میں ان کا باہمی نکاح نہیں ہو سکتا۔ ان دو صورتوں کے علاوہ اور کوئی ایسی صورت نہیں ہے کہ وہ دائرہ اسلام میں رہتے ہوئے ازدواجی تعلقات ختم ہونے پر میاں بیوی کا آپس میں نکاح نہ ہو سکتا ہو۔ صورت مسئولہ میں چونکہ نکاح کے بعد قبل از رخصتی طلاق ہوئی ہے، لہٰذا ایسی صورت میں عدت وغیرہ نہیں ہوتی طلاق ملتے ہی نکاح ختم ہو جاتا ہے۔ آئندہ جب بھی حالات سازگار ہو جائیں تو شرعی نکاح کرنے کے بعد میاں بیوی کے طور پر زندگی گزارنے میں شرعاً قباحت نہیں ہے۔ اس نئے نکاح کے لئے چار چیزوں کا ہونا ضروری ہے:

① عورت کی رضامندی۔ ② سرپرست کی اجازت۔
② حق مہر کا تعین۔ ④ گواہوں کی موجودگی۔

واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ احزاب آیت نمبر ۴۹ میں اس قسم کی طلاق کا ذکر فرمایا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال بچپن میں یہ طے ہوا کہ اسلم کا نکاح عابدہ سے کیا جائے گا، کیونکہ اسلم کی بہن عابدہ کے چچا کے نکاح میں ہے، مذکورہ رشتہ اسی بدلے میں طے ہوا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اسلم نے عابدہ کے بھائی اکرم پر اپنی جنسی ہوس پوری کرنے کے لئے رات کے وقت مجرمانہ حملہ کیا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اب اکرم کا موقف ہے کہ اس کے نکاح میں اپنی بہن کو نہ دے۔ کیا وہ اس موقف میں حق بجانب ہے اور اس پر عمل کرنا چاہیے؟

جواب مشروط تبادلہ نکاح کو شرعی اصطلاح میں شغار کہا جاتا ہے جسے ہم وٹہ سٹہ کا نکاح کہتے ہیں۔شرعی طور پر ایسا کرنا نکاح باطل ہے کیونکہ حدیث میں ہے۔اسلام میں نکاح وٹہ سٹہ کا کوئی وجود نہیں ہے۔ [صحیح مسلم، النکاح:۱۴۱۵]

مذکورہ روایت میں نکاح شغار کی تعریف بایں الفاظ کی گئی ہے کہ ایک آدمی دوسرے سے کہے کہ تم اپنی بیٹی کا نکاح مجھ سے کردو اور اس کے تبادلہ میں میں اپنی بچی کا نکاح تجھ سے کرتا ہوں۔یہ تعریف ہمارے ہاں رائج وٹہ سٹہ کی ہے۔صورت مسئولہ میں عابدہ کا نکاح اسلم کے ساتھ اس تبادلہ میں کیا جارہا ہے کہ اسلم کی بہن عابدہ کے چچا کے نکاح میں ہے یہ وٹہ سٹہ کی ہی صورت ہے اور ایسا کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔اگر اس نکاح میں یہ قباحت نہ ہوتو اسلم کا عابدہ کے بھائی پر جنسی ہوس پوری کرنے کے لیے مجرمانہ حملہ کرنا رکاوٹ کا باعث نہیں ہے،اگرچہ یہ جرم اپنی جگہ پر بہت سنگین اور گھناؤنا ہے،تاہم ایسے جرم سے کوئی حلال رشتہ حرام نہیں ہوتا۔بہرحال مذکورہ رشتہ،اس لئے ناجائز ہے کہ ایسا کرنا مشروط نکاح تبادلہ کی صورت ہے۔خواہ اسلم کا مجرمانہ حملہ کرنا یا نہ کرنا اس کے حرام ہونے پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک خاتون کو اس کے خاوند نے نکاح کے تین ماہ بعد جولائی ۱۹۸۰ء میں طلاق دیدی،پھر رجوع کرلیا۔اس کے سات سال بعد ۱۹۸۷ء میں پھر طلاق دی،رشتہ داروں کی مداخلت سے میاں بیوی کے درمیان صلح ہوگئی۔بعدازاں مارچ ۲۰۰۲ء میں رشتہ داروں کی موجودگی میں تیسری طلاق دے ڈالی۔لیکن جب اس سے رابطہ کیا گیا تو اس نے کہا کہ میں نے صرف دو طلاقیں دی ہیں وہ تیسری طلاق سے انکار کرتا ہے جبکہ خاتون اور دیگر رشتہ دار کہتے ہیں کہ اس نے تیسری دفعہ طلاق بھی دیدی ہے اب دریافت طلب بات یہ ہے کہ خاوند کے کہنے پر دو طلاقیں ہوں گی یا بیوی کی بات کو تسلیم کرتے ہوئے تین طلاق شمار کی جائیں گی،نیز اگر تین طلاقیں ہیں تو کیا خاوند حق مہر واپس لینے کا مجاز ہے؟

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ خاوند نے وقفہ وقفہ سے تین طلاقیں دے کر،طلاق کا نصاب پورا کردیا ہے اب صلح یا رجوع کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔پہلی یا دوسری طلاق کے بعد خاوند کو رجوع کا حق ہوتا ہے جو اس نے استعمال کرلیا ہے لیکن صورت مسئولہ میں خاوند کہتا ہے کہ میں نے باضابطہ طور پر صرف دو طلاقیں دی ہیں جبکہ بیوی کا دعویٰ ہے کہ خاوند نے مجھے تین طلاقیں دے دی ہیں اور اس پر گواہ بھی موجود ہیں۔ایسی صورت حال کے پیش نظر عورت کی بات کو تسلیم کیا جائے گا اور متنازعہ طلاق کو طلاق ہی شمار کرنا مناسب ہے۔چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''اگر عورت اپنے خاوند کی طرف سے طلاق کا دعویٰ کرتی ہے اور اس پر ایک عادل گواہ پیش کرتی ہے تو ایسی صورت حال میں خاوند سے حلف لیا جائے گا۔اگر وہ حلف دے کہ اس نے طلاق نہیں دی تو اس سے گواہ کی گواہی جھوٹی قرار پائے گی اور اگر خاوند قسم دینے سے انکار کردے تو اس کے انکار کو دوسرے گواہ کے قائم مقام قرار دے کر طلاق کو نافذ کردیا جائے گا۔'' [سنن ابن ماجہ، الطلاق:۲۰۳۸]

اس حدیث کے متعلق امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے کہ ''خاوند اگر طلاق کا انکار کرے تو کیا کیا جائے؟'' صورت مسئولہ میں اگر ایک گواہ ہوتا تو خاوند کے حلف پر فیصلہ کیا جاسکتا تھا لیکن اس سوال میں دو تین گواہوں کے دستخط ثبت ہیں کہ خاوند نے تیسری طلاق بھی دے ڈالی ہے ایسے حالات میں اگر گواہ عادل ہیں تو تیسری طلاق واقع ہوچکی ہے اور خاوند

کو رجوع کرنے کا حق نہیں ہے اور نہ ہی رشتہ داروں کی صلح سے معاملہ حل ہو سکے گا کیونکہ تیسری طلاق کے بعد خاوند صلح، یعنی رجوع کے حق سے محروم ہو جاتا ہے اس موقف کو حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے بہت وضاحت کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ [زاد المعاد، ص:۲۸۲، ج۵]

اس تیسری طلاق کے بعد بیوی کے درمیان مستقل جدائی ہو جاتی ہے۔ عام حالات میں ان کا آپس میں نکاح بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت حال میں خاوند کو اپنا حق مہر واپس لینے کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔ حق مہر صرف خلع کی صورت میں واپس لیا جا سکتا ہے جبکہ مذکورہ صورت میں ایسا نہیں ہے، بلکہ خاوند نے خود اپنے ارادہ سے تین طلاق دی ہیں۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ایک آدمی نے کسی عورت سے شادی کی لیکن مقاربت سے پہلے اسے طلاق دے دی کیا اس کے خاوند کا باپ، یعنی عورت کا سسر اس سے نکاح کر سکتا ہے؟

جواب قرآن کریم کی تصریح کے مطابق جس عورت کو مقاربت سے قبل طلاق مل جائے اس پر کسی قسم کی عدت وغیرہ نہیں ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اے ایمان والو! جب اہل ایمان خواتین سے نکاح کرو، پھر انہیں چھونے سے قبل طلاق دے دو تو تمہارے لئے ان پر کوئی عدت نہیں ہے جس کے پورا ہونے کا تم مطالبہ کرو۔'' [۳۳/الاحزاب:۴۹]

لہٰذا ایسی عورت پر عدت گزارنے کی پابندی نہیں ہے چونکہ نکاح کرنے سے بیٹے کی بیوی اس کی بہو بن چکی ہے۔ اور قرآن کریم کی صراحت کے مطابق حقیقی بیٹے کی بیوی سے نکاح کرنا حرام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور تمہارے لئے ان بیٹوں کی بیویاں بھی حرام ہیں جو تمہاری صلب سے ہوں۔'' [۴/النساء:۲۳]

اس لئے صورت مسئولہ میں قبل از مقاربت اگر کسی عورت کو طلاق مل جائے تو اس کا سسر اس سے نکاح نہیں کر سکتا، کیونکہ قرآن کریم نے اس کی حرمت کو مطلق طور پر بیان کیا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے ہاں کچھ لوگوں نے شیعہ کی نماز جنازہ پڑھ لی۔ مسجد کے خطیب نے فتویٰ دیا کہ جنہوں نے جنازہ پڑھا ہے ان کے نکاح ٹوٹ گئے ہیں کیا یہ صحیح ہے؟

☆ جو امام جان بوجھ کر کسی مرزائی کی نماز جنازہ پڑھا دے، اس کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟ بعض علما کہتے ہیں کہ ایسا کرنے سے نکاح باقی نہیں رہتا اس کی وضاحت فرمائیں؟

جواب نکاح ایک ایسا بندھن ہے کہ اس کے ٹوٹنے کے متعلق شریعت نے کچھ ضابطے مقرر کیے ہیں۔ مثلاً:

① خاوند بقائمی ہوش وحواس خود اپنی بیوی کو طلاق دیدے، مدت گزرنے کے بعد نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔

② بیوی بذریعہ عدالت خود اپنے خاوند سے طلاق کا مطالبہ کرے۔ شریعت میں اسے خلع کہا جاتا ہے۔ خلع کے بعد نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔

③ آدمی اپنی بیوی پر بدکاری کی تہمت لگائے لیکن بیوی اس کا انکار کر دے۔ بطور فیصلہ لعان کو عمل میں لایا جائے لعان کے بعد بھی نکاح ختم ہو جاتا ہے۔

④ بیوی خاوند دونوں میں سے کوئی دین اسلام سے برگشتہ ہو جائے تو اس سے بھی نکاح ختم ہو جاتا ہے۔

صورت مسئولہ میں جس جرم کی وضاحت کی گئی ہے وہ نکاح کے ٹوٹنے کا سبب نہیں ہے، البتہ مذکورہ قسم کے لوگوں کا دانستہ جنازہ پڑھنے والے کا سزا کے طور پر بائیکاٹ کرنا چاہیے۔ تاکہ اسے اس کی سنگینی کا احساس ہو۔ کیونکہ ایسا محض مفادات کے پیش نظر کیا جاتا ہے جبکہ دینی غیرت وحمیت کا تقاضا ہے کہ ایسے لوگوں کا جنازہ نہ پڑھا جائے۔ اگر کوئی دینی غیرت کو بالائے طاق رکھ کر جنازہ پڑھتا ہے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ اس قسم کے لوگوں کا بائیکاٹ کریں، لیکن نکاح کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو علما نکاح ٹوٹنے کا فتویٰ دیتے ہیں ہمارے نزدیک ان کا موقف صحیح نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ایک آدمی کا کسی ٹیچر لڑکی سے نکاح ہوا۔ وہ اس وقت اس کی تنخواہ وصول کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ عورت کی آمدنی صرف شوہر کے لئے ہے عورت کو جائیداد بنانے کا شریعت نے حق نہیں دیا ہے کیا یہ صحیح ہے؟

جواب قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شادی کے بعد بھی عورتوں کے حق ملکیت کو برقرار رکھا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''عورتوں کو ان کے حق مہر خوشی سے دیا کرو، ہاں، اگر وہ اپنی خوشی سے انہیں چھوڑ دیں تو اسے ذوق وشوق سے کھالو۔'' [۴/النساء:۴]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مہر کے متعلق عورت کا حق ملکیت ثابت کیا ہے۔ اسی طرح وراثت وغیرہ کے کئی ایک مسائل ہیں جن میں سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوی کو جائیداد بنانے کا شرعی حق ہے بلکہ بعض احادیث سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض مالدار صحابیات رضی اللہ عنہن اپنے شوہروں کو زکوٰۃ بھی دیتی تھیں۔ چنانچہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر میں اپنے خاوند حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پر مال زکوٰۃ صرف کروں تو کیا یہ جائز ہے؟ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں! اس کے لئے دو اجر ہیں ایک رشتہ سے حسن سلوک کرنے کا اور دوسرا صدقہ کرنے کا۔''

[صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، ۱۴۶۶]

اسی طرح حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے متعلق روایات میں آیا ہے کہ وہ اپنے خاوند کے بچوں پر مال زکوٰۃ خرچ کرتی تھیں۔

[صحیح بخاری، الزکاۃ: ۱۴۶۷]

اندریں حالات بیوی کو شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ اگر وہ اپنی تنخواہ الگ رکھنا چاہتی ہے تو اسے یہ حق پہنچتا ہے۔ خاوند کو چاہیے کہ وہ اس سلسلہ میں زیادتی کا مرتکب نہ ہو، البتہ خاوند کو یہ حق بھی شریعت نے دیا ہے کہ بیوی کی ملازمت اگر حقوق کی ادائیگی میں رکاوٹ کا باعث ہے تو بیوی کو ملازمت چھوڑنے پر مجبور کر سکتا ہے اور بیوی کے لئے اس کے حکم کی تعمیل ضروری ہے۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال ایک آدمی کا کسی جوان عورت کے گھر میں آنا جانا تھا اور وہ اس کے رشتہ کے لئے کوشش کرتا رہا، لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکا یہ دونوں مقدمات زنا کا ارتکاب کرتے رہے لیکن زنا کی نوبت نہ آئی، کیا وہ آدمی اس عورت کی لڑکی سے نکاح کر سکتا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن کریم میں نہ صرف زنا کو حرام کیا ہے بلکہ اس کے تمام ذرائع ووسائل اور مقدمات کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''زنا کے قریب نہ پھٹکو کیونکہ وہ بہت برا فعل اور انتہائی برا راستہ ہے۔'' [۱۷/بنی اسرائیل:۳۲]

اس آیت کریمہ میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ مسلمان صرف فعل زنا ہی سے بچنے پر اکتفا نہ کریں بلکہ زنا کے مقدمات اور اس کی ابتدائی حرکات واسباب سے بھی دور رہیں جو انہیں اس راستہ کی طرف لے جاتے ہیں۔رسول اللہ ﷺ نے جرم زنا کی سنگینی کو یوں بیان فرمایا ہے'' کہ لذت بھری نگاہ سے کسی عورت کی طرف دیکھنا یہ آنکھوں کی بدکاری ہے اور بدکاری کی نیت سے مزے لے لے کر لوچ دار گفتگو کرنا زبان کی بدکاری ہے جبکہ شرم گاہ سے اس فعل بد کو انجام دینا اس جرم میں شریک تمام اعضا کے لئے مہر تصدیق ثبت کرنا ہے۔'' شریعت ان مقدمات زنا اور اس کے اسباب ووسائل کو فعل زنا قرار نہیں دیتی کہ ان کے بجالانے پر حد زنا جاری کردی جائے جب تک عملی طور پر اس سے زنا کا ارتکاب نہ ہوا سے مجرم قرار نہیں دیا جاسکتا۔صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص نے جو طریق کار اختیار کیا ہے اسے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاسکتا، بلکہ وہ انتہائی خطرناک اور برا راستہ تھا، تاہم اس سے بالفعل زنا کا صدور نہیں ہوا، اس لئے مذکورہ شخص اس عورت کی لڑکی سے نکاح کرسکتا ہے جس سے مقدمات زنا انجام دیتا رہا ہے، کیونکہ قرآن کریم نے ایسے خونی، رضاعی اور سسرالی رشتوں کے متعلق بڑی تفصیل سے ہمیں آگاہ کیا ہے جو انسان پر حرام ہیں۔ان میں اس قسم کے تعلقات رکھنے والی عورت کا تذکرہ نہیں ہے اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ سے اس قسم کی کوئی پابندی منقول ہے، لہٰذا مذکورہ شخص پر صرف اس لئے پابندی عائد کرنا کہ وہ مقدمات زنا کا مرتکب ہوا مناسب نہیں اور اس کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہندہ کی شادی زید سے ہوئی دوسال بعد ان میں اختلافات پیدا ہوگئے اور ہندہ نے زید سے علیحدگی کا مطالبہ کردیا اور اپنی مرضی سے بذریعہ عدالت خلع لے لیا۔اب ہندہ دوبارہ زید کے ہاں آباد ہونا چاہتی ہے، کیا کتاب وسنت کی رو سے ایسا ممکن ہے؟

جواب عارضی زندگی میں شرعی طور پر طلاق دینا خاوند کا حق ہے لیکن اگر میاں بیوی کے تعلقات اس حد تک کشیدہ ہوجائیں کہ باہمی اتفاق کی کوئی صورت نہ رہے اور خاوند طلاق دینے پر بھی آمادہ نہ ہو تو ایسے حالات میں اسلام نے عورت کو حق دیا ہے کہ وہ اپنے خاوند کو کچھ دے دلا کر اس سے خلاصی حاصل کرے، اسے شریعت میں خلع کہتے ہیں۔اس کے لئے شرط یہ ہے کہ میاں بیوی کو ازدواجی زندگی میں حدود اللہ کے پامال ہونے کا اندیشہ ہو۔اس وضاحت کے بعد دین اسلام میں بیوی کے ازدواجی تعلقات ختم ہونے پر دو صورتیں ایسی ہیں کہ وہ عام حالات میں اکٹھے نہیں ہوسکتے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ جب خاوند اپنی زندگی میں وقفے وقفے کے بعد تین طلاقیں دے ڈالے تو ہمیشہ کے لئے مطلقہ عورت اپنے سابقہ خاوند کے لئے حرام ہوجاتی ہے، البتہ تحلیل شرعی کے بعد اکٹھا ہونے کی گنجائش ہے۔واضح رہے کہ تحلیل شرعی مروجہ حلالہ نہیں کیونکہ ایسا کرنا حرام اور باعث لعنت ہے۔

☆ لعان کے بعد جو جدائی عمل میں آتی ہے وہ آیندہ زندگی میں باہمی نکاح کرنے کے لئے رکاوٹ کا باعث ہے کسی بھی صورت میں ان کا آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے۔ان دو صورتوں کے علاوہ کوئی ایسی صورت نہیں کہ دائرہ اسلام میں رہتے ہوئے ازدواجی تعلقات ختم ہونے پر دوبارہ میاں بیوی کا نکاح نہ ہوسکتا ہو۔صورت مسئولہ میں یہاں بیوی کی علیحدگی بذریعہ خلع عمل میں آئی ہے، لہٰذا اگر عورت اپنے موقف سے دستبردار ہوکر دوبارہ اپنے سابقہ خاوند کے ہاں آباد ہونے کی خواہش مند ہے تو شرعی نکاح کرنے کے بعد ازدواجی زندگی گزارنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، البتہ نکاح جدید میں ان تمام شرائط کو ملحوظ رکھنا ہوگا جو نکاح کے لئے ضروری ہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال میں عرصہ تین سال سے شادی شدہ ہوں میرا خاوند ناگفتہ بہ غیر اخلاقی حرکات کا عادی ہے۔میں تین سال سے اپنے والدین کے ہاں قیام پذیر ہوں۔اس دوران مجھے کوئی نان ونفقہ نہیں دیا گیا۔برادری کے طور پر میرے والدین نے باہمی صلح کی بہت کوشش کی ہے لیکن میرا خاوند اس پر آمادہ نہیں ہوا۔اس کا کہنا ہے کہ نہ تو نباہ کرنا اور نہ ہی طلاق دینا ہے۔اب قرآن وحدیث کی روشنی میں میرے متعلق جو حکم ہے اس کی نشاندہی کی جائے تاکہ میں مستقبل کے متعلق کوئی واضح فیصلہ کرسکوں؟

جواب شریعت اسلامیہ میں طلاق دینا اگرچہ خاوند کا حق ہے، لیکن یہ بھی زیادتی ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں اور ان دونوں میں کسی طرح نباہ نہ ہوسکتا ہو، مگر شوہر طلاق دینے پر آمادہ بھی نہ ہو تو سنگین حالت میں بھی عورت اپنے خاوند کا ظلم وستم برداشت کرتی رہے اور خاوند کی طرف سے طلاق کے انتظار میں اپنی زندگی کو اجیرن بنائے رکھے۔اس صورت میں اسلام نے عورت کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنے خاوند کو کچھ دے دلا کر اس سے طلاق حاصل کرے۔اس طرح طلاق لینے کو شریعت کی اصطلاح میں خلع کہا جاتا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں حدود الٰہی پر قائم نہ رہیں گے تو ان دونوں کے درمیان یہ معاملہ طے ہوجانے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے خاوند کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی اختیار کرے۔'' [۲/البقرہ:۲۲۹]

حدیث میں ہے کہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے حق مہر واپس دے کر اپنے خاوند سے خلع حاصل کرلیا تھا۔

[ابوداؤد، الطلاق:۲۲۷۶]

خلع کی صورت میں بہتر ہے کہ عورت باہمی رضامندی سے اپنے گھر میں ہی کوئی معاملہ طے کرلے۔اگر خاوند اس پر رضامند نہ ہو، جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے تو عورت کو چاہیے کہ وہ حاکم وقت یا اس کی قائم کردہ عدالت میں حاضر ہوکر استغاثہ پیش کرے اور بذریعہ عدالت اپنے خاوند سے خلع حاصل کرے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کو یہ حکم دینا کہ تم اپنا باغ واپس لے لو اور بیوی کو طلاق دے دو۔اس بات کا بین ثبوت ہے کہ میاں بیوی میں ناچاقی کے وقت عورت کی درخواست پر خلع کروانا عدالت کا کام ہے۔بشرطیکہ وہ عدالت اپنے طور پر مطمئن ہوجائے کہ فریقین کے لئے باہمی معاشرت میں احکام الٰہیہ کی پابندی کرنا ممکن نہیں ہے۔صورت مسئولہ میں اگر واقعی خاوند اپنی بیوی کو طلاق دینے پر آمادہ نہیں ہے تو شریعت نے عورت کو حق دیا ہے کہ وہ عدالت کے ذریعے خلع کی ڈگری حاصل کرے، پھر تاریخ اجرا سے عدت گزارنے کے بعد نکاح ثانی کرے۔ [واللہ اعلم]

سوال اگر خاوند اپنی بیوی کو کہے کہ میں نے تجھے آزاد کیا تو اس طرح طلاق ہوجائے گی؟

جواب اللہ تعالیٰ کے نزدیک نکاح کا رشتہ اس قدر حساس اور مضبوط ہے کہ اسے اشاروں، کنایوں سے نہیں توڑا جاسکتا ہے۔ اسے ختم کرنے کے لئے صراحت کے ساتھ لفظ طلاق استعمال کرنا پڑتا ہے یا پھر سیاق وسباق کا خیال کرتے ہوئے نیت کو دیکھنا چاہیے۔صورت مسئولہ میں خاوند کا اپنی بیوی کو یوں کہنا کہ ''میں نے تجھے آزاد کیا۔'' رشتہ ازدواج کو ختم کرنے کے لئے صریح اور واضح نہیں ہے، ہاں، اگر سیاق وسباق کے پیش نظران الفاظ سے خاوند کی نیت اپنی بیوی کو طلاق دینے کی تھی تو ان الفاظ سے طلاق ہوجائے گی، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ایک منکوحہ کو طلاق دینے کے لئے یہ الفاظ استعمال کئے کہ تو ''اپنے گھر چلی جا۔''

[صحیح بخاری، الطلاق:۵۲۵۴]

چونکہ رسول اللہ ﷺ کی نیت طلاق دینے کی تھی، اس لئے سیاق وسباق کے پیش نظر یہ الفاظ طلاق کے لئے کافی تھے۔لیکن جب یہی الفاظ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کے لئے استعمال کئے: ''تو اپنے گھر چلی جا۔'' [صحیح بخاری، المغازی:۴۴۱۸] تو ان الفاظ سے طلاق واقع نہیں ہوئی کیونکہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی نیت طلاق کی نہ تھی۔امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک باب بایں الفاظ قائم کیا ہے۔''جب خاوند اپنی بیوی سے کہے کہ میں نے تجھ کو الگ یا آزاد کیا یا کوئی لفظ جس سے طلاق کا مفہوم لیا جاسکتا ہو تو معاملہ اس کی نیت پر محمول ہوگا۔'' [صحیح بخاری، کتاب الطلاق]

ان حقائق کے پیش نظر صورت مسئولہ میں اگر ان الفاظ سے خاوند کی نیت طلاق دینے کی تھی تو طلاق واقع ہوجائے گی۔ بصورت دیگر طلاق نہیں ہوگی، تاہم خاوند کو چاہیے کہ اگر اپنی بیوی کو طلاق نہیں دینا چاہتا تو اس طرح کے ذومعنی الفاظ استعمال کرنے سے بھی گریز کرے، کیونکہ معاشرتی طور پر ایسے الفاظ سے مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ایک آدمی نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کے بعد دوسرے دن اپنی مطلقہ بیوی کی بھتیجی سے نکاح کرلیا ہے۔کیا شریعت میں ایسا کرنے کی اجازت ہے؟

جواب جب آدمی اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے تو طلاق دیتے ہی اس کا نکاح ختم نہیں ہوجاتا بلکہ عدت گزرنے تک وہ بدستور اس کی بیوی رہتی ہے۔اس دوران اگر وہ فوت ہوجائے تو اس کی جائیداد کا خاوند حقدار ہوگا، اسی طرح اگر خاوند فوت ہوجائے تو اس کے ترکہ سے مطلقہ بیوی کو حصہ ملے گا۔عدت گزرنے کے بعد نکاح ختم ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ دوران عدت رجوع کرنے سے نکاح جدید کی ضرورت نہیں ہے۔صورت مسئولہ میں چونکہ طلاق کے بعد اس کی بیوی ابھی دوران عدت ہے اور اس کی بدستور بیوی ہے اس دوران اس عورت کی بھتیجی یا بھانجی سے نکاح نہیں ہوسکتا نہ ہی اس عورت کی بہن سے نکاح ہوسکتا ہے۔ان کے علاوہ کسی بھی عورت سے نکاح کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ طلاق یافتہ اس کی چوتھی بیوی نہ ہو۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک شخص نے بحالت غصہ اپنی بیوی کو دو گواہوں کے سامنے طلاق دے دی۔تیسرے روز ایک ہزار روپیہ حق مہر کے عوض اس عورت سے نکاح کرلیا، اس نکاح کی شرعاً کیا حیثیت ہے؟

جواب مطلقہ بیوی دوران عدت بیوی ہی رہتی ہے۔عدت گزرنے کے بعد نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔پہلی یا دوسری طلاق کی صورت میں عدت کے بعد ایسی عورت سے نیا نکاح کرکے رجوع ممکن ہے۔تیسری طلاق کے بعد رجوع کی کوئی صورت نہیں رہتی۔

صورت مسئولہ میں نکاح کی چنداں ضرورت نہ تھی بلکہ یہ نکاح تحصیل حاصل کی قبیل سے ہے، تاہم اس قسم کا نکاح پڑھنے سے نکاح خواں اور گواہان کے نکاح متاثر نہیں ہوتے خاوند کو چاہیے تھا کہ وہ تجدید نکاح کے بغیر ہی رجوع کر لیتا۔ [۲/البقرہ:۲۲۸]

سوال ایک عورت کا فریضہ حج ادا کرنے کے لئے قرعہ نکلا ہے ابھی تیاری کے مراحل میں تھی کہ اس کا خاوند فوت ہو گیا۔ اب وہ کیا کرے حج پر چلی جائے یا عدت گزارنے کے لئے گھر میں رہے؟

جواب انسان کے ذمہ جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کی دو اقسام ہیں:

① موسع؛ یعنی ان کی ادائیگی کے لئے وسیع وقت ہوتا ہے۔

② مضیق؛ یعنی وہ صرف ایک خاص وقت پر ادا ہو سکتے ہیں ان کی ادائیگی کا وقت انتہائی تنگ ہوتا ہے۔

صورت مسئولہ میں مذکورہ عورت دو فرائض کے درمیان گھر چکی ہے۔ ایک فریضہ حج کی ادائیگی ہے اور اس کے لئے اس کا قرعہ نکل آیا ہے لیکن یہ ایک فرض ہے جو موسع ہے، یعنی اس کا وقت وسیع ہے اور اسے بعد میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے اور دوسرا فرض عدت وفات کا گزارنا ہے اور یہ ایک ایسا فرض ہے جس کا وقت مقرر ہے، یعنی خاوند کی فوتگی کے بعد شروع ہو کر چار ماہ دس دن تک گھر میں سوگ منانا ہے، یہ فرض مضیق ہے، یعنی اس کی ادائیگی کا وقت انتہائی تنگ ہے۔ لہٰذا اسے فریضہ حج کو مؤخر کر دینا چاہیے اور گھر میں عدت وفات کو پورا کرے۔ [واللہ اعلم]

سوال میں عرصہ سولہ سال سے کویت میں مقیم ہوں اور میرے بیوی بچے پاکستان میں ہیں، میں انہیں باقاعدہ خرچہ بھیجتا ہوں، البتہ آخری تین سال میں نے کسی وجہ سے خرچہ وغیرہ بھیجنا بند کیا ہے۔ میری بیوی نے عدالت کے ذریعے خلع لے لیا ہے، جبکہ مجھے اس کی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ اس قسم کے خلع کا شرعاً کیا حکم ہے؟ قرآن وحدیث کے مطابق فتویٰ دیں۔

جواب قرآنی صراحت کے مطابق عورت مرد کے لئے اور مرد عورت کے لئے لباس ہے، اگر بیوی شوہر کو کچھ دے دلا کر اس لباس کو اتار پھینکے تو اسے خلع کہتے ہیں۔ اگر عورت اپنے شوہر کو اس شکل وصورت یا اس کے اخلاق وکردار کی وجہ سے ناپسند کرتی ہو اور ڈرتی ہو کہ وہ اس کی فرمانبرداری میں اللہ کا حق ادا نہیں کر سکے گی تو اس کے لئے جائز ہے کہ حق مہر بطور فدیہ واپس کر کے اس سے خلع لے لے اور جدائی اختیار کرے۔ صورت مسئولہ میں اخراجات کی ادائیگی اور دیگر حقوق کی بجا آوری خاوند کے ذمے تھی جو اس نے آخری تین سالوں میں پوری نہیں کی ہے۔ ان حالات کے پیش نظر اگر عورت مجبور ہو کر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے تو یہ اس کا حق ہے، اگرچہ عائلی زندگی میں طلاق دینے کا حق خاوند کو سونپا گیا ہے۔ لیکن اگر میاں بیوی کے تعلقات اس قدر کشیدہ ہو جائیں کہ باہمی اکٹھے رہنے کی صورت باقی نہ رہے اور شوہر بھی طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو، ایسے حالات میں اسلام نے عورت کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنے خاوند سے خلع لے کر فارغ ہو جائے۔ اس کی دو صورتیں ممکن ہیں:

① میاں بیوی باہمی رضامندی سے اپنے گھر میں ہی کوئی معاملہ طے کر لیں۔ اس کے بعد خاوند بیوی سے وصولی کے بعد اسے طلاق دیدے۔

② خاوند طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو تو عورت عدالت کی طرف رجوع کرے، پھر عدالت فریقین کے بیانات سننے کے بعد ڈگری

جاری کرے۔

صورت مسئولہ میں خاوند کو اطلاع دیے بغیر یک طرفہ ڈگری جاری کی گئی ہے۔ عدالت کو چاہیے تھا کہ وہ خاوند پر لگائے گئے الزامات سے اسے آگاہ کرتی، تا کہ وہ اس کی وضاحت کرتا۔ تاہم سوال میں اس بات کی وضاحت ہے کہ خاوند نے عرصہ تین سال سے خرچہ وغیرہ بند کیا ہے۔ جبکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ اپنی بیویوں سے حسن سلوک سے پیش آنے کی تلقین کرتا ہے اور انہیں تکلیف دینے سے منع کرتا ہے۔ اپنی بیوی کو خرچہ نہ دینا اس سے بڑھ کر اور کیا تکلیف ہوسکتی ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی فوج کے سربراہان کو لکھا تھا کہ جو آدمی اپنی عورتوں سے غائب ہیں انہیں چاہیے کہ وہ ان کے اخراجات برداشت کریں یا انہیں طلاق دے کر فارغ کردیں۔ طلاق دینے کی صورت میں بھی پہلی مدت کے اخراجات برداشت کرنا ہوں گے۔ [زاد المعاد فی ہدی خیر العباد]

اگرچہ عدالت کی یک طرفہ ڈگری ہے، تاہم نافذ العمل ہے۔ اگر فریقین باہمی اتفاق پر آمادہ ہیں تو نئے نکاح سے دوبارہ رشتہ بحال ہوسکتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال میں ملک سے باہر تھا میرے والد نے مجھے لکھا کہ اپنی بیوی کو طلاق دیدو میں نے ان کی اطاعت کرتے ہوئے طلاق نامہ لکھ کر والد صاحب کو بھیج دیا۔ لیکن انہوں نے میری بیوی کو اس کے متعلق کچھ نہ بتایا۔ ایک سال بعد جب میں واپس آیا تو بیوی کے ساتھ راضی خوشی رہنے لگا۔ اس کے بعد میرا بیوی سے کوئی جھگڑا ہوا تو میں نے بیوی کو پھر طلاق دیدی۔ بعد ازاں ہماری صلح ہو گئی۔ آج سے چند روز پہلے ہمارا پھر کسی بات پر تنازعہ ہوا تو میں نے جذبات میں آ کر پھر طلاق دیدی۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ میں اب بیوی سے رجوع کرسکتا ہوں یا نہیں؟ کیا پہلی طلاق شمار ہوگی جس کا بیوی کو علم نہ تھا کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دے کر میری پریشانی کو دور کریں۔

جواب صورت مسئولہ میں تین چیزوں کے متعلق وضاحت کرنا ہے:

① والد کے کہنے پر طلاق دینے کی شرعی حیثیت کیا ہے۔

② کیا طلاق کے متعلق بیوی کو علم ہونا ضروری ہے۔

③ وقفہ، وقفہ میں تین طلاق دینے سے رجوع کی گنجائش رہتی ہے۔

عام طور پر ہمارے ہاں یہ ضروری خیال کیا جاتا ہے کہ اگر والد طلاق کے متعلق اپنے بیٹے کو حکم دے تو والد کی اطاعت کرتے ہوئے طلاق دے دینی چاہیے۔ اس کے متعلق حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے متعلق ایک واقعہ کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میری ایک بیوی تھی۔ جسے میرے والد محترم حضرت عمر رضی اللہ عنہ ناپسند کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ اسے طلاق دیدو۔ میں نے اسے طلاق دینے سے انکار کردیا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ نے مجھے فرمایا کہ ''اپنے باپ کا کہا مانو'' چنانچہ میں نے اسے طلاق دیدی۔ [مسند امام احمد، ص:۲۰، ج۲]

اس سلسلہ میں ہمارا موقف یہ ہے کہ والد کے کہنے پر طلاق دینے کی دو صورتیں ہیں۔

① والد کوئی شرعی سبب بیان کرے کہ تمہاری بیوی اخلاقی طور پر درست نہیں ہے۔ غیر مردوں سے میل جول رکھتی ہے وغیرہ۔ تو

ایسی صورت میں بیٹے پر لازم ہے کہ وہ اسے طلاق دیدے۔

② والد کوئی شرعی سبب بیان نہیں کرتا بلکہ اپنی انانیت یا ضد کی وجہ سے بیٹے کو طلاق دینے کا کہتا ہے تو ایسی صورت میں طلاق دینا ضروری نہیں۔ جبکہ اس کی بہو اخلاقی لحاظ سے درست ہو، چنانچہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے واقعہ میں اس قسم کا اشارہ ملتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسی خاص مصلحت اور حکمت کے پیش نظر اپنے بیٹے کو طلاق دینے کا حکم دیا تھا، جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ ''میرے بیٹے نے ایسی عورت سے نکاح کر رکھا ہے، جسے میں اس کے لئے ناپسند کرتا ہوں''۔

[مسند امام احمد، ص: ۴۲، ج ۲]

اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ الساعاتی لکھتے ہیں کہ آپ نے اس عورت کو اپنے بیٹے کے لئے اس لئے ناپسند کیا کہ وہ ان کے لئے موزوں اور مناسب نہ تھی۔ اس معاملہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ضرور کسی مصلحت کو ملحوظ رکھا ہوگا، پھر آپ الہام الٰہی کے حامل بھی تھے۔ [الفتح الربانی، ص: ۴، ج ۱۷]

موجودہ دور میں جبکہ روشن خیالی ہمارے معاشرہ میں اپنا راستہ ہموار کر رہی ہے۔ ضروری نہیں کہ صرف والد کے کہنے پر بیوی کو طلاق دیدی جائے، ہاں، اگر کوئی وجہ بیان کی جائے تو اور بات ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ طلاق دینا خاوند کا حق ہے۔ خاوند نے اگر از خود یا اپنے باپ کے کہنے پر اپنے اس حق کو استعمال کیا ہے اور طلاق کے تیر کو اپنے ترکش سے نکال پھینکا ہے۔ اب بیوی کو علم ہو یا نہ ہو وہ تیر اپنے نشانہ پر بیٹھ جائے گا۔ چونکہ بیوی نے عدت گزارنا ہے، اس لئے بہتر ہے کہ طلاق کے متعلق بیوی کو علم ہونا چاہیے۔ لیکن نفاذ طلاق کے لئے یہ شرط نہیں ہے۔ اگر خاوند بیوی کے علم میں لائے بغیر ایسی طلاق سے رجوع کر لیتا ہے تو اس کا رجوع صحیح ہے، تاہم وہ طلاق شمار کی جائے گی۔ اس میں کسی اہل علم کو اختلاف نہیں ہے۔

تیسری بات یہ کہ وقفہ وقفہ سے بیوی کو اگر تین طلاق دیدی جائیں تو عام حالات میں اب رجوع کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، جیسا کہ قرآن مجید میں اس کی صراحت ہے۔

صورت مسئولہ میں خاوند نے وقفہ وقفہ کے بعد اپنی بیوی کو تین طلاق دینے کا نصاب پورا کر لیا ہے۔ اب اس سے رجوع نہیں ہو سکتا، اس سے رجوع کی صرف ایک صورت ہے کہ وہ آباد ہونے کی نیت سے کسی دوسرے خاوند سے نکاح کرے۔ نکاح کرتے وقت پہلے خاوند کی طرف واپسی کی قطعاً کوئی نیت نہ ہو۔ کیونکہ ایسے نکاح کو سازشی نکاح کہا جاتا ہے جس خاوند سے اس کے گھر آباد ہونے کی نیت سے نکاح کیا ہے، اگر وہ فوت ہو جائے یا اسے طلاق دیدے تو عدت گزارنے کے بعد پہلے خاوند سے از سر نو نکاح کیا جا سکتا ہے۔ اس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''پھر اگر مرد (تیسری) طلاق بھی دیدے تو اس کے بعد وہ عورت اس کے لئے حلال نہ رہے گی۔ حتیٰ کہ وہ کسی دوسرے خاوند سے نکاح کرے، ہاں! اگر دوسرا خاوند اسے طلاق دیدے تو پھر پہلا خاوند اور یہ عورت دونوں اگر یقین رکھتے ہیں کہ حدود اللہ کی پابندی کریں گے تو وہ آپس میں رجوع کر سکتے ہیں، اس سلسلہ میں ان پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ [۲/البقرہ: ۲۳۰]

سوال ایک لڑکے نے اپنی منگیتر سے بدکاری کی، گھر والوں نے رسوائی سے بچنے کے لئے ان کا فوراً نکاح کر دیا، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

جواب زانی مرد جس عورت سے زنا کرتا ہے اس کے ساتھ اس کا نکاح جائز ہے، خواہ وہ اس کی منگیتر ہو یا اس سے منگنی نہ ہوئی ہو، جرم زنا اپنی جگہ پر بہت سنگین ہے، تاہم اس سے ایک حلال چیز حرام نہیں ہوگی، لیکن اپنی منگیتر سے بدکاری کرنے کی صورت میں برائی سے بچنے کے لئے فوراً نکاح کر دینا صحیح نہیں ہے، اس بات کا یقین کر لینا ضروری ہے کہ منگیتر کا رحم خالی ہے۔ اس کے لئے ایک حیض آنے کا انتظار کرنا ہوگا۔ قرار حمل کی صورت میں وضع حمل کے بعد نکاح ہو سکے گا، کیونکہ حالت حمل میں نکاح کی ممانعت ہے۔ خواہ وہ زنا کے نتیجہ میں قرار پایا ہو، بہرحال نکاح کے وقت رحم کا خالی ہونا اولین شرط ہے، اسکا یقین ہو جانے کے بعد نکاح ہو سکے گا اگر نکاح کر دیا گیا ہے تو ان کے درمیان علیحدگی کرا دی جائے گی۔ [واللہ اعلم]

سوال میری بیٹی کا اپنے خاوند سے کسی بات پر جھگڑا ہوا، میں نے بیٹی اور داماد کو سمجھایا اور صلح کرانے کی کوشش کی مگر میرا داماد صلح پر آمادہ نہیں ہوا، بلکہ اس نے کہا کہ اپنی بیٹی کو ساتھ لے جاؤ تم میری طرف سے فارغ ہو۔ یہ یکم جنوری ۲۰۰۱ء کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد میرے داماد نے دوسری شادی بھی کر لی ہے۔ اس کے باوجود میں نے دوبارہ صلح کے لئے رابطہ کیا، لیکن وہ صلح کے لئے تیار نہیں ہے۔ کیا اس طرح میری بیٹی کو طلاق ہوگئی یا نہیں؟ کیا وہ آگے نکاح کر سکتی ہے؟

جواب بیوی خاوند کا اگر گھر میں کسی بات پر جھگڑا ہو جائے تو اسے گھر میں رہتے ہوئے نمٹانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن اگر داماد نے سائل کو یہ کہہ دیا ہے کہ اپنی بیٹی کو ساتھ لے جاؤ میری طرف سے فارغ ہو۔ صرف اتنا کہنے سے طلاق نہیں ہوگی، کیونکہ یہ الفاظ اس نے اپنی بیوی کو مخاطب کر کے نہیں کہے۔ اگر بیوی ہی کو کہے تب بھی یہ الفاظ طلاق کے لئے صریح نہیں ہیں۔ فقہا کی اصطلاح میں اسے ''کنایہ'' کہا جاتا ہے۔ ایسے الفاظ کہنے سے خاوند کی نیت کو دیکھا جاتا ہے، اگر اس کی نیت واقعی طلاق کی تھی تو اسے طلاق شمار کیا جائے گا۔ بصورت دیگر یہ الفاظ ایک دھمکی کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ داماد کا دوسری شادی کر لینا بھی طلاق کے لئے دلیل نہیں بن سکتا۔ کیونکہ یہ اس کا حق ہے جو اس نے استعمال کیا ہے، بہتر ہے کہ پنچائتی طور پر خاوند سے دریافت کیا جائے کہ اس کی ان الفاظ سے کیا مراد تھی؟ اگر اس نے طلاق کی نیت سے یہ الفاظ کہے تھے تو اب بیوی کی عدت بھی ختم ہو چکی ہے، لہٰذا اسے شرعاً نکاح کرنے کی اجازت ہے اور اگر اس نے یہ الفاظ طلاق کی نیت سے استعمال نہیں کئے بلکہ دھمکی اور اصلاح احوال کے لئے بطور ڈراوے کے کہے ہیں تو اس صورت میں طلاق نہیں ہوگی۔ سائل کی بیٹی ایسے حالات میں بدستور داماد کی بیوی ہے، برادری کے سرکردہ احباب یا مقامی معززین کے ذریعے مسئلہ کا حل تلاش کیا جائے تاکہ معاملہ زیادہ خراب نہ ہو۔ [واللہ اعلم]

عقیقہ و قربانی

عقیقہ و قربانی

سوال نام نہاد جماعت المسلمین کی طرف سے ہمیں ایک پمفلٹ موصول ہوا کہ خصی جانور کی قربانی جائز نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جانوروں کو خصی کرنے سے منع فرمایا ہے۔ مرسل نے اس کی وضاحت کے متعلق لکھا ہے؟

جواب اس پرفتن دور میں تحقیق کی آڑ لے کر مسلمات کا انکار اور بدعات و رسوم کو رواج دیا جارہا ہے۔ جماعت المسلمین کی طرف سے خصی جانور کو قربانی کے لئے ناجائز قرار دیا جانا بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ ہم نے پہلے بھی اس سلسلہ کے متعلق لکھا تھا کہ کسی جانور کو خصی کرنے کے مثبت اور منفی دو پہلو ہیں۔ مثبت پہلو یہ ہے کہ خصی جانور کا گوشت عمدہ اور بہتر ہوتا ہے جبکہ اس کے علاوہ غیر خصی جانور کے گوشت میں ایک ناگوار قسم کی بو پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کے تناول میں تکدر پیدا ہوتا ہے اور اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ اس کے خصی کرنے سے اس کی قبولیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ افزائش نسل کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے۔ قربانی کا تعلق مثبت پہلو سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود قربانی کے لئے بعض اوقات خصی جانور کا انتخاب کیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ دو ایسے مینڈھوں کی قربانی دیتے جو خصی اور گوشت سے بھرپور ہوتے۔ [مسند امام احمد: ۵/۱۹۶]

قربانی کے ذریعے چونکہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے، اس لئے قربانی کا جانور واقعی بے عیب اور تندرست ہونا چاہیے۔ بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے چند ایک ایسے عیوب کی نشاندہی فرمائی ہے جو قربانی کے لئے رکاوٹ کا باعث ہیں۔ تاہم قربانی کے لئے جانور کا خصی ہونا کوئی عیب نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو رسول اللہ ﷺ ایسے جانور کو قربانی کے لئے قطعی طور پر منتخب نہ فرماتے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''قربانی کے جانور کا خصی ہونا کوئی عیب نہیں بلکہ خصی ہونے سے اس کے گوشت کی عمدگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔'' [فتح الباری: ۱۰/۷]

اس وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ نام نہاد جماعت المسلمین کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹ بددیانتی پر مبنی ہے، جس میں خصی جانور کی قربانی کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ ہم جانوروں کو خصی کرنے کے متعلق اپنی گزارشات پیش کرتے ہیں۔

متقدمین علما میں اس کے متعلق اختلاف ہے۔ ایک گروہ جانوروں کے خصی کرنے کے عمل کو مطلقاً جائز قرار دیتا ہے، خواہ وہ جانور حلال ہوں یا حرام۔ جبکہ کچھ علما کی رائے ہے کہ خصی کرنے کی حرمت صرف حرام جانوروں سے متعلق ہے۔ ان کے نزدیک حلال جانوروں کا خصی کرنا جائز ہے۔ جو حضرات حرمت کے قائل ہیں ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:

☆ اولاد آدم کو گمراہ کرنے کے متعلق شیطان لعین کا ایک طریقہ واردات بایں الفاظ بیان ہوا ہے ''میں انہیں حکم دوں گا کہ وہ میرے کہنے پر اللہ کی ساخت میں ردوبدل کریں۔'' [۴/النسآء:۱۱۹]

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کریمہ کی تفسیر کے تحت لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک اس سے مراد جانوروں کا خصی کرنا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما حضرت انس رضی اللہ عنہ اور تابعین میں سے حضرت عکرمہ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہما کی یہی رائے ہے۔

[تفسیر ابن کثیر]

☆ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے مسند البزار کے حوالہ سے ایک حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جانوروں کو خصی کرنے کی شدت سے ممانعت کی ہے۔ [نیل الاوطار:۸/۲۴۹]

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹوں، بیلوں، بکروں اور گھوڑوں کو خصی کرنے سے منع فرمایا ہے۔ [شرح معانی الآثار:۲/۲۳۲]

دوسرے حضرات کی طرف سے ان دلائل کا اس طرح جواب دیا گیا ہے کہ آیت کریمہ کی تفسیر میں جانوروں کو خصی کرنے کی بات کسی صحیح یا ضعیف روایت سے مرفوع ثابت نہیں۔ جہاں تک کہ سلف کے اقوال کا تعلق ہے تو اس کے متعلق خود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت حسن بصری، حضرت مجاہد، حضرت قتادہ اور حضرت سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہم سے مروی ہے کہ اس سے مراد اللہ کا دین ہے، یعنی وہ حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرائیں گے، جیسا کہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مایہ ناز تفسیر میں نقل فرمایا ہے۔ جب سلف صالحین سے آیت مذکورہ کی مختلف تفاسیر منقول ہیں تو اس کی تفسیر میں جانوروں کو خصی کرنے کی بات حتمی طور پر نہیں کہی جاسکتی۔ چونکہ اس کی تفسیر میں کوئی مرفوع حدیث موجود نہیں۔ لہٰذا ''لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ'' اللہ تعالیٰ کے دین میں کوئی تبدیلی نہیں، اس کے پیش نظر آیت مذکورہ میں خلق اللہ سے مراد اللہ کا دین ہی ہے۔

مسند البزار کے حوالہ سے جو روایت بیان ہو چکی ہے تو اس سے حلال جانوروں کا خصی کرنا مراد نہیں ہے، کیونکہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عمل سے ایک حرام کام کی تائید کریں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مروی ہے کہ ان کے پاس ایک خصی غلام فروخت ہونے کے لئے لایا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں خصی کرنے کے عمل کی تائید وحمایت نہیں کرتا۔ [شرح معانی الآثار:۲/۳۸۳]

گویا انہوں نے اس کی خریداری کو اس عمل کی تائید خیال کیا ہے۔ اس بنا پر اگر حلال جانوروں کا خصی کرنا بھی ناجائز ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خصی شدہ جانوروں کی قربانی ہرگز پسند نہ کرتے۔ لہٰذا خصی کرنے کی ممانعت اور خصی جانوروں کی قربانی کرنے میں یہی تطبیق ہے کہ جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہے ان کا خصی کرنا درست ہے، مگر جن جانوروں کا گوشت حرام ہے ان کا خصی کرنا درست نہیں ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے بلکہ یہ ان کا اپنا قول ہے جب ہم علمائے متقدمین کو دیکھتے ہیں تو ان میں سے بیشتر حلال جانوروں کے خصی کرنے کے قائل ہیں اور فاعل ہیں۔ حضرت طاؤس رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اونٹ کو خصی کروایا تھا، نیز حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اگر نر جانور کے کاٹنے کا اندیشہ ہو تو اسے خصی کرانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ [شرح معانی الآثار:۲/۳۸۳]

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مسلم اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں اسی موقف کو اختیار کیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ قربانی کے لئے خصی جانور کو ذبح کیا جاسکتا ہے اور جن روایات میں امتناعی حکم ہے وہ ان جانوروں سے متعلق ہے جن کا گوشت نہیں کھایا جاتا ہے۔

نوٹ: سردست ہمیں مسند البزار دستیاب نہیں ہوسکی، تاکہ اس کی سند کے متعلق پتہ لگایا جاسکتا کہ آیا حدیث قابل حجت ہے یا نہیں۔

[واللہ اعلم]

سوال کسی فوت شدہ کی طرف سے قربانی کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے، اگر قربانی کر دی جائے تو کیا اہل خانہ اس کا گوشت استعمال نہیں کر سکتے، نیز قربانی کے لئے صرف دانتہ جانور ہونا چاہیے، اس کے علاوہ چوگا یا چھگا جانور ذبح نہیں کیا جا سکتا، کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دیں؟

جواب زندہ کی طرف سے غائبانہ طور پر قربانی کرنے کا حدیث سے ثبوت ملتا ہے، جیسا کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات کی طرف سے ایک گائے کی قربانی دی تھی، جبکہ انہیں اس بات کا علم نہیں تھا۔ [صحیح بخاری، الحج: ۱۷۰۹]

لیکن فوت شدہ کی طرف سے مستقل حیثیت سے انفرادی طور پر قربانی دینے کے متعلق کوئی صحیح اور صریح حدیث ہمیں نہیں مل سکی۔ اگرچہ امام ابوداؤد اور امام ترمذی نے میت کی طرف سے قربانی کا عنوان قائم کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث بیان کی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے قربانی کیا کرتے تھے۔ اس کے متعلق سوال کرنے پر آپ نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعد مجھے قربانی کرنے کی وصیت فرمائی تھی۔ [ابوداؤد، الضحایا: ۲۷۹۰]

ترمذی کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اپنے بعد قربانی کرنے کا حکم دیا تھا۔ [ترمذی، الاضاحی: ۱۴۹۵]

لیکن محدثین کرام نے تین خرابیوں کی وجہ سے اس حدیث کو ناقابل حجت قرار دیا ہے۔ جو حسب ذیل ہیں:

① امام ترمذی اسے بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے کہ ہم اسے شریک کے واسطہ کے علاوہ اور کسی واسطہ سے نہیں پہچانتے اور شریک بن عبداللہ کا حافظہ متغیر ہو گیا تھا، جیسا کہ اس کے متعلق حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''سچا ہے لیکن بکثرت غلطیاں کرنے والا، نیز جب سے اسے کوفہ کا قاضی بنایا گیا اس کا حافظہ متغیر ہو گیا تھا۔'' [تقریب التہذیب، ص: ۱۴۵]

② شریک راوی اپنے شیخ ابو الحسناء سے بیان کرتا ہے کہ اس کے متعلق حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ مجہول راوی ہے اور درجہ سابع سے تعلق رکھتا ہے۔ [تقریب، ص: ۴۰۱]

③ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والا ایک حنش نامی راوی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ سچا ہے، لیکن اس کے بے شمار اوہام ہیں اور مرسل روایات بیان کرتا ہے۔ [تقریب، ص ۸۵]

اس کے متعلق امام ابن حبان لکھتے ہیں کہ یہ کثیر الوہم ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بعض روایات کرنے میں متفرد ہے۔ اس بنا پر قابل حجت نہیں ہے۔ [عون المعبود، ص: ۵۱، ج ۳]

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ روایت سخت ضعیف ہونے کی وجہ سے قابل حجت نہیں۔ اگر اس کی صحت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو وصیت کی صورت میں میت کی طرف سے قربانی کی جا سکتی ہے۔ وصیت کے بغیر قربانی کرنا محل نظر ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اور روایت بھی پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مینڈھا ذبح کرتے وقت فرمایا کہ ''یہ محمد (ﷺ) اور اس کی امت کی طرف سے ہے۔'' [ابوداؤد، الضحایا: ۲۷۹۶]

ایک روایت میں ہے کہ ''یہ میری طرف سے اور میری امت کے ہر شخص کی طرف سے ہے جو قربانی نہ کر سکا ہو۔''

[ترمذی، الاضاحی:۱۵۲۱]

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے دو جانور ذبح کئے اور فرمایا کہ ''ایک میری امت کے ہر اس شخص کے لئے ہے جس نے اللہ کے لئے توحید اور میرے لئے شریعت پہنچا دینے کی گواہی دی اور دوسرا محمد (ﷺ) اور اس کی آل کی طرف سے ہے۔''

[ابن ماجہ، الاضاحی:۳۱۲۲]

مذکورہ روایات بھی محدثین کرام کے قائم کردہ معیار صحت پر پوری نہیں اترتیں۔اس کے علاوہ ان سے مراد خاص فوت شدہ ہی نہیں بلکہ مرنے والے اور زندہ ملے جلے مراد ہیں، خاص انفرادی طور پر اکیلی میت کی طرف سے قربانی کرنے کی کوئی صحیح حدیث ہمیں نہیں مل سکی۔

علامہ البانی رحمہ اللہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے امت کے نادار افراد کی طرف سے جو قربانی دی ہے، وہ آپ کا خاصہ ہے، اس لئے کسی اور کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ امت کے نادار افراد کی طرف سے قربانی دے اور نہ ہی اس پر قیاس کر کے کسی دوسرے کی طرف سے نماز، روزہ ادا کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی قرآن کریم کی تلاوت کی جا سکتی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ [ارواء الغلیل، ص:۳۵۴، ج۴]

ہاں میت کی طرف سے صدقہ کرنا درست ہے، جیسا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔صدقہ خواہ جانور کا ہو یا کسی اور چیز کا اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔اس قسم کے صدقہ سے خود بھی کھایا جا سکتا ہے، لیکن غربا اور مساکین کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔جیسا کہ حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب دو جانور بطور قربانی ذبح کرتے تو ان سے مساکین کو کھلاتے اور خود بھی کھاتے اور اپنے اہل وعیال کو بھی اس سے محروم نہ کرتے۔ [مسند امام احمد، ص۳۹۱، ج۶]

اس سلسلہ میں صحیح مسلم کی حدیث بھی پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قربانی کا ایک جانور ذبح کیا اور فرمایا: ''اے اللہ! محمد (ﷺ)، اس کی آل اور اس کی امت کی طرف سے قبول کر۔'' [صحیح مسلم، الاضاحی:۱۹۶۷]

اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ذبح کرتے وقت دعا فرمائی ''کہ اے اللہ! میری قربانی بھی قبول فرما اور میری آل واولاد کی طرف سے قبول کر بلکہ ساری امت کی قربانی کو قبول فرما۔جانور ذبح کرتے وقت یہ نہیں فرمایا کہ یہ جانور میری طرف سے، میری آل کی طرف سے اور میری امت کی طرف سے، یعنی اس روایت میں دوسروں کی طرف سے کسی قربانی کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال کے دوسرے حصے کے متعلق ہماری گزارشات یہ ہیں کہ اس حدیث میں قربانی کے جانور کی کم از کم حالت کو بیان کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دو دانتا سے اوپر جو جانور چوگا یا چھگا ہے اس کی قربانی جائز نہیں۔اس کی متعدد مثالیں احادیث میں ملتی ہیں جن میں کم از کم نصاب کو بیان کیا گیا ہے، مثلاً: چوری کے متعلق فرمایا کہ ''دس درہم کی چوری پر ہاتھ کاٹا جائے گا یا پانچ اوقیہ سے کم میں زکوٰۃ نہیں، اسی طرح پانچ وسق سے کم اجناس میں صدقہ نہیں یا پانچ اونٹوں سے کم میں زکوٰۃ نہیں۔'' ان روایات میں چوری یا زکوٰۃ کا کم از کم نصاب بیان ہوا ہے، اسی طرح حدیث میں ہے کہ قربانی میں دو دانتا جانور ذبح کرو، اس کا مطلب یہ نہیں کہ

اس سے زیادہ عمر والا جانور قربانی میں نہیں دیا جاسکتا، جیسا کہ سوال میں تاثر دیا گیا ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال قربانی کا جانور خریدنے کے بعد کسی بہتر جانور سے تبادلہ کرنا یا اسے فروخت کرکے اس سے بہتر جانور خریدنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب اس مسئلہ کے متعلق متقدمین میں اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ ائمہ ثلاثہ، یعنی امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک بہتر جانور سے تبادلہ کیا جاسکتا ہے۔ جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ قربانی کے جانور کو وقف کی طرح خیال کرتے ہوئے اسے فروخت کرکے یا کسی اور طریقہ سے تبادلہ کو جائز خیال نہیں کرتے، جیسا کہ فقہ القدیم میں اس کی تفصیل ملتی ہے۔

[مغنی ابن قدامہ، ص: ۵۳۵، ج ۱۳]

ہمارے ہاں بھی بعض علما اسے ناجائز کہتے ہیں کچھ تو اس قدر انتہا پسند ہیں کہ قربانی کا جانور خریدنے کے بعد کسی عیب پڑ جانے کی صورت میں بھی اسے تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دیتے بلکہ اسے ذبح کردینے کی تلقین کرتے ہیں، حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی حدیث (مسند امام احمد، ص: ۳۲، ج ۳) جس سے یہ مسئلہ کشید کیا ہے۔ وہ سخت ضعیف ہے کیونکہ اس میں ایک راوی جابر جعفی انتہائی کمزور اور دوسرا اس کا شیخ محمد بن قرظہ مجہول ہے۔ [سبل السلام، ص: ۹۴، ج ۴]

اس بنا پر اس مسئلہ کو ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

جو حضرات قربانی کے جانور کو فروخت کرکے بہتر جانور خریدنے یا کسی بہتر سے تبادلہ کے قائل ہیں ان کے دلائل یہ ہیں

حضرت عروہ بارقی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں (قربانی کی) بکری خریدنے کے لئے ایک دینار دیا، انہوں نے ایک دینار سے دو بکریاں خریدیں، ان میں سے ایک کو دینار سے فروخت کردیا، پھر جب ایک دینار اور بکری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تو آپ نے اس کے لئے خرید وفروخت میں برکت کی دعا فرمائی۔ [صحیح بخاری، المناقب: ۳۶۴۲]

بعض روایات میں صراحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قربانی کا جانور خریدنے کے لئے بھیجا تھا، لیکن راوی نے بعض اوقات قربانی کے بجائے صرف بکری خریدنے کا ذکر کیا ہے۔ [مسند امام احمد، ص: ۳۷۵، ج ۴]

اس روایت کو ابوداؤد، البیوع: ۳۳۸۴، ترمذی، البیوع: ۱۲۵۸، اور ابن ماجہ، الصدقات: ۲۴۰۲ میں بھی بیان کیا گیا ہے ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قربانی کی بکری خریدنے کا حکم دیا تھا۔ سفیان راوی اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ وہ آپ کے لئے بکری خریدے، گویا وہ قربانی ہے۔ [صحیح بخاری، المناقب: ۳۶۴۳]

اس موقف کی تائید میں حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کی روایت بھی پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بھی قربانی خریدنے کے لئے ایک دینار دیا۔ انہوں نے اس کے عوض ایک مینڈھا خریدا، واپسی پر راستہ میں اسے دو دینار کے عوض فروخت کر دیا، پھر منڈی سے ایک دینار کے عوض قربانی کا جانور خرید کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قربانی کا جانور اور دینار دونوں پیش کردیئے۔ آپ نے اس دینار کو بھی بطور صدقہ خرچ کردیا اور حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کے لئے اس کی تجارت میں خیر و برکت کی دعا فرمائی۔ [ابوداؤد، البیوع: ۳۳۸۶]

بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ قربانی ذبح کرو اور منافع کے دینار کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دو۔ [ترمذی، البیوع: ۱۲۵۷]

اس مقام پر یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ ابوداود کی روایت میں ایک راوی مجہول ہے جبکہ ترمذی کی روایت میں انقطاع ہے جیسا کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے خود بیان کیا ہے، تاہم اس قسم کی روایت کو بطور تائید پیش کیا جا سکتا ہے۔ علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تالیف میں ایک باب بایں الفاظ قائم کیا ہے کہ ''جو شخص قربانی کا جانور خریدنے کے بعد اسے تبدیل کر لیتا ہے۔'' پھر اس کے تحت ایک روایت لائے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک شخص کے بارے میں سوال ہوا جو قربانی کا جانور خریدتا ہے، پھر اسے فروخت کر کے اس سے موٹا تازہ خریدتا ہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے رخصت کا ذکر فرمایا، اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ [مجمع الزوائد، ص: ۲۱، ج ۴]

ان روایات کے پیش نظر قربانی کا جانور فروخت کر کے اس سے بہتر خریدا جا سکتا ہے اور کسی بہتر جانور سے اس کا تبادلہ کیا جا سکتا ہے۔

اور جو حضرات قربانی کا جانور متعین کرنے کے بعد اسے فروخت یا تبادلہ کو ناجائز کہتے ہیں، ان کا موقف ہے کہ قربانی چونکہ وقف کی طرح ہے۔ اس لئے اس میں خرید و فروخت یا تبادلہ جیسا تصرف درست نہیں ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہدی کے طور پر ایک عمدہ اونٹ کا انتخاب کیا، بعد میں کسی نے اس کی تین سو دینار کی قیمت لگا دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور بتایا کہ میں ایک عمدہ اونٹ ہدی کے طور پر مکہ مکرمہ بھیجنے کا پروگرام بنا چکا ہوں۔ اب مجھے اس کا تین سو دینار ملتا ہے، کیا میں اسے فروخت کر کے مزید اونٹ خرید سکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں تم اسی کو ذبح کرو۔'' [ابوداود، المناسک: ۱۷۵۶]

اس روایت کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بیان کیا ہے، لیکن اس میں عمدہ اونٹ کے بجائے بختی اونٹ کا ذکر ہے، جس کی گردن ذرا لمبی ہوتی ہے اور وہ بھی بہترین اونٹوں میں شمار ہوتا ہے۔ [مسند امام احمد، ص: ۱۴۵، ج ۴]

منتقی الاخبار میں اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا گیا ہے۔ کہ ہدی کو متعین کرنے کے بعد اسے بدلنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ہدی کی بیع درست نہیں ہے، خواہ اس جیسی یا اس سے بہتر کا تبادلہ مقصود ہو۔ [نیل الاوطار، ص: ۱۸۵، ج ۵]

چنانچہ قربانی بھی ہدی کی طرح ہے۔ اس بنا پر قربانی کا جانور بھی فروخت یا تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ حدیث اس مسئلہ پر واضح نہیں ہے، نیز محدثین کے قائم کردہ معیار صحت پر بھی پوری نہیں اترتی، کیونکہ اس میں ایک راوی شبیب بن غرقد کہتے ہیں کہ میں نے حی، یعنی قبیلہ سے سنا جو عروہ بارقی سے بیان کرتا ہے، اس قبیلہ کے افراد کی تعیین نہیں ہو سکی، لہٰذا اس ''جہالت'' کی وجہ سے یہ حدیث قابل استدلال نہیں ہے، چنانچہ چند ایک ائمہ حدیث نے اس حدیث پر اعتراضات کیے ہیں جن میں علامہ خطابی اور امام بیہقی سرفہرست ہیں۔ [فتح الباری، ص: ۷۷۴، ج ۶]

جہاں تک بخاری کی حدیث کے ضعف کا مسئلہ ہے اس کے متعلق محدثین کے فیصلے کے مطابق جس راوی کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی صحیح میں لائے ہیں وہ جرح و تعدیل کا پل عبور کر چکا ہے، یعنی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس کے متعلق خوب چھان پھٹک کرنے کے بعد

اسے اپنی صحیح میں لائے ہیں، لہٰذا اس حدیث پر بلاوجہ اعتراض درست نہیں ہے۔ ہاں، علامہ خطابی اور امام بیہقی نے اس حدیث کو غیر متصل قرار دیا ہے۔ اس کا جواب حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے کہ جب سماع کی تصریح موجود ہے تو اسے مرسل یا منقطع کیونکر کہا جا سکتا ہے بلکہ یہ روایت ایسی متصل ہے جس کی سند میں ایک مبہم راوی ہے، پھر اس ''مبہم حی'' کے متعلق لکھتے ہیں کہ انہوں نے ایک جماعت سے سنا ہے کہ جس کے کم از کم تین افراد ہیں۔ [فتح الباری، ص:۶۳۴، ج۶]

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ یہ حدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی شرط کے عین مطابق ہے کیونکہ عام طور پر ایک قبیلہ کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا ناممکن ہے۔ [فتح الباری، ص:۶۳۵، ج۶]

پھر اس حدیث کے متابعات وشواہد بھی ملتے ہیں جو اس کی تائید کرتے ہیں جن میں ''حی'' کے بجائے ابولبید لمازہ بن زیاد، حضرت عروہ بارقی رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں۔ [مسند امام احمد، ص:۳۷۶، ج۴]

امام منذری رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ بکری خریدنے والی اس روایت کو ابولبید لمازہ بن زیاد سے بیان کرتے ہیں جو حضرت عروہ بارقی سے بیان کرتے ہیں اس طریق سے یہ روایت حسن قرار پاتی ہے۔

[مختصر ابوداود، ص:۵۱، ج۵]

اس متابعت کے علاوہ حضرت حکیم بن حزام کی حدیث کو بطور شاہد پیش کیا جا سکتا ہے۔ الغرض یہ حدیث صحیح ہے اور اس میں کسی طرف سے ضعف کا شائبہ تک نہیں ہے، البتہ مانعین کی طرف سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جو حدیث پیش کی گئی ہے اس کے متعلق ہماری گزارشات حسب ذیل ہیں:

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے ناقابل حجت کی طرف اشارہ کیا ہے، فرماتے ہیں کہ محدث ابن خزیمہ نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں نقل کیا ہے لیکن اس سے حجت لینے میں توقف کیا ہے۔ [تہذیب، ص: ۱۲۱، ج۲]

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس روایت میں ایک راوی جہم بن جارود ہے جو حضرت سالم بن عبداللہ سے بیان کرتا ہے۔ اس کے متعلق امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس جہم کا حضرت سالم سے سماع معروف نہیں ہے۔ [تاریخ الکبیر، ص:۲۳۰، ج۲ القسم الثانی]

اس کے علاوہ جہم بن جارود بھی غیر معروف راوی ہے، چنانچہ اس کے متعلق امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بڑے بڑے تابعین سے روایت کرتا ہے۔ [دیوان الضعفاء، ص:۴۷، رقم:۷۹۳]

نیز فرماتے ہیں کہ اس راوی میں جہالت ہے خالد بن ابی یزید کے علاوہ اس سے اور کوئی راوی بیان نہیں کرتا۔

[میزان الاعتدال، ص:۴۲۶، ج۳]

محدثین کے ہاں کسی راوی کی جہالت صرف اسی صورت میں دور ہو سکتی ہے کہ کم از کم اس سے بیان کرنے والے دو ثقہ راوی ہوں۔ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ بات کہہ کر اس بات کی توثیق کی ہے کہ اس کی جہالت بدستور قائم ہے کیونکہ اس سے صرف ایک راوی بیان کرتا ہے اور مجہول کی روایت ناقابل قبول ہوتی ہے۔ بلاشبہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس راوی کو چھٹے درجے کا مقبول راوی بنایا ہے۔ [تقریب، ص:۱۳۵، ج۱]

لیکن اس لفظ سے اکثر اہل علم دھوکہ کھا جاتے ہیں، حالانکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسے راوی کی مرویات متابعت کے بغیر قبول نہیں ہوتیں، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے مقدمہ میں زکوٰۃ کی درجہ بندی کرتے ہوئے وضاحت کی ہے ''چھٹے درجے سے مراد وہ راوی ہیں جن سے بہت کم احادیث مروی ہیں لیکن ان میں کوئی ایسا سقم نہیں ہوتا جس کی وجہ سے ان کی مرویات کو رد کر دیا جائے۔ ایسے حضرات کے متعلق ''مقبول'' کا لفظ استعمال ہوگا جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر متابعت ہو تو مقبول بصورت دیگر ان کی مرویات کمزور ہوں گی۔'' [مقدمہ، ص:۵]

زیر بحث حدیث کی متابعت نہیں مل سکی اور نہ ہی اس کی تائید میں کوئی شاہد پیش کیا جا سکتا ہے۔ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں کہ محدث ابن قطان رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو بایں وجہ موصول قرار دیا ہے کہ اس کے راوی جہم بن جارود کے حالات کے متعلق کوئی پتہ نہیں چل سکا اور اس سے بیان کرنے والا بھی ابو عبدالرحیم خالد بن ابی یزید نامی ایک راوی ہے۔

[تہذیب السنن، ص:۲۹۲، ج۲]

محدث ابن خزیمہ نے بھی اس حدیث کے متعلق اظہار تردد فرمایا ہے کہ جہم بن جارود ایک ایسا راوی ہے کہ غیر کی وجہ سے اس کی بیان کردہ روایت کو بطور دلیل پیش کیا جا سکتا ہے۔ [صحیح ابن خزیمہ، ص:۲۹۱، ج۴]

صحیح ابن خزیمہ پر تعلیق ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے لکھی ہے اور محدث البانی رحمۃ اللہ علیہ نے نظر ثانی کے فرائض سرانجام دیئے ہیں۔ صاحب تعلیق نے اس کی سند کے متعلق لکھا ہے کہ ضعیف ہے، اگرچہ حافظ احمد شاکر نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔

[مسند امام احمد، ص:۱۴۴، ج۹]

تاہم مذکورہ بالا حقائق کے پیش نظر ہمیں اس کی صحت تسلیم کرنے میں تردد ہے۔ اس کی صحت تسلیم کرنے کی صورت میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہدی کا جانور اگر متعین ہو جائے تو اسے تبدیل کرنا درست نہیں، لیکن یہ پابندی قربانی کے جانور میں عائد کرنا کسی صورت میں درست نہیں ہے مقصد کے اشتراک سے یہ کب لازم آتا ہے کہ ان دونوں کے احکام بھی ایک جیسے ہوں، ہمارے نزدیک ہدی اور قربانی کے جانور میں درج ذیل کئی ایک وجوہ سے فرق ہے۔

① ہدی کے لئے جگہ کا تعین ہے، یعنی وہ جانور جو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے بیت اللہ کی طرف ہدیہ روانہ کیا جائے جبکہ قربانی کا جانور ان مکانی حدود و قیود کا پابند نہیں ہے۔

② ہدی کے لئے اشعار اور تقلید ضروری ہے جبکہ قربانی کے جانور میں یہ پابندی نہیں ہے۔

③ ہدی صرف ایک آدمی کی طرف سے ہو سکتی ہے جبکہ قربانی میں تمام اہل خانہ شریک ہوتے ہیں، خواہ ان کی تعداد کتنی ہو۔

④ بعض حالات میں انسان ہدی کا گوشت خود نہیں کھا سکتا اور نہ ہی اپنے رفقا کو کھلا سکتا ہے جبکہ قربانی کا جانور خود بھی کھایا جا سکتا ہے اور دوسروں کو کھلانے میں بھی چنداں حرج نہیں ہے۔

⑤ ہدی کے اونٹ میں سات شریک ہو سکتے ہیں جبکہ قربانی کے اونٹ میں دس تک شراکت جائز ہے۔

⑥ ہدی کے لئے وقت کی کوئی پابندی نہیں جبکہ قربانی کے لئے مخصوص ایام ہیں۔

⑦ قربانی کرنے والے کے لئے حکم ہے کہ وہ ذوالحجہ کا چاند نظر آنے کے بعد ذبح کے وقت تک اپنی حجامت وغیرہ نہ بنائے جبکہ بعض حالات میں ہدی بھیجنے والے پر اس قسم کی کوئی پابندی نہیں۔

⑧ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ علیہ کے نزدیک ہدی کا جانور عیوب سے پاک ہونا ضروری نہیں جبکہ قربانی کے جانور میں عیوب کا ہونا جائز نہیں ہے۔

⑨ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے 9ھ میں ہدی کے جانور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہمراہ روانہ کئے جبکہ مدینہ میں آپ نے قربانی بھی دی اس سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ دونوں کے احکام الگ الگ ہیں۔

⑩ ہدی کا جانور تبدیل کرنا درست نہیں جبکہ قربانی میں ایسا کیا جاسکتا ہے۔(تلك عشرة كاملة)

محدثین کرام نے کتب حدیث میں ہدی کے متعلق اس طرح کے عنوانات قائم کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدی کا جانور تبدیل کرنا جائز نہیں ہے۔(منتقی الاخبار) لیکن کسی محدث نے قربانی کے متعلق اس طرح کا باب قائم نہیں کیا جس کا واضح مطلب یہ ہو کہ ان دونوں کے احکام میں بہت فرق ہے اور کسی کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

مذکورہ حدیث پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیا جاسکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک عمدہ بختی اونٹ خریدا جب اس کی قیمت تین سو دینار لگی تو آپ نے اسے فروخت کرکے اس کی قیمت کے عوض ایک عام اونٹ خریدنے کا پروگرام بنایا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا اور کہا کہ وہ عمدہ اونٹ ہی اللہ کی راہ میں ذبح کرو، بہترین اونٹ کے بدلے عام اونٹ ہدی کے لئے لینا درست نہیں۔ چنانچہ محدث ابن خزیمہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے۔ ''زیادہ قیمت کی عمدہ ہدی دینے کا بیان۔''

یہ معنی کرنے سے مذکورہ حدیث مانعین کے لئے دلیل نہیں بن سکتی، مختصر یہ ہے کہ قربانی کے تبادلہ کی چار صورتیں ممکن ہیں۔

① صاحب حیثیت وہ جانور بھی ذبح کرے جو اس نے پہلے خرید کیا ہے اور بہترین عمدہ جانور اپنی گرہ سے ہی خرید کر ذبح کرے۔

② اسے فروخت کرکے اس میں اپنی طرف سے کچھ رقم ملا کر بہترین جانور خرید کر ذبح کر دیا جائے۔

③ عدم استطاعت کی صورت میں خریدے ہوئے جانور کو ہی ذبح کر دے۔

④ یہ جائز نہیں ہے کہ اسے بیچ کر کچھ رقم پس انداز کرے اور اس سے کم قیمت کے عوض کوئی معمولی جانور خرید کر ذبح کرے، اس قسم کی سودا بازی کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ [ہذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب]

سوال چرمہائے قربانی کا صحیح مصرف کیا ہے۔ ہمارے ہاں بعض تنظیموں کی طرف سے عید الاضحیٰ سے پہلے وعدہ کی رسیدیں تقسیم کی جاتی ہیں، کیا اس طرح کی وعدہ رسیدیں ملنے سے ہم پابند ہوجاتے ہیں کہ انہیں کو قربانی کی کھال دی جائے یا اپنی صوابدید کے مطابق انہیں تقسیم کریں؟

جواب چرمہائے قربانی کا صحیح مصرف گردوپیش کے غرباء و مساکین ہیں چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر سو اونٹ ذبح کئے اور ان کی کھالوں کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ انہیں صدقہ کے طور پر تقسیم کر دیا جائے۔ [صحیح بخاری، الحج:۱۷۱۸]

اس کی تفصیل بایں الفاظ وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ قربانی کے اونٹوں کی دیکھ بھال کریں، نیز ان کا گوشت، کھالیں اور جلیں مساکین میں تقسیم کر دیں اور قصاب کو بطور اجرت ان کھالوں سے کچھ نہ دیں۔

[صحیح مسلم، الحج: ۱۳۱۷]

اس فرمان نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کی کھالوں کے حق دار غرباء اور مساکین ہیں اور یہ حق انہی نادار اور غریبوں کو ملنا چاہیے۔ ہمارے ہاں عام طور پر مندرجہ ذیل مصارف پر ان کھالوں کو خرچ کیا جاتا ہے جو اسوۂ حسنہ کے بالکل منافی ہے۔

① ائمۂ مساجد اور ان کے خطبا کی تنخواہ پر انہیں صرف کر لیا جاتا ہے۔

② مقامی بچوں کی تعلیم پر اٹھنے والے اخراجات ان سے پورے کئے جاتے ہیں۔

③ مقامی لائبریریوں کی توسیع اور مساجد کی تعمیر و ترقی پر انہیں خرچ کیا جاتا ہے۔

④ سیاسی جماعتیں بھی سیاست چمکانے کے لئے ان کھالوں کو استعمال کرتی ہیں۔

⑤ جہادی تحریکیں بھی قربانی کے ایام میں سرگرم عمل ہوتی ہیں وہ بھی کھالوں کو اکٹھا کرنے میں تگ و دو کرتی ہیں۔

بعض جہادی تنظیموں کا طریقہ واردات سوال میں ذکر ہوا ہے کہ ان کے افراد قربانی سے پہلے لوگوں سے انفرادی ملاقات کر کے وعدہ کی رسیدیں ان کے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں تا کہ اسے پابند کر دیا جائے۔ مذکورہ تمام مصارف کے سلسلہ میں ہمیں ہوشیار رہنا چاہیے اور قربانی کی کھالیں صرف غرباء اور مساکین اور بیواؤں کا حق ہے، مقامی طلبا، مساجد، ائمۂ کرام، خطبائے عظام، مقامی لائبریریاں، سیاسی جماعتیں اور جہادی تنظیمیں ان کی حق دار نہیں، ہاں، اگر مقامی جماعت انتہائی کمزور ہو اور امام مسجد کی تنخواہ اتنی کم ہو کہ اس سے گزر اوقات نہ ہو سکے اور اس کا اور کوئی ذریعہ معاش بھی نہیں ہے تو اسے دیگر غرباء و مساکین کی طرح بقدر حصہ کھالیں دی جا سکتی ہیں، اسی طرح اگر مجاہدین مفلوک الحال ہوں تو ان کی غربت و ناداری کے پیش نظر بقدر حصہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ مقامی غرباء و مساکین کو نظر انداز کر کے تمام کھالوں پر یہی حضرات قبضہ کر لیں، واضح رہے کہ اگر کسی نے اپنی سادگی کی وجہ سے وعدہ رسید وصول کر لی ہے تو وہ اس کا پابند نہیں ہو جاتا بلکہ اسے چاہیے کہ اپنی صوابدید کے مطابق قربانی کی کھال کو صحیح جگہ پر صرف کرے۔ قربانی کی کھال سے قربانی کرنے والا خود بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے اگر وہ اس کا مصلی یا مشکیزہ بنا کر اپنے استعمال میں لانا چاہے تو لا سکتا ہے، اسے فروخت کر کے اس کی قیمت کو اپنے ذاتی استعمال میں لانا درست نہیں ہے اور نہ ہی اس کھال کو اجرت کے عوض قصاب کو دینا چاہیے، بلکہ اسے مزدوری اپنی گرہ سے دی جائے، جیسا کہ حدیث بالا سے واضح ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال قربانی کا جانور زندہ وزن کر کے فروخت کرنا شرعاً جائز ہے؟

جواب عبادات اور معاملات میں فرق یہ ہے کہ عبادت میں جواز کے لئے حکم دیکھا جاتا ہے، یعنی شریعت نے اس عبادت کو بجا لانے کا حکم دیا ہو۔ جس عبادت سے منع کیا ہے یا جس کے بجا لانے کا حکم نہیں دیا اسے نہیں کرنا چاہیے جبکہ معاملات میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ شارع علیہ السلام نے اس سے منع نہ کیا ہو، یعنی ہر وہ معاملہ جائز ہے جس سے شریعت نے منع نہیں کیا۔ صورت مسئولہ کے متعلق شریعت نے منع نہیں کیا اور نہ ہی اس میں کوئی ایسا سبب پایا جاتا ہے جس کی بنا پر اسے منع قرار دیا جائے، لہٰذا قربانی کا جانور وزن کر کے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہم نے علما سے سنا ہے کہ حلال جانور کی اوجڑی کھانا مکروہ ہے، عام حالات میں اسے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

کیا رسول اللہ ﷺ نے اسے مکروہ قرار دیا ہے؟

جواب کسی چیز کو لوگوں کے لئے حلال یا حرام کرنے کا اختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے جو جانور حلال کئے ہیں ان کے تمام اجزا حلال ہیں۔ ہاں! اللہ تعالیٰ خود کسی چیز کو حرام کر دیں تو الگ بات ہے، جیسا کہ حلال جانور کو ذبح کرتے وقت اس کی رگوں سے جو تیزی کے ساتھ خون بہتا ہے جسے دم مسفوح کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ اس خون کے علاوہ حلال جانور کی کوئی چیز بھی حرام نہیں ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر حلال جانور کا ہر جز دکھانا ضروری ہو۔ اگر حلال جانور کے کسی حصے کے متعلق دل نہیں چاہتا۔ تو یہ انسان کی اپنی مرضی ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے بعض حلال جانوروں کے گوشت کے متعلق اظہار ناپسندیدگی فرمایا لیکن آپ کے سامنے ایک ہی دستر خوان پر بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسے تناول فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کا ناپسند ہونا اور بات ہے اور اسے حرام قرار دینا کار دیگر است، مختصر یہ کہ حلال جانور کے تمام اجزا حلال ہیں۔ سوائے ان اجزا کے جنہیں خود اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہو، اس لئے حلال جانور کی اوجڑی کے حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے بعض فقہا نے اس سلسلہ میں کاوش کی ہے اور انہوں نے حلال جانور کے کچھ اجزا کو حرام کہا ہے۔ ان میں سے ایک اوجڑی بھی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک روایت کا سہارا لیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ذبح شدہ بکری کے سات حصوں کو مکروہ خیال کرتے تھے، یہ روایت محدثین کے ہاں نا قابل حجت ہے۔ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے ضعف کو بیان کیا ہے۔

[ضعیف الجامع الصغیر، رقم: ۴۶۱۹]

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس روایت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ (السنن الکبریٰ، ص ۷، ج ۱۰) [واللہ اعلم]

سوال ہم نے ایک گائے قربانی کے لئے خریدی تھی اس کی ٹانگ خراب ہو گئی، علاج کے بعد اب صحیح ہے لیکن دوسری ٹانگوں سے چھوٹی ہے جس کی وجہ سے اس کا لنگڑا پن نمایاں ہے اس صورت حال کے پیش نظر ہمارے لئے شریعت کا کیا حکم ہے۔ کیا ہم اسے قربانی کے طور پر ذبح کر سکتے ہیں؟

جواب قربانی کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول یہ تھا کہ ذبح کرتے وقت ان عیوب کو دیکھتے تھے۔ جو قربانی میں رکاوٹ کا باعث ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر خریدنے کے بعد ذبح کرنے سے پہلے قربانی کے جانور میں کوئی عیب پڑ جائے تو وہ جانور قربانی کے قابل نہیں رہتا۔ اسے تبدیل کرنا چاہیے۔ صورت مسئولہ میں جانور میں لنگڑا پن کا نمایاں ہونا ایک ایسا عیب ہے کہ اس کی موجودگی میں قربانی صحیح نہیں ہے اسے بطور قربانی ذبح نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں ایک روایت بھی پیش کی جاتی ہے کہ جانور خریدنے کے بعد اگر عیب پڑ جائے تو قابل معافی ہے لیکن وہ روایت سخت ضعیف ہے جس کے متعلق پہلے وضاحت کر چکے ہیں، صورت مسئولہ میں ہمارا رجحان یہ ہے کہ اس گائے کو فروخت کر دیا جائے اور اس کی قیمت سے کوئی دوسرا بے عیب جانور خرید کر بطور قربانی ذبح کیا جائے، ایسے جانور کی قربانی درست نہیں ہے جو عیب دار ہو بالخصوص جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو۔ [واللہ اعلم]

سوال ہم حج کے لئے مکہ مکرمہ آتے ہیں، ہمارے چند پاکستانی ساتھیوں نے کہا ہے کہ آپ حکومت کے ذریعے قربانی کا کوپن پر نہ کریں پتہ نہیں یہ لوگ قربانی کرتے ہیں یا نہیں؟ آپ اس کی رقم ہمیں دے دیں۔ ہم آپ کی طرف سے قربانی کر دیں

گے، لیکن ان کی رہائش حدود کعبہ اور منیٰ سے باہر ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب حکومت سعودیہ کو اللہ تعالیٰ قائم دائم رکھے، اس نے حجاج کرام کی خدمت کے لئے بہت کام کیا ہے، اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے خزانے کھول رکھے ہیں آج کل وہاں جو سہولتیں میسر ہیں چند سال قبل ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، ان سہولتوں میں سے ایک سہولت یہ ہے کہ انہوں نے حجاج کرام کے لئے قربانی کی ایک سکیم کا آغاز کیا ہے کہ وہ قربانی کی رقم لینے کے بعد حجاج کو ایک وقت دے دیتے ہیں کہ ہم اس وقت آپ کی طرف سے قربانی کردیں گے۔ اس کے بعد آپ دوسرے کام کرسکتے ہیں۔ حجاج کرام کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اگر کوئی خود قربانی کرنا چاہے تو اسے اجازت ہوتی ہے لیکن اس کے لئے خاص دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حکومت کی اسکیم کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس طرح گوشت ضائع نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی نگرانی میں محفوظ کرکے دیگر ممالک میں بھیج دیتے ہیں جہاں اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ صورت مسئولہ میں حکومت کی اس اسکیم کے متعلق جو شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اسے کسی صورت میں مستحسن قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگر کسی کا دل مطمئن نہ ہو تو حکومت کی طرف سے کوئی دباؤ نہیں کہ ضرور اس میں شمولیت کی جائے لیکن اسے مشکوک قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ اس کے متبادل جو صورت پیش کی گئی ہے اس میں کیا ضمانت ہے کہ ضرور ذبح کریں گے، پھر ان کا گھر مکہ اور حدود منیٰ سے باہر ہے۔ جبکہ قربانی کے لئے ضروری ہے کہ وہ منیٰ یا حدود مکہ میں ذبح کی جائے، اگر منیٰ یا مکہ سے باہر ہی ذبح کرنا ہے تو اسے پاکستان میں کیوں ذبح نہیں کیا جاسکتا؟ بہرحال انسان کو چاہیے کہ وہ خود ذبح کرے یا حکومت کی اسکیم میں شمولیت اختیار کرے۔ اس طرح شکوک وشبہات پھیلانے والوں سے ہوشیار رہیں، یہ اکثر مفاد پرست ہوتے ہیں باتوں سے حجاج کرام کو دھوکہ دیتے ہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال میں نے ایک جانور کے متعلق نذر مانی تھی کہ اسے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں ذبح کرنا ہے، اب کیا اسے قربانی کے لئے رکھا جاسکتا ہے کیونکہ قربانی بھی اللہ کی راہ میں ہوتی ہے؟

جواب نذر ایسے عہد کو کہا جاتا ہے جو انسان خود اپنے اوپر واجب قرار دے لے اور اگر یہ نذر اللہ کی اطاعت کے لئے ہے تو اسے پورا کرنا چاہیے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اللہ کی اطاعت کے لئے نذر مانی ہو تو اسے پورا کرنا چاہیے اور جس نے اللہ کی نافرمانی کے لئے نذر مانی ہو تو اس کو اللہ کی نافرمانی نہیں کرنی چاہیے۔'' [صحیح بخاری، الایمان والنذور: ۶۶۹۶]

اللہ کی اطاعت میں رہتے ہوئے اپنی نذروں کو پوری کرنے والوں کی اللہ تعالیٰ نے تعریف کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وہ اپنی نذریں پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہر سو پھیلی ہوگی۔'' [۷۶/الدھر: ۷]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی نشانی بایں الفاظ بیان کی ہے کہ ''لوگ اپنی نذر کو پورا نہیں کریں گے۔'' [صحیح بخاری: ۶۶۹۵]

اس قرآنی آیت اور پیش کردہ احادیث کے پیش نظر سائل کو چاہیے کہ وہ اپنی نذر کو پورا کرتے ہوئے اس جانور کو اللہ کی راہ میں ذبح کرے اور قربانی کے لئے کوئی دوسرا جانور خرید لے اور اگر نذر مانتے وقت یہ نیت تھی کہ قربانی بھی اللہ کے راستہ میں ہوتی ہے تو میں نے اسے قربانی کے لئے ذبح کرنا ہے تو پھر اس جانور کو بطور قربانی ذبح کیا جاسکتا ہے۔ اگر نذر مانتے وقت اس قسم کی نیت نہ تھی تو اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں اس طرح کی ''بچت سکیم'' پر عمل نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس جانور کو فی سبیل اللہ ذبح کردیں اور اس

کا گوشت غرباء اور مساکین میں تقسیم کر دیں اور قربانی کے لئے کوئی دوسرا جانور خرید یں اور اس کا گوشت خود کھائیں۔ بطور تحفہ کسی کو دیں اور غرباء و مساکین کو بھی کھلائیں۔ [واللہ اعلم]

سوال کیا بچے کا عقیقہ ساتویں روز ہی کرنا ضروری ہے یا دو چار سال بعد بھی کیا جا سکتا ہے، کیا عقیقہ کے لئے جانور کا دو دانتہ ہونا ضروری ہے، نیز عقیقہ کے لئے گائے میں سات حصے ہو سکتے ہیں؟

جواب بچے کا عقیقہ ایسی قربانی ہے جسے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے اور نعمت اولاد پر اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے پیدائش کے ساتویں روز ذبح کیا جاتا ہے۔ ساتویں دن عقیقہ کے متعلق ارشاد نبوی ہے: ''ہر بچہ اپنے عقیقہ کے عوض گروی ہوتا ہے، چنانچہ پیدائش کے ساتویں روز اس کا عقیقہ کیا جائے اور نام رکھا جائے اور اس کے سر کے بال منڈائے جائیں''۔

[ابوداؤد، الاضاحی: ۲۸۳۸]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے، کہ عقیقہ پیدائش کے ساتویں روز کرنا چاہیے اگر انسان اپنے بچے کی پیدائش کے وقت تنگ دست ہے تو اس پر عقیقہ لازم نہیں ہے، کیونکہ وہ عاجز ہے اور عاجز ہونے کی وجہ سے عبادات ساقط ہو جاتی ہیں، چونکہ بچہ عقیقہ کے عوض گروی ہوتا ہے، اس لئے جب بھی توفیق ملے وہ اپنے بچے کا عقیقہ کر سکتا ہے۔ ایک روایت میں بیان ہے کہ ساتویں روز کے بعد چودھویں یا اکیسویں روز عقیقہ کر دیا جائے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''عقیقہ کا جانور ساتویں روز ذبح کیا جائے یا چودھویں یا اکیسویں روز اسے قربان کیا جائے۔'' [بیہقی، ص: ۳۰۳، ج۹]

استطاعت کے باوجود بلاوجہ تاخیر کرنا خلاف سنت ہے اگر کسی کے والدین عقیقہ کے مسائل سے لاعلمی و جہالت یا غربت وافلاس کی وجہ سے زندگی میں اس کا عقیقہ نہ کر سکے ہوں وہ خود بھی اپنا عقیقہ کر سکتا ہے کیونکہ وہ عقیقہ کے عوض گروی ہے، اس لئے خود کو گروی سے چھڑانا ضروری ہے۔ عقیقہ کے لئے احادیث میں جو الفاظ وارد ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عقیقہ کے جانور میں قربانی کی شرائط نہیں، نیز کسی بھی صحیح حدیث سے عقیقہ کے جانور پر قربانی کی شرائط عائد کرنا ثابت نہیں ہوتا اور جو لوگ یہ شرائط عائد کرتے ہیں ان کے پاس قیاس کے علاوہ اور کوئی دلیل نہیں ہے، تاہم عقیقہ کے جانور میں متقارب اور مساوی کی قید اس بات کی متقاضی ہے کہ شریعت نے قربانی کے جانور میں جن عیوب و نقائص سے بچنے کا حکم دیا ہے انہیں عقیقہ کے جانور میں بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ چنانچہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ عقیقہ کے جانور میں بھی ان عیوب سے اجتناب کرنا چاہیے جن سے قربانی کے جانور میں احتراز کیا جاتا ہے۔ [مغنی لابن قدامہ، ص: ۳۹۹، ج۱۳]

بہر حال یہ بات اپنی جگہ پر مبنی بر حقیقت ہے کہ عقیقہ کے جانور کا دو دانتہ ہونا ضروری نہیں ہے لیکن موٹا تازہ ہونا چاہیے، جسے بکرا یا مینڈھا کہا جا سکے۔

احادیث میں عقیقہ کے لئے جن جانوروں کی قربانی کا ثبوت ملتا ہے وہ بکری یا دنبہ ہے۔ حضرت ام کرز رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''لڑکے کی طرف سے دو مساوی بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کی جاتی ہے۔'' [مسند امام احمد، ص: ۳۸۱، ج۶]

اس طرح دیگر روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عقیقہ کے لئے بکری یا دنبے کا ذکر ہی ملتا ہے، اس لئے عقیقہ میں صرف انہی جانوروں کو ذبح کیا جائے، نیز ان کے نزدیک نر یا مادہ سے ثواب میں کمی نہیں ہوگی، جیسا کہ حدیث میں اس کی وضاحت ہے۔

[ابوداؤد، الاضاحی: ۲۸۳۵]

اگر گائے کو عقیقہ میں ذبح کرنا ہے تو لڑکے کے لئے اس کے ساتھ ایک اور جانور ملانا ہوگا لیکن سات حصے عقیقہ کے طور پر رکھنا، کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔ بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عقیقہ میں اونٹ ذبح کرنے پر معاذ اللہ پڑھ کر اپنی خفگی کا اظہار کیا تھا۔

[بیہقی ص: ۳۰۱، ج ۹]

اس بنا پر سنت پر عمل کرتے ہوئے صرف بکری یا دنبے اور مینڈھے وغیرہ پر ہی اکتفا کیا جائے۔ [واللہ اعلم]

سوال عقیقہ کے متعلق مندرجہ ذیل سوالات کا جواب مطلوب ہے:

① کیا بچے کا عقیقہ ساتویں روز ہی کرنا چاہیے؟

② کیا عقیقہ کے لئے جانور کا دو دانتہ ہونا ضروری ہے؟

③ عقیقہ کے لئے گائے میں سات اور اونٹ میں دس حصے ہو سکتے ہیں، قرآن و سنت کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں؟

جواب واضح رہے کہ بچے کی پیدائش پر عقیقہ کرنا ضروری ہے۔ حضرت سلمان بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بچے کے ساتھ عقیقہ ہے، لہٰذا اس کی طرف سے خون بہاؤ اور اس سے اذیت کی چیز، یعنی بال وغیرہ صاف کرو۔'' [صحیح بخاری، العقیقہ: ۵۴۷۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ میں حکم دیا ہے اور اصول فقہ کا قاعدہ ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کام کا حکم دیں تو اس کا بجالانا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بچہ اپنے عقیقہ کی وجہ سے گروی رکھا ہوا ہے۔'' [ترمذی، الاضاحی: ۱۵۲۲]

جب بچے کا عقیقہ کیا جائے گا تو اس کی گروی ختم ہو جائے گی، اگر اس کی طرف سے عقیقہ نہ کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ گروی رکھا ہوا ہے اور اس کا ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بچے کا عقیقہ ساتویں دن ہی کرنا چاہیے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ساتویں دن بچے کا عقیقہ کیا جائے اور ساتویں دن اس کا نام بھی رکھا جائے اور اس کے بال بھی اتروائے جائیں۔''

[ابوداود، الاضاحی: ۲۸۳۷]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عقیقہ ساتویں دن ہی کرنا چاہیے، اگر ساتویں دن نہیں کر سکا تو پھر بعد میں جب بھی موقع ملے عقیقہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک روایت بھی پیش کی جاتی ہے کہ ''ساتویں دن عقیقہ کرو۔ چودھویں دن کرلو، اکیسویں دن کر لو۔'' لیکن یہ روایت محدثین کے معیار صحت پر پوری نہیں اترتی کیونکہ اس روایت میں ایک راوی اسماعیل بن مسلم مکی ہے جو کثیر الغلط اور ضعیف ہے۔ حدیث میں ہے کہ بچہ اپنے عقیقہ کی وجہ سے گروی رکھا ہوا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ ساتویں دن عقیقہ کیا جائے اگر ساتویں دن نہیں کر سکا تو پھر جب بھی موقع ملے عقیقہ کر دے، بعد میں اس کے متعلق کوئی تاریخ مقرر نہیں ہے۔

عقیقہ کے جانور کے متعلق حدیث میں ہے کہ ''لڑکا ہو تو اس کی طرف سے دو بکریاں ایک جیسی، یعنی ان کی عمر ایک جیسی ہو اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کی جائے۔'' [سنن ترمذی، الاضاحی: ۱۵۱۳]

حضرت ام کرز رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث کے یہ الفاظ ہیں کہ تم پر کسی قسم کا کوئی ضرر نہیں کہ وہ دو مادہ ہوں یا دو نر ہوں۔

[سنن ترمذی، الاضاحی: ۱۵۱۶]

عقیقہ کے جانور کے متعلق دو دانتہ ہونے کی کوئی شرط نہیں ہے، اس کے متعلق حدیث میں کوئی پابندی نہیں ہے، دو دانتہ ہونے کی شرط قربانی کے لئے ہے، جیسا کہ صحیح مسلم میں اس کی صراحت ہے۔ عقیقہ کے لیے گائے یا اونٹ میں حصے رکھنا تو بہت دور کی بات ہے ان کا عقیقہ میں ذبح کرنا ہی محل نظر ہے، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھائی حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو کسی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ آپ اس کی طرف سے اونٹ کا عقیقہ کریں۔ آپ نے جواب دیا اللہ کی پناہ، میں تو وہی کام کروں گی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے آپ نے دو بکریاں ذبح کرنے کے متعلق فرمایا ہے جو ہم عمر ہوں۔

[بیہقی ص: ۳۰۱، ج ۹]

اس حدیث کے پیش نظر عقیقہ میں گائے یا اونٹ ذبح کرنا درست نہیں ہے۔ ہماری پیش کردہ تفصیل کو مدنظر رکھتے ہوئے سوالات کا ترتیب وار جواب پیش خدمت ہے:

① عقیقہ ساتویں روز ہی کرنا چاہیے اگر مالی استطاعت نہ ہو تو آئندہ کسی وقت بھی کیا جا سکتا ہے۔

② عقیقہ کا جانور دو دانتہ یا عیوب سے پاک ہونا ضروری نہیں ہے، البتہ اسے موٹا تازہ اور گوشت سے بھرا ہونا چاہیے۔

③ عقیقہ کے لئے گائے میں سات اور اونٹ میں دس حصے تو بہت دور کی بات ہے بکری، مینڈھا اور دنبہ کے علاوہ دوسرے جانور، مثلاً: گائے یا اونٹ ذبح کرنا محل نظر ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال میری ہمشیرہ کے ہاں پہلے بچے کی پیدائش ہمارے ہاں ہوئی ہم نے بچے کا عقیقہ کیا۔ کیا ہم بچے کی پیدائش اور عقیقہ پر اٹھنے والے اخراجات کا مطالبہ اپنے بہنوئی سے کر سکتے ہیں؟

جواب واضح رہے کہ نکاح کے بعد بیوی کے جملہ اخراجات خاوند کے ذمہ ہیں، خواہ ان کا تعلق خورد و نوش سے ہو یا علاج معالجہ یا لباس اور رہائش وغیرہ سے ان تمام اخراجات کا پورا کرنا خاوند کی ذمہ داری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''کشادگی والے کو اپنی کشادگی سے خرچ کرنا چاہیے اور جس پر اس کا رزق تنگ کیا گیا ہو وہ بھی اللہ کے دیئے ہوئے سے خرچ کرے۔'' [۶۵/ الطلاق، ۷]

رہائش کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''انہیں وہیں رکھو جہاں تم خود رہتے ہو۔'' [۶۵/ الطلاق: ۶]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''تم پر معروف طریقہ کے مطابق ان عورتوں کو کھلانا پلانا اور انہیں لباس مہیا کرنا لازم ہے۔'' [صحیح مسلم، الحج: ۱۲۱۸]

حضرت عمرو بن احوص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خبردار عورتوں کا تم پر حق یہ ہے کہ تم انہیں لباس مہیا کرنے اور انہیں کھانا فراہم کرنے میں احساس کرو۔'' [مسند امام احمد ص: ۴۲۶، ج ۴]

ان آیات واحادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوی کا ہر خرچہ خاوند کے ذمہ ہے لیکن ہماری مشرقی روایات کچھ اس طرح تشکیل پاتی ہیں کہ شادی کے بعد بھی شادی شدہ بیٹی کے اخراجات والدین کے ذمے پڑے رہتے ہیں۔ اگر والدین ان کا مطالبہ کریں تو غیر مروت اور غیر مہذب ہونے کے طعنے سننے پڑتے ہیں، اس لئے والدین بے چارے رواداری میں انہیں برداشت کرتے رہتے ہیں۔ سوال میں ذکر کردہ اخراجات بھی اسی قبیل سے ہیں۔ بچی کی شادی کے بعد اس کے ہاں پہلے بچے کی ولادت عام طور پر والدین کے ہاں ہوتی ہے، شرم وحیا اور نسوانیت کا کچھ تقاضا بھی ہوتا ہے لیکن لڑکے کے والدین بچی کی اس مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ولادت پر جتنے بھی اخراجات آتے ہیں وہ بچی کے والدین ہی برداشت کرتے ہیں، خواہ بچے کی پیدائش گھر میں ہو یا ہسپتال میں، کسی پرائیویٹ کلینک میں ڈاکٹر حضرات بھی ایسے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں، دس پندرہ ہزار روپے تو معمولی بات ہے۔ پھر ولادت کے بعد اگر مذہبی ماحول ہے تو عقیقہ کے اخراجات بھی بچی کے والدین ہی برداشت کرتے ہیں۔ شرم کے مارے کچھ کہا بھی نہیں جاتا، حالانکہ ولادت وعقیقہ کے تمام اخراجات کو پورا کرنا شرعاً واخلاقاً خاوند کی ذمہ داری ہے، پھر جب ولادت کے بعد بچی کو واپس خاوند کے گھر رخصت کرنا ہوتا ہے تو اس وقت بھی افراط وتفریط سے کام لیا جاتا ہے، حالانکہ باپ تمام اولاد کے درمیان مساوات قائم رکھنے کا پابند ہے۔ عید الفطر، بقرہ عید کے موقع پر ''عیدی'' کے نام سے بھی یہی کچھ کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ایک اور بہت گندی رسم رائج ہے کہ جب فوت ہو جاتی ہے تو اس کے کفن ودفن کے اخراجات بھی بچی کے والدین پورا کرتے ہیں، حالانکہ اس بے بچاری نے ساری عمر خاوند کی خدمت گاری میں گزاری ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے معاشرے میں کفن کا بندوبست بچی کے والدین کے ذمہ ہوتا ہے۔ پھر کفن کے نام پر ایسے سرخ رنگ کی چادر یا دوپٹہ دیا جاتا ہے گویا آج اسے گھر سے دلہن بنا کر رخصت کرنا ہے۔ اس قسم کی افراط وتفریط ایک مسلمان کے شایان شان نہیں ہے بہر حال شادی کے بعد بیوی کے تمام اخراجات خاوند کے ذمہ ہیں، اس لئے ولادت وعقیقہ اور کفن ودفن کے اخراجات خاوند کو پورا کرنے چاہییں۔ [واللہ اعلم]

سوال رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بعض لوگ قربانی کرتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا معمول تھا کہ وہ قربانی کے موقع پر دو جانور ذبح کرتے تھے ایک رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اور دوسرا اپنی طرف سے، سوال کرنے پر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے وصیت فرمائی تھی کہ میں آپ کی طرف سے قربانی کرتا رہوں۔ [ابوداود، الاضاحی: ۲۷۹۰]

ترمذی کے یہ الفاظ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اپنے بعد قربانی کرنے کا حکم دیا تھا۔ [ترمذی، الاضاحی: ۱۴۹۵]

لیکن محدثین نے تین خرابیوں کی وجہ سے اس حدیث کو ناقابل حجت ٹھہرایا ہے:

① امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد خود لکھتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے، ہم اسے شریک کے واسطہ کے علاوہ کسی اور واسطہ سے نہیں پہچانتے۔ راوی حدیث شریک بن عبداللہ کا حافظہ متغیر ہو گیا تھا۔ [تقریب التہذیب، ص: ۱۴۵]

② شریک راوی اپنے شیخ ابوالحسناء سے بیان کرتا ہے۔ اس کے متعلق حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ مجہول راوی ہیں درجہ سابعہ سے تعلق رکھتا ہے۔ [تقریب: ۴۰۱]

③ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والا ایک حنش نامی راوی ہے۔ اس کے متعلق حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ سچا ہے، لیکن اس کے بے شمار اوہام ہیں اور مرسل روایات بیان کرنے کا عادی ہے۔ [تقریب، ص:۸۵]

اس کے متعلق امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ یہ کثیر الوہم ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بعض روایات بیان کرنے میں منفرد ہے اس بنا پر قابل حجت نہیں ہے۔ [عون المعبود، ص:۵۱، ج۳]

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا روایت سخت ضعیف ہے، اگر اسے صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وصیت کی تھی اور آپ اس وصیت پر عمل کرتے تھے یہی وجہ ہے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی دینے کا عمل منقول نہیں ہے، لہٰذا اس سلسلہ میں ہمارا موقف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی کرنا محل نظر ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال قربانی ذبح کرنے کے کیا آداب ہیں؟ قرآن و حدیث سے اس کے متعلق ہدایات کا حوالہ دیں۔

جواب قربانی کا جانور ذبح کرنا ایک عبادت ہے اور عبادت کے لئے نیت کا ہونا ضروری ہے۔ اس جانور کو ذبح کرنے سے پہلے اس کی نیت کرنا ضروری ہے، وہ بھی خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہونا چاہیے۔ حدیث میں ہے کہ ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے نیت کی۔'' [صحیح بخاری، بدء الوحی:۱]

☆ ذبح کرنے کے لئے چھری کو اچھی طرح تیز کیا جائے اور اسے قربانی کے جانور سے چھپا کر رکھا جائے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے لئے چھری کو تیز کرنے کا حکم دیا اور فرمایا: ''اسے جانور سے چھپا کر رکھا جائے۔''

[مسند امام احمد، ص:۱۰۸ ج۲]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حکم دیا کہ ''چھری کو پتھر پر تیز کر کے لاؤ'' [صحیح مسلم، الاضاحی:۱۹۸۷]

☆ ذبح کرتے وقت جانور کو بائیں پہلو پر لٹا لیا جائے، پھر اپنا پاؤں اس کی گردن پر رکھا جائے۔ اس کے بعد بائیں ہاتھ سے اس کی گردن پکڑ کر دائیں ہاتھ سے چھری چلا دی جائے۔ حدیث میں ہے کہ ''جب تم کسی جانور کو ذبح کرو تو عمدہ طریقہ سے ذبح کرو، اپنی چھری کو اچھی طرح تیز کر لو تاکہ ذبح کرتے وقت جانور کو آرام پہنچے۔'' [صحیح مسلم، الذبائح:۱۹۵۵]

☆ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چھری ذبیحہ کے سامنے تیز نہ کی جائے اور نہ ہی ایک جانور کے سامنے دوسرے جانور کو ذبح کیا جائے اور نہ ہی کسی جانور کو گھسیٹ کر ذبح کرنے کی جگہ پر لے جایا جائے۔ [شرح نووی، ص:۱۰۷، ج۱۳]

☆ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذبح کرتے وقت اپنا قدم جانور کی گردن پر رکھتے تھے اور (بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ) کہہ کر ذبح کرتے تھے۔

[صحیح بخاری، الاضاحی:۵۵۶۵]

☆ بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ کہتے وقت اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنِّیْ کے الفاظ سے دعا کرنا بھی مستحب ہے۔ [صحیح مسلم، الاضاحی:۵۰۹۱]

☆ قربانی کرنے والے کو چاہیے کہ خود اپنے ہاتھ سے ذبح کرے۔ [صحیح بخاری، الاضاحی:۵۵۶۴]

☆ قربانی کرتے وقت کسی دوسرے شخص سے تعاون بھی لیا جا سکتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قربانی ذبح کرتے

وقت کسی شخص کو کہا تھا کہ قربانی ذبح کرنے میں میری اعانت کرو اس شخص نے آپ کی اعانت کی۔ [الفتح الربانی،ص:۶۵،ج۱۳]

☆ ذبح کرنے کے بعد جانور کی گردن مروڑ کر اس کا منکا نہ توڑا جائے اور نہ ہی چھری کی نوک کو گردن کی ہڈی میں موجود حرام مغز میں مارا جائے، ایسا کرنے پر جانور حلال کرنے کا مقصد پورا نہیں ہوتا، بلکہ اس کا خون باہر نکلنے کے بجائے اندر ہی رک جاتا ہے جو صحت کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔

☆ جانور کو ٹھنڈا کرنے میں جلدی نہ کی جائے، جب تک مکمل طور پر ساکت نہ ہو جائے اس کی کھال اتارنے کا آغاز نہ کیا جائے۔ واضح رہے کہ جانور کے زندہ وزن کا تقریباً بارہواں خون ہوتا ہے جسے ذبح کے وقت اور اس کے بعد باہر خارج ہونا چاہیے۔ کیونکہ ہمارا انسانی معدہ خون ہضم نہیں کر سکتا، اس معدہ میں خون کی لحمیات ہضم کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، لہٰذا خون کے نکلنے کے بعد اس کی کھال اتاری جائے اور گوشت کاٹا جائے۔ [واللہ اعلم]

سوال قربانی کا جانور ذبح کرنے کے بجائے اس کی قیمت کو متاثرین زلزلہ کے لئے جمع کرنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟ قرآن و حدیث سے اس کی وضاحت کریں۔

جواب دس ذوالحجہ کو قربانی کرنا اللہ کے شعائر سے ہے اور سنت ابراہیم علیہ السلام کو تازہ کرنا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی سنت اور سنت المسلمین قرار دیا ہے۔ آپ نے اس سنت پر ہمیشہ عمل کیا ہے۔ قربانی کے شدید اہتمام کا اس امر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے حج کی قربانی کے لئے سو اونٹ ذبح کئے۔ اس کے ساتھ آپ نے عید الاضحیٰ کی قربانی بھی کی اور ازواج مطہرات کی طرف سے ایک گائے ذبح کرنے کا اہتمام فرمایا۔ آپ نے امت کو تاکید فرمائی کہ مسلمانوں کا ہر گھرانہ ہر سال قربانی کرے۔ استطاعت کے باوجود قربانی نہ کرنے والے پر شدید ناراضی کا اظہار فرمایا۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قربانی کا بہت اہتمام کرتے تھے اور قربانی کے جانور پر محنت کر کے اسے خوب موٹا کرتے تھے حتیٰ کہ انہوں نے سفر کی حالت میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ اس سنت کو ادا کیا ہے اور اس بات کا بھی ہمیں علم ہے کہ امت مسلمہ بعض اوقات بڑے کٹھن حالات سے دو چار رہی۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر آپ نے تعاون کے لئے خصوصی مہم چلائی اور اس کے لیے برملا اعلان فرمایا قبیلۂ مضر کے مفلوک الحال لوگ خستہ حالت میں مدینہ طیبہ تشریف لائے، آپ نے ان کے تعاون کے لئے منبر پر بیٹھ کر خطبہ دیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ کیا، لیکن کسی وقت بھی ایسا نہیں ہوا کہ قربانی کا جانور ذبح کرنے کے بجائے اس کی قیمت رفاہی کاموں اور فاقہ زدہ لوگوں پر خرچ کی گئی ہو۔ بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قربانی کی سنت کو زندہ رکھتے ہوئے غرباء و مساکین کے ساتھ بھرپور تعاون کیا ہے۔ ہمیں بھی اس سنت کو تازہ رکھتے ہوئے متاثرین زلزلہ کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ بلکہ قربانی کے جانور خرید کر زلزلہ زدگان میں تقسیم کرنے چاہیے۔ اس سلسلہ میں مختلف تحریکوں کی طرف سے اعلانات شائع ہو رہے ہیں لیکن انہیں قربانی کی رقم دینے کے بجائے قربانی کے جانور لے کر دیئے جائیں، بلکہ خود وہاں جا کر قربانی کے جانور ذبح کر کے کھلے آسمان تلے یا خیمہ بستیوں میں رہنے والوں کو ان کا گوشت دیا جائے، ہمارے نزدیک یہ کسی صورت میں جائز نہیں ہے کہ قربانی ذبح کرنے کے بجائے اس کی قیمت اس فنڈ میں جمع کرا دی جائے، جو متاثرین زلزلہ کے لئے ہے ان کے ساتھ اپنی گرہ سے بھرپور

تعاون کیا جائے اور قربانی دینے کی سنت کو بھی زندہ رکھا جائے۔ [واللہ اعلم]

سوال کیا قربانی کے حصہ داروں میں گوشت تقسیم کرتے وقت کمی بیشی سود کے زمرے میں آتی ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب قربانی کے شرکاء قربانی میں برابر کے شریک ہوتے ہیں، انہیں پورا پورا حصہ کے مطابق گوشت دینا چاہیے۔ لیکن اگر نادانستہ طور پر تقسیم کرتے وقت کمی بیشی ہو جائے تو اسے سود قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے، شرکاء کو چاہیے کہ وہ اس سلسلہ میں زیادہ باریک بینی کا مظاہرہ نہ کریں۔ بہرحال عملاً گوشت تقسیم کرتے وقت کمی بیشی نہیں کرنا چاہیے۔ اگر سہواً ایسا ہو جائے تو قطعی طور پر یہ سود نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال امام مسجد کن کن حالات میں قربانی کی کھالیں اپنے ذاتی مصرف میں لا سکتا ہے؟

جواب امام مسجد اگر مسکین ہے تو اس حیثیت سے بقدر حصہ اسے چرمہائے قربانی سے کچھ دیا جا سکتا ہے، تاکہ دوسرے فقراء ومساکین محروم نہ رہیں۔ ایسے حالات میں وہ قربانی کی کھالیں اپنے مصرف میں لا سکتا ہے لیکن امامت کا عوض یا حق الخدمت سمجھ کر قربانی کی کھالیں امام مسجد کو نہیں دی جا سکتیں کیونکہ عوض کے طور پر کسی کو قربانی کی کھال دینا منع ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو واضح حکم دیا تھا کہ ''قصاب کو ان کھالوں سے کچھ نہ دیا جائے۔'' [صحیح بخاری، الحج:۱۷۱۶]

لہٰذا امام مسجد اگر محتاج و مستحق ہے تو قربانی کی کھالوں سے بقدر حصہ اسے دیا جا سکتا ہے۔ اہل مسجد کی طرف سے تمام کھالیں اس کے سپرد کر دینا تاکہ وہ انہیں اپنے مصرف میں لے آئے، کسی صورت میں درست نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنے سے دوسرے مستحقین محروم رہتے ہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال ہماری مسجد میں شہری بچے ناظرہ قرآن کی تعلیم حاصل کرتے ہیں کیا ہم اپنی مسجد کے امام کو قربانی کی کھالوں سے تنخواہ دے سکتے ہیں؟

جواب چرمہائے قربانی کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا کہ قربانی کا گوشت اور اس کا چمڑا سب مساکین میں تقسیم کر دو اور قصاب کو بطور مزدوری ان میں سے کچھ نہ دو۔ [صحیح مسلم، الحج:۱۳۱۷]

اس فرمان نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کی کھالوں کے حقدار صرف غرباء اور مساکین ہیں اور یہ حق انہی ناداروں اور غریبوں کو ملنا چاہیے۔ امام مسجد قطعاً ان کھالوں کا حقدار نہیں ہے۔ ہاں، اگر مقامی جماعت انتہائی کمزور ہے یا خود امام غریب اور نادار ہے تو اس صورت میں قربانی کی کھالیں امام مسجد کو بقدر ضرورت دی جا سکتی ہیں یا ایسی مفلوک الحال جماعت انہیں فروخت کر کے اس مدرسے کے امام مسجد کی تنخواہ پوری کر سکتی ہے، تاہم بہتر یہی ہے کہ اہل مسجد جس طرح اپنی دیگر ضروریات زندگی کو پورا کرتے ہیں۔ امام مسجد کی تنخواہ کو بھی اپنی ان ضروریات کی فہرست میں شامل کریں۔ مسجد کا امام مسجد کی ایک ضرورت ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنا اہل مسجد کی ذمہ داری ہے۔ قربانی کی کھالوں سے اس کی تنخواہ ادا کرنے سے گھر کی چیز گھر ہی رہ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ مقامی بچوں کی تعلیم پر بھی قربانی کی کھالوں کو خرچ نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے ہاں جو سیاسی جماعتیں ہیں وہ بھی ان کی حقدار نہیں ہیں۔ جہادی تحریکوں سے بھی ہوشیار رہنا چاہیے۔ قربانی کی کھالیں صرف غرباء و مساکین اور بیواؤں کا حق ہے۔ مقامی طلباء اور مساجد

سیاسی جماعتیں، جہادی تنظیمیں ان کی حقدار نہیں ہیں۔ صورت مسئولہ میں امام مسجد پر صرف اس صورت میں قربانی کی کھالیں خرچ کی جاسکتی ہیں کہ مقامی جماعت انتہائی کمزور اور امام مسجد کی تنخواہ اتنی کم ہو کہ امام مسجد اس سے گزر اوقات نہیں کرسکتا اور اس کا اور کوئی ذریعہ معاش بھی نہیں ہے تو اسے دیگر غرباء و مساکین کی طرح بقدر حصہ دی جاسکتی ہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ مقامی غرباء و مساکین کو نظر انداز کر کے خود تمام کھالوں پر قبضہ کرے۔ [واللہ اعلم]

سوال آپ نے عید نمبر اہلحدیث میں عورت کے متعلق لکھا ہے کہ وہ خود قربانی کرسکتی ہے، اس سلسلہ میں آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے متعلق ذکر کیا ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو قربانی کرنے کا حکم دیا کرتے تھے، بخاری کا حوالہ دیا گیا ہے لیکن تلاش بسیار کے باوجود مجھے بخاری سے یہ روایت نہیں ملی، براہ کرم نشاندہی کردیں؟

جواب اس روایت کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے معلق طور پر ذکر کیا ہے۔ (صحیح بخاری، الاضاحی: ۵۵۵۹ سے پہلے) اس معلق روایت کے متعلق حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس روایت کو امام حاکم نے اپنی مستدرک میں سعید بن مسیّب کے طریق سے موصولاً بیان کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ ''حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اپنی بیٹیوں کو کہا کرتے تھے کہ اٹھو اور اپنی قربانیوں کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کرو۔'' اس کی سند بھی صحیح ہے۔ [فتح الباری: ۱۰/۲۵]

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ عورت اپنی قربانی کو خود ذبح کرسکتی ہے بشرطیکہ وہ اچھی طرح ذبح کرسکتی ہو اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ [عمدۃ القاری: ۱۴/۵۶۲]

سوال خرگوش کے حلال ہونے پر قرآن و حدیث سے کوئی صریح ثبوت ملتا ہے؟

جواب دین اسلام میں حرام چیزوں کی نشاندہی کردی گئی ہے اور اس کے اصول بتا دیئے گئے ہیں۔ جن کے تحت خرگوش حرام اشیاء کے ضمن میں نہیں آتا۔ خرگوش حلال ہے کیونکہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس ایک دفعہ خرگوش لایا گیا آپ نے اسے ذبح کیا اور کچھ گوشت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے آپ کے گھر بھیجا آپ نے اسے تناول فرمایا۔ [صحیح بخاری، کتاب الصید: ۵۵۳۵]

جن روایات میں اس کے خون کی وجہ سے اسے نہ کھانے کا ذکر ہے وہ صحیح نہیں ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ مذکورہ حدیث سے خرگوش کا گوشت کھانے کا جواز فراہم ہوتا ہے۔ تمام علما کا بھی یہی فتویٰ ہے، البتہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف سے اس کی کراہت منقول ہے۔ [فتح الباری: ۹/۶۶۲]

اس لئے خرگوش کے حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ شیعہ حضرات کے کہنے سے اس کے متعلق اندیشائے دور دراز میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک خاتون بذریعہ ای میل سوال کرتی ہے کہ اپنی قربانی کا جانور عورت خود ذبح کرسکتی ہے یا نہیں؟

جواب عورت کے متعلق قربانی کا جانور ذبح کرنے کے بارے کتب حدیث میں کوئی ممانعت مروی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی کراہت منقول ہے، بلکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ''عورت کے ذبح کرنے کا بیان۔'' پھر اس کے جواز پر حدیث لائے ہیں کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی ایک لونڈی بکریاں چرایا کرتی تھیں،

ہنگامی طور پر اس نے ایک تیز دھار پتھر سے بکری ذبح کر دی تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے ذبیحہ کو استعمال کرنے کی اجازت دی۔ [صحیح بخاری، الذبائح: ۵۵۰۵]

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اپنی بیٹیوں کو قربانی کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ [صحیح بخاری، الاضاحی تعلیقا، باب: ۱۰]

لہٰذا عورت کے لئے قربانی کا جانور ذبح کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے، یہ مسئلہ لوگوں کے ہاں غلط طور پر مشہور ہو چکا ہے اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ذبح شدہ جانور کے پیٹ سے برآمد ہونے والے بچے کا شرعاً کیا حکم ہے، کیا اسے کھایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس کی کتاب وسنت سے وضاحت کریں۔

جواب اگر ذبح شدہ جانور کو ذبح کرنے کے بعد اس کے پیٹ سے مردہ بچہ بھی برآمد ہو تو اس کا کھانا حلال ہے، کیونکہ حدیث کے مطابق اس کی ماں کا ذبح بچے کے لئے کافی ہے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم لوگ اونٹنی، گائے اور بکری کو ذبح کرتے ہیں ان کے پیٹ سے بچہ برآمد ہوتا ہے، کیا ہم اسے پھینک دیں یا کھا لیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر پسند کرو تو اسے کھا لو کیونکہ اس کا ذبح کرنا، اس کی ماں کا ذبح کرنا ہے۔'' [ابوداود، الاضاحی: ۲۸۴۲]

لیکن اس بچے کا کھانا ضروری نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اگر چاہو تو اسے کھا لو۔'' ہاں، اگر پیٹ سے زندہ بچہ برآمد ہو تو اس کا ذبح کرنا ضروری ہے کیونکہ وہ مستقل ایک جان ہے، جیسا کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ ''اگر وہ زندہ نکلے تو اس کا ذبح کرنا ضروری ہے کیونکہ وہ ایک مستقل جان رکھتا ہے۔'' [مغنی لابن قدامہ، ص: ۳۱۰، ج ۱۳]

اگر مردہ ہے تو وہ حلال ہے اگر دل چاہے تو اس کو کھانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال اوجڑی کے متعلق ہماری شریعت میں کیا ہدایات ہیں یہ حلال ہے یا نہیں، ہمارے ہاں اس میں اختلاف ہے براہِ کرم کتاب وسنت کی روشنی میں ہماری راہنمائی فرمائیں؟

جواب اللہ تعالیٰ نے جو جانور انسانوں کے لئے حلال قرار دیئے ہیں ان کے تمام اجزاء حلال اور جائز ہیں۔ ہاں، اگر اللہ تعالیٰ نے خود کسی چیز کو بندوں پر حرام کر دیا ہو تو الگ بات ہے، جیسا کہ حلال جانور کو ذبح کرتے وقت اس کی رگوں سے تیزی کے ساتھ بہنے والے خون کو قرآن مجید میں حرام کیا گیا ہے اسے ''دم مسفوح'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ حلال جانور کی کوئی چیز حرام نہیں ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر حلال جانور کا ہر جزو کھانا فرض ہے۔ اگر کسی حصے کے متعلق دل نہیں چاہتا تو یہ اس کی مرضی ہے، تاہم اسے حرام کہنا صحیح نہیں ہے۔ اس وضاحت کے پیش نظر حلال جانور کی اوجڑی بھی حلال ہے اور اسے عام حالات میں کھانا جائز اور مباح ہے۔ شرعی طور پر اس میں حرمت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں ایک روایت پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حلال جانور کے فلاں فلاں عضو کو مکروہ خیال کرتے تھے۔ یہ روایات صحیح نہیں ہیں جس کی وضاحت ہم نے اہلحدیث مجریہ یکم نومبر 2003ء میں کی ہے۔ دراصل احناف کے نزدیک حلال جانور کا بول و براز پلید ہے چونکہ اوجڑی حلال جانور کے براز کا محل ہے، اس لئے یہ حضرات اسے مکروہ قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہ مفروضہ بھی محل نظر ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا موقف ہے کہ جن جانوروں کا

گوشت کھایا جاتا ہے ان کا بول و براز نجس نہیں ہے۔آپ نے اس کے متعلق کئی ایک دلائل پیش فرمائے ہیں۔ان دلائل کا تقاضا ہے کہ جن حیوانات کا گوشت کھایا جاتا ہے ان کا بول و براز نجس نہیں ہے اور نہ ہی اوجڑی اس کا محل ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے۔یہ حلال جانور کا حصہ ہے۔اسے اچھی طرح دھو کر صاف کر کے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ایسے اگر کسی کا دل نہ چاہے تو اسے کھانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ [واللہ اعلم]

سوال اگر قربانی کا جانور خریدنے کے بعد اس میں عیب پڑ جائے تو اسے ذبح کیا جاسکتا ہے یا اس کی جگہ کوئی صحیح وسالم جانور خریدنا ہوگا؟

جواب احادیث میں قربانی کے جانور کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ معمول بیان ہوا ہے کہ اسے ذبح کرتے وقت ان عیوب کو دیکھتے تھے، جو قربانی کے لئے رکاوٹ کا باعث ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر خریدنے کے بعد ذبح کرنے سے پہلے قربانی کے جانور میں کوئی عیب پڑ جائے تو وہ قربانی کے قابل نہیں رہتا اسے تبدیل کرنا چاہیے۔یہ ایسے ہے جیسے قربانی کے جانور کو قبل از وقت ذبح کر دیا جائے، چنانچہ حدیث میں بیان ہے کہ حضرت ابو بردہ بن نیار رضی اللہ عنہ نے عید سے پہلے قربانی کا جانور ذبح کر دیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''یہ عام گوشت ہے اس کے بدلے کوئی اور جانور ذبح کیا جائے۔''

[صحیح بخاری، الاضاحی: ۵۵۶۰]

خریدنے کے بعد عیب پڑنے کی صورت میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس جانور کو قربانی کے طور پر ذبح کر دینے کا فتویٰ دیتے ہیں اور دلیل میں یہ حدیث پیش کرتے ہے کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے قربانی کے لئے ایک دنبہ خریدا، لیکن ذبح سے پہلے اس کی چکی ایک بھیڑیا لے گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں وہی جانور ذبح کرنے کی اجازت فرمائی۔ [مسند امام احمد: ۳/۷۸]

لیکن ایک تو یہ حدیث اس قابل نہیں کہ اسے بطور صحت پیش کیا جائے، کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی جابر جعفی ہے جو محدثین کے ہاں انتہائی مجروح اور ناقابل اعتبار ہے، نیز اس کی سند میں ایک دوسرا محمد بن قرظہ جو جابر جعفی کا استاد ہے، کتب جرح میں اسے مجہول قرار دیا گیا ہے۔ [خلاصہ تہذیب الکمال، صفحہ نمبر: ۳۵۶]

دوسری بات یہ ہے کہ دنبے کی چکی کا نہ ہونا کوئی ایسا عیب نہیں ہے جو قربانی کے لئے رکاوٹ کا باعث ہو۔یہ ایسے ہے کہ اگر قربانی کے جانور کا دانت ٹوٹ جائے تو اسے قربانی کے طور پر ذبح کیا جاسکتا ہے۔حاصل یہ ہے کہ قربانی کا جانور نامزد کرنے کے بعد اگر اس میں عیب پڑ جائے تو اس کے بدلے دوسرا جانور ذبح کرنا چاہیے۔اگر قربانی کی استطاعت نہیں تو اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے ہیں۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ہمارے ہاں عام طور پر ایک سال یا چھ ماہ کا چھترا قربانی کے لئے ذبح کر دیا جاتا ہے، قرآن وحدیث کے لحاظ سے اس کی وضاحت فرمائیں؟

جواب قربانی کے جانور کے لیے ضروری ہے کہ وہ دو دانتہ ہو اس کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں ہے کیونکہ علاقائی آب وہوا کی وجہ سے اس کے دو دانتہ ہونے کی عمر میں کمی بیشی ہوسکتی ہے، اگر دو دانتہ نہ ملے تو ایک سال کا دنبہ یا چھترا ذبح کیا جاسکتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ قربانی کے لئے تم دو دانتہ جانور ذبح کرو اگر ایسا جانور میسر نہ ہو تو اس کے بجائے ایک سال کا مینڈھا ذبح کر دو۔

[صحیح مسلم، الاضاحی: ۱۹۶۳]

دو دانتہ جانور نہ ملنے کی دو صورتیں ہیں:

① قربانی کے لئے دو دانتہ جانور عام دستیاب ہو لیکن صارف کی قوت خرید سے بالاتر ہو۔

② قربانی دینے والے کے پاس قوت خرید تو ہے لیکن مارکیٹ میں مطلوبہ جانور بسہولت دستیاب نہیں ہے۔

اگر مذکورہ بالا صورتوں میں کوئی صورت سامنے آ جائے تو ایک سال کا مینڈھا ذبح کیا جا سکتا ہے، جن احادیث میں یک سالہ مینڈھا ذبح کرنے کی اجازت منقول ہے، انہیں مذکورہ بالا دو صورتوں میں سے کسی ایک پر محمول کیا جائے گا۔ [واللہ اعلم]

سوال حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ہم نے ایک بڑی قربانی بطور فدیہ دے کر اسے چھڑا لیا۔''

[۳۷/الصافات: ۱۰۷]

اس بڑی قربانی سے کیا مراد ہے؟ بعض لوگ اس سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی قربانی مراد لیتے ہیں وضاحت فرمائیں؟

جواب حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے متعلق متعدد اسرائیلی روایات بیان کی جاتی ہیں، حالانکہ قرآن کریم کے بیان کے بعد کسی روایت کی ضرورت نہیں رہتی، چنانچہ اس واقعہ کو ایک ''نمایاں کارنامہ'' کٹھن امتحان کے طور پر بیان کیا ہے اور ذبح عظیم کا بطور فدیہ ذکر کیا ہے، البتہ حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ ذبح عظیم سے مراد ایک مینڈھا تھا۔

[البدایہ والنہایہ ص: ۱۴۹، ج ۱]

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے جس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے، اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آواز دی گئی کہ آپ نے اپنا خواب سچا کر دکھایا ہے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک سفید رنگ کا سینگوں اور سرگیں آنکھوں والا مینڈھا ذبح ہوا پڑا ہے۔ [مسند امام احمد، ص: ۲۹۷، ج ۱]

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم بھی قربانی کے لئے مینڈھوں کی یہی قسم تلاش کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ ایک طویل روایت ہے جس سے محدثین کرام نے کئی ایک مسائل کو مستنبط کیا ہے، ہمارے نزدیک ذبح عظیم سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ مراد لینا ایک خاص مکتب فکر کے حاملین کا کشید کردہ مسئلہ ہے۔ احادیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے اس کے خلاف واقعہ ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ولادت اور شہادت سے ہزاروں سال پہلے ذبح عظیم کا واقعہ ہو چکا تھا۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک شخص کی دو لڑکیاں، ایک لڑکا، دو بھائی اور ایک بہن ہے ان میں سے کسی کا عقیقہ نہیں ہوا۔ کیونکہ عقیقہ کے وقت مالی حالات درست نہ تھے اب حالات بہتر ہوئے ہیں اور عقیقہ کرنا چاہتے ہیں، کیا ایک گائے سے ان سب کا عقیقہ کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں ہماری راہنمائی فرمائیں۔

جواب واضح رہے کہ شریعت اسلامیہ میں عقیقہ کی بہت اہمیت ہے کہ استطاعت کے ہوتے ہوئے اگر عقیقہ نہ کیا جائے تو اولاد کے نیک اعمال میں اس کا والد شریک نہیں ہو سکے گا۔ حدیث میں بیان ہے کہ ہر بچہ اپنے عقیقہ کے بدلے اللہ کے ہاں گروی ہے،

یعنی عقیقہ کے بعد ہی گروی سے آزادی ہوگی، اس لئے شریعت نے بچے یا بچی کی پیدائش کے ساتویں دن عقیقہ کرنے کی تاکید کی ہے بچے کی طرف سے دو بکرے یا چھترے اور بچی کی طرف سے ایک بکرا یا چھترا بطور عقیقہ دینا ہوگا۔ تنگی حالات کے پیش نظر بچے کی طرف سے ایک جانور بھی دیا جاسکتا ہے۔ اگر ساتویں دن عقیقہ کرنے کی گنجائش نہ ہو تو زندگی میں کسی وقت بھی بطور صدقہ جانور ذبح کئے جاسکتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔ ''اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔'' [۲/البقرہ:۲۸۶]

اس آیت کے پیش نظر اگر عقیقہ کے وقت حالات سازگار نہیں تھے تو عقیقہ نہ کرنے پر اللہ کے ہاں باز پرس نہیں ہوگی۔ لیکن گائے اور بیل وغیرہ سے متعدد بیٹوں، بیٹیوں، بہنوں اور بھائیوں کی طرف سے عقیقہ کرنا شرعاً درست نہیں ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں بکرے اور چھترے کے علاوہ کسی دوسرے جانور کو عقیقہ کے لئے ذبح کرنا مستحسن نہیں ہے۔ اس لئے اگر اللہ نے توفیق دی ہے بیٹوں اور بھائیوں کی طرف سے دو، دو اور بہنوں، بیٹیوں کی طرف سے ایک ایک جانور ذبح کیا جائے۔ [واللہ اعلم]

سوال اہل حدیث حضرات بھینس کا حلال ہونا قیامت تک قرآن و حدیث سے ثابت نہیں کر سکتے، ہاں اگر فقہ حنفی کو تسلیم کر لیا جائے تو مسئلہ بآسانی حل ہوسکتا ہے؟

جواب فقہ حنفی منزل من اللہ نہیں ہے جس کا اتباع ضروری ہو اگر ایسا ہوتا تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردان رشید امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما امام صاحب کی 1/3 حصے سے مخالفت نہ کرتے، مثلاً: امام صاحب کے نزدیک بٹائی پر زمین لے کر کاشت کرنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح نومولود کا عقیقہ کرنا بھی ان کے نزدیک غیر مشروع ہے، جبکہ صاحبین نے اپنے امام کی مخالفت کرتے ہوئے ان کے جواز استحباب کا فتویٰ دیا ہے۔ قرآن کریم نے اس امت کو ''ما انزل'' کی اتباع کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''لوگو! جو کچھ تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو، اس کے علاوہ دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔'' [۷/الاعراف:۳]

اللہ تعالیٰ نے بطور شریعت دو ہی چیزیں نازل کی ہیں۔ ایک قرآن اور دوسرا اس کا بیان، یعنی احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ''ما انزل'' میں بھینس کی حلت اس طرح ہے کہ اس میں ان چیزوں کی نشاندہی کر دی گئی ہے جو حرام ہیں، مثلاً: جانوروں میں سے وہ حرام ہیں جو نیش دار، یعنی کچلی والے ہیں اور پرندوں میں وہ حرام ہیں جو چنگال دار، یعنی پنجے سے شکار کرتے ہیں اور پنجے ہی سے پکڑ کر کھاتے ہیں، بعض حرام جانوروں یا پرندوں کا نام بھی لیا ہے، مثلاً: گھریلو گدھا، کتا اور کوا وغیرہ۔ اسی طرح وہ جانور بھی حرام ہیں جنہیں مارنے کا حکم ہے، مثلاً: چھپکلی وغیرہ یا جنہیں مارنے سے منع کیا گیا ہے، مثلاً: بلی اور مینڈک وغیرہ، ان کے علاوہ جتنے بھی جانور یا پرندے ہیں، سب حلال ہیں۔ بھینس ان حرام جانور کی فہرست میں کسی طرح بھی داخل نہیں ہے۔ اس بنا پر اس کے حلال ہونے میں کیا شبہ ہے، اس لئے ہمیں مذعومہ فقہ حنفیہ کا سہارا لینے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر شریعت کی نظر میں فقہ حنفی کی اتنی ہی قدر و قیمت ہے تو حجۃ الوداع کے موقع پر تکمیل دین کا اعلان چہ معنی دارد۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے اسی (80) سال بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اگر فقہ حنفی کا وہی مقام ہے جس کے لئے اس قدر زور صرف کیا جا رہا ہے تو اسی (80) سال تک دین نامکمل رہا۔ جسے فقہ حنفی نے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ نعوذ باللہ اس فکر کو تسلیم کر لینے سے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ بہر حال ہمارا

یہ دعویٰ ہے کہ قرآن کریم اور حدیث ایک مکمل شریعت ہے جس کی تکمیل رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں ہوئی۔ اسے کسی قسم کی پیوندکاری کی ضرورت نہیں ہے اور یہ مکمل دین قیامت تک کے لئے ہے۔ ہمارے نزدیک دین اور شریعت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے جس کا نصاً یا اشارۃً اقتضائے قرآن وحدیث میں ذکر نہ ہو۔ اگر کوئی ہے تو اسے پیش کیا جائے۔ دیدہ وباید [واللہ اعلم]

سوال عقیقہ کے متعلق مندرجہ ذیل سوالات کے جواب درکار ہیں۔

☆ کیا عقیقہ کا جانور دودانتہ ہونا ضروری ہے اگر گائے وغیرہ کا عقیقہ دینا ہو تو کیا اس میں سات حصے ہو سکتے ہیں؟

☆ اس کا گوشت محلے میں تقسیم کرنا چاہیے یا اسے کسی دینی مدرسہ میں بھیج دیا جائے؟

جواب عقیقہ کے متعلق حدیث میں ہے کہ لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کی جائے۔

[ابوداؤد، الاضاحی: ۲۸۳۴]

لفظ شاتین کے مطلق طور پر ذکر سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ عقیقہ کے جانور میں وہ شرائط عائد نہیں کی جائیں گی جو قربانی کے جانور میں ہیں اور یہی بات برحق ہے۔ [نیل الاوطار، ص: ۱۰۵ ج ۳]

علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری لکھتے ہیں کہ کسی بھی صحیح حدیث سے عقیقہ کے جانور میں قربانی کی شرائط عائد کرنا ثابت نہیں ہوتا، بلکہ کسی ضعیف حدیث سے بھی ان شرائط کا ثبوت نہیں ملتا جو حضرات شرائط لگاتے ہیں ان کے پاس قیاس کے علاوہ اور کوئی دلیل نہیں ہے۔ [تحفۃ الاحوذی، ص: ۹۹، ج ۵]

البتہ ایک روایت میں شَاتَانِ مُكَافِئَتَانِ کے الفاظ ہیں جو ہم عمر دو بکریوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

[امام احمد، ص: ۳۸۱، ج ۶]

یہ شرط اس بات کی متقاضی ہے کہ شریعت کو عقیقہ میں ایسا جانور مطلوب ہے جو نقائص وعیوب سے پاک ہو۔

[مغنی لابن قدامہ، ص: ۳۹۹، ج ۱۳]

گائے کو عقیقہ کے طور پر ذبح کرنے کے متعلق درج ذیل حدیث پیش کی جاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''نومولود کی طرف سے اونٹ، گائے اور بکری وغیرہ کا عقیقہ دیا جائے۔'' [المعجم الصغیر، ص: ۴۵]

لیکن یہ روایت موضوع ہے کیونکہ اس میں مسعدہ بن یسع راوی کذاب ہے۔ [مجمع الزوائد، ص: ۵۸، ج ۴]

نیز یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث کے بھی خلاف ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کے گھر بچہ پیدا ہوا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو کسی نے کہا کہ عقیقہ کے لئے اونٹ ذبح کیا جائے تو آپ نے فرمایا: ''معاذ اللہ! ہم تو وہی کریں گے جو ہمیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہم عمر دو بکریاں ذبح کی جائیں۔'' [بیہقی، ص: ۳۰۱، ج ۹]

زیادہ سے زیادہ گائے کا عقیقہ جائز تو ہو سکتا ہے، لیکن اس میں سات حصوں والی بات صحیح نہیں ہے، اس کا گوشت مدرسہ میں بھی بھیجا جا سکتا ہے، لیکن بہتر ہے کہ اسے پڑوسیوں، رشتہ داروں، دوست واحباب میں تقسیم کیا جائے یا پھر گھر میں دعوت کا اہتمام کر کے اپنے پڑوسیوں، رشتہ داروں اور طلباء کو اس خوشی میں شامل کیا جائے خود بھی اس سے کھایا جا سکتا ہے۔ ائمہ ثلاثہ امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کا یہی موقف ہے۔ [الفتح الربانی، ص: ۱۳۲، ج ۱۳]

زینت و لباس

سوال پاکستانی معاشرے کے مخصوص حالات اور دیہاتی طرز زندگی کے پیش نظر شرعی پردہ کیسے نافذ کیا جائے، کیا مخصوص حالات وظروف کی وجہ سے اس میں کوئی نرمی کی جاسکتی ہے؟

جواب پردہ کے متعلق قرآن وحدیث میں واضح احکام موجود ہیں۔ان پر عمل کرنے سے ہی موجودہ بے حیائی کے سیلاب کو روکا جاسکتا ہے۔امہات المؤمنین اور دیگر صحابیات کا نمونہ ہمارے سامنے ہے، انہوں نے مشکل سے مشکل حالات میں بھی اس پر عمل کیا ہے۔حضرت اسماء رضی اللہ عنہا اپنے گھوڑوں کی خوراک لانے کے لئے گھر سے باہر جاتیں۔آپ مکمل پردہ سے باہر نکلا کرتی تھیں، اس کے احکام پر عمل کرنے کے لئے دیہاتی یا شہری ماحول کی تفریق درست نہیں ہے اور نہ ہی اس پر مخصوص حالات یا خاص طرز زندگی اثر انداز ہونی چاہیے اور نہ ہی احوال وظروف کی وجہ سے ان میں نرمی کو روا رکھا جاسکتا ہے۔کسی انتہائی مجبوری کے وقت، مثلاً: بیماری یا حادثہ کی صورت میں غیر محرم کے سامنے چہرہ کھولا جاسکتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال کیا عورت ایسا لباس پہن سکتی ہے جو آگے پیچھے یا دائیں یا بائیں جانب کھلا ہوا ہو اور چلتے وقت بعض اوقات اس کی پنڈلی ننگی ہو جاتی ہو، ہمارے معاشرے میں اس قسم کا لباس بطور فیشن عام ہوتا جارہا ہے۔قرآن وحدیث کی رو سے اس کی وضاحت درکار ہے؟

جواب عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ کامل شرم وحیا کا مظاہرہ کرے اور ایسا لباس استعمال کرے جو اس کا تمام بدن ڈھانپ لے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں خواتین ایسی قمیص پہنتی تھیں جو پاؤں کی طرف سے ٹخنوں تک اور ہاتھوں کی طرف سے ہتھیلیوں تک ہوتی تھی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لباس کے متعلق بہت سخت وعید سنائی ہے آپ نے فرمایا: ''اہل جہنم کی دو اقسام ایسی ہیں کہ جنہیں میں نے ابھی تک نہیں دیکھا ہے ایک وہ لوگ جن کے پاس گائے کی دموں جیسے کوڑے ہوں گے جن کے ساتھ وہ لوگوں کو زدوکوب کریں گے۔دوسرے ایسی عورتیں جنہوں نے لباس تو پہنا ہوگا لیکن اس کے باوجود وہ ننگی ہوں گی دوسروں کی طرف از خود مائل ہونے والی اور انہیں اپنی طرف مائل کرنے والی ہوں گی۔ان کے سر بختی اونٹوں کی کوہان جیسے ہوں گے۔وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گی اور نہ ہی اس کی خوشبو پاسکیں گی، حالانکہ جنت کی خوشبو بہت دور دراز کی مسافت سے آتی ہوگی۔''

[صحیح مسلم، اللباس: ۲۱۲۸]

اس وعید سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ عورت ایسا لباس زیب تن کرے جو اس کے تمام جسم کو ڈھانپ لے، نیز باریک اور چست لباس سے پرہیز کرے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہم لیڈیز ٹیلرنگ کا کام کرتے ہیں۔ہمارے ہاں مختلف قسم کی عورتیں آتی ہیں، کچھ عورتیں ماپ کے لئے اپنے کپڑے لے کر آتی ہیں اور کچھ عورتیں کپڑوں کے بجائے اپنے جسم کا ماپ دیتی ہیں۔ہمیں کسی نے بتایا ہے کہ عورت غیر مرد کو جسم کا ماپ نہیں دے سکتی اور نہ ہی غیر مرد عورتوں کے کپڑے دیکھ سکتا ہے۔اس کا کہنا ہے کہ یہ کام حرام ہے مسئلہ کی وضاحت فرمادیں؟

جواب لباس انسانی فطرت کا ایک اہم مطالبہ ہے۔قرآن کریم نے اس کی غرض وغایت بایں الفاظ بیان کی ہے ''کہ تمہارے جسم کے قابل شرم کو ڈھانکتا ہے اور تمہارے لئے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہے۔'' [۷/الاعراف:۲۶]

یعنی لباس انسان کی ستر پوشی جسم کی حفاظت اور اس کے لئے باعث زینت ہے۔آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لئے لباس کی اخلاقی ضرورت ''ستر پوشی'' اس کی طبعی ضرورت ''حفاظت وزینت'' سے مقدم ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ لباس کا بنیادی فائدہ یہ ہے کہ وہ ستر پوشی کا فائدہ دے۔اس کے برعکس اگر لباس اتنا باریک ہے کہ اس میں جسم کی جھلک نمایاں ہو یا سلائی اتنی چست ہے کہ جسم کے پوشیدہ حصوں کے خدوخال نمایاں ہوں۔اس قسم کے لباس کو ستر پوشی نہیں کہا جاسکتا اور ایک ایمان دار درزی کے لئے ضروری ہے کہ وہ عورتوں کے ایسے تنگ لباس تیار کرنے سے پرہیز کرے جو ساتر ہونے کے بجائے ان کی عریانی کا باعث ہوں۔اس قسم کے لباس کی اجرت جائز نہیں ہے،خواہ عورتیں خود ماپ دیں یا اپنے ماپ کا کپڑا بھیج دیں۔اسی طرح عورتوں کو بھی چاہیے کہ وہ ہمیشہ ساتر لباس زیب تن کریں۔انتہائی باریک اور چست لباس سے اجتناب کریں۔مغرب اور مغرب زدہ لوگوں کی تحریک عریاں کو ناکام ونامراد بنانے کے لئے تمام مسلمان عورتیں اپنے ساتر لباس اور شرعی حجاب کی پابندی اختیار کریں۔اسلامی لباس تیار کرنے کی اجرت لی جاسکتی ہے۔لیکن عورتوں کے جسم کی خود پیائش نہ لے بلکہ یہ کام اپنی عزیزہ بہن، بیٹی، والدہ اور بیوی وغیرہ سے لیا جاسکتا ہے۔عورت کے جسم کو بلاوجہ ہاتھ لگانا حرام ہے۔بالخصوص جسم کے ان حصوں کو چھونا جو اعضائے صنفی کہلاتے ہیں اور جن سے شہوانی جذبات ابھرنے کا اندیشہ ہے اس کام کے لئے مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا ہوگا:

(الف) مردوں اور بچوں کے لباس تیار کئے جائیں۔

(ب) عورتوں کے ساتر لباس تیار کئے جاسکتے ہیں،بشرطیکہ ان کی پیائش خود نہ لی جائے ، بلکہ ان کے کپڑوں کے ماپ سے کام چلایا جائے۔

(ج) بہتر ہے کہ خواتین کسی خاتون ٹیلر کی خدمات حاصل کریں اور شرعی حدود میں رہتے ہوئے ان سے اپنے لباس تیار کرائیں۔

مختصر یہ ہے کہ لباس تیار کرتے وقت مذکورہ بالا قرآنی ہدایات کو ضرور مدنظر رکھا جائے ، کیونکہ لباس تو تقویٰ کا ہی بہتر ہے۔[واللہ اعلم]

سوال سونے کا دانت لگوانے کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے،نیز وضو کرتے وقت اس طرح کے مصنوعی دانت اتارنا ضروری ہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دیا جائے۔

جواب مردوں کے لئے سونا پہننا اور اسے بطور زینت استعمال کرنا جائز نہیں ہے،جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ''میری امت کی عورتوں کے لئے سونے اور ریشم کو حلال قرار دیا گیا ہے۔'' [نسائی،الزینۃ:۵۱۵۱]

اس حدیث کے پیش نظر مردوں کو شدید ضرورت کے بغیر سونے کا دانت لگانا جائز نہیں ہے،البتہ عورتیں اسے بطور زینت لگاسکتی ہیں اور ایسا کرنا عورتوں کے لئے اسراف نہیں ہے۔البتہ اگر کوئی مرد یا عورت جس نے سونے کا دانت لگوایا ہوا گر فوت ہو جائے تو اس دانت کو اتار لینا چاہیے،اگر اس کو اتارنے سے مسوڑا پھٹنے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں اسے باقی رہنے دیا جائے، چونکہ سونا مال ہے اور مرنے کے بعد وہ مال اس کے وارثوں کا ہو جاتا ہے،اس بنا پر اسے میت کے پاس نہیں رہنے دینا چاہیے۔وضو

کرتے وقت اس قسم کے مصنوعی دانتوں کو اتارنے کی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ وضو کرتے وقت انگوٹھی کو اتارنا واجب نہیں ہے، البتہ اسے حرکت دینا بہتر ہے۔ رسول اللہ ﷺ انگوٹھی پہنتے تھے، لیکن دوران وضو اس کا اتارنا منقول نہیں ہے، ظاہر ہے کہ دانتوں کی نسبت انگوٹھی پانی کے پہنچنے میں زیادہ رکاوٹ کا باعث ہے، بعض دانت فکس ہوتے ہیں انہیں اتارنا، پھر لگانا بہت مشکل ہوتا ہے، اس لئے وضو کرتے وقت سونے یا دیگر مصنوعی دانت اتارنے ضروری نہیں ہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے ہاں بعض عورتیں ناخن پالش کرتی ہیں اور کچھ لڑکیاں مصنوعی ناخن بھی لگالیتی ہیں، ان کے ہوتے ہوئے وضو کا کیا حکم ہے ہوگا یا نہیں؟

جواب جس عورت نے اپنے کسی عارضہ کی وجہ سے نماز نہیں پڑھنا ہے اس کے لئے جائز ہے کہ ناخن پالش یا مصنوعی ناخن استعمال کرے، اگر یہ کام کافر عورتوں کی امتیازی علامت ہے تو پھر ان سے مشابہت کی وجہ سے کسی بھی مسلمان عورت کے لئے ان کا استعمال جائز نہیں ہے۔ اگر عورت کو کوئی عارضہ لاحق نہیں ہے اور اس نے نماز وغیرہ بھی پڑھنی ہے تو ایسے حالات میں ناخن پالش یا مصنوعی ناخن کا استعمال درست نہیں ہے، کیونکہ وضو یا غسل کرتے ہوئے دونوں چیزیں جسم تک پانی پہنچنے کے لئے رکاوٹ کا باعث ہیں، ہر وہ چیز جو اعضائے وضو تک پانی کے پہنچنے میں رکاوٹ کا باعث ہو یا غسل کرنے والے کے لئے اس کا استعمال جائز نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دوران وضو چہرے اور ہاتھوں کو دھونے کا حکم دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جب تم نماز پڑھنے کا ارادہ کرو تو منہ اور ہاتھ دھولیا کرو۔'' [۵/ مائدہ:۶]

جس عورت نے ناخن پالش یا مصنوعی ناخن استعمال کیا ہے اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے ان کی موجودگی میں اپنے ہاتھوں کو دھویا ہے، اس لئے ایسی صورت میں وضو نامکمل ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال عورت کے ستر اور حجاب میں کیا فرق ہے۔ کیا چہرہ ستر میں شامل ہے یا نہیں، کیا چہرے کا پردہ ضروری ہے؟

جواب چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ عورت کا تمام جسم ستر ہے جس کا چھپانا ضروری ہے چونکہ گھر میں اکثر محرم ہوتے ہیں، اس لئے گھر میں عورت کے لئے چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ باقی جسم کا چھپانا ضروری ہے اور جب کوئی غیر محرم سامنے آئے تو چہرے اور ہاتھوں کا چھپانا بھی واجب ہے۔ ستر صرف خاوند یا مجبوری کے وقت ڈاکٹر کے سامنے کھولا جاسکتا ہے۔ اس کے بغیر کسی کے سامنے ستر کا کھولنا جائز نہیں ہے۔ حجاب ستر سے زائد ہے۔ ایک دفعہ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما باریک لباس میں ملبوس رسول اللہ ﷺ کے سامنے آئیں تو آپ نے فوراً اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور اسے تلقین فرمائی ''کہ اے اسماء! جب عورت بالغ ہو جائے تو اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ جسم کا کوئی حصہ نظر آئے مگر یہ آپ نے منہ اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ فرمایا۔''

[ابوداؤد، اللباس:۴۱۰۴]

اس حدیث میں عورت کا ستر بیان ہوا ہے کہ چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ تمام جسم ستر ہے۔ جس کا ڈھانپنا ضروری ہے۔ جب کوئی اجنبی سامنے آجائے تو چہرے اور ہاتھوں کا مستور کرنا بھی ضروری ہے، جیسا کہ واقعہ افک میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب میں قافلہ سے پیچھے رہ گئی تو اپنی جگہ پر بیٹھی رہی، اتنے میں میری آنکھ لگ گئی۔ حضرت صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ

آئے۔انہوں نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا اور مجھے دیکھ کر انہوں نے "اناللّٰہ و انا الیہ راجعون" پڑھا۔اتنے میں میری آنکھ کھل گئی تو میں نے اپنا چہرہ اپنی چادر سے ڈھانپ لیا۔ [صحیح بخاری، المغازی: ۴۱۴۱]

اس کا مطلب یہ ہے کہ صحابیات مبشرات رضی اللہ عنہن کے ہاں اجنبی لوگوں سے چہرے کا پردہ رائج تھا۔عقلی لحاظ سے بھی یہ بات واضح ہے کہ عورت کا چہرہ ہی وہ چیز ہے جو مرد کے لئے عورت کے تمام بدن سے زیادہ پرکشش ہے۔اگر اسے حجاب سے مستثنیٰ قرار دیا جائے تو حجاب کے باقی احکام بے سود ہیں،اس سلسلہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:"اے نبی!اپنی بیویوں،بیٹیوں اور اہل ایمان کی خواتین سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی چادروں کے پلو اپنے اوپر لٹکا لیا کریں۔" [۳۳/الأحزاب:۵۹]

عربی زبان میں ارخاء کا لفظ اوپر سے لٹکا دینے کے عنوان میں مستعمل ہے،اس کا مطلب چادر کے پلو کو سر سے نیچے لٹکانا ہے۔اس میں چہرے کا پردہ خود بخود آجاتا ہے۔جو حضرات چہرے کو پردہ سے خارج سمجھتے ہیں وہ شریعت کے رمز آشنا نہیں ہیں،اس لئے ہمارے نزدیک اجنبی حضرات سے چہرے کا پردہ ضروری ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال کیا رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات اپنے بال کٹواتی تھیں اور کانوں تک رکھتی تھیں؟

☆ کیا عورت اپنے بال کٹواسکتی ہے یا نہیں؟

☆ کیا عورت اپنی دو گتیں کرا سکتی ہے؟وضاحت فرمائیں۔

جواب بالوں کے متعلق احادیث میں ہے کہ ان کا اکرام کیا جائے،ان کے اکرام کے لئے انہیں دھونا،صاف کرنا،تیل لگانا اور کنگھی کرنا ہے،اس میں مرد اور عورت کی کوئی تمیز نہیں،البتہ مردوں کے لئے بال رکھنے کی حد بندی ہے جبکہ عورت کے لئے اس قسم کی کوئی حد بندی نہیں۔چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق صحیح روایات ہیں کہ آپ کے بال نصف کانوں تک اور ایک روایت کے مطابق کہ کندھوں کے درمیان ہوتے تھے۔ [صحیح بخاری، اللباس: ۵۹۰۱]

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ عورت کا حسن و جمال اس کے خوبصورت لمبے اور گھنے بالوں میں ہے۔قرون اولیٰ کی خواتین اپنے بالوں کے متعلق خاص اہتمام کرتی تھیں لیکن آج کی مغرب زدہ عورت جسے گھر سے باہر کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا شوق ہے اور اسے گھریلو کام کاج کے لئے فرصت نہیں ہے چونکہ عورت کے بال محنت طلب کرتے ہیں جبکہ آج کی صنف نازک اس محنت سے قاصر ہے۔اس نے گندے بالوں کو اٹھائے رکھنے کے بجائے انہیں اتار پھینکنے میں ہی عافیت سمجھی ہے،پھر بالوں کو فیشن کے طور پر کاٹنا خالص مغربی تہذیب ہے۔مشرقی خواتین میں یہ تہذیب مغرب کی طرف سے آئی ہے۔اس لئے اس پرفتن دور میں عورت کو اپنے بال کاٹنے کی اجازت دینا مغربی تہذیب کی آبیاری کرنا ہے۔اس سلسلہ میں ازواج مطہرات کا جو عمل پیش کیا جاتا ہے وہ کئی ایک اعتبار سے محل نظر ہے۔صحیح مسلم میں ہے کہ ازواج مطہرات اپنے بالوں سے لے لیتی تھیں حتی کہ وہ وفرہ کی مانند ہوتے تھے۔ [صحیح مسلم، الحیض: ۷۲۸]

ہمارے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے بالوں کا خاص انداز سے جوڑا بنا لیتی تھیں۔جو وفرہ کی شکل میں نظر آتا تھا،امام

مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اس عمل کو طہارت کے مسائل میں بیان کیا ہے یہ بھی اس بات کا قرینہ ہے کہ اس سے مراد بالوں کا کاٹنا نہیں ہے بلکہ غسل کے موقع پر ان کا جوڑا بنانا ہے۔ عموماً خواتین غسل کے وقت یہ عمل کرتی ہیں، اگر اس سے مراد کاٹنا ہو تو بھی محدثین نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ازواج مطہرات نے سادگی اور ترک زینت کے طور پر ایسا کیا تھا۔

اس کے علاوہ اسلامی خواتین کو کفر پیشہ عورتوں سے مشابہت نہیں کرنا چاہیے اور مردوں سے مشابہت کرنے والیوں پر تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔ [صحیح بخاری، اللباس:۵۸۸۵]

ہمارے نزدیک کسی معقول عذر کے بغیر عورت کو سر کے بال کاٹنے کی اجازت نہیں ہے۔ خاوند کی خوشنودی کوئی معقول عذر نہیں ہے کیونکہ اس کی خوشنودی شریعت کے تابع ہے، اس لئے فیشن کے طور پر عورت کا بال کاٹنا جائز نہیں ہے، البتہ دو میڈھیاں یا گیسو بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صاحبزادی فوت ہوئی تھیں تو اس کے بالوں کی تین میڈھیاں بنائی گئی تھیں۔ [صحیح بخاری، الجنائز:۱۲۳۶]

اس لئے عورت کو اپنے بالوں کی دو تین میڈھیاں (گتیں) بنانے میں کوئی قباحت نہیں ہے، البتہ فیشن کے طور پر انہیں کاٹنا شرعاً جائز معلوم نہیں ہوتا۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک عورت اپنے داماد کو بیٹا ظاہر کر کے حج پر گئی ہے، کیا اس کا داماد محرم بن سکتا ہے، اگر نہیں تو اس کے حج کی شرعاً کیا حیثیت ہے، نیز بالوں کے رنگنے کے لئے مہندی میں سیاہ مہندی کی مقدار کس قدر ہونی چاہیے؟ اولین فرصت میں جواب دیں۔

جواب اللہ تعالیٰ نے ساس (خوش دامن) کو محرمات میں شمار کیا ہے کہ اس کے ساتھ نکاح نہیں ہو سکتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:
''تمہاری بیویوں کی مائیں بھی تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔'' [۴/النسآء:۲۳]

اس کا مطلب یہ ہے کہ داماد کو کسی وقت بھی اپنی ساس سے نکاح کی اجازت نہیں ہے، اس بنا پر ساس کو داماد سے پردہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اسے محرم کے طور پر حج کے وقت ساتھ لے جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ معاشرتی طور پر بھی جس کے ساتھ بیٹی کا نکاح کر دیا جائے، اسے بیٹا ہی شمار کیا جاتا ہے، البتہ اسے حقیقی بیٹا قرار دینا اور کاغذات میں حقیقی بیٹے کے طور پر اس کا اندراج کرانا صحیح نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک داماد کو محرم کے طور پر حج کے وقت ساتھ لے جانا صحیح ہے اور اس طرح حج کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

اور بالوں کو رنگتے وقت سرخ مہندی میں سیاہ مہندی کی مقدار کتنی ہو، مقدار کا تعین کرنے کے بجائے وہ معیار قائم رکھا جائے، جو شریعت کو مطلوب ہے شرعی طور پر سیاہ رنگ سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ اگر سرخ میں غلبہ سیاہ رنگ کا ہے اور دیکھنے میں سیاہ رنگت نمایاں ہے۔ تو اس قسم کی ملاوٹ سے اجتناب کیا جائے، چنانچہ فتح مکہ کے دن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد گرامی حضرت ابو قحافہ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا، جبکہ اس کے سر اور داڑھی کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ''اس سفیدی کو تبدیل کرو، لیکن سیاہ رنگت سے اجتناب کرو۔'' [صحیح مسلم، اللباس:۵۵۰۹]

نسائی اور ابوداؤد میں ہے کہ اسے سیاہ رنگ سے دور رکھو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امر وجوب کے لئے ہے جس کی خلاف ورزی حرام ہوتی ہے۔ چنانچہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ سیاہ رنگ خضاب حرام ہے۔ [شرح نووی، ص:۱۹۹، ج۲]

محدثین کرام نے بالوں کو سیاہ کرنا کبائر سے بتایا ہے اور ایسا کرنے سے انسان اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہوتا ہے۔ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے سیاہ رنگ کا خضاب کیا، قیامت کے دن اسے رو سیاہی کا سامنا کرنا پڑے گا'' [مجمع الزوائد، ص:۱۴۴، ج۵]

اگر سیاہ مہندی کی ملاوٹ سے رنگت گہری سرخ ہوجاتی ہے بالکل سیاہ نہیں ہوتی تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اسی طرح آج کل بازار سے کچھ ٹیوبیں بھی دستیاب ہیں۔ رنگت کے اعتبار سے ان کے خاص نمبر ہیں، ان کے لگانے سے سب بال سیاہ ہوجاتے ہیں ان کے استعمال سے بھی اجتناب کرنا چاہیے۔ اگرچہ ہمارے نامور علما انہیں استعمال کرتے ہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال پسرور سے شفیق الرحمٰن اسلم لکھتے ہیں:

☆ حمنہ کے لغوی معنی کیا ہیں، کیا یہ نام اسلامی ہے بعض حضرات اس نام کو صحیح خیال نہیں کرتے؟

☆ گھر میں کبوتر رکھنا شرعاً کیسا ہے کیا انہیں اڑانا ناجائز ہے؟

☆ اگر منبر موجود ہو تو کیا اس کے بغیر خطبہ دیا جاسکتا ہے، ہمارے ہاں سالہا سال سے یہ طریقہ ہے کہ منبر کی موجودگی میں خطبہ نیچے کھڑے ہوکر دیا جاتا ہے صرف دوسرے خطبہ کے لئے چند منٹ منبر پر بیٹھا جاتا ہے؟

جواب عربی لغت کے اعتبار سے ہر وہ چیز جس میں سیاہ اور چھوٹے ہونے کا وصف پایا جائے اسے ''حمن'' کہا جاتا ہے۔ اس کی تانیث حمنہ ہے، چنانچہ علاقہ طائف میں پائے جانے والی سیاہ انگوروں کی ایک خاص قسم بڑے سیاہ دانوں میں چھوٹے چھوٹے سیاہ دانے، سیاہ چیونٹی، جوں اور حیوانات کے جسم سے لگی ہوئی چچڑی کو عربی میں ''حمنہ'' کہا جاتا ہے۔ اس وضاحت کے بعد حمنہ ایک جلیل القدر صحابیہ ہیں۔ جن کے ذریعے استحاضہ کے متعدد مسائل سے اس امت کو معلومات حاصل ہوئی ہیں کہ ان کی ایک ہمشیرہ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ تھیں جن کے نیک اور پارسا ہونے کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے گواہی دی ہے۔ اس بنا پر کسی بچی کا نام حمنہ رکھا جاسکتا ہے۔ اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ ایسے ناموں کے متعلق لغوی کھوج لگانا تحصیل لا حاصل اور بے سود ہے۔ کیونکہ ان کی معنویت ان کے حاملین کے کردار میں ہے، جیسا کہ حضرت معاویہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے متعلق لغوی مفہوم کی کرید کرنا درست نہیں ہے۔ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کو نام اور کام کی وجہ سے اپنی نگاہوں سے روپوش رہنے کی تلقین فرمائی تھی۔ لیکن ہمارے لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق حسن ظن کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اپنے دلوں میں ان کے متعلق محبت اور الفت کے جذبات رکھیں اور کسی بھی پہلو سے ان کے متعلق نفرت کا اظہار نہ ہو۔ چونکہ حضرت حمنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانے والوں میں شریک تھیں۔ اس لئے کچھ حضرات اس نام سے تکدر محسوس کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ایسا رویہ درست نہیں ہے کیونکہ سزا اور توبہ کے متعلق جرم کی نوعیت ختم ہوجاتی ہے۔ ویسے انسان کے نام کا اس کی شخصیت کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اخلاق و کردار پر بھی نام اثر انداز ہوتا ہے، نیز قیامت کے دن انسان کو اس کے نام مع ولدیت آواز دی جائے گی، اس لئے رسول

اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ''تم اپنی اولاد کے لئے اچھے نام کا انتخاب کیا کرو۔'' [ابوداود، الادب: ۴۹۴۸]

اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ نام وہ ہیں جن میں اللہ یا رحمٰن کے لئے عبودیت کا اظہار ہو، چنانچہ حدیث میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کو عبداللہ اور عبدالرحمٰن نام بہت پسند ہیں۔'' [صحیح مسلم، الادب: ۵۵۸۷]

اسی طرح وہ نام جن میں بندے کی عبودیت کا اللہ تعالیٰ کی کسی بھی صفت کی طرف انتساب ہو، جیسا کہ عبدالسلام، عبدالرحیم اور عبدالقدوس وغیرہ۔ حضرات انبیا کے نام بھی اللہ کے ہاں اچھے نام ہیں۔ حدیث میں بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اپنی اولاد کے لئے انبیا کے نام تجویز کیا کرو۔'' [ابوداود، الادب: ۴۹۵۰]

اسلاف میں جو نیک سیرت اور اچھے کردار کے حامل لوگ ہوں ان کے نام بھی تجویز کئے جا سکتے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''تم سے پہلے لوگ حضرات انبیا اور صالحین کے ناموں کے مطابق اپنی اولاد کے نام رکھتے تھے۔''
[صحیح مسلم، الادب: ۵۵۹۸]

ان حقائق کے پیش نظر حمنہ ایک اسلامی نام ہے اور اپنی بچیوں کا نام رکھنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

☆ چھوٹے بچوں کی تفریح طبع یا گھر کی زینت کے لئے پرندوں کو گھر میں رکھا جا سکتا ہے، بشرطیکہ ان کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھا جائے، جیسا کہ حدیث میں بیان ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا ایک ابوعمیر نامی مادری بھائی تھا۔ جس نے اپنے گھر میں نغیر نامی ایک سرخ چڑیا رکھی تھی جو کسی وجہ سے مرگئی تو ابوعمیر بہت پریشان ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ جب حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے گھر جاتے تو ابوعمیر سے مخاطب ہو کر فرماتے: ''اے ابوعمیر! نغیر کو کیا ہوا۔'' [صحیح بخاری: ۶۲۰۳]

بخاری میں یہ وضاحت ہے کہ ابوعمیر نے یہ پرندہ محض تفریح طبع کے لئے رکھا تھا۔ اگر کبوتروں کو اپنے گھر میں زینت اور بچوں کے دل بہلانے کے لئے رکھا جائے تو حدیث بالا کے پیش نظر اس کی گنجائش ہے لیکن انہیں اڑانے اور شرط لگانے کے لئے رکھنا ناجائز ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جو کبوتروں کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا آپ نے فرمایا کہ ''ایک شیطان ہے جو مادہ شیطان کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔'' [مسند امام احمد: ۲/۳۵۲]

امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''کبوتروں سے کھیلنا۔''

ابن ماجہ میں مختلف صحابہ کرام سے اس کی کراہت کے متعلق متعدد احادیث ہیں۔ (۳۷۶۴، ۳۷۶۵، ۳۷۶۶، ۳۷۶۷) ان کے پیش نظر انسان کو اس قسم کے فضول شوق سے اجتناب کرنا چاہیے۔

☆ مسجد میں اگر منبر موجود ہے تو خطبہ جمعۃ المبارک اس پر کھڑے ہو کر دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ سے یہی عمل مسنون ہے۔ اگر مسجد میں اس کا اہتمام نہیں تو سنت کے احیا کے پیش نظر اس کا انتظام کرنا چاہیے۔

لیکن صورت مسئولہ میں یہ حرکت انتہائی معیوب ہے کہ منبر کی موجودگی میں خطبہ کے لئے اسے استعمال نہ کیا جائے، البتہ دوسرے خطبہ کے آغاز میں چند منٹ تک منبر پر بیٹھا جائے۔ اس طرح خطبہ تو ہو جاتا ہے لیکن یہ انداز محض تکلف اور غیر مسنون ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال عام طور پر کہا جاتا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنے کو ثابت کیا ہے، لہٰذا سنت طریقہ یہی ہے کہ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا جائے اس کی وضاحت فرمائیں؟

جواب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں مصافحہ سے متعلق ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے جس میں اس کا طریقہ نہیں بلکہ مشروعیت کو بیان کیا ہے۔ شارح صحیح بخاری، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ مصافحہ کی تعریف بایں الفاظ کرتے ہیں کہ ایک ہتھیلی کو دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی سے ملایا جائے۔ [فتح الباری، ص:۶۶، ج۱۱]

عربی زبان میں ''صفحہ'' ہاتھ کی ہتھیلی کو کہتے ہیں۔ اس لفظ سے مصافحہ بنا ہے جو باب مفاعلہ ہے اور مشارکت کا تقاضا کرتا ہے، یعنی دو ہتھیلیوں کا اس عمل میں شریک ہونا مصافحہ کہلاتا ہے۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے کہ مصافحہ، ہاتھ پکڑنے کو کہتے ہیں۔ جب ایک آدمی کسی دوسرے سے مصافحہ کرتا ہے تو اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کو اس کے ہاتھ کی ہتھیلی میں رکھ دیتا ہے۔ (ص:۵۱۴، ج۲)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں دو معلق اور دو موصول احادیث بیان کی ہیں۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہیں:

☆ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بایں حالت تشہد کی تعلیم دی کہ میری ہتھیلی آپ کی دونوں ہتھیلیوں میں تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس بیان سے مصافحہ بالیدین کو ثابت کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ حدیث ملاقات کے وقت مصافحہ سے متعلق نہیں، بلکہ یہ تعلیم کے اہتمام سے تعلق رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ مصنف ہدایہ نے اس حدیث کو نماز کے بیان میں ذکر کیا ہے اور حاشیہ میں اس کی وجہ بایں الفاظ بیان کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ہاتھ، اس لئے تھاما تاکہ ان کا دماغ حاضر رہے اور التحیات کی تعلیم دیتے وقت کوئی چیز رہ نہ جائے۔ [حاشیہ نمبر ۷ ہدایہ، ص:۹۳، ج۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عام طور پر عادت مبارکہ تھی کہ دوران تعلیم مخاطب کا ہاتھ پکڑ لیتے تھے، جیسا کہ حضرت ابوقتادہ اور ابودھاء کہتے ہیں کہ ہم ایک دیہاتی کے پاس آئے اور اس نے ہمیں بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اس علم سے کچھ سکھانے لگے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا تھا۔ [مسند امام احمد، حدیث نمبر:۲۰۶۲۴]

پھر اگر اس حدیث کو مصافحہ کے طریقہ کے لئے بطور دلیل تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بڑا آدمی دونوں ہاتھوں سے اور چھوٹا آدمی ایک ہاتھ سے مصافحہ کرے، حالانکہ اس انداز کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا، لہٰذا اس حدیث کا مصافحہ کے طریقہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

☆ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ مصافحہ کی مشروعیت کو ثابت کرنے کے لئے دوسرا واقعہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں مسجد میں داخل ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف فرما تھے۔ حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ دوڑتے ہوئے میرے پاس آئے انہوں نے مجھ سے مصافحہ کیا اور (میری توبہ قبول ہونے پر) مجھے مبارک باد دی۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد یہ ہے کہ ان دونوں واقعات میں ملاقات کا مصافحہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ کا ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا تعلم کے دوران ہاتھ تھامنا ملاقات کا مصافحہ نہیں ہے۔

☆ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں مصافحہ کا رواج تھا تو آپ نے جواب دیا کہ ہاں۔ [صحیح بخاری، الاستیذان:۶۲۶۳]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث سے بھی مصافحہ کی مشروعیت کو ثابت کیا ہے۔

☆ اس باب کی آخری حدیث میں حضرت عبداللہ بن ہشام رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ہاتھ تامے ہوئے تھے۔ [حدیث:۶۲۶۴]

اس حدیث میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک ہاتھ کا ذکر ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں نہ مصافحہ کا بیان ہے نہ ہی اس میں ملاقات کے وقت مصافحہ کا ذکر ہے۔ اس طرح مصافحہ کا باب مکمل ہوگیا۔ اس کے بعد امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دوسرا باب بایں عنوان قائم کیا ہے ''دو ہاتھ تھامنے کا بیان'' اس باب کے متعلق شارح بخاری مولانا احمد علی حنفی سہارنپوری لکھتے ہیں کہ جب مصافحہ کے بغیر بھی دونوں ہاتھوں کا پکڑنا جائز ہے تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب کو الگ باندھ دیا۔ مولانا سہارنپوری کی وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس باب کا تعلق مصافحہ سے نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اس باب میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کو موصولاً لائے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس روایت کا اصل محل یہی باب ہے۔ اس سلسلہ میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حماد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اثر بھی بیان کیا ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے دونوں ہاتھوں کے ساتھ مصافحہ کیا تھا۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن مبارک دو ہاتھ کے ساتھ مصافحہ کے قائل نہیں تھے کیونکہ انہوں نے اپنی ایک کتاب ''البر واالصلہ'' میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث بایں الفاظ بیان کی ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی آدمی سے ملاقات فرماتے تو اپنا ہاتھ مبارک اس وقت تک نہ کھینچتے جب تک وہ خود اپنا ہاتھ نہ کھینچ لیتا۔ [فتح الباری، ص:۶۸، ج۱۱]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس وضاحت سے دو ہاتھ سے مصافحہ کی تردید کی ہے کہ تابعی حماد بن زید نے عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے دو ہاتھ سے مصافحہ کیا لیکن خود عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ دو ہاتھ سے مصافحہ کے قائل نہیں تھے، رہ گئے حماد بن زید تو ان کا عمل متعدد احادیث اور متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریقہ مصافحہ کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتا ہے، کتب احادیث میں تقریباً چوبیس احادیث ایسی مروی ہیں جن میں مصافحہ کے وقت ایک ہاتھ ملانے کا ذکر ہے، آخر میں ایک ہاتھ کے مصافحہ پر احناف ہی کا ایک حوالہ پیش خدمت ہے۔ ابن عابدین درّ مختار کے حاشیہ ردالمختار میں لکھتے ہیں کہ ''اگر حجر اسود کو چومنے کی طاقت نہ ہو تو اپنے دونوں ہاتھ حجر اسود پر رکھ دے اور انہیں چوم لے یا ایک ہاتھ رکھے بلکہ صحیح یہ ہے کہ اپنا دایاں ہاتھ رکھے کیونکہ شرف اور بزرگی کے کاموں میں یہی دایاں ہاتھ استعمال ہوتا ہے، ''بحر العمیق'' نامی کتاب سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ حجر اسود اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ ہے جس کے ساتھ وہ اپنے بندوں سے مصافحہ کرتا ہے اور مصافحہ تو دائیں ہاتھ سے ہی کیا جاتا ہے۔ [ردالمختار، ص:۶۶، ج۲]

آخر میں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی وضاحت سے ہم اپنے فتویٰ کو مکمل کرتے ہیں، فرماتے ہیں یہ فصل اس بات کے بیان میں ہے کہ دائیں ہاتھ سے کون سا کام مستحب ہے اور بائیں ہاتھ سے کون سا کام کرنا چاہیے۔ چیزوں کا لینا، کھانا پینا، مصافحہ کرنا دائیں ہاتھ سے بہتر ہے۔ اسی طرح دائیں جانب سے وضو کا آغاز کرنا، جوتا پہننا اور اپنے کپڑے زیب تن کرنا وغیرہ۔

[غنیۃ الطالبین]

مختصر یہ ہے کہ مصافحہ کا مسنون طریقہ یہی ہے کہ صرف دائیں ہاتھ سے کیا جائے۔ بایاں ہاتھ اس کے لئے استعمال نہ کیا

جائے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال آج کل پردہ کے متعلق ایک نئی صورت سامنے آئی ہے کہ عورتیں صرف ناک کی پٹی پر چادر لپیٹ لیتی ہیں آنکھیں اور چہرے کا کچھ حصہ کھلا رہتا ہے جس سے چہرے کی رنگت نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہے۔اس کے متعلق وضاحت کریں کہ آیا ایسا کرنا کتاب وسنت کے مطابق ہے؟

جواب پردے کے متعلق سوال میں مذکورہ صورت شرعی اعتبار سے صحیح نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنا پردے کی حسب ذیل شرائط کے منافی ہے:

☆ برقعہ یا چادر تمام جسم کو ڈھانپ لے۔
☆ وہ چادر موٹی ہو باریک نہ ہو۔
☆ کھلی ہو تنگ اور چست نہ ہو۔
☆ اسے زینت کے طور پر نہ پہنا گیا ہو۔
☆ مردوں کے لباس کے مشابہہ نہ ہو۔
☆ اس پر خوشبو وغیرہ نہ لگی ہو،

پردہ میں چہرے کا ڈھانپنا ضروری ہے کیونکہ عورت کی شرافت اور پاکدامنی کی علامت ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''یہ پردہ عورت کے لئے اس کی شرافت کی علامت ہے تاکہ انہیں تنگ نہ کیا جائے۔'' [۳۳/الاحزاب:۵۹]

اس بنا پر سوال میں ذکر کردہ پردے کی صورت کتاب وسنت کے مطابق نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال بعض علما کا خیال ہے کہ عورت کے چہرے کا پردہ فرض نہیں ہے کیونکہ قرآن کریم سے چہرے کو ڈھانپنا ثابت نہیں ہوتا ان کا کہنا ہے کہ اگر چہرے کے پردے کو فرض مان لیا جائے تو اس امت کا ایک بڑا حصہ ایک فرض کے تارک ہونے کی بنا پر جہنمی قرار پاتا ہے۔قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں؟

جواب ابتدائے اسلام میں عورتیں زمانۂ جاہلیت کی طرح قمیص اور دوپٹے کے ساتھ نکلتی تھیں جبکہ ان کا چہرہ کھلا ہوتا تھا اور شریف عورتوں کا لباس ادنیٰ درجہ کی عورتوں سے مختلف نہ تھا۔اس سے بے حیائی اور بے غیرتی کا دروازہ کھلتا تھا۔اللہ تعالیٰ نے سدباب کے لئے حکم دیا کہ ''اے نبی! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمانوں کی خواتین کو حکم دیں کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے گھونگھٹ ڈال لیا کریں۔'' [۳۳/الاحزاب:۵۵]

یہ آیت کریمہ خاص چہرے کو چھپانے کے لئے ہے کیونکہ ''جلابیب'' جمع ہے ''جلباب'' کی، جس کا معنی بڑی چادر ہے اور ''ادنیٰ'' کا معنی لٹکانا ہے،یعنی چادر کے ایک حصے سے نیچے لٹکائیں،یہی مفہوم گھونگھٹ ڈالنے کا ہے مگر اصل مقصد کوئی خاص وضع نہیں بلکہ چہرے کو چھپانا مقصود ہے،خواہ گھونگھٹ سے چھپایا جائے یا نقاب سے یا کسی اور طریقے سے یہ طریقہ اختیار کرنے سے چہرے کا پردہ خود بخود آجاتا ہے۔دراصل عورت کا چہرہ ہی وہ چیز ہے جو مرد کے لئے عورت کے تمام بدن سے زیادہ پرکشش ہوتا ہے اگر اسے ہی حجاب سے مستثنیٰ قرار دیا جائے تو حجاب کے باقی احکام بے سود ہیں۔مفسرین نے درج بالا آیت کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔چنانچہ ترجمان القرآن سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی عورتوں کو یہ حکم دیا ہے کہ جب وہ کسی کام کے لئے اپنے گھروں میں سے نکلیں تو سر کے اوپر سے اپنی چادروں کے دامن لٹکا کر اپنے چہروں کو ڈھانپ لیا کریں۔'' [تفسیر ابن کثیر]

حضرت امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبیدہ سلمانی رحمۃ اللہ علیہ سے ان الفاظ کی تفسیر پوچھی تو انہوں نے عمل کر کے دکھایا کہ اپنے چہرے اور سر کو ڈھانپ لیا اور صرف اپنی بائیں آنکھ کو کھلا رہنے دیا۔ [تفسیر ابن جریر، ص:۲۲، ج۲۹]

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ آیت حجاب کے نزول سے قبل عورتیں جلباب کے بغیر گھروں سے باہر نکلا کرتی تھیں اور مردان کے چہرے اور ہاتھ دیکھتے تھے اور اس وقت عورت کے لئے جائز تھا کہ وہ اپنے چہرے اور ہاتھوں کو ننگا رکھے اور اس وقت ان اعضا پر مرد کی نگاہ پڑنا بھی جائز تھا، پھر جب اللہ تعالیٰ نے پردے کے احکام نازل فرمائے تو عورتوں نے مردوں سے مکمل حجاب اختیار کر لیا۔ [حجاب المرأۃ ولباسہا فی الصلوٰۃ]

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ اس آیت سے مراد گھونگھٹ نکالنا نہیں بلکہ ''بکل مارنا'' ہے۔ اس توجیہ میں جو کچھ ہے وہ سب کو معلوم ہے، تاہم توجیہ عقل ونقل کے خلاف ہے کیونکہ یہ آیت سورۂ احزاب کی ہے جو ۵ ہجری میں نازل ہوئی اور واقعۂ افک شوال ۶ ہجری میں پیش آیا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ ''میں اسی جگہ بیٹھی رہی، اتنے میں میری آنکھ لگ گئی، ایک شخص صفوان بن معطل سلمی رضی اللہ عنہ اس مقام پر آئے اور دیکھا کہ کوئی سو رہا ہے اس نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا کیونکہ حجاب کا حکم اترنے سے پہلے اس نے مجھے دیکھا تھا اس نے مجھے دیکھ کر ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھا تو میری آنکھ کھل گئی، میں نے فوراً اپنا چہرہ اپنی چادر سے ڈھانپ لیا۔ [صحیح بخاری، المغازی:۴۱۴۱]

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ صحابیات رضی اللہ عنہن کے ہاں چہرے کا پردہ رائج تھا حتی کہ حالت احرام میں بھی ازواج مطہرات اور عام خواتین اسلام نقاب کے بغیر اپنے چہروں کو اجانب سے چھپاتی تھیں، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ''سوار ہمارے قریب سے گزرتے تھے اور ہم عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حالت احرام میں ہوتی تھیں، جب وہ لوگ ہمارے سامنے آجاتے تو ہم اپنی چادریں اپنے سروں کی طرف سے اپنے چہروں پر ڈال لیتیں اور جب وہ گزر جاتے تو چہرہ کھول لیتی تھیں۔ [ابوداود، المناسک:۱۸۳۳]

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے متعلق بھی احادیث میں ہے کہ وہ احرام کی حالت میں اپنے چہرے کو اجانب سے ڈھانپ کر رکھا کرتی تھیں۔ [مستدرک حاکم، ص:۴۵۴، ج۱]

درج بالا حقائق کے پیش نظر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شریعت اسلامیہ میں عورت کے لئے چہرے کو اجانب سے مستور رکھنے کا حکم ہے اور اس پر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے عمل کیا جا رہا ہے اور عورتوں کے لئے ایسے کرنا قرآن کریم کی تجویز ہے۔ سوال کے آخر میں بڑی عجیب بات کہی گئی ہے کہ کسی چیز کی فرضیت سے، اس لئے انکار کر دیا جائے کہ اس کے ترک سے اکثریت جہنمی قرار پاتی ہے۔ بجائے اس کے کہ اپنی بدعملی کا علاج کیا جائے اور کوتاہی کی اصلاح کی جائے الٹا اس کی فرضیت سے ہی انکار کیا جا رہا ہے۔ کل کوئی منچلا اٹھے گا اور کہہ دے گا کہ نماز فرض نہیں ہے کیونکہ اس کے ترک سے اکثریت جہنمی ہونا قرار پاتی ہے۔ مختصر یہ کہ چہرہ کا پردہ فرض ہے اور قرآن کریم، احادیث نبویہ اور تعامل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی تقاضا ہے۔ [واللہ اعلم]

آداب و اخلاق

آداب و اخلاق

سوال ہمارے ہاں بعض عمر رسیدہ دم کرنے والے ایسے حضرات ہیں کہ عورتیں تنہائی اور خلوت میں ان سے دم کراتی ہیں۔ کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب کسی بھی اجنبی عورت سے خلوت اختیار کرنا حرام ہے، خواہ وہ تنہائی تعلیم و تعلم یا دم کرنے کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''خبردار! جو آدمی بھی کسی عورت کے ساتھ تنہائی اختیار کرتا ہے، ان دونوں کا تیسرا ساتھی شیطان ہوتا ہے۔'' [ترمذی، الفتن: ۲۱۶۵]

اس حدیث کے پیش نظر کسی عالم دین کے لئے جائز نہیں ہے، خواہ وہ عمر رسیدہ ہی کیوں نہ ہو کہ وہ خلوت میں کسی عورت کو دم کرے۔ عورت کو بھی چاہیے کہ وہ اس کام سے اجتناب کرے جس کے ارتکاب سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی ہوتی ہو، ہاں، اگر کوئی محرم ساتھ ہو تو دم کرانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے ہاں ایک شخص کو متفقہ طور پر امیر منتخب کیا گیا، پھر اس کی امارت کے دوران ہی چند لوگوں نے ایک دوسرے شخص کو امیر بنا دیا ہے۔ اب ہم کس امیر کی اطاعت کریں، نیز ہمارے ایک عالم دین نے "اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ" کا ترجمہ ''وہ حرام کا بیٹا تھا'' کیا ہے، کیا یہ ترجمہ صحیح ہے؟۔

جواب شریعت نے جن امرا کی سمع و اطاعت کا حکم دیا ہے اور اس کے متعلق بہت تاکید فرمائی ہے، ان سے مراد با اختیار شرعی امرا ہیں۔ ہمارے ہاں امیر کا انتخاب کسی جماعت یا ادارہ کا نظام چلانے کے لئے ہوتا ہے۔ اس بنا پر ان کی حیثیت ایک دستوری امیر کی ہوتی ہے، اس لئے پیش آمدہ اشکال جماعتی دستور کی روشنی میں حل کیا جانا مناسب ہے یا پھر اس سلسلہ میں مرکز سے رابطہ قائم کیا جائے۔ کیونکہ یہ ایک انتظامی معاملہ ہے، بظاہر تو پہلے منتخب امیر کا حق ہے کہ اسے جماعتی نظام چلانے کا موقع دیا جائے، اگر کہیں سقم ہو تو باہمی مشاورت سے اس کا حل تلاش کیا جائے۔ ایک امیر کی موجودگی میں چند افراد کا کسی دوسرے شخص کو منتخب کر لینا صحیح نہیں ہے، نیز عالم دین کا بیان کردہ ترجمہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ کسی نبی کی بیوی کبھی بدکار نہیں رہی ہے۔ [ابن کثیر، ص: ۳۹۲، ج ۴]

نیز فرماتے ہیں کہ وہ حضرت نوح علیہ السلام کا ہی بیٹا تھا، لیکن اخلاق و کردار میں ان کے نقش قدم پر نہیں چلتا تھا۔

[ابن کثیر، ص: ۴۴۸، ج ۲]

حضرات انبیا علیہم السلام پر اس طرح کے الزامات لگانا یہودیانہ ذہنیت تو ہو سکتی ہے، لیکن ایک مسلمان کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ انبیائے کرام علیہم السلام کے بارے میں ایسی باتیں ذہن میں لائے جو عقل و نقل کے خلاف ہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال اہل مسجد ایک خاندانی باعمل اہل حدیث کو اپنی مسجد کا متولی مقرر کرتے ہیں جو مقتدی حضرات اور خطیب کو خلاف

شریعت کام کرنے سے روکتا ہے، بدیں وجہ چند لوگ اور خطیب اس کے خلاف محاذ بنا لیتے ہیں اور اسے پریشان کرتے ہیں، نیز بلا وجہ اس پر بدکاری اور چندہ خوری کا الزام لگاتے ہیں، ایسے لوگوں کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ بلا وجہ کسی مسلمان کو تکلیف دینا حرام اور کبیرہ گناہ ہے، بالخصوص بدکاری کا الزام تو انتہائی سنگین جرم ہے۔ اس قسم کے لوگ بدعمل مسلمان ہیں، لیکن انہیں ان جرائم کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج نہیں کیا جا سکتا حدیث میں ہے کہ ''مسلمان کو گالی دینا گناہ اور اسے قتل کرنا کفر ہے۔'' [صحیح بخاری، الایمان: ۴۸]

اس حدیث میں لفظ کفر کبیرہ گناہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے کیونکہ قرآن پاک میں مسلمانوں کے گروہوں کو آپس میں لڑنے کے باوجود انہیں مؤمن قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو۔'' [۴۹/الحجرات: ۹]

اس بنا پر بعض مقتدی حضرات اور خطیب صاحب کا عمل اگرچہ بہت سنگین ہے، لیکن اس وجہ سے انہیں دائرہ اسلام سے خارج کرنا صحیح نہیں ہے۔ انہیں چاہیے کہ آپس میں ایثار اور ہمدردی کی فضا پیدا کریں اور باہمی صلح و اتفاق سے مسجد کے انتظام کو چلائیں اور ایک دوسرے پر ناجائز الزامات لگانے سے پرہیز کریں اور نیز متولی مسجد کو چاہیے کہ وہ بردباری اور تحمل مزاجی کا مظاہرہ کرے اور کسی کی خامی یا کوتاہی کو برسر عام نشر کرنے کے بجائے علیحدگی میں انہیں سمجھانے کی روش اختیار کرے۔ [واللہ اعلم]

سوال اگر کوئی زانی شرعی سزا کے بغیر توبہ کرے تو کیا اس طرح گناہ کی تلافی ہو جاتی ہے؟

جواب واضح رہے کہ گناہ دو طرح کے ہوتے ہیں، صغائر اور کبائر، صغیرہ گناہوں کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو جن سے تمہیں منع کیا جا رہا ہے تو ہم تمہاری چھوٹی چھوٹی برائیوں کو تمہارے حساب سے ساقط کر دیں گے۔'' [۴/النساء: ۳۱]

اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرنے سے چھوٹے موٹے گناہ خود بخود معاف ہو جاتے ہیں۔ احادیث میں ہے کہ وضو کرنے اور نماز پڑھنے سے بھی ایسے گناہوں کی تلافی ہو جاتی ہے، البتہ کبیرہ گناہوں کا معاملہ ان سے ذرا مختلف ہے۔ ان میں سے بعض کا تعلق حقوق اللہ سے ہوتا ہے، ایسے گناہ تو سچی توبہ سے معاف ہو جاتے ہیں اور بعض کبیرہ گناہ ایسے ہوتے ہیں جن کے ارتکاب پر حد جاری ہو جاتی ہے، ان کی پھر دو اقسام ہیں:

پہلی یہ کہ ان کا تعلق حقوق العباد سے بھی ہوتا ہے، جیسے چوری وغیرہ ایسی صورت میں حد کے ساتھ جو مال چرایا ہے اسے بھی واپس کرنا ہوگا۔

دوسری قسم یہ ہے کہ ان کا تعلق بندوں کے حقوق سے نہیں ہوتا، جیسے شراب پینا ایسے گناہوں کے ارتکاب پر حد کا اجرا ضروری ہوتا ہے۔ اور یہ حد ہی اس گناہ کا کفارہ بن جاتی ہے۔ اگر حد کے نفاذ کا موقع نہیں دیا جاتا تو معاملہ اللہ کے سپرد ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس شخص نے ایسے گناہ کا ارتکاب کیا جس پر حد ضروری ہے اور اس پر حد جاری کر دی گئی تو یہی اس کے گناہ کا کفارہ ہے۔ بصورت دیگر معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔'' [ابن ماجہ کتاب الحدود، ۲۶۰۳]

چونکہ ہمارے ملک کی سزائیں غیر شرعی ہیں اور حد کا متبادل نہیں ہیں، اس لئے مروجہ سزا لینے کے بعد بھی اسے توبہ کرتے رہنا چاہیے تاکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مواخذہ سے محفوظ رہے۔ صورت مسئولہ میں زانی کو سزا لینا ہوگی، اگر اس کے بغیر صرف توبہ پر اکتفا کرتا ہے تو معاملہ اللہ کے سپرد ہے چاہے تو معاف کردے اور چاہے تو مواخذہ کرے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی کسی دوسرے شخص سے اس کی پرائیویٹ بات پوچھنا چاہتا ہے جبکہ وہ اسے نہیں بتانا چاہتا، کیا ایسے حالات میں جھوٹ بول کر دوسرے شخص کو ٹالا جا سکتا ہے؟

جواب شریعت اسلامیہ میں جھوٹ بولنا سنگین جرم ہے۔ احادیث میں بات بات پر جھوٹ بولنا منافقین کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ صرف تین مواقع پر خلاف واقعہ بات کہنے کی اجازت ہے:

① دو بھائیوں یا دوستوں کے درمیان صلح کرانے کے لئے خلاف واقعہ بات کی جا سکتی ہے۔

② بیوی خاوند آپس کی ناچاقی کو دور کرنے کے لئے بقدر ضرورت خلاف واقعہ بات کر سکتے ہیں۔

③ میدان جہاد میں دشمن کی چالوں کو ناکام کرنے کے لئے جھوٹ بولا جا سکتا ہے۔

صورت مسئولہ ان صورتوں میں سے نہیں ہے، لہٰذا اگر کوئی دوسرے کو اپنی پرائیویٹ بات نہیں بتانا چاہتا تو اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس سلسلہ میں جھوٹ بولنے کی اجازت ہے۔ کھلے الفاظ میں صاف کہہ دیا جائے کہ میں اس بات کو کسی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا، جھوٹ بولنے کی ضرورت یا اجازت نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک بچے نے دن کے وقت گندم کے کھلیان کو آگ لگا دی، اس کے آگ لگانے میں کسی کے مشورے کو دخل نہیں۔ اس سے کافی نقصان ہوا ہے، کیا اس نقصان کی تلافی بچے کے ورثا کو کرنا ہوگی یا نہیں، نقصان ادا کرنے کی صورت میں پورے نقصان کے ذمہ دار ہوں گے یا کچھ نقصان ادا کرنا ہوگا؟

جواب شریعت اسلامیہ میں بعض افراد کو حقوق و واجبات کی ادائیگی میں مرفوع القلم قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے:

''دیوانہ ہوش آنے تک، بچہ بالغ ہونے تک اور سونے والا بیدار ہونے تک مرفوع القلم ہیں۔'' [مسند امام احمد]

محدثین کرام نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بچہ مواخذہ کے لحاظ سے مرفوع القلم ہے۔ اگر نیکی اور ثواب کے کام کرتا ہے تو اسے محروم نہیں کیا جائے گا، البتہ جو حقوق انسانوں سے متعلق ہیں اس کا معاملہ کچھ الگ ہے، اگرچہ بچے کو باز پرس نہیں ہوگی، تاہم اس کے ورثا نقصان کے ذمہ دار ہوں گے۔ چنانچہ فقہا نے صراحت کی ہے کہ بچہ میں اہلیت ادا معدوم ہوتی ہے، اس لئے اس کے اقوال و افعال پر کوئی شرعی مواخذہ نہیں ہوگا اور نہ ہی معاملات میں اس کے تصرفات کا اعتبار کیا جائے گا زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ بچہ جب کسی کا نقصان کرے گا تو مالی لحاظ سے وہ قابل مواخذہ ہوگا البتہ بدنی لحاظ سے اسے سزا وغیرہ نہیں دی جائے گی، مثلاً: بچہ کسی کو قتل کر دیتا ہے یا کسی کے مال کو نقصان پہنچاتا ہے تو مقتول کی دیت اور مال کی تلافی بہر صورت کرنا ہوگی۔ لیکن اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ [علم اصول الفقہ، ص: ۱۳۷]

اس طرح بچے کے مال میں زکوٰۃ بھی عائد ہوتی ہے، جیسا کہ محدثین کرام نے لکھا ہے۔ اس بنا پر صورت مسئولہ میں جو نقصان

ہوا ہے وہ بچے کے ورثا ادا کریں گے اور شرعی طور پر یہ ان کی ذمہ داری ہے۔ بچے کے مرفوع القلم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے مواخذہ نہیں ہوگا اور نہ ہی اس پر کوئی اور ذمہ داری عائد ہوگی، البتہ مالی نقصانات کی تلافی اس کے ورثا پر عائد ہوتی ہے، وہ بھی پورا پورا نقصان ادا ہوگا۔ [واللہ اعلم]

سوال میں نماز میں رفع الیدین رسول اللہ ﷺ کی سنت سمجھ کر کرتا ہوں جبکہ میرے والدین اس کے خلاف ہیں اور ان کا اس سنت کو چھوڑ دینے پر اصرار ہے، چونکہ رسول اللہ ﷺ نے حج اور جہاد کے موقع پر اطاعت والدین کو ترجیح دی ہے۔ اب مجھے اس سلسلہ میں کیا کرنا چاہیے؟

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ نماز میں رفع الیدین ایک ایسی سنت ہے جس کا ترک ایک دفعہ بھی ثابت نہیں ہے، اس کے متعلق مروی احادیث حد تواتر کو پہنچتی ہیں اور نہ ہی اس سنت کا نسخ ثابت ہے، جیسا کہ بعض اہل علم کی طرف سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ عمل اس معنی میں سنت نہیں کہ اگر اسے ادا نہ کیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے بلکہ اس معنی میں سنت ہے کہ نماز ادا کرنے کا یہی طریقہ ہے اور حدیث نبوی میں ہے کہ اس طریقہ سے نماز پڑھو۔ جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے بغیر نماز نہ پڑھی جائے، بلکہ اس کے بغیر نماز ادا کرنا ہمارے نزدیک نامکمل ادھوری نماز ہے، نیز اس میں اللہ کی عظمت اور کبریائی کا بھی اظہار ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے محبت کا تقاضا یہی ہے کہ ہر اس ادا کو عمل میں لایا جائے جسے رسول اللہ ﷺ نے اپنایا ہے۔ خاص طور پر آپ کی سنت کو مصلحت یا رواداری کی بھینٹ نہ چڑھایا جائے، باقی رہا مسئلہ اطاعت والدین کا تو اس کی کچھ حدود وقیود ہیں۔ اس کے متعلق شریعت اسلامیہ کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ "اللہ کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی بات کو نہ مانا جائے۔" لہٰذا رفع الیدین کی سنت پر عمل کرنے میں والدین کا ناراض ہونا محل نظر ہے۔ حج اور جہاد کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے خدمت والدین کے لئے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا تھا کیونکہ والدین کی خدمت دین اسلام کا ایک اہم فریضہ ہے اور اسے ادا کرتے رہنا چاہیے۔ لیکن آج تو اس فریضہ کو بھی خود ساختہ جہاد کی بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔ تاہم ادب واحترام کے دائرہ میں رہتے ہوئے والدین کو رفع الیدین کی سنت کا احساس دلایا جائے اور اس سلسلہ میں ان کے ساتھ نرمی اور حسن سلوک کا برتاؤ کیا جائے۔ امید ہے کہ اللہ کے ہاں رفع الیدین جیسی اہم سنت پر عمل کرنے والا والدین کا نافرمان نہیں ٹھہرایا جائے گا۔ [واللہ اعلم]

سوال عورتوں کے لئے سونے کے زیورات جائز ہیں یا نہیں؟ اس کے عدم جواز پر ہمارے ہاں بعض علما چند احادیث پیش کرتے ہیں۔ وضاحت فرمائیں۔

جواب حدیث میں ہے کہ سونے کے زیورات مردوں کے لئے ناجائز ہیں جبکہ عورتوں کو اس کے پہنے کی اجازت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے میری امت کے مردوں کے لئے سونے اور ریشم کو حرام قرار دیا ہے اور عورتوں کو اس کے پہننے کی اجازت دی ہے۔" [نسائی، الزینۃ: ۵۲۶۷]

شیخ عبدالعزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ سے سونے کی بالیاں پہننے کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے بایں الفاظ جواب دیا۔ اللہ تعالیٰ کے درج ذیل عمومی فرمان کے پیش نظر عورتوں کے لئے سونا پہننا جائز ہے "کیا وہ جو زیورات میں پرورش پائے اور مباحثہ میں بھی صاف

صاف بات نہ کر سکے۔" [۴۳/الزخرف:۱۸]

اس جگہ پر اللہ تعالیٰ نے زیور کو عورت کے وصف کے طور پر بیان فرمایا کہ جو سونے اور غیر سونے کے لئے عام ہے۔

[فتاویٰ برائے خواتین،ص:۲۷۵]

جن روایات میں سونے کے زیورات پہننے کے متعلق وعید آئی ہے ان سے مراد وہ زیورات ہیں جنکی زکوۃ نہ ادا کی گئی ہو، جیسا کہ درج ذیل حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی،اس کے ہمراہ اس کی بیٹی بھی تھی جس کے ہاتھ میں سونے کے دو کنگن تھے۔آپ نے اس سے دریافت کیا تو اس کی زکوٰۃ دیتی ہے؟اس نے عرض کیا نہیں،آپ نے فرمایا:"کیا تجھے پسند ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کے بدلے تمہیں آگ کے دو کنگن پہنائے۔"یہ سن کر اس خاتون نے دونوں کنگن پھینک دیئے۔ [ابوداؤد،الزکوٰۃ:۱۵۶۳]

اس کے علاوہ دیگر قرائن سے بھی پتہ چلتا ہے کہ زمانۂ نبوت میں خواتین زیورات استعمال کرتی تھیں، جیسا کہ عید الفطر کے موقع پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی جھولی میں خواتین کی طرف سے زیورات ڈالنے کا ذکر حدیث میں آیا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال آج کل ہمارے معاشرے کے مسلمان کفار کی نقالی کرتے ہوئے نئے نئے فقرے استعمال کرتے ہیں، مثلاً: السلام علیکم کے بجائے ہیلو، ہائے ،او کے ،فائن اور گڈ وغیرہ اس قسم کے مسلمانوں کے متعلق ہمیں کیا موقف اختیار کرنا چاہیے،منع کرنے کے باوجود بھی باز نہیں آتے؟

جواب ہماری یہ بدقسمتی ہے کہ ہماری اکثریت یہود و نصاریٰ اور کفار و مشرکین کی نقالی پر فخر کرتی ہے۔جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا دین عطا فرمایا جس میں تمام شعبہ ہائے زندگی کے لئے راہنمائی موجود ہے۔اس کے باوجود ہم مغربی تہذیب کو پسند کرتے ہیں۔یہ نقالی لباس و زینت،تقریبات،چال ڈھال،خلق و عادات،شادی اور خوشی کے تمام مواقع پر مشتمل ہے۔اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہود و نصاریٰ کی نقالی سے مطلق طور پر منع فرمایا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ"اہل ایمان ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں اس سے پہلے کتاب دی گئی تھی۔" [۵۷/الحدید:۱۶]

اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ"اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو اہل کتاب کے اصولی اور فروعی مسائل میں نقالی کرنے سے منع فرمایا ہے۔" [ص:۳۱۰،ج۴]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ"جو شخص کسی کی مشابہت اختیار کرتا ہے وہ قیامت کے دن انہی میں اٹھایا جائے گا۔"

[ابوداؤد،ص:۱۷۳،ج۲]

ان واضح جوابات کے باوجود ہمارا کردار انتہائی قابل افسوس ہے کہ ہم فون کرتے وقت سلام کہنے کے بجائے لفظ ہیلو استعمال کرتے ہیں،اپنے حالات سے کسی کو آگاہ کرتے وقت الحمدللہ کہنے کے بجائے گڈ، فائن جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔اس ظاہری تہذیب و ثقافت کو اپنانے میں ہمارا باطن ضرور متاثر ہوتا ہے۔اس قسم کا طرز زندگی اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ہمیں اپنی تہذیب سے محبت کے بجائے مغربی کلچر سے زیادہ انس ہے۔اس قسم کے مسلمانوں کے ساتھ ہمارا رویہ ناصحانہ ہونا چاہیے،انہیں ہمدردی کے

ساتھ اپنے دین کی تعلیم دینی چاہیے۔ان سے بے رخی اختیار کرنا کسی صورت بھی صحیح نہیں ہے۔رسول اللہ ﷺ نے ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا تھا ''اے اللہ! میری قوم کو ہدایت فرما یہ اس کی قدر و قیمت سے نا آشنا ہیں۔'' [واللہ اعلم]

سوال ایک عورت جو نماز پانچگانہ پابندی سے ادا کرتی ہے اور باقاعدہ تلاوت قرآن بھی کرتی ہے، لیکن ہر وقت اسے فلمی گانوں کا جنون رہتا ہے۔اس کے علاوہ ٹی وی پر فلم اور ڈرامہ دیکھنے کا بھی شوق رکھتی ہے، اپنے سسرال کے ساتھ اچھا سلوک نہیں رکھتی بلکہ طیش میں آ کر بعض اوقات وہ اپنے خاوند کو بھی گالیاں دیتی ہے، اس کی اجازت کے بغیر وہ گھر سے باہر سیر و تفریح کے لئے چلی جاتی ہے۔ایسی عورت کے متعلق شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟

جواب قرآن کریم نے نماز کے بہت سے اوصاف میں سے ایک وصف بایں الفاظ بیان کیا ہے: ''یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے۔'' [۲۹/العنکبوت:۴۵]

یعنی نماز کا وصف لازم یہ ہے کہ وہ نمازی کو اخلاقی برائیوں سے روکتی ہے اور وصف مطلوب یہ ہے کہ اسے ادا کرنے والا فحش اور برے کاموں سے رک جائے۔اب رہا یہ سوال کہ آدمی نماز کی پابندی کرنے کے باوجود عملاً برائیوں سے باز کیوں نہیں آتا، جیسا کہ صورت مسئولہ میں اس کا ذکر کیا گیا ہے تو اس بات کا انحصار خود اس شخص پر ہے جو نماز پڑھتے وقت اصلاح نفس کی تربیت لے رہا ہے۔اگر وہ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے تو نماز کے اصلاحی اثرات اس پر ضرور مرتب ہوں گے اور اگر وہ اس کے برعکس اس کا اثر قبول کرنے کے لئے آمادہ ہی نہیں یا دانستہ اس کی تاثیر کو دفع کرتا ہے تو ایسے بدبخت کی شقاوت میں کیا شک ہے۔نماز کی قبولیت کا یہ ایک معیار ہے کہ نماز پڑھنے کے بعد انسان برائی کرنے سے رک جائے، ایسے حالات میں یقیناً اس کی نماز اللہ کے ہاں شرف قبولیت سے نوازی گئی ہے۔سوال میں ذکر کردہ نماز اور تلاوت قرآن کے علاوہ دیگر تمام کام ناجائز اور حرام ہیں۔ایسے حالات میں خاوند کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ خاموش تماشائی بننے کے بجائے اپنی بیوی کو احسن انداز سے وعظ و نصیحت کرے اور گھر میں رہتے ہوئے اپنے اختیارات کو استعمال کرے اور اصلاح احوال کی کوشش کرے۔اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ گھر میں ٹی وی کون لایا ہے؟ یہ زہر آلود پودا خاوند کا خود کاشت کردہ ہے، اگر وہ اسے گھر میں نہ لاتا تو اس تلخ حقیقت کا خطرہ دیکھنے سے محفوظ رہتا، پھر وہ عورت یہ سب برے کام خاوند کے سامنے کرتی ہے آخر وہ کس مرض کا علاج ہے، عین ممکن ہے کہ خاوند خود بھی ایسی باتوں کا عادی ہو اور اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بیوی میں یہ عادات بد پڑ گئی ہوں۔قرآن کریم کی اس نصیحت پر عمل کرنا چاہیے:

''اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آتش جہنم سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔'' [۶۶/التحریم:۶]

ان حالات کے پیش نظر خاوند کو چاہیے کہ وہ خود اپنی اور اپنی بیوی کی اصلاح کی طرف توجہ دے اور اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داری کا احساس کرے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے ہاں دو نئے کام شروع ہو چکے ہیں، یعنی اجتماعی اعتکاف کے لئے درخواستیں وصول کی جاتی ہیں اور طاق راتوں میں وعظ و نصیحت کی مجالس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔اس اجتماعی اعتکاف اور اجتماعی مجالس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب اعتکاف کا مطلب یہ ہے کہ آدمی عبادت کے لئے رمضان کے آخری دس دن عبادت میں گزارے اور یہ دن اللہ کے

ذکر کے لئے مختص کر دے۔ رسول اللہ ﷺ ہر سال ماہ رمضان میں دس دن کا اعتکاف کرتے تھے اور جس سال آپ فوت ہوئے اس سال بیس دن کا اعتکاف فرمایا تھا۔ [صحیح بخاری، الصوم، الاعتکاف: ۲۰۴۴]

احادیث میں اعتکاف کرنے کی بہت فضیلت بیان ہوئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جو شخص اللہ کی رضا جوئی کے لئے صرف ایک دن کا اعتکاف کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے اور جہنم کے درمیان تین خندقوں کو حائل کر دیں گے۔ ایک خندق کے دونوں کناروں کا فاصلہ مشرق سے مغرب تک ہوگا۔'' [قیام رمضان بحوالہ طبرانی باسناد حسن]

رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں بحالت اعتکاف عبادت کے لئے اتنی محنت اور مشقت اٹھاتے کہ دوسرے دنوں میں اتنی کوشش نہ کرتے تھے۔ [صحیح مسلم، الاعتکاف: ۱۱۷۵]

روایت میں اس کوشش کی تفصیل بھی بیان ہوئی ہے رسول اللہ ﷺ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں عبادت کے لئے کمر بستہ ہو جاتے۔ رات کو عبادت کر کے اسے زندہ رکھتے اور اپنے اہل و عیال کو عبادت کے لئے بیدار کرتے۔

[صحیح بخاری، الصوم: ۲۰۲۴]

حضرت زینب بنت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ جب رمضان ختم ہونے میں دس دن باقی رہ جاتے گھر میں ہر اس فرد کو نیند سے اٹھا دیتے جو قیام کی طاقت رکھتا تھا۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتکاف اور طاق راتوں کا قیام ایک انفرادی عبادت ہے۔ صرف نماز تراویح کو ادا کرنے میں اجتماعیت کو برقرار رکھنے کی گنجائش ہے، اس کے علاوہ کسی مقام پر اجتماعیت نظر نہیں آتی، اس لئے ہمیں ان قیمتی دنوں اور سنہری راتوں کو اجتماعی اعتکاف اور اجتماعی مجالس کی نذر نہیں کر دینا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''جو شخص ہمارے دین میں کسی نئی چیز کو رواج دیتا ہے جس کا تعلق دین سے نہیں ہے، وہ مردود ہے۔'' [صحیح بخاری، الصلح: ۲۶۹۷]

اسی طرح آپ کا فرمان ہے کہ ''جس شخص نے ایسا کام کیا جس پر ہمارا امر نہیں ہے وہ رد کر دینے کے قابل ہے۔''

[صحیح بخاری، باب نمبر: ۶۰]

ان احادیث کا تقاضا ہے کہ ایسے اعمال و افعال سے اجتناب کیا جائے، جن کا کتاب و سنت سے ثبوت نہیں ملتا، کیونکہ بدعات کے ارتکاب سے ثواب کے بجائے الٹا گناہ کا اندیشہ ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال احادیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ باہمی دوڑ میں مقابلہ کیا تھا، اس مقابلے کو عورتوں کے لئے کھیل کود کو جائز قرار دینے کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے؟

جواب جس واقعہ کو سوال میں ذکر کیا گیا ہے اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ شریک سفر تھیں، جبکہ آپ کی عمر زیادہ نہ تھی نہ ہی آپ کا جسم فربہ ہوا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا: ''تم ذرا آگے چلے جاؤ۔'' جب وہ تعمیل کرتے ہوئے کچھ آگے چلے گئے تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ ''تم میرے ساتھ دوڑ میں مقابلہ کرو۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں دوڑتے ہوئے آپ سے آگے بڑھ گئی، پھر عرصہ دراز کے بعد ایک مرتبہ

پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے شریک سفر تھیں، آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا ''کہ تم ذرا آگے چلے جاؤ۔'' پھر آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ ''تم میرے ساتھ دوڑ میں مقابلہ کرو۔'' اس وقت آپ پہلے واقعہ کو بھول چکی تھیں اور جسم بھی فربہ ہو چکا تھا، فرمانے لگیں کہ میں اس حالت میں کیسے دوڑ سکتی ہوں، آپ نے فرمایا کہ ''ایسا نہیں ہوسکتا آپ کو دوڑ میں شریک ہونا ہوگا۔'' چنانچہ میں نے آپ سے دوڑ میں مقابلہ کیا تو آپ آگے بڑھ گئے اور میں پیچھے رہ گئی، آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ ''میں نے پہلے مقابلے کا بدلہ چکا دیا ہے۔'' [مسند امام احمد، ص: ۲۶۴، ج ۶]

واقعہ بیوی خاوند کے درمیان پیش آیا، اسے اوپن مقابلوں میں عورت کے شریک ہونے کے لئے کیونکر بنیاد بنایا جاسکتا ہے، اس سے مقصود اچھے انداز میں معاشرتی زندگی کی تکمیل اور میاں بیوی کے درمیان محبت و الفت کا حصول تھا۔ اس بنا پر اس واقعہ سے اس جیسے عمل کے لئے ہی استدلال لیا جاسکتا ہے، تاہم دین میں اتنی تنگی نہیں ہے کہ اگر عورتوں نے تفریح طبع کے طور پر کھیلنا ہے تو اس کے لئے درج ذیل پابندیوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا:

☆ مقابلہ خواتین کے مابین ہو اور انہیں دیکھنے والی بھی عورتیں ہی ہوں۔

☆ عورتوں کی جسمانی ساخت کے پیش نظر وہ ہلکی پھلکی کھیل میں حصہ لیں جس سے ان کی نسوانیت اور وقار مجروح نہ ہو۔

☆ مقابلہ اوپن نہیں ہونا چاہیے تاکہ وہ کسی قسم کا فتنہ فساد انگیزی کا باعث نہ ہو۔

لیکن آج کل عورتیں نیکریں پہن کر اپنے قابل ستر حصوں کو نمایاں کر کے کھیلوں میں شریک ہوتی ہیں، پھر اس مقابلے کو ٹی وی پر نشر کیا جاتا ہے، مرد حضرات اسے دیکھتے ہیں بلکہ میدان مقابلہ میں موجود ہوتے ہیں، ان کھیلوں سے ان کی نسوانیت بھی مجروح ہوتی ہے، ایسے حالات میں عورتوں کا کھیلوں کے مقابلہ میں حصہ لینا حرام اور ناجائز ہے۔ اس قسم کی مقابلہ بازی سے انہیں باز رکھنا انتہائی ضروری ہے تاکہ شر و فساد کا دروازہ نہ کھلے۔ [واللہ اعلم]

سوال عورت کا اپنے محرم رشتہ داروں، مثلاً: خاوند، بھائی، بیٹا اور باپ وغیرہ سے ملاقات کے وقت مصافحہ کرنا شرعاً کیسا ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق احادیث میں ہے کہ آپ عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے عورتوں سے بیعت لیتے ہوئے فرمایا کہ ''میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔'' [نسائی، بیعہ: ۱۸]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ کبھی کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں لگا، آپ صرف زبانی طور پر بیعت لیتے تھے۔ [صحیح مسلم، الامارات: ۸۸]

مصافحہ کرنے کے متعلق مذکورہ پابندی صرف غیر محرم عورتوں سے متعلق ہے، کیونکہ ان سے مصافحہ کرنا دونوں جانب فتنہ و فساد کے اسباب پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ البتہ عورتوں کا عورتوں اور محرم رشتہ داروں، مثلاً: باپ، بیٹا، بھائی اور خاوند وغیرہ سے مصافحہ کرنا تو اس میں چنداں حرج نہیں ہے، کیونکہ جب بیوی اور بیٹی کا بوسہ لیا جاسکتا ہے تو ان سے مصافحہ کرنا بالاولیٰ جائز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیویوں کا بوسہ لینا ثابت ہے۔ [صحیح بخاری، الصوم: ۱۹۲۹]

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ اپنی لخت جگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بوسہ لیا تھا۔ [صحیح بخاری، مناقب الانصار: ۳۹۱۸]

جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتیں تو آپ ان سے مصافحہ کرتے اور ان کا بوسہ لیتے، نیز اپنی جگہ پر بٹھاتے۔ [ابوداؤد، الادب: ۵۲۱۷]

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر جاتے تو وہ بھی آپ سے مصافحہ کرتیں اور بوسہ دیتیں، نیز آپ کو اپنی جگہ پر بٹھاتیں۔ [ترمذی، المناقب: ۳۸۷۲]

ان احادیث و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت اپنے محرم رشتہ داروں سے ملاقات کے وقت مصافحہ کرسکتی ہے اور ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہم جنوبی ایشیا کے لوگ ہندووانہ رسم و رواج سے بہت متاثر ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں جس عورت کا خاوند فوت ہوجاتا ہے تو اسے الگ کمرہ میں محدود کردیا جاتا ہے۔ اس کے لیے کسی کے سامنے آنا، بات کرنا یا کسی کام کاج کے لئے کوشش کرنا ممنوع قرار پاتا ہے، اس کے ساتھ ہتک آمیز رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ہمیں بتایا جائے کہ خاوند کی وفات کے بعد شرعی طور پر اس پر کون کون سی پابندیاں عائد ہوتی ہیں اور وہ عدت کے ایام کیسے بسر کریں؟

جواب شریعت اسلامیہ میں جس عورت کا خاوند فوت ہوجائے اسے چار ماہ دس دن بطور عدت گزارنا ہوتے ہیں اور عدت سے مراد وہ ایام ہیں جو زوال نکاح کے بعد عورت کو نکاح ثانی کے انتظار میں گزارنا لازم ہوتے ہیں۔ اس عدت وفات میں سوگ کا بھی حکم ہے، یعنی بیوہ ہوجانے والی عورت کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ عدت کی پوری مدت میں سوگ منائے جو چیزیں زینت اور سنگھار کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔ وہ اس عدت میں بالکل استعمال نہ کرے۔ الغرض اس پوری مدت میں بیوہ اس طرح رہے کہ اس کی شکل و صورت، لباس و ہیئت سے اس کی بیوگی اور غمزدگی ظاہر ہو اور دوسروں کو بھی اس کی ظاہری حالت محسوس ہو کہ خاوند کی وفات کا اسے ویسا ہی رنج ہے، جیسا کہ ایک شریف اور پاک دامن بیوی کو ہونا چاہیے۔ خاوند کے علاوہ کسی دوسرے قریبی رشتہ دار، مثلاً: بھائی، باپ اور بیٹے کے انتقال پر سوگ منایا جاسکتا ہے، لیکن اس کی مدت صرف تین دن ہے۔ اس سے زیادہ منع ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''کسی اہل ایمان خاتون کے لئے لائق نہیں کہ وہ کسی مرنے والے قربت دار کی موت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرے، ہاں، خاوند کی وفات پر چار ماہ دس دن سوگ کرنے کا حکم ہے۔'' [صحیح بخاری، الطلاق: ۵۳۳۵]

اس سوگ منانے میں بیوہ پر کیا پابندیاں ہیں اس کی وضاحت درج ذیل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس عورت کے شوہر کا انتقال ہوگیا ہو وہ کسم کے رنگے ہوئے اور اسی طرح سرخ گیرو سے رنگے ہوئے کپڑے نہ پہنے، زیورات پہننے پر بھی پابندی ہے، نہ خصاب (مہندی وغیرہ) استعمال کرے اور نہ سرمہ لگائے۔'' [ابوداؤد، الطلاق: ۲۳۰۴]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں خواتین زیب و زینت کے لئے کپڑے رنگتی تھی، وہ زیادہ تر دو چیزیں استعمال کرتی تھیں، زرد رنگ کے لئے کسم اور سرخ رنگ کے لئے گیرو وغیرہ، اس لئے حدیث میں خاص طور پر ان دو چیزوں کی ممانعت کا ذکر ہے، ورنہ ان

کی خصوصیت نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ ایسے رنگین اور شوخ کپڑے استعمال نہ کئے جائیں جو زیب و زینت کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح زیورات اور سرمہ مہندی وغیرہ جیسی دیگر اشیاء بھی استعمال نہ کی جائیں۔ جو زیب و زینت اور سنگھار کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ زمانۂ عدت میں سوگ کے ان احکام کا مقصد یہی ہے کہ خاوند کے انتقال کا بیوی کو جو رنج و صدمہ ہو اس کا اثر دل اور باطن کی طرح ظاہر، یعنی جسم اور لباس میں بھی ہو، یہ جو ہر نسوانیت کا فطری تقاضا ہے اور اسی میں نسوانیت کا شرف ہے۔

اگر آنکھیں خراب ہوں اور کوئی دوا دستیاب نہ ہو تو سرمہ کو بطور دوائی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اسے رات کے وقت ڈالا جائے اور دن کے وقت اسے صاف کر دیا جائے، جیسا کہ حدیث میں بیان ہے کہ ایک عورت کا خاوند فوت ہو گیا اسے آنکھوں میں کچھ شکایت تھی تو وہ جلا نامی سرمہ استعمال کرتی تھیں، پھر انہوں نے اپنی لونڈی کو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس مسئلہ دریافت کرنے کے لئے بھیجا کہ سرمہ بطور دوا استعمال کریں یا رہنے دیں، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ اسے استعمال نہ کریں، ہاں اگر بہت ضروری ہو تو رات کو لگائیں اور دن کے وقت اسے صاف کر دیں۔ اس کے بعد انہوں نے مزید فرمایا کہ جب میرے خاوند ابو سلمہ رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے اور میں نے مصبر (ایلوا) آنکھوں پر لگا رکھا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ ''دوران عدت تم نے یہ کیا لگا رکھا ہے؟'' میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس میں کسی قسم کی خوشبو نہیں ہے، آپ نے فرمایا: ''یہ چہرے کو جوان اور خوبصورت بناتا ہے اگر ضرورت ہو تو رات کو لگا لیا کرو لیکن دن کے وقت اسے صاف کر دیا کرو۔'' [ابوداؤد، الطلاق: ۲۳۰۵]

مندرجہ ذیل حدیث کی روشنی میں بیوہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوران عدت درج ذیل چیزوں سے پرہیز کرے:

☆ ہر قسم کی خوشبو سے اجتناب کیا جائے اگر خوشبودار صابن ہے تو نہانے کے لئے اسے استعمال نہ کیا جائے، اسی طرح خوشبودار تیل اور عطریات وغیرہ کے استعمال سے بھی پرہیز کرے، ہاں، ایام سے فراغت کے بعد ناگواری دور کرنے کے لئے حسب ضرورت خوشبو استعمال کر سکتی ہے۔ [صحیح بخاری، الطلاق: ۵۳۴۱]

☆ بیوہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ عدت کے ایام اپنے گھر گزارے، بلاوجہ گھر سے باہر نہ نکلے، اگر گھر سے نکلنے کی ضرورت ہو تو رات کے وقت اپنے گھر واپس آ جائے۔

☆ ہر قسم کی زیب و زینت کو ترک کر دے اس میں حسب ذیل تین چیزیں شامل ہیں:

(الف) جو چیز بھی فی نفسہ زینت کے لئے استعمال ہو، مثلاً: مہندی لگانا، ہونٹوں پر سرخی کا استعمال اور چہرے کے لئے کریم یا پاؤڈر وغیرہ اسی طرح سرمہ وغیرہ کا استعمال، ان تمام چیزوں سے اجتناب کرے۔

(ب) اور کپڑے جو زینت کے لئے استعمال ہوتے ہیں، اس میں مختلف قسم کے رنگین اور ڈیزائن دار کپڑے آ جاتے ہیں، بیوہ کو چاہیے کہ وہ دوران عدت سادہ اور عام کپڑے استعمال کرے۔

(ج) زیورات ہر قسم کے زیورات، یعنی بالیاں، پازیب، کنگن، ہار، انگوٹھی وغیرہ زیورات، خواہ سونے کے ہوں یا چاندی کے، یعنی جو بھی بطور زینت استعمال ہوتے ہوں انہیں استعمال کرنا صحیح نہیں ہے۔

اگر چہ ہمارے ہاں اس سلسلہ میں افراط وتفریط سے کام لیا جاتا ہے لیکن دور جاہلیت کی طرح ناروا قسم کی پابندی لگانا کسی صورت میں صحیح نہیں ہے، جیسا کہ شرعی پابندیوں سے آزادی بھی صحیح نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ہمارے معاشرے میں بزرگ حضرات چھوٹی بچیوں کے سر پر پیار دیتے ہیں، اس پر کچھ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ شرعاً ایسا کرنا جائز نہیں ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب محبت بھرے جذبات سے خیر وبرکت کی دعائیں دیتے ہوئے بزرگوں کا بچوں اور بچیوں کے سر پر ہاتھ پھیرنے کو ہمارے معاشرہ میں ''پیار'' کہا جاتا ہے۔ دین اسلام نے اسے مشروع قرار دیا ہے، چنانچہ حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میری خالہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئیں، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرا یہ بھانجا بیمار ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرے لئے خیر وبرکت کی دعا فرمائی۔ [صحیح بخاری، المرضیٰ: ۵۶۷۰]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے کہ ''بچوں کے لئے خیر وبرکت کی دعا کرتے ہوئے ان کے سر پر ہاتھ پھیرنا۔'' [صحیح بخاری، الدعوات، باب نمبر: ۳۱]

ولید بن عقبہ کہتے ہیں کہ فتح مکہ کے موقع پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں تشریف لائے تو اہل مکہ اپنے بچوں کو آپ کی خدمت میں پیش کرتے، آپ ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے اور ان کے لئے دعائے خیر کرتے۔ [مسند امام احمد، ص: ۳۲، ج ۴]

حضرت جریج رحمۃ اللہ علیہ پر جب تہمت زنا لگی تو اس واقعہ میں نومولود کے سر پر ہاتھ پھیرنے کا ذکر ملتا ہے۔ [مسند امام احمد، ص: ۴۳۴، ج ۲]

اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلی امتوں میں بھی یہ فطرتی رسم قائم تھی، جسے اسلام نے بھی برقرار رکھا ہے بلکہ یتیم بچے کے سر پر ہاتھ پھیرنے کو بہت اہمیت دی ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ''جس نے یتیم بچے یا بچی کے سر پر ہاتھ پھیرا، اس سے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی مقصود تھی تو ہاتھ کے نیچے آنے والے ہر بال کے عوض اسے نیکیاں دی جائیں گی۔''

[مسند امام احمد، ص: ۲۵۰، ج ۵]

ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی سنگدلی کا شکوہ کیا تو آپ نے بطور علاج یہ نسخہ تجویز کیا کہ ''یتیم کے سر پر ہاتھ پھیر اور مسکین کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کیا کر اس سے تیرا دل نرم ہو جائے گا۔'' [مسند امام احمد، ص: ۲۶۳ ج ۲]

زیر بحث مسئلہ کی متعدد صورتیں ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ بزرگ مرد محرم ہو تو اس کا اپنے سے چھوٹوں کو پیار دینا، خواہ وہ بالغ ہی کیوں نہ ہوں۔

☆ بزرگ عورت محرمات سے ہے، اس کا اپنے سے عمر میں چھوٹوں کو پیار دینا، خواہ وہ حد بلوغ کو پہنچ چکے ہوں۔

☆ بزرگ مرد غیر محرم یا عورت غیر محرمہ کا نابالغ بچوں اور بچیوں کو پیار دینا، اس کے جواز میں دو آراء نہیں ہو سکتیں، البتہ درج ذیل صورتوں میں اختلاف ہے۔

☆ بزرگ مرد غیر محرم ہو وہ اپنی رشتہ دار بالغ بچیوں کے سر پر ہاتھ پھیرے۔

☆ بزرگ عورت غیر محرمات سے ہو وہ اپنے رشتہ دار بالغ بچوں کو پیار دے۔

ان آخری دونوں صورتوں کے متعلق مختلف علما سے رابطہ کرنے کے بعد دو موقف سامنے آئے ہیں:

① ایسا کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ شریعت میں اس کا ثبوت نہیں۔

② ایسا کرنا جائز ہے کیونکہ شریعت نے اس سے منع نہیں کیا۔

فریقین کے دلائل پیش کرنے کے بعد آخر میں ہم اپنا موقف بیان کریں گے۔ جو حضرات اسے ناجائز قرار دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ ہمارے لئے بہترین نمونہ ہیں۔ آپ نے کبھی کسی بالغ بچی کے سر پر ہاتھ نہیں پھیرا حالانکہ آپ تمام لوگوں میں زیادہ پرہیزگار اور اللہ سے ڈرنے والے تھے۔ نیز وہ امت کے لئے روحانی باپ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بلکہ بعض مواقع پر آپ نے ایسے ارشادات فرمائے ہیں جن کے عموم سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے، مثلاً:

(الف) عورتوں سے بیعت لیتے وقت بعض خواتین کی طرف سے خواہش کا اظہار ہوا کہ یارسول اللہ! آپ ہم سے مصافحہ کیوں نہیں کرتے تو آپ نے فرمایا: ''میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔'' [مسند امام احمد، ص:۳۵۷، ج۶]

جب بیعت کے وقت رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ کسی عورت کے ہاتھ سے نہیں لگا تو عام آدمی کے لئے عورتوں کے سر پر ہاتھ پھیرنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے جبکہ یہ آدمی اس کے لئے اجنبی کی حیثیت رکھتا ہے۔

(ب) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا ہے کہ اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ نے کبھی کسی عورت کے ہاتھ کو چھوا تک نہیں۔ [صحیح بخاری، الشروط:۲۷۱۳]

جب رسول اللہ ﷺ جو خیر البشر ہیں قیامت کے دن اولاد آدم کے سردار ہوں گے ان کے مبارک ہاتھوں نے کسی عورت کے ہاتھ کو چھوا تک نہیں تو دوسرے غیر مردوں کے لئے کس طرح اجنبی عورتوں کے سر پر ہاتھ پھیرنا جائز ہو سکتا ہے۔

(ج) جو عورت مرد کے لئے حلال نہیں ہے اسے ہاتھ لگانا بہت سنگین جرم ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر آدمی کے سر میں نوک دار لوہے سے سوارخ کر دیا جائے تو یہ اس بات سے بہتر ہے کہ وہ کسی ایسی عورت کو ہاتھ لگائے جو اس کے لئے حلال نہیں ہے۔'' [ترغیب وترہیب، ص:۳۹، ج۳]

امام منذری رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو بیہقی اور طبرانی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ طبرانی کے راویوں کو صحیح کے راوی قرار دیا ہے۔ اسی طرح علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو امام رویانی کے حوالہ سے بیان کیا ہے اور اس پر صحیح ہونے کا حکم لگایا ہے۔ [الاحادیث الصحیحۃ ۲۲۶]

اس حدیث کی رو سے بھی اجنبی عورت کو ہاتھ لگانے کی حرمت ثابت ہوتی ہے، البتہ کسی ناگہانی ضرورت کے پیش نظر عورت کو ہاتھ لگانے میں چنداں حرج نہیں، مثلاً: بیماری کی حالت میں ڈاکٹر یا طبیب کا نبض دیکھنا یا مکان میں آگ لگنے کی صورت میں اسے پکڑ کر مکان سے باہر نکالنا، لیکن پیار دیتے وقت اس کے سر پر ہاتھ لگانا کوئی حقیقی ضرورت نہیں۔ جو حضرات بزرگوں کے لئے اجنبی عورت کو پیار دینے کے متعلق نرم گوشہ رکھتے ہیں ان کے پاس کوئی نقلی دلیل نہیں ہے، البتہ وہ عقلی اعتبار سے کہتے ہیں کہ یہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے جو معاشرہ کے رسم و رواج سے تعلق رکھتا ہے۔ چونکہ شریعت نے اس سے منع نہیں کیا، اس لئے ایسا کرنا جائز ہے،

پھر ایسا کرنے سے تبلیغ وغیرہ کا بھی موقع ملتا ہے کہ اگر وہ ننگے سر ہو تو سمجھایا جا سکتا ہے۔ شریعت نے معاشرہ میں رائج ''معروف'' کو بہت حیثیت دی ہے، اس لئے اسے جائز ہونا چاہیے، پھر ایسے موقع پر کسی قسم کے منفی جذبات ابھرنے کا موقع بھی نہیں ہوتا۔ جن کے پیش نظر اسے ممنوع قرار دیا جا سکے، اگر اندیشہ ہو تو اس کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کی مؤخر الذکر حدیث کا تعلق ایسے حالات سے ہے جب ہاتھ لگانے والا دل کا کوڑھ اور نیت میں فتور رکھتا ہو۔ ہم نے انتہائی دیانتداری کے ساتھ فریقین یعنی مانعین اور مجوزین کے دلائل قارئین کے سامنے رکھ دیئے ہیں، ہمارا رجحان یہ ہے کہ تقویٰ اور پرہیز گاری کے پیش نظر اس سے اجتناب کیا جائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے عمر رسیدہ عورت کو پردہ کے سلسلہ میں کچھ نرمی دی ہے اس کے باوجود فرمایا ہے کہ ''اگر وہ اس نرمی کو استعمال کرنے سے پرہیز کریں تو یہی بات ان کے حق میں بہتر ہے۔'' [۲۴/النور:۶۰]

البتہ مجوزین حضرات کے موقف کو بالکل نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس کے پیش نظر اگر کوئی برخوردار عمر رسیدہ خاتون کے سامنے سر جھکا دے یا کوئی برخورداری اپنے کسی بزرگ کے سامنے پیار لینے کے لئے اپنا سر آگے کر دے تو ان کی حوصلہ شکنی نہیں کرنی چاہیے، البتہ مسئلہ کی صحیح صورت حال سے انہیں ضرور آگاہ کر دیا جائے۔ ہمارے بعض خاندانوں میں ایسے موقع پر گلے ملنے کا رواج ہے لیکن اس کی کسی صورت میں اجازت نہیں دی جا سکتی ہے۔ اسی طرح سر پر ہاتھ پھیرتے وقت اگر کسی قسم کی شہوانی تحریک پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو بھی اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال میرے بھانجے کی شادی میری بھتیجی کے ساتھ ہونا طے پائی، منگنی وغیرہ تین سال قبل ہو چکی ہے جبکہ نکاح ۲۴ دسمبر ۲۰۰۴ء کو متوقع ہے۔ شومئی قسمت سے میرے بھانجے نے از راہ ہمدردی کسی کو اپنا خون دینے کا ارادہ کیا، جب خون چیک کرایا تو پتہ چلا کہ اسے ہیپاٹائٹس سی کا مرض ہے کچھ ڈاکٹر حضرات کی رائے ہے کہ بھانجے کی شادی اس بھتیجی سے نہ کی جائے، کیونکہ شادی کے بعد بیماری کے جراثیم بھتیجی میں منتقل ہو سکتے ہیں اور اس کے لئے جان لیوا ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس صورتحال کے پیش نظر بھتیجی کے والدین اس شادی سے خوف زدہ ہیں کہ اس کے نکاح سے ہماری بیٹی زیادہ متاثر ہو گی، شادی نہ ہونے سے یہ بھی اندیشہ ہے کہ وہ قریبی رشتہ داروں کے درمیان جدائی اور قطع تعلقی پیدا ہو جائے۔ برائے مہربانی قرآن وسنت کی روشنی میں دونوں خاندانوں کی صحیح راہنمائی فرمائیں آپ کے جواب کا شدت سے انتظار ہے؟

جواب دور جاہلیت میں توہم پرستی عام تھی، یعنی بیماریوں کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ وہ اللہ کے حکم سے بالا بالا ذاتی اور طبعی طور پر متعدی ہیں گویا وہ اڑ کر دوسروں کو چمٹ جاتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس عقیدہ کا ابطال کرتے ہوئے فرمایا کہ ''کوئی بیماری متعدی نہیں ہوتی۔'' [صحیح بخاری، الطب:۵۷۷۲]

اس حدیث میں واضح مفہوم یہ ہے کہ کوئی بیماری طبع کے اعتبار سے دوسروں کو نہیں لگتی، بلکہ اللہ کے حکم اور اس کی تقدیر سے دوسروں کو لگتی ہے، جیسا کہ ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے دور جاہلیت کے عقیدہ فاسد کی نفی کرتے ہوئے فرمایا کہ ''کوئی بیماری متعدی نہیں ہوتی۔'' تو ایک اعرابی کھڑا ہو کر عرض کرنے لگا: ہمارے اونٹ ریتلے میدان میں ہرنوں کی طرح ہوتے ہیں جب ان کے ہاں کوئی خارشی اونٹ آ جاتا ہے تو سب اونٹ خارش زدہ ہو جاتے ہیں، اس کے جواب میں رسول

اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پہلے اونٹ کو خارشی کس نے بنایا تھا۔'' [صحیح بخاری، الطب: ۵۷۷۵]

آپ کا یہ جواب انتہائی حکمت بھرا تھا کیونکہ اگر وہ جواب دیتا کہ پہلے اونٹ کو بھی کسی دوسرے اونٹ سے خارش کی بیماری لگی تھی تو یہ سلسلہ لامتناہی ہو جاتا اور اگر یہ جواب دیتا کہ جس ہستی نے پہلے اونٹ کو خارشی بنایا اسی نے دوسرے میں خارش پیدا کر دی تو یہی مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے تمام اونٹوں میں یہ فعل جاری کیا ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے علم سے بھی اس جاہلانہ عقیدہ کی بیخ کنی کی ہے۔ چنانچہ آپ نے ایک مجذوم، یعنی کوڑھی کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے ساتھ کھانا کھلانے کے لئے اپنے پیالہ پر ہی بٹھا لیا اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اور اس کا نام لے کر کھاؤ۔'' [ترمذی: ۱۸۱۷]

صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی سیرت طیبہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، چنانچہ ایک غلام کوڑھ کی مرض میں مبتلا تھا وہ آپ کے برتنوں میں کھاتا اور آپ ہی کے پیالہ میں پانی پیتا اور بعض دفعہ آپ کے بستر پر لیٹ بھی جاتا تھا۔ [فتح الباری، ص: ۱۹۷، ج ۱۰]

ان احادیث و واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے امراض کے وبائی طور پر لگ جانے کی نفی فرمائی ہے۔ البتہ ان کے بالاسباب متعدی ہونے کا اثبات فرمایا ہے، یعنی اصل موثر حقیقی تو اللہ کی ذات گرامی ہے اور اس نے بعض ایسے اسباب پیدا کئے ہیں جن کے پیش نظر امراض معتدی ہو جاتے ہیں، جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ جب آپ نے امراض کے ذاتی طور پر متعدی ہونے کی نفی فرمائی تو حدیث کے آخر میں فرمایا کہ ''مجذوم، یعنی کوڑھی انسان سے اس طرح بھاگو جس طرح شیر سے بھاگتے ہو۔''

[صحیح بخاری، الطب: ۵۷۰۷]

نیز آپ نے ضعیف الاعتقاد لوگوں کی رعایت کرتے ہوئے ایسا فرمایا کہ اللہ کی تقدیر کے سبب بیماری لگ جانے سے ان کے عقیدہ میں مزید خرابی نہ پیدا ہو کہ وہ کہنے لگیں: ''ہمیں تو فلاں شخص سے بیماری لگی ہے'' حالانکہ بیماری لگانے والا اللہ ہے۔ اس موقف کی تائید ایک روایت سے ہوتی ہے کہ جب آپ نے امراض کے متعدی ہونے کی نفی فرمائی تو آخر میں فرمایا: ''بیمار اونٹوں کو تندرست اونٹوں کے پاس مت لے جاؤ۔'' [صحیح بخاری، الطب: ۵۷۷۱]

امراض کے بالاسباب متعدی ہونے اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کے عقائد کی حفاظت کے پیش نظر آپ نے فرمایا: ''جس علاقہ میں طاعون کی وبا پھیلی ہو وہاں مت جاؤ اور اگر تم وہاں رہائش رکھے ہوئے ہو تو راہ فرار اختیار کرتے ہوئے وہاں سے مت نکلو۔''

[صحیح بخاری، الطب: ۵۷۳۰]

امراض کے بالاسباب متعدی ہونے میں بھی اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اصل مؤثر حقیقی اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات ہے ضروری نہیں ہے کہ سبب کی موجودگی میں بیماری بھی آموجود ہو کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ سبب موجود ہوتا ہے لیکن بیماری نہیں آتی، بیماری کا آنا یا نہ آنا اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے اگر وہ چاہے تو سبب کو مؤثر کر کے وہاں بیماری پیدا کر دے، اگر چاہے تو سبب کو غیر مؤثر کر کے وہاں بیماری پیدا نہ کرے۔ [فتح الباری، ص: ۱۹۸، ج ۱۰]

اس بات کا ہم خود بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ جس علاقہ میں وبائی امراض پھوٹ پڑتی ہیں وہاں تمام لوگ ہی اس کا شکار نہیں ہو جاتے بلکہ اکثر و پیشتر ان کے اثرات سے محفوظ رہتے ہیں۔ طبی لحاظ سے اس کی تعبیریوں کی جاسکتی ہے کہ جن لوگوں میں قوت

مدافعت زیادہ ہوتی ہے وہ بیماری کا مقابلہ کرکے اس سے محفوظ رہتے ہیں اور جن میں یہ قوت کم ہوتی ہے وہ بیماری کا لقمہ بن جاتے ہیں۔اس وضاحت کے بعد ہم مذکورہ سوال کا جائزہ لیتے ہیں۔اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغربی تہذیب کے علمبردار (یہود و نصاریٰ) یہ نہیں چاہتے کہ مسلمان اعتقادی، عملی اور اخلاقی و مالی اعتبار سے مضبوط ہوں، وہ آئے دن انہیں کمزور کرنے کے لئے منصوبہ بندی کرتے رہتے ہیں۔ہمارے خیال میں ہیپاٹائٹس کے متعلق میڈیا پر شور وغل اور چیخ و پکار بھی مسلمانوں کو اعتقادی اور مالی لحاظ سے کمزور کرنے کا ایک مؤثر اور سوچا سمجھا منصوبہ ہے ہم دیکھتے ہیں کہ جب سے اس کے متعلق غیر فطرتی چرچا شروع ہوا ہے، گھروں میں کوئی نہ کوئی اس مرض کا شکار ہے۔ایک گھر میں رہتے ہوئے بھائی، بہن، بیٹا، باپ، ماں اور بیوی خاوند اس اچھوت میں مبتلا ہو گئے ہیں، پہلے تو اس کے ٹیسٹ بہت مہنگے ہیں ہزاروں روپیہ ان کی نذر ہو جاتا ہے پھر اس کا علاج اس قدر گراں ہے کہ عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔جو گھر کے باشندے اس مرض سے محفوظ ہیں انہیں حفاظتی تدابیر کے چکر میں ڈال کر پھانس لیا جاتا ہے۔حفاظتی ٹیکے بہت مہنگے اور بڑی مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں۔عوام کو خوفزدہ کرنے کے لئے یرقان کا نام بدل کر ہیپاٹائٹس کا نام رکھ دیا گیا ہے۔یہ مرض پہلے بھی موجود تھی لیکن اس کے جراثیم دیکھے نہیں جا سکتے تھے اس لئے نفسیاتی طور پر لوگوں کو آرام اور سکون تھا۔جب سے خوردبینی آلات ایجاد ہوئے ہیں تو ہیپاٹائٹس، اے، بی، سی دریافت ہوا۔ہماری معلومات کے مطابق ڈی بھی دریافت ہو چکا ہے اس کے متعلق تحقیق و ریسرچ جاری ہے۔ہمارے خیال کے مطابق مسلمانوں کے عقائد اور ان کی مالی حالت کو کمزور کرنے کا یہ مغربی پروپیگنڈا ہے، جس کی وجہ سے ہم توہم پرستی کا شکار ہو گئے ہیں اور علاج اس قدر مہنگا ہے کہ ہم قرض پکڑ کر اس کا علاج کراتے ہیں، ان حالات کے پیش نظر ہمارا سائل کو مشورہ ہے:

① اللہ تعالیٰ پر اعتقاد اور یقین رکھتے ہوئے حسب پروگرام شادی کر دی جائے۔اس پروپیگنڈے سے خوفزدہ ہو کر اسے معرض التوا میں ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

② اگر والدین اس قدر پریشان ہیں کہ انہوں نے طے شدہ پروگرام کو ختم کرنے کا ارادہ کر لیا ہے تو ہمارے نزدیک یہ گناہ ہے کیونکہ ایسا کرنا صلہ رحمی کے خلاف ہے اور مغربی اثرات سے متاثر ہونا بھی مسلمانوں کی شان کے خلاف ہے۔

③ اگر والدین اس پروپیگنڈے سے متاثر ہیں تو طے شدہ تاریخ پر نکاح کر دیا جائے لیکن رخصتی کو ملتوی کر دیا جائے تا آنکہ بچے کا علاج مکمل ہو جائے اور بچی کو بھی حفاظتی ٹیکے لگا دیئے جائیں۔

④ موت کا ایک وقت مقرر ہے، اس کا وقت آنے پر ہر انسان دنیا سے رخصت ہو جائے گا، جدید طب کے مطابق متعدی امراض سے وہی متاثر ہوتا ہے جس کے اندر بیماری قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔اگر بیماری مقدر میں ہے تو وہ آ کر رہے گی۔اس لئے ہم کہتے ہیں کہ بچے کا علاج کرایا جائے، بچی کو حفاظتی ٹیکے لگا دیئے جائیں اور صلہ رحمی کے پیش نظر سنت نکاح بر وقت ادا کر دی جائے۔اللہ تعالیٰ ہمارے عقائد کو محفوظ رکھے اور اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرنے کی توفیق دے۔ [واللہ اعلم]

زُہد و رقاق

سوال ہماری جماعت نے جو امام مسجد رکھا ہے وہ خود نیک سیرت اور پارسا ہے لیکن اس کی بیوی کا چال چلن صحیح نہیں ہے اور نہ ہی اس کی اولاد اس کے کہنے پر چلتی ہے۔ امام مسجد کو جو کچھ ملتا ہے وہ اپنے بچوں پر خرچ کر دیتا ہے جو ان کی غلط کاری پر تعاون کی ہی ایک صورت ہے۔ ایسے حالات میں اسے امام رکھا جا سکتا ہے؟

جواب سوال میں ذکر کردہ امام کی صفات کہ وہ نیک سیرت اور پارسا ہے۔ امامت کے لئے کافی ہیں، اس سے مزید کو کرید کرنا درست نہیں ہے۔ بیوی کا چال چلن اور اولاد کا اس کے کہنے پر نہ چلنا، امامت کے علاوہ رکاوٹ کا باعث نہیں ہے، اگرچہ اس قسم کے امام کو چاہیے کہ انہیں سمجھانے میں کوتاہی نہ کرے اور ان کی خیر خواہی کرتا رہے۔ دیوث بن کر زندگی نہ گزارے آخر حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام نے بھی اپنی بیویوں سے گزارہ کیا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں منصب نبوت سے الگ نہیں فرمایا۔ ہمیں بھی ایسے امام کو برداشت کرنا چاہیے اور اسے ''منصب امامت'' سے ہٹانے کے لئے تگ و دو نہیں کرنی چاہیے۔

[واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی نے دو لاکھ روپے بنک میں رکھے، اسے ایک سال دس ہزار سود ملا، اگر سود نہیں لیتا تو بنک عملہ اسے بانٹ لے گا، لہٰذا وہ آدمی اپنی سود کی رقم کسی ایسے شخص کو دے دیتا ہے جس کے لئے مردار اور خنزیر کھانا بھی حلال ہے، کیا ایسا کیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ وہ آدمی سود کی رقم لینے کو بہت بڑا گناہ سمجھتا ہے؟

جواب ہمارے نزدیک سود ایک ایسی غلاظت ہے جس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہر ممکن طور بچنے کی تلقین فرمائی ہے۔ اسلام ہر پہلو سے اس نظام کا استیصال چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی سنگینی کو بایں الفاظ بیان کیا ہے ''اگر تم اس سے باز نہیں آؤ گے تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔'' [۲/البقرۃ:۲۷۸]

رسول اللہ ﷺ نے بھی اس گندے نظام سے نفرت دلائی ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: ''سود دینے والا سود لینے والا، اس پر گواہی دینے والا، اسے لکھنے والا سب ملعون ہیں اور یہ سب گناہ میں برابر ہیں۔'' [صحیح مسلم، البیوع:۱۵۹۸]

نیز آپ نے فرمایا کہ ''اگر اس جرم عظیم کے ستر حصے کئے جائیں تو اس کا ہلکا حصہ بھی اپنی ماں سے زنا کے برابر ہے۔''
[ابن ماجہ، الطہارۃ:۲۲۷۴]

بلکہ آپ نے سود کھانے کو چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بھی زیادہ سنگین قرار دیا ہے۔ [مسند امام احمد]

لیکن ہم لوگ اس کے متعلق نرم گوشہ رکھے ہوئے ہیں کہ اسے بنک سے وصول کر لینا چاہیے۔

پھر اس کی تین قسم بیان کی جاتی ہیں:

① ثواب کی نیت کئے بغیر کسی محتاج یا رفاہ عامہ میں خرچ کر دیا جائے۔

② بنک سے قرضہ لینے کی ضرورت پڑے تو اس کی جگہ سود کی رقم کو صرف کر دیا جائے۔

③ ناجائز ٹیکسوں پر اسے صرف کر دیا جائے۔

مگر جب اس سلسلہ میں شریعت کے احکام دیکھتے ہیں تو مصلحتوں کا یہ تعبیر کردہ بلند و بالا محل دھڑام سے نیچے آ گرتا ہے، کیونکہ انسان فطرتاً حریص واقع ہوا ہے، لہٰذا اسے مال کسی راہ سے بھی نظر آئے تو اسے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا، جب اسے سود وصول کرنے کی اجازت مل جائے گی تو اس گندگی سے خود پاک وصاف نہیں رہ سکے گا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے نظریہ میں لچک پیدا ہونا شروع ہو جائے گی، پھر خود اسے استعمال کرنے کی راہیں تلاش کرے گا شریعت اسے مال تسلیم نہیں کرتی کہ اسے وصول کر کے دوسری جگہ پر صرف کیا جائے۔ قرآن کریم کی واضح ہدایت ہے کہ ''تم سود سے توبہ کرلو تو تم صرف اپنے اصل سرمایہ کے حقدار ہو۔'' [۲/البقرہ:۲۷۹]

جب سود کی رقم ہماری نہیں ہے تو ہمیں اس کی فکر نہیں کرنی چاہیے کہ اس کا مصرف کیا ہونا چاہیے، بنک کا عملہ ملی بھگت کر کے اسے ہڑپ نہیں کر سکے گا۔ یہ ایک مفروضہ ہے یہ رقم کسی عرصہ تک اس کے اکاؤنٹ میں پڑی رہے گی، پھر رفتہ رفتہ سروس چارج جیسے چور دروازہ سے نکلنا شروع ہو جائے گی۔ صورت مسؤلہ میں اس قسم کی غلاظت وصول کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے، کیونکہ:

اولاً: تو کوئی آدمی ان دنوں ایسے حالات سے دوچار نہیں ہو سکتا کہ اسے مردار اور خنزیر کھانے تک نوبت آ جائے۔

ثانیاً: جو آدمی دو لاکھ کا مالک ہے، اسے چاہیے کہ اپنے دوسرے بھائی کو گندگی کھلانے کے بجائے وہ اپنی حلال پاکیزہ کمائی سے اس سے تعاون کرے یا کم از کم دو لاکھ سے پانچ ہزار زکوٰۃ ہی اسے دیدے۔

ثالثاً: ہماری جماعت ابھی تک ایسی خودغرضی کی شکار نہیں ہوئی کہ اس میں ایسے اہل خیر کا فقدان ہو جو آڑے وقت کسی کے کام نہ آ سکتے ہوں، اس طرح کا مجبور انسان راقم الحروف سے رابطہ کرے اللہ کی توفیق سے ہم اسے اس قسم کی گندگی کے پاس نہیں جانے دیں گے ان شاء اللہ۔ [واللہ اعلم]

سوال بعض ڈاکٹر یا اطبا اپنے کلینک کا نام شفا کلینک یا دارالشفا رکھتے ہیں یا عوام الناس کہتے ہیں کہ فلاں ڈاکٹر یا حکیم کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے بڑی شفا رکھی ہے، اس کی شرعی حیثیت واضح کریں؟

جواب مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ بیماری لگانے والا اور اس سے شفا دینے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ قرآن کریم میں اس کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عقیدہ بایں الفاظ بیان ہوا ہے ''اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے۔'' [۲۶/الشعراء:۸۰]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماری اور شفا کے متعلق ہمیں اسی عقیدہ کی تعلیم دی ہے، چنانچہ دعائے ماثور ہے کہ ''اے ہمارے رب! بیماری دور کر اور شفا عطا فرما بلاشبہ تو ہی شفا دینے والا ہے۔ تیری شفا کے علاوہ اور کوئی شفا نہیں ہے، ایسی شفا ہو کہ جس کے بعد کوئی بیماری نہ رہے۔'' [مسند امام احمد، ص:۴۱۸، ج۳]

یہ عقیدہ رکھنے کے بعد اگر کوئی ڈاکٹر یا حکیم علاج گاہ کا نام اچھے شگون کے لئے شفا کلینک یا دارالشفا رکھتا ہے تو اس میں کوئی

قباحت نہیں ہے، جیسا کہ نیک فال کے طور پر سعید نام رکھا جاتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اسے سعادت منداور نیک کرے، اسی طرح متعدد صحابیات اور تابعیات کے نام شفا ہی کتب حدیث میں آئے ہیں جن میں سے کچھ نام یہ ہیں: شفاء بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا جس نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو دم جھاڑ کی تعلیم دی تھی۔ [الاصابہ، ص:۳۴۱، ج۴]

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی بہن اور والدہ کا نام بھی شفاء تھا۔ [الاصابہ، ص:۳۴۲، ج۴]

شفاء بنت عبدالرحمٰن انصاریہ جلیل القدر تابعیہ ہیں جن سے ان کے بھائی ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن روایت کرتے ہیں اور ان سے مروی روایات کتب احادیث میں موجود ہیں۔ [الاصابہ، ص:۳۴۵، ج۴]

امراض کی صحیح تشخیص اور ادویات کا صحیح استعمال بھی شفا کے اسباب میں سے بہت بڑا سبب ہے اگر کوئی ڈاکٹر یا حکیم مرض کی صحیح تشخیص کرتا ہے، پھر اس کے مطابق مناسب دوا تجویز کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مریض کو شفا ہو جاتی ہے تو یہ بات کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس حکیم یا ڈاکٹر کے ہاتھ میں بڑی شفا رکھی ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے محلہ کی مسجد میں بڑے سائز کے قرآن مجید پڑے ہیں جن کی حالت انتہائی بوسیدہ ہے۔ پرانے ہونے کی وجہ سے ان پر تلاوت نہیں ہو سکتی، ان کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب قرآن مجید کا ظاہری اور باطنی ادب واحترام ہمارا اولین مذہبی فریضہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے گا یہ بات دلوں کے تقویٰ کی علامت ہے۔'' [۲۲/الحج:۳۲]

اللہ تعالیٰ کی کتاب کا سب سے زیادہ حق یہ ہے کہ اس کی تعظیم کی جائے۔ صورت مسئولہ میں بڑے سائز کے پرانے قرآن مجید اگرچہ تلاوت کے قابل نہیں ہیں، تاہم ان کا ادب واحترام اب بھی ضروری ہے جس کی ممکن حد تک حسب ذیل صورتیں ہیں:

☆ آج کل قبرستان میں کچھ لوگ مقدس اوراق کی حفاظت کے لئے ''قرآن محل'' تعمیر کرا دیتے ہیں یا لوہے کے ٹین اور ڈبوں کو کسی بجلی کے کھمبے یا دیوار سے آویزاں کر دیا جاتا ہے۔ ان پر لکھا ہوتا ہے کہ مقدس اوراق اس میں ڈالیں، یہ اچھی سوچ اور بہتر کام ہے لیکن عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ جب یہ قرآن محل یا لوہے کے ٹین اور ڈبے بھر جاتے ہیں تو پھر ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا اور مقدس اوراق کی بے حرمتی اس طرح ہوتی ہے کہ تیز ہوا چلنے سے یہ اوراق اڑ کر کسی پلید جگہ گر جاتے ہیں۔

☆ بعض حضرات زمین میں گڑھا کھود کر اس میں ان اوراق کو دفن کرنے کا مشورہ دیتے ہیں لیکن ایسا کرنے سے بھی ان کی بے حرمتی کا خطرہ بدستور قائم رہتا ہے۔ کیونکہ کسی وقت بھی زمین پلید ہو سکتی ہے یا ان اوراق کو دیمک وغیرہ کا خطرہ رہتا ہے۔

☆ بعض حضرات ان اوراق کا بنڈل بنا کر ان کے ساتھ کوئی وزنی چیز باندھ کر بہتے ہوئے پانی میں ڈال دیتے ہیں لیکن یہ بھی کوئی محفوظ طریقہ نہیں ہے۔ کیونکہ بنڈل کھل کر ان اوراق کے پانی پر آ جانے کا اندیشہ رہتا ہے بلکہ بعض اوراق کو پانی پر تیرتے ہوئے دیکھا بھی گیا ہے۔

☆ ایک بہتر صورت وہ یہ ہے کہ جسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں اپنایا، حدیث میں ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کی مختلف نقول تیار کر لیں تو جو مصاحف ان نقول کے مطابق نہیں تھے انہیں جلا دیا گیا۔

[صحیح بخاری، فضائل القرآن: ۴۹۸۷]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس چند لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کو جب جذباتی انداز میں پیش کیا تو آپ نے فرمایا: ''مصاحف کے جلانے کے متعلق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لئے کلمہ خیر ہی کہو۔ انہوں نے یہ کام کر کے کوئی برا اقدام نہیں اٹھایا۔''

[فتح الباری، ص: ۱۲، ج۹]

بہرحال معاملہ ہے بوسیدہ مصاحف اور پھٹے پرانے مقدس اوراق کے تقدس اور احترام کو ملحوظ رکھنے کا، اس پر کسی صورت میں بھی آنچ نہیں آنی چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال ☆ کیا اپنے کٹھن معاشی حالات کے پیش نظر موت مانگی جا سکتی ہے؟

☆ وہ کیا چیزیں ہیں جن کا مرنے کے بعد ثواب پہنچتا رہتا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب دنیا میں کیسے بھی کٹھن حالات ہوں کسی بھی صورت میں موت کی آرزو نہیں کرنی چاہیے۔ حدیث میں بیان ہے کہ ایک دفعہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بحالت مرض موت کی تمنا کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے چچا جان! موت کی تمنا مت کیجئے، کیونکہ اگر آپ نیک ہیں تو آپ بقیہ زندگی میں مزید نیکیاں حاصل کریں گے، یہ آپ کے لئے بہتر ہے اور آپ اگر گناہگار ہیں تو اپنے گناہوں سے توبہ کر سکتے ہیں، یہ آپ کے لئے بہتر ہے، لہٰذا آپ کسی بھی صورت میں موت کی تمنا نہ کریں۔''

[مسند امام احمد، ص: ۳۳۹، ج۶]

ایک دوسری حدیث میں بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی بھی اپنی کسی مصیبت کے پیش نظر موت کی تمنا نہ کرے۔ اگر اس کے بغیر چارہ نہ ہو تو اس طرح کہہ لے: ''اے اللہ تعالیٰ! مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک میرے لئے زندگی بہتر ہے اور اس وقت فوت کر لینا جب میرے لئے مرنا بہتر ہو۔'' [صحیح بخاری، الدعوات: ۶۳۵۱]

مرنے کے بعد میت کو مندرجہ ذیل چیزوں کا ثواب پہنچتا رہتا ہے:

☆ اگر کوئی اس کے حق میں دعا کرتا ہے تو میت اس سے بہرہ ور ہوتی ہے بشرطیکہ دعا میں قبولیت کی شرائط موجود ہوں۔ حدیث میں بیان ہے کہ اگر کوئی مسلمان اپنے بھائی کے لئے غائبانہ دعا کرتا ہے تو وہ ضرور قبول ہوتی ہے، اللہ کی طرف سے ایک فرشتہ تعینات کر دیا جاتا ہے۔ جب وہ کسی کے لئے دعائے خیر کرتا ہے تو فرشتہ اس پر آمین کہتا ہے اور اسے اللہ کے ہاں اس کے مثل اجر ملنے کی دعا کرتا ہے۔ [مسند امام احمد، ص: ۴۵۲، ج۶]

☆ میت کی نذر پوری کرنا۔ میت نے اپنی زندگی میں کوئی نذر مانی تھی لیکن اسے پورا کئے بغیر موت آ گئی تو لواحقین کو چاہیے کہ اسے پورا کریں وہ نذر خواہ روزے یا حج یا نماز ادا کرنے کی ہو، چنانچہ روزے کے متعلق صحیح بخاری: ۱۹۵۲، حج کے متعلق صحیح بخاری: ۱۸۵۲، نماز کے متعلق صحیح بخاری تعلیقاً ''بَابُ مَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ نَذْرٌ'' مطلق نذر کے متعلق بھی حدیث میں آیا ہے۔

[صحیح بخاری، الایمان والنذور: ۶۶۹۸]

☆ میت کی طرف سے قرض کی ادائیگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو تاکید کی تھی کہ وہ اپنے فوت شدہ بھائی کا قرض ادا کرے

کیونکہ وہ عدم ادائیگی کی وجہ سے اللہ کے ہاں محبوس ہے۔ [مسند امام احمد، ص:۱۳۶، ج۴]

☆ نیک اولاد جو بھی اچھے کام کرے گی والدین کو وفات کے بعد اس کا فائدہ پہنچتا رہتا ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: انسان کے لئے وہ کچھ ہے جس کی اس نے کوشش کی۔'' (۵۳/النجم:۳۹) اور اولاد بھی انسان کی کوشش اور کمائی میں سے ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے۔ [دارمی، ص:۲۴۷، ج۲]

☆ صدقہ جاریہ اور باقیات صالحات: حدیث میں ہے کہ ''جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو تین اعمال کے علاوہ اس کے تمام اعمال منقطع ہو جاتے ہیں، یعنی صدقہ جاریہ، ایسا علم جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہوں اور نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرتی رہے۔''
[صحیح مسلم، الوصیۃ:۱۶۳۱]

اس سلسلہ میں ایک جامع حدیث بھی ہے، جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انسان کی موت کے بعد جو حسنات اور اعمال جاری رہتے ہیں وہ یہ ہیں:

☆ وہ علم جس کی اس نے لوگوں کو تعلیم دی اور اس کی خوب نشر و اشاعت کی۔

☆ نیک اولاد جو اپنے پیچھے چھوڑ گیا۔

☆ کسی کو قرآن کریم بطور عطیہ دیا۔

☆ مسجد بنا کر وقف کر دی۔

☆ محتاج اور ضرورت مند کو گھر بنا کر دیا۔

☆ کسی غریب کے لئے پانی کا بندوبست کر دیا۔

☆ وہ صدقہ جسے اپنی زندگی اور صحت میں نکالا اس کا ثواب بھی مرنے کے بعد بدستور پہنچتا رہے گا۔ [ابن ماجہ، السنۃ:۲۴۲]

درج بالا وضاحت کے علاوہ کچھ چیزیں لوگوں نے خود ایجاد کر رکھی ہیں اور ایصال ثواب کے لئے انہیں عمل میں لایا جاتا ہے لیکن وقت اور مال کے ضیاع کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا، مثلاً: قل خوانی، ساتواں، چالیسواں اور برسی وغیرہ قرآن خوانی اور پھر کھانے وغیرہ کا بندوبست ہوتا ہے، اس کا میت کو کچھ فائدہ نہیں پہنچتا کیونکہ کتاب و سنت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

واجبات و حقوق

واجبات و حقوق

سوال دین اسلام میں مہر کی کیا حیثیت ہے، کیا یہ بیوی کا حق ہے یا باپ بھی اسے معاف کر سکتا ہے، اس کے متعلق قرآن و حدیث کی کیا ہدایت ہے؟

جواب دین اسلام میں مہر بیوی کا خصوصی حق ہے۔ باپ کو اجازت نہیں ہے کہ وہ خود ہی اسے معاف کر دے، اس سلسلہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "عورتوں کو ان کے مہر راضی خوشی میں ادا کرو۔" [۴/النساء:۴]

مہر کی آیات سے معلوم ہوا کہ مہر صرف عورت کا حق ہے اسے معاف کرنا بھی اسی کا حق ہے والد کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر مہر معاف کر دے، اس سلسلہ میں ہم بہت افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ شادی کے موقع پر لاکھوں روپیہ رسم و رواج کی نذر کر دیتے ہیں۔ لیکن حق مہر کے سلسلہ میں (عوام کے ایک طبقہ میں متداول اور اپنے طور پر رواج پذیر اصطلاح) "شرعی حق مہر" پر بات آ جاتی ہے، اگر برائے نام کچھ حق مہر طے ہو جاتا ہے تو لڑکی کے علم میں لائے بغیر سرپرست اسے فوراً واپس کر دیتا ہے، حالانکہ سرپرست کو اللہ تعالیٰ نے یہ حق نہیں دیا کہ وہ خود ہی لڑکی کی اجازت کے بغیر حق مہر واپس کر دے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ اہل حدیث حضرات حنفی بھائیوں کے جنازہ میں شریک نہیں ہوتے، اس کی کیا وجہ ہے؟ حالانکہ مسلمان کے جنازہ میں شریک ہونے کا حکم ہے۔

جواب حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے سوال ہوا کہ وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے ایک انسان کا مال اور خون دوسروں کے لیے حرام ہو جاتا ہے آپ نے فرمایا کہ "کلمۂ شہادت پڑھنے کے بعد جب نماز پڑھے، ہمارے قبلہ کی طرف منہ کرے اور ہمارے ذبح کو کھا لے ایسا شخص مسلمان ہے اس کے وہی حقوق ہیں جو عام مسلمانوں کے ہیں اور اس کے ذمہ وہی فرائض ہیں جو دوسرے مسلمانوں پر عائد ہوتے ہیں۔" [صحیح بخاری، حدیث نمبر:۳۹۳]

مسلمان کی مذکورہ تعریف ایک مرفوع حدیث سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ [صحیح بخاری، حدیث نمبر:۳۹۱]

حدیث میں ہے کہ "ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حق ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب وہ فوت ہو جائے تو اس کے جنازے میں شرکت کی جائے۔" (صحیح مسلم، السلام:۲۱۶۲)

ان احادیث کا تقاضا ہے کہ مسلمان، خواہ معروف ہو یا غیر معروف اس کے جنازہ میں شرکت کرنا ضروری ہے۔ اہل حدیث حضرات احناف کے جنازوں میں شرکت کرتے ہیں، نہ معلوم وہ کون سے اہل حدیث ہیں جن کا سوال میں ذکر کیا گیا ہے کہ وہ احناف کے جنازوں میں شریک نہیں ہوتے، الحمد للہ اہل حدیث اس قدر تنگ نظر نہیں ہوتا کہ وہ دوسروں کی غمی خوشی میں شریک نہ ہو، اس بنا پر میں ان کے متعلق بدگمانی نہیں رکھتا۔ تاہم شہادتین اور ادائیگی اور ان کا اقرار و اعتراف اسلام میں داخل ہونے کا مرکزی دروازہ ہے، اگر ان کا انکار کرتے ہوئے اس دروازے سے باہر نکل جائے تو وہ ہمارے نزدیک مسلمان نہیں ہے اور نہ ہی ایسے شخص کا جنازہ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ روحانی دم جھاڑ کرنے والے عورتوں یا کسی ایک عورت کو تنہائی میں دم کرتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے، اگر چہ دم کرنے والا بزرگ اور عمر رسیدہ ہو، قرآن وحدیث کے مطابق ہماری راہنمائی کریں؟

جواب دین اسلام میں عورت کی عزت وناموس کا بہت خیال رکھا گیا ہے۔ شریعت اسلامیہ میں کسی بھی اجنبی عورت سے خلوت اختیار کرنا حرام اور ناجائز ہے، خواہ وہ روحانی دم کرنے کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ کے اس سلسلہ میں واضح ارشادات ہیں:

''خبردار! جو آدمی بھی کسی عورت کے ساتھ تنہائی اختیار کرتا ہے دونوں میں تیسرا ساتھی شیطان ہوتا ہے۔''

[ترمذی، الرضاع: ۱۱۷۱]

دم کرنے والا، خواہ بزرگ اور عمر رسیدہ ہی کیوں نہ ہو، اس کے لئے عورتوں کے ساتھ تنہائی اختیار کرنا جائز نہیں ہے، شیطان بڑا ہوشیار اور چالاک ہے، اس سے بچاؤ کی تدبیر یہی ہے کہ انسان دین اسلام کے ضابطوں پر عمل پیرا رہے اور اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا رہے۔ عربی کا ایک محاورہ ہے کہ ''ہر گری پڑی چیز کوئی نہ کوئی اٹھانے والا ضرور ہوتا ہے'' اس لئے مرد یا عورت کی بزرگی اور عمر رسیدگی کو اس سلسلہ میں بطور بہانہ استعمال نہ کیا جائے، علمائے کرام کو چاہیے کہ اس مسئلہ کی نزاکت کو مدنظر رکھیں اور دم جھاڑ کرنے کے لئے عورتوں سے خلوت اختیار نہ کریں۔ [واللہ اعلم]

سوال میں نے بچپن میں ایک عورت سے قرآن کی تعلیم حاصل کی تھی، اب میں جب گاؤں جاتا ہوں تو اس کے پاس جاتا ہوں تو اس کی بزرگی کے پیش نظر میں اس کا سر چومتا ہوں اور ایسا ادب واحترام کے طور پر کرتا ہوں، کیا شرعی طور پر مجھے اپنی استانی جو اب تراسی (83) سال کی ہے، اس کا سر چومنے کی اجازت ہے؟ قرآن وحدیث کی رو سے میری راہنمائی کریں۔

جواب استاد اور شاگرد کا رشتہ بہت مقدس اور عزت واحترام کا حامل ہے، لیکن استاد کی عزت کرتے ہوئے ہمیں شریعت کے دائرہ میں رہنا چاہیے۔ صورت مسئولہ میں بلاشبہ اپنی استانی کا احترام کرنا چاہیے اور وہ اس احترام کی حق دار ہے لیکن احترام کے طور پر اس کا سر چومنا یا اس سے مصافحہ کرنا جائز نہیں، خواہ وہ عمر رسیدہ ہی کیوں نہ ہو اس کا احترام یہ ہے کہ اس کی ضروریات کا خیال رکھا جائے، کیونکہ وہ استانی محرمات میں سے نہیں ہے، البتہ اس کی خبرگیری کرنے اور سلام کہنے میں چنداں حرج نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس جب عورتیں بیعت کے لئے آتیں تو ان کی خواہش ہوتی کہ مردوں کی طرح رسول اللہ ﷺ سے مصافحہ کر کے بیعت کریں لیکن آپ ان سے زبانی بیعت لیتے اور وضاحت فرماتے: ''میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔''

[نسائی، البیعہ: ۴۱۸۱]

حالانکہ رسول اللہ ﷺ ان عورتوں کے روحانی باپ ہیں۔ اس کے باوجود آپ نے حزم واحتیاط کے پہلو کو مدنظر رکھا ہے۔ مذکورہ حدیث میں بیان ہے کہ عمر رسیدہ اور غیر عمر رسیدہ تمام عورتوں کو شامل ہے، بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان اس سلسلہ میں بہت واضح ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ نے کسی عورت کے ہاتھ کو چھوا تک نہیں۔''

[ابوداود، الامارۃ: ۲۹۴۱]

ان تصریحات کی روشنی میں کسی اجنبی مرد کے لئے جائز نہیں ہے۔ کہ وہ کسی اجنبی عورت کا سر چھوے یا اس سے مصافحہ کرے خواہ وہ اس کی استانی ہی کیوں نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہمارے لئے مشعل راہ ہے اسے نظر انداز کر کے عزت واحترام کے خودساختہ ضابطوں پر عمل کرنا خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، البتہ استاد کے حقوق کو فراموش نہیں کرنا چاہیے اور اس کے احترام میں کمی نہیں آنی چاہیے، شاگرد کو چاہیے کہ وہ اپنے استاد (خواہ مرد ہو یا عورت) کی خبر گیری کرتا رہے۔ [واللہ اعلم]

سوال بعض کتب دینیہ میں رسول اللہ ﷺ کے اسم گرامی کے ساتھ ''صلعم'' لکھا ہوتا ہے۔ اس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام کے ساتھ ''رض'' کی علامت لکھی ہوتی ہے، اس قسم کی علامت اور اختصار کی کیا حیثیت ہے؟

جواب اسلامی آداب میں سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اسم گرامی کے ساتھ محبت اور چاہت سے ''ﷺ'' لکھا جائے، اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسمائے شریفہ کے ساتھ ''رضی اللہ عنہم'' تحریر کیا جائے، دیگر انبیائے کرام کے ساتھ ''علیہم السلام'' اور متقدمین اسلاف کے ساتھ ''رحمہ اللہ تعالیٰ'' زندہ عالم کے ساتھ ''حفظہ اللہ'' اور برخورداران کے ساتھ ''سلمہ اللہ'' لکھا جائے۔ محدثین عظام نے وضاحت کی ہے کہ ﷺ یا رضی اللہ عنہ کو اختصار کی علامت سے نہ لکھا جائے، اور نہ ہی اسے بار بار لکھنے سے دل میں کسی قسم کی اکتاہٹ پیدا ہونی چاہیے۔ چنانچہ شارح صحیح مسلم علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ''کاتب کو چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ پر صلوٰۃ وتسلیم لکھنے کی پابندی کرے اور بار بار لکھنے میں کوئی اکتاہٹ محسوس نہ کرے، جو شخص اس سے غفلت کرتا ہے وہ گویا خیر کثیر سے محروم ہو گیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی کے ساتھ عزوجل جیسے الفاظ لکھے، نیز صحابہ کرام کے لیے رضی اللہ عنہم اور دیگر اخیار امت کے لئے رحمۃ اللہ علیہ جیسے الفاظ کا انتخاب کرے، اس سلسلہ میں رموز واشارات سے کام نہ لے بلکہ انہیں کامل طور پر لکھا جائے۔'' [شرح تقریب النووی، ص ۲۹۱]

علامہ سیوطی اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ، اگرچہ عزیز وجلیل ہیں لیکن آپ کے لئے عزوجل کے الفاظ نہ لکھے جائیں، اسی طرح صلوٰۃ وسلام کے الفاظ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے استعمال نہ کیے جائیں جیسا کہ امام نووی نے شرح مسلم میں وضاحت کی ہے۔ [تدریب الراوی، ص: ۲۹۳]

علامہ محمد جمال الدین قاسمی نے اپنی تالیف ''قواعد التحدیث'' میں باقاعدہ آداب کا عنوان بیان کر کے بڑی تفصیل سے اس مسئلہ کا حق ادا کیا ہے۔ [قواعد التحدیث]

لہٰذا ہمیں اس سلسلہ میں سستی یا کوتاہی سے کام نہیں لینا چاہیے، بلکہ ثواب وآداب کی نیت سے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ذکر خیر پر مذکورہ آداب لکھنے کی پابندی کرنی چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال عام طور پر تھانہ جات کی دیوار پر یہ حدیث لکھی ہوتی ہے کہ ''رشوت دینے والا اور لینے والا دونوں آگ میں ہوں گے''۔ وضاحت فرمائیں کہ مندرجہ بالا حدیث کس مستند کتاب میں موجود ہے؟

جواب حدیث کے الفاظ تلاش بسیار کے باوجود مجھے دستیاب نہیں ہو سکے، البتہ حافظ ہیثمی نے مسند البزار کے حوالہ سے بروایت عبدالرحمٰن بن عوف اس حدیث کا ذکر کیا ہے، نیز عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث طبرانی کے حوالہ سے بیان کی ہے لیکن ان دونوں احادیث میں ''کلاھما'' کے الفاظ نہیں ہیں۔ [مجمع الزوائد، ص: ۱۹۹، ج ۴]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو سند کے لحاظ سے ضعیف قرار دیا ہے۔ [ضعیف الجامع الصغیر،ص:۱۹۲،ج ۳]

قرآنی آیات اور دیگر مؤیدات سے معلوم ہوتا ہے کہ معنی کے لحاظ سے یہ حدیث صحیح اور قابل حجت ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی رمضان المبارک میں بلا عذر شرعی بے روزہ رہتا ہے جبکہ اس کی بیوی پابندی سے روزہ رکھتی ہے، خاوند بیوی سے اپنی خواہش کا اظہار کرتا ہے، بیوی کے بار بار انکار کے باوجود وہ باز نہیں آتا، اب عورت مجبور ہے، اس کا روزہ ٹوٹنے پر اسے گناہ ہوگا یا نہیں، نیز خاوند کا کردار شریعت کی نظر میں کیسا ہے، کیا اس پر کوئی حد یا تعزیر لگائی جاسکتی ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب واضح رہے کہ گھر میں رہتے ہوئے رمضان المبارک میں ہر عاقل وبالغ کے لئے روزہ رکھنا فرض ہے بشرطیکہ وہ تندرست ہو، بلا وجہ روزہ ترک کرنا بہت سنگین جرم ہے۔ حدیث نبوی کے مطابق ایسا انسان ہر قسم کی خیر وبرکت سے محروم کردیا جاتا ہے۔ قیامت کے دن وہ بڑی المناک سزا سے دوچار ہوگا اور جو انسان کسی دوسرے کے روزے کو خراب کرنے کا باعث ہے وہ بھی اسی قسم کی سزا کا حقدار ہے۔ رمضان المبارک میں روزہ توڑنے کا کفارہ یا تاوان اس صورت میں پڑتا ہے جب پہلے روزہ رکھا ہوا ہو، پھر اسے خراب کردیا جائے۔ صورت مسئولہ میں خاوند نے ایک سنگین قسم کی غلطی کا ارتکاب کیا ہے جو شرعاً قابل تعزیر ہے لیکن قابل حد نہیں ہے، اسے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنا چاہیے۔ البتہ بیوی مجبور اور بے بس ہے اس پر کوئی گناہ نہیں ہے، چونکہ اس کا روزہ ٹوٹ چکا ہے، اس لئے رمضان المبارک کے اس روزہ کی قضا دینا ہوگی، جب بھی موقع ملے اپنے خاوند کے علم میں لاکر روزہ رکھ لے۔ [واللہ اعلم]

سوال چند لوگوں نے درج ذیل حدیث سے یہ مسئلہ ثابت کیا ہے کہ کھانے پر ختم پڑھنا جائز ہے۔ حدیث میں بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کھانے اور سالن میں تم آیت الکرسی پڑھو گے اللہ تعالیٰ اس کھانے اور سالن میں برکت دے گا۔''

قرآن وحدیث سے اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں؟

جواب واضح رہے کہ مروجہ ختم قرآن وحدیث سے ثابت نہیں ہے۔ کھانے پر ختم دینا ایجاد بندہ اور شکم سیری کا ایک بہانہ ہے۔ سوال میں جس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے، تلاش بسیار کے باوجود نہیں مل سکی۔ فضائل قرآن اور آداب طعام کے ابواب میں ملنے کا امکان تھا لیکن دستیاب نہیں ہوسکی۔ البتہ مذکورہ کتاب میں ایک حدیث یوں بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کھانے اور پینے میں پھونک نہیں مارتے اور نہ ہی پینے کے برتن میں سانس لیتے تھے جبکہ ختم میں کچھ پڑھنے کے بعد پھونک ماری جاتی ہے لیکن رسول اللہ ﷺ کا اسوہ اس کے خلاف ہے، جیسا کہ مذکورہ حدیث میں بیان ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے کھانے میں اپنا لعاب مبارک ڈالا تھا اور برکت کی دعا کی تھی اور حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے کھانے پر کچھ پڑھا تھا۔ بعض حضرات اسی طرح کے واقعات سے کھانے پر ختم دینے کا مسئلہ کشید کرتے ہیں، حالانکہ ان واقعات کا تعلق معجزات سے ہے اور معجزات دلیل نبوت تو ہوسکتے ہیں لیکن دلیل احکام نہیں بن سکتے۔ اس بنا پر کھانے پینے کی چیزوں پر تبرک کے طور پر ختم دینا قرآن وحدیث سے ثابت نہیں ہے اور رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام رحمۃ اللہ علیہم اور ائمہ دین سے ایسا کرنے کی کوئی دلیل

نہیں ملتی، اس لئے ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس طرح کی رسومات سے اجتناب کرے۔ جو قرآن وحدیث سے ثابت نہیں ہیں اور انہیں کاموں پر عمل پیرا رہے جس کا ثبوت قرآن وسنت سے ملتا ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال بیوی نافرمان اور سرکش ہو جو خاوند کے کہنے پر عمل نہ کرے، جبکہ خاوند اسے برے کام کا حکم نہیں دیتا ہے، ایسے حالات میں خاوند کو کیا کرنا چاہیے؟

جواب بیوی کے لئے خاوند کا کہنا ماننا ضروری ہے، بشرطیکہ خاوند اسے برائی پر آمادہ نہ کرے، اگر خاوند دیکھے کہ بیوی میں نافرمانی کی علامات ظاہر ہیں اور وہ اس کی بات کو تسلیم نہیں کرتی تو اس سلسلہ میں قرآنی ہدایات پر عمل کرے، جو حسب ذیل ہیں:

① خاوند اسے وعظ ونصیحت کرے، اسے اللہ تعالیٰ سے ڈرائے، اللہ تعالیٰ کے واجب کردہ احکام یاد دلائے۔

② اگر وعظ ونصیحت کا نسخہ اس کے لئے مؤثر نہ ہو تو خاوند اسے اپنے بستر سے الگ کر دے۔

③ اگر علیحدگی کے بعد بھی نافرمانی پر اصرار کرے تو اسے راہ راست پر لانے کے لئے خاوند، بیوی کو ایسی ہلکی مار، مار سکتا ہے جو زخمی نہ کرے اور جس سے ہڈی نہ ٹوٹے، نیز چہرے پر نہ مارے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جن عورتوں کی نافرمانی اور بد دماغی کا تمہیں خوف ہو تو پہلے انہیں نصیحت کرو اور انہیں بستروں سے الگ کر دو، اس کے بعد انہیں مار کی سزا دو۔'' [۴/النسآء:۳۴]

اگر مذکورہ تمام مراحل کارگر ثابت نہ ہوں بلکہ بیوی خاوند کے درمیان علیحدگی کا خدشہ ہو جائے تو پھر دونوں کے خاندان والوں میں سے کچھ ایسے دیانتدار لوگوں کو حاکم بنایا جائے جو مناسب سمجھیں تو ان کی آپس میں صلح کرا دیں اور اگر دیکھیں کہ ان کے درمیان علیحدگی ہی بہتر ہے تو طلاق یا خلع کے ذریعے علیحدگی کرا دیں، پنچائتی حضرات جو بھی فیصلہ کریں وہ بیوی اور خاوند کو تسلیم کرنا ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''اگر تمہیں خاوند اور بیوی کے درمیان اختلاف اور ان بن کا خدشہ ہو تو ایک منصف مرد والوں اور ایک منصف عورت والوں کی طرف سے مقرر کر لو، اگر یہ دونوں صلح کرانا چاہیں تو اللہ تعالیٰ دونوں میں ملاپ کرا دے گا۔'' [۴/النسآء:۳۵]

ان ہدایات سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کی طرف سے نافرمانی اور سرکشی کا سامنا ہو تو سب سے پہلا مرحلہ اسے طلاق دے کر فارغ کر دینا نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے چند ایک مراحل ہیں جن پر عمل کرنا ضروری ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی صرف نام کا مسلمان ہے اور اپنے مذہب سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے، نماز وغیرہ بھی نہیں پڑھتا، ایک حادثہ میں زخمی ہونے کی وجہ سے اس کی انتڑیاں باہر آ گئی ہیں، ایسے شخص کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے یا صرف متقی، سلفی اور موحد کو ہی دینی چاہیے؟

جواب زکوٰۃ کے متعلق شرعی ہدایت یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے جو صاحب ثروت ہیں ان سے وصول کر کے مسلمانوں ہی کے ضرورت مند اور محتاج حضرات پر اسے تقسیم کر دیا جائے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن روانہ کرتے وقت فرمایا تھا کہ ''اہل یمن دعوت اسلام قبول کر لیں تو ان کے مالداروں سے زکوٰۃ وصول کر کے ان کے فقراء پر تقسیم کر دی جائے۔'' [صحیح بخاری، الزکوٰۃ:۱۳۹۵]

شریعت اسلامیہ نے کسی کا اسلام دیکھنے کے لئے ہمیں اس بات کا پابند کیا ہے کہ اسلام کی ظاہری اور موٹی موٹی واضح علامات

کو دیکھ لیا جائے کہ وہ اسلامی طریقہ کے مطابق نماز پڑھتا ہو، نماز ادا کرتے وقت مسلمانوں کے قبلہ کی طرف ہی رخ کرتا ہو اور اہل اسلام کے ذبیحہ سے نفرت نہ کرتا ہو بلکہ بلا حجاب اسے کھا لیتا ہو۔ [صحیح بخاری، الصلوٰۃ:۳۹۲]

بخاری کی ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان چیزوں کی بجا آوری پر مسلمانوں کے جملہ حقوق میں شریک ہے اور جملہ فرائض وواجبات کا پابند ہے۔ [صحیح بخاری، الصلوٰۃ:۳۹۳]

شریعت نے اس بات کا پابند نہیں کیا کہ لوگوں کے ایمان اور اسلام دیکھنے کے لئے دقت نظری اور باریک بینی کا مظاہرہ کریں۔ زکوٰۃ دینے کے لئے بھی اسلام کی موٹی موٹی علامتوں کو دیکھنا ہوگا، بدقسمتی سے ہمارے ہاں دوسروں کا اسلام دیکھنے کے لئے جو معیار رائج ہوا ہے اس کے پیش نظر تو شاید اعلیٰ نسل کے معیاری مسلمان دستیاب نہ ہوسکیں، کیا زکوٰۃ دینے والوں کے اسلام کو بھی اسی ترازو میں تولا جاتا ہے۔ جو زکوٰۃ وصول کرنے والوں کے لئے ہم نے قائم کر رکھا ہے۔ سوال میں جس قسم کے حاجت مند کا ذکر ہے وہ قطعاً مسلمانوں کی زکوٰۃ کا حق دار نہیں ہے لیکن متقی، سلفی اور موحد جیسی شرائط بھی محل نظر ہے، زکوٰۃ دینے کے لئے اسلام کی پیش کردہ موٹی موٹی علامتوں کو دیکھ لینا کافی ہے۔ واضح رہے کہ اگر کسی نے منافقانہ طور پر مذکورہ اسلامی شعائر کو اختیار کر لیا ہے اور اسلام کے خلاف سنگین قسم کے عقائد ونظریات کا حامل ہو اور گھناؤنے کافرانہ اور مشرکانہ اعمال کا مرتکب ہو، ایسے لوگوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مذکورہ شخص اگرچہ زکوٰۃ کا حق دار نہیں ہے، تاہم ہمیں چاہیے کہ زکوٰۃ کے علاوہ اپنی ذاتی گرہ سے اس کا علاج معالجہ کریں، اس کی طرف دست تعاون بڑھائیں، ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ کافروں کے ساتھ بھی حسن سلوک اور رواداری کا حکم دیتا ہے۔ [۶۰/الممتحنۃ:۸]

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''ہر زندہ جگر رکھنے والے کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں اجر وثواب ہے۔'' [صحیح بخاری، المساقاۃ:۲۳۶۳]

قرآنی آیت اور حدیث نبوی کے پیش نظر مذکورہ شخص زکوٰۃ کے علاوہ ہمارے تعاون کا حقدار ہے۔ اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے ادارہ کی معلمات گروپ کی صورت میں تبلیغ کے لئے بیرون شہر جاتی ہیں، بعض دفعہ دور دراز شہروں میں تبلیغی دورہ ہوتا ہے، ان کے ساتھ دو تین مبلغات کے محرم بھی ہوتے ہیں، کیا ایسے حالات میں دوسری مبلغات کا ان کے ساتھ جانا شرعاً جائز ہے؟ براہِ کرم اولین فرصت میں فتویٰ دیں۔

جواب دین اسلام کی تبلیغ ہر مرد وزن پر فرض ہے لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ شریعت کا کوئی دوسرا ضابطہ مجروح نہ ہو، اسلام نے عورت کی پاکدامنی اور اس کی عزت وناموس کی حفاظت کی خاطر دوران سفر محرم کی شرط لگائی ہے، تاکہ اس صنف نازک کو شہوانی اغراض اور غلط مقاصد سے محفوظ رکھا جاسکے۔ محرم کی معیت کی شرط، اس لئے رکھی ہے تاکہ وہ دوران سفر اس عورت کی معاونت کر سکے، اس لئے شرعی طور پر محرم کے بغیر عورت کا سفر کرنا جائز نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی بھی عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔'' [صحیح بخاری، الجہاد:۳۰۰۶]

رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان سن کر ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کرنے لگا: یارسول اللہ! میں نے تو فلاں جنگ میں شریک ہونے کے لئے اپنا نام لکھوا دیا ہے جبکہ میری بیوی کا حج پر جانے کا پروگرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جنگ میں شریک ہونے کے بجائے تم اپنی بیوی کے ساتھ حج پر جاؤ۔'' [حوالہ مذکورہ]

رسول اللہ ﷺ نے اس مجاہد کو جنگ میں نہ جانے کا حکم دیا اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت کے لئے دوران سفر محرم کا ساتھ ہونا ضروری ہے، حالانکہ صحابی جنگ میں شرکت کے لئے اپنا نام لکھوا چکے تھے، پھر عورت کا سفر بھی حج جیسی عظیم عبادت کے لئے تھا جو یقیناً عورتوں کے لئے باہر تبلیغ کرنے سے کم تر نہیں ہے، اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا کہ ''وہ جہاد کو چھوڑ دے اور اپنی بیوی کے ہمراہ حج پر جائے'' اس سے اس مسئلہ کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ ہمارے نزدیک عورتوں کا گروپ کی صورت میں دوسرے شہروں میں تبلیغ کے لئے باہر جانا جائز نہیں ہے، اگرچہ ایک کا محرم ساتھ ہو۔ ہاں! جن کے محرم ساتھ ہیں وہ اپنے خاوند یا سرپرست کی اجازت سے بیرون شہر یا دوسرے شہروں میں تبلیغ کے لئے جا سکتی ہیں۔ واضح رہے کہ اہل علم نے محرم کے لئے پانچ شرائط کا پایا جانا ضروری قرار دیا ہے:

① مرد ہو۔ ② مسلمان ہو۔ ③ عاقل ہو۔ ④ بالغ ہو۔

⑤ وہ اس عورت کے لئے ابدی طور پر حرام ہو۔

مثلاً والد، بیٹا، بھائی، چچا، سسر، والدہ کا خاوند اور رضاعی بھائی وغیرہ اور جن رشتہ داروں سے وقتی طور پر نکاح حرام ہے، مثلاً: بہنوئی، پھوپھا اور خالو وغیرہ وہ اس طرح کے محرم نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح عورت کا دیور، اس کا چچا زاد اور ماموں زاد بھی اس کا محرم نہیں ہو سکے گا، لہٰذا ان کے ساتھ بھی عورت کا سفر کرنا جائز نہیں ہے۔ یاد رہے کہ مدرسہ کا ناظم اگر عمر رسیدہ اور بزرگ ہو تو بھی معلمات اور مبلغات کے ساتھ تبلیغی دورہ پر نہیں جا سکتا، اِلَّا یہ کہ مبلّغہ یا معلّمہ اس کی بیٹی یا بہن ہو جس کے ساتھ اس کا نکاح نہیں ہو سکتا، الغرض ہمارے ہاں یہ عام طور پر وبا ہے کہ مبلغات مدرسہ کی گاڑی میں غیر محرم ڈرائیور کے ساتھ سفر کرتی ہیں اور صرف ایک دو مبلغات کے محرم ہوتے ہیں ایسا کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ ایسی تبلیغ سے کیا حاصل ہو گا جس سے عورت کی پردہ داری مجروح ہوتی ہو یا اسلام کے دوسرے ضابطے پامال ہوتے ہوں۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے گھر میں اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہے، اس کے باوجود میرے خاوند گھریلو اخراجات کے متعلق بہت تنگ کرتے ہیں، ایسے حالات میں مجھے شرعاً اجازت ہے کہ میں گھریلو اخراجات کے لئے اپنے خاوند کی جیب سے اس کی اجازت کے بغیر پیسے نکال لوں؟

جواب نکاح کے بعد بیوی کے جملہ اخراجات کی ذمہ داری خاوند پر عائد ہوتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''خوشحال کو چاہیے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق اخراجات پورے کرے اور تنگدست اللہ کی دی ہوئی حیثیت کے مطابق خرچہ دے۔'' [۶۵/الطلاق:۷]

اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اسی بات کی تلقین فرمائی ہے حدیث میں ہے: ''بیوی کے کھانے پینے اور لباس وغیرہ کے اخراجات تمہارے ذمے ہیں۔'' [صحیح مسلم، الحج: ۲۹۵۰]

ان اخراجات میں کھانا، پینا، علاج، رہائش اور لباس وغیرہ شامل ہیں۔ خاوند کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق ان اخراجات کو پورا کرے اور اگر وہ ان اخراجات کی ادائیگی سے پہلوتہی کرتا ہے یا بخل سے کام لے کر پورے ادا نہیں کرتا تو بیوی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی بھی طریقہ سے خاوند کی آمدن سے انہیں پورا کر سکتی ہے، جیسا کہ حضرت ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے خاوند کے متعلق شکایت کی کہ میرا خاوند ابو سفیان رضی اللہ عنہ گھریلو اخراجات پورے طور پر ادا نہیں کرتا تو کیا مجھے اجازت ہے کہ میں اس کی آمدن سے اتنی رقم اس کی اجازت کے بغیر لے لوں، جس سے گھر کا نظام چل سکے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں! اس کے مال سے اس کی اجازت کے بغیر اتنا لے سکتی ہو جس سے معروف طریقہ کے مطابق تیرے اور تیری اولاد کی گزر اوقات ہو سکے، یعنی گھر کا نظام چل سکے۔'' [صحیح بخاری، النفقات: ۵۳۶۴]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے:

''اگر خاوند اخراجات پورے نہ کرے تو بیوی کے لئے جائز ہے کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کے مال سے اس قدر لے لے، جس سے معروف طریقہ کے مطابق اہل خانہ کا گزارا ہو سکے۔''

مندرجہ بالا احادیث کے پیش نظر اگر خاوند گھریلو اخراجات کی ادائیگی میں کنجوسی کرتا ہے تو بیوی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اس کی اجازت کے بغیر اس کے مال سے اتنی رقم لے سکتی ہے جس سے گھر کا نظام چل سکے لیکن یہ اجازت صرف ضروریات کے لئے ہے فضولیات کے لئے نہیں، نیز ایسا کرنے سے بیوی، خاوند کے درمیان اختلاف اور تعلقات کے کشید ہونے کا اندیشہ ہے تو اس طریقہ سے اخراجات پورے نہیں کرنے چاہییں، کیونکہ بیوی، خاوند کے تعلقات کی استواری مقدم ہے، اس بات کا فیصلہ بیوی خود کر سکتی ہے کہ ایسا کرنے سے تعلقات تو خراب نہیں ہوں گے، بہر حال ایسے حالات میں ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بیوی کو اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر اس کے مال سے اس قدر رقم لینے کی شرعاً اجازت ہے۔ جس سے معروف طریقہ کے مطابق گزر اوقات ہو سکے۔

سوال ہمیں ایک سوال موصول ہوا تھا کہ اگر بیوی اپنی مرضی سے خاوند کے والدین کی خدمت نہ کرے تو کیا خاوند اپنی بیوی کو اپنے والدین کی خدمت کے لئے مجبور کر سکتا ہے، ہم نے جواب میں لکھا تھا کہ بیوی اپنے خاوند کے والدین کی خدمت میں کوتاہی نہ کرے، یہ خدمت سسرال کا حق ہے، دلیل کے طور پر ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے لخت جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کا حوالہ دیا تھا۔ اس کے متعلق ہمیں خط موصول ہوا ہے کہ میں آپ کے جواب سے بخوبی اتفاق کرتا ہوں لیکن آپ نے اپنے جواب میں اس کے متضاد پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر خاوند کے والدین اور اس کے بہن بھائی، خاوند کی بیوی کے ساتھ اچھا سلوک نہ کریں۔ تو آپ نے قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت نہیں فرمائی۔ آپ کا جواب تو یکطرفہ فیصلہ ہے، اس کے بعد ہمارے محترم نے اڑھائی صفحات پر مشتمل اپنی بیٹی پر روا رکھے جانے والے ظلم کی المناک اور دل سوز داستان رقم کی ہے۔

جواب ہمارے سامنے جب کوئی سوال آتا ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں جواب تحریر کیا جاتا ہے۔ استثنائی حالات سے ہم بے خبر ہوتے ہیں، اس لئے ''متضاد پہلو کو نظر انداز کر دینے'' کا الزام ہمیں نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی ہمارے کسی جواب کو ''یکطرفہ

فیصلہ'' قرار دیا جا سکتا ہے، ایسے مواقع پر خاوند کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے، جیسا کہ ہم نے اپنے جواب کے آخر میں لکھا تھا۔ خاوند کو چاہیے کہ وہ افہام و تفہیم کے ذریعے ایسے کاموں کو سرانجام دے اور محبت و اتفاق کی فضا کو برقرار رکھتے ہوئے خود بھی والدین کی خدمت کرے اور اپنی بیوی کو بھی یہ سعادت حاصل کرنے لئے پابند بنائے۔ محترم کے بیان کردہ حالات کے پیش نظر ہمارے سامنے بیوی کے لئے دو راستے ہیں:

ایک عزیمت کا۔ دوسرا رخصت کا۔

بدسلوکی دیکھ کر حسن سلوک کا مظاہرہ کیا جائے لیکن یہ بہت مشکل اور گراں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''نیکی اور برائی کبھی ایک جیسی نہیں ہو سکتیں، آپ بدی کو ایسی بات سے دفع کیجئے جو اچھی ہو، آپ دیکھیں گے کہ جس شخص کی آپ سے عداوت تھی وہ آپ کا گہرا دوست بن گیا ہے اور یہ بات صرف انہیں نصیب ہوتی ہے جو بڑے صبر کیش ہوتے ہیں اور یہ اعزاز صرف ان کو ملتا ہے جو بڑے نصیب والے ہوتے ہیں۔'' [۴۱/حم السجدہ:۳۴۔۳۵]

اس عزیمت پر عمل پیرا ہونا بچوں کا کھیل نہیں بلکہ بڑے حوصلہ منداور جگر گردہ رکھنے والوں کا کام ہے لیکن آخر کار یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں، لہٰذا اگر عزیمت پر عمل کرتا ہے تو خاوند کے والدین اور اس کے بہن بھائیوں کی بدسلوکی برداشت کر کے خدمت گزاری کا فریضہ سرانجام دیتے رہنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ''صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں ہوتا جو اچھا برتاؤ کرنے والے سے خوش اسلوبی سے پیش آئے کیونکہ یہ ادلے کا بدلہ ہے۔ صلہ رحمی کرنے والا دراصل وہ ہے جو قطع تعلقی کرنے والوں کے ساتھ بھی نرم رویہ اور ملنساری سے پیش آئے۔'' [صحیح بخاری، الادب:۵۹۹۱]

☆ دوسرا راستہ رخصت کا ہے، بشرطیکہ خاوند کا ساتھ دے، والدین سے علیحدگی اختیار کر لی جائے، شادی کے بعد والدین سے علیحدہ ہو جانا ہمارے معاشرے کا ایک حصہ ہے اور شریعت نے اسے بری نگاہ سے نہیں دیکھا ہے، بیوی خاوند اگر علیحدہ رہیں گے تو ہر روز کی گھٹن اور تو تکار سے نجات مل جائے گی۔ اکھٹے رہتے ہوئے حالات مزید خراب ہو سکتے ہیں۔ آخر صبر و ہمت کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ اگر عزیمت پر عمل کرنے کی ہمت نہ ہو اور علیحدگی اختیار کرنے میں خاوند ساتھ نہ دے تو زندگی اجیرن بنانے کے بجائے شریعت نے ایک دوسرا راستہ اپنانے کا ہمیں اختیار دیا ہے، وہ خلع لینے کا ہے۔ صحابیات مبشرات رضی اللہ عنہن کی مثالیں موجود ہیں جب نباہ کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو انہوں نے کچھ دے دلا کر اپنے خاوند سے خلع حاصل کر لیا۔

آخر میں ہمارا مشورہ ہے کہ برادری کے طور پر خاوند کے والدین کو سمجھایا جائے اور انہیں کتاب و سنت کی روشنی میں بچی کے ساتھ حسن سلوک کرنے پر آمادہ کیا جائے اور اگر بچی میں کوئی قصور ہے تو اسے بھی دور کرنے کی کوشش کی جائے، تاکہ زندگی کے یہ چند مستعار دن خوش اسلوبی سے گزر جائیں۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ہمارے ہاں کچھ دن پہلے ایک قتل ہوا، میں نے گولی چلنے کی آواز سنی اور ایک آدمی کو ہاتھ میں بندوق لیے ہوئے بھی دیکھا لیکن گولی چلاتے ہوئے نہیں دیکھا، میں نے عدالت میں گواہی دیدی ہے کہ اسی آدمی نے قتل کیا ہے، کیا یہ گواہی شرعاً درست ہے؟

جواب شریعت اسلامیہ کی رو سے اپنے مشاہدہ کی گواہی دی جاسکتی ہے۔ ظن وتخمین اور قیافہ سے عین ممکن ہے کسی بے گناہ کو دھرلیا جائے۔ چنانچہ حدیث میں بیان ہوا ہے کہ ایک عورت صبح کی نماز کے لئے مسجد میں آنے کی تیاری کررہی تھی۔ اچانک کسی نے اس سے زنا بالجبر کا ارتکاب کرلیا اور رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھائے ہوئے بھاگ نکلا۔ اتفاقاً ایک دوسرا آدمی وہاں سے گزرا تو عورت نے شور مچایا اور دادرسی کے لئے اس سے فریاد کی، اتنے میں چند آدمی اور آ گئے تو عورت نے انہیں بھی اپنی مدد کے لئے پکارا، انہوں نے دوسرے شخص کو پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کردیا اور کہا ہم نے اسے جائے وقوعہ سے بھاگتے ہوئے قابو کیا ہے۔ عورت نے بھی اس کے خلاف گواہی دے دی کہ اس نے زبردستی میری عزت کو لوٹا ہے۔ ملزم نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا اس عورت نے مجھے اپنی مدد کے لئے پکارا تھا اور میں وہاں سے متعلقہ شخص کو پکڑنے کے لیے دوڑا تھا لیکن عورت کا اصرار تھا کہ یہ خلاف واقعہ بات کہتا ہے اور اصل مجرم یہی ہے۔ بیانات سننے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اسے رجم کرنے کا حکم دیا۔ لوگ اسے رجم کرنے کے لئے لے جارہے تھے کہ ایک آدمی کانپتا ہوا آیا اور کہا یہ بے گناہ ہے، اصل مجرم میں ہوں۔ میں نے اس عورت سے زنا کا ارتکاب کیا تھا، لہٰذا اس کے بجائے مجھے رجم کیا جائے۔ (نسائی) اس طرح ایک واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں پیش آیا۔ پولیس نے ایک شخص کو اس حالت میں گرفتار کیا کہ اس کے خون آلودہ ہاتھوں میں چھری تھی اور ایک مقتول اس کے سامنے خون میں لت پت ہوا پڑا تھا۔ اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں پیش کیا گیا، حقیقت حال دریافت کرنے پر اس نے اعتراف ''جرم'' کرلیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فیصلہ دیا کہ اسے جرم قتل کی پاداش میں قتل کردیا جائے۔ جلاد اسے مقتل کی طرف لے جارہا تھا کہ ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ قاتل میں ہوں، لہٰذا اس کے بجائے میرا سر قلم کردیا جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پہلے اقراری مجرم سے کہا کہ جب اصل قاتل یہ ہے تو پھر تیرا اعتراف جرم کس بنا پر تھا؟ اس نے کہا حالات ہی ایسے تھے اگر میں اس وقت انکار کرتا تو میری بات کو کون تسلیم کرتا دراصل واقعہ یہ ہے کہ میں پیشہ کے لحاظ سے قصاب ہوں۔ گائے ذبح کرنے کے لئے باہر میدان میں گیا اسے ذبح کرکے کھال اتار رہا تھا کہ مجھے اچانک پیشاب کی حاجت محسوس ہوئی میں نے چھری ہاتھ میں لئے ویرانے کا رخ کیا تو دیکھتا ہوں کہ وہاں ایک شخص خون میں لتھڑا پڑا ہے، گھبراہٹ کے عالم میں کھڑا ہو کر دیکھ رہا تھا کہ آپ کی پولیس نے اسی حالت میں مجھے گرفتار کرلیا۔ [الطرق الحکمیہ، ص۵۵]

اس بنا پر سائل نے اگر دوسرے شخص کو اپنی آنکھوں سے گولی چلاتے ہوئے دیکھا ہے تو اس کی گواہی دی جاسکتی ہے بصورت دیگر کئی ایک خطرات کے جنم لینے کا اندیشہ ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال میرے والد صاحب مجھے ایک حدیث سنا کر مجھ سے مال کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''آپ اور آپ کا مال بھی والد کا ہے۔'' حالانکہ میں خود بھی صاحب عیال ہوں اور میری ضروریات بھی ہیں۔ وضاحت کریں کہ مجھے کس حد تک اپنے والد کا مطالبہ پورا کرنا چاہیے؟

جواب والد کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے مال سے جو چاہے لے لے، بشرطیکہ وہ اس کا ذاتی طور پر ضرورت مند ہو، جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یارسول اللہ! میرے

پاس مال بھی ہے اور میری اولاد بھی ہے میرے والد مجھ سے مال لینا چاہتے ہیں، میں کیا کروں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تو اور تیرا مال تیرے والد کا ہے۔'' [ابن ماجہ، التجارات: ۲۲۹۱]

ایک دوسری حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارا سب سے اچھا کھانا وہ ہے جو تمہاری کمائی کا ہو اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی سے ہے۔'' [ابن ماجہ، التجارات: ۲۲۹۲]

شارحین نے اس حدیث کو بنیاد بنا کر لکھا ہے کہ والد اپنے بیٹے کے مال سے جو چاہے کھا سکتا ہے مگر بیٹا اپنے والد کے مال سے اس کی رضامندی کے بغیر نہیں کھا سکتا۔ فقہا نے لکھا ہے کہ والد اپنے بیٹے کا مال درج ذیل شرائط کے ساتھ لے سکتا ہے۔

① وہ بیٹے کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دے۔

② وہ ایسی چیز نہ لے جس کی بیٹے کو خود ضرورت ہو۔

③ وہ ایک بیٹے سے لے کر دوسرے بیٹے کو نہ دے۔

④ یہ لینا دینا دونوں میں سے کسی ایک کا بھی مرض موت میں نہ ہو۔

⑤ والد کافر اور بیٹا مسلمان نہ ہو یعنی ان کے دین مختلف نہ ہوں۔

ان شرائط کی موجودگی میں باپ اپنے ذاتی استعمال کھانے پینے اور لباس وغیرہ کے لئے جب چاہے، اپنے بیٹے کا مال لے سکتا ہے۔ بعض حضرات نے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ مال لیتے وقت بیٹے کی رضامندی بھی ضروری ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ''کسی مسلمان کا مال اس کی رضامندی کے بغیر حلال نہیں ہے۔'' [مسند امام احمد، ص: ۷۲، ج۵]

لیکن ہمارے نزدیک اس شرط کا اطلاق عام انسانوں کے لئے ہے۔ ابن ماجہ کی پیش کردہ حدیث کے مطابق باپ اس سے مستثنیٰ ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے ہاں ایک مولانا صاحب نے سورۂ نساء کی آیت نمبر: ۹۶ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا کہ اگر کوئی مسلمان غیر مسلم ممالک میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہے۔ وہ اگر فوت ہو جائے تو جنت کا وارث نہیں ہوگا، جبکہ ہمارے بے شمار دوست و احباب غیر مسلم ممالک میں رہائش پذیر ہیں؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب پہلے آیت کا ترجمہ ملاحظہ کریں، جس کی تفسیر میں مذکورہ بالا بات کی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جو لوگ اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں جب فرشتے ان کی روح قبض کرنے آتے ہیں تو ان سے پوچھتے ہیں تم کس حال میں مبتلا تھے؟ وہ کہتے ہیں ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے، فرشتے انہیں جواب میں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے، ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے جو بہت ہی بری جگہ ہے۔ مگر جو مرد اور عورتیں اور بچے فی الواقع مجبور اور بے بس ہیں اور وہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر اور راہ نہیں پاتے امید ہے ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والا اور بخشنے والا مہربان ہے۔'' [۴/النساء: ۹۷-۹۸-۹۹]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ان آیات کے متعلق فرماتے ہیں کہ مکہ میں کچھ مسلمان لوگ تھے جو مشرکین کا ساتھ دیتے اور مقابلہ

کے وقت ان کی جماعت میں اضافے کا باعث بنتے تھے۔ جنگ وغیرہ میں مسلمانوں کی طرف سے کوئی تیر انہیں بھی لگ جاتا اور ان میں سے کسی کو تلوار لگتی تو زخمی ہو جاتا یا مر جاتا، ایسے لوگوں کے متعلق یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔ [صحیح بخاری، التفسیر: ۴۵۹۶]

ان آیات میں ہجرت کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے کہ جب کسی جگہ پر رہتے ہوئے دین اسلام پر عمل کرنا مشکل ہو تو وہاں سے ہجرت کر جانا چاہیے اور اپنے دین کو بچانے کے لئے فکر کرنی چاہیے۔ لیکن جب پورے عرب میں اسلام کا بول بالا ہو گیا تو پھر ہجرت کی ضرورت باقی نہ رہی، تاہم اگر کسی مقام پر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمانوں کو کسی خطہ میں رہتے ہوئے دینی شعائر بجا لانے ممکن نہ ہوں یا وہاں رہنا کفر اور اہل کفر کے لئے تقویت کا باعث ہو تو انہیں وہاں سے ہجرت کرنا لازم ہے تاکہ دینی اقدار کو بچایا جائے اور شعائر اسلام پر عمل کیا جائے۔ ہاں! اگر غیر مسلم ممالک میں رہتے ہوئے دینی شعائر بجا لانے میں کوئی قدغن یا پابندی نہیں ہے۔ وہاں کے باشندے آسانی کے ساتھ اپنے اسلام پر عمل پیرا ہیں تو ان کے لئے وہاں سے ہجرت کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس وضاحت کے بعد مولانا کا مذکورہ فرمان محل نظر ہے کہ ''اگر کوئی مسلمان غیر مسلم ملک میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہے اور وہاں فوت ہو جائے تو جنت کا وارث نہیں رہے گا۔'' پھر غیر مسلم ممالک سے ہجرت کر کے کس مسلم ملک کا رخ کیا جائے جہاں پورا اسلام نافذ ہو، بہر حال ہماری نظر میں آج کوئی غیر مسلم ملک ایسا نہیں ہے جہاں مسلمانوں کا اسلامی شعائر پر عمل کرنا دشوار ہو۔ [واللہ اعلم]

سوال میں نے کسی شخص سے کچھ رقم لینا تھی، میرے مطالبہ پر اس نے کسی شخص کے ہاتھ روانہ کر دی۔ رقم بھیجنے سے پہلے اس نے مجھ سے پوچھا کہ فلاں شخص کے ہاتھ رقم بھیج دوں، میں نے کہا بھیج دیں، پھر اس نے مجھے اطلاع کر دی کہ رقم کی ادائیگی کے بعد کسی کے نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوں، جو شخص رقم لا رہا تھا راستہ میں اس کی جیب کٹ گئی۔ اس طرح وہ رقم مجھے نہیں مل سکی، اب کیا رقم لانے والے سے مطالبہ کر سکتا ہوں؟

☆ میرے کچھ عزیز و اقارب انتہائی غریب ہیں، کیا میں انہیں بتائے بغیر زکوٰۃ سے ان کا تعاون کر سکتا ہوں یا زکوٰۃ کے متعلق وضاحت کرنا ضروری ہے۔

☆ میں نے کسی کا قرض دینا ہے، میں اسے مطلع کر دوں کہ میں ادائیگی کی پوزیشن میں نہیں ہوں، وہ خاموشی اختیار کر لے اور رقم کا مطالبہ بھی نہ کرے۔ آیا اس کے رویے سے یہ رقم معاف سمجھی جائے گی یا اس کی ادائیگی کرنا پڑے گی؟ کتاب و سنت کی روشنی میں ان سوالات کے جوابات دیں۔

جواب قرض کی رقم مقروض کے ذمے واجب الادا ہوتی ہے، قرض خواہ کے مطالبے پر اس نے ادائیگی کا بندوبست کر دیا اور بھیجنے سے قبل اس نے قرض خواہ سے پوچھا کہ آپ کی رقم فلاں شخص کے ہاتھ بھیج دوں؟ اس کے کہنے پر اس نے رقم ارسال کر دی۔ اب مقروض بری الذمہ ہے۔ اب سوئے اتفاق سے وہ رقم چوری ہو گئی اور قرض خواہ تک نہ پہنچ سکی، اس میں رقم لانے والے شخص کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ کیونکہ اس کے پاس رقم امانت تھی جو اس سے ضائع ہو گئی۔ اکثر اہل علم کا موقف ہے کہ امانت کے ضائع ہونے پر کوئی تاوان نہیں بشرطیکہ امانت کی حفاظت میں کوئی کوتاہی نہ کی گئی ہو۔ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم نے اسی مؤقف کو اختیار کیا ہے۔ [مغنی لابن قدامہ، ص: ۲۵۷، ج ۹]

اس سلسلہ میں ایک مرفوع حدیث بھی مروی ہے۔ [سنن بیہقی، ص:۲۸۹،ج۶]

ان شواہد کی بنا پر قرض خواہ کو قطعی طور پر یہ حق نہیں ہے کہ وہ رقم لانے والے سے اپنی رقم کا مطالبہ کرے، اس میں رقم لانے والا بے قصور ہے۔ [واللہ اعلم]

☆ عزیز و اقارب پر زکوٰۃ خرچ کرنا بہت فضیلت کا باعث ہے بشرطیکہ جن اقارب پر زکوٰۃ خرچ کرنا ہے ان کے اخراجات کی ذمہ داری خرچ کرنے والے پر نہ ہو، مثلاً: خاوند اپنی اولاد اور بیوی پر زکوٰۃ سے خرچ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ان پر خرچ کرنا باپ اور خاوند کی ذمہ داری ہے۔ البتہ بیوی اپنے خاوند پر زکوٰۃ وغیرہ خرچ کر سکتی ہے، چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے کہ ''اقارب کو زکوٰۃ دینا، پھر ایک حدیث بیان کی ہے کہ اقارب پر خرچ کرنے والے کو دو اجر ملتے ہیں، صدقہ خیرات کرنے اور قرابت داری کا لحاظ رکھنے کا۔'' [صحیح بخاری، الزکوٰۃ:۱۴۶۶]

اگرچہ بعض علما کا موقف ہے کہ زکوٰۃ دیتے وقت وضاحت کر دینا چاہیے کہ تعاون زکوٰۃ سے کیا جا رہا ہے لیکن کتاب وسنت میں ہمیں کوئی ایسی دلیل نہیں مل سکی، جس سے اس قسم کی وضاحت کرنے کا ثبوت ملتا ہو، اس لئے عزیز و اقارب کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ اور اس کے لئے زکوٰۃ کی صراحت کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ [واللہ اعلم]

☆ قرآن کریم میں قرض کے متعلق صراحت ہے کہ اگر مقروض تنگ دست ہو تو اسے ادائیگی کے لئے مزید مہلت دی جائے یا اسے قرض معاف کر دیا جائے۔ لیکن معافی کے لئے ضروری ہے کہ وہ برضا و رغبت اور دل کی خوشی سے اسے معاف کرے۔

صورت مسئولہ میں اگر قرض خواہ نے خاموشی اختیار کی ہے تو اسے مزید مہلت پر تو محمول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس خاموشی کو معافی کی علامت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ مقروض کو چاہیے کہ حالات درست ہونے پر قرض خواہ کی رقم واپس کرے یا پھر وضاحت کے ساتھ وہ رقم اس سے معاف کرا لے موہوم رویے پر قرض کے معاف ہونے کی بنیاد نہ رکھی جائے۔ [واللہ اعلم]

متفرقات

متفرقات

سوال شیخ الحدیث یا فتویٰ دینے کا عہدہ کن لوگوں کے لئے مختص ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب شیخ اپنے فن میں مہارت تامہ رکھنے والے کو کہتے ہیں۔ اگر ایک مسلمان عالم، علم حدیث میں مہارت و تجربہ رکھتا ہے تو اسے شیخ الحدیث کہا جاتا ہے۔ البتہ فتویٰ دینے کے لئے کچھ اضافی شرائط ہیں۔ یعنی مفتی کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسلمان، عاقل و بالغ اور شریعت کے متعلق وجہ البصیرت گہرائی اور گیرائی رکھنے والا ہو۔ یعنی بصیرت ایک اساسی اور بنیادی شرط ہے۔ نیز اس کے لئے بلند اخلاق اور باکردار ہونا بھی ضروری ہے، تاکہ لوگ اس کی بات پر اعتماد کریں۔ الغرض مفتی کے لئے ضروری ہے کہ وہ علوم اسلامیہ پر پوری پوری دسترس اور گردوپیش کے حالات وظروف پر گہری نظر رکھتا ہو۔ اس کے علاوہ عجز و نیاز کے ساتھ اللہ کے حضور جھکنے والا، احتیاط کے دامن کو تھامنے والا، لوگوں سے حسن سلوک کا معاملہ کرنے والا اور پیچیدہ مسائل میں دیگر اہل علم سے مشورہ کرنے والا ہو۔

سوال ایک عورت بچے کی پیدائش کے موقع پر دوران آپریشن فوت ہو جاتی ہے کیا اسے بھی شہادت کا رتبہ ملے گا، اگرچہ اس کی موت ڈاکٹر کی کوتاہی سے واقع ہوئی ہو؟

جواب دوران زچگی فوت ہونے والی عورت کو شہداء میں شمار کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''وہ عورت جو بچے کی پیدائش کے سبب فوت ہو جائے شہید ہے۔'' [مسند امام احمد، ص:۲۰۱، ج۴]

شرعی اصطلاح میں یہ شہادت صغریٰ ہے۔ دین اسلام کی سربلندی کے لئے میدان کارزار میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا شہادت کبریٰ ہے، لیکن دور حاضر میں زچگی کے آپریشن دو وجہ سے کئے جاتے ہیں:

① رحم مادر میں بچے کی حالت بایں طور ہوتی ہے تاکہ نارمل طریقہ سے اس کی پیدائش ممکن نہیں ہوتی بلکہ ایسے حالات میں آپریشن ناگزیر ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں دوران آپریشن زچہ فوت ہو جائے تو وہ بلاشبہ شہداء میں ہوگی، اگرچہ اس کی موت ڈاکٹر کی کوتاہی سے ہی کیوں نہ ہو۔

② بچے کی پیدائش معمول کے مطابق ہونا ممکن ہوتی ہے، لیکن بطور فیشن پیدائش کے وقت تکلیف سے بچنے کے لئے آپریشن کا سہارا لیا جاتا ہے۔ حالانکہ زچگی کے دوران تکلیف کی شدت فطرت کے عین مطابق ہے اور اس تکلیف کی وجہ سے پیدائش ممکن ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں اگر بلاضرورت آپریشن کا سہارا لیا جاتا ہے تو اس دوران اگر موت واقع ہو جائے تو اسے شہداء میں شمار کرنا محل نظر ہے بلکہ ایسے حالات میں آپریشن کا سہارا لینا ہی خلاف فطرت ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''تین آدمیوں کے لئے بغیر امیر شرعی رہنا جائز نہیں۔'' یہ حدیث کس کتاب میں ہے اس کا مفہوم کیا ہے، نیز وضاحت کریں کہ وہ تین قسم کے لوگ کون کون سے ہیں؟

جواب یہ حدیث مسند امام احمد، سنن بیہقی اور ابوداؤد میں ہے۔ سوال میں مذکورہ الفاظ مجھے نہیں مل سکے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی یہ الفاظ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آبادی سے باہر جب تین ہوں تو انہیں اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنا لینا

چاہیے۔'' [مسند امام احمد،ص:۱۷۷،ج۲]

اس حدیث کا تعلق سفر سے ہے، یعنی دوران سفر کسی کو امیر سفر بنا لینا چاہیے تاکہ اجتماعیت برقرار رہے اور نظم وضبط کے ساتھ سفر جاری رکھ سکیں۔ چنانچہ حدیث میں اس کی صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تین آدمی سفر کو نکلیں تو کسی ایک کو امیر ضرور بنالیں۔'' [ابوداؤد، الجہاد، ۲۶۰۸]

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے جب یہ حدیث بیان کی تو وہ سفر میں تھے تو ان کے شاگرد نافع رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ اس حدیث کے پیش نظر آپ ہمارے امیر ہیں۔ [بیہقی،ص:۲۵۷،ج۵]

واضح رہے کہ اس قسم کی امارات ''امارات صغریٰ'' کہلاتی ہیں۔ جس میں سفر کی زندگی کو ایک ضابطہ سے ادا کیا جاتا ہے، پھر انسان کو امارات کبریٰ کے قیام کے لئے کوشاں رہنا چاہیے۔ جسے قرآن نے ''اولی الامر'' سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی اطاعت مشروط ہوتی ہے۔ جب تک اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کے مطابق عمل پیرا ہوں گے۔ ان کی اطاعت ضروری ہے بصورت دیگر ان کی اطاعت ضروری نہیں۔ بہرصورت مندرجہ بالا حدیث سفر سے متعلق ہے کہ سفر کرتے وقت انسان کو چاہیے کہ اپنے سے بہتر کسی شخص کو امیر بنا کر اپنے سفر کو جاری رکھے، اس سے مراد حدود اللہ قائم کرنے والا امیر نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا قصاص لینا چاہتے تھے۔ اگر ایسا ہی تھا تو آپ نے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو عہدوں پر فائز کیوں کیا، نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے کیوں بیعت لی؟

جواب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احترام اور ان سے حسن ظن کا تقاضا یہی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خون عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لینے کا ارادہ رکھتے تھے، باقی رہا قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو عہدوں پر فائز کرنے کا معاملہ، تو اس وقت بعض مصلحتیں درپیش تھیں جن کے پیش نظر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ اقدام کرنا پڑا، یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والے باغیوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی از خود بیعت کی تاکہ وہ اس بیعت کی آڑ میں اپنا بچاؤ کر سکیں۔ چنانچہ وہ اس طرح اپنے مزعومہ مقاصد میں کسی حد تک کامیاب بھی رہے۔

بہرحال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق ہمیں غیر معمولی حد تک محتاط رہنا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی مرضی کا مژدہ سنایا ہے۔

سوال بدعت حسنہ کیا ہوتی ہے؟

جواب بعض حضرات بدعت کی تقسیم کرتے ہیں کہ ایک بدعت حسنہ، یعنی بعض کام بدعت تو ہوتے ہیں، لیکن اچھے ہوتے ہیں۔ دوسری بدعت سیئہ، یعنی بعض کام بدعت بھی ہیں اور برے بھی ہیں۔ لیکن شریعت کی نظر میں ہر بدعت بری ہے۔ دراصل بدعت کے دو معنی ہیں: ایک لغوی اور ایک اصطلاحی۔ لغوی لحاظ سے ہر نئی چیز کو بدعت کہا جاتا ہے، مثلاً: بجلی، ٹرین، ہوائی جہاز وغیرہ یہ تمام چیزیں دور اول میں نہ تھیں۔ اس لئے لغوی لحاظ سے انہیں بدعت کہا جاتا ہے۔ لیکن شریعت کی اصطلاح میں ہر نئی چیز کو بدعت نہیں کہا جاتا بلکہ دین میں کوئی نیا طریقہ نکالنا اور اس طریقہ کو از خود مستحب، لازم یا مسنون قرار دینا بدعت کہلاتا ہے۔ اس اعتبار سے کوئی بدعت اچھی نہیں ہوتی بلکہ ہر بدعت بری ہی ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال قرآن مجید کے بوسیدہ اوراق کو کیا کرنا چاہیے؟

جواب ان کے لئے مندرجہ ذیل چار صورتیں ممکن ہیں:

① انہیں قبرستان میں دفن کر دیا جائے۔

② انہیں پانی میں بہا دیا جائے۔

③ زمین میں گڑھا کھود کر چھپا دیا جائے۔

④ انہیں بے حرمتی سے محفوظ رکھنے کے لئے جلا دیا جائے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے یہ آخری صورت ثابت ہے، کیونکہ پہلی تین صورتوں میں ان کے دوبارہ برآمد ہونے کا اندیشہ برقرار رہتا ہے۔ آج کل قبرستان میں قرآن محل تعمیر کئے جاتے ہیں۔ بہتر ہے کہ بوسیدہ اوراق کو وہاں محفوظ کر دیا جائے۔ [واللہ اعلم]

سوال عام طور پر کھانے وغیرہ پر دو طرح کا ختم دیا جاتا ہے۔ ایک تو غیر اللہ کے نام کا ہوتا ہے اس کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ دوسرا بطور رسم قل وغیرہ کا ختم ہوتا ہے، اس دوسری قسم کے ختم کے متعلق کیا حکم ہے؟

جواب غیر اللہ کے نام پر کوئی بھی چیز دینا حرام ہے اور اس کا استعمال بھی ناجائز ہے، البتہ جو چیز صرف اللہ کے لئے دی جائے لیکن اس پر ختم وغیرہ پڑھ کر اسے صدقہ کر دیا جائے تو اس صورت میں تقویٰ کا تقاضا ہے کہ اسے استعمال نہ کیا جائے۔ کیونکہ کھانے پینے کی چیزوں پر اس طرح قرآن پڑھنا، قرون اولیٰ میں ثابت نہیں ہے۔ ایسا کرنا بدعت وصفی کے ضمن میں آتا ہے۔ اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ اس کی اصل شریعت میں موجود ہو لیکن اس کی خاص شکل وصورت خود متعین کر لی جائے، جیسا کہ ختم وغیرہ دینے کا مروجہ طریقہ ہے۔ اگر ہمت ہو تو اسے روکنا چاہیے اگر روکنے کی طاقت نہیں تو اس کے استعمال سے گریز کرنا چاہیے، لیکن اگر فتنہ وفساد کا اندیشہ ہو تو مجبوری کے پیش نظر اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے، تاہم دل میں اس کے متعلق کراہت رکھنا ضروری ہے۔

[واللہ اعلم]

سوال صحابی کی کیا تعریف ہے، کیا حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما صحابی تھے؟

جواب صحابی وہ ہوتا ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بحالت ایمان ملاقات کی ہو اور اسلام پر ہی وفات پائی ہو۔ یہ جامع تعریف حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "نخبة الفكر" میں فرمائی ہے۔ اس تعریف کے مطابق حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما صحابہ کرام میں شامل ہیں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ دراصل اہل بیت کے متعلق شیعہ حضرات کے مبنی برغلو پروپیگنڈا کے رد عمل میں یہ منفی ذہن ابھرا کہ کچھ لوگوں نے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی صحابیت سے انکار کر دیا اور ان کی فضیلت کے متعلق جو روایات ہیں انہیں خود ساختہ اور بے اصل قرار دیا، جیسا کہ خلافت معاویہ ویزید نامی کتاب میں صراحت کے ساتھ لکھا گیا ہے: (ص۴۴۰) حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنے لئے مہکتے ہوئے ''گل عنبرین'' قرار دیا ہے۔

[صحیح بخاری، المناقب: ۳۷۵۳]

اس لئے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے متعلق بھی دیگر صحابہ کی طرح حسن ظن رکھنا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال میری لڑکی لیڈی ٹیچر کی حیثیت سے سکول میں تعینات ہے۔ سسرال والوں کا مطالبہ ہے کہ پوری تنخواہ ہمیں دیا کرو،

جبکہ اس کا خاوند کسی فیکٹری میں معقول تنخواہ پر ملازمت کرتا ہے، کیا لڑکی کی تنخواہ گھر کے اخراجات کے لئے وصول کی جاسکتی ہے؟

جواب شرعی طور پر لڑکی اپنی ملازمت کے دوران ملنے والی تنخواہ کی خود مالک ہے۔ وہ اپنی مرضی سے گھر کے اخراجات کے لیے صرف کرسکتی ہے۔ سسرال والوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اسے وصول کرنے کے لئے اس پر دباؤ ڈالیں یا بزور وصول کریں۔ خاوند کو یہ حق تو پہنچتا ہے کہ وہ ملازمت نہ کرائے، لیکن وہ بھی زبردستی تنخواہ نہیں وصول کرسکتا۔ اس سلسلہ میں ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اس مسئلہ کو زیادہ طول نہ دیا جائے بلکہ گھر میں بیٹھ کر اسے افہام وتفہیم کے ذریعے حل کیا جائے۔ لڑکے کے والدین کو خوش اسلوبی سے اس معاملہ میں قائل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن لڑکی کو بھی اس کے متعلق غور کرنا ہوگا کہ کہیں دنیا کی یہ دولت اس کی بربادی کا باعث نہ بنے۔ اصل بات گھر کی آبادی ہے۔ اس پر کسی صورت میں آنچ نہیں آنی چاہیے۔

سوال شب براءت کے متعلق وضاحت کریں کہ اس کی شریعت میں کیا حیثیت ہے، کیا اس دن روزہ رکھنا چاہیے؟

جواب بعض ناقابل حجت روایات کی بنا پر لیلۂ مبارکہ سے مراد ماہ شعبان کی پندرھویں رات مراد لی گئی ہے۔ جس کا نام لوگوں نے شب براءت رکھا ہے، پھر ستم بالائے ستم یہ ہے کہ جس قدر فضائل ومناقب لیلۃ القدر کے متعلق احادیث میں وارد ہیں ان تمام کو شب براءت کے کھاتے میں ڈال کر اسے خوب رواج دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے ماہ شعبان کے متعلق مندرجہ ذیل طرز عمل منقول ہے:

☆ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ماہ شعبان میں بکثرت روزے رکھتے دیکھا ہے۔

[صحیح بخاری، الصوم:۱۹۶۹]

☆ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ماہ شعبان کے پورے روزے رکھتے حتی کہ اسے ماہ رمضان سے ملا دیتے۔ [ابوداؤد، الصوم:۲۳۳۶]

شعبان کی پندرھویں تاریخ کو صرف ایک روزہ رکھنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح شب براءت کے قیام کی بھی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔

سوال ہمارے گھر سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلہ پر ٹیوب ویل واقع ہے ہم اس کے میٹر سے تار لا کر گھر میں بجلی استعمال کرتے ہیں اور صرف شدہ بجلی کا کمرشل بل بھی ادا کرتے ہیں۔ جو کہ گھریلو عام ریٹ سے کہیں زیادہ ہوتا ہے کیا ایسا کرنا ازروئے شریعت جائز ہے؟

جواب یہ ایک اصولی بات ہے کہ معاشرہ میں رائج قوانین اگر شریعت کے خلاف نہ ہوں تو ان کی پابندی ضروری ہے، محکمہ واپڈا کا یہ قانون ہے کہ ہر صارف کو بجلی استعمال کرنے کے لئے ایک الگ میٹر مہیا کیا جاتا ہے۔ جو اس محکمہ کے مفاد میں ہے۔ ایک ہی میٹر سے دوسرے صارف کو بجلی سپلائی کرنا واپڈا کے قوانین کے خلاف ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے خود محکمہ کے مفادات مجروح ہوتے ہیں۔ اگر کسی اہلکار نے اس کی اجازت دی ہے تو اسے قانونی حیثیت حاصل نہیں ہے، لہٰذا ٹیوب ویل کے میٹر سے ایک کلومیٹر کے فاصلہ پر تار لے جا کر بجلی استعمال کرنا شرعاً وقانوناً درست نہیں ہے، کیونکہ ایسا کرنا محکمہ کے قوانین کے خلاف ہے۔ اگرچہ

صارف اس کی ہر ماہ مقررہ رقم ادا کرتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ محکمہ سے اجازت لے کر گھر کے لئے الگ میٹر نصب کرایا جائے تا کہ کسی قسم کا شک وشبہ نہ رہے، اسی طرح گھریلو میٹر کو کمرشل بنیادوں پر استعمال کرنا بھی شرعاً درست نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال کسی کا پیدائشی طور پر ہونٹ یا کان کٹا ہوا ہو تو اس کی پلاسٹک سرجری کروانا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب اللہ تعالیٰ کا نظام ہے کہ عام طور پر ماں کے پیٹ سے جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو ساخت و بناوٹ اور شکل وصورت کے لحاظ سے مکمل ہوتا ہے لیکن بعض اوقات قدرتی اسباب کے پیش نظر غذائی مواد کی کمی یا کیمیائی تبدیلی کی وجہ سے بچہ ناقص الخلقت پیدا ہوتا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض بچوں کی چار انگلیاں ہوتی ہیں اور بعض اوقات ان کا ہونٹ درمیان سے کٹا ہوتا ہے، جو صحیح اور درست بات چیت کرنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ ایسے حالات میں اگر کوئی علاج ممکن ہے تو شریعت نے اس کی اجازت دی ہے۔ آنکھوں کی بینائی اگر ختم ہو جائے تو آپریشن کے ذریعہ اسے بحال کیا جاتا ہے۔ پیدائشی ٹیڑھے پاؤں اور اوپر نیچے دانت ہموار کئے جاسکتے ہیں۔ شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ عرفجہ بن اسعد کا ناک دور جاہلیت میں جنگ کلاب کے دوران کٹ گیا تھا تو اس نے چاندی کا ناک لگوا لیا، لیکن اس میں تعفن پڑ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے اسے سونے کا ناک لگوانے کی اجازت دے دی۔ [نسائی، الزینة: ۵۱۶۴]

لیکن آج کل اس جدید طریقہ علاج سے غلط فائدہ اٹھایا جا رہا ہے کہ ''اس بازار'' کی عورتوں کے چہروں پر عمر رسیدگی یا نحوست کی وجہ سے جھریاں پڑ جاتی ہیں تو وہ اپنے نسوانی حسن کو بحال کرانے کے لئے اسی طریقہ علاج کا سہارا لیتی ہیں۔ ہمارے نزدیک ایسا کرنا جرم وحرام اور ناجائز ہے، کیونکہ اس سے دجل اور دھوکہ دینا مقصود ہوتا ہے، اس لئے شریعت ایسے حالات میں فطرت سے چھیڑ چھاڑ کی اجازت نہیں دیتی۔ مصنوعی بالوں کا استعمال بھی اسی وجہ سے ممنوع ہے۔ ہاں قدرتی بال اگانے کا بندوبست بذریعہ سرجری درست ہے تو شریعت میں اس طریقہ علاج کی گنجائش ہے۔ بشرطیکہ اسے غلط طور پر استعمال نہ کیا جائے۔ [واللہ اعلم]

سوال کیا خنزیر کے اعضاء انسانی جسم میں لگائے جاسکتے ہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی حیثیت واضح کریں۔

جواب شریعت نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے وہ صرف انسان کی فلاح و بہبود کی وجہ سے ہے کیونکہ یہ حرام اشیاء کبھی انسان کے جسم کے لئے ضرر رساں ہوتی ہیں اور کبھی اس کے اخلاق و کردار کو تباہ کر دیتی ہیں۔ اگرچہ ظاہری طور پر ان میں کوئی فائدہ بھی ہوتا ہے، تاہم اس میں نقصان کا پہلو بہر صورت غالب ہے۔ بعض اوقات ہماری ظاہر بین آنکھیں اس نقصان کے ادراک سے قاصر ہوتی ہیں۔ خنزیر کے گوشت کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''تم پر مردار، خون اور سور کا گوشت حرام کیا گیا ہے۔'' [۵/المائدہ:۳]

ایک دوسرے مقام پر اس کی وجہ بیان فرمائی کہ ''وہ ناپاک اور نجس ہے۔'' [۶/الانعام:۱۴۵]

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے کسی ایسی چیز میں شفا نہیں رکھی جو ان پر حرام

کر دی گئی ہو۔'' [صحیح بخاری، الاشربۃ، باب نمبر ۱۵]

قرآنی آیات میں اگرچہ خنزیر کے گوشت کا ذکر ہے کیونکہ یہ اس کا جزو اعظم ہے، تاہم خنزیر مجسمہ نجاست ہے۔ اس کے بال، گوشت، پوست اور ہڈیاں سب حرام اور نجس ہیں اور حدیث کے مطابق حرام میں شفا نہیں ہوتی۔ اس بنا پر مذکورہ قرآنی آیات اور احادیث کے پیش نظر خنزیر کے جسم کا کوئی حصہ انسانی جسم کے لئے بطور پیوند کاری استعمال نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی انہیں کسی اور کام کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال پرفیوم میں الکحل ہوتی ہے، ہم نے سنا ہے کہ اس کے استعمال سے کپڑے پاک نہیں رہتے، اس لئے نماز نہیں ہوتی کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟

جواب الکحل کے متعلق یہ بات قابل تحقیق ہے کہ یہ شراب (خمر) ہے یا اس کا متبادل، ہمارے نزدیک یہ خمر نہیں بلکہ اس کا متبادل ہے۔ ضروری نہیں کہ اصل چیز کے متعلق جو احکام ہوتے ہیں۔ متبادل کے بھی وہی ہوں۔ ہمارے اساتذہ جو محتاط محققین سے تھے، ان کا کہنا تھا کہ الکحل بعض اجزا سے تیار ہوتی ہے اور اس کے بعض اجزا حلال ہیں۔ جیسا کہ انگور وغیرہ ہیں، اگر اسے شراب جیسا ہی قرار دیا جائے تو بھی اس کی نجاست کے متعلق اختلاف ہے کہ وہ حسی ہے یا معنوی؟ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی رائے کہ شراب کی نجاست حسی نہیں بلکہ معنوی ہے، تاہم راجح بات یہی ہے کہ اس کی نجاست حسی ہے تاکہ لوگوں کی اس سے نفرت برقرار رہے۔ اس کے علاوہ بعض احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، جو لوگ الکحل کو ادویات یا خوشبو میں ڈالتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اسے صرف اس لئے استعمال کیا جاتا ہے تاکہ دوا اور خوشبو کا اثر برقرار رہے۔ جب اس دوا کو استعمال کیا جاتا ہے جس میں الکحل ہوتی ہے تو الکحل اڑ جاتی ہے اور دوا کا اثر باقی رہتا ہے، اسی طرح جب پرفیوم وغیرہ استعمال کی جاتی ہے تو اس سے الکحل اڑ جاتی ہے۔ صرف خوشبو باقی رہتی ہے اگر یہ بات درست ہے تو پرفیوم استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس کے استعمال سے کپڑے پلید نہیں ہوتے۔ ان میں نماز پڑھنا جائز ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال دم کرنا اور اس پر معاوضہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو دم کر کے معاوضہ لیا تھا؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب شریعت مطہرہ کی روشنی میں دم کرنا اور کروانا دونوں جائز ہیں، جبکہ مندرجہ ذیل شرائط پائی جائیں۔

☆ دم شرکیہ الفاظ پر مشتمل نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی کلام، اس کے اسمائے گرامی اور صفات عالیہ سے ہو۔

☆ بامعنی عربی زبان میں ہو، جادو، ٹونے اور ناجائز عبارات پر مشتمل نہ ہو۔

☆ نجس حالات، یعنی جنابت اور قضائے حاجت کے دوران نہ کیا جائے۔

☆ دم کرنے اور کرانے والا یہ عقیدہ رکھے کہ ذاتی طور پر دم فائدہ مند نہیں، بلکہ مؤثر حقیقی صرف اللہ کی ذات ہے۔ دم کے جواز کے متعلق روایات کتب حدیث سے مروی ہیں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے آپ کو دم کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بستر پر آرام کرنے کے لئے تشریف لاتے تو معوذات پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونک مارتے، پھر جہاں تک

ممکن ہوتا اپنے چہرے اور جسم پر انہیں پھیرتے۔ [بخاری، الطب: ۵۷۵۰]

دوسروں پر بھی دم کرتے، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما پر دم کیا کرتے تھے۔ [بخاری، الانبیاء: ۳۳۷۱]

دوسروں کو دم کرنے کا حکم بھی دیتے تھے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر ایک لونڈی کا چہرہ زرد رنگ کا دیکھا تو فرمایا: ''اسے دم کرو کیونکہ اسے نظر بد لگی ہوئی ہے۔'' [بخاری، الطب: ۵۷۳۹]

دم کر کے اجرت لینا بھی جائز ہے، جیسا کہ مخصوص حالات کے پیش نظر حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے ایک سردار پر سورۂ فاتحہ سے دم کرنے کی اجرت طے کی تھی۔ پھر دم کر کے فیس وصول کی، جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برقرار رکھا، بلکہ حوصلہ افزائی کے طور پر فرمایا: ''اس میں میرا بھی حصہ رکھو۔'' [بخاری، الطب: ۵۷۴۹]

لیکن دم کرنے کے لئے ہمہ وقتی سروس اور اسے پیشہ یا ذریعہ معاش بنانا کسی صورت میں صحیح نہیں ہے، کیونکہ

اولاً: اس کے لئے ہمہ وقت کی فراغت اور اسے پیشہ بنانے کا ثبوت اسلاف سے نہیں ملتا۔

ثانیاً: ایسا کرنے سے دم کے بجائے دم کرنے والے کی اہمیت زیادہ بڑھ جاتی ہے حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے کیونکہ دم اصل اور دم کرنے والا اس کے تابع ہے، اس لئے ہر وہ ذریعہ جو کلام اللہ اور دم کی ثقاہت کمزور کرے اس کا سد باب بہت ضروری ہے، لہٰذا دم کرنا اور اس پر اجرت (فیس) لینا تو جائز ہے لیکن ہمہ وقتی سروس کی صورت میں اسے ذریعہ معاش بنا لینا جائز نہیں ہے۔ واضح رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ کسی صحابی پر دم کر کے معاوضہ وغیرہ نہیں لیا، تاہم دم کے عوض طے شدہ معاوضہ کے متعلق یہ ضرور فرمایا تھا کہ میرا بھی اس میں حصہ رکھو، جیسا کہ صحیح بخاری کے حوالہ سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال مشرک کے ذبیحہ کے متعلق کیا حکم ہے، یعنی اس کا ذبح کیا ہوا جانور حلال ہے، نیز جو شخص خود کو مسلمان کہلائے اور شرک کا ارتکاب بھی کرے اس کے ذبیحہ کا کیا حکم ہے؟

جواب ذبح کرنا بھی ایک عبادت ہے، جو مشرک سے قبول نہیں کی جاتی۔ اس لئے جو بنیادی طور پر مشرک ہیں، مثلاً: ہندو، سکھ اور بدھ مت وغیرہ ان کا ذبیحہ حرام ہے، البتہ اہل کتاب جو سماوی شریعت کے قائل ہیں۔ قرآنی صراحت کے مطابق ان کا ذبیحہ جائز قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے جائز ہے۔'' [۵/المائدہ: ۵]

اس آیت کریمہ میں کھانے سے مراد ذبیحہ ہے لیکن اس کے لئے بھی شرط ہے کہ حلال جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جائے، نزول قرآن کے وقت اہل کتاب کی دو اقسام میں شرک پایا جاتا تھا، جیسا کہ قرآن میں ہے کہ یہودی حضرت عزیر علیہ السلام اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے تھے، ان کے باوجود ان کے ذبیحہ کو مشروط طور پر ہمارے لئے حلال قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح دور حاضر کے مسلمان جو معیاری نہیں ہیں، البتہ کلمہ گو، نماز و روزہ کے قائل و فاعل ہیں، اگر بظاہر کوئی شرکیہ کام کریں تو ان کا ذبح کردہ جانور حرام نہیں ہوگا۔ ہاں، اگر شرک و بدعت کو اپنے لئے حلال سمجھتے ہوں، ضد اور ہٹ دھرمی کے طور پر شرک کا ارتکاب

کرتے ہیں تو ایسے لوگوں کے ذبیحہ سے اجتناب کرنا چاہیے۔ واضح رہے کہ اگر کسی انسان میں شرک کے اسباب موجود ہوں تو اسے مشرک قرار دینے کے لئے ضروری ہے کہ وہاں کوئی موانع نہ ہوں۔ اگر اسباب کے ساتھ کوئی رکاوٹ یا مانع موجود ہو تو انہیں مشرک نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس موضوع پر راقم نے مورخہ ۲۷ جولائی بمقام دفتر ''محدث''، ماڈل ٹاؤن لاہور میں ایک درس دیا تھا اور وہ دفتر محدث سے مل سکتا ہے۔ اس میں وضاحت کی تھی کہ کسی کو مشرک یا کافر قرار دینے کے اسباب، ضوابط، شرائط اور موانع کیا ہیں۔

قرآن وحدیث میں ہمیں اس بات کا پابند بنایا گیا ہے کہ ہم حلال اور طیب مال استعمال کریں، اس سلسلہ میں (اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظَّالِمِیْنَ) کثرت سے پڑھا کریں، اس میں بہت خیر وبرکت ہے۔

سوال گولڈن کلر یعنی سونے کے رنگ کی کلائی گھڑی پہننا جائز ہے یا نہیں، اگرچہ اس کا چین سونے کا نہیں ہوتا لیکن اس پر سونے کا پانی ضرور ہوتا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ان سے دریافت کریں کہ کس نے اللہ تعالیٰ کی اس زینت کو حرام کیا ہے، جسے اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے۔ [۷/الأعراف:۳۲]

اس آیت کریمہ کی رو سے انسان کے لئے ہر قسم کی زینت کا استعمال حلال ٹھہرتا ہے لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لئے ہر قسم کی زینت مطلق طور پر حلال نہیں ہے بلکہ اس کے لئے کچھ حدود ہیں۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ اس زینت کی حرمت نص قطعی سے ثابت نہ ہو، جیسا کہ سونے اور ریشم کے متعلق حدیث میں ہے کہ ان کا استعمال عورتوں کے لئے جائز اور مردوں کے لئے ناجائز ہے۔ فرمان نبوی ﷺ ہے:

''سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں کے لئے حلال اور مردوں کیلئے حرام کیا گیا ہے۔'' [مسند امام احمد،ص:۳۹۲،ج۴]

☆ اس زینت سے نمود ونمائش اور ریاکاری مقصود نہ ہو ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ ''مجھے تمہارے متعلق زیادہ اندیشہ شرک اصغر، یعنی ریاکاری میں مبتلا ہوجانے کا ہے۔'' [مسند امام احمد،ص:۴۲۸،ج۵]

☆ عورتوں سے مشابہت کرنے کے لئے اس زینت کو استعمال نہ کیا گیا ہو۔ حدیث میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے ان مردوں پر لعنت کی ہے جو عورتوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں۔'' [مسند امام احمد،ص:۳۳۹،ج۱]

☆ زینت اختیار کرتے وقت غیر مسلم اقوام کی نقالی مقصود نہ ہو، جیسا کہ ہمارے ہاں بعض منچلے شوق فضول کی خاطر گلے میں صلیب وغیرہ لٹکا لیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے متعدد مرتبہ یہود ونصاریٰ کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا، نیز آپ نے فرمایا کہ ''جو انسان کسی دوسرے کی نقالی کرتا ہے، وہ انہیں سے شمار ہوگا۔'' صورت مسئولہ میں مذکورہ بالا حدود وقیود کی پابندی کرتے ہوئے گولڈن کلر، یعنی سونے رنگ جیسی کلائی گھڑی استعمال کی جاسکتی ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک شخص حدیث اور کتب حدیث پر اس طرح تنقید کرتا ہے کہ ان کی توہین کا پہلو نمایاں ہوتا ہے، نیز حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی صحابیت کا بھی منکر ہے، اس کے علاوہ وہ کہتا ہے کہ اسلام میں پہلا اختلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ڈالا۔ کیا اس طرح کے عقائد رکھنے والے کو مسجد کا ممبر بنایا جاسکتا ہے؟ بالخصوص جبکہ اندیشہ ہو کہ یہ اپنے فاسد عقائد ونظریات دوسرے نمازیوں میں

بھی پھیلائے گا، ایسے شخص کے ساتھ تعلقات رکھنا شرعاً کیسا ہے۔ کیا ایسے شخص کو سلام کرنا یا اس کے سلام کا جواب دینا درست ہے، کیا ایسے شخص کو زندیق کہا جا سکتا ہے، نیز زندیق کی شرعی طور پر سزا کیا ہے؟

جواب واضح ہو کہ دین اسلام کی بنیاد قرآن اور اس کے بیان (حدیث) پر ہے۔ بیان قرآن کے لئے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا ہے۔ آپ نے اپنے فرمودات وارشادات اور سیرت و کردار سے قرآن کریم کی وضاحت اور تشریح کی ہے جو ہمارے پاس کتب حدیث کی شکل میں موجود ہے۔ لیکن دور حاضر کے متجددین کتب حدیث کو ہدف تنقید بنا کر نہ صرف ان دفاتر حدیث کی توہین کا ارتکاب کرتے ہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ سے وہ اعزاز بھی چھیننا چاہتے ہیں جو خود اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے فرمودات کے ذریعہ قرآن کے اجمال کی تفصیل اور اطلاق کی تقلید دور حاضر کے ان معتزلہ وخوارج کو گوارا نہیں۔ وہ صرف اپنی عقل عیار کو معیار بنا کر قرآن کریم کی تشریح کرنا چاہتے ہیں تاکہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ اس ضابطہ حیات کو اپنی من مانی تاویلات کی بھینٹ چڑھایا جا سکے۔ ان کے نزدیک حدیث اور کتب حدیث ایک ''عجمی سازش'' کا حصہ ہیں۔ صورت مسئولہ میں ایک شخص کے متعلق دریافت کیا گیا ہے جو توہین رسالت کے علاوہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تشتت واختلاف کا موجب گردانتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''ایسے لوگوں کے ساتھ مت بیٹھیں تا آنکہ وہ کسی دوسری بات میں لگ جائیں۔'' [۴/النساء:۱۴۰]

ایسے شخص کو مسجد یا دینی جماعت کا ممبر بنانا جائز نہیں ہے۔ اس کے ساتھ تعلقات اصلاح احوال کے لئے تو رکھے جا سکتے ہیں لیکن اس قسم کے گندے جراثیم آگے منتقل ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسے عضو کو کاٹ دینا ہی بہتر ہے، یعنی ایسے شخص سے روابط ختم کر لئے جائیں ایسے شخص کو سلام کرنے میں ابتدا نہیں کرنا چاہیے، البتہ اگر وہ سلام کہتا ہے تو اس کا جواب دیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ ایسا انسان زندیق وملحد ہے اور اسلامی حکومت میں ایسے شخص کی سزا قتل ہے اور اس قسم کی سزا کا نفاذ بھی اسلامی حکومت کا کام ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال کیا درس قرآن کی ویڈیو بنائی جا سکتی ہے تاکہ دوسرے لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچایا جائے، اگر جائز ہے تو کیا اس قسم کی ویڈیو فلمیں عورتیں دیکھ سکتی ہیں، نیز درس قرآن سننے کے لئے ٹی وی، یا ویڈیو گھر میں رکھا جا سکتا ہے؟

جواب ویڈیو فلم کی بنیاد تصویر پر ہے اور تصویر کشی کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا امتناعی حکم وارد ہے، چنانچہ آپ نے فرمایا: ''جو لوگ تصویر کشی کا ارتکاب کرتے ہیں، انہیں قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا۔'' [بخاری، اللباس:۵۹۵۱]

مذکورہ وعید صرف تصویر بنانے والے ہی کے متعلق نہیں ہے بلکہ استعمال کرنے والے کے متعلق بھی ہے، جیسا کہ ایک روایت میں ''اصحاب الصور'' یعنی تصویر رکھنے والے کے الفاظ بھی ہیں۔ [صحیح بخاری، اللباس:۵۹۵۷]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے احادیث کی شرح کرتے ہوئے اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ [فتح الباری، ص:۳۸۸، ج۱۰]

فتنہ تصویر کشی اپنی ارتقائی منزل طے کرتا ہوا اب ٹیلیویژن، ویڈیو اور انٹرنیٹ کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ انہی کی ''برکات'' ہیں کہ پہلے سینما گھر مخصوص مقامات ہوتے تھے اب ان کی آمد کے بعد جگہ جگہ یہ گندگی موجود ہے بلکہ کیبل سسٹم نے

گھروں اور دکانوں کو بے حیائی اور بدمعاشی کے اڈوں میں بدل دیا ہے۔ ان اشیاء کو دوسروں تک اللہ کا پیغام پہنچانے کا ذریعہ قرار دینا محض خام خیالی ثابت ہوا۔ اس کے استعمال سے نہ صرف گلی کوچوں میں تبلیغ کے جذبات ماند پڑ گئے ہیں بلکہ ''علما اور مبلغین'' میں جذبۂ نمائش پروان چڑھا ہے۔ اسے انتہائی مجبوری یا یقینی فائدہ کے پیش نظر ہی استعمال کیا جانا چاہیے، البتہ کیسٹ اور ٹیپ ریکارڈ کے ذریعے اپنی آواز کو آگے پہنچانے میں کوئی قباحت نہیں۔ لہٰذا ہمارے نزدیک ٹیلی ویژن، ویڈیو وغیرہ کے استعمال سے پرہیز کرنا زیادہ بہتر ہے۔

سوال تمام قرآن یا کچھ آیات کو عربی متن کے بغیر اور زبان میں لکھنا شرعاً جائز ہے یا نہیں، کیا ایسا کرنے سے تحریف کا دروازہ تو نہیں کھلتا؟ قرآن و حدیث کے مطابق جواب دیں۔

جواب واضح رہے کہ کلام اللہ ہونے کے ناطے سے قرآنی آیات کا ادب و احترام انتہائی ضروری ہے اور ہر کلمہ گو مسلمان دل و جان سے اس کے ادب و احترام کو بجالاتا ہے، تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن اور ترجمہ قرآن دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ عام طور پر اخبارات کو پڑھنے کے بعد انہیں ردی بنا دیا جاتا ہے، اس لئے بعض اخبارات میں تبلیغی نقطۂ نظر سے عربی متن کے بغیر قرآنی آیات کا صرف ترجمہ شائع کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ قرآنی الفاظ صرف بے ادبی کی وجہ سے نہیں لکھے جاتے، تاہم بہتر ہے کہ قرآنی آیات کا حوالہ دے دیا جائے، معمولی سا ایمان رکھنے والا مسلمان قرآن مجید میں تحریف کا تصور بھی نہیں کرسکتا، البتہ جن ناعاقبت اندیش لوگوں نے اس کے متعلق ہاتھ کی صفائی دکھانا ہوتی ہے، وہ بدباطن قرآنی آیات کی موجودگی میں بھی معنوی تحریف کا ارتکاب کرکے اپنی آخرت خراب کر بیٹھتے ہیں، چنانچہ آنجہانی غلام احمد پرویز کی بزعم خویش تفسیر ''مفہوم القرآن'' میں اس قسم کے متعدد شاہکار دیکھے جاسکتے ہیں۔ بالخصوص جو آیات معجزات سے متعلق ہیں ان میں مجازی معنی متعین کی آڑ میں یہودیانہ طرز عمل کی طرح خوب خوب تحریف معنوی کی گئی ہے۔ جو اس کی بدحواسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ صورت مسئولہ میں بہتر ہے کہ قرآنی آیات کا بھی حوالہ دے دیا جائے، تاہم ترجمہ پر اکتفا کرنا بھی جائز ہے، نیز اس ترجمہ کا ادب و احترام کرنا انتہائی ضروری ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے ہاں اکثر خطیب حضرات واقعہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو دوران سفر ایک ایسی عورت سے گفتگو کا موقع ملا جو ہر بات کا جواب قرآنی آیات سے دیتی تھیں اس واقعہ کی اصلیت کیا ہے؟

جواب ہمارے ہاں یہ المیہ ہے کہ واعظین حضرات قرآن و حدیث کے صحیح اور مستند واقعات کے بجائے من گھڑت قصے بیان کرنے کے عادی ہیں۔ چونکہ ان میں انوکھا پن ہوتا ہے، اس لئے انہیں جھوم جھوم کر بیان کیا جاتا ہے۔ مذکورہ واقعہ بھی اس قبیل سے ہے۔ افسوس کہ جماعت اہل حدیث سندھ کے ترجمان رسالہ ''دعوت اہل حدیث'' میں تحقیق و تبصرہ کے بغیر تین چار صفحات تک اسے پھیلایا گیا ہے۔ عرصہ پچیس، تیس سال قبل بندہ نے اس واقعہ کے متعلق ''اہل حدیث'' میں لکھا تھا کہ یہ بے بنیاد اور خود ساختہ ہے۔ غالباً علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کو بنیاد بنایا تھا۔ بہرحال یہ واقعہ "حکایہ متکلم بالقرآن کے عنوان سے المستطرف فی کل فن مستظرف۔" [ص۵٦،ج۱]

میں بیان ہوا ہے۔ اس کا کوئی حوالہ باسند بیان نہیں ہوا۔ بلاسند واقعات اکثر و بیشتر خود ساختہ ہوتے ہیں ویسے بھی اس

کتاب میں اس طرح کے دیگر واقعات بھی فضول اور بے بنیاد ہیں۔ اس پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ امام ابن حبان نے بیان کیا ہے۔ [روضة العقلاء ونزهة الفضلاء ص: ٤٩]

انہوں نے اس کی سند بھی بیان کی ہے۔ اس میں ایک راوی محمد بن زکریا بن دینار الغلابی ہے۔ جس کے متعلق امام دارقطنی نے لکھا ہے کہ حدیثیں بنایا کرتا تھا۔ [کتاب الضعفاء والمتروکین، ص:۴۸۳]

اس کتاب میں مذکورہ واقعہ الاصمی کی زبانی بیان ہوا ہے۔ انہوں نے واقعہ کے آخر میں بتایا ہے کہ میری معلومات کے مطابق وہ عورت شیعہ تھی۔ [واللہ اعلم]

سوال بعض لوگ فوت شدگان کے ایصال ثواب یا اپنے گھروں اور فیکٹریوں میں برکت کے لئے قرآن خوانی کراتے ہیں۔ ہمارے اہل حدیث مدارس کے شعبہ تحفیظ القرآن میں یہ سلسلہ موجود ہے کہ بچوں کو قرآن خوانی کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ کیا ایسا کرنا رسول اللہ ﷺ یا تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے؟

جواب شریعت سے ناواقفیت کی وجہ سے ان دنوں بے شمار ایسی چیزیں دین میں داخل کر لی گئی ہیں جن کا قرآن وحدیث میں کوئی ثبوت نہیں تھا۔ ان میں سے ایک مروجہ قرآن خوانی بھی ہے، اس کے ذریعے مردوں کو ثواب پہنچانے کا رواج عام ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ گھروں، فیکٹریوں اور مارکیٹوں میں برکت کے لئے بھی مدارس کے طلباء کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ مردوں کے لئے قرآن خوانی تو ایک کاروبار کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ دوسرے مزدوروں کی طرح قرآن خواں بھی بآسانی کرایہ پر مل جاتے ہیں۔ حالانکہ میت کے لئے قرآن خوانی نہ تو قرآن سے ثابت ہے اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ سے اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کریمہ کہ ''انسان کے لئے صرف وہی ہے جو اس نے کوشش کی'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے متبعین نے اس آیت کریمہ سے یہ مسئلہ استنباط فرمایا ہے کہ قراءت قرآن کا ثواب فوت شدگان کو ہدیہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ وہ ان کی محنت وکوشش کا نتیجہ نہیں ہے اور اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اس عمل کو مستحب قرار نہیں دیا ہے اور نہ ہی آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کسی ظاہری حکم یا اشارے سے اس کی طرف راہنمائی کی ہے اور یہ طریقہ کسی صحابی سے بھی منقول نہیں ہے۔ اگر اس میں نیکی کا کوئی پہلو ہوتا تو وہ ضرور ہم سے پیش قدمی کرتے، نیک کاموں سے متعلق صرف کتاب وسنت پر اکتفا کیا جاتا ہے کسی کے ذاتی فتویٰ، قیاس یا رائے سے کوئی حکم ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ دعا وصدقہ کا ثواب پہنچنے میں سب کا اتفاق ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس سلسلہ میں واضح ارشادات موجود ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر، ص:۲۵۸، ج۴]

اس طرح مکانات ودکانات میں خیر وبرکت کے لئے خود قرآن پڑھا جا سکتا ہے لیکن اس سلسلہ میں مدارس کے طلباء کی خدمات حاصل کرنا، قرآن خوانی کے بعد دعوت طعام کا اہتمام کرنا قرون اولیٰ سے ثابت نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''جس نے ہمارے دینی معاملے میں کوئی نئی چیز ایجاد کی جو اس سے نہیں وہ مردود ہے۔'' [صحیح بخاری، کتاب الصلح:۲۶۹۷]

لہٰذا ایسے کاموں سے اجتناب کرنا چاہیے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال اسلام میں لونڈی یا غلام رکھنے کی کیا حیثیت ہے؟ اس کے متعلق پوری وضاحت کریں اور اس کی حدود وقیود سے آگاہ

فرمائیں؟

جواب دین اسلام نے کئی ایک طریقوں سے غلاموں اور لونڈیوں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی ہے۔ جس کے نتیجہ میں آج کل لونڈی سسٹم تقریباً ناپید ہے۔ اس بنا پر ایسے حالات ذہنی مفروضہ کے علاوہ کچھ نہیں ہیں اور نہ ہی ایسے سوالات کا ضروریات زندگی سے کوئی تعلق ہے، تاہم مسئلہ کی وضاحت ہم کئے دیتے ہیں۔ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① ان پر احسان کرتے ہوئے رواداری کے طور پر انہیں بلا معاوضہ رہا کر دیا جائے۔

② ان سے فی نفر مقررہ شرح کے مطابق فدیہ لے کر انہیں چھوڑا جائے۔

③ جو مسلمان قیدی دشمن کے ہاں قید ہوں ان سے تبادلہ کر لیا جائے۔

④ انہیں مال غنیمت سمجھتے ہوئے مسلمان سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

اس مؤخر الذکر صورت میں گرفتار شدہ عورتوں سے صنفی تعلقات قائم کرنے کے متعلق ہمارے ذہنوں میں بے شمار خدشات اور شکوک وشبہات ہیں، اس لئے اسلام کے مندرجہ ذیل اصول وضوابط کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

(الف) حکومت کی طرف سے کسی سپاہی کو لونڈی کے متعلق حقوق ملکیت مل جانا ایسا ہی ہے، جیسا کہ کوئی باپ اپنی بیٹی کا عقد کسی دوسرے سے کر دیتا ہے۔ جس طرح باپ نکاح کے بعد اپنی بیٹی واپس لینے کا مجاز نہیں ہوتا، اس طرح حکومت کو بھی ملکیت دینے کے بعد وہ لونڈی واپس لینے کا اختیار نہیں ہے۔ اس بنا پر مسلمان سپاہی اس عورت کے ساتھ صنفی تعلقات قائم کرنے کا مجاز ہے جو حکومت کی طرف سے اسے ملی ہے۔

(ب) جو عورت جس سپاہی کے حصہ میں آئے صرف وہی اس سے صنفی تعلقات قائم کر سکتا ہے، کسی دوسرے شخص کو اسے ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہے۔ ہاں، اگر حقیقی مالک کسی کے ساتھ نکاح کر دے تو ایسی صورت میں دوسرے کو حق تمتع حاصل ہو جاتا ہے لیکن اس صورت میں مالک اس لونڈی سے دیگر خدمات تو لے سکتا ہے لیکن اسے تمتع کی اجازت نہیں ہوگی۔

(ج) جس شخص کو کسی لونڈی کے متعلق حق ملکیت ملا ہے وہ اس وقت صنفی تعلقات قائم کر سکے گا۔ جب اسے یقین ہو جائے کہ وہ حاملہ نہیں ہے اس کا ضابطہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایام ماہواری کا انتظار کیا جائے، حمل کی صورت میں وضع حمل تک انتظار کرنا ہوگا۔

(نوٹ) گھریلو خادمائیں اور کاروباری نوکر چاکر، غلام اور لونڈی کے حکم سے خارج ہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال ہم نے بہت سے بزرگ علما سے سنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ چلتے وقت اپنے ہاتھ میں عصا یا کھونٹی وغیرہ رکھتے تھے اس کے متعلق قرآن وحدیث میں کیا ہدایات ہیں؟

جواب اس ''خود ساختہ سنت'' کی وجہ سے بندہ خود بھی اپنے گھر میں والد محترم حفظہ اللہ کے زیر عتاب رہتا ہے۔ وہ ہمیں اس پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے آئے دن ملامت کرتے رہتے ہیں۔ لیکن تلاش بسیار کے باوجود مجھے تادم تحریر اس کا کہیں سراغ نہیں مل سکا، تاہم مزید تلاش جاری ہے۔ رسول اللہ ﷺ خطبہ جمعہ یا خطبہ عیدین کے موقع پر اپنے ہاتھ میں لاٹھی یا کمان رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت حکم بن حزن رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی اقتدا میں ایک دفعہ جمعہ ادا کیا تو میں نے دیکھا کہ آپ

کے ہاتھ میں دوران خطبہ ایک لاٹھی یا قوس تھی جس کے سہارے آپ کھڑے تھے۔ [ابوداود، الصلوٰۃ، ۱۰۹۶]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوران خطبہ سہارا لینے کے لئے ہاتھ میں لاٹھی وغیرہ رکھنا سنت ضرور ہے لیکن چلتے وقت اسے ہمیشہ کے لئے سنت قرار دینا محل نظر ہے۔ اس کے علاوہ حبشہ کے فرمانروا حضرت نجاشی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک چھوٹا سا نیزہ بطور تحفہ بھیجا تھا وہ بھی کبھی کبھار کسی ضرورت کے لئے استعمال کر لیا جاتا تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضائے حاجت کے لئے باہر تشریف لے جاتے تو میں اور ایک دوسرا بچہ پانی کا مشکیزہ اور چھوٹا نیزہ اٹھا کر ساتھ لے جاتے۔

[صحیح بخاری، الوضو، ۱۵۲]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس چھوٹے نیزے کو زمین نرم کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا، بطور نشانی گاڑ دیا جاتا تاکہ گزرنے والوں کو پتہ چل جائے کہ ادھر کوئی آدمی بیٹھا ہے۔ [فتح الباری، ص: ۳۳۱، ج ۱]

اسے بعض اوقات بطور سترہ بھی آپ کے آگے گاڑ دیا جاتا تھا، چنانچہ حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوپہر کے وقت ہمارے ہاں تشریف لائے تو آپ نے وضو کیا اور ہمیں ظہر اور عصر کی نماز پڑھائی اور آپ کے آگے بطور سترہ نیزہ گاڑ دیا گیا۔ [صحیح بخاری، الصلوٰۃ، ۴۹۹]

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے پوچھا: ''اے موسیٰ! تمہارے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی میری لاٹھی ہے۔ میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اپنی بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں، علاوہ ازیں میرے لئے اس میں اور بھی کئی فوائد ہیں۔'' [۲۰/طہ: ۱۷، ۱۸]

مذکورہ فوائد کے علاوہ دیگر فوائد کے ذریعے بھیڑوں کو ہانکنا، ریوڑ کی حفاظت کرنا، درندوں کے حملے سے بچانا اور ان کا تعاقب کرنا ہوسکتا ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ ''سنت موسوی'' کہا جاسکتا ہے۔ لیکن ہمیشہ چلتے وقت اپنے ہاتھ میں لاٹھی رکھنے اور اسے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم قرار دینے کے متعلق ہمیں شرح صدر نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال نوری علم یا کالا علم، اسی طرح نوری جادو یا کالا جادو کرنے اور کروانے کے متعلق کیا حکم ہے؟ اسلام میں جادو کرنے یا کروانے کی کیا سزا ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب عام طور پر جادو کو کالا علم اور اس کے مقابلہ میں قرآنی عملیات کے ذریعے علاج کرنے کو نوری علم کہا جاتا ہے۔ کوئی جادو نوری نہیں ہوتا۔ قرآنی سورتوں کو پڑھ کر اگر دم کیا جائے تو جائز ہے۔ لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ قرآنی عملیات کے ذریعے علاج کرنے والے حضرات بھی ان سورتوں میں بعض کلمات کا اضافہ کرتے ہیں، ایسا کرنا بھی جادو ہی ہے۔ کیونکہ قرآنی الفاظ کی ترتیب بدلنا یا ان میں کلمات کے اضافہ سے شیاطین کا قرب مقصود ہوتا ہے، تاکہ ان کے ذریعے مریض سے متعلقہ معلومات حاصل کی جائیں پھر اس پر اپنی فنکاری کا سکہ جمایا جائے۔ اس قسم کے معالجین سے اجتناب کرنا چاہیے۔ شریعت میں جادو کرنے کو بڑے ہلاکت خیز گناہوں میں شمار کیا گیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''کہ سات تباہ کن گناہوں سے دور رہو۔'' صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ کون سے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''اللہ کے ساتھ شریک کرنا......اور جادو کرنا......''

[صحیح بخاری، الطب، ۵۷٦۴]

جس طرح جادو کرنا بہت سنگین جرم ہے، اسی طرح جادوگروں کی باتوں پر یقین کرنا بھی انتہائی خطرناک گناہ ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''تین قسم کے لوگ جنت میں نہیں جائیں گے شراب پینے والا، قریبی رشتہ داروں سے قطع تعلقی کرنے والا اور جادوگر کی باتوں پر یقین کرنے والا۔'' [مسند امام احمد، ص ۳۹۹، ج ۴]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا موقف تھا کہ جادوگر کو قتل کر دیا جائے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی شہادت سے ایک سال قبل سرکاری فرمان جاری کیا تھا جس کے الفاظ یہ ہیں۔ راوی کہتا ہے۔ ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک سال وفات سے قبل ان کا خط ہمیں موصول ہوا۔ انہوں نے فرمایا، ہر جادوگر مرد اور عورت کو قتل کر دو، چنانچہ ہم نے تین جادوگر عورتوں کو قتل کیا۔ [مسند امام احمد، ص: ۱۹۰، ج ۱]

لیکن ہمارے ہاں اسلامی قانون نہیں ہے کہ جادوگر کو قتل کر دیا جائے، اس لئے اس طرح کے ''کاٹ کے ماہر، کایا پلٹ'' عاملوں کو تحفظ حاصل ہے، جادوگر کو قتل کرنا حکومت کا کام ہے۔ ہمیں قانون کو ہاتھ میں لے کر یہ اقدام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

سوال گھوڑے کی حلت و حرمت کے متعلق قرآن و حدیث کا کیا فیصلہ ہے؟ دلائل سے بیان کریں۔

جواب واضح رہے کہ گھوڑا حلال ہے اور متعدد روایات میں اس کی حلت منقول ہے، حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں گھوڑا ذبح کیا اور اس کا گوشت کھایا۔ [صحیح بخاری، الذبائح، ۵۵۱۹]

ایک روایت میں ہے کہ ہم نے اور رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت نے اس کا گوشت کھایا۔ [دار قطنی، ص: ۲۹۰، ج ۴]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خیبر کے دن گدھوں کے گوشت سے منع فرمایا اور گھوڑے کے گوشت کو کھانے کی اجازت دی۔ [صحیح بخاری، الذبائح، ۵۵۲۰]

بعض روایات میں ہے کہ ہم نے خیبر کے دن گھوڑے کا گوشت کھایا۔ [صحیح مسلم، الصید، ۵۰۲۲]

ائمہ کرام میں سے صرف امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے اس کی حرمت منقول ہے، البتہ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما نے اپنے استاد سے اختلاف کرتے ہوئے اس کی حلت کا فتویٰ دیا ہے۔ [کنز الدقائق، ص: ۲۲۹ مترجم، فارسی]

محدث ثناء اللہ پانی پتی حنفی لکھتے ہیں کہ گھوڑا حلال ہے۔ [مالا بدمنہ، ص: ۱۱۰]

مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں کہ گھوڑوں کا کھانا جائز ہے بہتر نہیں ہے۔ [بہشتی زیور، ج ۵، ص: ۵٦]

کتب فقہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی وفات سے تین دن پہلے گھوڑے کی حرمت سے رجوع کر لیا تھا۔ (در مختار) مختصر یہ ہے کہ گھوڑا حلال ہے، اگر طبیعت نہ چاہے تو اس کا کھانا ضروری نہیں، لیکن حلال کہنے والوں پر طعن و تشنیع درست نہیں ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے صاف اعلان کیا ہے کہ ہم گھوڑے کے گوشت کے متعلق کوئی حرج محسوس نہیں کرتے۔

[کتاب الآثار، ص: ۱۸۰]

اس بنا پر احناف کو اس مسئلہ کے متعلق سختی نہیں کرنی چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال الیکشن کی شرعی حیثیت کیا ہے، جماعتی اختلافات ختم کرنے کے لئے الیکشن یا انتخاب کا شرعی طریقہ کیا ہے، کیا الیکشن

کمیشن میں سے بعض حضرات کابینہ کے ارکان منتخب ہو سکتے ہیں؟ قرآن وحدیث کے مطابق جواب دیں۔

جواب واضح رہے کہ موجود الیکشن جمہوریت کی پیداوار ہیں ہاں، اگر سنجیدہ فکر اور دردِ دل رکھنے والے حضرات باہمی سر جوڑ کر بیٹھیں اور ہچکولے کھانے والی ناؤ کو ساحل سمندر سے ہم کنار کرنے کے لئے کوئی لائحہ عمل تیار کریں تو اسلام میں اس کی گنجائش موجود ہے کیونکہ اس میں سربراہ مملکت کے انتخاب کے لئے کوئی لگا بندھا قاعدہ مقرر نہیں ہے، بلکہ حالات وظروف کے پیش نظر اس میں توسیع کو برقرار رکھا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں نہ تو امیدوار کی اہلیت کو دیکھا جاتا ہے اور ووٹر حضرات کے صاحب شعور ہونے کا خیال رکھا جاتا ہے۔ بلکہ دولت کے بل بوتے، دھونس دھاندلی کے ذریعے جو چاہتا ہے عوام کا نمایندہ بن کر سامنے آ دھمکتا ہے، اس سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں، یعنی گلی کوچوں کا کوڑا کرکٹ اسمبلی میں پہنچ جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک اگر الیکشن کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ ہو تو امیدوار کم از کم ایسا ہونا چاہیے جو فرائض کا پابند ہو، کبائر سے گریزاں اور جس کا ماضی داغ دار نہ ہو، اسی طرح ووٹر کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ صاحب شعور اور کھرے کھوٹے کی تمیز کر سکتا ہو۔ کسی کو نمایندہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے متعلق اس قدر لیاقت، معاملات کو سلجھانے اور اختلافات کو نمٹانے کی صلاحیت رکھنے کی گواہی دینا ہے۔ اس لئے گواہی دینے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اچھے برے کے درمیان تمیز کر سکتا ہو اور امیدوار کے کردار کو اچھی طرح جانتا ہو اگر ان باتوں کا خیال نہ رکھا گیا تو فرمان رسول اللہ ﷺ کے مطابق کہ ''جب معاملات کی بھاگ دوڑ نالائقوں کے سپرد کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرنا۔''

صورت مسئولہ میں اختلافات کو نمٹانے کے لئے ضروری ہے کہ صاحب بصیرت اور گہری سوچ وبچار رکھنے والے حضرات اکٹھے ہو کر کسی ایک جہاں دیدہ کو اپنا امیر منتخب کر لیں اور وہ امیر اپنی صوابدید کے مطابق کمیٹی تشکیل دے اور پھر اس مجلس شوریٰ کے مشورہ سے جماعتی امور کو چلایا جائے، اگر کمیشن نے اپنے میں سے ہی کسی کو منتخب کرنا ہے اور یہ بات پہلے سے طے شدہ ہے تو کمیشن میں سے کسی کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چھ رکنی کمیٹی تشکیل دی تھی کہ ان میں کسی کو باہمی مشورہ سے منتخب کر لیا جائے۔ اگر پہلے سے طے شدہ نہیں ہے تو پھر کمیشن کے علاوہ کسی اور ساتھی کو اس ذمہ داری کا اہل قرار دیا جائے۔ بہر حال دور حاضر میں یہ مسئلہ بڑی نازک صورت حال سے دوچار ہے، اس لئے نہایت بصیرت کے ساتھ اس سے نمٹنا ہو گا۔ [واللہ اعلم]

سوال حدیث میں ہے کہ ربع دینار کی مالیت پر چوری کرنے سے ہاتھ کاٹا جائے گا، موجودہ حساب سے ربع دینار کتنی مالیت کا ہے؟

جواب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''چور کا ہاتھ صرف ربع دینار یا اس سے زیادہ مالیت چوری کرنے پر کاٹا جائے۔'' ایک روایت میں ہے کہ اس وقت ربع دینار تین درہم کے برابر تھا۔ [مسند امام احمد، ص:۸۰، ج۶]

سونے کے حساب سے متعلق روایات سے پتہ چلتا ہے کہ دینار، مثقال کے برابر ہوتا ہے، موجودہ نظام کے مطابق ایک مثقال ساڑھے چار ماشہ کے مساوی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ دینار کا وزن بھی ساڑھے چار ماشہ ہے۔ اس حساب سے ربع ۱۲۵.۱ ماشہ ہو گا۔ اعشاری نظام کے مطابق 3 تولہ کے 35 گرام ہوتے ہیں جبکہ 3 تولہ 36 ماشہ کے مساوی ہے۔ اس اعتبار سے گرام اور ماشہ

میں معمولی سا فرق ہے۔ ہمارے رجحان کے مطابق ایک گرام سونا، اس کی مالیت کے برابر چوری کرنے پر ہاتھ کاٹا جائے گا۔ جب ہاتھ نے جرم کیا ہے تو اللہ کے ہاں اس کی یہ قدر و قیمت ہے کہ معمولی سی چوری کرنے پر اسے کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جب ہاتھ بے گناہ اور معصوم ہو گا تو اس کی قیمت اللہ کے ہاں یہ ہے کہ ایک انگشت کی دیت دس اونٹ ہیں، یعنی اگر کسی نے ایک انگلی ضائع کر دی ہے تو اسے دس اونٹ بطور دیت دینا ہوں گے۔ [ترمذی، الدیات: ۱۳۹۱]

سوال ہمارے ہاں عام طور پر بچوں کا نام رکھتے وقت اللہ تعالیٰ کے نام سے پہلے عبد یا محمد کا لفظ لگا لیتے ہیں، جیسے عبدالوارث اور محمد وارث وغیرہ، شہنشاہ فارسی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر بچے کا نام محمد شہنشاہ رکھ لیا جائے تو درست ہے یا نہیں؟ کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب واضح رہے کہ نام کا شخصیت کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بعض ناپسندیدہ ناموں کو تبدیل فرمایا، چنانچہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے متعلق حدیث میں ہے کہ ان کا نام ''برہ'' تھا جسے آپ نے تبدیل کر کے زینب رکھا کیونکہ اس میں خود نمائی اور تقدس کا اظہار ہوتا ہے۔ [صحیح بخاری، الادب: ۶۱۹۲]

جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے کہنے پر نام تبدیل نہ کیا عمر بھر کف افسوس ملتے رہے۔ [صحیح بخاری، ۶۱۹۳]

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''اللہ کے ہاں پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں کیونکہ ان میں اللہ کے لئے بندہ کی طرف سے عاجزی، درماندگی اور عبودیت کا اظہار ہے، نیز حضرات انبیا علیہم السلام کے نام بھی اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں، خود آپ نے اپنے بیٹے کا نام ابراہیم رکھا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں دو الگ الگ عنوان قائم کئے ہیں۔ [کتاب الادب، باب نمبر ۱۰۵-۱۰۹]

ان احادیث کے پیش نظر والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کا نام ایسا رکھیں جس میں عبودیت اور بندگی کا اظہار ہو یا حضرات انبیا علیہم السلام کے نام پر ان کے نام رکھے جائیں یا معنوی لحاظ سے خوبصورت ہوں۔

واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعض نام ایسے ہیں جو ذات باری تعالیٰ کے لئے خاص ہیں، مثلاً: الصمد اور الرحمٰن وغیرہ ان سے پہلے محمد یا احمد لگانا صحیح نہیں ہے، البتہ ایسے صفاتی نام جو بندے کے لئے ہیں اور ان سے پہلے محمد یا بعد میں احمد بطور تبرک ہو گا، اگرچہ معنوی اعتبار سے ایسا کرنا صحیح نہیں ہے۔

صورت مسئولہ میں محمد شہنشاہ نام درست نہیں ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بدترین انسان وہ ہے جو اپنا نام ''ملک الاملاک'' رکھتا ہے۔ [صحیح بخاری، الادب: ۶۲۰۵]

حدیث کے راوی حضرت سفیان نے کہا ہے کہ ''ملک الاملاک'' یہ خاص اللہ کی صفت ہے، بندہ اس سے پہلے غلام یا عبد لگائے تو صحیح ہو سکتا ہے، اس لئے محمد شہنشاہ نام درست نہیں ہے اگر کسی نے یہ نام رکھا ہے تو اسے تبدیل کر کے اس کی جگہ کوئی اور بہترین نام رکھ لینا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال میرے گھر میں ٹی، وی نہیں ہے اور نہ ہی میں اسے پسند کرتا ہوں، میرے بچے پڑوس میں جا کر ٹی وی دیکھ آتے ہیں جس سے بچوں کے اخلاق و عادات میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے بچوں کو سزا اس لئے نہیں دیتا کہ اس سے بھی اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے کیا

ایسے حالات میں مجھے ٹی وی رکھنے کی اجازت ہے؟

جواب ٹیلی ویژن دور حاضر کا ایک ایسا فتنہ ہے کہ اس کے متعلق نرم گوشہ رکھنے والوں کا ضمیر بھی چیخ اٹھا ہے کہ اس کے دیکھنے سے بچوں کے اخلاق و عادات میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے، جیسا کہ سوال میں اس کی وضاحت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جو لوگ ایمانداروں میں فحاشی پھیلانا چاہتے ہیں وہ دنیا اور آخرت میں سزا کے حق دار ہیں''۔ [۹/التوبۃ:۱۹]

اس آیت کریمہ کی زد میں وہ تمام ذرائع و وسائل آ جاتے ہیں جو فحاشی پھیلانے، بے حیائی عام کرنے، بداخلاقی کی تعلیم دینے، بے راہ روی پر اکسانے صنفی جذبات بھڑکانے، جنسی خواہشات ابھارنے اور رقص و سرود کا سامان مہیا کرنے میں پیش پیش ہیں۔ ٹیلی ویژن، اگرچہ دنیاوی لحاظ سے بے شمار فوائد و منافع کا حامل ہے لیکن دینی اور اخلاقی اعتبار سے انتہائی نقصان دہ اور ضرر رساں واقع ہوا ہے۔ بالخصوص نئی پود میں آوارگی اور نوجوانوں میں حیا باختگی پیدا کرنے میں اس نے بہت نمایاں کردار ادا کیا ہے، ہمارے نزدیک ٹیلی ویژن کے دنیاوی فوائد کے پیش نظر اس کے گھر میں رکھنے کے جواز مہیا کرنا ایک چور دروازہ کھولنا ہے۔ جس کے ذریعے شیطان اور اس کی ذریت کو اپنے گھر کا موقع فراہم کرنا ہے۔ اس کے مفاسد کے پیش نظر مکمل طور پر اس سے اجتناب کرنا چاہیے اور بچوں کو سختی سے منع کرنا چاہیے، اس لئے اگر بچوں کو تھوڑی بہت سزا دی جائے تو اس سے بچوں کے اخلاق متاثر نہیں ہوں گے، جیسا کہ سائل نے اس خدشے کا اظہار کیا ہے۔ اسلامی غیرت اور دینی حمیت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ٹیلی ویژن کے متعلق اپنے اندر کوئی نرم گوشہ نہ رکھا جائے، اس کے نقصانات کی مختصر جھلک یہ ہے کہ ٹیلی ویژن ایسے حیا سوز ڈرامے اور فحش مناظر پیش کرتا ہے کہ انہیں دیکھ کر باحیا انسان کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ چوری، ڈکیتی، مار دھاڑ کی عملی تربیت دی جاتی ہے جس سے امن عامہ تباہ و برباد ہو رہا ہے، نیز اخلاق و کردار کو بگاڑنے میں بڑا موثر کردار سرانجام دے رہا ہے۔ اس کے علاوہ تصویر کو اس میں نمایاں حیثیت دی جاتی ہے جو فتنہ و فساد کی اصل بنیاد ہے۔ جسے شریعت نے حرام قرار دیا ہے، ان کے علاوہ اور بھی بے شمار نقصانات ہیں جن کے پیش نظر اس سے کلی اجتناب کرنا ہی مناسب ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال مجلہ اہلحدیث میں شائع ہونے والے احکام و مسائل سے عوام کے ساتھ ساتھ اہل علم بھی برابر مستفید ہو رہے ہیں کیونکہ آپ کے فتاوی میں اعتدال پسندی اور قوت استدلال ہوتی ہے، مثلاً: عقیقہ کے جانور کے متعلق بہت سے علما تک مغالطہ کا شکار ہیں، اس سلسلہ میں وہ دودانتہ کی شرط لگاتے ہیں، پھر کچھ حضرات گائے، بیل میں سات عقیقوں کی بات بھی کرتے ہیں۔ بحمداللہ آپ نے بہت سے شکوک و شبہات کو دور کر دیا ہے، آپ کے ایک فتویٰ میں لونڈی کے متعلق مفصل معلومات تھیں۔ ایک بات اب بھی تشنہ ہے کہ اگر لونڈی غیر مسلم ہے تو تمتع کی صورت میں اگر اس سے اولاد پیدا ہو تو وہ ام ولد کہلائے گی جبکہ وہ تا حال غیر مسلم ہے؟

جواب احکام و مسائل کے کالم میں پیش کردہ فتاوی کے اسلوب و انداز کے متعلق قارئین کرام کی طرف سے اس قسم کے حوصلہ افزا جذبات پر مشتمل متعدد خطوط اور فون موصول ہوتے رہتے ہیں، راقم ان تمام حضرات کا تہہ دل سے شکر گزار ہے جو اپنی مخلصانہ دعاؤں میں اس عاجز و ناتواں کو یاد رکھتے ہیں۔ دراصل اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے یہ محض میرے اللہ کا فضل اور اس کا انتہائی کرم ہے کہ اس نے مجھے یہ فریضہ سرانجام دینے کی توفیق دے رکھی ہے۔ بصورت دیگر ''من آنم کہ من دانم''

علما حضرات سے دردمندانہ اپیل ہے کہ وہ بندہ کی اس سلسلہ میں ضرور راہنمائی کرتے رہا کریں۔

احب الصالحین ولست منهم　　　　لعل الله یرزقنی صلاحا

تحدیث نعمت کے طور پر عرض ہے کہ محترم پروفیسر محمد حسین آزاد صاحب سے ہمارا دیرینہ علمی رشتہ ہے، کیونکہ وہ ہمارے ایک حدیث نبوی کے متعلق عظیم منصوبے کے روح رواں ہیں۔ انہوں نے حدیث کی ایک عظیم کتاب ''مستدرک حاکم'' کا اردو میں ترجمہ شروع کر رکھا ہے۔ اور اس کی آخری جلد کتاب الملاحم والفتن تک ترجمہ مکمل کرلیا ہے۔ فجزاه الله خير الجزاء قارئین کرام سے استدعا ہے کہ وہ ہمارے اس خواب کے متعلق شرمندۂ تعبیر ہونے کی دعا کرتے رہیں۔

جہاں تک آخر میں ذکر کردہ سوال کا تعلق ہے کہ اگر لونڈی غیر مسلم ہے تو تمتع کی صورت میں اس سے اولاد پیدا ہو تو وہ ام ولد کہلائے گی یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ کفار سے جنگ کی صورت میں وہی مرد و زن، غلام لونڈیاں بنتے ہیں جو اسلام قبول کرنے سے پہلے پہلے گرفتار ہو جائیں۔ اگر گرفتار ہونے سے قبل مسلمان ہو جائیں تو انہیں لونڈی یا غلام بنانا شرعاً ناجائز ہے، یہی وجہ ہے کہ لونڈی سے تمتع کرنے کے متعلق کسی بھی اہل علم نے اس کے مسلمان ہونے کی شرط نہیں لگائی۔ اس پر تمام فقہا کا اتفاق ہے، ایسے حالات میں اگر اس سے اولاد پیدا ہو جائے تو وہ ام ولد کہلائے گی خواہ وہ مسلمان ہو جائے یا غیر مسلم رہے، ایسی ام ولد آقا کے فوت ہونے کے بعد خود بخود آزاد ہو جائے گی۔ ام ولد کے متعلق مسلمان ہونے کی شرط بھی کسی اہل علم سے منقول نہیں ہے، راقم نے اس سلسلہ میں متعدد اہل علم سے مشاورت کی، کسی نے بھی ام ولد سے متعلق مسلمان ہونے کی شرط سے اتفاق نہیں کیا، ویسے بھی آج مسلم ممالک میں لونڈی سسٹم تقریباً ختم ہے اور اسلام نے بھی غلام کو ختم کرنے کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال طاغوت کسے کہتے ہیں موجودہ دور میں طاغوت کی کیا صورتیں ہیں اور اس سے کیونکر محفوظ رہا جاسکتا ہے؟

جواب لغت کے اعتبار سے طاغوت ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اپنی جائز حدود سے تجاوز کر جائے، قرآن کریم کی اصطلاح میں طاغوت سے مراد وہ بندہ ہے جو بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خود آقائی کا دم بھرے اور اللہ کے بندوں سے اپنی بندگی کرائے۔

اللہ کے مقابلہ میں بندے کی سرکشی کے تین مراتب حسب ذیل ہیں:

☆ بندہ اصولاً اس کی اطاعت کو ہی حق خیال کرے مگر عملاً اس کے احکام کی خلاف ورزی کرے، اس کا نام قرآنی اصطلاح میں فسق ہے۔

☆ بندہ اس کی فرمانبرداری سے اصولاً منحرف ہو کر یا تو خود مختار بن جائے یا اس کے علاوہ کسی دوسرے کی بندگی کرنے لگے یہ کفر ہے۔

☆ وہ اپنے مالک سے باغی ہو کر اس کے ملک میں اس کی رعیت میں خود اپنا حکم چلانے لگے، اس آخری مرتبے پر جو بندہ پہنچ جائے اس کا نام طاغوت ہے۔

کوئی شخص صحیح معنوں میں اللہ کا حقیقی بندہ نہیں ہوسکتا جب تک وہ اس طاغوت کا منکر نہ ہو اور اللہ کی بندگی سے منہ موڑ کر انسان صرف ایک طاغوت کے چنگل میں ہی نہیں پھنستا بلکہ بہت سے طواغیت اس پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ ایک طاغوت، شیطان

ہے جو اس کے سامنے نت نئی جھوٹی ترغیبات کا سدا بہار سرسبز باغ پیش کرتا ہے۔ دوسرا طاغوت آدمی کا اپنا نفس ہے جو اسے خواہشات کا غلام بنا کر زندگی کے ٹیڑھے راستوں پر دھکیل دیتا ہے۔ ان کے علاوہ بے شمار آقا طاغوت کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں اور اس سے اپنی اغراض کی بندگی کراتے ہیں۔ پھر بے شمار آقاؤں کا یہ غلام ساری عمر اس چکر میں پھنسا رہتا ہے کہ کس آقا کو خوش کرے اور کس کی ناراضی سے محفوظ رہے۔ مختصر یہ ہے کہ طاغوت ہر وہ باطل قوت ہے جو اللہ کے مقابلہ میں اپنی عبادت یا اطاعت کرائے یا لوگ از خود اللہ کے مقابلہ میں اس کی عبادت یا اطاعت کرنے لگیں، خواہ وہ مخصوص شخص ہو یا ادارہ، گویا طاغوت سے مراد دنیادار چودھری اور حکمران بھی ہو سکتے ہیں۔ بت شیطان اور جن بھی ہو سکتے ہیں اور ایسے پیر فقیر بھی ہو سکتے ہیں جو اللہ کے مقابلہ میں اپنی اطاعت کروانا پسند کرتے ہیں اور شریعت پر طریقت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس طرح ہر انسان کا اپنا نفس بھی طاغوت ہو سکتا ہے جبکہ وہ اللہ کی اطاعت و عبادت سے انحراف کر رہا ہو۔ ان سے محفوظ رہنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ ان سب کا انکار کر دیا جائے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اب جو شخص طاغوت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لائے تو اس نے ایسے مضبوط حلقہ کو تھام لیا جو ٹوٹ نہیں سکتا۔'' [۲/البقرہ:۲۵۶]

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: ''جو لوگ طاغوت کی عبادت کرنے سے بچتے ہیں اور اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں ان کے لئے بشارت ہے، لہٰذا آپ میرے بندوں کو کہہ دیجئے جو بات کو توجہ سے سنتے ہیں، پھر اس سے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت بخشی اور یہ عقل مند ہیں۔'' [(۳۹/الزمر:۱۸) واللہ اعلم بالصواب]

سوال ہمارے ہاں مواصلات کی ایک کمپنی ٹیلی نار کے لئے ٹاور کی جگہ مخصوص کی گئی جبکہ بعض مذہبی جماعتوں کی طرف سے اعتراض اٹھایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق گستاخانہ خاکے شائع کرنے میں ڈنمارک کا ملک پیش پیش تھا۔ جن سے بائیکاٹ کا فیصلہ ہوا تھا، لہٰذا اس ملک کی کمپنی کو ٹاور لگانے کی اجازت دینا اس کے معاشی بائیکاٹ کے خلاف ہے، جس کا فیصلہ کیا گیا تھا شرعی اعتبار سے اس مسئلہ کی وضاحت کریں تاکہ ہم اس کمپنی سے تعاون کرنے یا نہ کرنے کے متعلق کوئی فیصلہ کر سکیں؟

جواب سورۂ ممتحنہ میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے متعلق دو اقسام کی نشاندہی کی ہے۔ وہ کافر جو اسلام اور اہل اسلام کو نیچا دکھانے میں کوشاں ہیں اور ان سے برسر پیکار ہیں، وہ کافر جو اپنے کفر پر تو ہیں لیکن اسلام اور اہل اسلام کے خلاف سازشوں میں شریک نہیں ہیں۔ کفار سے تعلقات کی بھی حسب ذیل تین اقسام ہیں:

① موالات: دوستی اور قلبی تعلقات رکھنا، یہ تو کسی کافر کے ساتھ کسی حال میں درست نہیں ہے۔ قرآن کریم نے اس سے سختی سے روکا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''تم اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ۔'' (۳/آل عمران:۲۸)

② مدارات: ظاہری طور پر خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے پیش آنا، رفع ضرر اور مصلحت دین کے پیش نظر کفار کے ساتھ اس قسم کا تعلق رکھا جا سکتا ہے۔ ذاتی مفاد یا دینوی مصلحت کے لئے ایسا کرنا درست نہیں ہے۔

③ مواسات: ضرورت مند پر احسان اور اس کی نفع رسائی کا اقدام یہ صرف ایسے کفار کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جو اہل حرب نہ ہوں، یعنی اہل اسلام سے برسر پیکار نہ ہوں۔ اگر کفار اہل اسلام کی مخالفت کرتے ہوئے میدان میں اتر آئیں اور اہل اسلام کو تکلیف

دینے کے لئے منصوبہ سازی میں سرگرم عمل ہوں تو ایسے کفار کے ساتھ مواسات درست نہیں۔ سورۂ ممتحنہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کافر دشمن اور کافر غیر دشمن ہو ایک ہی درجہ میں رکھنا درست نہیں ہے بلکہ ان میں فرق کرنا چاہیے۔ خیر پسند لوگوں کے ساتھ خیر خواہانہ تعلقات کو جائز قرار دیا گیا ہے، خواہ وہ کسی مذہب یا دین سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس تمہیدی گزارش کے بعد ہم پیش کردہ سوال کا جواب دیتے ہیں جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے توہین آمیز خاکے شائع کئے ہیں ان سے بائیکاٹ کرنا ہمارا ایمانی تقاضا ہے۔ اسلامی حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنا کردار ادا کریں، اس سلسلہ میں سعودی عرب کی مثال پیش کی جا سکتی ہے، واقعی اس نے مصنوعات کا بائیکاٹ کر کے ایمانی غیرت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق ٹیلی نار جو ڈنمارک کی ایک مواصلاتی کمپنی ہے اس نے پاکستان میں سرمایہ کاری کرنے کا معاہدہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں اس نے پاکستان سے اجازت حاصل کرنے کے لئے تقریباً بیس بائیس ارب روپیہ حکومت پاکستان کو ادا کیا ہے اور پاکستان نے باضابطہ طور پر اسے کام کرنے کی اجازت دی ہے، جن لوگوں نے خاکے شائع کرنے کی مجرمانہ حرکت کی ہے ان کا اس کمپنی سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اس کمپنی نے اخبارات میں ان لوگوں سے اظہار بیزاری کا اعلان کیا ہے اور پاکستان میں کئی ایک اہل پاکستان کا اس سے روزگار وابستہ ہے، ایسے حالات میں اس کمپنی سے معاشی بائیکاٹ صحیح نہیں ہے اور ٹاور لگانے میں جو معاہدہ ہوا ہے۔ اس میں رکاوٹیں کھڑی کرنا بھی درست نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال شادی کارڈ پر بسم اللہ لکھنا جائز ہے یا نہیں، کیونکہ اسے بعد میں ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جاتا ہے؟

جواب شادی کارڈ اگر صرف اطلاع کے لئے ہے تو اسے شائع کرنا اور اس پر بسم اللہ لکھنا جائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مملوک وسلاطین کو جو خطوط لکھے تھے، ان کا آغاز بسم اللہ سے ہوتا تھا، لیکن یہ کسی طور پر جائز نہیں کہ جسے کارڈ دیا جائے جس پر بسم اللہ یا قرآنی آیات یا حدیث لکھی ہوں وہ اسے کوڑے کی ٹوکری میں پھینک دے۔ اسی طرح وہ اخبارات وجرائد کہ جن پر اللہ کا نام درج ہوا نہیں بے حرمتی سے پھینکنا یا انہیں بطور دستر خوان استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ ایسے اوراق کو ردی کے طور پر دکانداروں کو فروخت کرنا اور ان کو اشیاء صرف کو لپیٹنے کے لئے استعمال کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی بے حرمتی کرتا ہے تو اس کا گناہ لکھنے والے پر نہیں بلکہ گناہ کا حق دار وہ ہوگا جو ان کی بے حرمتی کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایسے کاغذوں کو جلا دیا جائے یا انہیں حفاظت سے رکھا جائے۔ واضح رہے کہ شادی کارڈ صرف اطلاع کے طور پر ہوتے ہیں لیکن ان پر ہزاروں روپیہ خرچ کیا جاتا ہے ایسا کرنا اسراف ہے، جس کی شریعت نے اجازت نہیں دی، اس لئے انہیں اگر شائع کرنے کی ضرورت ہو تو اس کے لئے سادہ کاغذ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بہترین، رنگین، ڈیزائن اور خوبصورت طباعت سے مزین کرنا فضول خرچی ہے جس کے متعلق باز پرس ہو سکتی ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال موبائل فون کے متعلق دو مسئلے دریافت طلب ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اس کی سکرین پر لفظ اللہ، الحمد للہ، قرآنی آیات یا کلمہ طیبہ لکھا ہوتا ہے۔ یا پھر بیت اللہ یا مسجد نبوی یا کھلے قرآن پاک کی تصویر ہوتی ہے۔ اس کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ جبکہ موبائل لیٹرین وغیرہ میں بھی ہمارے ہمراہ ہوتا ہے۔ دوسرا اطلاعی گھنٹی کے بجائے حرمین کی اذان، تسبیحات اور قرآنی آیات ریکارڈ ہوتی ہیں۔ کسی کا فون آئے تو موبائل سے اذان، سبحان اللہ اور قرآنی آیات پڑھی جاتی ہیں۔ کیا گھنٹی کے بجائے اس طرح کی آواز ٹیپ

کرنا جائز ہے۔ براہ کرم اولین فرصت میں جواب دیں۔ کیونکہ ہمارا مذہبی اور دین دار طبقہ اس انداز کو بہت پسند کرتا ہے۔

جواب موبائل ایک آلہ ہے بذات خود اچھا یا برا نہیں بلکہ اس کے استعمال سے اس کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر اسے شریعت مقدسہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے استعمال کیا ہے تو ٹھیک بصورت دیگر اس کا غیر شرعی استعمال ہمارے لئے باز پرس کا باعث ہوگا، چنانچہ شعائر کا احترام انتہائی ضروری ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''اے ایمان والو! اللہ کے شعائر کی بے حرمتی نہ کرو۔'' [۵/المائدہ:۲]

بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''جو شعائر اللہ کی تعظیم کرتا ہے تو یہ بات دلوں کے تقویٰ سے متعلق ہے۔'' [۲۲/الحج:۳۲]

اس بنا پر موبائل کی سکرین پر لفظ اللہ، الحمد للہ، قرآنی آیات یا بیت اللہ کی تصویر شرعاً درست نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنے سے لفظ جلالہ، قرآنی آیات، بیت اللہ کی بے حرمتی کا اندیشہ ہے کیونکہ اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھا جاتا ہے، اس کے بجائے سکرین پر کوئی قدرتی منظر، درخت یا پھول وغیرہ کی تصویر مناسب ہے۔ اس طرح اللہ کا ذکر یا کلمات اذان یا تسبیحات وغیرہ کی اطلاعی گھنٹی کے طور پر استعمال کرنا بے ادبی ہے۔ کیونکہ اللہ کا ذکر بطور عبادت ہوتا ہے۔ اذان، نماز کی اطلاع کے لئے ہے، اسی طرح قرآن کی تلاوت بھی غیر مقصد کے لئے استعمال نہیں ہو سکتی۔ ہمارے اسلاف کے سامنے جب کسی حکم کا غلط استعمال ہوتا ہے تو وہ اس پر خاموش نہیں رہتے تھے بلکہ اس کی اصلاح فرماتے، مثلاً: حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ سوئے ہوئے تھے تو انہیں بیدار کرنے کے لئے ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' کہا گیا فرمایا ان کلمات کو اپنے مقام پر رہنے دو، لہٰذا موبائل فون میں اطلاعی گھنٹی کے طور پر مقدس کلمات سیٹ کرنا شرعاً درست معلوم نہیں ہوتا۔ اس کے بجائے السلام علیکم ریکارڈ کر لیا جائے یا سادہ گھنٹی استعمال کی جائے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے ڈیرے پر نامعلوم افراد نے فائرنگ کی، ہمیں جن لوگوں پر شبہ تھا، سراغ رسانی کے کتوں کے ذریعے ان پر الزام صحیح ثابت ہوا۔ جبکہ انہوں نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔ برادری کے کچھ آدمی ان کی صفائی دینے کے لئے تیار ہوئے۔ ہم نے ان سے دس آدمیوں کا انتخاب کیا اور دو لاکھ روپیہ بطور ضمانت رکھ لیا کہ اگر ان میں سے ایک آدمی بھی منحرف ہو تو زر ضمانت کو ضبط کر لیا جائے گا۔ اس معاملہ کی شرعی حیثیت کے متعلق وضاحت کریں تاکہ ہم کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں؟

جواب کسی مسلمان کو بلاوجہ مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا، اگر کسی پر شک و شبہ ہو تو اسے ثابت کرنے کے لئے شریعت نے دو چیزوں کا اعتبار کیا ہے۔ ایک یہ کہ ملزم خود اقرار جرم کرے، یا اس کے جرم کو ثابت کرنے کے لئے دو گواہ پیش کئے جائیں۔ اگر ملزم کی طرف سے اقرار جرم نہ ہو اور نہ ہی اس کے خلاف دو گواہ پیش کئے جا سکیں تو ملزم قسم اٹھا کر اپنے الزام سے بری ہو سکتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''مدعی پر دلیل پیش کرنا لازم ہے اور قسم وہ اٹھائے گا جس نے انکار کیا۔''

[بیہقی، ص:۲۵۲، ج۱۰]

حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں اور ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک جھگڑا لے کر گئے۔ آپ نے فرمایا: ''تجھے ثبوت جرم کے لئے دو گواہ پیش کرنا ہوں گے یا پھر مدعا علیہ سے قسم لی جائے گی۔'' [صحیح بخاری، الشہادات:۲۶۶۹]

صورت مسئولہ میں مدعیان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس بات پر گواہ پیش کریں کہ واقعی فلاں لوگوں نے فائرنگ کی ہے۔

آدمی کے سراغ رسانی کے کتوں کے ذریعے جرم ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں صرف گواہی کی تائید میں پیش کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ان کتوں کے سونگھنے کی قوت اگر چہ بہت تیز ہوتی ہے، تاہم بعض اوقات ان سے خطا ممکن ہے۔ ایسے واقعات بھی ہمارے سامنے ہیں کہ سراغ رسانی کے کتے تھک ہانپ کر ایک جگہ بیٹھ گئے۔ فوجی حضرات نے جہاں بیٹھے تھے انہیں کو جرم میں دھر لیا، لہٰذا کتوں وغیرہ سے جرم ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ عدالتیں اور پولیس انہیں تسلیم نہیں کرتے۔ اگر جرم ثابت نہ ہو تو ملزموں سے قسم لی جائے گی اگر چہ ان کی ثقاہت مجروح ہی کیوں نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں ایک شخص قتل ہوا، مقتول کے ورثا نے یہود پر الزام لگایا کیونکہ ان کے علاقہ میں مقتول پایا گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”تم اس پر گواہ پیش کرو کہ واقعی انہوں نے قتل کیا ہے یا پھر یہودیوں میں سے پچاس آدمی قسم اٹھا کر اس الزام سے بری ہو جائیں گے۔“ انہوں نے کہا کہ یہود کی قسم کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس مقتول کی دیت بیت المال سے ادا کر دی تا کہ مسلمان کا خون ضائع نہ ہو۔

[صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۷۰۲]

لیکن ملزمان کی بجائے دوسروں سے قسم لینا اس کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے آدمی ان سے قسم لے کر ان کی طرف سے صفائی دے سکتے ہیں لیکن ان کی جگہ پر وہ قسم اٹھائیں اس کا ثبوت محل نظر ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال اگر کوئی مقروض، قرض کی ادائیگی کے وقت قرض خواہ کو قرض سے زیادہ رقم ادا کرے جبکہ پہلے یہ اضافہ طے شدہ نہ ہو تو کیا ایسا کرنا بھی سود اور ناجائز ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب جس انسان نے کسی سے قرض لیا ہے اس کے ذمے صرف اتنی ہی رقم واپس کرنا ضروری ہے، خیر خواہی کے طور پر کسی کو قرض دینے کی بہت فضیلت ہے۔ حدیث میں اس فضیلت کی بایں الفاظ وضاحت ہے کہ ”کوئی بھی مسلمان جب کسی مسلمان کو دو مرتبہ قرض دیتا ہے تو اس کے ایک مرتبہ صدقہ کرنے کی طرح ہوتا ہے۔“ [ابن ماجہ، الاحکام: ۲۴۳۰]

اگر پہلے سے کوئی اضافہ یا فائدہ طے شدہ نہ ہو تو قرض کی رقم سے افضل یا زیادہ دینا جائز ہے۔ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جبکہ میرا آپ کے ذمے کچھ قرض تھا۔ آپ نے مجھے وہ قرض ادا کیا اور اس سے کچھ زیادہ بھی دیا۔ [صحیح بخاری، الاستقراض: ۲۳۹۴]

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ذمے کسی شخص کا اونٹ قرض تھا۔ جب وہ شخص اس کا تقاضا کرنے آیا تو آپ نے صحابہ کرام کو اس کی ادائیگی کے متعلق حکم دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس عمر کا اونٹ تلاش کیا لیکن نہ مل سکا، البتہ اس سے زیادہ عمر کا اونٹ مل گیا۔ آپ نے فرمایا: ”اسے یہی اونٹ دے دو۔“ اس پر اس شخص نے کہا آپ نے مجھے پورا پورا حق دیا ہے۔ [صحیح بخاری، حدیث: ۲۳۰۵]

بہر حال اگر قرض لیتے وقت کوئی شرط طے نہیں کی گئی تو ادائیگی کے وقت مقروض اپنے قرض سے بہتر یا زیادہ دے سکتا ہے۔ شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، البتہ شرح سود طے کر کے اضافہ کے ساتھ رقم واپس کرنا سخت منع ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے ہاں معاشرتی طور پر خواتین شادی سے پہلے خود کو اپنے والد کی طرف منسوب کرتی ہیں، مثلاً: ”رقیہ محمود“ یعنی

محمود کی بیٹی رقیہ، لیکن شادی کے بعد اس نسبت کو ترک کر کے اپنے خاوند کی طرف خود کو منسوب کرتی ہیں، مثلاً: ''رقیہ عامر'' یعنی عامر کی بیوی، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب دور جاہلیت میں لوگ لے پالک کو اپنی طرف منسوب کر لیتے تھے اور اسی نسبت سے اسے پکارا کرتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور ہمیں آگاہ کیا کہ ''ان (منہ بولے بیٹوں) کو ان کے باپوں کے نام سے ہی پکارا کرو، اللہ کے ہاں یہی انصاف کی بات ہے۔'' [۳۳/الاحزاب:۵]

اس آیت کا تقاضا ہے کہ انسان مرد ہو یا عورت اس کی نسبت حقیقی باپ کی طرف ہونی چاہیے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے کہ لوگوں کو ان کے باپوں کے نام سے پکارا جائے، پھر اس کے تحت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن ہر غدار کے لئے ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں بن فلاں کی غداری ہے۔'' [صحیح بخاری، الادب:۶۱۷۷]

شارح صحیح بخاری ابن بطال کہتے ہیں کہ باپ کے نام سے پکارنا ہی پہچان میں زیادہ واضح اور امتیاز میں زیادہ بلیغ ہے اور قرآن وحدیث کے دلائل بھی اس بات پر دلالت کرتے ہیں۔ [شرح بخاری، ص:۳۵۴، ج۹]

جب قیامت کے دن باپ کی نسبت ہی تعارف کا ذریعہ ہوگی تو دنیا میں یہ نسبت اختیار کرنے میں کیا قباحت ہے۔ کتب حدیث میں جہاں فلاں بن فلاں کے نام استعمال ہوتے ہیں، اسی طرح عورتوں کے لئے فلاں بنت فلاں کے الفاظ آئے، حالانکہ ان میں اکثر خواتین شادی شدہ تھیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا شادی سے پہلے بھی عائشہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما اور شادی کے بعد بھی انہیں اسی نسبت سے پکارا جاتا تھا۔ کسی موقع پر ''عائشہ محمد'' نہیں کہا گیا۔ اس لئے ہمارا رجحان اسی طرف ہے کہ شادی کے بعد بھی خواتین کو اپنے باپ کی نسبت سے پکارا جانا زیادہ مناسب ہے۔ معاشرتی طور پر نئی نسبت کو اختیار کرنے میں کئی ایک قباحتیں ہیں، مثلاً: بچی جب اٹھارہ سال کی ہو جاتی ہے تو اس کا شناختی کارڈ باپ کے نام سے بنتا ہے۔ شادی کے بعد اسے تبدیل کرنے کی زحمت اٹھانی پڑتی ہے اور خاوند کی نسبت سے نیا شناختی کارڈ بنانا پڑتا ہے۔ جب میاں بیوی سے کسی وجہ سے علیحدگی ہو جاتی ہے تو مزید تکلیف سے دوچار ہونا پڑتا ہے، کیونکہ قانونی کاغذات میں اس کا نام اپنے شوہر کے نام کے ساتھ منسلک ہوتا ہے، جبکہ شوہر اس کے لئے اجنبی ہو چکا ہوتا ہے۔ جب وہ آگے کسی نئے مرد سے شادی کرتی ہے تو اسے مزید الجھن سے دوچار ہونا پڑے گا، جیسے جیسے اس کی زندگی میں خاوند وفات، طلاق اور خلع کی وجہ سے تبدیل ہوتے ہیں، اسی طرح اس کی شناخت بھی تبدیل ہوتی رہے گی۔ اگر ہر بار شناختی کارڈ تبدیل کرانا پڑے تو یہ ایک دردسر ہے، دراصل مغربی تہذیب نے ہمارے ذہنوں کو خراب کیا ہے۔ اسلام نے تو ہماری شناخت باپ سے کی ہے جو کسی صورت میں تبدیل نہیں ہوتی۔ یہ نسبت دنیا اور آخرت میں برقرار رہے گی، اس لئے ہمیں چاہیے کہ اسی نسبت کو برقرار رکھیں تاکہ پریشانیوں اور الجھنوں سے محفوظ رہیں، ہماری اسلاف خواتین کا بھی یہی طریقہ تھا اور اب بھی بعض مسلم خواتین اپنے نام کے ساتھ اپنے باپ کا نام لگانا ہی پسند کرتی ہیں۔ اسلامی طرز عمل کو اختیار کرنے میں خیر وبرکت ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق ریڈیو، ٹی وی پر یہ حدیث بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں علم کا شہر ہوں

اور علی رضی اللہ عنہ اس کا دروازہ ہے''۔ کیا یہ حدیث صحیح ہے، اگر صحیح ہے تو اس کا کیا مطلب ہے؟

جواب ہمارے ہاں بیشتر احادیث زبان زد خاص و عام ہیں، لیکن ان کی اسنادی حیثیت انتہائی مخدوش ہوتی ہے۔ اس میں سے ایک یہ ہے جس کا سوال میں حوالہ دیا گیا ہے۔ اس روایت کو امام حاکم نے اپنی تالیف مستدرک میں بیان کیا ہے۔

[مستدرک، ص:۱۲۶، ج۳]

یہ حدیث بیان کرنے کے بعد امام حاکم کہتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے اور ابوالصلت نامی راوی ثقہ اور باعث اطمینان ہے۔

[تلخیص المستدرک ص:۱۲۶، ج۳]

اس روایت کے متعلق ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ امام حاکم کا اس طرح کی باطل روایات کو صحیح قرار دینا انتہائی تعجب انگیز ہے اور اس کا ایک راوی احمد تو دجال اور دروغ گو ہے۔ اس کے بارے میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ محدثین کے نزدیک یہ روایت ضعیف بلکہ موضوع ہے۔ [احادیث القصاص، ص:۷۸]

خطیب بغدادی، امام یحییٰ بن معین کے حوالے سے اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ روایت جھوٹ کا پلندہ اور اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ [تاریخ بغداد، ص:۲۰۵، ج۱۱]

یہ روایت مختلف الفاظ سے مروی ہے اور اس کے تمام طرق بے کار ہیں۔ امام جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کے تمام طرق پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے جو تقریباً چھ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ انہوں نے عقلی اور نقلی لحاظ سے اسے بے بنیاد قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں یہ حدیث کسی بھی طریق سے صحیح ثابت نہیں ہے۔ [موضوعات، ص:۳۵۳، ج۱]

اس روایت کے دوسرے الفاظ حسب ذیل ہیں: ''میں دانائی کا گھر ہوں اور علی رضی اللہ عنہ اس کا دروازہ ہے''۔

[ترمذی، کتاب المناقب:۳۷۲۳]

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں غرابت اور نکارت ہے۔ حافظ سخاوی، امام دار قطنی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ یہ حدیث مضطرب ہونے کے ساتھ ساتھ بے بنیاد بھی ہے۔ [المقاصد الحسنہ، ص:۹۷]

اس روایت کے متعلق امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر حضرات نے اسے بیان کیا ہے۔ ان کے بیان کرنے کے باوجود یہ محض جھوٹ ہے۔ [احادیث القصاص، ص:۷۸]

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ مذکورہ روایت کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسماعیل بن موسیٰ سے انہوں نے محمد بن عمر سے انہوں نے شریک سے بیان کی ہے مجھے معلوم نہیں ان میں سے کس نے اسے وضع کیا ہے۔ [میزان الاعتدال، ص:۶۹۸، ج۳]

علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس روایت کو موضوعات میں شمار کیا ہے۔ [الفوائد المجموعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ، ص:۳۴۸]

اگرچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اسے کثرت طرق کی وجہ سے حسن کہا ہے لیکن ان کا یہ فیصلہ محل نظر ہے کیونکہ کثرت طرق سے روایت میں پایا جانے والا معمولی سقم تو دور ہوسکتا ہے لیکن بنیادی کمزوری اس سے رفع نہیں ہوتی۔ چنانچہ محدث ابن الصلاح لکھتے ہیں: کثرت طرق سے ضعف رفع نہیں ہوتا وہ یہ ہے کہ اس روایت میں کوئی راوی متہم بالکذب ہو۔ [مقدمہ ابن الصلاح ص:۳۱]

اس روایت کی سند میں صرف تہمت زدہ راوی نہیں بلکہ کذاب اور جھوٹے راوی موجود ہیں۔محدث العصر علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے موضوع قرار دیا ہے اور اس کے تمام طرق پر بحث کر کے اس کا خود ساختہ ہونا واضح کیا ہے۔[ضعیف الجامع الصغیر:۱۴۱۶]

اس روایت کے مقابلہ میں ایک صحیح روایت ملاحظہ ہو جس کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔آپ نے فرمایا کہ ''خواب میں میرے پاس دودھ کا ایک پیالہ لایا گیا میں نے اس میں سے کچھ دودھ نوش کیا حتی کہ اس کی سیرابی میرے ناخنوں تک ٹپکنے لگی۔میں نے اپنا بچا ہوا دودھ عمر رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اس کی تعبیر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''اس کی تعبیر علم ہے۔'' [صحیح بخاری کتاب تعبیر الرویا، باب رویۃ اللبن]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کو نیچا دکھانے کے لئے مذکورۃ الصدر روایت کو وضع کیا گیا ہے۔

عرصہ ہوا کہ راقم نے اس روایت کی استنادی حیثیت ہفت روزہ ''اہلحدیث'' ۳۱ مارچ ۱۹۸۹ء میں واضح کی تھی۔اس کا دفاع سید بشیر حسین بخاری نے پندرہ روزہ ''ذوالفقار'' پشاور میں کیا۔ان کے مبلغ علم سے قارئین اس دفاع کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔بخاری صاحب نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ تمام قرآن حکیم کا لب لباب بسم اللہ میں ہے اور بسم اللہ کا اس کی ب میں اور ب کا اس کے نقطہ میں جو اس کے نیچے ہے اور وہ نقطہ میں ہوں''۔پندرہ روزہ ذوالفقار مجریہ ۱۶،۱۱پریل ۱۹۸۹) معتقدین اور متوسلین کو خوش کرنے کے لئے تو اس طرح کی بے کار روایات سہارا بن جاتی ہیں، لیکن علمی دنیا میں اس طرح کی روایات کا کوئی مقام نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ایک شخص کی کچھ رقم چوری ہو گئی، اسے دو آدمیوں پر شبہ تھا جو اس کے پاس آنے جانے والے تھے، اتفاق سے ایک تیسرے آدمی نے حلفیہ بیان دیا کہ جن پر چوری کا شبہ تھا انہوں نے میرے سامنے چوری کا اقرار کیا ہے۔لیکن جب معاملہ کی چھان بین کی گئی تو انہوں نے صاف صاف انکار کر دیا کہ ہم نے کسی کے پاس کوئی اقرار نہیں کیا ہے۔کیا اس تیسرے آدمی کے بیان حلفی کو بنیاد بنا کر مشتبہ آدمیوں پر چوری ڈالی جا سکتی ہے؟

جواب چوری کا جرم ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ملزم اقرار جرم کرے یا دو عادل گواہ ملزم کے ارتکاب جرم کی عینی شہادت دیں۔صورت مسئولہ میں دونوں صورتوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ اقرار کی دھندلی سی ایک شہادت ہے اور وہ بھی انکار بعد از اقرار کی صورت اختیار کر چکی ہے۔اتنی سی بات سے چوری ثابت نہیں ہوتی۔اگر ایک گواہ کی بھی عدالت ثابت ہو جائے جو چوری کی گواہی کے لئے ضروری ہوتی ہے تو مدعی کی قسم سے فیصلہ ہو سکتا تھا۔لیکن یہاں یہ صورت بھی نہیں، کیونکہ مدعی کس بات کی قسم اٹھائے اور اگر مدعی قسم اٹھانے پر آمادہ بھی ہو جائے تو اس کی کیا بنیاد ہے؟ اگر گواہ کی عدالت بھی مشتبہ ہو اور مدعی کا قسم اٹھانا بھی بے بنیاد ہو تو اتنی سی بات سے جرم ثابت نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کسی تیسرے آدمی کے بیان حلفی کو بنیاد بنا کر مشتبہ آدمیوں پر چوری ڈالی جا سکتی ہے بلکہ صورت مسئولہ میں مدعیان علیہما سے قسم لے کر انہیں بے قصور قرار دینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سوال اس وقت موبائل فون کا ایک عام رواج ہے۔بعض اوقات دوران نماز اسے بند نہیں کیا جاتا وہ اطلاعی گھنٹی کے موقع پر بجنا شروع ہو جاتا ہے جس سے نماز کا خشوع متاثر ہوتا ہے۔اب الجھن یہ ہے کہ اگر اسے دوران نماز بند کر دیا جائے تو یہ عمل نماز کے

منافی معلوم ہوتا ہے اور اگر اسے بند نہ کیا جائے تو اپنی اور جماعت کی صورت میں دوسرے نمازیوں کی توجہ قائم نہیں رہتی، کیا اسے دوران نماز بند کیا جاسکتا ہے؟

جواب موبائل فون دور حاضر کی ایک مفید ایجاد ہے۔ بشرطیکہ اسے استعمال کرتے وقت اس کے آداب وشرائط اور تقاضوں کو ملحوظ رکھا جائے۔ لیکن ہمارے ہاں ضروریات سے تجاوز کر کے یہ موبائل فضولیات میں قدم رکھ چکا ہے۔ بلا شبہ نماز اللہ کے ساتھ مناجات کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس لیے نماز میں کامل توجہ اور خشوع وخضوع کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے اور ہر ایسے عمل کا سد باب ہونا چاہیے جو نماز میں خلل کا باعث ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ پہلے موبائل کو کم از کم اس کی اطلاعی گھنٹی کو بند کر دیا جائے اگر کوئی نمازی اپنا موبائل یا اس کی گھنٹی بند کرنا بھول جائے اور دوران نماز اس کی اطلاعی گھنٹی بجنا شروع ہو جائے تو کیا کرنا چاہیے۔ اس کے لئے ہمیں رسول اللہ ﷺ کا اسوہ دیکھنا ہوگا۔ نماز کے متعلق مروی احادیث کا تقاضا ہے کہ انسان دوران نماز کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کے منافی ہو، لیکن بعض اوقات نمازی کسی مصلحت یا ضرورت کے پیش نظر دوران نماز کوئی نقل وحرکت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جو بظاہر نماز کے منافی ہوتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ دوران نماز اس طرح کی حرکت کی حدود وشرائط کو بیان کر دیا جائے۔ چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس ضرورت کے پیش نظر اپنی صحیح میں ایک بڑا عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے "نماز میں کوئی کام کرنے کا بیان۔" اس عنوان کے تحت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے رسول اللہ ﷺ کے دوران نماز افعال کا تتبع کرتے ہوئے تقریباً 32 احادیث بیان کی ہیں، پھر ان پر اٹھارہ کے قریب چھوٹے چھوٹے عنوان قائم کیے ہیں۔ ہمارے نزدیک ایسے کاموں کی تحدید مشکل ہے، اس لئے رسول اللہ ﷺ سے جتنا عمل ثابت ہے اسے جائز اور اس سے زائد عمل کو نماز کے منافی قرار دیا جائے، ہاں، اگر رسول اللہ ﷺ کے کسی عمل کے لئے خصوصیت کی دلیل موجود ہو تو اس میں امت کے لئے جواز کا کوئی پہلو نہیں ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے دوران نماز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو پکڑ کر اپنی دائیں جانب کیا جبکہ وہ بائیں جانب کھڑے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازی کو دوسرے کی اصلاح کے لئے اپنے ہاتھ سے مدد لینا درست اور جائز ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ نماز کی مصلحت کے لئے دوران نماز اپنے ہاتھ سے مدد لی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے دوران نماز بچھو اور سانپ کو مارنے کی اجازت دی ہے۔ [ابوداؤد، حدیث نمبر: ۹۲۱]

نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے اور گھر کا دروازہ بند تھا۔ میں باہر سے آئی اور دروازہ کھٹکھٹایا تو رسول اللہ ﷺ نے دوران نماز چل کر دروازہ کھول دیا، پھر آپ اپنے مقام نماز پر واپس چلے گئے اور گھر کا دروازہ قبلہ کی جانب تھا۔ [ابوداؤد، حدیث نمبر: ۹۲۲]

ان احادیث کے پیش نظر ہم کہتے ہیں کہ اگر کوئی نمازی اپنے موبائل کی گھنٹی بند کرنا بھول جائے تو دوران نماز اس کی گھنٹی بجنے لگے تو اسے اپنے ہاتھ سے بند کر دینا جائز ہے اور اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، کیونکہ اس کے جاری رہنے سے دوسرے نمازیوں کا خشوع وخضوع متاثر ہوتا ہے اور ان کے لئے خاصی تشویش کا باعث بن جاتا ہے۔ جب نماز کی مصلحت کے پیش نظر دوران نماز اپنے ہاتھ سے کوئی بھی کام کیا جاسکتا ہے تو موبائل بند کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے، اگرچہ احناف نے دوران نماز

عمل قلیل کی اجازت دی ہے، پھر عمل قلیل کی حد بندی کی ہے لیکن ہمیں اس طرح کی باریک بینی میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، واضح رہے کہ ہمارے ہاں احناف نے دوران نماز موبائل فون بند کرنے کو عمل قلیل ہی قرار دیا ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال شادی کے موقع پر کیا آج بھی چھوٹی بچیاں دف بجا کر اشعار پڑھ سکتی ہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں ہماری راہنمائی کریں۔

جواب ''دف بجا کر چھوٹی بچیوں کا اشعار پڑھنا'' اس کی بنیاد درج ذیل حدیث پر ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے، اس وقت میرے پاس دو بچیاں جنگ بعاث سے متعلق گیت گا رہی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا چہرۂ مبارک دوسری طرف پھیر کر لیٹ گئے۔ اتنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ انہوں نے مجھے ڈانٹ کر کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں یہ شیطانی ساز چہ معنی دارد؟ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: ''ابوبکر! انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو۔'' پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب مصروف ہو گئے تو میں نے ان بچیوں کو اشارہ کیا تو وہ اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔ [صحیح بخاری، العیدین: ۹۲۹]

ایک روایت میں ہے کہ عید کے دن انصار کی بچیاں گیت گا رہی تھیں۔ [صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۹۵۲]

ایک روایت کے مطابق وہ گیت گاتے وقت دف بجا رہی تھیں۔ [صحیح بخاری: ۹۸۷]

ایک روایت میں صراحت ہے کہ وہ بچیاں پیشہ ور گلوکارہ نہیں تھیں۔ [صحیح بخاری، حدیث نمبر ۹۵۲]

مغنیہ یا گلوکارہ اس پیشہ ور عورت کو کہتے ہیں جو کاروبار کے طور پر اپنے فن کے مطابق گائے، جس میں نشیب، ترنم اور زیر و بم ہوتا ہے۔ اس سے ہیجانی جذبات پیدا ہوتے ہیں، نیز اس میں فواحش و منکرات کی تصریح یا تعریض ہوتی ہے، مذکورہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بچیاں گانے بجانے کے فن سے نا آشنا تھیں، اس بنا پر مندرجہ ذیل شرائط کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے آج بھی شادی کے موقع پر دف کو استعمال کیا جا سکتا ہے اور اس کے ساتھ اشعار بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔

① دف صرف ایک طرف سے بجائی جاتی ہے اور اس کے بجانے سے سادہ سی آواز پیدا ہوتی ہے۔ جس میں گھنگھرو کی جھنکار نہیں ہوتی اور نہ ہی ''لشکارا گلی گلی'' جاتا ہے۔

② دف بجاتے وقت دیگر آلات موسیقی استعمال نہ کیے جائیں، کیونکہ ان آلات موسیقی کی حرمت پر قرآن وحدیث میں واضح نصوص موجود ہیں، قرآن کریم نے ان آلات موسیقی کو ''لہو الحدیث'' کہہ کر ان سے اظہار نفرت کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرب قیامت کی یہ علامت بتائی ہے کہ لوگ انہیں مباح سمجھ کر خوب، خوب استعمال کریں گے، جیسا کہ آج کل ہمارے معاشرہ میں اسے ''روشن خیالی'' خیال کیا جاتا ہے۔

③ خوشی کے موقع پر ایسے اشعار پڑھیں جائیں جو شجاعت و بہادری پر مشتمل ہوں کہ حدیث میں صراحت ہے کہ انصار کی بچیوں نے ایسے اشعار پڑھے تھے جو انصار نے جنگ بعاث کے موقع پر پڑھے تھے۔ خوشی کے موقع پر بزمیہ قسم کے اشعار، یعنی ہیجان انگیز اور عشقیہ غزلیں نہ ہوں۔

④ جوان عورتیں ان میں حصہ نہ لیں بلکہ نابالغ بچیاں ایسے موقع پر ''گنجائش'' سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔اگر بچیوں کے اشعار گانے سے کسی فتنہ کا اندیشہ ہو تو ان پر بھی پابندی لگائی جا سکتی ہے، کیونکہ ایسے موقع پر مباح کام بھی ناجائز قرار پاتا ہے۔

⑤ یہ اہتمام ایسے حلقہ میں ہو جہاں عزیز و اقارب ہوں، اجنبی لوگوں کا دل بہلانے کے لئے اس قسم کی محفل کا اہتمام کرنا شرعاً ناجائز ہے۔

⑥ وہ گیت اور اشعار ایسے مضامین پر مشتمل نہ ہوں جو خلاف شرع ہیں۔اگر شریعت سے متصادم اشعار ہیں تو ان پر پابندی لگانا شریعت کا عین تقاضا ہے۔

مذکورہ شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے خوشی کے موقع پر دف کے ساتھ اشعار پڑھے جا سکتے ہیں، اس حدیث پر ایک دوسرے پہلو سے غور کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بچیوں کے گانے اور دف بجانے کے موقع پر اپنا چہرہ مبارک دوسری طرف پھیر لیا تھا۔ بعض روایات کے مطابق اپنے چہرے کو کپڑے سے ڈھانپ لیا تھا، گویا چشم پوشی کے ساتھ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی فرما دیا، گویا آپ نے اس انداز سے یہ تاثر دیا کہ آپ اس گیت اور دف کی آواز سے کسی طرح بھی محظوظ نہیں ہو رہے ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ ایسی حالت میں گانا اور دف بجانا اباحت مرجوحہ کے درجہ میں تھا۔ [واللہ اعلم]

سوال اسلامی دن کا آغاز مغرب کے بعد ہوتا ہے یا عشاء کے بعد؟ ہم نے کسی عالم سے سنا ہے کہ اسلامی دن کا آغاز عشاء کے بعد ہوتا ہے۔اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی فرمائیں۔

جواب چوبیس گھنٹوں کا یوم ایک دن اور ایک رات پر مشتمل ہوتا ہے۔عرف عام میں دن کا آغاز طلوع آفتاب سے ہوتا ہے جبکہ اسلامی دن کا آغاز طلوع فجر سے غروب آفتاب تک ہے، کیونکہ اسلامی طور پر روزے کی ابتدا طلوع فجر سے ہوتی ہے اور اس کی انتہا غروب آفتاب سے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''فجر کے وقت جب سفید دھاری، سیاہ دھاری سے واضح طور پر نمایاں نہ ہو جائے تو تم کھاؤ اور پیو، پھر رات تک اپنے روزے کو پورا کرو۔'' [۲/البقرۃ:۱۸۷]

رسول اللہ ﷺ کے ایک فرمان کے پیش نظر روزے کی انتہا غروب آفتاب تک ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی دن طلوع فجر سے غروب آفتاب تک ہے، نیز اسلامی یوم میں رات پہلے ہوتی ہے، جیسا کہ غروب آفتاب کے بعد اگر چاند نظر آ جائے تو وہ رات اگلے دن میں شمار ہوتی ہے۔بہر حال اسلامی یوم کا آغاز غروب آفتاب کے بعد ہے، عشاء کے بعد دن کا آغاز ایجاد بندہ ہے۔اس کی عقلی یا نقلی کوئی دلیل نہیں ہے۔

سوال ہفت روزہ اہلحدیث میں ''احکام و مسائل'' کا کالم دل چسپی، اشتیاق اور التزام کے ساتھ پڑھتا ہوں اور اس سے مستفید بھی ہوتا ہوں۔اس میں دینی سوالات کے جوابات نہایت محنت، کدوکاوش اور گہری تحقیق سے لکھے جاتے ہیں، ہمیں ان دنوں ایک مسئلہ درپیش ہے، وہ یہ کہ میری اس وقت عمر اسی سال سے متجاوز ہے۔میں اور اہلیہ دونوں شدید خرابی صحت میں مبتلا ہیں، ہمیں ہماری ضرورت کے مطابق کھانا تیار کرنے اور اسے پیش کرنے کے لئے کوئی مسلمان مرد یا عورت دستیاب نہیں ہو سکا۔مجبوراً

ہم نے ایک عیسائی عورت کو اس کام کے لئے ملازم رکھا ہے۔فیملی کے کسی فرد نے اعتراض کیا ہے کہ اس کے ہاتھوں تیار کیا ہوا کھانا جائز نہیں، اس سلسلہ میں ہماری شرعی راہنمائی فرمائیں۔

جواب اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی اہلیہ کو صحت کاملہ وعاجلہ عنایت فرمائے، یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ آپ کو ضرورت کے مطابق کھانا تیار کرنے والا کوئی مسلمان مرد یا عورت باورچی نہیں مل سکا۔آپ نے مجبوراً کسی عیسائی عورت کی خدمات حاصل کی ہیں، ہمارے ملک میں عیسائی مرد یا عورت دو طرح کے ہیں۔ایک وہ ہیں جو اپنی نظافت وطہارت کا خیال نہیں رکھتے بلکہ انہیں گندگی اٹھانے اور نالیاں وغیرہ صاف کرنے کے لئے رکھا جاتا ہے اور دوسرے وہ ہیں جو عیسائی ہونے کے باوجود صفائی، نظافت اور طہارت کا خیال رکھتے ہیں، پہلی قسم کے عیسائی سے ہر انسان کو کراہت ہوتی ہے، صورت مسئولہ میں یقیناً دوسری قسم سے کسی عیسائی عورت کا انتخاب کیا گیا ہوگا۔اہل کتاب کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے جائز ہے۔'' [۵/المائدہ:۴]

لفظ طعام اپنے عموم کے اعتبار سے ہر قسم کے کھانے کے لئے استعمال ہوا ہے، اگرچہ اکثر مفسرین نے اس کا معنی ذبیحہ کیا ہے۔جب ان کا کھانا استعمال کیا جاسکتا ہے اور ان کا ذبیحہ بھی کام میں لایا جاسکتا ہے تو ان کے ہاتھ کی پکی ہوئی چیز کھانے میں کیا امر مانع ہے۔اگر عیسائی عورت طہارت ونظافت کا خیال رکھتی ہے تو اسے گھر میں کھانا وغیرہ تیار کرنے کے لئے ملازم رکھنا جائز ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح خیبر کے موقع پر ایک یہودیہ عورت کے ہاں کھانا تناول فرمایا تھا، کھانے میں پیش کردہ بکری کے گوشت میں یہودیوں نے زہر ملا دیا تھا۔اس کی تفصیل احادیث میں موجود ہے۔ [صحیح بخاری، المغازی:۴۲۴۹]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے تحت لکھا ہے کہ اہل کتاب کا کھانا تناول کرنا اور ان کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے۔

[فتح الباری، ص:۶۲۳، ج۷]

گھر کا باورچی گھر کا بھیدی ہوتا ہے۔اس اعتبار سے کرسچن عورت پر کڑی نظر رکھی جائے، اس کا عیسائی ہونا کھانا وغیرہ تیار کرنے اور اسے پیش کرنے کے لئے کوئی مانع امر نہیں ہے۔البتہ راز داری، دیانت اور نظافت وطہارت کے پہلو کو ضرور دیکھ لینا چاہیے، شرعی طور پر اس مشروط اجازت کے باوجود کسی مسلمان باورچی کی تلاش جاری رکھنا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال میں نے بکر سے فون پر سونے کا سودا کیا، قیمت اور وزن متعین ہے، لیکن قیمت کی ادائیگی ایک ہفتہ کے ادھار پر طے ہوئی، دو تین دن بعد بکر نے مجھے فون کیا کہ تمہارا سونا فروخت کردوں، جبکہ میں نے اس پر قبضہ نہیں کیا اور نہ اس کی قیمت ادا کی ہے۔کیا اس طرح خرید وفروخت کا معاملہ جائز ہے؟

جواب ہمارے ہاں مارکیٹ اور منڈیوں میں اکثر سودے اسی طرح ہوتے ہیں کہ فون پر مال خریدا جاتا ہے، پھر اس کو دیکھے یا قبضہ میں لئے بغیر آگے فروخت کردیا جاتا ہے۔حالانکہ شرعاً ایسا جائز نہیں ہے۔حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ لوگ بازار کے بلند مقام میں غلہ خریدتے اور اسی جگہ فروخت کردیتے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں منع فرمایا کہ ''غلہ وہیں فروخت نہ کریں بلکہ وہاں سے کہیں اور منتقل کرنے کے بعد فروخت کریں۔'' [مسند امام احمد، ص:۵۶، ج۱]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میرے خیال کے مطابق ہر چیز شرعی اعتبار سے غلہ کی مانند ہے۔ [بیہقی ص:۳۱۲،ج۵]

بلکہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی روایت میں صراحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سودے کو اس جگہ بیچنے سے منع فرمایا ہے جہاں اسے خریدا جاتا ہو حتی کہ اسے اپنے گھر میں لے جائیں۔ [مستدرک حاکم، ص:۴۰، ج۲]

ایک روایت میں ہے کہ ''جب تم کوئی چیز خریدو تو اسے قبضے میں لینے سے قبل مت فروخت کرو۔'' (مسند امام احمد، ص:۴۰۳، ج۳)

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خرید کردہ چیز جب تک اپنے قبضہ میں نہ لی جائے اس کا آگے فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

صورت مسئولہ میں چونکہ خریدار نے ابھی سونے پر قبضہ نہیں کیا، اس لئے اس کا آگے خود یا کسی کے ذریعے فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال میں ایک دینی ادارہ میں زیر تعلیم ہوں اور میرے والد بنک ملازم ہیں، جبکہ ہمیں علم ہے کہ بنک کی ملازمت شرعاً جائز نہیں ہے اور والد کی کمائی بھی درست نہیں ہے، اسی سے وہ مجھے خرچہ دیتے ہیں اور گھر کے اخراجات چلاتے ہیں، اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ہماری دعاؤں اور عبادات پر والد کی کمائی اثر انداز ہوگی یا نہیں؟ اس سلسلہ میں والدہ صاحبہ خاصی پریشان ہیں، والد صاحب سے کئی مرتبہ گفتگو بھی ہوئی ہے، لیکن وہ بنک کی ملازمت چھوڑنے پر آمادہ ہوتے نظر نہیں آتے اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی کریں۔

جواب ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ حلال اور پاکیزہ رزق استعمال کرے اور اپنے بچوں کو حلال رزق کھلائے، حرام مال سے اخراجات پورے کرنا کئی ایک حوادث کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہے، ایسے شخص کی عبادات ہی قبول نہیں کی جاتیں جو حرام مال استعمال کرنے کا عادی ہو، صورت مسئولہ میں اگر بنک ملازم کی اولاد کا کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے، جس سے وہ اپنا پیٹ پال سکیں یا گھر کے اخراجات چلاسکیں تو ایسے حالات میں بنک کی تنخواہ سے کھانا، پینا اور اس سے کپڑے پہننا کوئی گناہ نہیں ہوگا، کیونکہ وہ مجبور ہیں اور مجبوری کے وقت حرام مال کھانے کی اجازت ہے، لیکن انہیں مندرجہ ذیل اشیاء کا خیال رکھنا ضروری ہے:

① اہل خانہ کو چاہیے کہ وہ اپنے والد یا خاوند کو نصیحت کرتے رہیں اور اسے اس ملازمت کے ناجائز ہونے کا یقین دلائیں تاکہ وہ اس سے اجتناب کرے، ممکن ہے کہ ان کی وعظ و نصیحت سے حرام مال کو ترک کردے اور اس سے توبہ کرے۔

② اس کمائی کو زیادہ مقدار میں خرچ نہ کریں، صرف اسی قدر لیں جس سے گزارا چل جائے، نیز اس کمائی سے صدقہ و خیرات بھی نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ خود پاک ہے اور پاکیزہ چیز کو ہی قبول کرتا ہے۔

③ اولاد کو چاہیے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کریں، جب حالات سازگار ہوجائیں کہ والد کے سرمایہ کی ضرورت نہ رہے تو اس حرام کمائی سے اجتناب کریں، اس لئے انہیں بہت محنت سے کام لینا ہوگا۔

④ اگر حرام سے بچنے کی کوئی صورت نہ ہو تو امید ہے کہ اہل خانہ کی عبادات اور دعاؤں پر یہ حرام مال اثر انداز نہیں ہوگا، کیونکہ ان کے پاس طاقت ہی نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا'' [۲/البقرۃ:۲۸۵]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے سود کا کاروبار کرنے والے کے متعلق سوال کیا گیا کہ وہ فوت ہوگیا ہے اور اس نے اپنے پیچھے اولاد اور مال چھوڑا ہے اور اولاد کو اپنے والد کے سودی کام کا بھی علم ہے تو کیا ان کے لئے یہ مال بطور وراثت حلال ہے؟ شیخ

الاسلام نے جواب دیا: ''اولاد کو سود کی جس مقدار کا علم ہے، وہ اس سے نکال دے اور اگر ممکن ہو تو وہ لوگوں کو واپس کرے، اسے صدقہ نہ کرے اور جو باقی ہے اسے وراثت کے طور پر استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن جس مقدار میں شبہ ہو اس کے متعلق بہتر ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے اور اگر مال میں حرام اور حلال دونوں کی ملاوٹ ہو اور اس کی مقدار کا علم نہیں تو اس کے دو حصے کر لینے چاہییں، یعنی نصف حلال اور نصف حرام کا، حلال حصہ کو استعمال کر لیا جائے۔ [مجموعہ الفتاویٰ، ص:۳۰۷، ج۲۹]

بہر حال والد کو وعظ و نصیحت کرتے رہنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں اہل علم کا تعاون بھی لیا جا سکتا ہے، اس کے دوست واحباب سے بھی یہ کام لیا جا سکتا ہے، تاکہ اسے مطمئن کر کے حرام کمائی سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہم اپنے ایک دوست کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ رشوت لینے اور دینے والے کی قربانی جائز نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی فرمائیں۔

جواب واضح ہو کہ رشوت دینا اور رشوت لینا ایک سنگین جرم ہے۔ ان دونوں کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''رشوت لینے اور دینے والے دونوں جہنمی ہیں۔'' جہنم کی آگ سے مراد ایک تو وہ آگ ہے جس کا مجرم لوگ قیامت کے دن تر نوالہ بنیں گے، دوسری آگ دنیا کی ہے اس سے مراد وہ ناکامی و محرومی ہے جو رشوت خور کا کسی وقت بھی پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ''رشوت لینے اور دینے والے دونوں ملعون ہیں۔'' لعنت سے مراد وہ بے برکتی ہے جس کے بعد رشوت خور اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت سے محروم ہو جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ اس صورت میں برآمد ہوتا ہے کہ اس کا دل بالکل سیاہ ہو جاتا ہے اور اس سے سوچ و بچار کی تمام قوتیں سلب کر لی جاتی ہیں۔ رشوت لینا اور دینا اس قدر سنگین جرم ہونے کے باوجود ایسا عمل نہیں ہے کہ دوسرے اعمال کی خرابی کا باعث ہو، اگرچہ شریعت مطہرہ کے متعلق فکر و عمل کی ایسی بے اعتدالیاں موجود ہیں جو انسان کے دوسرے نیک اعمال کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں، جیسا کہ شرک کے متعلق صراحت ہے کہ اس کی موجودگی میں انسان کا کوئی عمل بھی صالح قرار نہیں پاتا بلکہ اس کے ارتکاب سے پہلے کئے ہوئے نیک اعمال بھی ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس طرح بدعت کا بھی یہی حال ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق: ''صاحب بدعت سے کوئی بھی نیک عمل قبول نہیں کیا جائے گا۔'' رشوت لینا، دینا سخت ترین جرم ہونے کے باوجود ایسا جرم نہیں ہے کہ اس کے ارتکاب سے دوسرے اعمال خراب ہو جاتے ہوں، البتہ رشوت کی رقم سے قربانی یا صدقہ کیا جائے تو بلاشبہ حرام اور ناقابل قبول ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''اللہ تعالیٰ خود بھی پاک ہے اور پاکیزہ عمل کو ہی قبول کرتا ہے۔'' [ترمذی، کتاب الزکوٰۃ:۶۶۱]

چونکہ رشوت لینا پاکیزہ کمائی نہیں بلکہ حرام اور پلید ہے، لہٰذا اس کی رقم سے خریدا ہوا کوئی بھی جانور اللہ کی بارگاہ میں شرف قبولیت سے محروم رہے گا۔ کسب حلال کی اہمیت مخفی نہیں ہے۔ عبادات کی قبولیت کا دارومدار کسب حلال پر ہے۔ بشرطیکہ قبولیت کی دوسری شرائط بھی ملحوظ رکھی جائیں، وہ ایمان وعقیدہ کی سلامتی اور شرک و بدعت سے اجتناب ہے۔ اس مسئلہ پر بایں پہلو بھی غور کیا جا سکتا ہے کہ بعض اوقات انسان اپنا حق لینے کے لئے رشوت دیتا ہے اور یہ ایک مجبوری ہے، اگرچہ تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے حالات میں اپنے حق سے دستبردار ہو جائے اور رشوت دینے کا سنگین جرم نہ کرے، لیکن جواز کی حد تک اس کی گنجائش ہے، لہٰذا ایسے

حالات میں اسے رشوت دینے کی وعید میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ اس بنا پر ہماری ناقص رائے کے مطابق رشوت لینے والا اگر رشوت کی رقم سے قربانی کا جانور خریدتا ہے تو اس صورت میں بلاشبہ اس کی قربانی بے کار اور ضائع ہے، لیکن اگر رشوت خور قربانی کا جانور خریدنے کے لئے رشوت کا پیسہ استعمال نہیں کرتا تو اس صورت میں یہ کہنا مشکل ہے کہ اسے قربانی نہیں کرنا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال برائلر مرغی، جس کی تخلیق عموماً غیر فطری ہوتی ہے کیا شرعاً حلال ہے؟

جواب سوال میں برائلر مرغی کی تخلیق کے متعلق غیر فطری ہونے کی وضاحت نہیں کی گئی۔ اگر اس کے غیر فطری ہونے کا معنی یہ ہے کہ اس کے انڈوں کو مرغی کے نیچے نہیں رکھا جاتا بلکہ مشینی آلات کے ذریعے اس کے بچوں کو حاصل کیا جاتا ہے تو اسے غیر فطری نہیں کہا جاتا ہے، کیونکہ اس کے حصول کے متعلق طریقہ کار کو تبدیل کیا گیا ہے، البتہ اس کے متعلق تدریجی عمل وہی ہوتا ہے جو مرغی کے نیچے رکھنے سے ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ عام طور پر مرغی اکیس دن کے بعد انڈوں سے بچے نکالتی ہے، مشینی طریقہ کار سے بھی اکیس دن درکار ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو مشہور ہے کہ مشینی طریقہ سے بچے ایک دن میں نکل آتے ہیں یہ غلط ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے، جیسا کہ عوام میں یہ بات بھی غلط مشہور ہے کہ حضرات حواء علیہا السلام ابتدائی طور پر ایک بچہ صبح اور ایک بچہ شام کو جنم دیتی تھی، اس مفروضے کا بھی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، دراصل موجودہ سائنس نے جدید آلات سے معلوم کیا ہے کہ مرغی کے نیچے انڈے رکھنے سے روزانہ کتنی گرمی درکار ہوتی ہے جس سے اکیس دن بعد بچے نکل آتے ہیں، گرمی کی یہی مقدار مشینی ذرائع سے انڈوں کو یومیہ دی جاتی ہے اور اکیس دن کے بعد بچے نکل آتے ہیں۔ چونکہ بچے نکلنے اور انڈے مشین میں رکھنے کا عمل روزانہ جاری رہتا ہے۔ اکیس دن کے بعد جن انڈوں سے بچے نکل آتے ہیں، ان کی جگہ دوسرے انڈے رکھ دیے جاتے ہیں اس سے عوام میں یہ مشہور ہوگیا ہے کہ فارمی مرغیوں کی تخلیق غیر فطری ہے۔ حیوانات میں آج کل افزائش نسل کے مصنوعی طریقے ایجاد ہو چکے ہیں۔ خاص طور پر گائے سے زیادہ دودھ حاصل کرنے کے لئے مصنوعی بار آوری کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اس کے جائز ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، البتہ عورتوں کا بانجھ پن دور کرنے کے لئے مصنوعی طریقے سے اولاد پیدا کرنے کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ اس کے بعض طریقے شرعاً جائز نہیں ہیں، البتہ حیوانات کو اس طرح کے مصنوعی مراحل سے گزارنا جائز اور مباح ہے۔ مرغیوں کے متعلق ابھی تک کوئی طریقہ ایجاد نہیں ہوا جسے عمل میں لا کر طبعی طریقہ سے ہٹ کر ان سے انڈے حاصل کئے جا سکیں، البتہ انہیں ایسی خوراک ضرور دی جاتی ہے جس کے استعمال سے انڈے دینے کے عمل میں تعطل نہیں آتا، بلکہ وہ مسلسل انڈے دیتی رہتی ہیں۔ پھر ان مرغیوں کی دو اقسام ہیں، ان میں کچھ حصول گوشت کے لئے ہوتی ہیں اور کچھ کو انڈوں کے لئے رکھا جاتا ہے۔ انڈوں والی مرغیوں میں مرغ ہوتے ہیں جن سے وہ انڈے دینے کے قابل ہوتی ہیں۔ جب وہ انڈے دینا بند کر دیتی ہیں تو انہیں گوشت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، اس قسم کی مرغیوں کو لیئر کہتے ہیں۔ مرغیوں کی دوسری قسم وہ ہے جو صرف گوشت کے لئے ہوتی ہے انہیں برائلر کہا جاتا ہے، وہ پیدائش سے چالیس دن تک گوشت کے لئے تیار ہو جاتی ہیں، جب وہ چوزے انڈوں سے برآمد ہوتے ہیں ماہرین کی مدد سے ان میں نر، مادہ کی تمیز کر دی جاتی ہے مادہ چوزوں کو ایسی خوراک دی جاتی ہے جس سے وہ گوشت کے لئے جلدی تیار ہو جاتی ہیں۔ اس خوراک میں کچھ حرام اجزا کی آمیزش ہوتی ہے، مثلاً: مردار کا گوشت، ذبیحہ کا خون اور جانوروں کی ہڈیاں

وغیرہ، لیکن ان حرام اجزا پر مشتمل خوراک استعمال کرنے سے ان کی حلت متاثر نہیں ہوتی ہے۔ کیونکہ حیوانات حلال وحرام کے مکلّف نہیں، چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ''مرغی کے گوشت'' کے متعلق ایک عنوان قائم کیا ہے۔ اس کے تحت وہ ایک واقعہ لائے ہیں۔ حضرت زھدم کہتے ہیں کہ ہم حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے پاس تھے، قبیلۂ جرم کے لوگ بھی وہاں موجود تھے اور ہمارا اس قبیلہ سے بھائی چارہ تھا۔ انہیں کھانا پیش کیا گیا، اس میں مرغی کا گوشت بھی تھا۔ اس قبیلہ کا ایک آدمی کھانا کھانے کے بجائے الگ تھلگ ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے پوچھا گیا کہ آپ کے اس طرز عمل کی کیا وجہ ہے؟ اس نے وضاحت کی کہ میں نے مرغی کو گندگی کھاتے دیکھا ہے، اس لئے اسے پسند نہیں کرتا ہوں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مرغی کا گوشت کھاتے دیکھا ہے، اس لئے تمہیں بھی تکلف سے کام نہیں لینا چاہیے۔ [صحیح بخاری، الذبائح: ۵۵۱۸]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حیوانات وغیرہ اس کے مکلّف نہیں ہیں کہ وہ حلال غذا استعمال کریں۔ الغرض حلال جانور کا گوشت کھانا جائز ہے، خواہ اسے حرام اجزا پر مشتمل خوراک دی جائے، اس لئے صورت مسئولہ میں برائلر مرغی کا گوشت حلال ہے اور اس کی تخلیق غیر فطری نہیں۔ اگر دل نہ چاہے تو کسی کو کھانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ [واللہ اعلم]

سوال فرقہ بازی کیا ہے؟ جسے اللہ تعالیٰ نے معیوب قرار دیا ہے اور حکومت، نیز عوام الناس بھی اس کی مذمت کرتے ہیں؟

جواب اہل تفریق کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور خود فرقوں میں بٹ گئے، ان سے آپ کو کچھ سروکار نہیں، ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔'' [۶/الانعام: ۱۵۹]

فرقہ بازی ایک ایسی لعنت اور باعث مذمت ہے جو ملت کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ جب لوگوں میں یہ عادات بد پائی جاتی ہیں، ان کی ساکھ اور عزت دنیا کی نظروں میں گر جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرقہ بندی کو اپنے عذاب کی ایک شکل قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اللہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ تم پر تمہارے اوپر سے کوئی عذاب نازل کرے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے کوئی عذاب مسلط کر دے یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک فرقے کو دوسرے سے لڑائی کا مزہ چکھا دے۔ [۶/الانعام: ۶۵]

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت بالا میں ذکر کردہ تمام قسم کے عذابوں سے اللہ کی پناہ مانگی اور میری امت پر اس قسم کے عذاب نہ آئیں۔ چنانچہ پہلی اور دوسری قسم کے عذابوں کے متعلق آپ کی دعا قبول ہو گئی مگر تیسری قسم کے عذاب جو فرقہ بندی سے متعلق ہے، دعا قبول نہ ہوئی بلکہ آپ نے اس عذاب کو پہلے دونوں عذابوں کی نسبت آسان قرار دیا ہے۔

[صحیح بخاری، التفسیر: ۴۶۲۸]

اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلی دو قسم کا عذاب اس امت کے کلی استیصال کے لئے نہیں آئے گا، البتہ جزوی طور پر آ سکتا ہے۔ رہا تیسری قسم کا عذاب تو وہ اس امت میں موجود ہے جس نے ملت اسلامیہ کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے مسلمانوں کو ایک مغلوب قوم بنا رکھا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور پیشین گوئی فرمایا تھا:

''بنی اسرائیل بہتر (۷۲) فرقوں میں تقسیم ہو گئے جبکہ میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ایک گروہ کے

علاوہ سب فرقے جہنم کا ایندھن ہوں گے۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ نجات یافتہ کون ہوں گے؟ آپ نے فرمایا: ''جو اس راہ پر چلیں گے جس راہ پر میں اور میرے اصحاب ہیں۔'' [ترمذی، الایمان، ۲۶۴۱]

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معیار کی نشاندہی فرمادی ہے جو قیامت کے دن اس کے ہاں اس کے عذاب سے نجات کا باعث ہوگا۔ قرآن پاک میں اسے صراط مستقیم اور سبیل المؤمنین کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرقہ بازوں کو مشرکین کے لفظ سے ذکر کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور ان مشرکین سے نہ ہو جاؤ جنھوں نے اپنا دین الگ کر لیا اور گروہوں میں بٹ گئے ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی میں مگن ہے۔'' [۳۰/الروم:۳۲]

اس کی وجہ یہ ہے کہ جس مذہبی یا سیاسی فرقہ کا آغاز بدعتی عقیدہ یا بدعتی عمل سے ہوتا ہے، مثلاً: کسی رسول یا بزرگ کو اس کے اصلی مقام سے اٹھا کر اللہ کی صفات میں شریک بنا دینا، یہی وہ غلو فی الدین ہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

پھر یہ فرقہ بازی عموماً دو قسم کی ہوتی ہے۔

☆ ایک مذہبی جیسے کسی امام کی تقلید میں بایں طور انتہا پسندی سے کام لینا کہ اس امام کو منصب رسالت پر بٹھا دینا گویا وہ معصوم عن الخطا ہے یا کسی معمولی اختلاف کو کفر و اسلام کی بنیاد قرار دینا یا کسی اہم اختلاف کو باہمی رواداری کے خلاف خیال کرنا وغیرہ۔

☆ دوسری سیاسی جیسے علاقائی، قومی اور لسانی بنیادوں پر تقسیم کرنا۔ درج ذیل عقائد اس فرقہ بازی کی زد میں آتے ہیں۔

① اللہ کے بجائے عوام کی بالادستی اور انہیں طاقت کا سر چشمہ قرار دینا۔

② اللہ کی ذات اور انبیا علیہم السلام کے معجزات کا انکار۔

③ کچھ ائمہ کو معصوم اور مامون قرار دینا۔

الغرض جتنے بھی فرقے ہیں، خواہ مذہبی ہوں یا سیاسی، ان کا کوئی نہ کوئی عقیدہ یا عمل ضرور کتاب و سنت کے خلاف ہوگا۔ بدعی عمل کا تعلق سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہوتا لہٰذا کسی سنت کو دیدہ و دانستہ نظر انداز کر دینا یا کسی نئے کام کو ثواب کی نیت سے شروع کر دینا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دین میں پہلے کمی رہ گئی تھی جو اس ترمیم یا اضافہ سے پوری کی جا رہی ہے۔ اعاذنا اللّٰہ عنہ

اگر مزید غور کیا جائے تو گروہ بندی کی تہہ میں دو ہی اغراض پوشیدہ ہوتی ہیں۔ ایک مال کی محبت، دوسرے اقتدار کی چاہت، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''بکریوں کے کسی ریوڑ میں دو بھوکے بھیڑیے اتنی تباہی نہیں مچاتے جتنا مال کی محبت اور منصب کی چاہت کسی کے ایمان کو برباد کرتی ہیں۔'' [ترمذی، الزہد: ۲۳۷۶]

اس فرقہ بندی سے محفوظ رہنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ قرآن اور صحیح احادیث کے مطابق زندگی بسر کی جائے اور اس سلسلہ میں دائیں، بائیں جھانکنے سے اجتناب کیا جائے۔

سوال دور حاضر میں جماعت المسلمین والے صرف اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، دوسروں کو فرقہ واریت کی پیداوار کہہ کر مسلمان خیال نہیں کرتے، ان کا کہنا ہے کہ جو ہمارے امیر کی بیعت کرے گا وہی مسلمان ہے جو بیعت سے انکار کرتا ہے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس جماعت کے متعلق وضاحت کریں؟

جواب ہمیں معلوم نہیں کہ سائل نے کس ''جماعت المسلمین'' کے متعلق سوال کیا ہے، کیونکہ اس وقت تک متعدد ''جماعت المسلمین'' خودرو بوٹیوں کی طرح نمودار ہو چکی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ 65 ہجری میں معتدل خوارج کی ایک تنظیم ''جماعت المسلمین'' کے نام سے موسوم تھی، جس کا بانی عبداللہ بن اباض تھا، جسے اہل جماعت امام المسلمین کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

☆ دور حاضر میں عربوں نے ایک جماعت المسلمین بنا رکھی ہے۔ جن کا ایک کاغذی خلیفہ انگلینڈ میں پناہ لئے ہوئے ہے۔

☆ کراچی میں بھی ایک جماعت المسلمین ہے، جسے مسعود احمد بی ایس سی نے کاشت کیا، ان کا دعویٰ ہے کہ ہماری جماعت ہی امت مسلمہ ہے باقی جماعتیں امت مسلمہ سے خارج ہیں۔

☆ اس جماعت المسلمین سے ایک المسلمین نامی جماعت پیدا ہوئی ہے۔ اس کے پیروکار رفع عیسیٰ اور حیات عیسیٰ علیہ السلام کے منکر ہیں۔

☆ ایک جماعت المسلمین لوگوں سے خفیہ بیعت لیتی ہے، انہوں نے بڑی تگ و دو کے بعد ایک قریشی خلیفہ دریافت کیا ہے۔ جو بنگلہ دیش میں روپوش ہے۔

☆ کراچی میں ایک ہی جماعت المسلمین ردعمل کے طور پر معرض وجود میں آئی ہے۔ اس کے بانی ہمارے محترم جناب مولانا ابو جابر عبداللہ دامانوی ہیں اور وہ اسے حقیقی جماعت المسلمین قرار دیتے ہیں۔ دراصل اس ہنگامہ خیزی کے دور میں جماعت سازی کا فتنہ عروج پر ہے جو زبان آور یا قلم کار ہے۔ وہ سب سے پہلے جماعت سازی کے متعلق سوچتا ہے۔ اس قماش کے لوگ خدمت ملت یا خدمت اسلام کا نعرہ لے کر اٹھتے ہیں۔ جب انہیں عوام میں کچھ پذیرائی ہوتی ہے تو جسد اسلام سے ایک لوتھڑا الگ کر کے اپنی ایک الگ دکان سجا لیتے ہیں پھر جو شخص اس دکان سے سودا نہ خریدے ان کے ہاں اس کا ایمان مشکوک قرار پاتا ہے۔ انہیں اپنے علاوہ کوئی دوسرا مسلمان دکھائی نہیں دیتا، چنانچہ ہم مسعود احمد بی ایس سی کی جماعت المسلمین کو دیکھتے ہیں جو ۱۳۹۵ ہجری میں حکومت پاکستان کے ہاں رجسٹرڈ ہوئی اور اسے خوب عروج حاصل ہوا۔ یہ تکفیری گروہ اہل حدیث حضرات کو اپنا مد مقابل خیال کرتا ہے۔ اہل حدیث جماعت سے ان کی دشمنی کا ایک واقعہ ہدیہ قارئین ہے۔

ڈاکٹر سید شفیق الرحمٰن زیدی کسی زمانے میں مسعود احمد بی ایس سی کی جماعت المسلمین میں شامل تھے۔ بہاولپور میں قیام کے دوران حافظ عبداللہ مرحوم بہاولپوری کی اقتدا میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ ان کے پیر و مرشد نے انہیں بایں الفاظ ہدایت نامہ جاری کیا۔

آپ ابھی تک جماعت کے شدید ترین دشمن کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں، آپ نے ایک فرقہ پرست کو امام بنا رکھا ہے، آپ نے ایک فرقہ پرست کو چھوڑنے کے بجائے اس کو ایک بڑا اعزاز دے رکھا ہے، لہٰذا پہلے آپ ان سے دینی تعلقات منقطع کریں۔ ان کے پیچھے نماز پڑھنا چھوڑیں، پھر اپنے سوالات بھیجیں۔ جماعت المسلمین کے تمام ارکان کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ کسی فرقے سے تعلق رکھنے والے شخص کے پیچھے نماز نہ پڑھیں۔ اس کے پیچھے نماز پڑھنا اپنی حقانیت پر خود ضرب لگانا ہے اور اپنے وجود کو ختم کرنا ہے۔ [مراسلہ بنام شفیق الرحمٰن، بحوالہ تحقیق مزید بسلسلہ جماعت المسلمین، ص:۹۹]

ان کے عقائد کی جھلک درج ذیل ہے:

☆ جو شخص مسعود احمد کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرتا وہ غیر مسلم ہے۔

☆ غیر مسعودی کی اقتدا میں نماز پڑھنا جائز نہیں۔

☆ غیر مسعودی کی نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں اور نہ ہی ان کے معصوم بچوں کے جنازہ میں شریک ہونا جائز ہے۔

☆ غیر مسعودی کو لڑکی دینا یا ان سے لڑکی لینا جائز نہیں۔

☆ مسعودی اپنے معاہدہ نکاح میں یہ شرط شامل کرتے ہیں کہ جماعت چھوڑنے کی صورت میں ہماری لڑکی کو طلاق دو گے۔

☆ جماعت المسلمین کو چھوڑنے والا مرتد اور خارج از اسلام ہے۔

☆ غیر مسعودی کی اقتدا میں حج کرنا جائز نہیں ہے۔

خوارج کی طرح ان کا رویہ انتہائی سخت اور خشونت بھرا ہوتا ہے، ان کے عقائد ونظریات بڑی حد تک روافض وقادیانیوں سے یکسانیت رکھتے ہیں۔ ان حضرات نے امت مسلمہ کی تکفیر کر کے سیاسی اقتدار کے حصول کے بغیر ''جماعت المسلمین'' کے نام سے ایک خود ساختہ نظام حکومت قائم کرنے کا نظریہ بھی خوارج سے مستعار لیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا تھا کہ جو آیات کفار ومنافقین کے متعلق نازل ہوئی ہیں۔ یہ لوگ انہیں مسلمانوں پر چسپاں کر کے قلبی سکون حاصل کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا ہے کہ ''ان کے ساتھ مت بیٹھو تا آنکہ وہ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں۔ بصورت دیگر تم بھی اس وقت انہی جیسے ہو جاؤ گے۔'' [۴/النسآء:۱۴۰]

سوال غنیۃ الطالبین میں شعبان کی پندرہویں رات، یعنی شب براءت کے متعلق لکھا ہے کہ اس رات آیندہ سال کی پیدائش واموات لکھی جاتی ہیں اور اس میں رزق تقسیم ہوتا ہے، ہر سال ایسا ہوتا ہے، جبکہ ہر انسان کی قسمت کا فیصلہ، یعنی موت وحیات اور رزق وغیرہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے پہلے طے کر رکھا ہے۔ وضاحت فرمائیں اس کے علاوہ اس رات سو رکعت پڑھنے کے متعلق بھی لکھا ہے کہ ہر رکعات میں دس دس مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھی جائے۔ اسے ''صلوٰۃ خیر'' کہتے ہیں۔ اس کا اہتمام کرنے سے برکت پھیلتی ہے۔ مزید فرمایا کہ ہمارے اسلاف اس نماز کو جماعت کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اس کی فضیلت بیان کی گئی ہے کہ اس نماز کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ستر بار نظر رحمت سے دیکھتا ہے اور ہر بار دیکھنے سے انسان کی ستر حاجتیں پوری ہو جاتی ہیں اس کے متعلق تفصیل سے لکھیں؟

جواب قرآن کریم میں ہے کہ ''ہم نے اس قرآن کو لیلۂ مبارکہ میں، یعنی خیر وبرکت والی رات میں نازل کیا ہے، کیونکہ ہمیں اس سے ڈرانا مقصود تھا اس رات ہمارے حکم سے ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔'' [۴۴/الدخان:۳،۴]

اسی رات کو دوسرے مقام میں لیلۃ القدر کہا گیا ہے کہ اس رات کو بڑے اہم امور کے فیصلے کئے جاتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اس رات ملائکہ اور جبرائیل عَلَیْہِ السَّلَام اپنے پروردگار کے اذن سے ہر طرح کا حکم لے کر اترتے ہیں۔'' [۹۷/القدر:۴]

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس رات اللہ تعالیٰ افراد واقوام کی قسمتوں کے فیصلے انہیں نافذ کرنے کے لیے اپنے فرشتوں کے حوالے کر دیتا

ہے، پھر وہ سال بھر اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق عمل درآمد کرتے رہتے ہیں۔ حدیث میں اس رات کے متعلق صراحت ہے کہ ماہ رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں آتی ہے، مگر بعض ناقابل حجت روایات کی بنا پر انہیں دو الگ الگ راتیں قرار دیا گیا ہے۔ لیلۃ القدر سے مراد رمضان المبارک کے آخری عشرہ والی رات اور لیلۃ المبارکہ کو ماہ شعبان کی پندرہویں رات مراد لی گئی ہے۔ جس کا نام شب براءت ہے، پھر ستم یہ ہے کہ جس قدر فضائل ومناقب لیلۃ القدر کے متعلق احادیث میں وارد ہیں، ان تمام کو شب براءت کے کھاتے میں ڈال کر خوب رواج دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے ماہ شعبان کے متعلق یہ منقول ہے کہ آپ اس مہینے کے روزے بکثرت رکھتے تھے۔ باقی اس رات آئندہ سال کی پیدائش واموات لکھی جانے والی بات سرے سے غلط ہے، اگرچہ تفسیر ابن کثیر میں حضرت مغیرہ بن اخنس سے بیان ہے کہ اس رات شعبان سے شعبان تک لوگوں کی عمریں لکھی جاتی ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر:۴/ ۱۳۷]

لیکن اس کے متعلق آپ کا فیصلہ بھی مذکور ہے کہ یہ مرسل روایت صحیح نصوص کے خلاف ہے۔ بہرحال ہر انسان کی موت وحیات اور رزق وغیرہ کا فیصلہ لیلۃ القدر میں ہوتا ہے جو ماہ رمضان کے آخری عشرہ میں ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ فیصلے اللہ کی تقدیر میں پہلے سے طے شدہ ہوتے ہیں، تاہم اللہ تعالیٰ سال بھر کے فیصلے فرشتوں کے حوالے کر دیتا ہے تاکہ وہ انہیں اہل دنیا پر نافذ کریں۔ واضح رہے کہ اہل علم نے تقدیر کی چار اقسام بیان کی ہیں:

① تقدیر ازلی: اس سے مراد اللہ کی وہ تقدیر ہے جو زمین وآسمان کی پیدائش سے پہلے تحریر کی گئی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''کوئی مصیبت ملک پر یا خود تم پر نہیں آتی مگر اس سے پہلے کہ ہم اسے پیدا کریں، وہ ایک خاص وقت میں لکھی ہوئی تھی۔'' [۵۷/ الحدید:۲۲]

② تقدیر عمری: یعنی عمر بھر کی تقدیر اس کی دو انواع ہیں:

(الف) عہد وپیان کے وقت لکھی گئی تقدیر جس کے متعلق قرآن کریم میں بیان ہے: ''جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے اقرار لیا کہ میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کیوں نہیں! ہم سب گواہ بنتے ہیں تاکہ تم لوگ قیامت کے دن یوں نہ کہو کہ ہم تو اس سے محض بے خبر تھے۔'' [۷/ الاعراف:۱۷۲]

(ب) شکم مادر میں تقدیر عمری کا بیان حدیث میں بیان ہے کہ ''قرار نطفہ کے چار ماہ بعد فرشتہ اس کی تقدیر کو لکھتا ہے۔'' قرآن کریم میں بیان ہے کہ ''وہ تمہیں خوب جانتا ہے جب اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے۔''

[۵۳/ النجم:۳۲]

③ تقدیر حولی: جس میں سال بھر کے فیصلے ہوتے ہیں۔ یہ کام لیلۃ القدر میں سرانجام پاتا ہے، جیسا کہ پہلے اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

④ تقدیر یومی: ہر روز اس کے تازہ فیصلوں کا نفاذ، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وہ ہر روز کام میں مصروف رہتا ہے۔'' (۵۵/ الرحمٰن:۲۹)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر روز کسی کو بیمار کر رہا ہے تو کسی کو شفایاب کر رہا ہے کسی کو مالدار بنا رہا تو کسی مالدار کو فقیر کر رہا ہے کسی کو گدا سے شاہ اور شاہ سے گدا الغرض کائنات میں یہ سارے تصرف اس کے امر اور اس کی مشیئت سے ہو رہے ہیں۔ کائنات میں کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی کارگزاری سے خالی ہو۔

ماہ شعبان کی پندرہویں رات کے متعلق جو صلوٰۃ خیر بیان کی جاتی ہے، اس کے متعلق ملا علی قاری لکھتے ہیں: شب براءت میں سو رکعت اور ہزار رکعت نماز باجماعت یا انفرادی طور پر اس کا ثبوت کسی بھی صحیح حدیث میں نہیں ہے۔ ان کے متعلق امام ذہبی اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب موضوع اور خود ساختہ ہے [تحفۃ الاحوذی:۲/۵۳]

بہرحال اس کے متعلق غنیۃ الطالبین کے حوالے سے جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کا ثبوت صحیح احادیث میں نہیں ملتا۔ [واللہ اعلم]

سوال میں پیدائشی طور پر ایک ہیجڑا ہوں۔ میری شکل وصورت، چال ڈھال اور جسمانی ساخت وپرواخت انتہائی طور پر لڑکیوں سے مشابہہ ہے میرا نام لڑکیوں والا اور لباس بھی لڑکیوں والا پہنتا ہوں۔ میرے سر کے بال لڑکیوں کی طرح لمبے اور خوبصورت ہیں۔ ایک آواز ہے جو لڑکیوں سے قدرے بھاری ہے۔ مجھے دیکھنے والا لڑکی ہی خیال کرتا ہے۔ میرے ساتھ یہ حادثہ ہوا کہ میرا گرو عدالتی کارروائی کے ذریعے مجھے میرے والدین سے چھین کرلے آیا تھا۔ میں بچپن سے اب تک گرو کی صحبت میں اور اسی کی زیر تربیت رہا ہوں، اس لئے ناچ گانے کا پیشہ اپنانا ایک فطرتی بات تھی، تاہم میں شروع ہی سے اس کاربد کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، اب جبکہ میرا گرو مرچکا ہے اور میں آزاد ہوں۔ میری عمر تیس بتیس سال کے قریب ہے، لیکن میں اپنے گرو کے مکان میں دوسرے ہیجڑے ساتھیوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ مجھے اس پیشہ سے جنون کی حد تک نفرت ہوچکی ہے، میں نے عزم کرلیا ہے کہ میں اس پیشہ اور ہیجڑوں سے کنارہ کش ہوجاؤں اور اپنی توبہ کا آغاز حج بیت اللہ کی سعادت سے کرنا چاہتا ہوں۔ میری الجھن یہ ہے کہ میں مردوں کی طرح حج کروں یا عورتوں کی طرح۔ کتاب وسنت کے مطابق میری الجھن حل کریں مجھے اس بات کا علم ہے کہ اگر میں مردوں کی طرح حج کروں تو مجھے احرام باندھنا ہوگا اور مجھے بدن کا کچھ حصہ ننگا رکھنا ہوگا، اس کے علاوہ سر کے بال بھی منڈوانا ہوں گے، لیکن سچی بات ہے کہ میرے لئے یہ امر بہت مشکل ہوگا۔ جس سے مجھے خوف آتا ہے بلکہ تصور کرکے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ جبکہ عورتوں کی طرح حج کرنے میں مجھے آسانی ہی آسانی ہے، کیونکہ میں نے اب تک عمر کا تمام حصہ عورتوں کی طرح گزارا ہے اور جنسی طور پر مردانہ خواہش کبھی بھی میرے دل میں نہیں ابھری، بعض علما سے دریافت کرنے سے الجھن کا شکار ہوچکا ہوں کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں، مجھے کسی نے کہا ہے کہ اگر تم مسئلہ کا صحیح حل چاہتے ہو تو کسی وہابی عالم کی طرف رجوع کرو، اس لئے میں نے آپ کی طرف رجوع کیا ہے۔ مجھے جلدی اس کا جواب دیا جائے؟

جواب اس قدر طویل سوال کے باوجود بعض امور دریافت طلب ہیں، تاہم جواب پیش خدمت ہے۔ اس سلسلہ میں چند باتیں ملاحظہ کریں:

اولاً: گرو کا والدین سے عدالتی کارروائی کے ذریعے چھین کرلے آنا انتہائی محل نظر ہے، کیونکہ ایسا کوئی قانون نہیں ہے جس کا سہارا لے کر عدالتی کارروائی کے ذریعے اس ''مخلوق'' کو اس کے والدین سے زبردستی چھینا جھپٹی کی جاسکے۔ یقیناً اس میں والدین کی مرضی شامل ہوگی، جس کے متعلق وہ جوابدہ ہوں گے۔ ایسے متعدد واقعات ہمارے مشاہدے میں ہیں کہ اس جنس کے گرو حضرات والدین سے انہیں لینے آئے، لیکن والدین نے انکار کردیا اور انہیں دینی مدرسہ میں داخل کرایا۔ دینی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ وہ گانے بجانے کا دھندا کرنے کے بجائے دین اسلام کی تبلیغ واشاعت کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

ثانیاً: اس کام سے صرف نفرت ہی کافی نہیں ہوگی، بلکہ فریضہ حج کا انتظار کیے بغیر فوراً اس سے توبہ کی جائے۔ اپنے ساتھیوں سے الگ ہو جانا چاہیے، کیونکہ موت کا کوئی پتہ نہیں کب آ جائے، اخروی نجات کے لئے برے کام سے صرف نفرت ہی کافی نہیں، بلکہ اسے اللہ کی بارگاہ میں ندامت کے آنسو بہاتے ہوئے چھوڑ دینا ضروری ہے۔ پھر نیک اعمال نماز، روزہ وغیرہ سے اس کی تلافی کرنا بھی لازمی ہے۔ اس بنا پر سائل کو ہماری نصیحت ہے کہ وہ فوراً اس کام سے باز آ جائے اور اپنے ہم پیشہ ساتھیوں سے کنارہ کش ہو کر اخروی نجات کی فکر کرے۔

ثالثاً: رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں یہ جنس موجود تھی، بعض کے نام بھی ملتے تھے کہ وہ معیت، نافع، ابو ماریہ الجنۃ اور مابور جیسے ناموں سے پکارے جاتے تھے۔ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شرائع اسلام ادا کرتے تھے۔ نمازیں پڑھتے، جہاد میں شریک ہوتے اور دیگر امور خیر بھی بجالاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ ان کے متعلق پہلے یہ خیال کرتے تھے کہ یہ بے ضرر مخلوق ہے۔ آدمی ہونے کے باوجود انہیں عورتوں کے معاملات میں چنداں دلچسپی نہیں ہے۔ اس لئے آپ ازواج مطہرات کے پاس آنے جانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے تھے، لیکن جب آپ کو پتہ چلا کہ انہیں عورتوں کے معاملات میں خاصی دلچسپی ہی نہیں بلکہ یہ لوگ نسوانی معلومات بھی رکھتے ہیں، تو آپ نے انہیں ازواج مطہرات اور دیگر مسلمان خواتین کے ہاں آنے جانے سے منع فرما دیا، بلکہ انہیں مدینہ بدر کر کے روضہ خاخ، حمراء الاسد اور نقیع کی طرف آبادی سے دور بھیج دیا، تاکہ دوسرے لوگ ان کے برے اثرات سے محفوظ رہیں۔ [صحیح بخاری، المغازی: ۴۳۲۴]

رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو حکم دیا کہ انہیں بے ضرر خیال کر کے اپنے پاس نہ آنے دیں، بلکہ انہیں گھروں میں داخل ہونے سے روکیں۔ [صحیح بخاری، النکاح: ۵۲۳۵]

رابعاً: واضح رہے کہ مخنث بنیادی طور پر مرد ہوتا ہے، لیکن مردمی قوت سے محروم ہونے کی وجہ سے عورتوں جیسی چال ڈھال اور ادا و گفتار اختیار کیے ہوتا ہے۔ یہ عادات اگر پیدائشی ہیں تو انہیں چھوڑنا ہوگا، اگر پیدائشی نہیں بلکہ تکلف کے ساتھ انہیں اختیار کیا گیا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے اس اختیار پر لعنت فرمائی ہے کہ ''وہ مرد جو عورتوں جیسی چال ڈھال اور وہ عورتیں جو مردوں جیسی وضع قطع اختیار کریں اللہ کے ہاں ملعون ہیں۔'' [صحیح بخاری، اللباس: ۵۸۸۷]

رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک ایسا مخنث لایا گیا جس نے عورتوں کی طرح اپنے ہاتھ پاؤں مہندی سے رنگے ہوئے تھے۔ آپ سے عرض کیا گیا کہ یہ از خود عورتوں جیسی چال ڈھال پسند کرتا ہے تو آپ نے اسے مدینہ بدر کر کے علاقہ نقیع میں بھیج دیا، جہاں سرکاری اونٹوں کی چراگاہ تھی۔ آپ سے کہا گیا اسے قتل کر دیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ ''مجھے نمازیوں کو قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے۔'' [ابوداؤد، الادب: ۴۹۲۸]

البتہ خنثیٰ اس سے مختلف ہوتا ہے، کیونکہ فقہا کے ہاں اس کی تعریف یہ ہے کہ ''جو مردانہ اور زنانہ آلات جنسی رکھتا ہو یا دونوں سے محروم ہو۔'' [المغنی لابن قدامہ، ص: ۱۰۸، ج ۹]

بلوغ سے پہلے اس کے لڑکے یا لڑکی ہونے کی پہچان اس کے پیشاب کرنے سے ہو سکتی ہے اور بلوغ کے بعد اس کی داڑھی

یا چھاتی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ بہر صورت وہ شرعی احکام کا پابند ہے، اگر مرد ہے تو مردوں جیسے اور اگر عورت ہے تو عورتوں کے احکام پر عمل کیا جائے۔

خامساً: صورت مسئولہ میں جس طرح تفصیل بیان کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سائل لڑکی ہے اور اس پر عورتوں جیسے احکام لاگو ہوں گے، لیکن حقیقت حال وہ خود ہی بہتر جانتا ہے کہ اگر وہ مرد ہے اور عورتوں جیسی شکل وصورت اختیار کی ہے جو اس کے گرو کی صحبت اور تربیت کا نتیجہ ہے تو اسے اس شکل وصورت کو یکسر ختم کرنا ہوگا، کیونکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اس طرح عورتوں کا روپ دھارنے والے پر لعنت فرمائی ہے اور اگر وہ حقیقت میں عورت ہی ہے، نیز گرو کی مجلس نے اس کی نسوانیت کو دو آتشہ کر دیا ہے تب بھی اسے یہ کام ختم کرنا ہوں گے اور مسلمان عورتوں کی طرح چادر اور چاردیواری کا تحفظ کرنا ہوگا، تاہم احتیاط کا تقاضا ہے کہ حج کے لئے عورتوں جیسا احرام اختیار کرے، یعنی عام لباس پہنے، اپنے چہرے کو کھلا رکھے، تاہم اگر کوئی اجنبی سامنے آ جائے تو گھونگھٹ نکالے، جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان کتب حدیث میں مروی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حالت احرام میں ہوتیں اور قافلے ہمارے پاس سے گزرتے جب وہ ہمارے سامنے آ جاتے تو ہم اپنی چادریں اپنے چہروں پر لٹکا لیتیں اور جب وہ گزر جاتے تو ہم انہیں اٹھا دیتیں۔ [ابوداود، المناسک: ۱۸۳۳]

اس کے علاوہ محرم کی بھی پابندی ہے کہ وہ اپنے کسی محرم کے ساتھ یہ مبارک سفر کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو اس کی بیوی کے ساتھ سفر حج پر روانہ کیا تھا جبکہ وہ جہاد میں اپنا نام لکھوا چکا تھا، اس لئے سائل کو حج پر جانے کے لئے اپنے کسی محرم کا انتخاب بھی کرنا ضروری ہے، اگر اسے اپنے کسی محرم کا پتہ نہیں ہے، جیسا کہ سوال میں بیان کردہ صورت حال سے واضح ہوتا ہے تو اسے چاہیے کہ چند ایسی عورتوں کی رفاقت اختیار کرے، جن کے محرم ان کے ساتھ ہوں، اسے اکیلی عورتوں یا اکیلے مردوں کے ساتھ سفر کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ادارہ ''اہل حدیث'' کی معرفت کالج کی ایک طالبہ کا خط موصول ہوا ہے جس میں اپنے دینی جذبات کا بایں الفاظ اظہار کیا گیا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے کا بہت شوق ہے لیکن صنف نازک ہونے کی وجہ سے اس سعادت کو حاصل نہیں کر سکتی، نیز میرے والد گرامی جہاں میرا رشتہ کرنا چاہتے ہیں وہاں دینی لحاظ سے مطمئن نہیں ہوں، اس ذہنی الجھن سے نجات حاصل کرنے کے لئے مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کتاب وسنت کی روشنی میں میری راہنمائی فرمائیں؟

جواب اللہ کی راہ میں اپنی جان قربان کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا اعزاز ہے، بلکہ شہادت کی تمنا کرنا ایمان کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اس سعادت کو حاصل کرنے کے لئے بایں الفاظ اپنی خواہش کا اظہار فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں چاہتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں قتل ہو جاؤں، پھر مجھے زندگی مل جائے، پھر اللہ کی راہ میں کٹ جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں، پھر مجھے زندگی دی جائے، پھر اللہ کے راستہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کروں۔'' [صحیح بخاری، الجہاد: ۲۷۹۷]

عورتوں کے لئے جہاد میں شرکت کے لئے کئی ایک مواقع ہیں، لیکن ان کا شریک ہونا ضروری نہیں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

نے رسول اللہ ﷺ سے جہاد میں شرکت کی اجازت طلب کی تو آپ نے فرمایا کہ ''تمہارا جہاد بیت اللہ کا حج کرنا ہے۔''

[صحیح بخاری، الجہاد: ۲۸۷۵]

اللہ کے دین میں عورتوں کے اس جہاد ''حج بیت اللہ'' کی اس قدر اہمیت ہے کہ ایک آدمی جس نے غزوہ میں شرکت کے لئے نام لکھوار کھا تھا، اسے واپس کر دیا گیا کیونکہ اس کی عورت حج کرنا چاہتی تھی۔ [صحیح بخاری، الحج: ۱۸۶۲]

اس پر فتن دور میں عورتوں کو چاہیے کہ گھر میں چار دیواری میں رہتے ہوئے، فرائض وواجبات کی پابندی کریں۔ چادر اور چار دیواری کا تحفظ ہی ان کے لئے جنت کی ضمانت ہے۔ کتب احادیث میں شہادت کی کئی ایک صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ اگر نیت خالص، ایمان کامل اور یقین صادق ہے تو اللہ تعالیٰ شہادت کا شوق رکھنے والی عورتوں کو اس سعادت سے محروم نہیں کرے گا۔ اب ہم سوال میں پیش کردہ ذہنی الجھن کا حل پیش کرتے ہیں۔

رشتۂ ازدواج دنیا کا بہت حساس اور انتہائی قیمتی بندھن ہے، اس لئے اس کے ہر نازک پہلو پر سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر کر کے سرانجام دینا چاہیے۔ اسے عام حالات میں ایک بار ہی ادا کیا جاتا ہے۔ بجلی کے بلب کی طرح نہیں ہے، کہ جب جی چاہے اتار کر دوسرا لگا دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سلسلہ میں جو راہنما اصول متعین فرمائے ہیں، اگر انہیں پیش نظر رکھا جائے تو کبھی ناکامی اور خسارے کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ ہمارے ہاں عام طور پر نکاح کے لئے مال ومتاع، حسن وجمال، حسب ونسب کو دیکھا جاتا ہے، جبکہ شریعت کی نظر میں یہ چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس سلسلہ میں اولیت اور ترجیح دین واخلاق کو حاصل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''نکاح کے لئے عورت کی چار چیزوں کو دیکھا جاتا ہے، یعنی اس کا مال، خوبصورتی، خاندانی حسب ونسب اور اسلامی اقدار وغیرہ مسلمان کو چاہیے کہ وہ دین داری کو ترجیح دے کر کامیابی حاصل کرے۔'' [صحیح بخاری، النکاح: ۵۰۹۰]

جو لوگ دین کو نظر انداز کر کے دیگر معیار زندگی دیکھتے ہیں، وہ جلد ہی اس کے بھیانک انجام سے دوچار ہو جاتے ہیں کیونکہ ''بلند معیار'' کی تلاش میں بیٹوں کو اپنے گھر کی دہلیز پر بوڑھا کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد فتنہ وفساد کے علاوہ کیا مل سکتا ہے؟ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''جب تمہارے پاس دین واخلاق کا حامل رشتہ آئے تو نکاح کر دو، بصورت دیگر فتنہ اور بہت بڑا فساد ہوگا۔''

[ترمذی، النکاح: ۱۰۸۵]

نکاح کے سلسلہ میں نہ تو والد کو کلی اختیارات ہیں کہ وہ جہاں چاہے اپنی بیٹی کو اعتماد میں لئے بغیر اس کا نکاح کر دے اور نہ ہی عورت مطلق العنان ہے، کہ وہ اپنی مرضی سے جس سے چاہے نکاح کر لے بلکہ جہاں سرپرست کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ اس کے بغیر نکاح نہیں ہوتا، وہاں اسے پابند بھی کیا گیا ہے کہ نکاح سے پہلے وہ بیٹی یا بہن کو اعتماد میں لے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جو امیر المومنین فی الحدیث ہیں اور ان کی مصالح عباد پر بڑی گہری نظر ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ استدلال میں نصوص کا پہلو بھی انتہائی مضبوط رکھتے ہیں۔ نکاح کے سلسلہ میں انہوں نے بہت متوازن راہنمائی کی ہے۔ وہ سوال میں ذکر کردہ ذہنی الجھن کے حل کے لئے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کرتے ہیں ''جس شخص کا یہ موقف ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ نکاح کے سلسلہ

میں ولی سرپرست کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، پھر ایک دوسرا عنوان قائم کرتے ہیں کہ ''کوئی باپ یا کوئی دوسرا رشتہ دار کسی کنواری یا شوہر دیدہ کا نکاح اس کی رضا کے بغیر نہ کرے۔'' ان ابواب کا تقاضا ہے کہ نہ تو کھلی آزادی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے شادی رچا لے اور نہ ہی وہ اس قدر مقہور و مجبور ہے کہ اس کا سرپرست جہاں چاہے جس سے چاہے اس کا عقد کر دے بلکہ امام بخاری رحمہ اللہ اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ایک تیسرا عنوان بیان کرتے ہیں ''اگر کسی نے اپنی بیٹی یا بہن کی مرضی کے بغیر نکاح کر دیا تو یہ نکاح مردود ہے۔''

درحقیقت شریعت اعتدال کو قائم رکھنا چاہتی ہے نہ تو سرپرست کو اتنے وسیع اختیارات حاصل ہیں کہ وہ اپنی بیٹی یا بہن کی مرضی کے بغیر جہاں چاہے جس سے چاہے نکاح کر دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک نکاح ایسا ہوا تو آپ نے بچی کی صوابدید پر موقوف رکھا کہ اگر وہ چاہے تو اسے مسترد کر دے۔ [صحیح بخاری، النکاح: ۵۱۳۸]

اور نہ ہی عورت کو اس قدر کھلی آزادی دی گئی ہے کہ وہ خود سرپرست کی اجازت کے بغیر نکاح کر کے اپنے خاندان کی عزت و آبرو کو خاک میں ملا دے۔ ہاں اگر باپ یا دوسرے سرپرست کے متعلق باوثوق ذرائع سے پتہ چل جائے کہ وہ اپنے زیر سرپرست کے لئے مہر و وفا کے جذبات سے عاری ہے یا وہ دینی و دنیوی مفادات کا محافظ نہیں ہے تو وہ خود بخود حق ولایت سے محروم ہو جاتا ہے۔ حدیث میں اس کی وضاحت موجود ہے، چنانچہ بعض روایات میں ولی مرشد کے الفاظ ملتے ہیں۔ [بیہقی، ص: ۱۲۴، ج ۷]

اس صورت میں حق ولایت خود بخود دوسرے قریبی رشتہ دار کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اگر تمام سرپرست کسی غلط جگہ پر نکاح کرنے کے لئے اتفاق کر لیں (اگرچہ ایسا بہت کم ہوتا ہے) تو گاؤں یا شہر کے سرکردہ اور شریف الطبع لوگوں کی سرپرستی میں نکاح کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ صورت بھی ناممکن ہو تو بالآخر عدالتی چارہ جوئی میں کوئی قباحت نہیں۔ اگر عدالت دیانتداری کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچے کہ تمام سرپرست نکاح کے لئے کسی غلط کار کا انتخاب کئے ہوئے ہیں تو جج کی سرپرستی میں نکاح کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر باپ یا کوئی دوسرا سرپرست صحیح جگہ پر نکاح کرنا چاہتا ہے لیکن وہاں لڑکی آمادہ نہیں یا اپنی کسی غلط کاری کی وجہ سے کسی ایسی جگہ رشتہ کرنا چاہتی ہے جو خاندان کے لئے باعث ننگ و عار ہے یا اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ کر عدالتی چھتری کے نیچے نکاح کر لیتی ہے تو ایسے حالات میں عدالتی نکاح صحیح نہیں ہوگا۔ اس سلسلہ میں ہمارا عزیزہ کو یہی مشورہ ہے کہ وہ چادر اور چار دیواری کا تحفظ کرتے ہوئے اپنے والد کو کتاب و سنت کے دلائل سے آمادہ کرے کہ نکاح کے متعلق دینی و اخلاقی اقدار کو اولیت حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں از خود کسی رشتہ کی نشاندہی کرنے کے بجائے یہ انتخاب والدین کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے بھی مضبوط تعلق قائم کیا جائے اور دعا کرتی رہے کہ وہ اسے دینی لحاظ سے بہترین رفیق حیات عطا فرمائے۔ [واللہ اعلم]

سوال

☆ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موت کی خبر سنانے سے منع کرتے تھے کیا فوتگی کا اعلان کرنا درست ہے؟

☆ اگر عورت کے چہرے پر مونچھیں اگ آئیں تو کیا انہیں صاف کیا جا سکتا ہے؟

☆ کیا بچوں یا بڑوں کو برہنہ دیکھنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

☆ عشاء کی نماز کے بعد دو نفل ادا کیے جا سکتے ہیں؟

☆ اگر زکوۃ کی مدت رمضان المبارک سے پہلے پوری ہو جائے تو کیا اسے رمضان المبارک میں ادا کرنے کے لئے روکا جا سکتا ہے تاکہ ثواب زیادہ ہو؟

☆ سوال درج کرنے سے حیا مانع ہے؟

جواب جوابات بالترتیب درج ذیل ہیں:

☆ دور جاہلیت میں رواج تھا کہ جب کوئی مرجاتا تو اس کے فضائل و مناقب بیان کرتے ہوئے گلی کوچوں میں ڈھنڈورا پیٹا جاتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس قسم کے اعلانات سے منع فرمایا ہے۔ [مسند امام احمد، ص: ۴۰۶، ج ۵]

البتہ مسجد میں سادگی کے ساتھ فوتگی کی اطلاع اور نماز جنازہ کا اعلان کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حبشہ کے سربراہ حضرت نجاشی کے فوت ہونے کی اطلاع اور اس کے جنازہ کا اعلان فرمایا تھا۔ [مسند امام احمد، ص: ۲۴۱، ج ۲]

☆ مرد و زن کے بال تین طرح کے ہوتے ہیں:

① جن کے زائل کرنے سے شریعت نے منع فرمایا ہے، مثلاً: مرد کی داڑھی اور مرد و زن کے ابروؤں کے بال، انہیں زائل کرنا حرام اور ناجائز ہے۔

② جن کا زائل کرنا شریعت میں مطلوب و پسندیدہ ہے، مثلاً: مرد و زن کے موئے بغل و زیر ناف اور مرد کی مونچھیں وغیرہ شریعت نے حکم دیا ہے کہ انہیں زائل کیا جائے۔

③ جن کے زائل یا باقی رکھنے کے متعلق شریعت نے سکوت اختیار فرمایا ہے، مثلاً: عورت کی داڑھی اور اس کی مونچھیں وغیرہ ان بالوں کے متعلق شریعت نے کوئی حکم نہیں دیا ہے، بلکہ انسان کے اپنے اختیار پر موقوف رکھا ہے، ایسی چیزوں کے متعلق شریعت کا قاعدہ ہے کہ وہ قابل معافی ہیں۔ ان کا عمل میں لانا، نہ لانا دونوں برابر ہیں۔ [ابوداود، الاطعمہ: ۳۸۰۰]

اب ان کے متعلق وجہ ترجیح تلاش کرنا ہوگی وہ یہ ہے کہ عورت کی داڑھی اور مونچھوں کے بال اس کے قدرتی نسوانی حسن میں باعث رکاوٹ ہیں، پھر عورت کی خلقت اور جبلت کے بھی خلاف ہیں۔ لہٰذا ان زائد بالوں کا زائل کرنا ہی شریعت میں مطلوب ہے۔ [واللہ اعلم]

☆ شریعت نے نواقض وضو کی تعیین کر دی ہے کسی کو برہنہ دیکھنا نواقض وضو سے نہیں ہے۔ شرمگاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، اس لئے جو خواتین مدت رضاعت کے بعد بچوں کو نہلاتی ہیں اگر صابن وغیرہ استعمال کرتے وقت ان کا ہاتھ شرمگاہ کو لگ جائے تو انہیں نماز کے لئے نیا وضو کرنا ہوگا۔

☆ عشاء کی نماز کے بعد دو سنت پڑھنے کا احادیث میں ذکر آیا ہے۔ دو نفل ادا کرنے کی صراحت کسی حدیث میں بیان نہیں ہے، ہاں، وتر کے بعد دو رکعات ادا کرنے کا حکم اور رسول اللہ ﷺ کا عمل مبارک ملتا ہے۔ وہ بھی ہمیں کھڑے ہو کر ادا کرنے چاہیں، انہیں بیٹھ کر ادا کرنا سنت نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا انہیں بیٹھ کر ادا کرنا آپ کا خاصہ ہے۔ اس کی تفصیل گزشتہ کسی فتویٰ میں

دیکھی جاسکتی ہے۔

☆ اگر مال، نصاب زکوٰۃ کو پہنچ جائے اور وہ ضروریات سے فاضل ہو اور اس پر سال گزر جائے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہے۔ اگر کوئی زکوٰۃ کا مستحق ضرورت مند ہے تو فوراً ادا کرنا چاہیے۔ امید ہے کہ ثواب میں کمی نہیں آئے گی۔ ہاں، اگر کوئی ضرورت مند وقتی طور پر سامنے نہیں ہے تو ثواب میں اضافہ کے پیش نظر اسے رمضان تک مؤخر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، تاہم بہتر ہے کہ جب بھی زکوٰۃ واجب ہو تو فوراً اس سے عہدہ برآ ہو جائے کیونکہ زندگی اور موت کے متعلق کسی کو علم نہیں ہے وہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ اگر زکوٰۃ دیئے بغیر اللہ کا پیغام اجل آ گیا تو اُخروی باز پرس کا اندیشہ ہے۔

☆ خاوند کو فطرت و شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی بیوی سے تمتع کرنے کی اجازت ہے۔ سوال میں ذکر کردہ صورت اگرچہ شریعت کے خلاف نہیں ہے، تاہم فطرت سے متصادم ضرور ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک شخص کی داڑھی اتنی طویل ہے کہ ناف کے نیچے تک ہے اور گھنی اتنی کہ رخسار بھی نظر نہیں آتے۔ ایسی صورت حال کے پیش نظر داڑھی کو رخساروں سے صاف کرنا اور ناف کے نیچے سے کاٹ دینا درست ہے؟

جواب داڑھی کے متعلق ہمارا موقف یہ ہے کہ اسے اپنی حالت پر رہنے دیا جائے اور اس کے ساتھ کسی طرف سے بھی چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے۔ کیونکہ

① اس کے متعلق امر نبوی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا امر وجوب کے لئے ہے اِلَّا یہ کہ قرینہ صارفہ ہو۔

② اس سے چھیڑ چھاڑ کرنا یہودی و نصاریٰ اور مشرکین و مجوس سے ہمنوائی ہے جبکہ ہمیں ان کی اس سلسلہ میں مخالفت کرنے کا حکم ہے۔

③ اس کی کانٹ چھانٹ تخلیق الٰہیہ میں تبدیلی کرنا ہے جس سے ہمیں منع کیا گیا ہے کیونکہ ایسا کرنا ایک شیطانی حربہ ہے۔ [۴/النسآء:۱۱۹]

④ داڑھی کا بڑھانا امور فطرت ہے، اس لئے داڑھی کو فطرتی حالت میں رہنے دیا جائے اور اس کے غیر فطرتی عمل کو نہ کیا جائے۔

⑤ ہمیں نسوانی مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے جبکہ داڑھی منڈوانے سے عورتوں سے مشابہت ہوتی ہے۔ اس سے محفوظ رہنے کا یہی طریقہ ہے کہ اسے اپنی حالت پر رہنے دیا جائے۔

⑥ خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے فرمان کے مطابق داڑھی منڈوانا ''مثلہ'' کے مترادف ہے اور اس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

⑦ داڑھی منڈوانا ایسا قبیح فعل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے مرتکب دو ایرانی باشندوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

صورت مسئولہ میں بعض اہل علم بایں طور پر نرم گوشہ رکھتے ہیں کہ

❶ داڑھی کے متعلق مندرجہ ذیل تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے امر نبوی منقول ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما [صحیح بخاری، اللباس:۵۸۹۲] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ [صحیح مسلم، الطہارۃ:۶۰۳]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما [مجمع الزوائد ص:۱۶۹، ج۵]

جبکہ یہ تینوں اکابر کے متعلق روایات میں ہے کہ بالعموم یا خاص مواقع پر ایک مشت سے زائد داڑھی اور رخساروں کے بال کٹوا دیتے تھے۔[حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما صحیح بخاری:۵۸۹۲ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ طبقات ابن سعد ص:۳۳۴، ج۴، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما مصنف ابن ابی شیبہ ص:۸۵، ج۴]

اگرچہ ہمارے نزدیک قابل عمل راوی کی روایت نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت ہے۔

2 امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے سوال ہوا کہ آدمی کی داڑھی بہت زیادہ طویل ہو جائے تو کیا کرے؟ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فتویٰ دیا کہ ایسی حالت میں اسے اعتدال پر لانے کے لئے کاٹا جا سکتا ہے۔ [باجی شرح مؤطا ص:۲۲۶، ج۷]

3 حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے امام طبری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اگر آدمی اپنی داڑھی کو اپنی حالت پر چھوڑ دے اور اس کا طول و عرض اس حد تک بڑھ جائے کہ لوگوں کے ہاں ''اضحوکہ روزگار'' بن جائے تو ایسی حالت میں اسے کاٹا جا سکتا ہے۔[فتح الباری ص:۴۳۰ ج۱۰]

4 حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق روایات میں ہے کہ ان کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس کی داڑھی حد سے بڑھی ہوئی تھی تو آپ رضی اللہ عنہ نے معقول حد کے نیچے سے اسے کاٹ دیا تھا۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے طبری کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ [واللہ اعلم]

اگر کوئی اس قسم کے دلائل سے مطمئن ہو تو مذکورہ شخص کے متعلق نرم گوشہ رکھنے میں چنداں حرج نہیں ہے۔ بصورت دیگر اسے استقامت کا مظاہرہ کرنا چاہیے تا کہ سنت کی حفاظت پر اللہ کے ہاں بے پایاں اجر و ثواب کی امید کی جا سکے۔ ہم نے ایسے بزرگ بھی دیکھے ہیں کہ دوران نماز جب رکوع کرتے تھے تو ان کی داڑھی زمین پر آ لگتی تھی۔ اب وہ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے ہاں کروٹ کروٹ رحمت سے نوازے۔ آمین

سوال قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے کس فرقہ پر کاربند رہنے کا حکم دیا ہے، جبکہ قرآن کریم میں تو فرقہ بندی سے منع کیا گیا ہے، نیز یہ بھی آگاہ فرمائیں کہ کس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے 73 فرقوں کا ذکر کیا ہے؟

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ہمارا نام مسلمان رکھا ہے اور ہمیں فرقہ بندی سے بھی سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو اہل حدیث کہلاتے ہیں۔ کیا اہل حدیث ایک فرقہ نہیں ہے؟

جواب قرآن پاک میں ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے کسی خاص فرقہ پر کاربند رہنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ اس سلسلہ میں ہدایت جاری کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ [۳/آل عمران:۱۰۳]

حبل اللہ، یعنی اللہ کی رسی سے مراد اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات و معمولات ہیں۔ جب تک امت ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رکھے گی، کبھی گمراہی سے دوچار نہیں ہوگی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، اگر تم نے انہیں مضبوطی سے تھامے رکھا تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں گمراہ نہیں کر سکے گی۔ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میرا طریقہ ہے۔'' [مستدرک حاکم، العلم:۳۱۹]

فرقہ سازی، فرقہ پروری اور فرقہ پرستی سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں منع فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور روشن دلائل آنے کے بعد آپس میں اختلاف کرنے لگے۔'' [۳/آل عمران:۱۰۵]

نیز فرمایا کہ ''جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور کئی فرقوں میں تقسیم ہو گئے، ان سے آپ کو کوئی سروکار نہیں، ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔'' [٦/الانعام:١٦٠]

آیت کریمہ میں ''لوگوں سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں جو نفسانی خواہشات اور حصول اقتدار کی بنا پر مختلف گروہوں میں بٹ گئے اور ایک دوسرے کو کافر کہنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہودی اکہتر (71) فرقوں میں اور نصاریٰ بہتر (72) گروہوں میں بٹ گئے۔ آخر کار میری امت تہتر (73) فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی جن میں ایک فرقہ کے علاوہ سب دوزخی ہوں گے۔'' عرض کیا گیا کہ وہ نجات یافتہ کون لوگ ہوں گے؟ آپ نے فرمایا کہ ''جو اس راستہ پر چلیں گے جس پر میں اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم گامزن ہیں۔'' [ترمذی، الایمان:٢٦٤١]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر گمراہ فرقے کی بنیاد کوئی اختراعی عقیدہ یا خود ساختہ عمل ہوتا ہے۔ لہٰذا مسلمان کو اس بات کی تحقیق کر لینی چاہیے کہ اس کا کوئی عقیدہ یا عمل ایسا تو نہیں ہے جو عہد رسالت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں پایا جاتا ہو۔ اگر کسی عقیدہ یا عمل کا ثبوت کتاب و سنت سے نہیں ملتا تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ گمراہی میں مبتلا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔'' [٤٢/الشوریٰ:١٣]

واضح رہے کہ لوگوں میں اختلاف اور تفرقہ، اس لئے نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں کوئی ابہام یا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی الجھن ہے۔ جس کی لوگوں کو پوری طرح سمجھ نہیں آتی بلکہ اس کی اصل وجہ اپنا اپنا جھنڈا اونچا کرنے کی خواہش یا مال و جاہ کی طلب ہوتی ہے، پھر اس کے بعد باہمی ضد اور ایک دوسرے کو زک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ وہ اسباب ہیں جو لوگوں کو دین کی کشادہ راہ اور سیدھے راستہ سے ہٹا کر مختلف پگڈنڈیوں پر ڈال دینے کا باعث ہوئے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''ان لوگوں میں فرقہ بندی اس وقت پیدا ہوئی جب وہ ضد بازی پر اتر آئے، حالانکہ اس سے پہلے ان کے پاس علم وحی آ چکا تھا۔'' [٤٢/الشوریٰ:١٤]

الحمد للہ! جماعت اہل حدیث کے منہج اور طرز عمل میں فکر و عقیدہ اور عمل و کردار کے اعتبار سے کوئی کجی نہیں ہے، کیونکہ یہ لوگ اس دین کو تھامے ہوتے ہیں، جن پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عمل پیرا تھے ان کی شناختی علامت یہ ہے:

اصل دین آمد کلام اللہ معظم داشتن   پس حدیث مصطفی برجان مسلم داشتن

جماعت اہل حدیث کے عقیدہ و عمل کو درج ذیل حدیث کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ اللہ کے احکام کو قائم رکھے گا۔ ان کی تکذیب کرنے والے یا انہیں رسوا کرنے والے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے حتیٰ کہ جب قیامت آئے گی تو یہ لوگ احکام الٰہی پر کاربند ہوں گے۔'' [صحیح بخاری:٧٤٦٠]

یہی وہ اجنبی لوگ ہیں جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مبارک باد دی ہے: ''کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو میرے اس طریقہ کی اصلاح کرتے ہیں جسے مختلف لوگوں نے خراب کر دیا ہوگا۔'' [ترمذی، الایمان:٢٦٣٠]

جماعت اہل حدیث کے افراد عملی کوتاہی کا شکار تو ہو سکتے ہیں لیکن من حیث الجماعت فکر و عمل کی کوتاہی سے محفوظ ہیں، باقی رہا اہل حدیث نام کا مسئلہ تو یہ کوئی بڑی بات نہیں کیونکہ یہ ایک لقب ہے جو اصحاب الرائے اور روافض سے ممتاز ہونے کے لئے

اختیار کیا گیا ہے۔ اگرچہ فرمان باری تعالیٰ ہے کہ ''اس سے قبل ازیں بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس (قرآن کریم) میں بھی مسلم ہی رکھا ہے۔'' [۲۲/الحج:۷۸]

تاہم اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مسلمانوں کو ''مہاجرین اور انصار'' کے لقب سے بھی یاد فرمایا ہے۔ [۹/التوبہ:۱۰۰]

متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کی صفات کی وجہ سے مہاجر وانصار میں تقسیم فرما کر ان کی طرف منسوب کر دیا اس سے معلوم ہوا کہ جس فرد یا جماعت میں کوئی خاص امتیازی وصف ہو تو مسلمین میں شمولیت کے باوجود ان صفات کی طرف ان کا انتساب کوئی معیوب چیز نہیں ہے اور نہ ہی اسے بدعت کہا جاسکتا ہے۔ اہل حدیث لقب کے جائز ہونے پر محدثین کرام اور تمام سلف صالحین کا اجماع یہی ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور سے لے کر چودھویں صدی ہجری کے نصف تک کسی نے بھی اس لقب کو بدعت نہیں کہا، پھر حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم مسلمین کو ان کے ناموں کے ساتھ پکارا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے نام مسلمین، مؤمنین اور عباد اللہ رکھے ہیں۔''

[مسند امام احمد،ص:۱۳۰،ج۴]

اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے والے کو ''مسلم'' کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ہر نبی پر ایمان لانے والی قوم مسلم ہی تھی۔ اس اعتبار سے ہم بھی مسلم ہیں لیکن جب اس مسلم قوم میں بدعات کا رواج ہوا تو امتیازی طور پر انہیں اہل حدیث یا اصحاب الحدیث کہا جانے لگا۔ گویا مسلم ذاتی اور اہل حدیث ایک صفاتی نام ہے۔ اہل رائے اور اہل بدعت کے مقابلہ میں اہل حدیث کا لقب اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ آخر ہم لوگ اپنی پہچان کے لئے اپنے نام الگ رکھ لیتے ہیں تو بحیثیت جماعت اہل حدیث صفاتی نام رکھنے میں کیا قباحت ہے۔ اس حدیث کی مخالفت کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ کم از کم اپنے پیر حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی بات ہی مان لیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ اہل السنہ کا نام اہل حدیث ہے۔ [غنیۃ الطالبین مترجم فارسی،ص:۲۱۲]

سوال قیامت کے دن سب سے پہلے نماز کے متعلق حساب ہوگا، اگر نماز سنت کے مطابق نہ ہوئی تو کیا حساب آگے چلے گا یا وہیں ختم کر دیا جائے گا؟

جواب واضح رہے کہ انسان پر دو طرح کے واجبات ادا کرنا ضروری ہیں۔ ایک حقوق اللہ اور دوسرا حقوق العباد، قیامت کے دن حقوق العباد سے قتل ناحق کے متعلق پہلے حساب لیا جائے گا، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ''قیامت کے دن سب سے پہلے لوگوں کے درمیان خون ناحق کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔'' [صحیح بخاری، الرقاق:۶۵۳۳]

البتہ حقوق اللہ سے نماز کے متعلق سب سے پہلے حساب ہوگا۔ اس حساب کی نوعیت حدیث میں بایں الفاظ بیان ہوتی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن سب سے پہلے انسانی اعمال میں سے نماز کا حساب ہوگا، اگر وہ صحیح ہوئی تو اسے کامیاب وکامران قرار دیا جائے گا اور اگر اس کا معاملہ خراب ہوا تو انسان خسارے میں رہے گا۔ اگر اس فریضہ میں کچھ کوتاہی ہوئی تو سنن ونوافل سے اس کی تلافی کر دی جائے گی۔ اسی طرح دیگر اعمال کا محاسبہ ہوگا۔'' [ترمذی، الصلوٰۃ:۴۱۳]

نماز میں کمی کے متعلق مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ معیار ومقدار کے متعلق بھی ہوسکتی ہے اور فرائض وشروط کے بارے میں

ایسا ہوسکتا ہے۔ دونوں صورتوں میں نوافل وغیرہ سے اس کمی کو پورا کیا جائے گا۔ اگر کسی انسان کے نامۂ اعمال میں نماز نامی کوئی چیز برآمد ہی نہ ہوئی تو ایسے انسان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے وہ تو احادیث کی صراحت کے مطابق دائرہ اسلام سے ہی خارج ہے، اس کے علاوہ رکعات کی تعداد یا کیفیت ادا کے متعلق اگر کمی کوتاہی ہوئی تو اسے نوافل وسنن سے پورا کیا جائے گا، جیسا کہ دیگر احادیث میں اس کی صراحت بیان ہوئی ہے۔ [نسائی، الصلوٰۃ: ۴۶۷، ابن ماجہ الصلوٰۃ: ۱۴۲۵]

عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے چھوٹے سے چھوٹے عمل کا حساب ہوگا، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔

''ہم قیامت کے دن عدل وانصاف کا ترازو قائم کردیں گے، لہٰذا کسی کی کچھ حق تلفی بھی نہ ہوگی اور اگر کسی کا رائی کے دانہ کے برابر بھی عمل ہوگا تو وہ بھی سامنے لائیں گے اور حساب لینے کے لئے ہم کافی ہیں۔'' [۲۱/ الانبیاء: ۴۷]

مذکورہ حدیث کے آخر میں بھی ہے کہ اسی طرح دیگر اعمال کا محاسبہ ہوگا، البتہ ارکان اسلام، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ لازمی مضامین کی حیثیت سے ان کا حساب لیا جائے گا۔ اگر ان میں انسان ناکام رہے تو اسے ناکام ہی قرار دیا جائے گا، البتہ حساب و کتاب تو زندگی بھر کے اعمال کا ہوگا تاکہ برسر عام ایک نامراد انسان کی ناکامی کو واضح کیا جائے۔ قرآن میں ہے کہ ''جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔ [(۹۹/ الزلزال: ۷، ۸) واللہ اعلم]

سوال نیشنل بنک آف پاکستان کی طرف سے سونے کے زیورات پر قرضہ دیا جاتا ہے اس پر بنک سود بھی وصول کرتا ہے، ان زیورات کی گارنٹی کے لیے بنک کی طرف سے ایک زرگر مقرر رہتا ہے جو بنک سے تو کچھ وصول نہیں کرتا البتہ قرضہ والوں سے زیورات کی گارنٹی کے عوض کچھ فیس وصول کرتا ہے بنک کی طرف سے یہ ڈیوٹی اور گارنٹی پر فیس کی وصولی شرعاً کیا حیثیت رکھتی ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب حدیث میں بیان ہے کہ لوگوں پر ایسا وقت آجائے گا کہ کوئی بھی سود کی لعنت سے محفوظ نہیں رہے گا، اگر کوئی سود نہیں لے گا تو اس کے غبار و دھواں سے ضرور دوچار ہوگا۔ [ابن ماجہ، التجارات: ۲۲۷۸]

چنانچہ آج ہماری یہی کیفیت ہے، اس کا مصداق سوال میں ذکر کردہ صورت میں دیکھا جاتا ہے کہ بنک والوں نے لوگوں کو پھانسنے کے لئے کیا کیا صورتیں پیدا کر رکھی ہیں، بنک زیورات کی گارنٹی پر لوگوں کو سود دیتا ہے۔ لیکن زیورات کے معیار اور اس کی مقدار کے لئے ایک آدمی مقرر ہے جو بنک سے تو کچھ وصول نہیں کرتا لیکن زیورات والوں سے اس گارنٹی کے عوض فیس وصول کرتا ہے، گویا بنک جب قرضہ جاری کرتا ہے تو اس زرگر کی شہادت پر دیتا ہے کہ ان زیورات کا معیار یہ ہے اور مقدار اتنی ہے یعنی گارنٹی دینے والا بنک اور قرضہ لینے والے کے درمیان ایک واسطہ ہے اور اس کی گواہی پر قرضہ جاری ہوتا ہے، اب ہم حدیث پر غور کرتے ہیں کہ ایسا کام کرنے کے متعلق کیا وعید ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے سود کھانے والے، کھلانے والے، لکھنے والے اور اس کے متعلق گواہی دینے والے پر فرمایا کہ یہ سب جرم میں برابر کے شریک ہیں۔''

[صحیح مسلم، المساقاۃ: ۴۰۹۳]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان ہے کہ ''سود کھانے، کھلانے والا، اس کی گواہی دینے اسے ضبط تحریر میں لانے والا

یہ سب قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ کی زبان سے لعنت زدہ ہوں گے بشرطیکہ دیدہ ودانستہ ایسا کام کرتے ہوں۔''

[مسند امام احمد،ص:۴۳۰،ج۱]

ان احادیث کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ سودی معاملات میں گواہی دینے والا بھی سودخوری کے جرم میں برابر کا شریک ہے،صورت مسئولہ میں سودی سلسلہ میں گواہی کی ایک شکل ہے،لہٰذا اس کاروبار کو ترک کردینا چاہیے،اس کے علاوہ قرآن کریم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ''تقویٰ اور بھلے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کرو،گناہ اور زیادتی والے معاملات میں کسی کا تعاون نہ کرو۔''

[۵/المائدہ:۲]

درج بالا صورت بھی گناہ اور نافرمانی میں بنک کا تعاون کرنا ہے،ہمارے ہاں بنکاری نظام کی بنیاد سود پر ہے،اس لئے اس کے ساتھ ہر قسم کا تعاون شرعاً ممنوع ہے،لہٰذا ایک مسلمان کو دنیا کی بجائے اپنی آخرت کی فکر ہونی چاہیے،یہ دنیا کا سازوسامان تو دنیا میں ہی رہ جائے گا۔ [واللہ اعلم]

سوال ہمارے بعض مدارس میں سبعہ یا عشرہ قراءت کا اہتمام کیا جاتا ہے،جبکہ بعض علما سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قراءت کا حصہ نہیں ہیں،کیونکہ ان کا ثبوت حد تواتر کو نہیں پہنچتا،قرآن کریم تواتر سے ہم تک پہنچا ہے،قرآن وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب اس پرفتن دور میں جہاں آزادی تحقیق کے نام سے صحیح احادیث کا انکار بلکہ استخفاف کیا جاتا ہے،وہاں قراءت متواترہ کو بھی تختہ مشق بنایا جاتا ہے۔حالانکہ ہمارے ہاں برصغیر میں قرآن کریم کی جو روایت پڑھی پڑھائی جاتی ہے وہ قراءت متواتر کا ہی ایک حصہ ہے۔اسے تسلیم کرنا اور باقی قراءت کا انکار کرنا علم وعقل سے کورذوقی کی بدترین مثال ہے۔حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی زبان مختلف علاقوں اور قبیلوں میں استعمال ہو تو اس کے بعض الفاظ کے استعمال میں اتنا فرق آجاتا ہے،کہ ایک قبیلہ والا دوسرے قبیلے والوں کے لب ولہجہ اور ان کے ہاں مستعمل الفاظ کو سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔نزول قرآن کے وقت عربی زبان قریش،ہذیل،تمیم،ربیعہ،ہوازن اور سعد بن بکر جیسے بڑے بڑے قبیلوں میں بولی جاتی تھی۔لیکن بعض قبائل عربی الفاظ اور ان کے موارد استعمال کے سمجھنے سے قاصر رہتے۔اللہ تعالیٰ نے ان پر آسانی کرتے ہوئے قرآن کریم کو سات حروف میں نازل فرمایا ہے۔تاکہ قرآن کریم کے اول مخاطبین تکلف کا شکار نہ ہوں۔چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ''قرآن کریم سات حروف میں نازل کیا گیا ہے،لہٰذا جو حرف تمہیں آسان معلوم ہو اس کے مطابق اس کی تلاوت کرو۔'' [صحیح بخاری،فضائل القرآن:۴۹۹۲]

یہ حدیث محدثین کے ہاں''سبعہ احرف''کے نام سے مشہور ہے اور ائمہ حدیث نے اسے اپنی تالیف میں ذکر کرکے متواتر کا درجہ دیا ہے،چنانچہ صحیح بخاری،صحیح مسلم،جامع ترمذی،سنن نسائی،سنن ابی داؤد،مؤطا امام مالک،مسند امام احمد،سنن بیہقی،مستدرک حاکم اور مصنف عبدالرزاق میں یہ حدیث بیان ہوئی ہے اور رسول اللہ ﷺ سے بائیس سے زیادہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیان کرتے ہیں جن میں عمر بن خطاب،عثمان بن عفان،علی بن ابی طالب،ابوہریرہ،عبداللہ بن مسعود،ابی بن کعب،معاذ بن جبل،عبداللہ بن عباس،حذیفہ بن یمان،انس بن مالک،عبدالرحمٰن بن عوف،عبادہ بن صامت،ابوطلحہ انصاری،سمرہ بن جندب،عمرو بن العاص،

ہشام بن حکیم، سلیمان بن حرد، ابوجہم انصاری اور ام ایوب انصاریہ (رضی اللہ عنہم) پیش پیش ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بے شمار تابعین اور ان گنت ائمہ حدیث نے متعدد اسانید کے ساتھ اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

حدیث میں بیان شدہ سبعہ احرف کے متعلق بہت اختلاف ہے، علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے علما کے چالیس اقوال کا ذکر کیا ہے، اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اس متواتر حدیث کے کسی طریق میں کوئی بھی ایسی صریح عبارت موجود نہیں ہے۔ جو سبعہ احرف کی مراد کو متعین کر دے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ضرورت کے وقت کسی بات کی وضاحت کو مؤخر نہیں کرتے۔ احادیث میں سبعہ احرف کی وضاحت نہ ہونے کی صرف یہ وجہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک سبعہ احرف کا مفہوم اس قدر واضح تھا کہ کسی کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق سوال کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی اور نہ ہی وہ اس مفہوم کو سمجھنے کے لئے کسی کے محتاج تھے۔ اگر ان کے ذہن میں کوئی اشکال پیدا ہوتا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس عقدہ کو حل کرنے کی کوشش کرتے۔ حالانکہ یہ حضرات قرآن کے متعلق اس قدر حساس تھے کہ سبعہ احرف سے متعلق اگر کسی نے کسی دوسرے قاری سے مختلف انداز پر قراءت سنی تو قرآن کریم میں اختلاف واضطراب کے واقع ہو جانے کے خوف سے فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع فرمایا، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق روایات میں ہے کہ وہ خود اپنی سرگزشت بایں الفاظ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں حضرت ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ کو سورۂ فرقان پڑھتے ہوئے سنا، میں نے جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ متعدد الفاظ اس طرح تلاوت کر رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نہیں سکھائے تھے۔ چنانچہ حضرت ہشام کو نماز ہی میں روک لینے پر تیار ہو گیا لیکن میں نے بمشکل اپنے آپ کو اس اقدام سے روکے رکھا، جونہی انہوں نے سلام پھیرا تو میں انہیں ان کے کپڑوں سے کھینچتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لے چلا، اس اثنا میں سوال کیا کہ آپ کو یہ سورت اس انداز پر پڑھنے کی کس نے تعلیم دی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سورت اس طریقہ سے نہیں پڑھائی، جس پر میں نے تجھے تلاوت کرتے ہوئے سنا ہے، چنانچہ میں انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لے چلا، وہاں پہنچ کر میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے اسے سورۂ فرقان ایسے طریقہ پر پڑھتے سنا ہے کہ آپ نے مجھے اس طرح نہیں پڑھائی ہے، آپ نے فرمایا کہ ''ہشام کو چھوڑ دو۔'' میں نے اسے چھوڑا تو آپ نے فرمایا: ''ہشام تم پڑھو۔'' تب ہشام نے اسی طرح تلاوت کی جس طرح میں نے اسے پڑھتے ہوئے سنا تھا، آپ نے فرمایا: ''یہ سورت اسی طرح نازل کی گئی ہے۔'' پھر آپ نے مجھے پڑھنے کا حکم دیا تو میں نے اسی انداز سے اسے تلاوت کیا، جیسا کہ آپ نے مجھے پڑھائی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ ''اسی طرح بھی نازل کی گئی ہے۔'' پھر آپ نے فرمایا: ''یہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، لہٰذا جو حروف تمہیں آسان معلوم ہوں اس پر قرآن کی تلاوت کرو۔''

[صحیح بخاری، فضائل القرآن: ۵۰۴۱]

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ ایک تو یہ تمام وجوہ قراءت منزل من اللہ ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان وجوہ کا اختلاف تناقص وتضاد کا نہیں بلکہ تنوع اور زیادتی معنی کی قسم سے ہے۔ اس تنوع کے بے شمار فوائد ہیں جو فن توجیہ القراءات میں بیان ہوئے ہیں اور اس پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ ہر سال رمضان المبارک میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کا دور کرتے تھے اور جس سال آپ کی وفات ہوئی اس سال آپ نے دومرتبہ دور کیا، اس موقع پر بہت سی قراءات منسوخ کردی گئیں اور چند قراءتیں باقی رکھی گئی ہیں۔ جواب تک متواتر چلی آرہی ہیں۔ ان کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ وہ متواتر ذریعے سے ثابت ہوں اور دوسری شرط یہ ہے کہ مصاحف عثمانی کے رسم کے مطابق ہوں، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں جب سرکاری طور پر قرآن پاک کے نسخے تیار کرائے تو ان کے لئے ایسا رسم الخط تجویز کیا گیا کہ قراءتیں اس رسم الخط میں سما گئیں اور جو قراءات رسم الخط میں نہ آسکتی تھیں، ان کو محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ ایک نسخہ ایک قراءت کے مطابق اور دوسرا دوسری کے مطابق تحریر کیا۔ اس طرح سات نسخے تیار کیے گئے جو مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، یمن، بحرین، بصرہ اور شام بھیجے اور ان کے ساتھ قرّاء حضرات بھی روانہ کئے تاکہ صحیح طریقے سے لوگوں کو قرآن کریم کی تعلیم دیں۔ چنانچہ یہ قرّاء حضرات مختلف علاقوں میں پہنچے اور ہر ایک نے اپنی اپنی قراءت کے مطابق پڑھانا شروع کردیا اور یہی قراءتیں لوگوں میں مشہور ہوگئیں۔ علمائے امت نے ان قراءات کو یاد کرنے کا اس قدر اہتمام کیا کہ ''علم قراءت'' ایک مستقل فن کی شکل اختیار کرگیا۔ بہرحال متواتر قراءات وحی کا حصہ ہے۔ ان میں سے کسی ایک کا انکار کرنا قرآن کا انکار کرنا ہے۔ [واللہ اعلم]

نوٹ: تدوین قرآن کے وقت عربی کتابت نقاط وحرکات سے خالی ہوتی تھی۔ اس لئے ایک ہی نقش میں مختلف قراءت کے سما جانے کی گنجائش تھی۔ لوگوں کی سہولت کے لئے جب حروف پر نقاط وحرکات لگیں تو قرآن مجید بھی علیحدہ علیحدہ قراءت میں شائع ہونے لگے۔ چنانچہ ہمارے ہاں برصغیر میں قراءت امام عاصم بروایت حفص رائج ہے، اسی طرح مغرب، الجزائر، اندلس اور شمالی افریقہ میں قراءت امام نافع بروایت ورش عام ہے اور اسی کے مطابق قرآن مجید کی اشاعت ہوئی ہے۔ چنانچہ راقم نے مدینہ منورہ میں دوران تعلیم قراءت نافع بروایت قالون اور بروایت ورش دونوں الگ الگ مصاحف دیکھے تھے۔ نیز قراءت امام کسائی کا مصحف بھی نظر سے گزرا تھا، یہ وضاحت اس لئے ضروری تھی کہ ہمارے ہاں روایت حفص پر مشتمل مصاحف ہی دستیاب ہیں۔ اس لئے اسے قرآن کے مترادف خیال کیا جاتا ہے اور اس بنیاد پر دوسری متواتر قراءت کا انکار کیا جاتا ہے جبکہ حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے متعلق کتب احادیث میں آیا ہے کہ انہوں نے کوہ طور پر سفر کیا تھا ان کا سفر اس حدیث کے خلاف نہیں ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''تین مساجد کے علاوہ کسی دوسری مسجد کی طرف رخت سفر نہ باندھا جائے۔'' نیز کچھ لوگ زیارت طور سے زیارت مزارات کا سفر ثابت کرتے ہیں؟

جواب حدیث میں بیان ہے کہ مسجد حرام، مسجد نبوی اور بیت المقدس کے علاوہ تقرب الی اللہ اور حصول ثواب کی نیت سے کسی دوسری جگہ سفر کرکے جانا جائز نہیں ہے۔ [صحیح بخاری، فضل الصلوٰۃ:۱۱۸۹]

جب ان تین مسجدوں کے علاوہ کسی اور مسجد کی طرف سفر کرنا جائز نہیں، تو مزارات اور صالحین کے آثار کی زیارت کے لئے سفر کیونکر جائز ہوسکتا ہے؟ ائمہ اربعہ اور دیگر فقہا کے نزدیک تو مسجد قبا کی زیارت کے لئے دور دراز سے سفر کرکے جانا بھی جائز نہیں

ہے۔ ہاں مدینہ منورہ سے مسجد قبا کی طرف ارادہ کرکے جانا اور وہاں نماز پڑھنا مستحب ہے، جیسا کہ حدیث میں بیان ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ ہر ہفتہ کے دن پیدل یا سوار ہو کر مسجد قبا تشریف لے جاتے اور وہاں نماز ادا کرتے تھے۔'' [صحیح بخاری، فضل الصلوۃ:۱۱۹۳]

رسول اللہ ﷺ کی اس سنت پر عمل کرنے کے لئے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی مسجد قبا جایا کرتے تھے۔

[صحیح بخاری، فضل الصلوۃ:۱۱۹۴]

مذکورہ حدیث سے یہ نہ سمجھا جائے کہ سفر کے متعلق امتناعی حکم صرف مساجد سے متعلق ہے، مزار یا بزرگوں کے آثار اس کے حکم کے تحت نہیں آتے، کیونکہ نزول شریعت کے چشم دید گواہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس امتناعی حکم کو مساجد اور غیر مساجد کے لئے عام رکھا ہے، جیسا کہ درج ذیل احادیث سے واضح ہوتا ہے۔

☆ حضرت ابوبصرہ غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جب کوہ طور سے واپس آئے تو وہ ان سے ملے اور انہوں نے دریافت کیا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں؟ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ کوہ طور پر گیا تھا وہاں نماز پڑھ کر واپس آیا ہوں، حضرت ابوبصرہ رضی اللہ عنہ نے کہا اگر مجھے آپ کے وہاں جانے کا پہلے علم ہو جاتا تو آپ وہاں نہ جاتے، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تین مساجد کے علاوہ کسی دوسری مسجد کی طرف رخت سفر نہیں باندھنا چاہیے وہ یہ ہیں مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ (مسند امام احمد، ص:۷،ج۶)

سوال میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے متعلق کوہ طور پر جانے کا تذکرہ نامکمل ہے، اس حدیث کی روشنی میں اسے دیکھا جائے، یہ حدیث سننے کے بعد حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اسے بیان کیا کرتے تھے، جیسا کہ بخاری کے حوالہ سے پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

☆ شہر بن حوشب کہتے ہیں کہ ہم چند لوگ کوہ طور پر جانے کا ارادہ کئے ہوئے تھے، اس دوران ہماری حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی اور ہم نے آپ سے اپنے ارادہ کا اظہار کیا تو آپ نے ہمارے سامنے رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث بایں الفاظ بیان فرمائی: ''تین مساجد کے علاوہ کسی طرف (تقرب الٰہی کی نیت سے) سواری کو استعمال نہیں کرنا چاہیے، ان میں سے ایک مسجد حرام، دوسری مسجد مدینہ اور تیسری مسجد اقصیٰ ہے۔'' [مسند امام احمد، ص۹۳، ج۳]

☆ حضرت قزعہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ سے فرمایا کہ میں جبل طور پر جانا چاہتا ہوں، آپ نے رسول اللہ ﷺ کے فرمان کا ذکر کیا کہ مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے علاوہ کسی جگہ کا (تقرب الٰہی کی نیت) سے قصداً سفر کرنا منع ہے، لہٰذا تم جبل طور پر جانے کا ارادہ ترک کر دو۔ (مجمع الزوائد، ص:۴، ج۴)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ تین مساجد کے علاوہ کسی اور جگہ عبادت یا زیارت کی نیت سے جانا منع ہے، لہٰذا اس حکم امتناعی کو صرف مسجد سے خاص کرنا صحیح نہیں، کیونکہ مذکورہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کوہ طور پر قصداً عبادت یا زیارت کی نیت سے سفر کرنا منع ہے اور جبل طور پر مسجد نہیں بلکہ ایک مقدس مقام ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رب کائنات سے گفتگو کی تھی، اس بنا پر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے کوہ طور کے سفر سے زیارت مزارات کا استدلال محل نظر ہے۔

[واللہ اعلم]

سوال آج کل مارکیٹ میں بڑی فکر انگیز تقاریر پر مشتمل کیسٹیں دستیاب ہیں، کیا شرعی طور پر ان کیسٹوں کے ذریعے عورتوں کی تقاریر سن سکتے ہیں، قرآن وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب واضح رہے کہ عورتوں کو غیر مردوں سے اپنی ہر چیز چھپانے کا حکم ہے، اس کی زیب وزینت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وہ اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر جو از خود ظاہر ہو جائے۔'' [۲۴/النور:۳۱]

اسی طرح آواز کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتی ہو تو کسی نامحرم سے دبی زبان میں بات نہ کرو، ورنہ جس شخص کے دل میں روگ ہے۔ وہ کوئی غلط توقع لگا بیٹھے گا، لہٰذا صاف سیدھی بات کرو۔'' [۳۳/الاحزاب:۳۲]

اس آیت کریمہ کے مطابق غیر عورت کی باہمی گفتگو اور آواز پر پابندی لگائی گئی ہے اور اس حکم میں مخاطب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو بالخصوص اس لئے کیا گیا ہے کہ ان سے بھی لوگوں کو دینی مسائل پوچھنے کی ضرورت پیش آتی رہتی تھی، چنانچہ انہیں حکم دیا گیا کہ ان کی آواز شیریں اور لوچدار ہونے کے بجائے روکھی اور اسے ضرورت کی حد تک بلند ہونا چاہیے، دبی زبان میں ہرگز بات نہ کی جائے، جو اپنے اندر نرم گوشہ لئے ہوئے ہو، لوچدار اور شیریں آواز بذات خود دل کا مرض ہے، پھر اگر مخاطب کے دل میں پہلے سے ہی اس قسم کا روگ موجود ہو تو وہ ایسی لذیذ گفتگو سے کئی غلط قسم کے خیالات اور تصورات دل میں جمانا شروع کر دے گا۔ عورت کی آواز پر اصل پابندی یہ ہے کہ ضرورت کے بغیر غیر محرم مرد اس کی آواز نہ سننے پائیں، نیز اس کی آواز میں نرمی، بانکپن اور شیریں پن نہیں ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت اذان نہیں کہہ سکتی مردوں کی جماعت نہیں کرا سکتی، نماز با جماعت میں اگر امام بھول جائے تو زبان سے ''سبحان اللہ'' نہیں کہہ سکتی اور نہ اسے لقمہ دے سکتی ہے، بلکہ ایسے حالات میں اس کے لئے حکم ہے کہ اپنے ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ مار کر آواز پیدا کرنے سے امام کو متنبہ کرے، جیسا کہ احادیث میں اس کے متعلق مفصل ہدایات موجود ہیں۔ لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک ایسا فریضہ ہے جو صرف مردوں کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ عورتیں بھی اسے ادا کرنے میں مردوں کے ساتھ شریک ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صحابیات مبشرات رضی اللہ عنہن نے شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس فریضہ کو ادا فرمایا، چنانچہ حدیث میں بیان ہے کہ نماز فجر کے بعد کچھ لوگوں نے بیت اللہ کا طواف کیا پھر مجلس وعظ میں بیٹھ گئے، جب طلوع آفتاب کا وقت ہوا تو طواف کی دو رکعت پڑھنا شروع کر دیں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان پر بایں الفاظ بیان فرمایا کہ ''طواف کے بعد بیٹھے رہے اور جب وہ وقت آ پہنچا جس میں نماز ادا کرنا مکروہ ہے تو اٹھ کر نماز شروع کر دی۔'' [صحیح بخاری، الحج:۱۶۲۸]

اسی طرح معرکہ یرموک میں رومیوں کے مقابلہ میں بعض مسلمانوں نے پسپائی اختیار کی تو مسلمان خواتین نے انہیں شرم دلائی اور معرکہ کارزار میں واپس پلٹنے کی تلقین کی۔ [البدایہ والنہایہ ص:۱۳، ج۷]

حفصہ بنت سیرین نے دینی وابستگی اور حمیت اسلامی کے بارے میں ایک مرتبہ فرمایا تھا ''اے نوجوانو! زمانہ جوانی میں اپنی جانوں سے فائدہ حاصل کرو میں نے جوانی کے عمل جیسا بہترین عمل کسی اور زمانے میں نہیں دیکھا ہے۔'' [صفۃ الصفوۃ ص:۵۰۷، ج۴]

الغرض کتب حدیث میں بے شمار واقعات ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خواتین اسلام نے عام لوگوں اور اپنے عزیز و اقارب علما، طلبہ اور حکمرانوں کا وعظ وارشاد کے ذریعے احتساب فرمایا۔ اس بنا پر مردوں کو عورتوں کی تقاریر پر مشتمل کیسٹ سننے میں

کے باوجود درگزر کرتے ہوئے خیر و برکت کے جذبے سے ''اربعین'' کو تالیف کیا ہے۔ ان میں کچھ اصول دین سے متعلق ہیں اور متعدد اربعین کا تعلق فروغ اسلام سے ہے۔ [العلل المتناہیہ، ص:۱۲۱، ج۱]

خود علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے بندگان الٰہی کے اخلاق و کردار سے متعلق احادیث پر مشتمل ''اربعین'' تالیف کی ہے، لیکن زیادہ شہرت اور قبولیت علامہ نووی کی ''اربعین'' کو حاصل ہے۔ ہمیں اس بات پر تعجب ہے کہ جب ایک حدیث سرے سے ہی ثابت نہیں، پھر اسے بنیاد بنا کر احادیث جمع کرنا چہ معنی دارد؟ اگر خیر و برکت اور خدمت دین کا جذبہ پیش نظر ہے تو چالیس کی تعداد پر انحصار کرنا کس بنا پر ہے۔ بہر حال چالیس احادیث کو یاد کرنے، لکھنے اور لوگوں تک پہنچانے کے متعلق جتنی بھی احادیث بیان ہوئی ہیں وہ محدثین کے قائم کردہ معیار صحت پر پوری نہیں اترتیں بلکہ ان کا ضعف اس قدر شدید ہے کہ کثرت طرق سے بھی اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

سوال تاریخ مدینہ نامی کتاب میں حضرت زید بن خارجہ رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں فوت ہو جانے کے بعد گفتگو کی ''ص:۱۱۰'' اس واقعہ کے متعلق وضاحت کریں کہ کہاں تک درست ہے، کیونکہ ایسے واقعات سے بدعتی حضرات کو اپنی بدعات پھیلانے کا موقع ملتا ہے۔

جواب کتب تاریخ میں اس طرح کے متعدد واقعات بلا تحقیق درج ہوتے ہیں۔ جن سے شرک و بدعت کے چور دروازے کھلتے ہیں۔ چونکہ راقم آثم تاریخ سے متعلق واجبی سا علم رکھتا ہے، پھر تاریخی واقعات کی چھان پھٹک کے لئے کافی وقت چاہیے، جو بدقسمتی سے میرے پاس نہیں ہے۔ ملازمت کی ذمہ داریاں، دعوتی پروگرام، گھریلو مصروفیات اور مدرسہ کے لئے اعصاب شکن تگ و دو کے بعد کم وقت فتاویٰ نویسی کے لئے ملتا ہے۔ یہ صرف اللہ کی مہربانی ہے کہ کام چل رہا ہے۔ بہر حال سر دست مذکورہ واقعہ کے متعلق گزارش یہ ہے کہ مرنے کے بعد کسی بندہ بشر کا گفتگو کرنا قانون الٰہی کے خلاف ہے، اگر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا مظاہرہ کر دے تو اس سے کوئی بعید نہیں ہے۔ میری معلومات کے مطابق یہ واقعہ موت سے پہلے کا ہے، چنانچہ ابن عبد البر القرطبی لکھتے ہیں۔ حضرت زید بن خارجہ رضی اللہ عنہ کو موت سے پہلے غشی کا دورہ پڑا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی روح پرواز ہو چکی ہے، اس پر کپڑا ڈال دیا گیا، پھر چند لمحات کے بعد سکتہ کی کیفیت ختم ہوئی تو انہوں نے حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے متعلق کچھ گفتگو کی، اس کے بعد فوراً اس پر موت واقع ہو گئی۔ [الاستیعاب بر حاشیہ الاصابہ، ص:۵۶۱، ج۱]

تاریخ مدینہ اور استیعاب کے بیان میں زمین و آسمان کا فرق ہے، موت سے پہلے اس طرح کے واقعات پیش آنا کوئی بعید بات نہیں ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ پر ایک دفعہ غشی کا دورہ پڑا، ان کی ہمشیرہ حضرت عمرہ بنت رواحہ رضی اللہ عنہا نے رونا شروع کر دیا اور بایں الفاظ بین کرنے لگی، ہائے پہاڑ وغیرہ جب انہیں ہوش آیا تو کہنے لگے کہ جب تو میرے متعلق بین کر رہی تھی تو مجھے کہا جاتا تھا واقعی تو ایسا ہے۔ [صحیح بخاری، حدیث نمبر:۴۲۶۷]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ فرشتہ نے لوہے کی گرز اٹھا رکھی تھی اور وہ مجھ سے پوچھتا تھا کہ واقعی تو ایسا تھا اگر میں کہتا تو مجھے مار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔ [فتح الباری، ص:۶۴۷ ج۷]

اگر سند کے اعتبار سے زید بن خارجہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ صحیح ہے تو وہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ جیسا ہوگا یہ بھی ممکن ہے۔ ہاتف غیب سے کوئی آواز آتی ہو جسے زید بن خارجہ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دیا گیا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو غسل کے متعلق پریشانی لاحق ہوئی کہ آپ کے کپڑوں کو اتار دیا جائے یا کپڑوں سمیت غسل دیا جائے تو صحابہ کرام پر نیند کی کیفیت طاری ہوئی اور گھر کے ایک کونے سے آواز آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انہی کپڑوں میں غسل دیا جائے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ وہ آواز دینے والا کون تھا۔ [مسند امام احمد،ص:۲۶۷،ج۶]

بہرحال موت کے بعد ہم کلام ہونا تاکہ حاضرین اسے سنیں یہ سنت اللہ کے خلاف ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال بازار میں سادہ ٹون والے موبائل فون دستیاب ہیں، لیکن بعض لوگ ایسا موبائل خریدتے ہیں جس میں میوزک والی ٹون بھی ہوتی ہے، پھر اس میں کیمرہ بھی ہوتا ہے جس سے بخوبی فوٹو اتارا جا سکتا ہے، کیا ایسا فون خرید کر استعمال کرنا جائز ہے، بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوران جماعت ہی موبائل فون کی گھنٹی بجنا شروع ہو جاتی ہے جس سے دوسرے نمازیوں کے خشوع میں خلل آتا ہے، اس کے متعلق قرآن وحدیث کی روشنی میں ہماری راہنمائی فرمائیں؟

جواب موبائل فون دور حاضر کی ایک نئی ایجاد ہے جس کا فائدہ یہ ہے کہ انسان ہر وقت رابطہ میں رہتا ہے، اسے انتظار کی زحمت نہیں اٹھانا پڑتی، لیکن اس کے فائدہ کے ساتھ ساتھ منفی اثرات بہت زیادہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوئے کے متعلق فرمایا کہ ''ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں لیکن ان کا گناہ ان کے فائدے کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔'' [۲/البقرہ:۲۱۹]

تجربات نے ثابت کیا ہے کہ یہی معاملہ موبائل فون سے متعلق ہے، کیونکہ اس میں فوائد بھی ہیں، لیکن جسمانی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور دینی نقصانات اس کے فائدے کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں، جیسا کہ درج ذیل تفصیل سے واضح ہے۔

☆ جسمانی نقصانات: جو ڈاکٹر دماغی رسولیوں کے ماہر ہیں ان کی رپورٹ کے مطابق موبائل فون بکثرت استعمال کرنے سے قوت سماعت سے متعلق عصب میں ٹیومر رسولی ہونے کا خطرہ دوسروں کے مقابلہ میں دوگنا ہو جاتا ہے، نیز ان کا تجزیہ ہے کہ سیل فون کے تابکاری اثرات کے نتیجہ میں خوردبینی جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں جو کینسر کی ابتدا کا باعث ہیں۔ اس کے برقی مقناطیسی اثرات کے تحت دماغ کے خلیات کو نقصان پہنچتا ہے جس کے نتیجہ میں دماغ سے متعلق ایسی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جن کا علاج فی الحال ناممکن ہے، اس کے کثرت استعمال سے حافظہ کمزور، قوت فکر متاثر ہوتی ہے اور دماغ کی نشوونما بھی رک جاتی ہے۔

☆ معاشی نقصانات: ہمارے ہاں موبائل فون ضرورت سے تجاوز کر کے ایک فیشن کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ گھر میں جتنے افراد ہیں، ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر ایک کے پاس ذاتی موبائل ہو۔ اس میں تین صد یا چھ صد روپے کا کارڈ ڈالا جاتا ہے جسے ایک ہی نشست میں فضول گپ شپ لگاتے ہوئے ختم کر دیا جاتا ہے۔ جو آدمی اسے ضروریات کے بجائے فضولیات میں لے جاتا ہے وہ اس کے بغیر گزارا نہیں کر سکتا، بلاوجہ اس کے ذریعے مال کا ضیاع ہے جس کا کوئی معقول مصرف نہیں ہے، شوق فضول اس کے ذریعے پورا کیا جاتا ہے۔

☆ معاشرتی نقصانات: کیمرہ موبائل فون کے ذریعے گلی کوچوں میں جانے والی عورتوں کے فوٹو آسانی سے بنائے جاسکتے ہیں، پھر انہیں مختلف پوز میں ڈھالنے کی سہولت موبائل میں موجود ہوتی ہے۔اس قسم کی تصاویر کے ذریعے بلیک میل کر کے معاشرہ کو تباہ کیا جارہا ہے،سعودی گورنمنٹ نے اس قسم کے موبائل فون پر پابندی لگا رکھی ہے،جبکہ ہماری روشن خیال حکومت اس قسم کے اقدامات کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

☆ اخلاقی نقصانات: فون میں میوزک اور موسیقی ہوتی ہے،پھر اس میں گانے بھرنے کی سہولت موجود ہوتی ہے،نیز محدود پیمانے پروڈیوفلم بنائی جاسکتی ہے،فحش گانوں اور مخرب اخلاق فلموں سے ہماری نسل کے اخلاق متاثر ہوتے ہیں۔اس کا احساس آیندہ چندسالوں میں ہوگا جب پانی سر سے گزر چکا ہوگا۔

☆ دینی نقصانات: بعض اوقات جنازہ پڑھا جاتا ہے،اس دوران موبائل کی گھنٹی بجنا شروع ہوجاتی ہے جو گانے کی دھن پرسیٹ کی ہوتی ہے،اس سے جنازہ کا تسلسل اور وقتی خشوع بھی رخصت ہوجاتا ہے،بعض اوقات مسجد میں بھی گانوں کی دھنیں بکھرنا شروع ہوجاتی ہیں،بہرحال اس فون نے مسجد کے تقدس اور نماز کے خشوع وخضوع کو ختم کردیا ہے،اس لئے ہم موبائل فون کے مخالف نہیں،بلکہ اس کے غلط استعمال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سامان موسیقی کے متعلق آج سے چودہ سو سال قبل خبردار کیا ہے۔آپ نے فرمایا:"اس امت میں بھی دھنسنے،شکلیں بگڑنے اور پتھروں کی بارش برسنے کے واقعات ہوں گے۔"ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ ایسا کب ہوگا؟آپ نے فرمایا:"جب گلوکار عام ہوجائیں گے، آلات موسیقی رواج پاجائیں گے،شراب نوشی کی برسرعام محفلیں ہوں گی۔" [ترمذی،الفتن:۲۲۱۲]

اس حدیث کی روشنی میں آلات موسیقی،اس کے متعلق دیگر ذرائع کی حرمت اوران کے خطرناک نتائج سے ہمیں آگاہ کیا گیا ہے۔مساجد میں موبائل کی گھنٹیاں کھلی رکھنا جن میں موسیقی کی دھنیں ہوں اللہ کے عذاب کو دعوت دینا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اوران کی نماز اللہ کے پاس صرف سیٹیاں بجانا اور تالیاں پیٹنا تھی،ان سے کہا جائے گا کہ اب اپنے کفر کی پاداش میں دردناک عذاب کا مزہ چکھو۔" [۸/الانفال:۳۵]

واضح رہے کہ اگر موبائل فون کی گھنٹی مسجد میں آتے وقت بند نہیں کی جاسکی اوروہ دوران نماز بجنے لگے تو اسے نکال کر بند کردینے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ ہمیں اس کے صحیح استعمال کی توفیق دے۔ [واللہ اعلم]

سوال چھوٹے بچوں کو بہلانے کے لئے کھلونے،مثلاً: پلاسٹک کی گڑیا،شیر،بندروغیرہ گھروں میں رکھنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟

جواب تصویرکشی اورفوٹوگرافی کواسلام نے حرام قرار دیا ہے۔امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تصاویر کے متعلق مستقل ایک عنوان قائم کیا ہے،اس میں بیان کردہ احادیث کی روشنی میں ان کے نقصانات سے ہم قارئین کرام کو آگاہ کرتے ہیں۔

☆ جس گھر میں تصاویر ہوں وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔ [کتاب اللباس،حدیث نمبر:۵۹۴۹]

☆ قیامت کے دن تصاویر بنانے والے کو سخت ترین عذاب سے دوچار کیا جائے گا۔ [حدیث نمبر:۵۹۵۰]

☆ رسول اللہ ﷺ نے انہیں بدترین مخلوق قرار دیا ہے۔ [حدیث نمبر:۴۳۴]

☆ رسول اللہ ﷺ نے تصاویر بنانے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔ [حدیث نمبر:۵۹۶۲]

☆ رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ جہاں تصاویر یا کوئی مجسمہ پاتے اسے توڑ ڈالتے۔ [حدیث نمبر:۵۹۵۲]

☆ اللہ تعالیٰ نے ایک حدیث قدسی میں تصویریں بنانے والوں کو ظالم ترین قرار دیا ہے۔ [حدیث نمبر:۵۹۵۳]

☆ تصویر کشی کی پاداش میں انہیں دگنا عذاب ہوگا، انہیں ان تصویروں میں روح ڈالنے کے متعلق کہا جائے گا۔ [حدیث نمبر:۵۹۵۱]

☆ رسول اللہ ﷺ اس گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے جن میں تصویریں ہوتی تھیں۔ [حدیث نمبر:۵۹۵۷]

تصاویر بنانے اور شوق کے طور پر انہیں اپنے پاس رکھنے کی بہت سخت وعید ہے، البتہ درج ذیل صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔

☆ پاسپورٹ، شناختی کارڈ یا نوٹوں پر تصاویر اپنے پاس رکھنے کی گنجائش ہے، کیونکہ یہ ایک مجبوری کی صورت ہے۔

☆ ایسے کپڑے پر تصاویر قابل برداشت ہیں، جسے بچھونے کے طور پر استعمال کیا جائے، کیونکہ ایسا کرنے سے تصاویر کی توہین ہوتی ہے۔

☆ درخت اور قدرتی مناظر کی تصاویر رکھنے کا جواز ہے جن میں روح نہ ہو۔

☆ لڑکیوں کو امور خانہ داری سکھانے کے لئے تصاویر رکھی جاسکتی ہیں جو گڑیوں کی شکل میں ہوں۔

☆ کسی یقینی فائدے کے پیش نظر بھی تصاویر رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

صورت مسئولہ میں بچوں کو بہلانے کے لئے پلاسٹک وغیرہ کی گڑیا رکھنے میں جواز ہے، جیسا کہ درج ذیل احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔

☆ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں گڑیوں سے کھیلا کرتی تھیں۔ [صحیح بخاری، الادب:۶۱۳۰]

☆ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کھلونے میں ایک گھوڑے کا کھلونا بھی تھا جس کے دو پر تھے۔ [ابوداود، الادب:۴۹۳۲]

لیکن ان کھلونوں میں بندروں، شیروں کتوں اور خنزیروں کی شکل وصورت کے کھلونے رکھنا ایک مسلمان کی شان کے خلاف ہے، مغربی تہذیب سے وابستہ لوگ اس قسم کے حیوانات سے پیار کرتے ہیں، مسلمان گھرانوں کو ان سے پاک ہونا چاہیے۔ [واللہ اعلم]